اسلام اور سیاست

آیت اللہ مصباح یزدی مدظلہ العالی

مترجم

القائم گروپ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ

۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

نام کتاب	:	**اسلام اور سیاست**
تصنیف	:	حضرت آیت اللہ مصباح یزدی
مترجم	:	القائم گروپ
پروف ریڈنگ	:	مجاہد حسین حر
کمپیوزنگ	:	قائم گرافکس
طبع	:	اوّل مئی 2013ء
ناشر	:	مصباح القرآن ٹرسٹ۔لاہور۔پاکستان
قیمت	:	

اس کتاب کی اشاعت کے لیے الحاج شیخ وحید احمد صاحب نے بطور قرض حسنہ تعاون فرمایا ہے۔خدا تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائیں۔

ادارہ

ملنے کا پتہ

محمد علی بک ایجنسی،اسلام آباد 051-2557471

معراج کمپنی،اُردو بازار،لاہور۔ 042-37361214

انتساب

نجات دہندہ بشریت

حجۃ اللہ علی الخلق

حضرت صاحب العصر الزمان

عجل اللہ فرجہ الشریف

کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی، انشاء اللہ العزیز آئندہ بھی شائع ہوتی رہیں گی۔

موجودہ کتاب ''اسلام اور سیاست'' حضرت آیت مصباح یزدی کی چالیس تقاریر کا مجموعہ ہے آقائی محترم نے علامہ اقبال کے اس شعر کی ایک خوبصورت تشریح کی ہے: ''جدا ہو گر دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

www.misbahulqurantrust.org

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

تقریظ

حجۃ الاسلام مولانا سید شہنشاہ حسین نقوی

ہمارا معاشرہ سیاست کے لفظ سے خوب آشنا ہے تصور میں مطلب خدمت انسانیت کم اور مطلب پرستی زیادہ لیا جاتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ موجودہ زمانے میں سیاست ایک بہت ہی بری چیز سمجھی جانے لگی ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہی کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر علامہ اقبال نے کہا تھا:

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہی بات آج کے زمانے میں حضرت امام خمینیؒ نے ثابت کر کے دکھائی کی کہ سیاست وہی ہے جو دین ہے اور دین وہی ہے جو سیاست ہے مگر سیاست برائے سیاست سیاست نہیں بلکہ سیاست برائے ترویج دین اور خدمت انسانیت ہونی چاہئے اور سیاست پر دین کا حاکم ہو اور سیاست پر دین کو حاکم ہونا ہی سیاست کی بہترین تصویر ہے۔

حضرت آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی ایران کی علمی و سیاسی و سماجی مشہور و معروف شخصیت ہیں یہ کتاب آقائی مصباح یزدی کی چالیس تقاریر کا مجموعہ ہے ان تقاریر میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسلامی سیاست کے خدوخال کو واضح کیا بلکہ دنیاوی و یورپی سیاست کے مکروہ چہرے سے نقاب نوچ ڈالی۔ آقائی مصباح یزدی پہلی تقریر سے جو گفتگو شروع کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ اب کوئی اور کام نہیں بلکہ اسی کتاب کو پورا کر کے اٹھنا ہے کیونکہ کتاب شروع کرنے کے بعد اس کو چھوڑنا بڑا مشکل نظر آتا ہے۔

اس کتاب کے عنوان ہی ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر کتاب خود پکارتی ہے کہ مجھے ضرور پڑھو۔

اسلام اور اس کا سیاسی نظریہ
اسلامی حکومت میں لوگوں کا کردار
اسلام کے سیاسی نظریہ کو پہچاننے کے طریقے
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت
دشمن کی سازشوں کے مقابلے میں ہمارا وظیفہ
دین میں سیاست کی اہمیت
اسلام میں آزادی

اسلام کے سیاسی نظریہ کے اصول

اقدار کے بارے میں اسلام اور مغربی تمدن میں نظریاتی فرق

قانون کے سلسلے میں اسلام اور یورپ کے درمیان بنیادی فرق

حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کی خصوصیت

حقیقت یہ ہے کہ آقائی مصباح یزدی کی کتاب کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یہ ہمارے لئے سعادت کا مقام ہے کہ ہمیں آقائی مصباح یزدی کی کتاب پر کچھ لکھنے کا موقع ملا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ استاد اور ہم ایک ادنیٰ طالب علم کا درجہ رکھتے ہیں۔

علمی اعتبار سے یہ کتاب اتنا عظیم سرمایہ ہے جسے اردو زبان پڑھنے والوں کے لئے پیش کرنا خود بہت بڑا کارنامہ و سعادت مندی ہے اور اس کا عنوان مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے روح رواں جناب شیخ محمد امین صاحب کو جاتا ہے جو اپنے اس عظیم مقصد سے اتنے سچے ہیں جس پر فخر کرنے کو دل کرتا ہے امید ہے کتاب ھذا اہل علم و دانش کے لئے ایک ذخیرہ علمی قرار پائے گی۔

والسلام

سید شہنشاہ حسین نقوی

فہرست کتاب

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان | صفحہ نمبر

عنوان | صفحہ نمبر

عنوان | صفحہ نمبر

صفحہ نمبر عنوان

عنوان | صفحہ نمبر

عنوان | صفحہ نمبر

عنوان | صفحہ نمبر

صفحہ نمبر عنوان

عنوان | صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان | صفحہ نمبر

عنوان | صفحہ نمبر

عنوان | صفحہ نمبر

سینتیسویں نشست

اڑتیسویں نشست 467

عنوان	صفحہ نمبر

مختصر تعارف

حضرت آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی

محمد مصباح یزدی ۱۳۱۳ھ ش میں شہر یزد میں پیدا ہوئے۔آپ نے حوزہ کی ابتدائی اور مقدماتی تعلیم کو یزد میں ہی مکمل کیا۔اور تعلیم کو مرحلہ تکمیل تک پہچانے کی غرض سے نجف اشرف کا سفر کیا۔لیکن مالی مشکلات کی بنا پر نجف چھوڑ کر قم چلے آئے۔

۱۳۳۱ھ ش سے لے کر ۱۳۳۹ھ ش تک امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے درسوں میں شرکت کرتے رہے اور اسی دوران تفسیر قرآن، شفا اور اسفار کے دروس کو علامہ طباطبائی کے پاس مکمل کیا۔اور تقریبا ۱۵ سال تک آیت اللہ بہجت کے درس میں حاضر ہوتے رہے۔اس کے بعد امام کے ملک بدر ہونے کی وجہ سے امام کے دروس کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔اس دوران موصوف نے مختلف موضوعات منجملہ جہاد، قضا اور حکومت اسلامی جیسے موضوعات پر تحقیق کرنا شروع کیا۔

آپ پہلوی حکومت کے ساتھ معرکہ آرائی میں بھی حصہ دار تھے ڈاکٹر شہید بہشتی ، شہید باہنر اور آیت اللہ رفسنجانی کے ساتھ ہمکاری کرتے تھے اور اس دوران دو مجلات بنام ''بعثت'' اور ''انتقام'' میں بھی اہم کردار نبھاتے تھے مخصوصا مجلہ انتقام سے متعلق تمام امور آپ کے ذمہ تھے۔

اس کے بعد مدرسہ حقانی میں آیت اللہ جنتی ، شہید بہشتی اور شہید قدوسی کے ساتھ اداری کاموں اور تدریس میں مشغول ہوگئے اور تقریبا دس سال تک اس مدرسہ میں فلسفہ اور علوم قرآن کی تدریس کی۔

اس کے بعد انقلاب کی کامیابی سے پہلے اور بعد میں امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی تائید سے کئی مدارس، کمپلکس اور یونیوسٹیاں قائم کیں کہ جن میں اہم ترین ''موسسہ در راہ حق''، ''دفتر ہمکاری حوزہ و دانش گاہ'' اور ''بنیاد فرہنگی باقر العلوم'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اور آپ حال حاضر میں رہبر معظم کی تائید سے موسسہ امام خمینیؒ کے ہیڈ آفیسر ہیں۔

آیت اللہ مصباح یزدی ۱۳۶۹ ش میں شہر خوزستان کی طرف سے مجلس خبرگان کے نمائندہ مقرر ہوئے۔اور اس وقت تہران کی طرف سے آپ مجلس خبرگان کے نمائند ہیں۔اور کئی سال سے آپ عالمی اہلبیتؑ اسمبلی کی اعلی کونسل کے سربراہ اور ہیڈ ہیں۔

آپ نے اسلامی فلاسفی، الٰہیات، اخلاق اور عقائد پر مختلف کتابیں تالیف کی ہیں۔

پہلی نشست

اسلامی سیاست کے سلسلے میں چند اہم سوالات

1۔ مقدمہ

بے شک ہمارے اسلامی نظام اور انقلاب کے ثمرات میں سے ایک نماز جمعہ بھی ہے جس کے امت اسلامی کے لئے بہت سے فوائد ہیں مثلاً جس کا ایک ضمنی فائدہ مومنین کو ضروری چیزوں سے آگاہ کرنا ہے، نماز جمعہ کے خطبوں سے قبل یا نماز جمعہ اور نماز عصر کے درمیان تقاریر کا سلسلہ لوگوں کے لئے بہت مفید ہے، چنانچہ شروع انقلاب سے آج تک مختلف اساتید دانشمندان اور خطباء کے ذریعہ مختلف موضوعات منجملہ اعتقادی' تربیتی' اقتصادی' وغیرہ جیسے عظیم اور مہم مسائل پر نماز جمعہ پڑھنے والوں کے درمیان یہ گفتگو ہوتی رہی ہے اور ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ بھی دوسرے لوگوں تک یہ آواز پہنچتی رہی ہے۔

ہم نے بھی "اعتقادی نظام اور ارزش اسلام میں توحید کی اہمیت" کے موضوع پر تقریریں کیں ہیں، جو الحمد للہ چھپ کر قارئین کرام تک پہنچ چکی ہیں، فی الحال بعض احباب اور دوستوں کی فرمائش اور ان کے اصرار پر "اسلام کے سیاسی نظریات" کے عنوان کے تحت چند نشستیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور امیدوار ہیں کہ خداوند عالم اس سلسلہ میں ہماری مدد فرمائے، اور جو بھی اس کی مرضی ہو اور امت اسلام کے لئے مفید ہو وہ ہمیں الھام کرے، اور ہماری زبان پر جاری کرے، تا کہ شہید پرور اور حزب اللہی امت تک ہم اس کو پہنچا سکیں، ہماری اس بحث کا عنوان بہت وسیع ہے، اس کے اندر مختلف موضوعات کی بحثیں کی جاسکتی ہیں چاہے وہ عمیق ہوں یا سادی اور رواں۔

اگر چہ اس سلسلہ میں امام خمینی کی تحریک کے آغاز (یعنی 1341 ہجری شمسی) سے لے کر آج تک بہت سی گفتگو ہوتی رہی ہے اور مضامین و کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، اس طرح بہت سی تقاریر بھی ہوتی رہیں ہیں، لیکن معاشرہ کے متوسط فہم لوگوں کے لئے بہت ہی کم اس طرح کے منظم مطالب بیان کئے گئے ہیں، بہر حال احباب کا اصرار تھا کہ ان مطالب کو اس ترتیب سے بیان کیا جائے تا کہ سبھی لوگ اس سے استفادہ کر سکیں، اور مختلف لوگوں کی خصوصا جوان طبقہ کی ضرورت کو پورا کر سکے، الحمد للہ ہماری قوم تمدن کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے، خصوصا آخری چند سالوں میں ہمارے معاشرے اور ماحول نے بہت زیادہ ترقی کی ہے، اور بہت سے دقیق وعمیق مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بہر حال علمی اور ادبی زبان، علمی مراکز (یونیورسٹی اور حوزات علمیہ) سے مخصوص ہے، اور اگر عوام کے لئے گفتگو کرنا ہوتی ہے تو حتی المقدور علمی اصطلاحات نہیں ہونی چاہئے تا کہ اکثر لوگ (چونکہ مطالعہ نہیں ہے) ان ابحاث سے فائدہ اٹھا سکیں، البتہ اس بات کی توجہ رکھنی چاہئے کہ اسلام کے سیاسی فلسفہ

کے تحت جو گفتگو کی جائے گی اتنی مفصل بحث ہے جس کو 100 نشستوں میں بھی بیان کرنا مشکل کام ہے، اس وجہ سے ہم اپنے وقت اور جلسات کی محدودیت کی بنا پر کچھ منتخب مسائل کو چھیڑیں گے، اور جن مسائل کی زیادہ ضرورت ہے، اور جن کے سلسلہ میں سوالات اور شبہات کئے جاتے ہیں، ان کے بارے میں بحث کریں گے۔

یہ توجہ رہے کہ ہمارا موضوع بنام "اسلام کا سیاسی فلسفہ" تین کلموں سے مرکب ہے جس کے ہر ایک کلمہ کے لئے مفصل بحث درکار ہے اور سیاسی فلسفہ کی متعدد اصطلاح ہیں (مثلاً علم سیاست کا فلسفہ و علم سیاست کے مقابل میں فلسفۂ سیاسی) لیکن فلسفہ سیاسی سے ہماری یہاں مراد حکومت و سیاست کے بارے میں اسلامی نظریات کی توضیح و تفسیر ہے جو خاص اصولوں پر قائم ہے، اور اسلامی حکومت کے سیاسی افکار بھی انہیں اصولوں کی بنیاد پر قابل وضاحت ہیں۔

2۔ اسلام اور اس کا سیاسی نظریہ

جس وقت ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ اسلام "سیاست اور حکومت" کے سلسلہ میں ایک خاص نظریہ رکھتا ہے، جو اسلامی اصول و ضوابط پر بنا رکھے ہوئے ہے تو سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا دین سیاست و حکومت کے بارے میں کوئی خاص نظریہ رکھتا ہے تاکہ اسلام اس سیاسی نظریہ کو بیان کرے؟ یہ ایک ایسا مشہور سوال ہے جو صدیوں سے مختلف ممالک اور مختلف معاشرہ میں ہوتا آیا ہے، ہمارے ملک میں بھی یہ سوال مورد بحث چلا آیا ہے خصوصاً مشروطیت کے زمانے سے آج تک اس سوال پر کافی زور دیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں مختلف طریقوں سے بحث بھی ہو چکی ہے، البتہ امام خمینیؒ کے بیانات کے پیش نظر اور مرحوم شہید مدرس کے مشہور و معروف جملہ کہ "ہمارا دین عین سیاست اور ہماری سیاست عین دین ہے" جس نے ہمارے ذہن میں نقش بنا لیا ہے، اور یہ مسئلہ ہم لوگوں کے لئے واضح اور روشن ہو چکا ہے، اور ہم اپنے لئے اس سوال کا واضح جواب رکھتے ہیں، لیکن اسلام کے سیاسی نظریہ اور دین کی سیاست میں دخالت جیسے مسائل پر تحقیق اور بررسی کی ضرورت ہے۔

مغربی تمدن میں دین کو جامعیت نہیں دی گئی ہے اور اس کو محدود کر کے پیش کیا گیا ہے کہ دین کا تعلق اجتماعی و سیاسی مسائل سے نہیں ہے، فقط دین کے اندر انسان کا خدا سے رابطہ ہونا چاہئے اور فرد کا رابطہ خدا سے کیا ہے اس اس چیز کو دین کے اندر مغربی تمدن کے نزدیک بیان کیا جاتا ہے، لہٰذا سیاسی، اجتماعی، بین الاقوامی، حکومت اور لوگوں کے درمیان روابط اور حکومتوں کے آپسی روابط یہ سب انسان اور خدا کے رابطہ سے جداگانہ چیزیں ہیں، یعنی ان کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے، لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے دین ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس کے اندر انسان کے فردی مسائل اجتماعی مسائل شامل ہیں اور اس کے اندر انسان کا خدا سے رابطہ اور انسان کا آپس میں رابطہ اور دیگر سیاسی، اجتماعی اور بین الاقوامی روابط بھی شامل ہیں یعنی دین کے اندر یہ ساری باتیں پائی جاتی ہیں، کیونکہ اسلام کے اعتبار سے خداوند عالم تمام دنیا پر حاکم ہے لہٰذا سیاست، اقتصاد (معاش) تعلیم و تربیت، مدیریت اور وہ تمام مسائل جو انسانی زندگی سے متعلق ہیں وہ سب دینی احکام میں شامل ہیں۔

3۔ اسلامی سیاسی نظریہ کا بنیادی ہونا

اب جبکہ ہم نے قبول کرلیا کہ اسلام حکومت اور سیاست کے سلسلے میں اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے، اور حکومت وسیاست کے بارے میں اسلام کی طرف ایک خاص نظریہ کی نسبت دی جاسکتی ہے، اس نظریہ کی ماہیت وکیفیت کے بارے میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں۔

کیا اسلام کا سیاسی نظریہ ایک بنیادی نظریہ ہے یا کسی نظریہ کی تقلید ہے؟ یعنی کیا اسلام نے یہ نظریہ اختراع اور ایجاد کیا ہے اور خدا کے نازل شدہ تمام احکام تعبدی کی طرح اس نظریہ کو پیش کیا ہے یا یہ کہ اسلام نے کسی ایک نظریہ کو لے کر اس کی تائید کر کے پیش کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اسلام نے بہت سے مسائل میں سیرت عقلاء کی تائید کی ہے، جسے اصطلاحاً اسلام میں "امضاء روش عقلاء" کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر عام انسان جس طرح کے معاملات کرتے ہیں مثلاً خرید وفروخت، کرایہ، بیمہ وغیرہ ان کو سیرت عقلائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کہ لوگوں نے ان کو ایجاد کیا ہے اور شارع مقدس نے ان کی تائید فرمائی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ اسی طرح ہے کہ عقلاء نے کچھ حکومت وسیاست کے بارے میں نظریہ قائم کیئے اور ان کو قبول کیا، اور شارع مقدس نے بھی ان نظریات کی تائید کرنے کے بعد قبول کرلیا ہے؟ یا یہ کہ خود اسلام نے اس سلسلے میں اپنا ایک خاص اور اختراعی نظریہ پیش کیا ہے؟ اور دنیا کے تمام نظریات کے مقابلے میں اسلامی حکومت کے بارے میں پیش کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے حکومت اور سیاست کے بارے میں سیاسی واجتماعی زندگی کے لئے بنیادی واختراعی اصولوں پر مشتمل ایک مجموعہ پیش کیا ہے، نہ یہ کہ اسلام کے نظریات تقلیدی اور تائیدی ہیں جو حضرات حکومت کے مختلف اشکالات اور سیاسی فلسفہ سے آگاہی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں مختلف نظریات موجود ہیں جن میں سے ایک نظریہ "تھوکراسی" (الٰہی حکومت) بھی ہے یہ نظریہ عیسوی صدی کے وسط میں یعنی تقریباً ایک ہزار سال پہلے یورپ میں کلیسا (عیسائی کی عبادتگاہ) کی طرف سے پیش کیا گیا مخصوصاً کیتھولک عیسائیوں کے کلیسا کا کہنا یہ تھا کہ ہم لوگ خدا کی طرف سے لوگوں پر حاکم ہیں، اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کا دوسرا فرقہ یہ کہتا ہے تھا کہ حضرت عیسیٰ مسیح کا دین سیاست سے جدا ہے، یعنی دین اور سیاست میں کوئی ربط نہیں ہے۔

بہر حال دوسرے فرقے کا اعتقاد یہ تھا کہ پاپ کو حکومت کا حق ہے، اور خدا کی طرف سے کلیسا کو ایسا صاحب اقتدار ہونا چاہئے جو لوگوں پر خدا کی طرف سے حکومت کر سکے، اور لوگوں کو بھی خدا کے حکم سے پاپ کی اطاعت کرنا چاہئے اس نظریہ کو تھولوکراسی حکومت نام دیا گیا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام عام لوگوں کی ایجاد شدہ حکومت کے علاوہ اپنے خاص نظریہ کے تحت اسلامی اور الٰہی

حکومت کو پیش کرتا ہے تو کیا اس سے یہی تھو کراسی حکومت مراد ہوتی ہے جسے مغرب اور یورپ میں سمجھا جاتا ہے اور الٰہی حکومت ان کے تمدن میں اسی معنی میں پہچانی جاتی ہے؟ اور جس طرح تھو کراسی حکومت میں خداوند عالم نے حاکم کو وسیع پیمانے پر اختیارات دیئے ہیں اور وہ اپنی مرضی کے مطابق لوگوں پر حکومت کرسکتا ہے اور لوگوں پر بھی واجب ہے کہ اس حاکم کی مرضی کے مطابق عمل کریں؟ کیا حکومت الٰہی وولایی کے مطابق بھی جس کا ہم دعوی کرتے ہیں اور اسلام کے ولایت فقیہ کے نظریہ کے تحت کیا ولی فقیہ اپنی مرضی کے مطابق لوگوں پر حکومت کا حق رکھتا ہے اور کیا اس کو یہ بھی حق ہے کہ جس طرح وہ چاہے قوانین بنا کر ان کے ذریعہ لوگوں پر حکومت کرے، اور لوگوں پر بھی اس کی اطاعت واجب ہے؟

یہ سوال بہت اہم ہے اور ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ایک مناسب بحث اور تحلیل کی ضرورت ہے تا کہ اس سلسلہ میں جو غلط فہمی پائی جاتی ہے وہ دور ہوجائے۔

مذکورہ سوال کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جس الٰہی حکومت کے ہم معتقد ہیں اور وہ تھو کراسی حکومت (جو مغرب اور یورپ میں معروف ہے) زمین تا آسمان فرق رکھتی ہے، یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ الٰہی حکومت اسلام کی نظر میں وہی حکومت ہے کہ جس کے عیسائی خصوصا فرقہ کیتھولک خدا اور پاپ بارے میں قائل ہیں۔

سیاسی صاحب نظر افراد نے حکومت کے نظریات کی کثرت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(1) ڈکٹیٹری حکومت (شہنشاہی حکومت)

(2) ڈیموکراٹک (جمہوری حکومت) اگرچہ ان دونوں کی بہت سی قسمیں موجود ہیں لیکن کلی طور پر حکومت کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم ایسی حکومت جس میں حاکم اپنی مرضی سے حکومت کرتا ہے اور خود فرمان جاری کرتا ہے اور مختلف طریقوں سے اپنی حکومت کو چلاتا ہے اور اپنی فوجی طاقت کے ذریعہ لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔

دوسری قسم ایسی حکومت جس میں لوگوں کی رائے دخالت رکھتی ہے اور لوگ اپنی مرضی سے اپنے حاکم کو چنتے ہیں اور حاکم بھی لوگوں کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہوتے ہیں یعنی ان کی حکومت لوگوں کے ارادے اور ان کی چاہت پر موقوف ہوتی ہے۔

4۔ اسلامی حکومت کی حقیقت اور اس کے ارکان

جن لوگوں نے حکومت کے سلسلہ میں مغربی تقسیم کو قبول کیا ہے اور معتقد ہیں کہ حکومت دو حال سے خالی نہیں ہے حکومت یا ڈکٹیٹری ہے یا ڈیموکراٹک اور جمہوریت، اب یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت ڈکٹیٹری حکومت ہے یعنی جو بھی حکومت پر ہو مختار ہے مثلاً ہمارے زمانہ میں ولی فقیہ اپنی طاقت وقدرت اور اسلحہ کے ذریعہ لوگوں پر حکومت کرتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے یا اسلامی حکومت کا کوئی نیا انداز ہے؟ یا اسلامی حکومت کی کوئی تیسری شکل ہے کہ نہ ڈکٹیٹری

ہے اور نہ جمہوریت؟

بہرحال حکومت کی دوگانہ تقسیم ایسی ہیں جن کو تمام لوگوں نے قبول کیا ہے لہٰذا اسلامی حکومت مذکورہ تقسیم سے خارج نہیں ہے یا یہ حکومت ڈکٹیٹری ہے یا جمہوری اگر اسلامی حکومت جمہوری ہے تو اسلامی حکومت کو یورپی حکومت میں پائے جانے والے طور طریقے اپنانا چاہئیں، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسلامی حکومت ڈکٹیٹری حکومت ہوگی جو صرف خاص فرد کی مرضی پر تکیہ زن ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں تیسرے نظریہ کو انتخاب کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا ضرورت ہے اس چیز کی کہ اس اہم سوال کا جواب دیں اور بیان کریں کہ اسلامی حکومت ڈکٹیٹری ہے یا جمہوری یا کوئی تیسری قسم انہیں سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے مقدمات اور اس کے ارکان کیا ہیں؟ وہ کون سے ارکان ہیں کہ جن پر حکومت اسلامی کو توجہ رکھنی چاہئے تا کہ واقعی طور پر حکومت اسلامی ہو سکے؟ جو حضرات ہمارے مذہب اور فقہ کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ اگر نماز کے ارکان میں کوئی ایک بھی رکن چھوٹ جائے چاہے عمداً طور پر چھوڑا جائے یا سہواً چھوٹ جائے اس کی نماز باطل ہو جائیگی در حقیقت ارکان نماز سے ہی نماز ہے اسی طرح اسلامی حکومت کے ارکان ہونا چاہئے کہ اگر وہ ارکان موجود ہوں تو اس حکومت کو اسلامی حکومت کہا جائے گا اور اگر وہ ارکان نہیں ہیں یا اگر ان میں خلل (کمی وزیادتی) پائی جائے تو اس کو حکومت اسلامی نہیں کہا جائے گا۔

انہیں ارکان کی اہمیت کے پیش نظر جن پر اسلامی حکومت موقوف ہوتی ہے، ہم ان ارکان سے آگاہ ہونے کی خاطر ان کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کیونکہ جب ہم ان ارکان کو پہچان لیں گے تو اسلامی حکومت کا معیار و ملاک ہمارے ہاتھ میں آجائے گا کہ جس کے ذریعہ سے ہم اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کے فرق کو مکمل طریقہ سے پہچان لیں گے اسی وجہ سے اس اہم سوال کا جواب بہت ضروری ہے۔

5۔ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ، اس کے اختیارات اور وظایف کی وسعت

اس سلسلہ کا ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے حکومتِ اسلامی کی ایک خاص شکل وصورت معین کی ہے؟ جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ آج کی اس دنیا میں حکومت کے کیا ڈھانچے اور طور طریقے ہیں اور قدیم زمانے میں بھی حکومت کی شکل وصورت ہوتی تھی جو اس وقت نہیں ہے۔

موجودہ حکومتوں کی بعض قسمیں اس طرح ہیں:

1۔ بادشاہی حکومت، مشروطہ و مطلق۔

2۔ جمہوری حکومت (ریاستی یا پارلیمینٹ کی حکومت)۔

3۔ الٰہی حکومت۔

کیا اسلام نے حکومت کی ان شکلوں میں سے کسی ایک کو قبول کیا ہے یا اسلام نے خود ایک خاص شکل معین کی ہے جو

مذکورہ شکلوں سے فرق رکھتی ہے یا یہ کہ اسلام نے حکومت کے لئے کوئی خاص طریقہ کو نہیں اپنایا، اور فقط حکومت کے لئے چند معیار معین کئے ہیں جن کا ہر طرح کی حکومت میں لحاظ کرنا ضروری ہے؟ مثال کے طور پر اسلام کا حکم ہے کہ حکومت میں عدالت کا لحاظ رکھا جائے لیکن عدالت کا کس طرح لحاظ رکھا جائے؟ کیا عدالت زمان و مکان کے اعتبار سے لحاظ کی جائے؟ چنانچہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں کسی بھی وقت زمان و مکان کے اعتبار سے اس طرح کی عدالت لحاظ کیا جاسکتا اور اسلام نے ایک خاص شکل و صورت کی عدالت برتنے پر اصرار نہیں کیا ہے؟! اور اسلام کی نظر میں حکومت کی مناسب شکل اس کے معیار کی رعایت پر ہے۔

اور اگر اسلام نے حکومت کے لئے کسی خاص شکل و صورت کا انتخاب کیا ہے تو کیا اسلام کی نظر میں اس حکومت کا ڈھانچہ ایک ثابت اور پائیدار ڈھانچہ ہے؟ یا یہ کہ اس کا ڈھانچہ غیر پائیدار ہے کہ جس میں اکثر و بیشتر تبدیلی و تغیر ہوسکتی ہے؟

اس طرح کے سوالات اسلامی حکومت کے ڈھانچے اور شکل و صورت کے بارے میں ہوتے رہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کے جوابات بھی دیئے جائیں۔ فلسفہ حکومت کے سلسلے میں ایک دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اسلامی حاکم اور رئیس چاہے وہ کوئی ایک فرد ہو یا ایک گروہ یا ایک مجلس و انجمن کی شکل میں ہو، یعنی اسلامی حکومت کے اختیارات کیا کیا ہیں؟ اور اسی طرح حکومت کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ کیونکہ گذشتہ زمانے اور عصر حاضر کی حکومتوں میں ذمہ داریوں کے لحاظ سے کافی فرق نظر آتا ہے بعض حکومتیں اختیارات اور وظایف کے لحاظ سے کافی محدود ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ بعض حکومتیں فقط لوگوں کی عام حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہیں جو اہم ہوتے ہیں، اور اکثر کاموں میں خود لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن بعض حکومتوں کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں اس کے وظایف اور ذمہ داریاں بھی وسیع ہوتی ہیں اس حکومت کی ذمہ داریاں، بہت مہم اور خطرناک ہوتی ہیں کہ جن کے بارے میں اسے جواب دہ ہونا ہوتا ہے اور ان ذمہ داریوں کو تمام لوگوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا کیونکہ لوگوں کو حق ہے کہ وہ حکومت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں مطالبہ کریں۔

اسی طرح یہ بھی روشن ہونا چاہئے کہ اسلام کے سیاسی فلسفہ کے تحت اسلامی حکومت نے کیا کیا اختیارات و ذمہ داریاں معین کی ہیں اور بلاشبہ یہ اختیارات و ذمہ داریاں مناسب اور متعادل ہونی چاہئیں، جن مقدمات پر کوئی کام موقوف ہو ان مقدمات کو فراہم نہ کر کے کسی کے سپرد کوئی ذمہ داری کی جائے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

بہرحال اسلامی حکومت کے اختیارات اور اس کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ اس اہم سوال کے بارے میں ہم گفتگو کریں گے۔

6۔ اسلامی حکومت میں لوگوں کا کردار اور چند دیگر سوالات

آج کے انہیں اہم سوالوں میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ حکومت اسلامی میں لوگوں کا کردار کیا ہے؟ لوگوں کے اختیارات اور ان کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ انہیں سوالوں میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ صدر اسلام میں حضرت رسول خدا،

حضرت علی علیہ السلام اور حضرت امام حسن علیہ السلام کی حکومتوں کی کیا شکل تھیں؟ اسی طرح بنی امیہ و بنی عباس وغیرہ کی حکومتیں کس حد تک اسلامی تھیں؟

اور جس وقت ہم اسلامی حکومت کی گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد مذکورہ حکومتوں سے کون سی حکومت مراد ہوتی ہے؟ اور تاریخ میں اسلامی حکومت کی تشکیل کس طرح ہوتی آئی ہے کہ نتیجۃً اسلامی حکومت کی یہ شکل اسلامی انقلاب کے ذریعہ ایران میں بھی وجود میں آئی؟

البتہ مذکورہ سوالات کے ضمن میں دوسرے جزئی سوال بھی ہوتے ہیں منجملہ یہ سوال کہ کیا ہماری یہ حکومت سو فی صد اسلامی حکومت ہے؟ اور کیا اس میں اسلامی حکومت کے تمام معیار وضوابط موجود ہیں؟ اور اگر اس میں وہ تمام معیار وضوابط موجود ہیں تو کیا اس حکومت نے ان کی رعایت کی ہے؟ اسی طرح یہ سوال کہ اس حکومت میں کیا کیا نقص ہیں؟

7۔ اسلام کے سیاسی نظریہ کو پہچاننے کے طریقے

قبل اس کے کہ ہم مذکورہ سوالات اور شبہات کا جواب دیں اور فلسفہ سیاسی اسلام میں وارد ہوں اس چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اس روش وطریقے کو پہلے بیان کردیں جس کو مذکورہ بحث کی تحقیق اور بررسی میں اپنائیں گے اس بحث کی متدلوژی (طور وطریقہ) کیا ہے، بہر حال یہ ایک مقدماتی بحث ہے کہ جس کو شروع میں بیان کردینا چاہئے، کیا یہ ہماری بحث کا طریقہ اور عقلی روش ہے؟ یعنی کیا ہم عقلی دلیلوں کے ذریعہ اسلام کے نظریات کو بیان کریں گے؟ یا ہماری روش اور شیوہ بحث تعبدی اور نقلی ہوگا یعنی قرآن وسنت کے تابع ہے؟ گویا اس حکومت کے اصول وضوابط قرآن وروایات سے اخذ کیئے جائیں گے؟

یا یہ کہ اسلامی سیاست ایک تجربہ کی طرح ہے؟ کہ جس کے درست اور غیر درست ہونے کو تجربہ ہی ثابت کرسکتا ہے؟ اس صورت میں ہماری گفتگو کا شیوہ تجربہ ہوگا اور فیصلہ کرنے کا معیار بھی تجربہ ہوگا۔

بہر حال چونکہ ہماری بحث عقلانی پہلو رکھتی ہے اسی وجہ سے اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ عقلی بحث کی کم از کم دو قسمیں ہیں:

(1) جَدَلی طریقہ۔ (2) برہانی اور دلائل کا طریقہ۔

جس وقت ہم کسی گفتگو کو شروع کرتے ہیں اور عقلی لحاظ سے کسی ایک موضوع کی تحقیق کرتے ہیں تو کبھی ایسے اصول ومقدمات سے بحث کرکے مجہول نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جن مقدمات اور اصول کو ہم اور ہمارا مخالف قبول کرتا ہے اس کے مقابلہ میں وہ برہانی راہ وروش ہے کہ جس میں تمام مقدمات بھی مورد بحث قرار پاتے ہیں گویا بحث خود قضایا اولیہ ویقینیات وبدیہیات سے ہوتی ہے تاکہ ان کے ذریعہ ہمارا استدلال اور برہان یقینی اور قطعی قرار پائے، اور ظاہر ہے اگر ہم اس راستہ کو اختیار کریں تو بحث طولانی ہوجائے گی۔

مثال کے طور پر اگر ہم برہان کے ذریعہ ثابت کرنا چاہیں کہ حکومت اسلامی میں عدل وانصاف رعایت ہونا چاہئے تو سب سے پہلے ہمیں عدل کے مفہوم اور معنی کو واضح کرنا ہوگا اور اس کے بعد اس سوال کا جواب دیں کہ عدالت کا کس طرح لحاظ رکھا جائے؟ اسی طرح یہ سوال کہ عدالت اور آزادی ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں یا نہیں نیز اسی طرح یہ سوال کہ عدالت کے معیار کو کون معین کرے؟ کیا عدالت کے معیار کو خداوند عالم معین کرے یا عقل؟

مذکورہ سوالات کے حل ہونے کے بعد یہ سوال ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں عقل کس حد تک فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے؟ کیا عقل کی قضاوت ایک خاص مقدار میں ہے یا مطلق طور پر اس طرح یہ بحث طول پکڑ جاتی ہے یہاں تک کہ اصول اولیہ اور مسائل معرفت شناسی کے بارے میں مورد سوال قرار پاتے ہیں بہر حال ان کو بھی واضح وروشن ہونا چاہئے، خلاصہ یہ عقل کیا ہے؟ اور اس کی دلالت کس طرح کی ہے؟ عقل کس طرح استدلال کرتی ہے؟ اور عقل کا اعتبار اور اس کا حکم کس حد تک قابل قبول ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اگر ہم اس طرح کے مسائل پر تحقیق کریں تو مختلف علوم سے بحث کرنی پڑے گی، جو ایک طولانی مدت چاہتی ہے جو مفقود ہے۔

بہر حال برہانی بحث کرنا اپنی جگہ مقدس اور محترم ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی اشارہ کیا کہ برہانی و استدلالی بحث کرنے کے لئے بہت سے علوم کا سہارا لینا پڑتا ہے اور بہت کم افراد ہی ان علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور علم کے ماہر انسان اس کے محدود مسائل تک ہی رسائی رکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ یہ کام کافی مشکل ہے اور اس طرح کے مسائل کو واقعاً حل کرنے ایک طویل مدت درکار ہے ہم بھی اپنی گفتگو میں اگر اسی برہانی راستہ کو اپنائیں اور الگ الگ مسائل سے بحث کرکے بدیہی اصول اور مبنیٰ تک پہنچیں تو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، لہٰذا اپنی بحث کو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے، اسی وجہ سے جہاں برہانی بحث سادہ اور غیر پیچیدہ ہے وہاں برہانی اور استدلالی بحث کریں گے اور اس کے علاوہ تمام موارد میں جدلی بحث کریں گے کیونکہ جدلی بحث کا مناسب ترین طریقہ ہے۔

درحقیقت یہ ہدف اور نتیجہ تک پہنچنے کے لئے یہ راستہ درمیانی راستہ ہے، یعنی یہ راستہ دوسروں کو قانع کرنے کے لئے عام راستہ ہے، خداوند عالم نے قرآن مجید میں بارہا دشمن کو قانع کرنے کے لئے اور اپنی طرف سے اتمام حجت کے لئے اس کو بیان کیا ہے، اور ہمیں بھی حکم دیا ہے کہ ہم بھی اس راستہ کو اپنائیں اور دوسروں سے اسی کے ذریعہ بحث اور گفتگو کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ... [1]

"حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو، اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث وجدل کرو۔"

---

[1] سورۂ نحل آیت 125

دوسری نشست

اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت

ہم نے پہلے جلسہ میں اسلام کے سیاسی نظریہ کے تحت اس سلسلے کے منتخب مسائل کو بیان کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس سلسلے میں ہم کیا کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، آج ہم خداوند عالم کی مدد سے اس سلسلے میں بحث کریں گے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کتنی مہم اور ضروری ہے۔

1۔ اسلامی انقلاب سے مغرب و مشرق کا برتاؤ

اس بحث کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے لئے ایک نگاہ اپنے ملک اور اس زمانے کے اسلامی ممالک کی تاریخ پر نظر ڈالیں، اور جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ دنیا پرست، قدرت طلب، زور گو افراد ہمیشہ تاریخ میں فتنہ و فساد کے باعث بنے ہیں اور جس طرح انسان کی زندگی ماڈرن ہوتی جا رہی ہے اور حکومتیں قاعدہ و قانون اور علم کی بنیاد پر ترقی کی طرف گامزن ہیں، فتنہ و فساد کی فعالیت بھی عملی تر اور قواعد و ضوابط کے بنیاد پر دقیق تر ہوتی جا رہی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی طاقتیں اس نتیجہ پر پہنچ گئی ہیں کہ دنیا کی دو بڑی سوپر طاقت یعنی مغرب کی ثروتمند طاقت اور مشرق کی مارکسست اور کیمونیسٹ طاقت موجود ہیں اور جنگ کی کامیابی کے بعد دونوں طاقتوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی قدرت سے دوسرے ممالک کو بھی خوف زدہ کیا جائے تا کہ وہ ان کے مقابلہ میں سر نہ اٹھا سکیں۔

اور جب بھی کسی نے ان فتنہ گر اور مفسدوں کے مقابلہ میں سر اٹھایا ہے اسکو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان ظالم و ستم گروں کا مقابلہ کرنے والے انبیاء اور ان کے پیروکار تھے جو کسی بھی زمانہ میں ستم گروں و ظالموں کے مقابلہ میں تسلیم نہیں ہوئے اسی وجہ سے ظالم و ستمگروں نے انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو اپنا دشمن سمجھا اور ان کے ساتھ دشمن جیسا سلوک کیا، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد، خصوصا کلیسا کو جو یورپ میں دینی قدرت کا مظہر تھا میدان سے خارج کرنے بعد یہ گمان کر بیٹھے کہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ان کے مقابلہ میں آسکے۔

لیکن بیسویں صدی کی آخری تین دھائیوں میں غیر یقینی طور پر ایران کے انقلاب کو دیکھتے ہوئے بہت تعجب ہوا، شروع میں تو یہ سوچا کہ کہ ایران کا یہ انقلاب ان دوسری انقلابی تحریکوں کی طرح ہے جو کبھی کبھی اسلامی ممالک میں ہوتی چلی آئی تھیں کہ جن کو کلی طور پر نیست و نابود کر دیا گیا تھا، انہوں نے یہ سوچ لیا تھا کہ ہم اپنے مخصوص تجربات کے ذریعہ اس انقلاب کو

بھی جڑ سے اکھاڑ پھینک دیں گے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا انہوں نے دیکھا کہ یہ انقلاب تو دوسری تحریکوں سے بہت نمایاں فرق رکھتا ہے۔

بہرحال اسلامی انقلاب ایران کے نتیجہ میں اس منطقہ میں ایک بڑی طاقت رونما ہوئی۔ انقلاب اسلامی نے مشرق ومغرب پر بھروسہ نہ کیا اور نہ ہی بغاوت جیسی تحریکوں اور فوجی ٹکراؤ کا سہارا لیا، بلکہ غرب کو ناکام کرتے ہوئے اسلامی حکومت تشکیل دیدی۔

اسلام دشمن طاقتوں کے پاس دینداری سے مقابلہ کا جو کچھ تجربہ تھا وہ سب انقلاب اسلامی کے نابودی کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے، آپ حضرات کے لئے تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہم فقط اشارہ کرتے ہوئے گذرتے ہیں۔

شروع انقلاب میں ملکی حالات کو خراب کرنے کی کوشش کی، اس امید میں کہ یہاں پر ایسی ایک حکومت تشکیل دی جائے جو مغرب کے لئے کام کرے، لیکن انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کی طاقت وقدرت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ یہ گروہوں کو تحریک کرکے انقلاب اسلامی کے لئے کوئی خطرہ ایجاد کریں یہاں تک کہ اپنے مختلف حربے استعمال کیئے منجملہ یہ کہ ایران پر اقتصادی پابندی لگائی عراق کے ذریعہ آٹھ سال تک جنگ تھونپی ان تمام حربوں کے ذریعہ انقلاب اسلامی کو ناکام کرنا چاہتے تھے لیکن خدا کے فضل سے کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

2۔ جوانوں کی گمراہی کے لئے مغرب کا ایک ثقافتی حربہ

چونکہ دشمن کسی بھی میدان میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس کی امید صرف جوانوں پر آکر رکی کہ ایران کے جوانوں کے لئے فرہنگ (کلچر) کے لحاظ سے ایک طولانی مدت پروگرام بنایا جائے، اور اس پروگرام کے تحت مختلف طریقوں سے ملک میں نفوذ کرنا چاہا (کیونکہ اس سلسلے میں ان کے پاس کافی تجربہ موجود تھا) ان کی کوشش یہ تھی کہ ایک ایسا مرکز بنایا جائے کہ جس کے ذریعہ اپنے افکار ونظریات کو نشر واشاعت کی جائے اور اس مرکز کے ذریعہ ملت کے مختلف لوگوں تک اپنی تبلیغاتی لہریں پہنچائی جائیں تا کہ آہستہ آہستہ اپنی مرضی کے مطابق ماحول بنایا جائے، ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں بھی دوسرے پروگراموں کی طرح انہوں نے اپنے علمی حساب وکتاب کے تحت پروگرام بنایا۔

چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ انقلاب کی نسل بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی ہے، اور مستقبل کی نبضوں کو جوانوں کے ہاتھوں میں دیکھا (وہ جوان کہ جو شاہ کے ظلم وستم سے آگاہ نہیں ہیں اور نہ ہی انقلاب سے پہلے والے اور انقلاب کے بعد والے اسلامی رزمندوں کی جانثاروں سے آگاہ ہیں، اور صرف وہ اپنی خواہشوں کے پیروں ہیں ان کی مرادیں کبھی مادیات ہوتی ہیں اور کبھی خواہشات) تو یہ کہ جوان طبقہ جو اس وقت ملت کی اکثریت ہے اس میں کسی طرح سے رسوخ پیدا کیا جائے اور آہستہ آہستہ اپنی مرضی کے مطابق ایسی حکومت بنوائیں جو ان کے نفع کیلئے کام کرے، اور وہ اسی کشمکش میں تھے کہ

پروگرام کو کہاں سے شروع کیا جائے، اور اس جوان نسل کے افکار وعقائد میں کس طرح نفوذ کیا جائے، تاکہ ان کی امیدوں کیلئے زمینہ فراہم ہو سکے، چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں بہت اسٹڈی کی کہ آخر اس قدر لوگ کیوں حکومت اسلامی کے حامی اور وفادار ہیں یہاں تک کہ تمام مشکلات مالی، مہنگائی، بمباری اور دوسری پریشانیوں کو بھی برداشت کرر ہے ہیں پھر بھی حکومت اسلامی کی حمایت سے باز نہیں آتے، ان تمام چیزوں کو دیکھ کر دشمن اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ دین اسلام کے معتقد ہیں۔

3۔فرہنگی تین حربے

کیونکہ ایرانی قوم اہل بیت علیہم السلام کے پیروں ہیں اور ائمہ علیہم السلام اور امام حسین علیہ السلام کو اپنے لئے نمونہ عمل بنایا ہے، اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کے لئے اپنی جان ومال بھی قربان کر سکتے ہیں اور ان کو یہ اعتقاد ان کی ماں نے دودھ میں پلایا ہے، اور جب تک زندہ رہیں گے، یہ عقیدہ ان کہ دلوں میں باقی رہے گا مگر دشمن اس عقیدہ کو کم رنگ کرنا چاہتا ہے، اور دشمن کی تمنا یہ ہے کہ آئندہ آنے والی نسل میں اس طرح کا عقیدہ باقی نہ رہے اور اس طرح اسلامی حکومت اور اسکے ذمہ دار افراد سے بدظن کردیں، کیونکہ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دین اسلام ہمارا حاکم ہے، اور حکومت کے حقدار علماء اور دیندار افراد ہیں جن کی سرپرست ولی فقیہ، ہے، اور جب تک یہ عقیدہ جوانوں کے درمیان موجود ہے اس حکومت اسلامی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

چنانچہ دشمن نے سوچا کہ اس اعتقاد کو ختم کرنا چاہئے لیکن کس طرح؟ ظاہر ہے کہ یہ افکار روشن فکر طبقہ کے ذریعہ ہی ان تک پہنچائے جاسکتے ہیں، لہٰذا یونیورسٹی اور ثقافتی مراکز کے درمیان ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے ذریعہ یہ افکار ملت تک پہنچائے جائیں، اور ایسے افراد کو بروئے کار لایا جائے جوان کے افکار کو پھیلائے اور حداقل لوگوں کے دلوں میں خصوصاً جوان طبقہ میں شک ووسوسہ پیدا کریں اور اسلامی حکومت، ولایت فقیہ کی نسبت ان کے عقائد کو ڈاماڈول اور کم رنگ کیا جائے، جوانوں میں حکومتِ اسلامی کی نسبت عقیدہ کو کم رنگ کرنا ہی ان کا مطلوب ہے کیونکہ اگر ان کے دلوں میں شک پیدا ہو گیا تو پھر کوئی دوسرا 13/ سالہ نوجوان کمر سے بم باندہ کر ٹینک کے نیچے نہیں جائے گا، یہ کام تو اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب آخرت اور حساب وکتاب پر ایمان ہو اور اپنے صحیح راستہ کو جانتا ہو، لیکن اگر شک پیدا ہو جائے تو کافی ہے ایک قدم آگے بڑھائے اور پھر پیچھے ہٹ جائے اور یہ شک وتردید دشمن کے لئے کافی ہے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے۔

انہیں مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے زرخرید غلاموں (کہ واقعاً جنہوں نے دھوکہ کھایا) اور اپنے مختلف تجربوں، اور ان لوگوں کے ذریعہ کہ جن کے عقائد واقعاً ضعیف وکمزور ہیں مخفیانہ طور پر ذریعہ اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کیا اور درج ذیل چیزوں کے ذریعہ اپنا کام شروع کیا۔

الف: دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر رائج کرنا

دشمن کا سب سے پہلا کام دین کو سیاست اور حکومت سے جدا کرنے کی فکر کو رائج کرنا تھا اس مسئلہ کی تبلیغ کے لئے

راستہ بعد کافی ہموار تھا کیونکہ صدیوں سے مغرب اور یورپ میں اس سلسلہ میں کافی کام ہو چکا تھا بہت سی کتابیں لکھی گئیں کافی مقدار میں ریسرچ کی گئی تھیں جس کے نتیجہ میں مغربی ممالک میں یہ فکر رائج ہو چکی تھی کہ دین سیاست سے الگ ہے۔

اپنے اسی ہدف کو حاصل کرنے کے لئے ایران میں بھی راستہ ہموار کیا کہ کم از کم کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہو کہ دین سیاست سے جدا اور الگ ہے اگر چہ اس کے لئے تھوڑا بہت راستہ پہلے سے ہی ہموار تھا کیونکہ انقلاب سے پہلے بھی اور انقلاب کے بعد بھی بعض وہ لوگ جو حکومت کے کارکنان تھے ایسا عقیدہ رکھتے تھے، ان کا اعتقاد یہ تھا کہ دین اور سیاست میں ایک بہت بڑی دیوار حائل ہے اور اس چیز کے پیش نظر تقریریں بھی ہوئیں، کتابیں بھی لکھی گئیں، چنانچہ اسی نظریہ کو مزید تقویت ان چیزوں کے ذریعہ جو مغربی ممالک میں کارگر ہو چکی تھیں اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا، دی گئی۔

پس معلوم یہ ہوا کہ دشمن کی ثقافتی کارکردگی میں سے ایک، دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر رائج کرنا ہے، البتہ اس فکر سے تمام لوگ تحت تاثیر قرار نہ پائے کیونکہ جن حضرات نے اس اسلامی حکومت کے لئے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو قربان کیا تھا، مالی قربانی پیش کی ہے، اور تمام مشکلات کو برداشت کیا ہے، آسانی سے اس فکر سے متاثر نہیں ہونگے، کیونکہ ابھی تک ان کے کانوں میں امام خمینیؒ کی دل نشین آوازیں گونج رہی ہیں، اور مرحوم مدرسؒ کی یہ آواز کہ "دیانت ما عین سیاست ما است" (ہماری دینداری اور ہماری سیاست ایک ہی ہے) کو اتنی آسانی سے نہیں بھلا سکتے تھے۔

ب: ولایت فقیہ کا انکار

دشمن اور مغرب زدہ روشن فکری کی کارگردی کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ملت میں یہ فکر ایجاد کریں کہ اگر چہ سیاست اور اجتماعی کاموں میں دین دخالت رکھتا ہے اور معاشرہ میں بھی اسلامی احکامات جاری ہونے چاہئے، اور سیاست میں بھی دینی امور کی طرف توجہ ہونا چاہئے، لیکن اسلامی حکومت کے معنی فقہاء کی حکومت نہیں ہے بلکہ اسلامی پارلیمینٹ میں قوانین کا طے ہونا کافی ہے، بعض قوانین کا دین کے خلاف نہ ہونا اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں دین کے مطابق قوانین جاری ہو گئے اور بس، اسلامی حکومت کے معنی اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

پس دوسرا حصہ دشمن کی سیاست کا یہ تھا کہ اگر تمام لوگوں کو اس بات پر قانع نہ کر سکے کہ دین سیاست سے الگ ہے اور وہ اس بات کے قائل رہے کہ دین اور سیاست باہم ہیں تو ہم کہیں گے کہ دین اور سیاست باہم ہیں لیکن دینی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ دینی احکام جاری ہوں، لیکن ان احکام کا مجری (جاری کرنے والا) کون ہے؟ اس مسئلہ کا دین سے کوئی ربط نہیں، بلکہ احکام دینی کو جاری کرنے کے لئے لوگوں نے جس کا انتخاب کرلیا وہی حاکم ہے، پس اسلامی حکومت کا مطلب اسلامی قوانین کا جاری کرنا ہے، نہ کہ حاکم متدین، مومن اور فقیہ ہو، یعنی دین کی سیاست میں دخالت کو قبول کرتے ہیں لیکن دین احکام کا مجری فقیہ اور مجتہد ہو اس کو قبول نہیں کرتے، یا یہ کہ حکوت کا سربراہ ولی فقیہ ہو، غیر قابل قبول ہے۔

اس سلسلہ میں (یعنی ولایت فقیہ کے ذریعہ حکومت نہ ہونے کے سلسہ میں) بہت کوششیں کیں اور اس وقت بھی ان

کی یہ کوشش جاری ہے، مختلف اخباروں، ماہناموں اور دیگر مختلف طریقوں سے ان مطالب کو منتشر کیا جارہا ہے اور اسی سلسلہ میں یونیورسٹی اور دوسرے مراکز میں میٹنگ کرتے رہتے ہیں تا کہ ابھی تک جو متدین حضرات دین کو سیاست سے جدا نہ ہونے کا نظریہ رکھتے ہیں ان کے ذھنوں میں یہ فکر ڈالیں کہ اسلامی حکومت قابل قبول ہے لیکن ولایت فقیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس قسم کا تبلیغی مشن، اسلامی احکامات اور فقہی بنیادوں سے نابلد جوانوں میں مؤثر ہوسکتا ہے خصوصا جبکہ اس سلسلے میں ثقافتی وسائل کے ذریعہ بھر پور تبلیغات کی جائے، اور وسیع مالی امکانات کو اس کے لئے خرچ کیا جائے، لیکن پھر بھی ایسے افراد موجود ہیں جن پر ان کی تبلیغات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور ولایت فقیہ کو جیسا کہ قانون اساسی میں بھی اسی کو محور قرار دیا گیا ہے، اپنی تمام زندگی میں اہمیت دیتے ہیں اور جیسا کہ دنیا بھر میں یہ انقلاب، انقلابِ ولایت فقیہ، اور حکومت، حکومتِ ولایت فقیہ کے نام سے مشہور ہے، اور سبھی ولایت فقیہ کے پابند ہیں۔

ج۔ ولایت فقیہ کو موردِ اعتراض قرار دینا

ظاہر ہے کہ جولوگ ولایت فقیہ کے قائل ہیں ان کے درمیان ان لوگوں نے نفوذ کرنے کا دوسرا طریقہ انتخاب کیا وہ اس طرح کہ لوگوں میں اس فکر کو رائج کیا جائے کہ ایران میں موجودہ ولایت فقیہ مخدوش (قابل اعتراض) ہے، اور اس پر تجدید نظر کی جانی چاہئے اور یہ ولایت فقیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ڈیموکراسی (جمہوریت) اور لیبرالیزم کے اصولوں سے میل نہیں کھاتی، ولایت فقیہ کو اس طرح ہونا چاہئے کہ دور حاضر میں موجودہ ڈیموکراسی سے ہم آہنگ ہو، اور آج کی دنیا میں جو اصول وضوابط مسلم اور قابل قبول ہیں ان سے ولایت فقیہ متفق ہو، پس دشمن کی تیسری فکری سازش جمہوری اسلامی ایران میں ولایت فقیہ کو مخدوش کرنا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ عالمی استکبار اور دشمن اسلام عملی اور فکری تین طریقوں سے اس اسلامی حکومت کو ضعیف کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے خاص پروگرام بھی بنائے اور آج بھی اس طرح کے پروگرام بناتے رہتے ہیں لیکن ان کی امیدیں آنے والی نسل تھی کہ جس لئے انہوں نے ایک لمبا فکری پروگرام بنا رکھا تھا۔

اور اس فکری پروگرام کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ دین کو سیاست سے دور ہونے کی فکر دے اس امید میں کہ ایک طبقہ اس کو قبول کرے گا۔

دوسرا نظریہ یہ پیش کیا کہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت کا ولایت فقیہ سے کوئی ربط نہیں ہے، یہ نظریہ بھی ایک طبقہ میں قابل قبول ہوسکتا ہے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جولوگ ولایت فقیہ پر ایمان راسخ رکھتے ہیں ان میں یہ نظریہ رائج کریں کہ ولایت فقیہ مورد قبول ہے لیکن ایران میں جو ولایت فقیہ ہے اس کی فعلی صورت کو تبدیل ہونا چاہئے، خلاصہ دشمن ہر ممکن ذریعہ سے کوشش میں

ہے کہ جوانوں کے درمیان شک وشبہ پیدا کرے تا کہ اسلامی حکومت کے سلسلے میں ان کا اعتقاد ضعیف و کمزور ہو جائے، اور اگر ایسا ممکن ہوا تو پھر عالمی استکبار کے نفوذ کے لئے راستہ ہموار ہو جائے گا اور اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت میں نفوذ ہو جائے گا۔

جو لوگ ان تینوں نظریات میں سے کسی ایک کا شکار ہو گئے چاہے وہ کسی بھی جگہ ہوں، کسی بھی مقام ومنزلت پر فائز ہوں گو یا انھوں نے عالمی استکبار کی مدد اور نصرت کی اور استکبار کو اپنے اغراض ومقاصد تک پہنچنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

4۔ دشمن کی مذکورہ سازشوں کے مقابلے میں ہمارا وظیفہ

چونکہ دشمن نے مذکورہ سازشوں میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے لہٰذا وہ حضرات جو اس حکوت کو دل وجان سے چاہتے ہیں (اور الحمد للہ لوگوں کی اکثریت اس حکومت کو دل وجان سے چاہتی ہے اور اس کا نمونہ وہ عظیم مظاہرے ہوتے ہیں جو بعض موقع پر ہوتے رہتے ہیں اور تمام دنیا کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں) ان لوگوں کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ دشمن ان تین طریقوں سے ان کے درمیان نفوذ نہ کرے، اور ان کو ایسی کوشش کرنا چاہئے کہ جس سے لوگوں کا یہ عقیدہ راسخ تر ہو جائے کہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے اور انہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ دوسرے ین اگر سیاست سے جدا ہوں تو ہوں، لیکن اسلام سیاست سے جدا نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اپنے دلوں میں یہ نظریہ راسخ کر لیں کہ حکومتِ اسلامی کا مطلب فقط یہ نہیں کہ پارلیمینٹ میں اسلامی قوانین بن جائیں یا یہ کہ وہ قوانین اسلام کے مخالف نہ ہوں، بلکہ اسلامی حکومت کی حقیقت یہ ہے کہ قانون کو جاری کرنے والے اسلام کے دلسوز اور اسلام کی پہچان رکھنے والے ہوں اور احکام الٰہی کو جاری کرنے میں اپنی پوری توجہ صرف کریں، ورنہ اگر قانون کاغذ پر لکھے جائیں اور اس کو جاری کرنے والے ہی ان قوانین کا پاس ولحاظ نہ رکھیں تو اس سے لوگوں کو کیا فائدہ ہو گا؟

کیا شاہ کے زمانے کے قوانین اساسی میں ایران کا رسمی مذہب شیعہ نہیں تھا؟ لیکن یہ قوانی کچھ بھی کارگر ثابت نہ ہوئے کیونکہ شاہ کی حکومت کافر اور دشمنوں سے بے حد متاثر تھی جس کی وجہ سے اسلامی قوانین پر عمل نہیں ہوتا تھا۔

اگر قوانین صرف کاغذ پر لکھے ہوئے ہوں اور ان کا جاری کرنے والا مومن ومتدین اور قدرتمند نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا، لہٰذا اگر اسلامی پارلیمینٹ میں اسلامی قوانین بنائے جائیں لیکن جو شخص ان قوانین کی نظارت کر رہا ہے وہ اسلام کا دلسوز نہ ہو اور اس قدر قدرت نہ رکھتا ہو کہ ان قوانین کو جاری کر سکے، تو ایسے قوانین کو جاری ہونے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، لہٰذا دوسری ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم روز بروز ولایت فقیہ کے اعتقاد کو پختہ تر کریں، تا کہ ہمارے یقین میں بھی اضافہ ہو اور ہماری نسلوں میں بھی یہ عقیدہ باقی رہے کہ ولایت فقیہ کے بغیر اسلامی حکومت ناممکن ہے۔

ان دو مرحلوں کے بعد تیسرے مرحلے کی باری آتی ہے کہ یہ ولایت فقیہ کی موجودہ شکل وصورت جو اس وقت ایران

می تقریباً 20 سال سے ہے یہ وہی شکل وصورت ہے جس کو اہل بیت علیہم السلام نے بیان کیا ہے یا یہ کہ اس کی شکل وصورت کو عوض ہونا چاہئے؟

یہ تیسرا مرحلہ ایک فرعی مرحلہ ہے کہ جو گذشتہ دو مرحلوں کے بعد ہے لہٰذا پہلے ان دو مرحلوں پر بحث کرنا ضروری ہے اور انہیں دو مسئلوں کی بنیاد پر ہماری بحث اسلام کے سیاسی نظریہ کے تحت تشکیل پاتی ہے۔

5۔ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں بہترین راستوں کا انتخاب

مذکورہ مطالب سے واضح ہوجاتا ہے کہ دشمن نے اپنی تمام تر طاقت اپنی مندرجہ ذیل سازشوں میں صرف کردی:

1۔ دین وسیاست میں جدائی کرنا۔

2۔ اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ میں جدائی کرنا۔

3۔ ایران میں ولایت فقیہ کی کارگردگی میں شک وتردید کا ایجاد کرنا۔

لہٰذا طبیعی طور پر ہمارا ابھی تین گروہوں سے مقابلہ ہے پہلا گروہ وہ ہے کہ جس نے یہ قبول کرلیا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے یعنی مساجد، امامبارگاہ جدا ہیں اور سیاست وحکومت جدا ہے، لہٰذا ان لوگوں سے بحث کرنے کے لئے ہمیں ایک خاص راستہ اپنانا پڑے گا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اسلامی حکومت کو تو قبول کیا ہے لیکن اس کے احکام کے مجری کے سلسلے میں چوں وچرا کرتے ہیں، ان لوگوں سے بحث کرنے کا انداز دوسرا ہونا چاہئے، کیونکہ اگر فرض کریں کہ کوئی خدا ہی کا قائل نہیں ہے تو اس سے بحث اس طرح شروع کی جائے تاکہ خدا کا اثبات ہوسکے اور اس کے بعد نبوت عامہ (تمام انبیاء کی نبوت) اور نبوت خاصہ (حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت) کے بارے میں بحث کی جائے لیکن اگر کوئی خدا اور بعض انبیاء کو قبول کرتا ہو لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا منکر ہو تو اس سے نبوت خاصہ کے سلسلہ میں بحث کی جائے گی۔

بہر حال جو لوگ خداوند عالم کو قبول کرتے ہیں لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو قبول نہیں کرتے تو آنحضرت کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ پہلے خدا کے اثبات سے بحث شروع کی جائے کیونکہ اس کے لئے یہ طے شدہ ہے کہ کوئی خدا ہے اور اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء کو بھیجا ہے اسی طرح دوسرے مسائل میں بھی مناسب راستہ اپنانا چاہئے اور جس سلسلہ میں ہم بحث کرنا چاہتے ہیں وہ ایسے اصول اور مقدمات پر موقوف ہے کہ بعض لوگ قبول کرتے ہیں اور بعض لوگ ان کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے۔

لہٰذا مذکورہ بحث کے سلسلہ میں ہمیں بھی چند طریقوں سے بحث کرنا ہوگی اور اس کے لئے مختلف روش درکار ہیں یعنی ممکن ہے بعض جگہ فقط عقلی دلیلوں کے ذریعہ اپنا مدعیٰ ثابت کریں اور جس چیز کو انسان کی عقل درک کرتی ہے اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کا سہارا نہ لیں، ایسی صورت میں عقلی برہانوں کے ذریعہ بحث کو آگے بڑھائیں گے بالکل اسی طرح کہ اگر کوئی خدا

کو نہ مانتا ہو اور اس کے سامنے خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہو تو ایسے موقع پر قرآن اور معصومین علیہم اسلام کی احادیث کے ذریعہ اثبات کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ وہ ابھی خدا کو ہی نہیں مانتا، تو قرآن وحدیث کو کس طرح قبول کرسکتا ہے؟!

اس کو سمجھانے کے لئے فقط عقل سے کام لینا پڑے گا اور اس کو عقلی دلیلوں کے ذریعہ خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہوگا، اسی طرح جن لوگوں نے اسلامی حکومت کو قبول کیا ہے وہ لوگ ایک قدم آگے ہیں تو ان لوگوں سے بحث کرنے کے لئے ایسا راستہ اپنانا پڑے گا جو دینی باتیں قبول کرتے ہیں ان کے سامنے وہ دلیلیں بیان کریں جو مجتوائے دین کو بیان کریں یعنی ان سے بحث کرنے کے لئے قرآن وحدیث اور تاریخی شواہد کو مدرک قرار دینا ہوگا۔

لیکن اگر حکومت کی کارگردگی کی بحث کی جائے تو تاریخی شواہد ومدارک کو مدنظر رکھ کر بحث کی جائے یہاں پر عقلی نقلی وتعبدی (قرآن وسنت) بحث نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ہماری بحث بھی مختلف پہلو رکھتی ہے لہٰذا ہماری بحث بھی مختلف طریقوں سے ہوگی، بعض جگہ عقلی طریقہ سے بحث ہوگی اور بعض جگہ قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث ہوگی، اور بعض دوسری جگہ پر تاریخ کا سہارا لیا جائے گا، یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ بعض افراد بحث کے درمیان ہم پر اعتراض نہ کریں کہ یہ بحث عقلی ہے یا شرعی؟ اس وجہ سے پہلے یہ عرض کردینا مناسب سمجھا کہ ہماری بحث کے مختلف طریقے ہوں گے، بحث کو اس کے مناسب طریقہ سے مورد تحقیق وبررسی قرار دیا جائے گا۔

6۔ دین کی تعریف اور اس کی حدود

یہاں پر ایک دوسرا اہم مسئلہ بھی ہے جس پر مستقل طور پر جداگانہ بحث ہوسکتی ہے لیکن اس وقت صرف اس کی طرف اشارہ کریں گے:

یہاں پر بحث یہ ہے کہ دین کی حدود کہاں تک ہیں؟ جس وقت ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ حکومت ودین میں کیا ربط ہے اور دین وسیاست کا جدا کرنا صحیح ہے یا نہیں۔

تو سب سے پہلے خود دین کی معرفت حاصل کرنا ضروری ہے کہ دین کیا ہے دین کی صحیح تعریف ہمارے پاس ہونا چاہئے تاکہ اس کی بنیاد پر ہم اس کی حدود معین کرسکیں، اس سلسلے میں بعض لوگوں نے سعی فرمائی ہے مگر ایک دوسرے عنوان سے، وہ اس طرح کہ آیا انسان کو دین کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس چیز کو مورد بحث قرار دیتے ہیں اور اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دین کی انسان کی زندگی میں کیا دخالت ہے اس مرحلہ کی تحقیق وبررسی کے بعد ان لوگوں نے اس بحث کو مورد بحث قرار دیا کہ اسلام میں سیاست، دین کا جز ہے یا نہیں؟ بہر حال ان لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت سی بحثیں کی ہیں، جیسا کہ آپ حضرات بھی ان بحثوں سے کم وبیش واقف ہیں۔

"مثلاً دین سے ہماری امیدیں" یعنی دین سے ہماری امیدیں حداقل درجہ پر ہیں یا حداکثر درجہ پر (یعنی کیا دین

انسان کی تمام زندگی کے مسائل کو شامل ہوتا ہے؟ یا یہ کہ انسان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو شامل ہوتا ہے، بقیہ امور میں انسانی زندگی کے اکثر مسائل کو عقل وعلم اور لوگوں کی مرضی کے مطابق حل ہوتے ہیں) وہ حضرات جو دین کو حکومت سے الگ گردانتے ہیں جس وقت انہوں نے دین کی تعریف فرمائی تو ایسی تعریف کی جو سیکولر یزم کے عقیدہ کے موافق تھی مثلاً دین کی یوں تعریف فرمائی کہ: دین یعنی انسان کا خدا سے معنوی رابطہ یا اس سے ایک قدم اور آگے رکھا اور کہا دین وہ چیز ہے کہ جو انسان کی آخرت (اگر آخرت کو قبول کرتا ہو) کی زندگی میں مؤثر اور کارگر ہو، یعنی دین کا کام یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو آخرت سے ہم آہنگ کرے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ اگر دین کی اس طرح تعریف کی جائے تو پھر یہ کہنا بہت آسان ہے کہ دین کا سیاست سے کیا رابطہ؟ سیاست کا خدا سے انسانی رابطہ کا کیا دخل؟ سیاست تو صرف انسانوں کے درمیان ایک دوسرے سے رابطہ کو بیان کرتی ہے، اور سیاست دین سے الگ ہے، سیاست انسان کی دنیاوی زندگی سے متعلق ہے اور اس کا عالم آخرت سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور اگر دین کی حدود صرف یہ ہوں کہ جہاں انسان کی عقل سمجھنے سے قاصر رہے اور جہاں عقل خود فیصلہ اور قضاوت نہ کرسکتی ہو تو پھر وہاں دین سے کوئی رابطہ نہیں کیونکہ دین کی حدود وہاں تک محدود ہیں کہ جہاں پر عقل کی رسائی اور پہنچ نہ ہو۔

لہٰذا اگر ہم نے دین کی مذکورہ تعریف کے مطابق اس کی حدود کو محدود کر دیا اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ جن مسائل کو ہماری عقل حل کرسکتی ہے وہاں دین کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور ہم کو دین کی ضرورت وہاں ہے کہ جہاں ہماری عقل مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے سے عاجز ہو، چنانچہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جارہا ہے اور انسان ترقی کررہا ہے دین کی ضرورت کم ہوتی جارہی ہے چونکہ اس بنیاد پر دین کی ضرورت وہاں ہے کہ جہاں عقل ان مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے سے عاجز ہے۔

چونکہ شروع میں انسان علم وتمدن نہیں رکھتا تھا، لہٰذا اس کو دین کی ضرورت بہت زیادہ تھی اور چونکہ انسان خود اپنی عقل سے مسائل کو نہیں سمجھ سکتا تھا لہٰذا اس کو دین کی ضرورت تھی اور آہستہ آہستہ اس کو دین کی ضرورت کم ہوتی گئی، اور اس آخری زمانہ میں انسان کو دین کی ضرورت تقریباً نہیں ہے، ہاں بعض ان جزئی مسائل میں ہے جن کو عقل انسان ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہے اور کوئی امید بھی نہیں ہے کہ ان کو جلد ہی حل کرلیا جائے گا، ان مسائل میں ابھی بھی دین کی ضرورت ہے، (افسوس کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور پھر یہ اعتراض اور اشکال کرتے ہیں کہ اس وقت چونکہ عقل بشری کامل ہوگئی ہے، لہٰذا اب دین ووحی کے قوانین کی ضرورت نہیں ہے) بہر حال مذکورہ دین کی تعریف کے مطابق نتیجہ یہ ہوگا کہ سیاست کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور جب ہم عقلی کوششوں اور عقلی استدلالوں کے ذریعہ تمام سیاسی مسائل کو حل کرسکتے ہیں، تو پھر دین کیا ضرورت ہے؟

المختصر یہ کہ اب تک جو ہم نے بیان کئے وہ اس سلسلے کے چند اعتراضات اور اشکالات تھے، اور اب ہم اس کا مختصراً جواب عرض کرتے ہیں اور شروع ہی گوش گذار کردیں کہ دین کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی بنیاد پر دین کو فقط اخروی زندگی

سے مربوط اور خدا سے انسانی رابطہ مانتے ہیں ہماری نظر میں باطل اور بے بنیاد ہے، اور یہ نظریہ کہ دین سے سیاسی مسائل کا یعنی انسان کے سیاسی مسائل کا خدا سے کوئی ربط نہیں، یہ ساری چیزیں انسان اور خدا کے روحانی رابطہ سے جدا گانہ ہیں، یہ بھی بے بنیاد اور بے ہودہ گفتگو ہے اور اس کا حقیقت دین سے کوئی ربط نہیں، یہ دین کی نامکمل تعریف ہے، بلکہ دین وہ طریقہ ہے جو انسان کو صحیح رفتار و کردار پر گامزن رکھے یعنی اس طرح انسان کو بنادے کہ جس طرح خدا چاہے، یعنی اگر انسان اپنے اعتقاد اور اپنی فردی واجتماعی زندگی میں خدا کی مرضی کے مطابق قدم اٹھائے تو ایسا شخص دیندار ہے اور اسکے مقابل اگر انسان کا عقیدہ خدا کی مرضی کے مخالف ہو اور ان عقائد کو قبول کرے جو خدا کو ناپسند ہیں اور اس کی انفرادی واجتماعی زندگی کے اعمال ورفتار خدا پسندانہ نہ ہوں، تو اس کا دین بھی ناقص ہوگا، خلاصہ یہ کہ دین تمام مذکورہ چیزوں کو شامل ہے۔

7۔ دینی طریقوں سے دینی معرفت کی ضرورت

اگر ہم دین کی تعریف کرنا چاہیں تو ہمیں دیندار اور دینی بزرگوں کی تعریف دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات نے دین کی کس طرح تعریف کی ہے؟ اور اگر ہم خود اپنے ذہن سے دین کی تعریف کریں اور من گھڑت تعریف کی بنا پر کہیں کہ سیاسی اور اجتماعی مسائل دین سے خارج ہیں یا یہ کہ سیاسی واجتماعی مسائل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے جیسا کہ دین کی ہم نے تعریف کی ہے نہ جیسا کہ خدا نے دین کو بھیجا ہے، پس ہمارے لئے ضروری ہے کہ دین خدا کی معرفت اور اسکو سمجھنے کے لئے خود اپنے طور وطریقہ اور اپنی فکر کے مطابق دین کی تعریف نہ کریں بلکہ دین کی معرفت اور شناخت کے لئے ضروری ہے کہ دینی منابع و مآخذ کے ذریعہ دین کے بارے میں تحقیق کریں۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ کہے: میں دین کو نہیں مانتا، کیونکہ اسلام کے صحیح ہونے پر جو دلیلیں قائم ہوئی ہیں وہ ضعیف ہیں یا (نعوذ باللہ) یہ کہے کہ ہمارے پاس اسلام کے جھوٹ اور باطل ہونے پر دلیل موجود ہے، اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے، تو یہ دعوی منطقی اور صحیح نہیں ہے، البتہ اگر کوئی اسلام کو قبول کرے، اور پھر وہ کہے کہ جو میں کہتا ہوں وہی دین ہے نہ یہ کہ جو قرآن، پیغمبر اور ائمہ کہتے ہیں اور جس کے مسلمان معتقد ہیں، اگر کوئی اسلام کے حق یا ناحق ہونے کے بارے میں بحث کرے چاہے وہ اس کی طرفداری کرے یا اس کی رد کرے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اسلام کی معرفت اور پہچان حاصل کرے اور بے شک اسلام کی پہچان کے لئے خدا کے فرمان کی طرف رجوع کرے، جس نے اسلام کو بھیجا ہے، للہذا قرآن کے ذریعہ اسلام کو پہچانا جائے، اس حقیقت کے پیش نظر ہم نے کہا کہ دین کی پہچان، اس کی تعریف اور اس کی فرمانروائی کے دائرے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دینی منابع، یعنی قرآن وسنت کی طرف رجوع کریں، نہ یہ کہ اپنی مرضی کے مطابق یا کسی امریکن اور یورپین (کہ جن کی باتیں ہمارے نزدیک غیر معتبر ہیں) کے کہنے کے مطابق دین کی تعریف کریں۔

للہذا اگر کوئی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہے تو اسے چاہئے کہ اس اسلام کے مطابق گفتگو کرے جس کو قرآن، پیغمبر اور ائمہ علیہم السلام نے بیان کیا ہے، اور اسی اسلام کی بنیاد پر جس کی اصل قرآن وسنت ہے دین کی تعریف اور اس

کے فرمانروائی کے دائرے کو سمجھیں نہ یہ کہ کسی مستشرق (مشرقی زبان دان اور ماہر علوم)، مؤلف اور سیاست مدار کی غرض کے تحت اسلام کی تعریف شدہ تعریف کو اپنائیں یا کسی (یورپی) دائرۃ المعارف (معلومات عامہ کتاب) کے مطابق اسلام کی تعریف کریں ایسے اسلام سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اسلامِ حقیقی کی طرف رجوع کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ دین کی فرمانروائی کا دائرہ انسان کی عقل وفہم پر ختم نہیں ہوتا بلکہ عقل، اسلامی شناخت کے طریقوں میں سے ایک ہے، اور اگر کوئی عربی زبان سے تھوڑی بھی واقفیت رکھتا ہو (اور قرآن کی تفسیر سے چاہے اجمالی ومختصر تفسیر سے آشنا ہو) جس وقت قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے اجتماعی مسائل کو نہیں چھوڑا اور ان کو بیان کیا ہے، پس کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے۔

اگر دین کے معنی قرآن کے مطابق کئے جائیں تو دین میں اجتماعی اور سیاسی مسائل شامل ہیں اور اس میں عبادت وذاتی اخلاقیات کے علاوہ قوانین مدنی، قوانین جزائی (جرائم) اور عالمی قوانین موجود ہیں، اور گھریلو زندگی، شادی بیاہ، تربیت اولاد، کاروبار اور تجارت وغیرہ جیسے مسائل کو بیان کیا ہے، پس کون سی چیز ایسی ہے جو دین سے خارج ہے؟ معاملات، تجارت، اور رہن (گروی رکھنا) کے بارے میں قرآن مجید میں بڑی بڑی آیات موجود ہیں، اگر اسلام کو قرآن کے ذریعہ پہچانے تو پھر کس طرح کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسلام کا اجتماعی سے کیا ربط؟

اگر نکاح وطلاق دین کا جز نہ ہوں، اگر تجارت، رہن خرید وفروخت اور سود دین سے مربوط نہ ہوں، اسی طرح ولایت کا مسئلہ اور ولی امر کی اطاعت دین کا جز نہ ہوں تو پھر دین میں کیا باقی بچتا ہے؟! اور آپ کس دین کی باتیں کرتے ہیں؟ قرآن کریم نے مسلسل ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کی ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جس دین میں اجتماعی وسیاسی مسائل کو شامل کیا جائے ہم اس دین کو نہیں مانتے! ٹھیک ہے نہ مانئے، اسلام کو نہ ماننے والوں کی تعداد کوئی کم نہیں ہے، اس وقت بھی بہت سے لوگ دین کو نہیں مانتے، ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں، لیکن اگر وہ چاہتے ہیں تو آئیں اور ہم سے بحث کریں تاکہ اس اسلامِ کامل کو ان کے لئے ثابت کریں اور اگر نہیں چاہتے تو جو راستہ چاہیں اپنائیں:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ... [1]

"(اے رسول) تم کہدو کہ سچی بات (کلمہ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہو چکی ہے) بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے"

لیکن اگر وہ کہیں کہ ہم اسلام کو قبول کرتے ہیں لیکن پھر اسلام کو ان مسائل پر شامل ہونے کا انکار کرتے ہیں، اور

---

[1] سورۂ کہف آیت ۲۹

اسلام کے اکثر اجتماعی مسائل پر کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ کیا جو کچھ قرآن وسنت میں موجود ہے اسلام نہیں ہے؟ کہ تم لوگ نہ نماز کو قبول کرتے ہو اور نہ ہی دوسری عبادتوں کو؟ تمہارا ایمان نہ اسلام کے اجتماعی مسائل پر ہے اور نہ ہی اس کے سیاسی مسائل پر، نہ تم اسلامی نکاح کو قبول کرتے ہو اور نہ ہی طلاق کو، اور اسی طرح دوسرے احکام کو قبول نہیں کرتے، تو پھر اسلام میں کیا چیز باقی ہے کہ جس اسلام کا تم دم بھرتے ہو وہ کیا ہے؟ یہ باتیں صرف سادہ لوح افراد کے لئے مؤثر ہو سکتی ہیں لیکن دانشمند اور پڑھے لکھے افراد کے لئے بے مایہ اور فضول ہیں، بہر حال دین یعنی انسانی زندگی الٰہی رنگ وڈھنگ کے ساتھ ہونا:

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔[1]

"(مسلمانوں سے کہدو کہ) رنگ تو خدا ہی کا رنگ ہے جس میں تم رنگے ہوئے ہو"

انسانی زندگی الٰہی رنگ وڈھنگ میں بھی ہو سکتی ہے اور شیطانی رنگ وڈھنگ میں بھی، لیکن اگر انسانی زندگی الٰہی رنگ وڈھنگ میں ہو تو پھر واقعاً اسلام کامل ہے، اگر ہم چاہیں کہ الٰہی رنگ وڈھنگ اور اس کی مرضی کے بارے میں گفتگو کریں تو پہلے ہمیں دینی منابع کو پہچاننا ضروری ہے اور اسلام کی شناخت کے لئے قرآن، سنت اور عقل کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اور یہی طریقے اسلام کے تمام عبادی، سیاسی، اجتماعی اور انفرادی مراحل کو شامل ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے کہا کہ قرآن پر ایک سرسری نظر کافی ہے تا کہ ہمارے لئے یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ دین جو قرآن میں موجود ہے اور قرآن دین کا اصل منبع ہے، ممکن نہیں کہ اس اسلام میں سیاسی اور اجتماعی مسائل کو چھوڑ دیا گیا ہو اور قوانین کا مجموعہ سیاسی اور اجتماعی مسائل سے خالی ہو، یہاں تک کہ عبادی مسائل سے بھرپور ہو، اور یہ سلسلہ اسلام سے مرتبط نہیں ہے، کیونکہ وہ اسلام جو قرآن نے بیان کیا ہے ہم اس اسلام کا دفاع کرتے ہیں اور یہ اسلام سیاسی، اجتماعی اور عبادی مسائل کو شامل ہے اور سیاست اسلام کے مہم ارکان اور اس کے فرمانروائی کے اصل دائرے میں سے ہے، اور امریکن اور یورپین رائٹروں کے مطابق اسلام سے ہمارا کوئی ربط نہیں ہے اور اس کو حقیقی اسلام کی حقیقت سے دور اور اجنبی مانتے ہیں۔

---

[1] بقرہ۔ ۱۳۸

تیسری نشست

دین میں سیاست کی اہمیت

(پہلا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

"اسلام کے سیاسی نظریہ" کی توضیح کے ضمن میں اسلامی منابع و مآخذ؛ یعنی قرآن، سنت اور عقل کے تحت ہم نے بیان کیا کہ اسلام نے انسانی زندگی کے اجتماعی و انفرادی مختلف مسائل میں نظریات بیان کئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دنیاوی زندگی میں دخالت رکھتا ہے، اور ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ مختلف نظریات رکھنے والوں سے بحث کا طور و طریقہ بھی مختلف ہونا چاہئے، جو لوگ ہمارے ساتھ بعض عقیدوں میں شریک ہیں ان سے بحث کا طریقہ الگ ہے لیکن جو لوگ ہمارے اعتقادات کے مخالف ہیں ان سے بحث کا طریقہ الگ ہے اور ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ مد مقابل کو قانع کرنے کے لئے کبھی برہانی اصولوں کو بنیاد بنایا جاتا ہے اور کبھی جدَلی طریقہ اپنانا پڑتا ہے اور ہم اس کتاب میں دونوں طریقوں سے استفادہ کریں گے، اور ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ اسلام سیاست کے بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتا ہے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس نظریہ کو پہچانیں اور اس کو عملی جامہ پہنائیں، انقلاب اسلامی کے ارکان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسلام سیاسی مسائل میں دخالت رکھتا ہے، اسی وجہ سے ہمارا یہ انقلاب "اسلامی انقلاب" کے نام سے مشہور ہوا۔

اسی طرح ہم نے گذشتہ بحث میں بیان کیا کہ اسلام کے سیاسی نظریہ اور اس کے سیاسی پہلو سے دفاع کرنے میں ہمارے مقابل دو گروہ ہیں:

پہلا گروہ: ان لوگوں کا ہے کہ جو اسلام کو نہیں مانتے یا یہ کہ کسی بھی دین کو نہیں مانتے، ان لوگوں کے جواب کے لئے آیات و روایات سے دلیل پیش کرنا بے فائدہ ہے بلکہ ان سے مناظرہ کرنے کے لئے عقلی طریقہ اپنانا پڑے گا، اور سب سے پہلے اسلام کو ثابت کرنا پڑے گا تاکہ ثابت ہوسکے کہ خدا، دین، پیغمبر اور قیامت ہے، اور یہ مسلم ہے کہ اس گروہ سے (جو دین سے بے گانہ ہے) بحث کرنا صرف اعتقادی بحث ہوگی۔

دوسرا گروہ: ان لوگوں کا ہے کہ جو مسلمان ہیں اور دین کو قبول کرتے ہیں یا اگر اسلام پر اعتقاد نہیں ہے، مگر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اسلام، سیاست سے بے گانہ ہے اور اسلام کا سیاست سے کوئی ربط نہیں ہے، اس گروہ کے مقابلہ میں ہم کو چاہئے کہ اس اسلام کی تحقیق و بررسی کریں جس کے مسلمان معتقد ہیں اور دیکھیں کہ

یہ اسلام سیاسی نظریہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اس گروہ کے مقابلے میں ہمیں صرف عقلی روش سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی شناخت کے لئے اسلامی اصولوں پر توجہ کریں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور اس کے بعد اسلامی منابع؛ یعنی قرآن، سنت اور عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کریں کہ قرآن، سنت اور سیرت رسول اور ائمہ کی سیرت اور ان کے فرمان کے مطابق اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے یہ کہ اسلام کی سیاسی دخالت پر بزرگان دین کی سیرت موجود ہے یا نہیں؟

2۔ سیاست کی تعریف اور اسلام میں تین طاقتوں کی اہمیت

ہم پہلے سیاست کی واضح و روشن تعریف کرتے ہیں تاکہ واضح و روشن ہو جائے کہ قرآن مجید میں سیاست کے بارے میں گفتگو موجود ہے یا نہیں؟

سیاست یعنی قوم و ملت کو ادارہ کرنے کا طور و طریقہ، یا معاشرہ کو اس طرح تنظیم کیا جائے کہ اس کی ترقی اور پیشرفت ہو سکے، اور اس کے تمام مصالح اور ضروریات کو پورا کر سکے، یا بہ الفاظ دیگر: سیاست یعنی ملکی نظام چلانے کا قانون۔

البتہ سیاست سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ جس کے اثرات منفی ہوں یعنی جس میں فریب کاری، حیلہ بازی اور دوسروں کو دھوکہ دینا پایا جائے۔

سیاست اور ملکی نظام کے سلسلے میں "مانٹسکیو" کے زمانے سے حاکم گروپ کو تین طاقتوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔ "قوۂ مقننہ"، قانون گذار پاور (پارلیمینٹ)

2۔ "قوہ مجریہ"، قانون کو جاری کرنے والی طاقت (صدر یا وزیر اعظم)

3۔ "قوہ قضائیہ"، (عدالت یا کورٹ پاور)

قانون گذر پاور کی ذمہ داری یہ ہے کہ ملت کو ادارہ کرنے، اور ان کی مناسب و بہتر زندگی کے لئے قانون بنائے تاکہ عدل و انصاف برقرار رہے اور معاشرے پر نظام حکومت کر سکے، اور کوئی ایک دوسرے کے حقوق کو پامال نہ کر سکے، پوری قوم ترقی اور کامیابی کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی نظر آئے، اور قوہ مجریہ کا وظیفہ یہ ہے کہ پارلیمینٹ میں بنائے گئے قوانین کو نافذ کرے اور یہی گروہ حکومت کی شکل پاتا ہے، قوہ قضائیہ کا کام یہ ہے کہ کلی قوانین کے تحت لوگوں کے درمیان موجودہ اختلافات اور جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔

مذکورہ تقسیم بندی کے تحت جو وظائف تینوں طاقتوں کے لئے شمار کئے گئے ہیں ان کے بارے میں قرآن کے نظریات کیا ہیں اور شرعی لحاظ سے ان کی اہمیت کس قدر ہے اور کیا اس سلسلے میں قرآن اور اسلام نے کچھ خاص قوانین و دستورات بیان کئے ہیں؟ البتہ توجہ رہے کہ قوانین سے ہماری مراد اجتماعی قوانین ہیں نہ کہ انفرادی احکام و قوانین کہ جو دین میں مسلم ہیں۔

اجتماعی قوانین میں مدنی (شہری) قوانین، عدالتی قوانین، تجارتی قوانین اور حکومت کا لوگوں سے روابط کے ضوابط

نیز بین الاقوامی قوانین شامل ہیں، اگر ہم صحیح معنوں میں قرآن پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں مذکورہ تمام قوانین مل جائیں گے قرآن مجید میں شہری قوانین، نکاح وطلاق کے احکام، تجارت ومعاملات کے قوانین، قرض ورھن اور عدالت کے مسائل (یہ تمام چیزیں اس چیز کی حکایت کرتی ہیں کہ اسلام نے معاشرہ کو ادارہ کرنے کے لئے یہ احکامات پیش کئے ہیں) کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خاص حقوق بیان کئے ہیں تا کہ خاص مواقع پر زمان ومکان کے پیش نظر کچھ احکام وضع کریں اور مومنین کو بھی حکم ہوا ہے تا کہ آنحضرت کی اطاعت وپیروی کریں، ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ط.... [1]

"اور نہ کسی ایماندار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ کسی ایماندار عورت کو کہ جب خدا اور اس کے رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کو اپنے اس کام (کے کرنے یا نہ کرنے) کا اختیار ہو"

اس آیہ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی تقسیم وارادہ پر اعتراض کریں، پس معلوم یہ ہوا کہ خدا کے مسلم قوانین کے علاوہ اسلامی حکومت میں زندگی بسر کرنے والوں کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنائے ہوئے قوانین بھی لازم الاجراء ہیں، یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے اور کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ آنحضرت کی نافرمانی کرے، کیونکہ جو شخص آنحضرت کے قوانین کی مخالفت کرے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے:

1۔ یا تو وہ پیغمبر کو خدا کا رسول نہیں مانتا، ایسے شخص سے ہمارا کوئی مطلب نہیں ہے، ہم تو اس سے گفتگو کرتے ہیں جو آنحضرت کو خدا کا رسول مانتا ہو اور اس چیز کا بھی قائل ہو کہ آنحضرت کو خدا کی طرف سے قانون بنانے کا حق دیا گیا ہے، اسی وجہ سے خدا نے یہ نہیں فرمایا:

وَمَا كَانَ لِكَافِرٍ وَلَا كَافِرَةٍ۔

بلکہ خداوند عالم کا ارشاد تو یہ ہے

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ۔ [2]

2۔ یا یہ کہ آنحضرت کی نبوت کا اعتقاد رکھتا ہے لیکن رسول اسلام کو اس طرح کا حق ملنے کے بارے میں بحث کرتا ہے؛ ایسے شخص کے لئے ہم قرآن مجید سے دلائل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اسلامی حکومت میں رہنے والے ہر مومن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا معتقد انسان خدا کے احکامات کو لازم الاطاعۃ جانتا ہے بالکل اسی طرح سے رسول اسلام کے

---

[1] سورۂ احزاب آیت ۳۶

[2] سورۂ احزاب آیت ۳۶

بنائے ہوئے قوانین کو بھی لازم الاطاعۃ ماننا ضروری ہے اور تمام مومنین پر آنحضرت کی اطاعت وولایت ثابت شدہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ۔ [1]

"نبی تو مومنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں"

پس قرآن کی نظر سے رسول اسلام کے لئے قانون کا بنانا اور اس کو اجراء کرنے کا حق مسلم الثبوت ہے،، لیکن یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا یہی مرتبہ رسول اسلام کے بعد کسی دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے یا نہیں؟ البتہ اس بحث کو کسی دوسری جگہ پر کیا جائے گا اس وقت ہماری بحث اسلام کے بارے میں ہے کہ اسلام سیاسی نظریہ رکھتا ہے یا نہیں؟

3۔عدالتی احکام قرآن کی نگاہ میں

قضاوت اور عدالتی احکام یعنی خدا کے کلی احکام کو اختلافی اور جھگڑے وغیرہ جیسے مسائل پر منطبق کرنا، اس سلسلے میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ [2]

"پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں پھر (یہی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ خوش خوش ان کو مان لیں"

آیہ مذکورہ میں نہ صرف یہ کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے قضاوت ثابت ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قضاوت ودادوری کو قبول کرنا شرط ایمان ہے، چونکہ آیت کے شروع میں قسم کھائی گئی ہے لہٰذا اس مطلب کی مزید تاکید ہوجاتی ہے کہ مومنین کو چاہئے کہ اختلافی مسائل میں آپ کے فیصلے اور حکم کو دل وجان سے قبول کریں، اور آپ کے دیئے ہوئے فیصلہ پر ناراض نہ ہوں، اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ پر اعتراض کیا اور اس کو دل وجان سے قبول نہ کیا تو پھر وہ حقیقی مومن نہیں ہے۔

جی ہاں! حقیقی مومن وہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت اس کے برخلاف کوئی فیصلہ دے تو اس کو دل وجان سے قبول کرے اگرچہ یہ احتمال بھی ہو کہ اس کا حق ضائع ہوا ہے کیونکہ قاضی گواہوں اور دوسرے شواہد کی وجہ سے ظاہری حکم کرتا ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا:

---

[1] سورۂ احزاب آیت ٦

[2] سورۂ نساء آیت ٦٥

إِنَّمَا أَقْضِي بَيْنَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَالْأَيْمَانِ۔ [1]

میں تمہارے درمیان قسم اور دوسرے شواہد کی بنا پر فیصلہ کرتا ہوں۔

ممکن ہے کہ کوئی گواہ ظاہراً عادل اور معتبر ہو اور اس کی گواہی قبول ہو؛ اگر اس کی گواہی جھوٹ پر مشتمل ہو یا گواہ سے کوئی بھول چوک یا غلطی واقع ہوئی ہو لیکن اگر یہ طے قرار پائے کہ قاضی کے فیصلہ کو قبول نہ کیا جائے اگرچہ خلاف واقع بھی ہو تو پھر بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اسلامی حکومت نہیں چل پائے گی۔

قرآن سے جو نتائج نکلتے ہیں اور قرآن مجید کا جزائی امور جیسے دیت، قصاص اور تعزیرات (سزا دینا) وغیرہ کا بیان اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام سیاست وحکومت میں سب سے بڑی دخالت رکھتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ اسلام نے مجرم اور مفسد کے لئے "حد" (اسلامی سزا) معین کی ہے اور قاضی کو اس حد تک اجازت دی ہے کہ مفسد اور مجرم پر حد جاری کرے اگرچہ کوئی مخصوص شکایت کرنے والا نہ ہو، چونکہ ایسی صورت میں گویا حقوق الٰہی کو پامال کیا گیا ہے (لہٰذا اس کو سزا دی گئی ہے)

بعض مقامات پر تو اسلام نے بہت سنگین اور سخت سزا معین کی ہیں کہ جس کی بنا پر بعض لوگوں کے لئے ان کا قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے، مثلاً قرآن مجید میں حکم ہوا کہ اگر اسلامی معاشرے میں کسی نے زنا کیا اور قاضی کے نزدیک چار عادل گواہوں نے گواہی دی اور وہ جرم قاضی کے نزدیک ثابت ہو چکا ہے تو زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک سو سو تازیانے لگائے جائیں، اور قرآن نے اس سلسلہ میں خصوصی طور پر تاکید کی ہے تاکہ قاضی عواطف ومحبت سے متاثر نہ ہو، اور ان کے ساتھ مہربانی ومحبت سے پیش نہ آئے، ارشاد ہوتا ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللهِ۔ [2]

"زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو (سو) کوڑے مارو اور اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم خدا کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا رحم کا لحاظ نہ ہونے پائے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کسی پر ایسی "حد" جاری ہو گئی تو اس کی عزت وآبرو ختم ہو جاتی ہے لیکن معاشرہ اور سماج ان تمام برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

چوری کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللهِ وَاللهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ [3]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۲۷ ص ۲۳۲، اصول کافی جلد ۷ باب ان القضاء بالبینات والایمان حدیث نمبر ۱

[2] سورۂ نور آیت ۲

[3] سورہ مائدہ آیت ۳۸

"چور خواہ مرد ہو یا عورت تم ان کے کرتوت کی سزا میں ان کا (داہنا) ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ (ان کی سزا) خدا کی طرف سے ہے اور خدا تو بڑا زبردست حکمت والا ہے"

پس نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید نے رسول خدا کے لئے مقام قضاوت، قوم و معاشرے کی فلاح و بھبودی کے لئے حق قانون گذاری اور حدود سزا دینے کا حق معین فرمایا ہے، اگر کوئی شخص واقعاً انصاف رکھتا ہو اور قرآن اور معصومینؑ کی معتبر روایت پر ایمان رکھتا ہو اس پر یہ بات واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام سیاسی و اجتماعی مسائل میں دخالت رکھتا ہے، لیکن اگر کوئی بغض و عناد کی وجہ سے ان حقائق سے چشم پوشی اور ان کا انکار کرے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چمکتے ہوئے سورج کا منکر ہو۔

4۔ سلام کا ہمہ گیر ہونا اور اسلامی حاکم کی اہمیت

قرآن مجید نے وسیع سیاسی مسائل، حکومتی قوانین، قانون گذاری اور اس کو خاص موارد پر منطبق کرنا اور قوانین کے اجراء کرنے کے علاوہ فرعی اور جزئی قوانین کے بارے میں بھی وضاحت کی ہے مثلاً سال کے مہینوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۔ [1]

"اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا نے جس دن آسمان و زمین کو پیدا کیا (اسی دن سے) خدا کے نزدیک خدا کی کتاب (لوح محفوظ) میں مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہے ان میں سے چار مہینے (ادب و) حرمت کے ہیں یہی دین سیدھی راہ ہے"

مذکورہ آیت میں سال کے بارہ مہینوں کی تقسیم تکوینی لحاظ سے اور خلقت کے نظام پر منطبق ہیں، اور اس طرح کے مطالب دین میں ذکر ہونا، دین کے صحیح اور مستحکم ہونے کی نشانی ہے، اسی طرح قرآن مجید میں چاند کو دیکھنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۔ [2]

"(اے رسول) تم سے لوگ چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ کیوں گھٹتا بڑھتا ہے) تم کہہ دو کہ اس سے لوگوں کے (دینوی امور اور حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں"

اس وجہ سے اجتماعی و عبادی احکام تکوینی نظام پر منطبق ہوتے ہیں اس کے علاوہ، بہت سے حقوقی احکام ماہ رمضان کا آغاز، حج کا زمانہ اور دوسری عبادی احکام چاند دیکھنے پر متوقف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید دین کو فطرت اور نظام خلقت سے ہم آہنگ اور منطبق بتاتا ہے:

---

[1] سورۂ توبہ آیت ٣٦

[2] سورۂ بقرہ آیت ١٨٩

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ [1]

"تو (اے رسول) تم باطل سے کترا کے اپنا رخ دین کی طرف کئے رہو، یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی (درست کی ہوئی) فطرت میں (تغیر) تبدل نہیں ہوسکتا"

اور چونکہ الٰہی قوانین فطرت الٰہی کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں لہٰذا یہ قوانین مسلم ہیں اور ان میں تبدیلی نہیں آسکتی، البتہ یہاں توجہ رکھنی چاہئے کہ اسلام کے بعض احکام وقوانین ایسے ہیں جو کسی خاص زمان ومکان کے لحاظ سے تبدیل ہوسکتے ہیں لیکن ان مسائل کو طے کرنا یا ان کو معین کرنا حاکم شرع کی ذمہ داری ہے، وہ حاکم شرع کہ جس کی مشروعیت اور طاقت خدا کی طرف سے ہے، قرآن مجید نے اس باعظمت منصب کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مقرر فرمایا ہے اور شیعہ عقائد کے لحاظ سے ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی یہ منصب ہے (جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے) اور ان کے بعد یہ مقام ولی فقیہ کے لئے معین ہوا ہے (ولی فقیہ کے بارے میں دوسرے موقع پر تفصیل سے بحث کریں گے، انشاء اللہ)

لہٰذا یہ اعتراض کہ دین کا اجتماعی مسائل سے کوئی مطلب نہیں، اور یہ کہ دین صرف آخرت سے مربوط ہے، یعنی انسان کے خدا سے رابطہ کا نام ہے یہ اعتراض بالکل ختم ہوجاتا ہے، اور نہ یہ اعتراض دین سے مربوط ہے، البتہ اس دنیا میں کوئی ایسا بھی دین ہوسکتا ہے کہ جس پر مذکورہ اعتراض وارد ہوسکتا ہو، لیکن ہماری بحث اس دین سے نہیں ہے، بلکہ ہماری گفتگو اس دین کے بارے میں ہے جس میں سال کے مہینوں تک کو بیان کردیا گیا ہو جس میں معاملات اور مالی روابط کے بارے میں اس طرح تاکید کی گئی ہو کہ اگر کوئی شخص ایک دوسرے کو قرض دے تو اس کو لکھ لیا جائے یا دو گواہوں کے سامنے قرض دیا جائے، اور اگر لکھنا یا گواہ لینا ممکن نہ ہو تو کوئی چیز گروی رکھ لی جائے، (قرآن مجید میں رہن کے جواز کے بارے میں جو بیان ہوا ہے وہ ایسے ہی مقامات کے لئے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قرض دے اور اس سے کوئی نوشتہ یا سند نہ لے سکے تو اس سے کوئی قیمتی چیز بعنوان گروی لے کر اس کو قرض دے دیا جائے)

لہٰذا ہم معتقد ہیں کہ دین اسلام سیاست، حکومت اور لوگوں کی مادی اور معنوی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پروگرام رکھتا ہے۔

ہم نے گذشتہ جلسہ میں دین کی اس تعریف کو جس میں دین کو فقط انسان کے خدا سے رابطہ میں منحصر کیا گیا تھا اس کی ردّ کرتے ہوئے حقیقی دین کی تعریف کی تھی اور ہم نے عرض کیا تھا کہ دین کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی پر الٰہی جلوہ ہو جو انسان کے تکامل کا راستہ بیان کرے اور اس کو مبدأ ومعاد کی طرف متوجہ رکھے پس دین انہیں راستوں کے اختیار کرنے کا نام ہے اور بغیر کسی شک وشبہ کے ایسا دین زندگی کے کسی ایک حصہ مثلاً عبادت اور دوسرے عبادی کاموں میں منحصر نہیں ہوسکتا، بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے کیونکہ انسان کی تخلیق کی وجہ یہ ہے کہ انسان ابدی اور ہمیشگی سعادت کو حاصل

---

[1] سورۂ روم آیت ۳۰

کر سکے اسی بنا پر اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو الٰہی احکامات سے ہم آہنگ کرے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی براہ راست عبادت اور اصطلاحی عبادت دین کا بعض حصہ ہے اور ہماری زندگی کے دوسرے فکری و عملی پہلو خدا کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے، اور جب ہمارے سارے کام مرضی معبود کے مطابق ہو جائیں گے تو یہ تمام کام بھی عبادت بن جائیں گے اور انسان اس طرح زندگی کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچ جائے گا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ [1]

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں"

اس آیت کا مطلب یہ کہ انسان خدا کی عبادت و پرستش کی بنا پر کمال کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

لہٰذا انسان کے تمام اعمال وافعال اسی قاعدے اور قانون کے تحت ہونا چاہئے، یہاں تک کہ اس کا سانس لینا بھی اسی قاعدہ کے تحت ہونا چاہئے اور اگر انسانی زندگی نے الٰہی رنگ کو اپنا لیا ہے اور اسی سانچہ میں ڈھل گیا، تو وہ انسان واقعاً دیندار ہے اور اگر خدا کی عبادت اور اس کی پرستش کے دائرے سے خارج ہو گیا تو وہ شخص بے دین اور مرتد ہو جائے گا، وہ لوگ جن کی زندگی کا بعض حصہ خدا کی مرضی کے خلاف ہو اور خدا کی عبادت سے بے خبر رہتے ہیں، وہ لوگ واقعی دیندار نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ارتداد کی سرحد پر رہتے ہیں ان لوگوں کا دین ناقص ہے، کیونکہ دین کے ناقص ہونے کے بھی درجات ہیں لہٰذا ہم کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ جو حضرات واقعاً دیندار ہیں اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں احکامات الٰہی کی رعایت کرتے ہیں، پس وہ لوگ جو زندگی کے بعض حصوں میں احکام الٰہی کی رعایت کرتے ہیں وہ ان کے مرتبہ کے برابر نہیں ہیں، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ایمان اور دینداری کے بھی بہت سے مراتب اور درجات ہیں اور انسان ان میں ترقی کر سکتا ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰـهُمْ تَقْوٰىهُمْ۔ [2]

"اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو خدا (قرآن کے ذریعہ) مزید ہدایت کرتا ہے اور ان کو پرہیزگاری عطا کرتا ہے"

جو لوگ ہدایت پا چکے ہیں خداوند عالم ان کی ہدایت اور تقوے میں اضافہ کرتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا۔ [3]

---

[1] سورۂ ذاریات آیت ۵۶

[2] سورۂ محمد آیت ۱۷

[3] سورۂ انفال آیت ۲

"سچے ایماندار تو بس وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ہل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور بھی زیادہ کر دیتی ہیں"

جی ہاں ایسے بعض حضرات موجود ہیں جن کے ایمان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور تکامل کی طرف بڑھتے رہتے ہیں تا کہ ایمان کی بلند منزلوں تک پہنچ سکیں اور اولیاء الٰہی میں شمار ہونے لگیں، ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جو پستی کی طرف جاتے رہتے ہیں اور دینداری میں پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اغیار و بے گانوں کے اعتراضات واشکالات کو سن کر نامناسب ماحول کی طرف بڑھ جاتے ہیں اور جس دین کو ماں باپ یا کسی استاد سے سیکھا تھا اس کو کھو بیٹھتے ہیں، کیونکہ جن لوگوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ مسائل کو اچھے طریقہ سے سمجھ سکیں اگر وہ اعتراضات واشکالات میں وارد ہوتے ہیں تو منحرف ہو جاتے ہیں، قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ...[1]

"(مسلمانو!) حالانکہ خدا تم پر اپنی کتاب قرآن میں حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سن لو کہ خدا کی آیتوں کا انکار کیا جاتا ہے اور اس سے مسخرا پن کیا جاتا ہے تو تم ان (کفار) کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں غور کرنے لگیں اور تم بھی اس وقت ان کے برابر ہو جاؤ گے"

انسان کو چاہئے کہ پہلے اپنے علم اور عقلی وفکری بنیادوں میں اضافہ کرے اور اعتراضوں کے جوابات اور ان کا تجزیہ وتحقیق کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے، اس کے بعد کسی کے اعتراضات وشبہات پر کان دھرے، اور دوسرے کے اعتراض کو سن کر خود کو انحرافات کے خطرے میں نہ ڈالے، اسلام یہ نہیں کہتا کہ کسی سے کشتی نہ لڑو، بلکہ اسلام کی نظر تو یہ ہے کہ پہلے کشتی کے فن سے واقف ہو جاؤ بعد میں کشتی لڑو، اور اگر چاہو کہ کسی بھاری پہلوان سے کشتی لڑو تو پہلے اپنے وزن اور پریکٹس میں اضافہ کرو اسی طرح اسلام یہ نہیں کہتا کہ دوسروں کے اعتراضات کو نہ سنو بلکہ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جس قدر اشکالات واعتراضات کی تجزیہ وتحقیق اور تشخیص کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو، وہاں تک اشکالات کو سنو، یعنی پہلے معارف الٰہی حاصل کرو پھر شبہات کے جوابات دینے کا طریقہ سیکھو اس کے بعد دوسروں سے بحث ومناظرہ کرو تا کہ دشمن تم کو شکست نہ دے سکے اور اپنے عقائد کو تم پر تھوپ نہ کر سکے۔

5۔ مذکورہ بحث کا خلاصہ

ہماری بحث وگفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام، تمام سیاسی پہلوؤں پر شامل ہوتا ہے لہٰذا ہماری تمام زندگی دین کے مطابق ہونا چاہئے، زندگی کا کوئی بھی گوشہ دین سے خارج نہ ہو؛ چاہے وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، خاندانی زندگی ہو

---

[1] سورۂ نساء آیت ۱۴۰

یا ازدواجی مشترکہ زندگی، ماں باپ سے اولاد کے روابط ہوں یا امت اور امام کا رابطہ، یہاں تک کہ دوسرے مذاہب سے رابطہ کیسا ہونا چاہئے کن افراد سے رابطہ رکھنا صحیح ہے اور کن لوگوں سے رابطہ رکھنا صحیح نہیں ہے، اور اگر ہم قرآن مجید کی آیات پر ایک نظر ڈالیں (درحالانکہ روایات کی طرف رجوع بھی نہ کریں)

توجو شخص تھوڑا بھی انصاف رکھتا ہو اس کے لئے واضح وروشن ہو جائے گا کہ سیاست اسلام کا متن (اصلی رکن) ہے اور ہم بغیر سیاست کے اسلام نہیں رکھتے، اور کچھ لوگ اسلام کو سیاست سے جدا تصور کریں تو گویا ان کا دین دوسرا ہے اور اس کو اسلام کا نام دے دیا ہے وہ اسلام کہ جس کی اصل قرآن وسنت ہے اس کا سیاست سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے۔

چوتھی نشست

دین میں سیاست کی اہمیت

(دوسرا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

گذشتہ نشستوں میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد، اسلام دشمن طاقتیں اپنی پوری جد وجہد اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس اسلامی حکومت سے مقابلہ کے لئے انقلاب کی بنیادی اور مرکزی چیز کا مطالعہ کیا جائے جو "ولی فقیہ" کی ولایت و سرپرستی ہے، اور اس کو اپنے پروپیگنڈے کی تیز دھار کا نشانہ بنایا جائے، چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ گذشتہ چند سالوں سے عصر حاضر تک اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ پر دنیا بھر سے مختلف اعتراض ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح دشمن طاقتوں کے نمائندے ملک میں ولایت فقیہ کے برخلاف تمام تر کوششوں میں مشغول ہیں، ان تمام باتوں کے باوجود اگرچہ ہماری قوم وملت ولایت فقیہ کی حکومت پر بھرپور اعتماد وایمان رکھتی ہے، اور اس حکومت کی ہر اعتبار سے حمایت کرتے ہیں لیکن پھر بھی ضروری ہے کہ مذکورہ مسائل کے بارے میں تفصیلی بحث کی جائے تاکہ اس حکومت کی نظری اور فکری بنیادیں عوام اور بالخصوص جوان نسل کے لئے واضح وروشن ہو جائیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس سلسلے میں تین طرح کے اعتراض کئے جاتے ہیں:

پہلا اعتراض:

پہلا اعتراض یہ ہے کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور ایک سیاسی نظام کسی بھی صورت میں دینی نہیں ہو سکتا، گذشتہ جلسہ میں ہم نے اس اعتراض کا جواب دیا کہ اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ یہ سیکھے کہ اسلام ایک دین اور مذہب ہونے کے عنوان سے کسی سیاست سے منسلک ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب کیلئے قرآن مجید کا اور اس میں بیان کئے گئے احکام وقوانین کا ایک سطحی اور سرسری مطالعہ کافی ہے اور حقیقت میں جو شخص مسلمان ہے اور قرآن پر اعتقاد رکھتا ہے اور اسی طرح وہ شخص جو مسلمان نہیں ہے، لیکن اسلام کی شناخت اور معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا چاہئے، تب اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ دین اور سیاست کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن ہے۔

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلام کی پہچان کا صحیح طریقہ قرآن مجید ہے، جس طرح اگر ہم چاہیں کہ کسی ایک موضوع کے بارے میں عیسائیت کا نظریہ معلوم کریں تو اس کیلئے ہمیں انجیل کا مطالعہ کرنا پڑے گا، البتہ ہم نے جو کچھ بیان کیا یہ ان

لوگوں کیلئے ہے جو مسائل کو سمجھنے کیلئے صحیح اور منطقی طریقہ اپنائیں چاہے بحث وگفتگو ہو چاہے مطالعہ تحقیق و بررسی ہو، صحیح طریقے کا انتخاب کریں، لیکن دشمن بحث وگفتگو کیلئے صحیح اور منطقی طریقوں سے دور بھاگتا ہے کیونکہ ان کا مقصد صرف مومنوں میں اعتراضات اور شبہات پیدا کرنا ہوتا ہے، تاکہ ان کے ایمان کو ناقص کر دیں چونکہ ان کی بحث وگفتگو منطقی نہیں ہوتی کہ ہم اس کا جواب دیں، لیکن پھر بھی اپنا وظیفہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اعتراضات اور شبہات کا منطقی جواب دیں۔

2۔کیا دین سیاست سے جدا ہے؟ (مذہبی وغیر مذہبی لوگوں کا نظریہ)

جن لوگوں نے دین کو سیاست اور حکومت سے ہونے میں غیر مذہبی نظریہ کو انتخاب کیا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں۔ ہم کو قرآن سے کوئی مطلب نہیں اور اسلام پر غیر مذہبی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس سے پہلے کہ ہم اسلامی منابع و ماخذ کی تحقیق و بررسی کریں یا یہ دیکھیں کہ قرآن سیاست سے متعلق کیا کہتا ہے، یہ سوال کرتے ہیں کہ انسان کو دین کی کیا ضرورت ہے؟ اور کن مسائل میں اس کو دین کی راہنمائی کی ضرورت ہے؟

انہوں نے اس مسئلہ سے متعلق اپنے خیال خام میں دو نظریہ فرض کیئے ہیں، پہلا فرض یہ ہے کہ انسان تمام چیزوں میں اور زندگی کے تمام امور میں دین کی ضرورت رکھتا ہو، مثلاً کس طریقہ سے غذا آمادہ کی جائے اور کس طرح سے کھائی جائے، یا کسی طرح مکان بنایا جائے، شادی بیاہ کے کیا طریقے ہیں اور حکومت اور جامعہ کی تشکیل کو ایک ہی صف میں رکھا ہے، اور اس طرح کہتے ہیں، کیا دین کیلئے ضروری ہے کہ ان تمام مسائل کو حل کرے، اور انسان کو علمی اور دقیق مسائل کی تحقیق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور ہم کو اکثر مسائل میں دین کا منتظر نہیں اپنا چاہیئے کہ ہر چیز کی وضاحت دین ہی سے طلب کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کوئی لباس بنانا چاہیں تو پہلے یہ معلوم کریں اسلام کا نظریہ کیا ہے، اور اگر کھانا کھانا چاہیں تو دیکھیں کہ اسلام نے کن کھانوں کی اجازت دی ہے، اور اگر بیمار ہو جائیں اور ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے تو دیکھیں کہ اسلام نے اس سلسلے میں کیا وصیت کی ہے؟ نیز اس طرح اسلام نے حکومت اور سیاست کے بارے میں کیا نظریہ پیش کیا ہے۔

دوسرے فرض یہ ہے کہ دین فقط بعض چیزوں میں دخالت رکھتا ہے اور دین سے ہماری توقعات حداقل درجہ پر ہونی چاہئے اور یہ بات طبیعی ہے کہ دین ہر اعتبار سے انسان کی ضروریات میں نظر نہیں رکھتا، بلکہ کوئی بھی دین یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ انسان کی تمام ضروریات پورا کر سکتا ہے۔

اور جب ہم نے یہ مشاہدہ کر لیا کہ دین ہم کو کھانا بنانا، علاج کرنا، ہوائی جہاز اور کشتی بنانا وغیرہ نہیں سکھاتا تو اب ہم کو یہ دیکھنا ہوگا، وہ مسائل کہ جن کو اپنے سے بیان کیا ہے ان کا دوسرے مسائل سے بھی کیا امتیاز ہے، اور اصلا دین نے کس کس میدان میں وارد ہوا ہے۔

یہ لوگ اپنے خیال خام میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک دوسری قسم کو انتخاب کریں اور وہ یہ ہے کہ دین فقط دینی امور میں ہے دنیاوی امور سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور دین سے ہماری توقعات کم سے کم ہونی چاہئے اور ہم کو چاہیئے کہ جن کے ذریعہ فقط

ان چیزوں اور طریقوں کو پہچانیں کہ جن کے ذریعہ آخرت میں کامیابی، جنت میں جانے، دوزخ سے نجات حاصل کی جاسکے۔ جیسے نماز پڑھنا، روزہ، رکھنا، حج کو انجام دینا اور دوسرے عبادی امور کو دین سے حاصل کریں۔

ان لوگوں نے اپنے خیال خام میں دین وسیاست کے ربط کو اس طرح حاصل کیا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے اور یہ کہا کہ سیاست کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے اور یہ کہ سیاست کا دائرہ دنیوی امور میں ہے، اور دین کا دائرہ آخرت سے مربوط ہے، نہ دین کو سیاست میں دخالت کرنا چاہیے اور نہ ہی سیاست کو دین میں دخالت کرنی چاہیے۔

لہٰذا سیاست وہ ہے کہ جس کا تعلق دنیا اور علم سے ہے، لہٰذا سیاست کو فقط علم اور انسانی ترقی میں دخالت کا حق ہے چاہے اس علم کا تعلق کسی شعبہ ہائے زندگی سے ہو، دنیاوی علوم میں دین کی کوئی دخالت نہیں ہے، دین کی دخالت صرف اُخروی امور میں ہے۔

ان مسائل کا تاریخچہ چند صدی پہلے مغربی ممالک کی طرف پلٹتا ہے کہ جس وقت کلیسائی پادریوں اور علم وسیاست کے لوگوں کے درمیان اختلاف اور تضاد پیدا ہوا، اور آپس میں مدتوں تک اسی سلسلے میں جنگ وجدال ہوتی رہی، اور آخر میں ان کی یہ جنگ وجدال ایک عجیب صلح پر تمام ہوئی، جس میں یہ طے پایا کہ دین فقط آخرت سے تعلق رکھتا ہے دین بھی انسان کا خدا سے رابطہ، اور دنیادی کاموں میں دخالت کرنا اہل سیاست اور اصل علم افراد کے سپرد کیا گیا۔

یہ تمام نظریات مغربی ممالک کے تھے، لیکن بعد میں جو لوگ ان کے تحت تاثیر قرار پائے ان کا کہنا ہے کہ ہمارے اسلامی ممالک میں بھی اس طرح تقسیم ہونا چاہئے مثال کے طور پر اس طرح ہونا چاہئے کہ دین کی باگ ڈور فقط دینی علماء کے ہاتھوں میں ہو اور ان کا نام صرف ضروری کاموں میں حق دخالت ہو، اور دین یا دینی علماء دنیاوی کاموں کو بالکل دخالت نہ کریں، لھذا سیاست کو اہل سیاست حضرات پر چھوڑ دیا جائے اور دینی علماء اور فقہاء کو سیاست میں دخالت کا کوئی حق نہیں، اور اس سلسلے میں بہت سی تقریریں ہوئی، مقالات لکھے گئے، اور اپنے اس نظریہ کی تائید کیلئے ہر ممکن کوشش کی گئی تا کہ ہمارے جوانوں کے درمیان اس اعتراض کو رائج کریں اور اس نظریہ کو تقویت پہنچائیں کہ دین سیاست سے جدا ہیں۔

افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ بعض پڑھے لکھے افراد ناخواستہ طور ان کے نظریہ کے تحت تاثیر قرار پائے، اور آہستہ آہستہ یہ نظریہ لوگوں کے ذہن میں اپنا مقام بناتا جارہا ہے، کہ دین، دنیا کے مقابلہ میں ہے یعنی دین انسانی زندگی کے بعض مسائل کو حل کرسکتا ہے اور دنیاوی امور کا دین سے کوئی رابطہ نہیں، اور جب یہ اعتراضات اور شبہات ہمارے پڑھے لکھے اور مولفین اور مقررین حضرات کے ذریعہ بیان ہوتے ہیں تو واقعاً یہ ہماری ملت اور جامعہ کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

3۔ دنیا اور آخرت میں چولی دامن کا رابطہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ اگر چہ ہماری یہ زندگی دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے دنیاوی زندگی، افروی زندگی، یعنی دنیا میں ہماری زندگی کا ایک حصہ روز پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور موت پر ختم ہوجاتا ہے اس کہ بعد دوسری زندگی عالم برزخ اور عالم

قیامت میں شروع ہوتی ہے، البتہ اس کے علاوہ بھی ایک دوسری زندگی فرض کی جاسکتی ہے اور وہ ہے عالم جنین) لیکن زندگی کی تقسیم کا ملازمہ یہ نہیں ہے کہ ہماری چال چلن دو حصوں میں تقسیم ہو جائے اور دو نظریوں سے دیکھا جائے، بہر حال اس وقت ہم دنیا میں ہیں اور اس دنیا میں دن بھر ہم بہت سے امور انجام دیتے رہتے ہیں دین اس وجہ سے آیا ہے تا کہ ہمارے امور کو سلیقہ عطا کرے، اور اپنے دستوری اور تشریعی نظام کے ذریعہ ہماری رہنمائی کرے، نہ یہ کہ دینی قوانین صرف مرنے کے بعد کیلئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ہماری 50 یا 60 سال کی عمر کا بعض حصہ دنیا سے مربوط ہو اور بعض حصہ آخرت سے، بلکہ ہماری نظر میں دنیا کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو آخرت سے مربوط نہ ہو، بلکہ ہمارے تمام دنیاوی امور ایک طرح سے آخرت سے مربوط ہو سکتے ہیں یعنی دنیاوی امور اس طرح سے انجام پائیں کہ آخرت میں مفید ثابت ہوں، اور ہوسکتا یہی اعمال ہمارے آخرت کے لئے مضر اور نقصان دہ ثابت ہوں، بہر حال گفتگو یہ ہے کہ ہمارے اعمال و افعال آخرت کیلئے مؤثر ہیں اور بنیادی طور پر اسلامی نظریہ بھی یہی ہے کہ آخرت کی زندگی کو اسی دنیا میں سنوارا جاتا ہے:

"الیوم عملٌ ولا حساب وغداً حسابٌ ولا عمل۔"[1]

آج کا دن عمل کرنے کا دن ہے حساب کا نہیں اور روز قیامت حساب کا دن ہے وہاں عمل کی جگہ نہیں ہے۔

"الدنیا مزرعة الاخرة۔"[2]

دنیا آخرت کی کھیتی ہے (جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے لہذا جو کام ہم دنیا میں کریں گے آخرت میں اسی طرح بدلا ملے گا، اور ایسا نہیں ہے کہ دنیاوی زندگی کا اخروی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں ہے یا ہماری زندگی کا کچھ حصہ دنیا سے اور کچھ حصہ آخرت سے متعلق ہے، یعنیہماری زندگی کے الگ الگ شعبے نہیں ہیں، بلکہ اس دنیا میں ہمارے کام اس طرح ہونا چاہئے تا کہ ہمیں آخرت میں سعادت اور کامیابی نصیب ہو مثلاً ہمارا اٹھنا بیٹھنا، سانس لینا، دیکھنا، سننا، گفتگو کرنا، کھانا پینا، میاں بیوی کے تعلقات اور اجتماعی روابط اس طرح ہوں کہ ہماری آخرت سنور جائے، اور ہوسکتا ہے ہمارے یہی کام آخرت میں مضر اور نقصان دہ ہوں، یہ بات مسلم ہے کہ کھانا پکانا اور کھانا کھانا دنیا سے مربوط ہے لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کھانے کا یہی طریقہ جنت میں جانے کا باعث بنے اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے لیئے باعث عذاب ہو

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا۔[3]

"بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق چٹ کر جایا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بس انگارے بھرتے ہیں اور

---

[1] بحار الانوار ج ۳۲ ص ۳۵۴

[2] بحار الانوار ج ۷۰ ص ۲۲۵

[3] سورۂ نساء آیت ۱۰

عنقریب واصل جہنم ہونگے"

جو شخص اپنے پیٹ کو یتیموں کے مال سے بھرتا ہے اگر چہ وہ ظاہراً کھانا کھاتا ہے اور اس سے لذت بھی اٹھاتا ہے لیکن یہی کھانا جو کھا رہا ہے اس کے لئے جہنم کا عذاب بن جائے گا، جس طرح اگر انسان خدا کی عبادت کرنے کے لئے کھانا کھاتا ہے تو اسکا یہی کھانا آخرت میں ثواب واجر کا باعث ہے اسی طرح اگر انسان خدا کی خوشنودی کے لئے گفتگو کرتا ہے تو جنت میں اس کے لئے ایک درخت لگایا جاتا ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: جو شخص بھی تسبیحات اربعہ پڑھے، خداوند عالم اس کے لئے جنت میں ایک درخت اُگاتا ہے (یہ سننے کے بعد)

بعض لوگوں نے کہا: تب تو ہمارے لئے جنت میں بہت سے درخت موجود ہوں گے، کیونکہ ہم تسبیحات اربعہ کو مکرر پڑھتے رہتے ہیں۔

اس موقع پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ٹھیک ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان کو جلانے کے لئے وہاں آگ نہ بھیجو۔

لہٰذا اگر ہمارے اعمال وکردار خدا کی خوشنودی کے لئے ہوں تو آخرت کی سعادت وکامیابی کا سبب ہوں گے، اور اگر ہمارے یہی اعمال خدا کی مرضی کے خلاف ہوں تو آخرت میں بدبختی اور عذاب جہنم کے باعث بنتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ہماری یہ زندگی دو مستقل حصوں پر مشتمل ہو جس کا ایک حصہ آخرت سے مربوط ہو اور مسجد وعبادت گاہوں میں گذارا جائے اور دوسرا حصہ ہماری دنیا سے مربوط ہو جس کا آخرت سے کوئی سروکار نہ ہو۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ نظریہ (دین کی حدود صرف انفرادی، عبادی مسائل اور عبادتگاہ تک ہوں کہ جس کا ثمرہ آخرت میں ظاہر ہوگا اور دوسرے مسائل دین سے خارج ہیں) آخری چند صدی کے درمیان بعض مغربی لوگوں میں بعض ادیان کے ماننے والوں کی طرف سے رائج ہوا ہے اور اس نظریہ نے بہت سے لوگوں کے ذہن کو پراکندہ کردیا ہے، اور نہ صرف یہ کہ اسلام میں یہ مطلب موجود نہیں ہے۔

بلکہ کسی بھی آسمانی برحق دین میں یہ مطلب نہیں پایا جاتا ہے، ہر برحق دین کا نظریہ یہی ہے کہ انسان کی تخلیق اس وجہ سے ہوئی ہے کہ انسان اپنے لئے سعادت یا شقاوت (بدبختی) کو معین کرے، اور انسان کی ہمیشگی سعادت یا ہمیشگی شقاوت اس دنیاوی زندگی کے زیر سایہ حاصل ہوتی ہے، یعنی اگر انسان کی رفتار و، گفتار الٰہی قوانین کے تحت ہو تو ہمیشگی سعادت اس کے شامل حال ہوگی، اور اگر انسان کے کارنامے خدا کی مرضی کے خلاف ہوں تو ہمیشگی شقاوت وبدبختی اس کے دامن گیر ہوگی۔

وہ لوگ جن کا نظریہ یہ ہے کہ دین سے ہماری توقعات کم سے کم ہونی چاہئے، انہوں نے انسانی رفتار وگفتار کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے جس کا ایک حصہ دین سے متعلق ہے اور اس کا دنیا سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسرا حصہ دنیا سے متعلق ہے

وہ دین سے خارج ہے، جیسے سیاسی اور اجتماعی مسائل، البتہ یہ نظریہ صرف ایک مغالطہ اور کج فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر دین سے ہماری توقعات حداکثر ہو تو پھر ہمارے تمام امور دین کے مطابق ہونا ضروری ہیں یہاں تک کہ کھانا پینا مکان بنانا وغیرہ وغیرہ، چونکہ انہوں نے یہ سوچا کہ یہ نظریہ نہ تو صحیح ہے اور نہ ہی دین ان تمام چیزوں کو پورا کرسکتا ہے، لہٰذا یہ لوگ دین سے کم سے کم توقعات کے قائل ہو گئے۔

ان کی یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے اس مسئلہ کی صرف دو قسم تصور کی جب کہ تیسری قسم بھی موجود ہے اور یہی تیسری قسم صحیح ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم دین سے اتنی توقع نہیں رکھتے کہ تمام چیزوں کے بارے میں ہمیں بتائے یہاں تک کہ کھانا کھانے، کپڑے پہننے اور مکان بنانے کا طریقہ بتائے، کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا، اور یہ اس لئے ہے کہ دین نے بہت سے مسائل کے بیان کو سمجھنے کے لئے دنیاوی علوم پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن پھر بھی یہ مسائل کسی نہ کسی اعتبار سے دین سے متعلق ہوتے ہیں، اور یہ اس وقت ہوگا جب یہ مسائل خود ارزش مند اور پر اہمیت قرار پائیں۔

یعنی ان کے اندر وہ پہلو بھی کارفرما ہوں جو دین سے متعلق ہیں مثلاً کھانا کھانا دینی مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی مر رہا ہے، بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھانا واجب ہے، تو اس صورت میں یہ مسئلہ دینی ہو جائے گا۔

4۔ انسان کے دنیاوی اعمال و کردار کی اہمیت

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی سے ایک ربط رکھتی ہے اور ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ انسانی اعمال و کردار اس کے کمال یا پستی کے باعث ہوتے ہیں، اور ہمارا کردار سعادت اخروی میں مؤثر ہوسکتا ہے تو پھر ہمارے یہ افعال واعمال پر اہمیت اور باارزش ہو جاتے ہیں لہٰذا ہم اب یہ دین کو حق دیتے ہیں کہ وہ ہمارے افعال و کردار کے بارے میں قضاوت کرے یا بہ لفاظ دیگر یہ کہا جائے کہ دین ہمارے حلال وحرام افعال کو بیان کرتا ہو دین ان کو انجام دینے کی کیفیت بیان نہیں کرتا، دین تو یہ کہتا ہے کہ بعض چیزوں کا کھانا حرام اور گناہ ہے۔

مثلاً خنزیر کا گوشت اور نشیلی چیزوں کا کھانا حرام ہے لیکن شراب کیسے بنائی جاتی ہے خنزیز کیسے پالا جاتا ہے یہ دین کا کام نہیں ہے، البتہ اسلام نے خنزیر کے گوشت کو حرام اس لئے کیا ہے کہ دینی عبادات و مسائل میں یہ مانع ہے اور دینی احکام چاہے واجب ہوں یا حرام یہ سب وجوب وحرمت مثبت اور منفی اثرات کی بنا پر جعل ہوئے ہیں یعنی احکام کے متعلقات میں انسان کی سعادت اور آخرت پائی جاتی ہے گویا احکام ایجابی وسلبی کے ذریعہ ہمارے افعال و کردار کی اہمیت پتہ چلتی ہے۔

بہ الفاظ دیگر اس طرح عرض کیا جائے کہ انسان کی ترقی اور تکامل کی راہ ایک نقطہ سے لامتناہی نقطے کی طرف شروع ہوتی ہے اس راہ میں جو چیز ہمارے لئے مفید ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا کی طرف متوجہ ہوں اور انسانی معنویت کی بلندی کا زینہ ہموار کریں، درجات کے اعتبار سے چاہے وہ احکام واجب ہوں یا مستحب یا اس کے بعد مباح، اور جو راہیں انسان کو تنزل

اور پستی کی طرف لے جانے والی ہیں اور انسان کو راہ کمال اور خداوند عالم سے دور کرتی ہیں "حرام" ہیں اس کے بعد مکروھات ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دین یہ نہیں کہتا کہ کون سا کھانا کھائیں کس طرح کھانا بنائیں کس طرح مکان بنائیں بلکہ دین اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ مکان غصبی جگہ پر نہ بنایا جائے یا مکان کو اس طرح نہ بنائیں کہ جس سے دوسروں کے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہو، دین یہ کہتا ہے کہ حلال پیسہ سے مکان بنائیں سود کے پیسہ سے مکان نہ بنائیں، درحقیقت مکان کی اہمیت اور اس کی کیفیت کو بیان کرتا ہے اسی طرح دین یہ کہتا ہے کہ ہمارا کھانا ایسا ہو جس سے ہماری ظاہری اور معنوی رُشد و ترقی ہو اور وہ غذائیں جو حرام ہیں یا "الکحل" نشہ آور چیزوں سے پرہیز کریں جو خود ہمارے لئے ضرر رساں اور نقصان دہ ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ...[1]

"اے ایمان دارو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس ناپاک (برے) شیطانی کام ہیں تو تم لوگ اس سے بچے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ، شیطان کی تو بس یہی تمنا ہے کہ شراب اور جوے کے بدولت تم میں باہم عداوت و دشمنی ڈلوا دے اور خدا کی یاد سے باز رکھے"

نتیجہ یہ نکلا کہ دین کی حلال اور حرام کردہ چیزیں انسانی کردار کو بیان کرنے والی ہیں، یعنی ان کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی کردار مثبت پہلو رکھتا ہے یا منفی، اور کیا یہ چیز ہماری سعادت اور کامیابی میں موثر ہیں؟ اور کیا یہ چیزیں خدا تک پہنچنے کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں؟ یا یہ چیزیں انسان کو بدبختی اور ھلاکت کی وادی میں پہنچا دیتی ہیں؟ خلاصہ یہ کہ دین، دنیاوی کردار کے ماورای اس کردار پر توجہ کرتا ہے کہ جس کے ذریعہ انسان جنتی یا جہنمی ہوتا ہے۔

5۔ انسان کے کردار کی اہمیت کو سمجھنے میں عقلی طاقت کی شعاعیں

ہمارے افعال و کردار کی اہمیت ایجاب و سلب کے لحاظ سے (یعنی ہمارے افعال و رفتار و کردار کے لئے ارزش کا اثبات کرنا یا سلب کرنا) کبھی اتنا واضح و روشن ہوتا ہے کہ جس کو عقل بخوبی سمجھ لیتی ہے اور شارع مقدس کی طرف سے تعبدی بیان کی ضرورت نہیں بلکہ عقل خود ہی خداوند عالم کے حکم کو مشخص کر لیتی ہے۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام مستقلات عقلیہ میں فرماتے ہیں: بعض مسائل میں عقل مستقل طور پر فیصلہ کر لیتی ہے اور افعال و اعمال کے حُسن و قبح (اچھائی، برائی) کو معین کر لیتی ہے اور ہم عقل کے ذریعہ سمجھ لیتے ہیں کہ خداوند عالم کا ارادہ فلاں

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۹۰،۹۱۔

کام کے انجام دینے یا ترک کرنے سے متعلق ہے، ہم عقل کے ذریعہ یہ پتا لگا لیتے ہیں کہ خداوند عالم اس کام سے راضی ہے یا نہیں، ہم سبھی کی عقل اس بات کو سمجھتی ہے کہ کسی یتیم کا مال کھانا برا ہے،

اور اس سلسلے میں شارع مقدس کی طرف تعبدی بیان آنا ضروری نہیں ہے، عقل کی تشخیص کے بعد قرآن وحدیث میں بھی اس بارے میں تعبدی بیان آنا یہ حکم عقل کی تاکید کے لئے ہے، لیکن اکثر مقامات پر ہماری عقل ہمارے افعال واعمال ورفتار وکردار کی اہمیت اور پھر ان افعال کی ہماری شقاوت وسعادت میں تاثیر کی مقدار کو درک کرنے سے قاصر ہے، اس طرح کہ ہم اپنے اعمال کے وجوب وحرمت اور استحباب وکراھت کو عقل کے ذریعہ پہچانیں، لہٰذا ایسے مقامات پر دین کو دخالت کرنے کا حق ہے چنانچہ اس وقت دین کو ہمارے اعمال وافعال کے انجام دینے کے احکام بیان کرنا ھوں گے۔

6۔دین کی حدود

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ چیزیں جو ہماری ہمیشگی سعادت یا شقاوت میں مؤثر ہیں صرف ان مسائل میں منحصر نہیں جو براہ راست خداوند عالم سے مربوط ہیں، بلکہ دین، عبادی مسائل کے علاوہ دنیاوی امور میں بھی حق دخالت رکھتا ہے اسی وجہ سے دین نے بعض کھانے پینے والی چیزوں کو حلال یا حرام ہونے کو بھی بیان کیا ہے۔

اور جب ہم دینی احکامات کو ملاحظہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دینی حدود انفرادی مسائل میں محدود نہیں ہیں بلکہ اجتماعی مسائل مثلاً گھریلو مسائل، شادی، طلاق اور تجارت وغیرہ جیسے مسائل کو بھی شامل ہیں، اور ان مسائل کا حلال وحرام ہونا ان کی اہمیت کو بیان کرتا ہے، درحقیقت دین ان امور کی حقیقت کو بیان کرکے ان کی حرکت کی جھت وسمت معین کرا ہے اور نشان دھی کرر ہا ہے کہ ان کے ذریعہ کس طرح سے خداوند عالم کی سمت انسان حرکت کرسکتا ہے اور کون سے امور شطان کی طرف مایل ہونے کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔

علم بعض چیزوں کے بیان کرنے سے قاصر ہے علم صرف یہ بیان کرتا ہے کہ کس چیز کو بنانے کے لئے کن چیزوں کو کس مقدار میں ہونا ضروری ہے اور فیزیکی اور شیمیائی چیزوں کو بیان کرتا ہے لیکن یہ بیان نہیں کرتا کہ ان چیزوں کو کس طرح استعمال کیا جائے تاکہ انسان حقیقی اور واقعی کمال اور سعادت تک پہنچ سکے، ایسے مقامات پر دین کو قضاوت اور فیصلہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا جس طرح ہمارے اعمال ہماری سعادت وبدبختی میں مؤثر ہوتے ہیں اسی طرح سیاسی واجتماعی امور میں ہمارے اعمال ہماری سعادت یا بدبختی میں مؤثر ہوتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ اس حصے میں اور زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔

اب رہی ہماری اصل گفتگو یعنی "اجتماعی امور" کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرہ اور ملت کا چلانا ہماری سعادت یا بدبختی میں کوئی اثر نہیں رکھتا؟، اور اس معاشرہ کے افراد جس طرح بھی چاہیں معاشرہ کے ادارے کے لئے جس کو چنیں، مختار ہیں اور ان مسائل میں دین کوئی دخالت نہیں رکھتا؟ کون ہے جو نہیں جانتا کہ معاشرہ میں عدالت اور انصاف کی رعایت سے انسان کی سعادت اور کامیابی ہے اور عدالت وانصاف سے کام لینا ایک بہت مہم اور مثبت پہلو رکھتا ہے اس سلسلہ میں اگر کوئی آیت یا

حدیث نہ ہوتی تب بھی ہماری عقل اس بات کو سمجھتی ہے کہ عدالت وانصاف کی رعایت کرنے سے انسانی کمال اور سرفرازی میں شایان شان تاثیر رکھتی ہے، جو حضرات ان مسائل کو سمجھنے کے لئے عقل کو کافی نہیں سمجھتے، وہ قرآن واحادیث کی طرف رجوع کریں، البتہ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ سیاسی واجتماعی امور کے بہت سے مسائل کی اہمیت کو عقل سے سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو بھی عقل سمجھیں وہ دین کے دائرے سے خارج ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ جو چیز مرضی خدا کو کشف کرتی ہے اور جو چیز خدا کی حکمت اور اس کے ارادہ کو بیان کرتی ہے اور ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ خدا کی مرضی کیا ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اس امر کو کس راستہ کے ذریعہ کشف کریں، بلکہ مہم یہ ہے کہ ہم خداوند عالم کے ارادہ تشریعی کو کشف کریں، چاہے یہ کشف قرآن وسنت کے ذریعہ ہو یا عقل کے ذریعہ، کیونکہ یہ تینوں دلیلیں خدا کے احکام اور دینی قوانین کو کشف کرتی ہیں اسی وجہ سے عقل کو احکام الٰہی کے منابع میں شمار کیا جاتا ہے اور فقہاء کرام نے عقل کو احکام شرعی کے اثبات کرنے والی دلیلوں میں شمار کیا ہے، چنانچہ شرعی مسائل کو ثابت کرنے کے لئے عقل سے بھی تمسک کرتے ہیں، لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ عقل اور شرع کے درمیان کوئی حد موجود ہو کہ کچھ چیزیں عقل سے مربوط ہوں اور کچھ چیزیں شرع سے، بلکہ عقل ایسا چراغ ہے کہ جس کی روشنی میں خدا کی مرضی اور اس کے ارادہ کو تلاش کیا جاسکتا ہے، لہٰذا جو چیز اس طرح عقل کے ذریعہ کشف ہوگی وہ دینی ہے۔

7۔ دین اور حکومت میں رابطہ

جو کچھ ہم نے اجتماعی اور سیاسی امور کے بارے میں دین کی دخالت کے سلسلے میں عرض کیا اس پر توجہ رکھتے ہوئے اور مختلف قسم کی حکومتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اب تک اس دنیا میں وجود پاچکی ہیں خصوصاً وہ حکومتیں جو اسلام کے نام سے یا اسلامی زمانے میں دوسرے ناموں سے جانی جاتی تھیں، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام ان کے بارے میں مثبت یا منفی نظریہ نہیں رکھتا؟، اگر ہم معاویہ اور یزید کی فاسد اور ظالم حکومت کا حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی عدالت وانصاف ور حکومت سے مقابلہ کریں تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام ان دونوں حکومتوں کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے اور حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے؟

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان آزاد ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی حکومت کے طریقہ کار کو اپنائے؟! اور اس میں دین کی کوئی دخالت نہ ہو، اور انسانی کردار اور اس کی سعادت یا بدبختی میں کوئی دخالت نہیں رکھتا، یعنی کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ نہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت انسان کی آخرت میں کوئی تاثیر رکھتی ہے اور نہ ہی معاویہ کا کردار انسان کی آخرت میں کوئی اثر رکھتا ہے؟! کیونکہ حکومت کا طریقہ کار دنیا اور سیاست سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے! کیا کوئی عقلمند انسان ان باتوں کو قبول کرسکتا ہے؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کی نظر میں یہ دونوں حکومتیں (حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی حکومت) مساوی و برابر ہیں؟ اور دین ان میں سے کسی ایک کی مدح یا مذمت نہیں کرتا؟ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی اور حکومتی جیسے مسائل میں دین کی

دخالت ضروری ہے، دین کو چاہیئے کہ حکومت کے لئے مناسب ڈھانچہ پیش کرے، دین کو بیان کرنا چاہیئے کہ حاکم وقت اپنی حکومت کے آغاز ہی سے کمزور اور غریب لوگوں کی فکر میں رہے نہ کہ اپنی حکومت کو مضبوط بنانے کے چکر میں لگا رہے؟!

نتیجہ یہ نکلا کہ دین میں بالخصوص دین اسلام میں سیاسی واجتماعی مسائل کی ایک بڑی اہمیت ہے اور ان کو دین کے دائرہ سے خارج نہیں کیا جاسکتا، اور اس بات کا اعتقاد صحیح نہیں کہ ان سیاسی اور اجتماعی مسائل کا انسان کی شقاوت اور سعادت میں نہیں اگر انسان کا آخرت، حساب وکتاب اور ثواب وعذاب پر اعتقاد ہے تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاویہ اور یزید کی حکومت وہ تاثیر نہیں رکھتی! اگر چہ بعض اہل سنت برادران، معاویہ کے مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کر سکے ہیں، لیکن تاریخ میں ایسے بہت سے ظالم وجابر افراد گذرے ہیں جنہوں نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر کے رکھا ہے، کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ظالم وجابر لوگوں کی حکومت، عدالت وانصاف ور افراد کی حکومت کے برابر ہیں؟ اسی زمانہ کو لے لیجئے جس میں ہم زندگی گذار رہے ہیں، کیا وہ حکومتیں جو عورتوں اور بچوں کو جن کو ہر مذہب وملت میں بے گناہ مانا جاتا ہے ان کے سر وگردن میں جدائی کریں، ان پر بم گرائیں اور ان کو زندہ درگور کریں، ان حکومتوں کے برابر ہوسکتی ہیں کہ جن کی تمام تر کوشش کمزور اور مظلوم لوگوں کی نجات کے لئے ہوتی ہیں؟ کیا یہ دونوں حکومتیں جنت میں جاسکتی ہیں؟ لہٰذا کس طرح سیاسی واجتماعی مسائل کو دین سے خارج مانا جاسکتا ہے؟ اگر یہ طے ہے کہ دین اسلام حلال وحرام، ثواب وعذاب اور دوسرے دینی مسائل میں اپنی خاص نظر رکھتا ہو تو بدرجہ اولیٰ سیاسی واجتماعی مسائل وہ واضح وروشن مسائل ہیں کہ جن میں دین کا نظریہ ضروری ہے۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نظریہ جس میں دینی مسائل کو دنیاوی مسائل سے الگ کیا جاتا ہے اور دینی مسائل کو صرف خدا اور آخرت سے مخصوص کیا جاتا ہے، اور ان کو دنیاوی دائرہ سے خارج مانا جاتا ہے (یعنی انسان کے بعض امور، دانشمندوں اور سیاسی لوگوں پر چھوڑ دیئے گئے ہیں اور بعض امور، دینی علماء کرام پر چھوڑ دیئے گئے ہیں) یہ نظریہ بالکل غلط اور باطل ہے اور کسی بھی طریقہ سے اسلامی نظریہ سے سازگار اور موافق نہیں ہے، اسلام انسان کیلئے جس زندگی کے بارے میں نظریہ رکھتا ہے اور اسلام جس طرز زندگی کو پیش کرتا ہے اور ہمیں اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس (گذشتہ) نظریہ سے ہم آہنگ وموافق نہیں ہے۔

چھوڑئے ان لوگوں کو جو اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں یہ لوگ نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں اور نہ ہی قیامت پر، ان کی یہ باتیں صرف اور صرف اس وجہ سے ہوتی ہیں تاکہ علماء دین کو اس میدان سے باہر نکال دیں، لیکن ہم کو ان کے ذاتی عقیدہ سے کوئی مطلب نہیں ہماری عرض تو صرف یہ ہے کہ دنیاوی مسائل کو دینی مسائل سے جدا کرنے کا نظریہ اور دنیاوی مسائل کو دینی حدود سے خارج کرنے کا نتیجہ اسلام کے انکار کا سبب بنتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا نتیجہ نہیں رکھتا، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ انسان کا کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جو ہماری سعادت یا بدبختی میں موثر نہ ہو، لہٰذا ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ ہماری تمام زندگی میں دین اپنا نظریہ دے سکتا ہے اور اس کی اہمیت کو بیان کرسکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"مَا مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ عَنِ النَّارِ إِلَّا وَ قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ وَ مَا مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا وَقَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ". [1]

"نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جو تمہیں جنت سے قریب کرے اور جہنم سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تم کو اس کے کرنے کا حکم دیا ہے اور نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جو تمہیں جہنم سے قریب اور جنت سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تم کو اس سے منع کیا ہے"

اسلامی نظریہ کے مطابق سعادت کے معنی جنتی ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں اور بدبختی کے معنی جہنمی ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے:

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ ــــ

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ. [2]

"تو جو لوگ بدبخت ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے اور جو لوگ نیک بخت ہیں وہ تو بہشت میں ہوں گے"

8۔ دین کی جامعیت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق ایک دوسرا نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی یہ کہے: ٹھیک ہے کہ دین حلال و حرام کو بیان کر سکتا ہے لیکن زندگی کے بعض امور کو خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کر دیا ہے اور بعض دوسرے امور کو لوگوں پر چھوڑ دیا ہے بعض وہ چیزیں جو آنحضرت کے زمانے سے متعلق تھیں وہ بیان کر دیں اور باقی چیزوں کو ہم لوگوں پر چھوڑ دیا تا کہ زمان و مکان کے لحاظ سے ہم خود طے کر لیں کہ کون چیزیں حلال ہیں اور کون چیزیں حرام۔

کیونکہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعادت تک پہنچنے والی تمام چیزوں کو بیان نہیں فرمایا جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جس کے ذریعہ تمہاری سعادت کی ضامن ہو مگر یہ کہ میں نے اس کو بیان کر دیا، البتہ آنحضرت کے فرمان کے یہ معنی نہیں کہ آپ نے تمام چیزوں کی جزئیات بھی بیان کر دیں، بلکہ آپ نے کلی چیزوں کو بیان کیا ہے تا کہ آئندہ زمانے میں ائمہ اور مجتہدین جو ایسی صلاحیت رکھتے ہیں کہ جزئی احکام، اور حلال و حرام کو کلی عناوین پر منطبق اور مرتب کر کے ان کے احکام کو معلوم کر لیں، اور ان کو عناوین اولیہ یا عناوین ثانویہ یا حکومتی احکام کے عنوان سے لوگوں کے سامنے پیش کریں، بے شک مصادیق کی تشخیص اور جزئی احکام، انہیں کلی احکام پر منطبق ہیں کہ جو قرآن، سنت اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں ذکر ہوئے ہیں جن کو اصطلاحاً فتویٰ کہا جاتا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ج ۷۰ ص ۹۱

[2] سورہ ہود آیت ۱۰۶، ۱۰۸

پانچویں نشست

اسلام میں آزادی

(پہلا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے اسلام میں سیاست کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ حکومتی اور سیاسی مسائل، معرف اسلامی کا ایک حصہ ہیں اس سے قبل ہم نے اشارہ کیا کہ بعض لوگوں نے جامعہ میں انحراف اور کج روی پیدا کرنے کے لئے نیز لوگوں کے ذھنوں کو پراکندہ کرنے کے لئے اسلامی حکومت کے سلسلہ میں بہت سے اعتراضات کیئے ہیں جن میں سے ایک شبہ یہ تھا کہ دین کا دائرہ دنیا کے دائیرہ سے جدا ہے اور دین دنیاوی مسائل میں کوئی مداخلت نہیں کرتا اور یہ کہ دنیاوی امور میں دخالت کرنا دین کے شایان شان نہیں ہے دین کا کام صرف ان امور سے وابستہ ہے جو آخرت اور منویات سے مربوط ہیں اور انسان کا خدا سے رابطہ کا نام دین ہے، خلاصہ یہ کہ دین سے کم سے کم امید رکھیں اس سے پہلے جلسہ میں ہم نے اس اعتراض کا جواب عرض کیا اور ہم نے "دین سے ہماری امیدیں" کی بحث کے سلسلہ میں اس مغالطہ (کہ دین سے ہماری امیدیں زیادہ ہوں یا کم سے کم) کا جواب مفصل طور پر عرض کیا تھا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی اور اس سے متعلق دوسری واقفیتوں کے دو رخ ہیں: پہلا رخ یہ ہے کہ سببی اور مسببی علت اور معلول رابط موجود ہے جیسا کہ یہ رابطہ تمام چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے، مثلا کون کون سی چیزیں آپس میں مرکب ہوں تا کہ فلاں شمیائی چیز وجود میں آسکے، اور ایک زندہ چیز کن شرائط کے ساتھ رشد و نمو کرتی ہے، یہ انسان جو ایک زندہ چیز ہے کس طرح زندگی کرتا ہے اور کس طرح اپنی صحت و سلامتی کو محفوظ کرتا ہے، اور جب مریض ہو جائے تو کس طرح اپنا علاج کرائے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ اس دنیا کی تمام حقیقتوں کا انسان کی روح اور معنوی کمالات سے رابطہ ہے۔

2۔ علم اور دین کے مخصوص دائرے

الکحل کو کس طرح اور کن چیزوں کے ذریعہ بنایا جاتا ہے اور الکحل کتنے طریقوں کا ہوتا ہے یہ ایک علم ہے اور ایسی چیزوں کی تحقیق اور بررسی کرنا دین کی ذمہ داری نہیں ہے دین کی ذمہ داری یہ ہے کہ بیان کرے کہ الکحل کو پیا جائے یا نہیں؟ اور اس کا انسان کی روح اور معنوی پہلو کے لئے نقصان دہ ہے یا نہیں دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ دین کی ذمہ داری یہ ہے کہ بیان کرنا ہے کہ الکحل کا استعمال کرنا حلال ہے یا حرام؟ اس طرح دین دوسری چیزوں کے احکام کو بیان کرتا ہے، نہ کہ

اس علمی اور تحقیقی پہلو کو بیان کرتا ہے دین ان چیزوں کی ترکیبات سے بحث نہیں کرتا بلکہ وہ تو ان چیزوں اور انسانی روح اور اس کی صلاح واچھائی کے رابطہ کو بیان کرتا ہے اور ان کی تحقیق و بررسی کرتا ہے، کس کارخانہ یا تجارتی گروپ کا منیجر کس طرح صحیح طور پر کام کرسکتا ہے اور کس طرح کے پروگرام بنائے جائیں تا کہ اچھے نتائج برآمد ہوسکیں ان سوالوں کا جواب علم دے سکتا ہے لیکن ان کارخانوں میں کیا چیز بنائی جائے اور کون سی چیز بنانا جائز ہے اور کون سی چیز حرام ہے اور کون سی چیز انسانی روح سے مربوط ہے یہ دین کا کام ہے۔

3۔ دینی حاکمیت کا آزادی سے ٹکراو، ایک شبہ

لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے ایک شبہ جو مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے البتہ یہ شبہ صرف ایک مغالطہ ہے، وہ شبہ یہ ہے کہ اگر دین انسان کے سیاسی اور اجتماعی کاموں میں مداخلت کرے اور لوگوں کو کسی خاص طریقہ کو اپنانے پر زور دے یا کسی کی اطاعت کا حکم دے تو یہ انسان کی آزادی کے خلاف ہے اور انسان چونکہ آزاد اور صاحب اختیار ہے کہ جو چاہے کرے جو چاہے نہ کرے، اور اس کو کسی کام پر مجبور کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے، اور چونکہ دین انسان کے لئے تکلیف معین کرتا ہے، اور اس کو کسی کی اطاعت کا حکم کرتا ہے اطاعت بھی اطاعت مطلق (یعنی چون و چرا) یہ سب کچھ آزادی سے میل نہیں کھاتا۔

4۔ مذکورہ شبہ دینی انداز میں

مذکورہ شبہ کو مختلف شکلوں میں بیان کیا جاتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ شبہ کرنے والا اپنی دینداری کا ڈنکا بجاتا ہے اور خود کو قرآن کا ماننے والا کہتا ہے اور اپنے شبہ کو مومنین اور متدین افراد پر کارگر کرنے کے لئے اس کو قرآنی اور دینی مخمل سے سجاتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام، انسان کی آزادی کا خاطر خواہ احترام کرتا ہے اور قرآن کریم دوسروں کے تسلط اور حکومت کی نفی کرتا ہے یہاں تک کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی پر تسلط (حق حکومت) نہیں رکھتے تھے، اور کسی کو مجبور نہیں کیا گیا لہٰذا قرآن کے نظریہ کے مطابق انسان آزاد ہے اور کسی کی اطاعت پر مجبور نہیں ہے۔

ان تمام شبہات اور مغالطوں کا مقصد، ولایت فقیہ کے اصولوں کو ضعیف اور کمزور کرنا ہے، اسی مقصد کے لئے یہ شبہ ایجاد کیا گیا ہے تا کہ ولایت فقیہ کی اطاعت کو انسانی آزادی کے خلاف قرار دیا جاسکے، اور یہ اسلامی نظریہ کے سراسر مخالف ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات اور زمین پر خدا کا خلیفہ ہے، ذیل میں ان آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو شبہ کرنے والوں نے اپنا مدرک بنایا ہے

(1) خداوند عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمارہا ہے:

فَذَكِّرْ ۔ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ ۔[1]

"تم تو بس نصیحت کرنے والے ہو، تم کچھ ان پر داروغہ تو ہو نہیں"

اس آیت کے پیش نظر، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ سب سے بلند و بالا مقام رکھتے ہیں جب وہ تسلط نہیں رکھتے اور مسلمان آزاد ہیں ان پر پیغمبر کی اطاعت کرنا لازم نہیں ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی زندگی کے بارے میں اظہار خیال کرنے کا حق بالکل نہیں ہے۔

2۔ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۔[2]

"اور ہم نے تم کو لوگوں کا نگہبان تو بنایا نہیں ہے اور نہ تم ان کے ذمہ دار ہو"

3۔ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلَّا الْبَلٰغُ ۔[3]

"(ہمارے) رسول پر پیغام پہنچا دینے کے سوا (اور) کچھ (فرض) نہیں"

4۔ إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُوْرًا ۔[4]

"اور ہم نے (انسان) کو راستہ بھی دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا"

5۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۔[5]

"(اے رسول) تم کہہ دو کہ سچی بات (کلمہ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہو چکی ہے) بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے"

مذکورہ اعتراض کا جواب

اس اعتراض کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ معترض نے جن آیات کے ذریعہ رسول خدا کے تسلط نہ ہونے اور آنحضرت کی اطاعت کو واجب نہ ہونے پر تمسک کیا ہے، ان کے مقابلے میں دوسری ایسی آیات موجود ہیں جو خود معترض کی غلط اور غیر صحیح برداشت کے منافی ہیں ذیل میں ہم ان آیات کو بیان کرتے ہیں:

1۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۔[6]

---

[1] سورہ غاشیہ آیت ۲۱، ۲۲

[2] سورہ انعام آیت ۱۰۷

[3] سورہ مائدہ آیت ۹۹

[4] سورہ انسان آیت ۳

[5] سورہ کہف آیت ۲۹

[6] سورہ احزاب آیت ۳۶

"اور نہ کسی ایماندار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ کسی ایماندار عورت کو کہ جب خدا اور اس کے رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کے اپنے اس کام (کے کرنے نہ کرنے) کا اختیار ہو"

مذکورہ آیت واضح طور پر خدا اور رسول کی اطاعت کو لازم اور ضروری ہونے کو بیان کررہی ہے کہ مومنین کو رسول خدا کی اطاعت سے سرپیچی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

2۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔ [1]

"(اے ایماندارو) تمہارے مالک سرپرست تو بس یہی ہیں خدا اور اس کا رسول اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں"

3۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ [2]

"نبی تو مومنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں"

دونوں صورتوں میں لوگوں کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے خود اپنے بارے میں ان کی رائے پر مقدم ہے اس آیت کے سلسلہ میں تمام مفسرین قرآن اس بات پر متفق ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ پیغمبر کی رائے کو اپنی رائے پر مقدم رکھیں اور پیغمبر کی رائے کی مخالفت کرنے کا حق نہیں رکھتے، البتہ مذکورہ آیت رسول خدا کی اصل ولایت کو بیان کررہی ہے، اور یہ بیان نہیں کررہی ہے کہ آنحضرت کی ولایت کہاں تک محدود ہے، اور آنحضرت کی ولایت اور آپ کی رائے کا مقدم ہونا صرف اجتماعی امور میں ہے یا اجتماعی امور کے علاوہ مشخص امور کو بھی شامل ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شبہ کرنے والے نے جن آیات سے تمسک کیا کہ رسول اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کی نفی کی گئی ہے ان دو طرح کی آیات کے تناقض (ٹکراؤ) کا جواب بھی دے ہوسکتا ہے کہ معترض ان آیات سے بالکل غافل ہو، یا ان آیات کے مطلب کو قبول ہی نہ کرتا ہو لیکن چونکہ ہم قرآن کریم کی آیات میں تناقض اور تعارض کے منکر ہیں لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ان آیات کے ظاہری تناقض کو حل کریں اس اہم امر کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان دو طرح کی آیات کو پہلی اور بعد کی آیتوں نیز آیات کے لحن (طرز) اور ان کے مخاطبین کو ملاحظہ کریں تا کہ آیات کے حقیقی مطلب کو سمجھ سکیں۔

5۔ قرآن پر مختلف توجہ کی دلیل

جس وقت ہم آیات کے پہلے اور دوسرے گروہ پر دقت کرتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آیات کا لحن ایک دوسرے سے مختلف ہے: آیات کا پہلا گروہ ان لوگوں کے بارے میں ہے کہ جنھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا ہے اسی وجہ سے

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۵۵

[2] سورہ احزاب آیت ۶

خداوند عالم ان لوگوں کو حقیقت اسلام کی رہنمائی کرتا ہے اور اپنی اطاعت کے فوائد کو بیان کرتا ہے اور جب اپنے پیغمبر جو خدا کی رحمت و مہربانی کے مظہر ہیں مگر بعض لوگوں کے اسلام کو قبول نہ کرنے اور خدا کی اطاعت سے روگردانی کرنے کی وجہ سے پریشان دیکھتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں یہ لوگ دوزخ کے راستہ کو اپنے لئے ہموار کرتے ہیں ایسے موقع پر خداوند عالم اپنے رسول کو نگران و پریشان دیکھ کر ان کی دلجوئی کرتا ہے کہ اے میرے حبیب ان لوگوں کے ایمان نہ لانے سے کیوں غمگین ہوتے ہیں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں ہم نے اسلام کو اس لئے نازل کیا تاکہ لوگ اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے اسے قبول کریں وگرنہ اگر ہم چاہتے تو تمام لوگوں کی ہدایت کر دیتے اور اس کی قدرت بھی ہم میں ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۝ [1]

"(اے پیغمبر) اگر آپ کا پروردگار چاہتا ہے تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو تاکہ سب کے سب ایماندار ہو جائیں"

خداوند عالم کا انبیاء کو بھیجنے کا ہدف یہ ہے کہ لوگ حق کو پہچانتے ہوئے اپنے لئے سعادت کا راستہ اپنائیں اور اپنے اختیار سے دین حق کو قبول کریں نہ یہ کہ خداوند عالم ان کو ایمان لانے پر مجبور کرے وہ ایمان جو اکراہ اور اجبار سے حاصل ہو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور ہمارے پیغام کو پہنچانا تھا لہٰذا آپ ان مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے پریشان نہ ہوں، کیا آپ سوچتے ہیں کہ آپ نے اپنی رسالت کی ذمہ داری پر عمل نہیں کیا، آپ کی رسالت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو خوف اور اکراہ کے ذریعہ مسلمان کریں، کیونکہ ہم نے آپ کو کفار پر مسلط نہیں کیا ہے تاکہ طاقت کے زور پر ان کو مسلمان کرسکیں آیات کے پہلے گروہ کے مقابلے میں آیات کا دوسرا گروہ ان لوگوں کے بارے میں ہیں کہ جنہوں نے معرفت و شناخت کے ساتھ اپنے اختیار سے اسلام کو قبول کیا ہے ان آیات میں ان افراد کو پیغام دیا جا رہا ہے کہ اسلامی احکامات پر عمل کریں اور اس پیغمبر کی اطاعت کریں کہ جس کے بارے میں اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ پیغمبر اور اس کے تمام احکامات خدا کی طرف سے ہیں اور اس پیغمبر کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور آنحضرت کے فرمان پر حق انتخاب بھی نہیں رکھتے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے انسان کو حق انتخاب ہے لیکن اسلام کو قبول کرنے کے بعد تمام شرعی احکامات کو تسلیم کرنا ہوگا اس بنا پر وہ لوگ جو خدا کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہیں خداوند عالم ان کی سخت مذمت کرتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۔ [2]

---

[1] سورہ یونس آیت ۹۹

[2] سورہ نساء آیت ۱۵۰،۱۵۱

"بے شک جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں سے انکار کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس (کفر و ایمان) کے درمیان ایک دوسری راہ نکالیں یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں"

بعض احکام کو قبول کرنا اور دوسرے احکام قبول نہ کرنا اسی طرح بعض قوانین کو قبول کرنا اور دوسرے قوانین سے سرپیچی کرنا گویا اصل دین کا انکار کرنا ہے، کیونکہ اگر دین کو قبول کرنے کا معیار اور میزان خداوند عالم کے احکامات ہوں تو احکامات الٰہی کے حساب سے عمل کیا جائے اور خدا کے احکامات تمام احکام وقوانین کو قبول کرنے کے لئے ہیں یہاں تک کہ اگر دین قبول کرنے کا معیار مصالح اور مفاسد ہوں کہ جن کو خدا جانتا ہے، اور اپنے احکامات میں ان کو ملاحظہ کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خداوند عالم تمام مصالح و مفاسد کو جانتا ہے، لہٰذا پھر کیوں بعض احکام کو قبول کیا جائے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے جو پیغمبر کا بھی معتقد ہو اور آنحضرت ﷺ کی قضاوت اور ان کے فرمان کو قبول کرے اور دل سے بھی اس پر راضی رہے حتی ناراحتی کا احساس بھی نہ کرے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ [1]

"پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں پھر (یہی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ خوش خوش اس کو مان لیں"

حقیقی مومن، رسول خدا کی قضاوت اور فیصلہ کو دل سے قبول کرتا ہے اور ناراحتی کا احساس نہیں کرتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو پورا یقین ہے کہ یہ رسول خدا کا بھیجا ہوا ہے ان کا حکم خدا کا حکم ہے یہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ۔ [2]

(اے رسول) ہم نے تم پر برحق کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو"

اگر کوئی اسلام کو قبول کرنے کے بعد کہے، میں اسلامی احکام میں عمل کرنے سے آزاد ہوں اگر چاہوں عمل کروں اگر چاہوں عمل نہ کروں یہ اس حکومت کی طرح ہے کہ جو ڈیموکراسک اور آزاد ہے وہ لوگ اپنی مرضی سے اس حکومت کے انتخاب میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے ووٹوں کے ذریعہ وزیر اعظم، رئیس جمہور اور ممبر آف پارلیمینٹ کو منتخب کرتے ہیں لیکن جب

---

[1] سورہ نساء آیت ۶۵

[2] سورہ نساء آیت ۱۰۵

یہی حکومت کوئی قانون بناتی ہے تو اس پر عمل کرنے سے............؟

اور جب یہ حکومت ٹیکس لگاتی ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں نہیں دونگا اصل حکومت اور اس کے ووٹ دینے میں آزاد تھے لہٰذا اب بھی آزاد ہیں کہ اس کے قانون پر عمل کریں یا عمل نہ کریں ان باتوں کو کوئی بھی عقلمند قبول نہیں کر سکتا۔

جی ہاں: اسلام کو قبول کرنے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسلام دلی اعتقاد کا نام ہے اور طاقت کے زور پر کسی نے اسلام قبول کر لیا تو اس وقت اس سے کہا جائے گا نماز پڑھو اور اگر کوئی کہے کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا یا اگر اس سے کہا جائے کہ زکاۃ دو لیکن زکاۃ دینے سے انکار کرے، اسے ک تو کوئی بھی انسان اس کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اگر کسی نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے تمام احکام کو بھی قبول کرنا پڑے گا یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلام تو قبول کر لے لیکن اس کے احکامات کو قبول نہ کرے، اور اپنی مرضی کے مطابق اعمال انجام دے کوئی بھی حکومت اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ انسان اس کو ووٹ دے لیکن عملی میدان میں اس حکومت کے قوانین کو قبول نہ کرے، اجتماعی زندگی میں بنیادی ترین اصل وظائف اور تعہد و پیمان اور وعدہ پر وفادار نہ ہو تو اجتماعی زندگی بالکل ہی وجود نہیں پا سکتی۔

لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں اور پیغمبر پر ایمان رکھتا ہوں لیکن اسلام کے احکامات پر عمل نہیں کرتا اور اس کی حاکمیت اور ولایت کو قبول نہیں کرتا تو ایسے اسلام کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ اسلام اور پیغمبر کو قبول کرنا اور اطاعت و پیروی نہ کرنے میں ظاہری تناقض پوشیدہ ہے۔

ہماری گفتگو سے یہ واضح و روشن ہو چکا ہے کہ اگر کوئی انصاف کی آنکھ سے آیات کو ملاحظہ کرے اور ان کی دلالت، لحن اور ماقبل و مابعد کو غور سے دیکھے تو قرآن کریم میں کوئی تناقض نہیں ملے گا اور مذکورہ شبہ کی اطاعت اور آزادی میں جو تناقض ہے وہ بالکل ختم ہو جائے گا جیسا کہ قرآن مجید نے بھی اسی کو صحیح کہا ہے)

لیکن جن کے دل مریض ہیں وہ قرآن کریم کو صداقت اور انصاف سے نہیں دیکھتے اگر یہ لوگ قرآن کا مطالعہ کرتے تو اس وجہ سے کہ اپنی کج فکری اور منحرف نظریات کی دلائل تلاش کریں، اور اس وجہ سے کہ قرآن کی آیات کے بعض حصوں کو انتخاب کرتے ہیں اور سیاق و سباق (پہلی اور بعد والی آیتوں کو) نہیں دیکھتے اور قرآن کے مطابق محکمات قرآن کو چھوڑ دیتے ہیں اور متشابہات کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔[1]

"پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ انہیں آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ فساد برپا کریں اور اس خیال سے کہ انہیں اپنے مطلب پر ڈھال لیں حالانکہ خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں بڑے پایہ پر فائز ہیں ان کا

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۷

اصلی مطلب کوئی نہیں جانتا"

متشابہات کی پیروی کے علاوہ آیات کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور آیت کے ایک جملہ کو اخذ کرتے ہیں اور ماقبل و مابعد کو چھوڑ دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کو قرآن مجید میں تناقض نظر آتا ہے جیسا کہ مذکورہ شبہ میں ان لوگوں نے آیات کے ما قبل و مابعد کو چھوڑتے ہوئے اعتراض کیا کہ پیغمبروں کی ولایت آزادی کے مخالف ہے۔

وہ آیات کہ جن میں رسول اسلام کے تسلط کا انکار کیا گیا ہے وہ کفار کے اسلام قبول کرنے سے پہلے نازل ہوئی تھیں جن میں کہا گیا ہے کہ رسول ان کو طاقت کے زور پر اسلام قبول نہ کروائیں یعنی آنحضرت کفار پر تسلط نہیں رکھتے، درحقیقت ان آیات کے مطابق احکام الٰہی میں عمل کی آزادی اسلام لانے سے پہلے ہے ورنہ تو اسلام قبول کرنے والے ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیغمبر اور دوسرے اسلامی احکام کی پیروی کریں اور اس کا وظیفہ ہے کہ تمام اسلامی احکامات کی رعایت کریں، اسلامی اور الٰہی قوانین کی توہین نیز دین کی توہین یا تجاہر بہ فسق (کھلے عام گناہوں کا مرتکب ہونا) کرنے والوں کا شدت سے مقابلہ کرتی ہے یہ درحقیقت جامعہ پر اسلامی حکام کی ولایت ہی تو ہے کہ جو ان کو موظف کرتی ہے کہ ایمان اور اسلام کے تمام لوازمات پر مؤید ہیں وہ اسلام ہے جو خود انہوں نے اپنی مرضی سے قبول کیا ہے۔

6۔ مذکورہ شبہ غیر مذہبی طریقہ سے

اب تک اس شبہ کے جواب میں بحث کی گئی ہے جو قرآنی اور دینی لہجہ میں تھا، اور یہ شبہ اس شخص کی زبان سے تھا جو خود مسلمان اور دیندار کہلاتا ہے، اور آیات قران کو دلیل بناتا ہوا یہ نتیجہ اخذ کرتا تھا کہ اسلام کو الزام آور فرمان نہیں دینا چاہئے، یعنی اسلام کو لوگوں کی زندگی میں دخالت نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ دخالت خود اسلام کی قبول کردہ آزادی کے خلاف ہے۔

اس وقت اس اعتراض کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ جو غیر مذہبی طور پر کیا جاتا ہے، اس اعتراض میں شبہ کرنے والے کی یہ فکر ہے کہ اسلام کے الزام آور احکام اور اس کی اطاعت و پیروی کو جوہر انسانیت سے ناسازگار اور منافی قرار دے، اگرچہ یہ شبہ چند طریقوں سے کیا گیا ہے، ہم یہاں پر بعض طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

منطق کی اصطلاح میں "اختیار" انسان کی فصل اور مقوم ہے اور اسی سے جوہر انسانیت کی وجود پاتا ہے، لہٰذا اگر ہم انسان سے اختیار اور اس کی آزادی کو سلب کرلیں اور اس کو مجبور کریں تو گویا ہم اس سے انسانیت کو سلب کررہے ہیں اور گویا اس کو ایک حیوان کی مانند قرار دے رہے ہیں، اور اس کی گردن میں لگام ڈال کر ادھر اُدھر کھینچ رہے ہیں، لہٰذا انسان کی اہمیت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کو "حق انتخاب" دیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین اس کے لئے الزام آور احکام بیان نہ کرے، اور اگر اس کو پیغمبر، ائمہ اور نائبین ائمہ کی اطاعت کے لئے مجبور کرے، تو اس صورت میں انسانیت کا احترام اور اس کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے اور گویا ہم اس کو حیوان کی طرح قرار دے کر ادھر اُدھر لے جارہے ہیں۔

7۔ "حیوم" کے اعتراضات اور ان کے جوابات

اول: ہم مذکورہ اعتراض کے دو جواب پیش کریں گے اور چونکہ معترض کا اعتراض حیوم کے اعتراض کی طرح ہے، حیوم کا اعتراض یہ ہے کہ عقل نظری "است ھا" (ہے) کو درک کرتی ہے اور عقل عملی "باید ھا و نباید ھا" (فلاں چیز ہونی چاہئے اور فلاں چیز نہیں ہونی چاہئے) کو درک کرتی ہے اور چونکہ عقل نظری کا، عقل عملی سے کوئی ربط نہیں ہے لہٰذا عقل عملی کی درک شدہ چیزوں (باید ھا و نباید ھا) کو عقل نظری کی بنیاد قرار نہیں دی جاسکتی۔

حیوم کا اعتراض مغربی فلاسفہ کی قابل توجہ قرار پایا اور انہوں نے اس کو بہت سی علمی چیزوں کی بنیاد قرار دیا، جمہوری اسلامی ایران کے انقلاب کے بعد بہت سے مغربی دانشمندوں نے یہ اعتراض کیا کہ ہم "است ھا" سے "باید ھا" کا نتیجہ نہیں نکال سکتے مثلاً اگر کوئی شخص ایک خاص صفت رکھتا ہے تو اسکا نتیجہ یہ نہیں لیا جا سکتا ہے کہ اس طرح ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے، کیونکہ "است ھا" کی درک کرنے والی عقل نظری ہے اور "باید ھا" کو درک کرنے والی عقل عملی ہے، جبکہ ان دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔

حیوم کے اس اعتراض کو ماننے والے یہ کہتے ہیں: لوگوں کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی انسانیت کے خلاف ہے، لہٰذا دین کو الزام آور احکامات پیش نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ انسان مختار اور آزاد ہے، پہلے یہ کہتے ہیں کہ انسان مختار ہے لہٰذا اس کو آزاد رہنا چاہئے، اور اس کو مجبور نہیں کیا جانا چاہئے اس بنا پر انسان کے مختار ہونے سے کہ جو "است ھا" میں سے ہے اور جس کو عقل نظری درک کرتی ہے "باید و نباید" کہ جس کو عقل عملی درک کرتی ہے کا نتیجہ لیتے ہیں اور ان کی بنیاد یہی تناقض ہے کہ جس کو وہ خود قبول کرتے ہیں کہ "است ھا" کے ذریعہ "باید ھا" کا نتیجہ نکلے۔

البتہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ''است ھا'' کسی چیز کی علت تامہ ہو تو اس وقت اس کا نتیجہ ''باید ھا'' لیا جا سکتا ہے لیکن یہ نتیجہ ہماری بحث میں نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ انسان کا مختار ہونا، اس کے مکلف ہونے کی علت تامہ نہیں ہے، بلکہ اختیار تکلیف کے لئے راہ ہموار کرتا ہے، اور کسی کام پر تکلیف اور اس پر مجبور کرنا یا کسی کام سے روکنا کسی خاص مصلحت یا مفسدہ کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے ضمن میں کام ہوتا ہی ہے، لہٰذا کسی کام پر مجبور کرنے میں اس کی مصلحت چھپی ہوتی ہے اور کسی کام سے روکنے میں اس کا ضرر اور نقصان پوشیدہ رہتا ہے۔

8۔ دوسرا جواب: آزادی مطلق اور لامحدود نہیں ہے

اگر ہم اس شبہ کو مان بھی لیں اور کہیں کہ چونکہ انسان مختار ہے لہٰذا اس کو کسی کام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور کوئی بھی حکومت انسان کے لئے الزامی احکام نافذ نہیں کر سکتی کیوں کہ انسان آزاد ہے جس طرح چاہے عمل کرے اور آزادی کا سلب کرنا ہے اور آزادی کا سلب کرنا یا انسانیت کا سلب کرنا لہٰذا کوئی بھی قانون قابل اعتبار نہیں ہے اور جنگلی راج اور عسر و حرج کو قبول کرلیں۔

لیکن ہم یہ عرض کریں گے کہ کس چیز کے الزام اجبار ہی کے ذریعہ قانون قانون ہوسکتا ہے قانون اس وقت قانون ہوگا کہ جب اپنے ہمراہ الزام واجبار لیے ہو کوئی بھی محکمہ ہو جب اس کے قوانین اور دستور العمل کو قبول کرلیا جائے تو اس کو ہر حال میں عمل کرنا ہی ہوگا یہ نہیں ہوسکتا کہ قانون تو قبول کرلے لیکن اگر وہ قانون اس کے نقصان کا باعث ہو تو اس پر عمل نہ کرے اور اپنے نفع نقصان کے بارے میں سوچے اس طرح تو وہ نظام محکمہ چل ہی نہیں پائے گا اور اس محکمہ کا دیوالیہ نکل جائے گا جب تک قانون قانون بنانے والے کی نظر میں مقید ہے سب لوگ اس کی اطاعت کریں یہاں تک کہ اگر اس قانون میں کوئی خامی ہو تو اس کی تلافی کرنا قانون گذار کی ذمہ داری ہے، اور دوسروں کو قانون میں خامی کا بہانہ بنا کر اور اس پر عمل کرنے سے فرار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

9۔حاکمیت اور انسان کے خلیفۃ اللّٰھی عظمت کے درمیان تعارض ایک شبہ

ایک دوسرا شبہ یہ کہا جاتا ہے کہ انسان قرآن کے مطابق خلیفۃ اللہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان روئے زمین پر خدا کا جانشین ہے اور خدا کی طرح عمل کرتا ہے جس طرح خدا نے اس دنیا کو خلق فرمایا ہے اس طرح انسان بھی بہت سی چیزوں کو پیدا کرے اور جس طرح خداوند عالم اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے تو انسان بھی جس کے اختیار میں زمین ہے وہ بھی اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے۔

اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پہلے خلافت الٰہی کے معنی صحیح طرح سے سمجھ لیے جائیں اور توجہ رہے کہ جس معنی میں حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ اللہ کہا گیا ہے

خداوند عالم اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۚ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۚ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ [1]

"یاد کیجئے اس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے ملائکہ سے کہا میں روئے زمین پر جانشین (نمائندہ) بنانے والا ہوں تو اس وقت فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے کو خلیفہ اور جانشین بنائے گا جو زمین پر خونریزی و فساد برپا کرے ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں تب اس وقت خداوند عالم نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے"

یہ مقام تمام اولاد آدم کے لئے نہیں ہے کیوں کہ قرآن بعض اولاد آدم کو شیطان کہتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۳۰

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ۔ [1]

"اور (اے رسول) جس طرح یہ کفار تمہارے دشمن ہیں اسی طرح (گویا) ہم نے (خود آزمائش کے لئے) شریر آدمیوں اور جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا" اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان ان افراد میں نہیں ہے کہ جس کو ملائکہ سجدہ کرتے اس موقعہ پر خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۝۔ [2]

"اور (اے رسول وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک آدمی کو خمیر دی ہوئی مٹی سے جو سوکہ کر کھن کھن لولنے لگے پیدا کرنے والا ہوں تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا"

خلیفۃ اللہ ہونا بہت سے اہم شرائط رکھتا ہے جن میں سے کچھ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ اسماء کا علم

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ [3]

"اور (آدم کی حقیقت ظاہر کرنے کی غرض سے) آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے"

2۔ اللہ کا خلیفہ روئے زمین پر عدالت و انصاف کو جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو

لہٰذا وہ انسان جس کی عادت قتل و غارت اور خونریزی ہو اور کوئی بھی ظلم کرنے سے نہ گھبراتا ہو وہ خلیفۃ اللہ نہیں ہوسکتا (معاذ اللہ) کیا خداوند عالم ظالم ہے کہ اس کا خلیفہ اور جانشین بھی ظالم ہو؟ اللہ کا خلیفہ وہ ہے جو اپنی فردی اور اجتماعی زندگی میں خدائی حفاظت کا اظہار کرے نہ یہ کہ جو دو پیروں سے انسانی شکل میں چلتا ہو وہ خلیفۃ اللہ ہے لہٰذا وہ افراد جو لوگوں کو گمراہ کرنے اور حکومت اسلامی کو درہم و برہم کرنے میں لگا ہو وہ افراد نہ یہ کہ اشرف المخلوقات نہیں ہیں بلکہ انسانی شکل میں شیطان ہیں جن کو خداوند عالم حیوانوں سے بھی بدتر کہتا ہے ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ [4]

"اس میں شک نہیں کہ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے گونگے (کفار) ہیں

---

[1] سورہ انعام؛ آیت ۱۱۲

[2] سورہ حجر آیات ۲۹،۲۸

[3] سورہ بقرہ آیت ۳۱

[4] سورہ انفال آیت ۲۲

جو کچھ نہیں رکھتے"

معترض کہتا ہے کہ انسان کی عظمت و بزرگی اس کے کردار سے ہے اور جو چیزیں انسان کی آزادی میں مانع ہوں وہ قابل قبول نہیں ہے یہ ایک دعو کہ والا نعرہ ہے جو مغرب زمین میں لگایا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی اسے قبول کیا جاتا ہے جبکہ اس کے لوازمات اور اثرات پر توجہ نہیں کی جاتی اور نعرہ پر پافشاری کی جاتی ہے بے شک اس نعرہ کے جواب میں کہ جس میں بہت سے اغراض و مقاصد پوشیدہ ہیں ایک تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ بعد میں اس سلسلہ میں بحث کی جائے گی لیکن اس وقت اا اجمالی طور پر یہ سوال کرتے ہیں کہ انسان کے مطلق طور پر آزاد ہونے کا مقصد کیا ہے اور کسی محدودیت کے قائل نہ ہونے سے آپ کی مراد کیا ہے؟ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے لئے کوئی بھی قانون ضروری نہیں ہے؟

اس کو تو کوئی بھی عاقل انسان قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر کام میں آزاد ہے اور جو آزاد ہے وہ کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے کسی کی عزت بھی لوٹ سکتا ہے لوگوں میں بدامنی بھی پھیلا سکتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے نقصان یا ضرر خود اس نظریہ رکھنے والے کو پہنچ سکتا ہے اور کیا ایسی آزادی رکھنے والوں کے درمیان زندگی بسر کی جا سکتی ہے؟ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی آزادی نا محدود نہیں ہے اور اور انسان ایسا آزاد نہیں ہے کہ جو بھی چاہے اسے انجام دے اب جبکہ روشن ہو چکا ہے کہ آزادی محدود اور مشروط ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی حدود کو کون معین کرے؟ اور آزادی کی حد کہاں تک ہے؟

اور اگر طے یہ ہو کہ ہر انسان آزادی کی حد کو معین کرے تو اس کا نتیجہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ ہر انسان اپنی مرضی سے عمل کرے اور یہاں پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جو مطلق آزادی پر ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ آزادی کی حد کو معین کرنے کے لئے ایک قانونی مرجع ہونا چاہئے اس صورت میں اگر کوئی قبول کرتا ہے کہ خدا ہے اور انسان کے لئے نفع و نقصان کو خود اس سے بہتر جانتا ہے اور انسان کی زندگی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے اور وہ تو صرف اپنے بندوں کی بھلائی چاہتا ہے تو ایسے شخص کے لئے آزادی کی حد کو بیان کرنے کے لئے خدا کے علاوہ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اعتقادی اور فکری مسائل میں کوئی تناقض نہیں ہے کیونکہ مسلمان اس خدا کو مانتے ہیں کہ جو انسان کے لیے نفع و نقصان کو خود اس سے بہتر جانتا ہے اور بہتر طور پر جانتا ہے کہ انسان کی بھلائی کس چیز میں ہے لہٰذا وہ اس آزادی کی حد کو بیان کرے لیکن اگر کوئی خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو یا اگر خدا پر ایمان تو ہو لیکن اس کو آزادی کی حد معین کرنے والا نہ مانے اور یہ کہے کہ انسان خود آزادی کی حد کو معین کر سکتا ہے تو ایسی صورت میں ہزاروں مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ تمام انسان ایک نظریہ پر متفق نہیں ہو پائیں گے اور اگر اکثریت نے آزادی کی حد کو معین کیا اور اقلیت نے اس کو قبول نہ کیا وہ کس طرح اپنے حقوق تک پہنچ سکتے ہیں لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ اگر چہ آزادی ایک خوبصورت اور دل پذیر لفظ ہے لیکن مطلق اور لامحدود نہیں ہے اور کوئی بھی مطلق آزادی کو قبول نہیں کر سکتا۔

چھٹی نشست

اسلام میں آزادی

(دوسرا حصہ)

1-تاریخ انسان میں تحویل وتحول کی بنا پر ایک شبہ

یہ شبہ انسانی تاریخ، تمدن اور کلچر کے تحول وتبدل نیز اجتماعی نظام میں تغییر وتبدیلی کی بنا پر ہوتا ہے، اور یہ طے شدہ بات ہے کہ انسانی اجتماعی زندگی مختلف مرحلوں سے گذری ہے، اور ایک زمانہ میں "غلامی" کا مسئلہ رائج تھا، اور انسانی کی ترقی اسی میں سمجھی جاتی تھی کہ کمزور اور ناتوان لوگ دوسروں کی غلامی کریں، اور ان کی ہر ممکن خدمتگذاری کرتے رہیں، ظاہری بات ہے کہ اس زمانے میں انسان وخدا جیسا غلام اور آقا کے درمیان ہوتا تھا، کیونکہ اس زمانے میں یہ رائج تھا کہ بعض طاقتور لوگ مولا اور آقا اور بعض کمزور لوگ ان کے بندے اور غلام بن کر رہیں، اور انسانوں کے درمیاں رابطہ بھی عبد اور آقا کے لحاظ سے سمجھا جاتا تھا، اس بنا پر جس طرح ضعیف اور کمزور لوگ عبد اور بندے اور ذلیل وپست سمجھے جاتے تھے، اس طرح لوگ خدا کے عبد اور بندے سمجھے جاتے تھے، اور خداوند ان کا مولا وآقا، آج جب بندگی اور غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے، لہٰذا اس وقت کا قیاس اور معیار اس زمانے میں نہیں لانا چاہئے۔

آج انسان کسی بھی زبردستی کو قبول نہیں کرتا، اور اپنے کو آقا سمجھتا ہے نہ کہ بندہ، لہٰذا ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم بندہ ہیں اور خدا مولا، آج ہم خود کو اللہ کا خلیفہ مانیں، اور جو خدا کا جانشین ہو اس کو بندگی کا احساس کیسا، گویا خداوند عالم سے خدائی ختم ہو چکی ہے اور یہ حضرت اس کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور جو چاہیں کریں جس طرح کوئی حاکم کسی کو اپنا قائم مقام بنائے تو وہ اس کے تمام اختیارات کا مالک بن جاتا ہے، اور اس کے کام کے کام ہوتے ہیں اور ان کے درمیان حاکم وفرمانبردار کا رابطہ نہیں ہے، اور قائم مقام کے کاموں کی کوئی باز پرس نہیں ہونا چاہئے۔

اس زمانہ میں جبکہ ماڈرن اور جدید تمدن کا دور دورا ہے، اور ہماری زندگی ایک بلند مرتبہ پر پہنچ چکی ہے تو ہم بندگی اور غلامی کی زندگی کے احکام (اطاعت وفرمانبرداری) کو قبول نہیں کر سکتے، اور آقا ومولیٰ کے پیچھے پیچھے گھومتے رہیں، تکلیف اور اطاعت کا زمانہ پیچھے رہ گیا ہے، اور اگر قرآن میں تکالیف اور دوسرے فرمان موجود ہیں تو وہ غلامی کے زمانے کے ہیں، کیونکہ جس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے، غلامی کا زمانہ تھا، اور اسلام کا پہلا دور، خدا اور رسول اور لوگوں کے درمیان

رابطہ کیلئے مناسب تھا۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ انسان تکلیف کا طالب نہیں ہے، لیکن حقوق کا طالب ہے اور اس کے ذہن میں کبھی یہ نہیں آتا کہ اس پر کوئی فریضہ اور ذمہ داری ہے، تاکہ ان کو انجام دے سکے، انسان کو چاہئے کہ وہ خدا اور دوسروں سے اپنے حقوق کو حاصل کرے۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ پیغمبر، آئمہ اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں یہ چودہ صدی پہلے کسی اجتماعی زندگی کا تھا، جبکہ آج کی اجتماعی زندگی بالکل بدل چکی ہے، اور فرائض اور ذمہ داری کی کوئی بات نہیں کرتا بلکہ انسانی حقوق کی باتیں ہوتی ہیں، انسان کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ تجھے یہ حق ہے کہ جس طرح بھی چاہے زندگی کرے، تجھے اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پہننے کا حق ہے، اور جس طرح بھی چاہے اجتماعی زندگی کو بسر کرے۔

2- ہمارا جواب

ہم مذکورہ اعتراض کا جواب "تکوینی" اور "تشریعی" لحاظ سے پیش کرتے ہیں، کیونکہ ہمارے سامنے دو مقام ہیں: تکوینی مقام، تشریعی مقام، بہ عبارت دیگر مقام واقعیت اور "ھست ھا" (ہے) اور دوسرے مقام تکلیف "باید ھا" (ہونا چاہئے) یعنی عالم واقعیات، اور عالم ارزشہا (قیمت اور اہمیت) (اگرچہ مذکورہ الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ مختلف لوگوں کو سمجھانے کیلئے مختلف الفاظ ہیں) اب ہمیں یہاں دیکھنا ہے کہ تکوینی لحاظ سے ہماری خدا سے کیا نسبت ہے، کیونکہ اگر کوئی خدا کو ماننا ہی نہ ہو، تو اس کی نظر میں خدا سے کوئی نسبت بے فائدہ ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص خدا پر اعتقاد رکھتا ہو یا کم سے کم یہ قبول کرتا ہو کہ اس کا پیدا کیا ہوا ہے، اور خدا کی خالقیت کو قبول کرتا ہے (خدا کو ماننے کا یہ سب سے کم درجہ ہے) اور اپنے کو خدا کی مخلوق جانتا ہو، البتہ خدا کی خالقیت پر اعتقاد رکھنے سے انسان موحد (خدا کو ایک ماننے والا) نہیں بنتا، لہٰذا خدا کی تکوینی اور تشریعی ربوبیت کا قائل ہونا ضروری ہے، توحید در خالقیت کی بنا پر کسی کا یہ کہنا کہ وہ خدا کا بندہ اور اس کا مملوک نہیں ہے خود اس کے خداوند عالم کی خالقیت کے اعتقاد سے ٹکراتا ہے، توحید کا پہلا قدم اپنے کو خدا کی مخلوق تسلیم کرنا ہے، اور ہمارا وجود خدا کا عطا کردہ ہے، اور یہ وہی عبودیت ہے، عبد یعنی مملوک، دوسری کی ملکیت ہونا، لہٰذا اگر کوئی اپنے کو مسلمان اور خدا کا معتقد کہلاتا ہے، لیکن اپنے کو خدا کی عبودیت اور مملوکیت نہیں مانتا، گویا اس کی گفتگو میں واضح تناقض ہے، کیونکہ خدا پر اعتقاد ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ ہم خود کو اس کی مخلوق، عبد اور مملوک سمجھیں، اس وجہ سے تمام مسلمان اپنی بہترین عبادت نماز میں کہتے ہیں "اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ" اور یہ بات مسلّم ہے کہ انسان کیلئے سب بہترین عظمت اور مقام خدا کا بندہ ہونا ہے، اس وجہ سے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا۔[1]

---

[1] بنی اسرائیل آیت ا

"وہ خدا (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (آسمانی مسجد) تک کی سیر کرائی"

جی ہاں! خدا کی بندگی اور اس کی عبودیت کی اہمیت کے پیش نظر قرآن میں اس خوبصورت لفظ "عبد" اور اس کے دوسرے مشتقات کو استعمال کیا گیا ہے، اور انسان کیلئے بہترین اور بلند درجہ کو "عبودیت" شمار کیا گیا ہے:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ [1]

"(اور کچھ لوگوں سے کہے گا) اے اطمینان پانے والی جان اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ تو اس سے خوش ہے وہ تجھ سے راضی ہے تو میرے (خاص بندوں میں شامل ہو جا"

تشریعی لحاظ سے دوسرا جواب

دوسرا جواب تشریعی لحاظ سے یہ ہے کہ انسان کا آزاد ہونا اور قانون ذمہ داری قبول کرنا آپس میں سازگار نہیں ہے کہ جس کا نتیجہ وحشت، ظلم و بربریت اور عسر و حرج ہے، اور یہ نتیجہ نکالنا کہ انسان آزاد ہے جس طرح چاہے عمل کر سکتا ہے، اگر چہ اس نے اس قانون کو ووٹ دیا ہو لیکن اس پر عمل کرنے سے انکار کرے، ایسا تو جنگل میں بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پر بھی حیوانوں کے عمل کرنے کے لئے خاص قوانین ہوتے ہیں۔

لہٰذا جب ہم تمدن اور مدنیت کا دم بھرتے ہیں تو ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ مدنیت کا سب سے پہلا رکن یہ ہے کہ انسان قوانین پر عمل کرنے کا ذمہ دار ہے، اور ذمہ داری اور مسئولیت کو قبول نہ کرنے سے نہ صرف یہ کہ تمدن جدید کا ادعا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اپنے کو وحشی گری کی سب سے نیچی کھائی میں غلطاں پائیں گے۔

دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جائے کہ انسان کی فصل مقوم عقل ہے، اور عقل کا حکم یہ ہے کہ انسان ذمہ داری کو قبول کرے، اور خدا امور کو انجام دینے کا مکلف سمجھے اور بعض چیزوں سے پرہیز کرے، لہٰذا اگر کوئی محلہ اور سڑک پر اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پہنے یا لوگوں کے سامنے برہنہ آئے اور جو بھی منہ میں آئے وہ کہتا پھرے، تو اس صورت میں کیا کوئی اس کو عاقل تصور کر سکتا ہے؟ یا اس کو وحشی اور دیوانہ کہا جائے گا؟ اور اگر کوئی اس سے سوال کرے کہ تم ایسے کام کیوں کرتے ہو؟ اب اگر اس کے جواب میں کہے کہ میں چونکہ آزاد ہوں اور آزادی مقوم انسان ہے، لہٰذا میں اپنی مرضی کے مطابق جو چاہوں کروں، تو کیا کوئی انسان اس کی ان باتوں کو قبول کر سکتا ہے؟

لہٰذا چونکہ انسان کی فصل مقوم عقل ہے، اور اس کا عقلی لازمہ یہ ہے کہ انسانی ذمہ داری اور قانون کو قبول کرے، کیونکہ اگر قانون نہ ہو تو مدنیت نہیں ہو سکتی، اور اگر مسئولیت اور ذمہ داری نہ ہو تو انسانیت بھی نہیں آسکتی، انسان کے آزاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان تکوینا انتخاب کی قدرت رکھتا ہے، نہ کہ تشریعاً قانون اور الزام آور اور امکانات کو قبول نہ

[1] سورۂ فجر آیت ۲۷ تا ۲۹

کرے، اور اپنی اجتماعی زندگی میں کسی حد و حدود کا قائل نہ ہو، پس نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ دین کی ولایت آزادی کے مخالف ہے کیونکہ انسان کی فصل مقوم آزادی ہے جس سے انسان کا خدا کا جانشین ہونا لازم آتا ہے۔1

3۔ گذشتہ اعتراض، ایک دوسرے لحاظ سے

بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ انسان کی زندگی میں مختلف طریقوں سے ترقی اور پیشرفت ہوتی ہے، اور جیسا کہ انسانی جدید تمدن میں نئے طریقہ کی نظریات اور تفکرات پیدا ہوئے ہیں، ایسی صورت میں دین کو انسانی حقوق بیان کرنے چاہئیں، نہ یہ کہ دین تکالیف اور الزام آور احکامات بیان کرے، گذشتہ زمانے میں چونکہ غلامی، بردگی اور ظلم و جور کا زمانہ تھا اور جو بھی ذمہ داری اور مسئولیت ان کو دی جاتی تھی وہ اس کو قبول کرتے تھے، لیکن آج وہ زمانہ نہیں ہے آج ہر انسان اپنے کو آقا سمجھتا ہے، آج انسان ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا بلکہ اپنے حقوق لینا چاہتا ہے۔

درحقیقت آج کا ماڈرن زمانہ ہمارے اور گذشتہ (غلامی اور بردگی کو قبول کرنے والے) لوگوں میں ایک بہت بڑی دیوار ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ آج ماڈرن انسان نے گذشتہ زمانے کی طرح ذمہ داری کو قبول کرنے کو بند کر دیا ہے، اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے، آج تکالیف اور ذمہ داری کو قبول کرنے کی باتیں کرنا ماضی کی طرف پلٹنا ہے، آج کے اس زمانے نے جس میں حقوق بشر کا نعرہ لگایا جاتا ہے، ڈیموکراسی کی برکت سے انسان کو استثمار اور غلامی کی قید و بند سے آزاد کر دیا ہے، آج کا دور وہ دور ہے کہ جس میں جو ادیان تکالیف اور ذمہ داری کی باتیں کرتے ہیں ان کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور حقوق بشر کا نعرہ لگانے والے دین کو تلاش کیا جاتا ہے۔

اعتراض کرنے والے اپنے ہدف اور مقصد تک پہنچنے کیلئے نیز سماج بالخصوص جوانوں کو اپنے طرف جذب کرنے کیلئے ایسی باتیں کرتے ہیں اور مختلف طریقوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی باتوں کو خوبصورت و دلنشیں انداز اور مختلف طریقوں سے چاشنی لگا کر پیش کرتے ہیں، لیکن ہم ان بے ڈھنگے سوالوں کا صحیح انداز میں جواب پیش کرتے ہیں۔

4۔ ہمارا جواب

معترض کا مطلق طور پر یہ کہنا کہ آج کا انسان اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے، تکالیف و ذمہ داری کا مطالبہ نہیں کرتا، یہ بات بیہودہ اور باطل ہے جیسا کہ فلاسفۂ حقوق بھی کہتے ہیں! انسان اس وقت کسی چیز کا مستحق نہیں ہوتا جب تک وہ دوسروں کیلئے کوئی کام انجام نہ دے، مثال کے طور پر اگر شہری حضرات کو صاف و سالم ہوا میں رہنے کا حق ہے تو دوسرے لوگوں پر ذمہ داری ہے کہ وہ ہوا کو آلودہ اور خراب نہ کریں، پر دوشن نہ پھیلائیں، اس طرح اگر کسی کو اپنے مال میں تصرف کا حق ہے تو دوسروں پر ذمہ داری ہے کہ اس کے مال میں دست درازی نہ کریں، ورنہ اپنے مال سے کوئی بھی بہرہ مند نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر اس کے لئے کوئی حق ثابت ہوتا ہے تو وہ اس کے بدلہ کوئی کام انجام دے، اگر کسی کو یہ حق ہے کہ وہ سماج کی تیار کردہ چیزوں کو استعمال کرے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی کسی طریقہ سے سماج کی خدمت کرے، اور مسئولیت و ذمہ داری کو قبول کرے،

اور دوسروں پر بار نہ بنے، لہٰذا حق اور تکلیف ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ انسان صرف حقوق کا طالب ہو، اور تکالیف کو قبول نہ کرتا ہو، یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

توجہ رکھنا چاہئے کہ الٰہی اور غیر الٰہی تمام دانشمندان اور فلاسفۂ حقوق نے کلی طور پر ذمہ داری اور مسئولیت کی نفی نہیں کی ہے، بلکہ تکالیف اور ذمہ داری پر یقین رکھتے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ معترض کی تکلیف سے مراد الٰہی تکلیف ہے، جس کا نچوڑ یہ ہے کہ خداوند عالم کو ہم پر تکلیف و ذمہ داری نہیں کرنا چاہئے، ورنہ تو ان کی نظر میں حق کے مقابلہ میں تکلیف ہونے سے گریز ناممکن ہے کیونکہ تکالیف کو تمام عقلاء اور دانشمندوں نے قبول کیا ہے ہماری بات کی تائید یہ ہے کہ خود انہوں نے صاف صاف کہا ہے کہ عبد اور مولیٰ کے درمیان رابطہ اور مولیٰ کی طرف سے حکم صادر ہونا اور اس کی اطاعت کا ضروری ہونا غلامی اور بردگی کلچر کے مناسب ہے۔

5۔خدا کی نافرمانی تاریخ کی نظر میں

صرف آج کا ماڈرن انسان ہی خدا کی اطاعت اور تکالیف سے فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ تاریخ میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے شیطانی وسوسوں کی خاطر خدا کی نافرمانی اور قانون شکنی کی ہے، یہ کہنا کہ:

انسان حقوق کا طالب ہے تکالیف کا نہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ شروع ہی میں حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند قابیل نے خدا کی معصیت کی اور کھلے عام تکالیف اور الٰہی قوانین سے سرپیچی کی، اور قانون شکنی کرتے ہوئے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ ۘ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ ۖ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ... [1]

"(اے رسول) تم ان لوگوں سے آدم کے دو بیٹوں (ہابیل وقابیل) کا سچا واقعہ بیان کر دو کہ جب ان دونوں نے خدا کی بارگاہ میں نذر پیش کی تو ان میں سے ایک (ہابیل) کی (نذر تو) قبول ہوآئی اور دوسرے (قابیل) کی (نذر) نہ قبول ہوئی تو (مارے حسد کے ہابیل سے) کہنے لگا میں تجھے ضرور مار ڈالوں گا، اس نے جواب دیا کہ (بھائی اس میں اپنا کیا بس ہے) خدا تو صرف پرہیزگاروں کی (نذر) قبول کرتا ہے"

قرآن مجید میں پیغمبروں کے واقعات اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اکثر لوگوں نے اپنے زمانے کے نبی کو جھٹلایا، اور نہ صرف یہ کہ ان کی بات پر لبیک نہیں کہا بلکہ ان پر تہمت وبہتان لگاتے تھے اور ان کا مسخرہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کو قتل بھی کر دیتے تھے، یا ان کو شہر بدر کر دیتے تھے اگر کوئی نبی ان کیلئے مفید باتیں بیان کرتا تھا، مثلاً قرآن کے مطابق لوگوں کو کم فروشی سے روکتا تھا، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۲۷

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ .... [۱]

"اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو" ان کے جواب میں کہتے تھے:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ... [۲]

"وہ لوگ کہنے لگے اے شعیب کیا تمہاری نماز (جسے تم پڑھا کرتے ہو) تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ جن (بتوں) کی پرستش ہمارے دادا کرتے آئے ہیں انہیں ہم چھوڑ بیٹھیں، یا ہم اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں کر بیٹھیں"

ممکن ہے اس موقع پر کوئی کہے کہ تاریخ میں انبیاؑ و اولیا الٰہی کے مقابلے کی وجہ بت پرستی، شرک اور شیطان کی پیروی تھی اور ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ انسان کسی بھی معبود کی اطاعت کی طوق اپنی گردن سے نکال دے، اور بتوں اور شیطان کی پیروی بھی نہ کرے، لیکن یہ کہنا بھی اولیاءِ الٰہی کی نظر میں باطل اور مردود ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کے مطابق انسان ایسے راستہ پر پہنچ جاتا ہے کہ یا خدا کی اطاعت کرے یا طاغوت (شیطان) کی اطاعت کرے، اور وہ کسی کی بھی اطاعت نہ کرے اس کے لئے محال، اور اگر کوئی یہ نعرہ لگائے کہ میں کسی کا بندہ اور غلام نہیں ہوں، درحقیقت ایسا شخص طاغوت اور اپنی ہوائے نفس کا غلام ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ [۳]

"خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لا چکے کہ انہیں (گمراہی کی) تاریکیوں سے نکال کر (ہدایت کی) روشنی میں لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے سرپرست شیطان ہیں کہ ان کو (ایمان کی) روشنی سے نکال کر (کفر کی) تاریکیوں میں ڈال دیتے ہیں"

دوسری جگہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ [۴]

"اے آدم کی اولاد کیا میں نے تمہارے پاس یہ حکم نہیں بھیجا تھا کہ (خبردار) شیطان کی پرستش نہ کرنا وہ یقینی طور پر تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اور یہ کہ (دیکھو) صرف میری عبادت کرنا یہی (نجات کی) سیدھی راہ ہے"

---

[۱] سورۂ شعراء آیت ۱۸۳

[۲] سورۂ ہود آیت ۸۷

[۳] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۶

[۴] سورۂ یٰسین آیت ۶۰، ۶۱

اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر شیطان کی عبادت چھوڑی جائے تو پھر کسی دوسرے کی عبادت اور اطاعت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو چاہئے کہ خدا کی عبادت کرے، جس طرح کہ کلمہ میں "لا الہ" کے بعد "الا اللہ" ہے۔

اس بنا پر جن لوگوں نے وحی پر توجہ کی اور خواب غفلت سے بیدار ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس خدا کی عبادت کریں جو ان کا خالق اور حقیقی مالک ہے، اور جس کے ہاتھ میں ان کی زندگی، موت، جوانی، پیری، اور صحت و سلامتی ہے، اس کی بندگی باعث افتخار ہے، اس کی تکالیف حکمت و رحمت کے سرچشمہ سے صادر ہوتی ہیں، اور ان پر عمل کرنا انسان کیلئے کمال اور سعادت کا باعث ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ تکالیف اور مسئولیت کو قبول نہ کرنا حیوانی درندگی صفت اور شیطانی پیروری کی وجہ سے ہے، کہ جو ہمیشہ تاریخ میں موجود ہے اور آج کے ماڈرن زمانے سے ہی مخصوص نہیں ہے، درحقیقت یہ ماڈرن انسان ہے کہ جس نے مدنیت سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے، اور جاہلیت و وحشی گری کے زمانے کی طرف پلٹ گیا ہے، اور گزشتہ زمانہ کی طرف پلٹ رہا ہے، وگرنہ انبیاء کی تربیت شدہ افراد نے حیوانیت اور وحشی گری سے کنارہ کشی کرلی ہے اور لاقانونیت سے نکل کر قانون، تکالیف اور مسئولیت کو قبول کر کے صحیح معنوں میں مدنیت کو قبول کر چکا ہے۔

لہذا بعض لوگ کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماڈرن زمانہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان کسی بھی ذمہ داری کو قبول نہ کرے! یہ تمدن ہے یا وحشیگری؟ تمدن و محدودیت، قانون اور مسئولیت قبول کرنے میں ہے ورنہ وحشی گری سے کوئی فرق نہ ہو گا۔

لہذا جو لوگ قانون، تکالیف اور مسئولیت کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ مدیریت اور وحشی گری کے قدیم زمانے کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں اور یہ طے ہے کہ کوئی شخص اس نظریہ کے تحت، مقدس اور خلیفہ اللہ نہیں ہوسکتا، جس سے وہ ہمارے لئے نمونہ عمل قرار پاسکے، (اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مدنیت اور قانون کی طرف مائل ہونا جیسا کہ ہمارے سماج میں رواج پیدا کر چکا ہے، اس کا مطلب مدنیت اور قانون مندی کے کمال پر پہنچنا ہے تاکہ کسی بھی جگہ قانون کی خلاف ورزی نہ کی جائے، اور نہ ہی یہ کوئی نیا حادثہ ہوا ہے اور نہ ہی ہمارا سماج انقلاب کے بعد 19 سال تک وحشی گری کا شکار تھا اور آج مدنیت کی طرف مائل ہوا ہے، بلکہ ہمارا یہ انقلاب مدنیت اور اسلامی تمدن پر استوار ہے، اور انقلاب کے اصل اہداف میں سے ہے کہ تمام مقامات پر الٰہی قوانین کی رعایت کی جائے۔)

6-خدا کی اطاعت اور آزادی

انبیاء علیہم السلام لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دیتے تھے اور طاغوت کی پیروی سے روکتے تھے اس سلسلے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ.[1]

"اور ہم نے تو ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو خدا کی عبادت کرو اور بتوں (کی عبادت) سے بچے رہو"

اس چیز کے پیش نظر یہ بات قبول نہیں کی ہے کہ اسلام نے انسان کو اپنے علاوہ یہاں تک کہ خدا کی اطاعت سے بھی منع کر دیا ہے، اور یہ طے ہے کہ جو مذہب ہم کو خدا کی اطاعت کی دعوت نہ دے وہ باطل ہے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا کہ انبیاؑ کا مقصد خدا کی مطلق طور پر اطاعت کرنے کی دعوت دیتا ہے، ہماری موت و حیات اسی سے وابستہ ہے

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.[2]

"ہم تو خدا ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں"

ہم خدا کی طرف سے ہیں اور خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اب جبکہ ہم نے خداوند عالم کو اپنا مالک حقیقی مان لیا تو پھر کس طرح یہ بات قبول کی جاسکتی ہے کہ خدا کو ہمیں حکم دینے اور فرمان صادر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیا مالکیت اس کے علاوہ ہے کہ مالک جس طرح بھی چاہے اپنی چیز میں تعریف کرے؟ لہٰذا یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم نے اسلام تو قبول کر لیا ہے لیکن ہم خدا کی بندگی کے قید و بند سے آزاد ہیں، کیونکہ اس طرح کی مطلق آزادی نہ صرف یہ کہ اسلام قبول نہیں کرتا، بلکہ اس کو تو عقل بھی قبول نہیں کرتی۔

اسلام آزادی کا نعرہ لگاتا ہے لیکن غیر خدا اور طاغوت کی عبادت و اطاعت سے آزادی و رھائی کا نعرہ لگاتا ہے، خداوند عالم کی اطاعت سے آزادی کا نعرہ نہیں لگاتا، اگرچہ انسان آزاد و مختار پیدا کیا گیا ہے، لیکن تشریعاً و قانوناً خدا کی اطاعت پر مکلف ہے یعنی ہم اپنے ارادہ و اختیار سے خدا کی اطاعت کریں، اور یہ طے ہے کہ خلقت کے اعتبار سے میں ہر مخلوق پر بندگی اور عبودیت کی مہر لگی ہوئی ہے، تکوینی طور پر کوئی بھی مخلوق خدا کی بندگی کے لیبل سے خالی نہیں ہے اور ہر موجود کی پستی اس کی عین بندگی ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ.[3]

"ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں (سب) اس کی تسبیح کرتے ہیں اور (سارے جہان) میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے (حمد و ثنا) کی تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے"

---

[1] سورہ نحل آیت ۳۶

[2] سورہ بقرہ آیت ۱۵۶

[3] سورہ اسراء آیت ۴۴

اس طرح خداوند عالم دوسرے موجودات کی عبادت اور بندگی کے بارے میں فرماتا ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ ۖ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ. [1]

"(اے شخص) کیا تو نے اتنا بھی نہیں دیکھا کہ جتنی مخلوقات سارے آسمان اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے (غرض سب) اسی کی طرح تسبیح کیا کرتے ہیں، سب کے سب اپنی نماز اور اپنی تسبیح کا طریقہ خوب جانتے ہیں"

لیکن چونکہ انسان صاحب عقل وخرد ہے، مختار و آزاد خلق کیا گیا ہے، اگرچہ خداوند عالم نے ہدایت و گمراہی کے راستے دکھادیئے ہیں لیکن اپنے لئے راستہ کے انتخاب میں آزاد ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا. [2]

"خواہ شکرگذار ہو خواہ ناشکرا"

لہٰذا انسان کو اپنے ہدف خلقت کو مدنظر رکھ کر اور اس کو سوچ سمجھ کر خدا کی اطاعت و بندگی میں مشغول رہنا چاہئے، اور خداوند عالم کا تشریعی قانون بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ شیطان اور غیر خدا کی اطاعت میں قدم بڑھائے، بلکہ انسان کو خدا کی اطاعت اور الٰہی تکالیف کو انجام دے نا چاہئے، کیونکہ خداوند عالم نے اسی مقصد کے تحت اس کو پیدا کیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. [3]

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں"

اور چونکہ خداوند عالم کی عبادت نظام خلقت و ہستی کے ہمنوا ہے اور خداوند عالم کی تکالیف کو انجام دینا اور الٰہی وظیفہ و مسئولیت پر عمل کرنا نیز اس خالق کا شکر ادا کرنا خود ایک مہربانی ہے کہ جو ہم کو حیات و زندگی عطا کرتا ہے اور اس کی عنایت اور لطف و کرم سے ہم کو صحت و سلامتی اور دوسری بہت سی نعمتیں عطا کی گئی ہیں جیسا کہ خداوند عالم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے:

الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ﴿٧٩﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ﴿٨١﴾. [4]

"جس نے مجھے پیدا کیا (وہی میرا دوست ہے) پھر وہی میری ہدایت کرتا اور وہ شخص جو مجھے (کھانا) کھلاتا ہے اور

---

[1] سورہ نور آیت ۴۱

[2] سورہ انسان آیت ۳

[3] سورہ ذاریات آیت ۵۶

[4] سورہ شعراء آیات ۷۸ تا ۸۱

مجھے (پانی) پلاتا ہے اور جب بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا عنایت فرماتا ہے اور وہ شخص جو مجھے مار ڈالے گا اس کے بعد (پھر) مجھے زندہ کرے گا"

کس طرح خدا کی اطاعت سے انکار کیا جا سکتا ہے، اور کیا واقعاً یہ حق و انصاف سے بعید نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اب ماڈرن انسان تکالیف و اطاعت کا تابع نہیں ہے، اور اپنے حقوق کا طالب ہے؟

کیا اسلام اس فلسفہ کو قبول کر سکتا ہے؟ واقعاً ایسے نظریہ کا اسلامی ہونا تو دور کی بات، یہ تو عقل اور انسانیت سے بھی خالی ہے۔

ساتویں نشست

آزادی کی حدود

1- اسلام کا سیاسی نظریہ اور آزادی کو محدود کرنے کا شبہ

چونکہ ہمارا اسلامی سماج، اسلامی قوانین اور ان متغیر قوانین پر کہ جو اسلامی دائرے میں وضع کئے جاتے ہیں، ادارہ ہوتا ہے لہٰذا ہماری حکومت بھی اسلامی قوانین پر ہونی چاہئے اور قانون کو جاری کرنے والے حضرات اسلامی دائرے سے خارج نہیں ہونے چاہئے اور ہم لوگوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ اسلامی قوانین پر عمل کریں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظریہ انسان کی آزادی سے ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں؟ انسان اپنی زندگی کے قوانین اور ان کی کیفیت کو طے کرنے میں آزاد ہے، اگر اس سے کہا جائے کہ تمہیں اس دائرے میں چلنا ہے اور ان قوانین کی رعایت کرنی چاہے تو کیا یہ انسان کی اصل آزادی جو انسان کی مسلمہ حقوق میں سے ہے، اس سے منافات تو نہیں رکھتا؟

ہم مندرجہ بالا سوال کو بیان کرنے سے پہلے مقدمہ کے طور پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اور اس نکتہ سے ہم کو بعد کی گفتگو میں اس سے استفادہ کرنا ہے، اور یہ نکتہ غور طلب ہے: جس وقت عینی اور انضمامی چیزوں سے ہمارا واسطہ ہوتا ہے، تو ان کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا مثال کے طور پر جب ہم طبیعی علوم میں عینی چیزیں جیسے پانی، بجلی، اٹھنا، بیٹھنا، اسی طرح ڈاکٹری امور میں آنکھ، کان، ہاتھ، پیر، معدہ، دل، جگر کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو ان چیزوں کو سمجھنا آسان ہے کیونکہ ہم تمام لوگ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں؟ ہاں بہت کم ایسے مسائل مبہم ہوتے ہیں جن کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے جیسے اگر پانی میں مٹی ملی ہو تو کیا پھر بھی پانی ہے یا نہیں؟

لیکن عینی اور انضمامی چیزوں کو سمجھنے میں غالباً کوئی خاص مشکل نہیں ہوتی، لیکن اگر ہمارے سامنے انتزاعی اور کسبی چیزیں ہوں (مثلاً فلسفی مفاہیم یا انسانی علوم مثلاً علم نفسیات، جامعہ شناسی، حقوق اور علوم سیاسی وغیرہ جیسی چیزیں) تو ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، اور کبھی کبھی کسی لفظ کے مختلف معنی ہوتے ہیں اور ایک لفظ کے متعدد معنی ہونے کی وجہ سے ان کو سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے غالباً ایسے الفاظ کے بارے بحث کے بعد بھی انسان کسی یقینی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔

مثال کے طور پر ہم سبھی لفظ، فرہنگ (کلچر) سے آشنا ہیں اور یہ لفظ مدارس کی مختلف کلاسوں میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح اشعار، ادبیات اور روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہوتا ہے، اس کے بعد بھی اگر کسی سے سوال کیا جائے کہ فرہنگ کے

کیا معنی ہیں؟ تو شاید ہزاروں میں ایک بھی ایسا شخص بھی نہ ملے جو فرہنگ کے معنی کرتے وقت کہے کہ اس لفظ کے 50 سے 500 تک معنی ہیں!! اور یہ مسلم ہے کہ جب اس مشہور اصطلاح میں اتنا ابہام پایا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس ابہام کی وجہ سے بہت سے اجتماعی مسائل بھی تحت تاثیر قرار پائیں گے، اور جب توسعۂ فرہنگی (کلچر کی وسعت) کی بات کی جائے گی تو سوال کیا جائے گا توسعہ فرہنگی یعنی چیست؟ اور اس کے مصادیق کیا ہیں؟ اور کس صورت میں اور کس طرح فرہنگ میں توسعہ ہوتا ہے اور اگر پارلیمنٹ میں توسعہ فرہنگی کیلئے بجٹ پاس کیا جاتا ہے اور اس کو خرچ کرنے کیلئے جگہیں معین کی جاتی ہیں، ہر روز اخبار میں اس لفظ کے معنی بیان کئے جاتے ہیں اور اس کے خاص موارد مشخص کئے جاتے ہیں اور بعض لوگوں کو اس سے غلط فائدہ اٹھانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

2- آزادی کے بارے میں مختلف نظریات

ہم نے جو کچھ انتزاعی اور کسبی الفاظ کے بارے میں عرض کیا کہ جن کے خاص مصادیق بھی نہیں ہیں اور ان کی تعریف وحد و حدود بھی مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی ایک انتزاعی مفہوم ہے جس کے بارے میں ہمیں بحث کرنا ہے، مثلاً اگر کوئی کہے" آزادی" تو سننے والے کو اچھا لگتا ہے، اور آزادی کیلئے تمام ہی مذاہب، ملت خاص احترام کے قائل ہیں، کیونکہ انسان فطری طور پر آزادی چاہتا ہے، اور بعینہ آزادی کی تلاش میں رہتا ہے۔

اگر کسی انسان سے سوال کیا جائے کہ آپ آزاد رہنا پسند کرتے ہیں یا غلام؟ لامحالہ سبھی حضرات جواب دیں گے: آزاد رہنا، اور کوئی بھی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ کسی کا غلام بن کر رہنا پسند نہیں کرے گا، لیکن چونکہ آزادی کے کوئی واضح معنی بیان نہیں ہوتے ہیں، جس کی بنا پر آزادی کا نعرہ لگانے والے افراد جو دینی اختلافات کا شکار ہو جاتے ہیں کوئی کچھ معنی کرتا ہے تو دوسرا کچھ معنی مراد لیتا ہے، ایک شخص جب آزادی کا مطلب بیان کرتا ہے تو دوسرا کہتا ہے ہماری نظر میں آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے جو آپ نے بیان کیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں جو ہم کرتے ہیں، اسی طرح دوسرا شخص بھی یہی کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس بارے میں جو کچھ اب ہماری طرف نسبت دیتے ہیں، وہ ہماری مراد نہیں ہے۔

بلکہ ہماری مراد اس کے علاوہ ہے اگر ہم آزادی کے بارے لکھی ہوئی کتابوں، مضامین اور رسالوں کا مطالعہ کریں خصوصاً وہ کتابیں جو آخری سالوں میں لکھی گئی ہیں تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ مولفین اور صاحب نظر حضرات کے دھیان آزادی کا کوئی مشخص و معین معنی نہیں ہے، ایک شخص آزادی کا کچھ معنی کرتا ہے اور اسی کا دفاع بھی کرتا ہے، تو دوسرا شخص اس نظریہ کی تنقید کرتا ہوا ایک دوسرا معنی کرتا ہے، اور ظاہر میں بات ہے کہ اس قدر اختلاف کے باوجود آپس میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا تفاہم اور سمجھوتے کیلئے آزادی کی ایک مشترک تعریف کی جانا ضروری ہے، تاکہ بحث کسی نتیجہ پر پہنچ سکے، اگر ہم سے کوئی سوال کرے کہ آزادی اور اسلام میں سازگاری ہے یا نہیں تو ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ پہلے ہمیں

آزادی کو سمجھنا پڑے گا، کہ آزادی کے معنی کیا ہیں، (اور جیسا کہ مغربی مؤلفین نے آزادی کے بارے میں حدوداً 200 تعریف بیان کی ہیں اگر چہ ان میں سے بہت سی تعریفیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں، صرف ایک یا دو الفاظ کی وجہ سے اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن ان مقامات پر یہ تعریفیں ایک دوسرے کے منافی (مخالف) ہیں تو اس طرح کے اختلافی موارد میں کس طرح یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ آزادی اسلام سے سازگار ہے یا نہیں؟

آزادی کی طرح "ڈیموکراسی" (جمہوریت) بھی ہے یہ ایک مغربی اصطلاح ہے جس کے معنی مردم سالاری، حکومت یا لوگوں کی حکومت کیئے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے کوئی خاص اور معین معنی موجود نہیں ہیں، اس میں یہ معین نہیں ہے کہ ڈیموکراسی ایک حکومت ہے یا اجتماعی زندگی کا ایک طریقہ ہے؟ کیا اس کا تعلق حکومتی اور سیاسی مسائل سے ہے؟ معاشرہ شناسی یا مدیریت سے اس کا ربط ہے؟ یہ جامعہ شناسی سے مربوط ہے یا اس کا ربط مدیریت سے ہے، اس سلسلے میں بھی بہت بحثیں ہو چکی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ ایسے الفاظ کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا بھی مشکل میں اضافہ کرتا ہے۔

اس طرح لفظ "لیبرالیسم" بھی ہے کہ جس کا ترجمہ پہلے "آزادی خواہی" ہوتا تھا اور آزادی خواہی لفظ آزادی کی وجہ سے بہت جذاب اور خاص اہمیت کا حامل تھا اور اس بنیاد پر آخری دھائیوں میں شاہ کی پہلوی حکومت "آزادی خواہ پارٹی" کا نام اپنائے ہوئے تھی۔

لہٰذا چونکہ اس طرح کے انتزاعی مفاہیم اچھی طرح واضح نہیں ہوتے ان سے بحث کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ واضح نہ ہونے کی بنا پر مطلب مشکل ہو جاتا ہے، اور قطعی طور پر ان کے معنی کی حد بیان کرنا مشکل ہوتا ہے اس طرح کے الفاظ کی کوئی خاص حد نہیں ہوتی، کبھی ان الفاظ کی حد کم ہو جاتی ہے اور کبھی بڑھ جاتی ہے اور ظاہری بات ہے کہ ان مشکلات کی وجہ سے بحث بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

لفظِ آزادی کے بارے میں ان مشکلات، ابھامات اور مختلف نظریات (جیسا کہ 200 سے زائد تعریفیں بیان کی گئی ہیں) کے پیش نظر اگر ہم اسلامی لحاظ سے آزادی کو سمجھیں اور الگ الگ تعریفوں کو اسلام کے ساتھ مقایسہ کریں تو واقعاً یہ ایک مشکل و پیچیدہ کام ہے، عمومی اور مختلف لوگوں کیلیے اس بحث کو بیان کرنا تو دور کی بات ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ بحث کو تطبیقی لحاظ سے آگے بڑھایا جائے اور دیکھیں کہ آزادی کے طرفدار حضرات آزادی سے کون سے معنی مراد لیتے ہیں؟ اور آزادی سے کیا چاہتے ہیں، اس وقت دیکھا جائے گا کہ جو وہ لوگ چاہتے ہیں وہ اسلامی نقطہ نظر سے ٹھیک ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جو آزادی چاہتے ہیں اور آزادی کی طرفداری بھی کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس ملک میں آزادی نہیں ہے، آزادی کا کیا مطلب مراد لیتے ہیں؟ کیا میڈیا آزاد نہیں ہے؟ کیا لوگ انفرادی آزادی نہیں رکھتے؟ یا سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی آزادی نہیں رکھتے؟ آزادی کا نعرہ لگانے والے لوگوں کو کس صورت میں آزاد سمجھتے ہیں؟

اگر مصادیق کے بارے میں تھوڑی بحث کی جائے تو ایک واضح نتیجہ پر پہنچنا ممکن ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا مدمقابل کیا کہتا ہے اور کیا چاہتا ہے، اس صورت میں گفتگو کی روش مبہم نہ رہے اور دوسرے افراد بھی اس سے غلط استفادہ نہ کرسکیں گے۔

3۔آزادی، مطلق نہیں ہے، اور آزادی کے دین پر مقدم ہونے کا جواب

معمولاً خود غرض اور دھوکہ باز افراد آزادی جیسی انتزاعی اور مشکل چیزوں سے اپنے اہداف و مقاصد تک پہنچنے کیلئے آزادی جیسے الفاظ سے سوء استفادہ کرتے ہیں، اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کچھ سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت میں ان کے کہنے کا مقصد فی کچھ اور ہی ہوتا ہے، مغالطہ آمیز اور دھوکہ دینے والے الفاظ کے ذریعہ لوگوں کو فریب دیتے ہیں، مثال کے طور پر تقریروں، مقالوں اور اخباروں میں یہ سوال بیان کیا جاتا ہے کہ دین آزادی پر مقدم ہے یا آزادی دین پر مقدم ہے؟ کیا اصل، آزادی ہے اور دین آزادی کے تابع ہے یا اصل دین ہے اور آزادی اس کے تابع ہے؟

معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ سوال ایک علمی اور دقیق سوال ہے اور یہ سمجھنا واقعاً جذاب ہے کہ آزادی اصل ہے یا دین اصل ہے؟ اس کا درک کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے، لیکن جب ہم بحث کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دین اصل ہے تو جواب دیتے ہیں کہ اگر کوئی آزاد نہ ہو تو کوئی پھر کس طرح دین کا انتخاب کرسکتا ہے؟ لہٰذا انسان کو دین قبول کرنے میں آزاد ہونا چاہئے،، پس نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی دین پر مقدم ہے اور جب یہ طے ہوجائے کہ آزادی دین پر مقدم ہے تو پھر یہ نتیجہ بھی آسانی سے نکل آئے گا کہ دین آزادی کو محدود نہیں کرسکتا، کیونکہ آزادی دین سے بالاتر ہے اور دین پر مقدم ہونے کا حق رکھتی ہے۔

قارئین کرام جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ مغالطہ آمیز استدلال ظاہراً تو ٹھیک دکھائی دیتا ہے، کیونکہ اگر کوئی انسان آزاد نہ ہو تو کس طرح دین کو انتخاب کرسکتا ہے، اس لئے انسان کو آزاد ہونا چاہئے، تاکہ اسلام کو دل سے قبول کرسکے، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی دین پر مقدم ہے، اور یہی اصل ہے یہی دین کو معتبر بناتی ہے، اور بنیادی طور پر دین کی علت وجودی ہے لہٰذا اپنی پیدا کی ہوئی چیز کے ذریعہ خود ختم یا محدود نہیں ہوسکتی، آخر میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہر انسان کا دینی ماحول بالکل آزادی کے ساتھ ہوگا۔

بعض دوسرے افراد یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو کسی کا غلام نہیں ہوتا بلکہ آزاد ہوتا ہے، لہٰذا زندگی اس کو میں آزاد ہونا چاہئے۔

اس طرح یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ اختیار اور آزاد ارادہ رکھنا ایک بہت اہم چیز ہے، اس بنیاد پر اگر انسان اس دنیا میں آئے اور اس کے ہاتھ پیر مفلوج ہوجائیں اور زبان سے گونگا ہوجائے تو اس کی کیا قیمت ہے؟ انسان کی قدر و قیمت اس وقت ہے جب وہ آزاد ہو جہاں چاہے جائے جو کرنا چاہے اس کو انجام دے سکے، جو چاہے اپنی زبان سے کہے اور چونکہ انسان تکوینی طور پر آزاد خلق ہوا ہے تو پھر قانونی طور پر بھی انسان کو آزاد ہونا چاہئے!

یہ وہی طبیعت گرانہ مغالطہ ہے کہ جس میں "است" (ہے) سے "باید" (ہونا چاہئے) کا غلط نتیجہ نکالا گیا ہے، اگر ہم چاہیں کہ ان تمام مسائل کو دقیق اور جدی طریقہ سے بحث کریں تو ہم کو فلسفی اور دقیق بحث کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، اور بہت جلدی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگر ہم آزادی کے بارے میں بحث کریں تو پھر دسیوں تعریفوں سے تحقیق و بررسی کرنی ہوگی، اس وجہ سے مصادیق کے سلسلے میں ہی بحث کرنا مناسب ہے، اور آزادی کا نعرہ لگانے والے افراد سے کہیں کہ: اگر کوئی شخص تمہارے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگا کر کہے میں آزاد ہوں؟! تو کیا یہ صحیح ہے؟ ظاہر سی بات ہے کہ جواب منفی ہوگا اور اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا، اور جواب یہ ملے گا کہ آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تو دوسروں پر ظلم ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی اس وقت تک مناسب ہے کہ جب تک دوسرے پر ظلم و زیادتی نہ ہو، یعنی آزادی مطلق نہیں ہے۔

اور اگر اس سے یہ کہا جائے کہ کوئی شخص تمہارے خاندان اور عورتوں کے بارے میں جو کچھ چاہے کہے، وہ تم کو مارتو نہیں رہا ہے بلکہ آپ کی بے حرمتی کر رہا ہے اور تمہارے یا تمہارے اہل خانہ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہہ رہا ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اس بات کی اجازت نہیں دے گا، کیونکہ یہ بھی دوسروں کے حقوق کی پائمالی ہے، اور ناموس کی عزت بھی معاشرے میں محترم ہے، پس معلوم ہوا کہ عزت و ناموس پر تجاوز و زیادتی ظاہری چیزوں پر منحصر نہیں ہے۔

اور اگر کوئی شخص کسی اخبار میں اس کے خلاف کچھ لکھے اور مقالہ کے ذریعہ اس کی شخصیت اور آبرو کو داغدار کرے، تو اس صورت میں کیا یہ فیزیکی اور ظاہری طور پر اس کی بے حرمتی نہیں ہوئی ہے، یعنی زبان کے ذریعہ اس کی بے عزتی نہیں ہوئی ہے، کیا کوئی اس چیز کی اجازت دے سکتا ہے؟ ہرگز کوئی شخص اس بات کو قبول نہیں کر سکتا، اور اس کام کو بھی دوسروں کے حقوق کی پائمالی اور اپنے لئے بے عزتی جانتا ہے، اور اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص اس کی آبروریزی کرے، اور اس کے حقوق کو پائمال کرے، نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کیلئے اب تک تین قیود و شرط موجود ہیں اور اگر ان شرطوں کی رعایت نہ کی جائے تو دوسروں کے حقوق کی پامالی ہے۔

4۔ ہر معاشرے کی مقدسات کی رعایت ضروری ہے۔

ایک دوسرا نکتہ کہ جس کے بارے میں بحث کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر معاشرہ کی مقدسات (قابل احترام چیزیں) الگ الگ ہیں، اور نسبی ہوتی ہیں مثال کے طور پر بعض معاشروں میں کسی کی بھن یا بیٹی سے آزادانہ رابطہ کرنا معیوب نہیں ہوتا، جیسا کہ یورپی اور امریکائی ممالک ہیں کہ کوئی بھی شخص کسی بھی لڑکی یا عورت سے دوستی کرنا چاہے، تو چاہے اس دوستی کے نتائج کچھ بھی نکلیں کوئی مشکل نہیں ہے۔

کیونکہ دونوں کی مرضی سے یہ کام ہو رہا ہے لیکن اگر کوئی شکایت کرے اور کورٹ میں جا کر اس کے خلاف مقدمہ دائر کرے کہ طاقت کے بل بوتے پر مجھ پر ظلم ہوا ہے اور میں راضی نہیں ہوں، تو عدالت اس کی اس شکایت کو سنتی ہے لیکن

صرف مرد و عورت کی دوستی کیونکہ اپنی مرضی سے ہوتی ہے، لہٰذا کوئی عیب نہیں ہے! لہٰذا اگر کوئی شخص کسی سے کہے میری اور تمہاری بہن کی دوستی ہے اور کل رات فلاں جگہ تھے یورپی فرہنگ و کلچر میں برا نہیں سمجھا جاتا، اور کوئی اس بات پر خوش بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہی بات بری سمجھی جاتی ہے اور اس کو برا سمجھا جاتا ہے کسی کو ایسی باتیں کہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا، ان باتوں سے ایک دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ہر معاشرے میں کچھ خاص چیزیں ہوتی ہیں کہ جن کو وہ محترم اور مقدس سمجھتا ہے، درحالیکہ یہی چیزیں دوسرے معاشرے میں نہیں پائی جاتیں، اب یہ دیکھنا ہے کہ ان مقدسات کا معیار کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر معاشرے کی مقدسات اس کی ثقافتی اور اجتماعی زندگی کی وجہ سے ہوتی ہیں، اور ظاہری بات ہے کہ یہ مقدسات معاشرے کی بنیاد، اس ماحول اور ملک کے ثقافتی معیار کی وجہ سے ہوتی ہیں لہٰذا اگر کسی معاشرے میں وہاں کی ثقافت کے وجہ سے کچھ چیزیں مقدس اور قابل احترام ہوں، تو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے اور ان کی بے احترامی نہیں ہونا چاہئے، اور کسی بھی معاشرے میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جو چاہے کہے، جبکہ اس کو اس طرح کی باتیں کرنا چاہئے جن سے ان مقدسات کی بے احترامی نہ ہوتی ہو۔

نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کیلئے بہت سی قید و شرط ہیں کہ جن کی ہر معاشرہ کے لحاظ سے رعایت کرنا چاہئے اور آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان جو چاہے کہے، اور جس طرح چاہے کرے، ہاں اگر جس ماحول میں وہ زبان کھول رہا ہے اسمیں اگر اس کو بے احترامی نہیں سمجھا جاتا تو اس کا کہنا صحیح ہے لیکن جس معاشرے میں وہ کہہ رہا ہے اگر وہاں اس کا یہ کہنا اس معاشرے اور مذہب کے مقدسات کی توہین ہے تو پھر کسی کو یہ حق نہیں ہے وہ مقدسات کے ہدف کچھ کہے، اور جو چاہے انجام دے اور کوئی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا، اگرچہ ہم نے جو کچھ بیان کیا، مغربی ممالک میں محترم اور بااہمیت نہیں سمجھا جاتا اور ہر انسان اپنی گفتار و کردار میں آزاد ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں چونکہ اسلامی حکومت ہے مغربی ممالک سے فرق ہے اور اس طرح کی آزادی نہیں ہے کہ جو چاہے لوگوں کی طرف نسبت دے اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے فرہنگ و ماحول میں یہ چیزیں باارزش ہیں اور ہر قوم و ملت کے مقدسات کا احترام کرنا ضروری ہے اور آزادی کے بہانہ ان کی خلاف ورزی کرنا صحیح نہیں ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ آزادی کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے ہیں اور اس قدر آزادی کو کوئی بھی عقلمند انسان قبول نہیں کر سکتا، لہٰذا آزادی کے اس طرح معنی بیان کرنے چاہئے جس سے دوسروں کی توہین اور ان کے حقوق کی پائمالی نہ ہوتی ہو۔

لہٰذا جن باتوں سے لوگوں کے مقدسات کی توہین ہوتی ہو ان کا بیان کرنا ممنوع اور ناجائز ہے، اسلامی معاشرہ میں آزادی کا بہانہ بنا کر خاص طور سے جان سے زیادہ عزیز اسلامی مقدسات کی توہین کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

ہماری قوم و ملت نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے عزیزوں کی لاکھوں جانیں قربان ہو جائیں، لیکن اسلام باقی رہے،

اب اگر مغربی کلچر میں کسی بھی طریقہ سے کسی کی توہین ہو (مثلاً یہ کہا جائے کہ آپ کی ناک بہت لمبی ہے، آپ کا قیافہ برا ہے) اس کو عدالت میں جانے اور مقدمہ دائر کرنے کا حق ہے، اسی طرح اگر ہمارے معاشرے میں کوئی شخص کسی چیز کے بارے میں توہین کرے، وہ بھی اس بارے میں کہ جو ماں، باپ، بیوی اور اولاد حتی خود اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو، ظاہر ہے کہ لوگوں کو یہ اعتراض کرنے کا حق ہے کہ آزادی کا بہانہ بنا کر ہمارے مقدسات کی توہین کیوں کر رہے ہو۔

5- آزادی کے نعرہ میں ناجائز غرض

جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں اور آزادی نہ ہونے کا غم مناتے ہیں اور ایران میں آزادی نہ ہونے کا مرثیہ پڑھتے ہیں! کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ان میں سے بعض لوگوں نے مغربی ممالک کا سفر کیا ہے یا ان کے بارے میں سنا ہے یا وہاں کی فلموں کو دیکھا ہے، جو لوگ اس طرح کی زندگی چاہتے ہیں، لیکن ایران میں ان کو اس طرح کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں ہے، اسلامی حکومت کہاں سے قوانین بناتی ہے؟ کیا اسلامی حکومت کے قوانین خدا، رسول اور آئمہ کی مرضی کے مطابق قوانین نہیں ہوتے ہیں؟ وہ لوگ الٰہی احکام کو قبول نہیں کرتے، ولی فقیہ پر اعتراضوں کی بوچھار کرتے ہیں اور ولی فقیہ کے متعلق کینہ رکھتے ہیں جبکہ ولی فقیہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہتا:

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ۔ [1]

"یہ لوگ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ (یہ) ظالم (حقیقتا) خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں"

کیا مرجع تقلید اور فقیہ اپنی طرف سے کچھ کہتا ہے؟ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے قرآن، احادیث سے اخذ کرتا ہے لیکن دشمن اس چیز کو قبول نہیں کرتا، امریکہ کی معتبر یونیورسٹیوں کی کھلی فضا میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے سامنے ایسے ایسے کام کرتے ہیں کہ جن کے بیان کرنے سے شرم آتی ہے، وہاں کے عیاش خانوں میں کیا کیا ہوتا ہے؟ تصور کریں اگر وہاں کے عیاش خانوں کی ویڈیو بنائی جائے اور اس کو اس ملت کے جوانوں کو دکھائی جائے تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی جوان ایسی فلمیں دیکھیے گا، اور جب صبح اٹھ کر یونیورسٹی جائے گا تو پھر سکون سے نہیں رہ سکے گا، کیونکہ رات میں سویا ھی نہیں ہے، اور دوسری طرف اس کی شہوت تحریک ہو جاتی ہے، اور اس کا چین وسکون غائب ہو جاتا ہے، اب اگر ایسا جوان نعرہ لگائے کہ یہاں آزادی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو میں کرنا چاہتا ہوں، اس کو کرنے نہیں دیا جاتا اسلام کے مقابلہ میں اسی طرح کی آزادی کو لایا جاتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے کہ آزادی مقدم ہے یا اسلام؟ اس آزادی کا مطلب ہی جنسی شہوات کو پورا کرنا ہے، لہٰذا شروع ہی سے یہ کہا جائے کہ آزادی سے ہم یہ چاہتے ہیں، ہر وہ چیز جو کچھ کفر والحاد کے ماحول میں ہوتی ہے وہی معاشرے میں بھی جائز ہو جائے تو وہ مطمئن رہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ لوگوں نے اپنے عزیزوں کی جانیں قربان کی ہیں تاکہ اسلام کا رواج

---

[1] سورۂ انعام آیت ۳۳

ہو، نہ کہ مغربی فساد اور بے ہودگی رائج ہو۔

ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم واقعاً مسلمان ہیں اور اس حکومت کو ووٹ دیا ہے اور ولایت فقیہ کے معتقد ہیں اور جیسی آزادی مغربی ممالک میں رائج ہے ایسی آزادی نہیں چاہتے، بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم لکھنا چاہیں اس کو بغیر کسی روک ٹوک کے بے جھجک لکھ سکیں ہم تو آزادی بیان وقلم اور عملی آزادی کے خواہاں ہیں، ہم کو اپنی بات کہنے کی آزادی ملنا چاہئے۔

یہ بات ظاہراً ٹھیک ہے کیونکہ حقوق بشر کے نشریات میں سے ایک حق جو تمام لوگوں کو ہے یہی آزادی بیان اور میڈیا کی آزادی ہے اور اسی طرح کی آزادی کو ڈیموکراسی کی ایک اصل مانا گیا ہے، لیکن ہم ان سے یہ کہیں گے کہ آپ اپنی رائے کا اظہار کریں کہ ہمارے ملک کے حکمران کیسے ہیں لیکن کیا واقعاً آپ کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں شہر کا فلاں قاضی صحیح کام کرتا ہے یا نہیں یا فلاں شہر کا ڈی ایم (D-M) ٹھیک کام کرتا ہے یا نہیں یا فلاں ملازم کا کردار صحیح ہے یا نہیں؟ یا در حقیقت آپ اصل اسلام اور اسلامی مقدسات کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں اور ان تمام چیزوں کی نفی کرنا چاہتے ہیں؟ یا اسلامی مقدسات کی توہین کرنا چاہتے ہیں؟

6۔ آزاد گفتگو کی حد وحدود

اگر آزادی سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جس کام کا ہونا جائز نہیں ہے اس کے بارے میں لکھنا اور کہنا جائز ہونا چاہئے، جیسا کہ ہم نے مثال میں عرض کیا تو جب کسی شخص کو آپ کے سلسلے میں کوئی توہین آمیز کلمات کہنے کا کوئی حق نہیں ہے، یعنی وہ اتنی آزادی نہیں رکھتا لیکن جب اسلامی مقدسات کی بات آتی ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ آزادی بیان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جو چاہیں لکھیں ہم جو چاہیں کہیں!

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی آپ کے بارے میں توہین آمیز کلمات زبان پر جاری کرے، اور اگر کوئی ایسا کرے تو آپ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور مقدمہ دائر کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں، آپ اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ذاتی مسائل کو اخبار میں دیا جائے تو پھر آپ کو اس ملت کے راز فاش کرنے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا؟ کس طرح آپ کی نظر میں کسی ایک شخص کے راز کو فاش کرنا جائز نہیں ہے، لیکن ایک ملت کے راز کو فاش کرنا جائز ہو گیا! یعنی آپ کی نظر میں جب ایک شخص لاکھوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو کیا اس کے راز کو فاش کرنا جائز ہے؟! کیا ایک معاشرے کی نسبت اپنے مقالوں میں حدود کی رعایت کرنا ضروری نہیں ہے؟ کیا کچھ بھی لکھا اور کیا جا سکتا ہے، معاشرے کے بھی کچھ حقوق ہیں، اس کے مقدسات ہیں اور ان کا احترام باقی رہنا چاہئے اور مقدسات کو مجروح نہیں کیا جا سکتا۔

جس طرح آپ اپنی توہین کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، اسی طرح آپ اپنی ناموس یا آپ کے گھریلو اسرار کے بارے میں تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتے، تو پھر آپ کس طرح اجازت دیتے ہیں کہ اس عظیم معاشرے جس

نے ہزاروں عزیزوں کو ان مقدسات کی حفاظت کیلئے قربان کردیا ہے اس کی توہین کی اجازت دیتے ہیں؟!

کیا آپ کی نظر میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے، ؟اور آزادی کا بہانہ بنا کر قانون کی طرف سے کوئی حد وحدود نہیں ہونا چاہئے؟ کیا آزادی مطلق ہے؟ اور اگر آزادی مطلق ہو تو کسی کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا حق حاصل ہونا چاہئے ےاور اگر اس ۶ /کروڑ والی ملت کی مقدسات مجروح ہوں اور کوئی تم پر اعتراض کرے تو آپ جواب میں کہیں: اظہار نظر کرنا آزاد ہے! اس سے بڑا مغالطہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے احترام کو مجروح کرنا جائز نہیں ہے لیکن ۶ /کروڑ والی ملت کے مقدسات کو مجروح کرنا جائز ہے، لیکن ایک عرب مسلمانوں کے مقدسات کو مجروح کرنا جائز ہے! یہ کونسی منطق اور فلسفہ ہے؟ اور صرف اس وجہ سے کہ حقوق بشر کے نشریات میں موجود ہے کہ بیان آزاد ہے مقدسات کی توہین کرنا بھی آزاد ہوجائے گا؟! آزادی کا ایک مبہم کلمہ استعمال کرتے ہیں اور ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کی تفسیر کرکے سوء استفادہ کرتا ہے۔

7۔ الفاظ کے مفہوم اور مصادیق کو روشن کرنے کی ضرورت

ہم یہاں پر یہ مشورہ نہیں دیتے ہیں کہ مبہم اور غیر واضح الفاظ کو استعمال کرنے کے بجائے ان کے مصادیق پر تکیہ کریں اور کہیں کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً یہ کہنے کے بجائے کہ اسلام ڈیموکراسی کے موافق ہے یا نہیں؟ کہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور کون سا عمل انجام دینا چاہتے ہیں؟ کیا آپ خدا اور اس کے احکام کو نادیدہ کرنا چاہتے ہیں اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا، اگر ڈیموکراسی کے یہ معنی کیے جائیں کہ انسان جس طرح کے قوانین بنانا چاہے بنا سکتا ہے اگرچہ خدا کے قوانین کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں، تو چاہے پوری دنیا زور لگائے ہرگز ہم ایسی ڈیموکراسی کو قبول نہیں کرسکتے۔

لیکن اگر ڈیموکراسی کے یہ معنی کیے جائیں کہ لوگ اپنی سرنوشت اور زندگی میں مؤثر ہیں، کوئی شخص اپنے زور کے ذریعہ ان پر تحمیل نہیں کرسکتا، افراد بھی اسلامی قوانین اور بنیادوں کے دائرے میں چلیں، تو اس چیز پر تو شروع انقلاب سے عمل ہورہا ہے، اور اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ایران کے برابر کسی بھی ملک میں لوگوں کی کا احترام نہیں کیا جاتا، تو شاید دعویٰ بے جا نہ ہوگا، اور شاید کہنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ ہمارے پاس اس حد تک ثبوت نہیں ہیں، لیکن پھر بھی ہمارا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اتنی آزادی نہ ہو، لہٰذا لفظ ڈیموکراسی پر بحث ومباحثہ کرنا کہ اسلام ڈیموکراسی کا موافق ہے یا مخالف ہے؟

اس سے بہتر یہ ہے کہ پہلے اس کے مصادیق کو معین کرلیں، مثلاً کیا اسلام ہم جنس بازی کے آزاد ہونے کی اجازت دیتا ہے؟ چاہے تمام ہی لوگ ایسا نظریہ رکھتے ہوں، ظاہر ہے کہ اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا اگر تمام ہی لوگ اس چیز کے موافق ہی کیوں نہ ہوں اور اس بارے میں ووٹ بھی دیں، لہٰذا اگر ڈیموکراسی اس حد تک بے لگام ہو تو پھر ہم اس کو نہیں مانتے لیکن اگر ڈیموکراسی سے مراد یہ ہو کہ افراد انتخابی مہم میں آزاد ہیں پارلیمنٹ کے ممبران کو آزادانہ طور پر منتخب کریں، صدر کا انتخاب آزادانہ طریقہ پر ہو اور ان کو حق ہے کہ ممبران پارلیمنٹ یا دوسرے ذمہ دار افراد سے کسی مسئلہ میں وضاحت مانگے تو ایسی آزادی ہونا چاہئے کہ الحمد للہ ہمارے یہاں یہ آزادی ہے، اور ہم بھی سو فیصد اس کی حمایت کرتے ہیں، لہٰذا اس کے لئے

الفاظ کی بحث میں جانے سے بہتر یہ ہے کہ ان کے مصادیق کے بارے میں بحث کی جائے، کھلے عام کہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں تا کہ اس کا جواب بھی واضح طور پر دیا جا سکے۔

اور اگر الفاظ مبہم اور نامشخص استعمال کئے جائیں گے تو ان کے جوابات بھی مبہم دیئے جائیں گے، درج ذیل الفاظ جیسے آزادی، ڈیموکراسی، لیبرالیسم، جامعہ مدنی، تمدن اور فرہنگ وثقافت مبہم ہیں کہ جن کی مختلف تفسیریں کی جاسکتی ہیں لہٰذا ان کے بارے میں بحث ومباحثہ کرنا کبھی بھی عقلمندی نہیں ہے، صاف کہیں کیا چاہتے ہیں تا کہ ہم اس کا جواب دیں کہ آیا اسلام سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

آٹھویں نشست

حکومت کے ڈھانچے کی وضاحت

1۔ عنصری اور مصداقی تعریف کی اہمیت

ہم اس جلسہ میں اسلامی حکومت کے ڈھانچے اور شکل وصورت کے بارے میں بحث کریں گے، یہاں پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت امام خمینیؒ کا ایک مختصر سا واقعہ بیان کریں:

انقلاب کے ابتدائی دور میں ایک بیرونی رپوٹر نے حضرت امام خمینیؒ سے سوال کیا کہ آپ شاہ کی حکومت کو سرنگوں کرنے کے بعد کون سی حکومت تشکیل دیں گے؟ تو آپ نے فرمایا: ہم حضرت علی علیہ السلام کی طرح حکومت بنائیں گے، ظاہر ہے کہ اس خارجی خبرنگار کے لئے اسلامی حکومت کو سمجھنا مشکل تھا کیونکہ وہ اسلامی ثقافت کو سمجھنے سے قاصر تھا، اس کو سمجھانے میں گھنٹوں درکار تھے؛ لیکن حضرت امام خمینیؒ نے اس کو ایک جملہ میں قانع کنندہ جواب دیدیا، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو دشمن اور دوست سبھی جانتے ہیں اور اس کے لئے زیادہ مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت نہیں تھی، اور ساتھ ساتھ ہماری حکومت کی بھی شناخت ہوگئی۔

اس قسم کی تعریف ووضاحت؛ یعنی اس طرح کی سادہ اور مصداقی تعریف عوام الناس کو سمجھانے کے لئے بہت بہتر ہے، کیونکہ انتزاعی اور فلسفی چیزیں عوام الناس کو سمجھانے کے لئے مشکل ودشوار ہوتی ہے، کہ جس میں خارجی مصداق سے سروکار ہوتا ہے، لہٰذا خارجی نمونہ پیش کرکے کسی کو سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ بجلی یعنی کیا؟ تو روشن بلب کی طرف اشارہ کرکے یا دوسرے الیکٹریک سامان کی طرف اشارہ کرکے اس کو سمجھایا جاسکتا ہے، کہ یہ سامان بجلی سے چلتے ہیں تو اس کی سمجھ میں بجلی کا مفہوم آجائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کسی چیز کی تعریف کرنا جس میں اس کی ذاتیات اور عوارض اور اس کی اصلی خصوصیت سے اجتناب کیا جاتا ہے، لیکن علمی اور اکیڈمیک اصطلاح میں اگر کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے تو اس کی ذاتی یا عرضی خصوصیات کو بیان کیا جاتا ہے کہ جن میں سے منطق کی مشہور تعریف ہے کہ جس میں جنس وفصل ذکر کی جاتی ہے، اس طرح کی تعریف میں پہلے ایک عام اور وسیع مفہوم کو تصور کیا جاتا ہے اور اس کے بعد ایک خاص مفہوم کو ذکر کیا جاتا ہے تاکہ دوسری چیزیں اس میں شامل نہ ہو۔

کسی چیز کی پہچان اور تعریف کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے عناصر کو شمار کیا جاتا ہے؛ یعنی کسی ایک ماہیت کے لوازم اور خصوصیات کی تحقیق کی جاتی ہے اور ان سب کو ملا کر اس چیز کی تعریف قرار دیدی جاتی ہے، اور کوئی بھی شخص اس کی خصوصیات کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتا ہے کہ جو چیز بھی وہ خاص خصوصیات رکھتی ہوگی وہی فلاں چیز ہوگی۔

2۔ اسلام اور تینوں قوتوں کے جدا جدا ہونے کا نظریہ

حکومت کے وسیع پیمانے پر تعریف کرنا اور اس کی ان خصوصیات کو بیان کرنا جن کو اسلام نے بیان کیا ہے، یا سیاست کے بارے میں اسلام کے نظریہ کو ایک جملہ میں اس طرح کہا جاسکتا ہے: کہ سیاست کے بارے میں اسلام کا نظریہ ہے کہ سیاست اور حکومت کے تمام امور الٰہی اور وحی سے الہام گرفتہ ہیں، اور یہی چیزیں حکومت اور نظام اسلامی بن جانے کی ضمانت ہوتی ہیں۔

مزید وضاحت اور اسلامی حکومت کو ایک جامع شکل پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ (حکومتی) قوتوں کے جدا جدا ہونے کے نظریہ کو بیان کیا جائے کہ جو "حقوقی فلسفہ" میں بیان ہوتی ہیں، ان آخری چند صدیوں میں مغربی حقوق داں فلسفی حضرات کے درمیان کافی کشمش ہوتی آئی ہے کہ (حکومتی) قوتوں کو ایک جگہ ہونا چاہئے یا الگ الگ کہ ہر شخص یا ہر گروہ صرف ایک طاقت کا مالک ہو، اور آخر کار "رنسانس" کے زمانے کے بعد بالخصوص "منتسکیو" کے زمانے کے بعد (منتسکیو نے اس سلسلہ میں ایک ضخیم کتاب بنام "روح القوانین" لکھی کہ جس میں طاقتوں کے جدا ہونے پر بہت زیادہ تاکید اور اصرار کیا ہے)، حقوقی فلاسفہ نے اس بات پر اجماع واتفاق کر لیا کہ حکومتی طاقتوں کو جدا جدا ہونا چاہئے اور یہ نظریہ پیش کیا کہ حکومت کی تینوں طاقتیں:

1۔ "قوہ مقننہ" (قانون گذار طاقت یعنی پارلیمینٹ)

2۔ "قوہ مجریہ" (یعنی صدر مملکت یا وزیر اعظم اور "قوہ قضائیہ" (عدالتی طاقت) ڈیموکراٹک اور جمہوریت حکومتوں کا اصلی[1] ستون سمجھے جاتے ہیں، اور ان تینوں طاقتوں کے لئے الگ الگ دائرہ اور مستقل میدان تصور کیا جاتا ہے، اس طرح کہ ایک طاقت کو دوسری طاقت میں دخالت کرنے کا کوئی حق نہیں، اور ہر ایک ان میں سے مستقل ہوتی ہیں، اس نظریہ میں ہر قوت کو الگ الگ کرنے کے بعد اس کی تعریف بھی کی گئی ہے، کہ جن کو ہم یہاں پر مختصر طور پر بیان کرتے ہیں:

الف۔ قوہ مقننہ:

حکومت کا ایک اہم رکن قوہ مقننہ ہے کیونکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں ہر وقت تغیر وتبدیلیاں پائی جاتی ہیں اور ہر زمانہ کے شرائط مختلف ہوتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کچھ لوگ ان پر تبادلہ خیال اور غور وفکر کر کے مناسب قانون وضع کرتے ہیں،

---

[1] عام اصطلاح میں کبھی کبھی "حکومت" تینوں طاقتوں پر استعمال ہوتا ہے، اور کبھی کبھی حکومت صرف "قوہ مجریہ" پر اطلاق ہوتا ہے، البتہ یہ معنی خاص مواقع پر استعمال ہوتے ہیں اور اکثر اوقات حکومت سے مراد وہی عام معنی ہیں جو تینوں طاقتوں پر استعمال ہوتا ہے۔

اور قوہ مقننہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کے بنائے گئے قوانین معتبر اور واجب الاجراء ہیں۔

ب۔قوہ قضائیہ:

قوانین کو معتبر اور رسمی ہونے کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کلی قوانین کو خاص موقع ومحل پر مطابقت اور لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو روشن کیا جائے۔

نیز اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے قوہ قضائیہ کا ہونا ضروری ہے، یعنی قانون کے بننے کے بعد شہریوں کے اختلاف کی صورت میں یا گروہوں کے درمیان اختلاف یا عوام الناس اور حکومت کے درمیان اختلاف کو حل کرنے اور لوگوں کے حقوق کو پامال ہونے سے بچانے کے لئے اور قوانین کو مذکورہ موقع ومحل پر مطابقت، قضاوت اور فیصلہ کرنے کے لئے قوہ قضائیہ کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ صرف پارلیمنٹ میں قوانین پاس ہونے سے مشکل حل نہیں ہوتی، کیونکہ اختلافی صورت میں ہر ایک شخص اپنے کو حق سمجھتا ہے اور اپنے حق میں قانون کی تفسیر کرتا ہے۔

ج۔قوہ مجریہ:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معاشرہ اپنے اہداف ومقاصد تک پہنچنے کے لئے قانون کا محتاج ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تمام عوام الناس تمام قوانین کی رعایت کریں؛ کیونکہ مختلف وجوہات سے قانون کی مخالفت ہوسکتی ہے، قانون کے لئے ضرورت ہے کہ اس کے جاری ہونے کی ضمانت بھی ہو، اور یہ ضمانت اجرائی قوہ مجریہ کے ذریعہ ممکن ہے، (کہ جس کے پاس قوانین کو جاری کرنے کے لئے باندازہ کافی وسائل ہوتے ہیں)، لہٰذا قوہ مجریہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرائے اور خلاف ورزی سے روکے، اور اسی طرح قوہ قضائیہ کے احکامات (سزا وکیفر) کو بھی جاری کرے، اور اس سلسلہ میں قوانین کو جاری کرنے اور خلاف ورزی کرنے والوں اور مجرموں کو سزا دینے کے لئے پولیس وغیرہ کا بھی سہارا لیا جاسکتا ہے۔

ہم نے مختصر طور پر جمہوریتی نظام میں تینوں طاقتوں کے جدا ہونے کے نظریہ کو بیان کیا، اگر چہ ہم اس سلسلہ میں اسلام کے نظریہ کو بیان کرنے کے درپے نہیں ہیں، لیکن اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی جمہوری ایران کے اساسی اور بنیادی قانون میں ان طاقتوں کو جدا ہونے کے نظریہ کو قبول کیا گیا ہے، لیکن یہ تینوں طاقتیں ولایت فقیہ کی زیر نظر ہوتی ہیں جس کی وجہ سے نظام اسلامی ہوجاتا ہے، چاہے اسلامی نظام میں تینوں طاقتوں کی مشروعیت اس چیز کی وجہ سے ہے کہ یہ سب کے سب الٰہی اور اسلامی ڈھانچہ رکھتے ہوں اور ان کا رابطہ خداوند عالم سے ہوں اور ولایت فقیہ کی وجہ سے ہی نظام الٰہی ہوجاتا ہے اور نظام کی مشروعیت کا ملاک ومعیار بھی یہی ولایت فقیہ ہے۔

جس وقت ہم اسلام کے قوانین کی وضع اور ان کو جاری کرنے کی باتیں کرتے ہیں اور ہم یہ دعوی کرتے ہیں کہ تمام قوانین اور مقررات الٰہی اور اسلامی ہونا چاہئے، تو ہم اس بات کو مسلم اور طے شدہ مان لیتے ہیں کہ اسلام کا خلاصہ نماز وروزہ

اور دوسری عبادتوں میں نہیں ہوتا؛ بلکہ اسلام ایک کامل مجموعہ کا نام ہے کہ جس میں اجتماعی قوانین بھی شامل ہوتے ہیں۔

یعنی اجتماعی قوانین کے تمام شعبے اسلام میں شامل ہوتے ہیں، جیسے مالی مسائل، حقوق مدنی، تجارتی حقوق اور بین الاقوامی حقوق وغیرہ کہ جن کی معاشرہ کو ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا ہم یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اسلام کے قوانین اجتماعی قوانین ہیں اور اسلام حکومت کو بھی ذمہ دار بناتا ہے کہ اس کے قوانین کو معتبر جانے اور ان کو عملی جامہ پہنائے، اور اگر کوئی حکومت اسلام کے قوانین کو معتبر نہ جانے اور ان کو جاری کرانے کی فکر میں نہ رہے، تو اسلام کی نظر میں اس حکومت کا کوئی اعتبار اور مشروعیت نہیں ہے۔

3۔ اسلام معاشرہ کو ادارہ نہیں کرسکتا (ایک شبہ)

یہاں پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ آج کل انسان کی زندگی ترقی یافتہ دور میں بڑے پیمانے پر نئے نئے قوانین کا نیاز مند ہے اور ان سب کا جواب قرآن کریم یا سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کلام ائمہ معصومین علیہم السلام میں نہیں پایا جاتا، آج انسان کو اس طرح کے قوانین کی ضرورت ہے کہ جو صدر اسلام میں بالکل بھی موجود نہیں تھے تو ان کا حکم ہی کہاں سے بیان ہوا ہوگا، مثال کے طور پر فضائی اور ہوائی لائن کے مسائل کو پیش نظر رکھیں کہ کیا کوئی ہوائی جہاز کسی دوسرے ملک کی فضا میں بغیر اس ملک کی اجازت کے گذر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کے قوانین قرآن یا حدیث رسول یا کلام ائمہ معصومین علیہم السلام میں نہیں ہیں کیونکہ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا تصور ہی نہیں تھا تا کہ یہ مسئلہ پیش آتا کہ ہوائی جہاز دوسرے ملک کی فضا سے گذر سکتا ہے یا نہیں۔

اسی طرح ٹرافک اور ڈرائیورنگ کے مسائل، اس وقت میں بس یا گاڑی کا وجود ہی نہیں تھا کہ اس کے قوانین بیان ہوتے، اسی طرح دوسرے قوانین کہ جن کی انسان کو اس وقت ضرورت ہے مثلاً دریا اور سواحل کے قوانین، اور اس طرح کے دوسرے قوانین کہ جن کے بارے میں ابھی تک خاص قوانین نہیں بنائے گئے اور ضرورت ہے اس بات کی کہ حقوق داں اور قانون گذار حضرات اس سلسلہ میں بڑے غور وفکر سے ان کے لئے قوانین بنائیں۔

لہٰذا ان چیزوں کے پیش نظر قرآن اور حدیث میں ذکر کئے گئے قوانین انسان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتے، تو پھر کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرہ میں اسلامی قوانین نافذ ہونا چاہئے جبکہ بعض چیزوں کے بارے میں اسلام کوئی قانون ہی نہیں رکھتا،!

لہٰذا انسان کے لئے ایسے قوانین کی واضح ضرورت ایک طرف، اور اسلام میں ایسے قوانین موجود نہ ہونا دوسری طرف، تو اس موقع پر کیا کیا جائے؟ اور ایسے موقع پر ہم کس طرح اسلامی قوانین پر پابند ہوں؟ اب تک جو ذکر ہوا یہ ان لوگوں کا نظریہ تھا جو اسلام کو نہیں مانتے اور یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین معاشرہ کو چلانے کے لئے کافی نہیں ہیں؛ اور ان کی جگہ بشریت کے بنائے ہوئے قوانین کی طرف رجوع کیا جائے، اعتراض کرنے والوں نے موضوع مشکل اور پیچیدہ کرنے

کے لئے اس اعتراض کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے اور لوگوں نے اپنے مختلف خواہشات کی بنا پر اس سلسلہ میں مختلف بیان دیا ہے۔

لیکن ان سب کا ہدف اور مقصد اسلامی حکومت کو کمزور اور متزلزل کرنے کے لئے ہے کہ اسلام معاشرہ کو ادارہ نہیں کرسکتا، لہٰذا اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کی باتیں کرنا اور ان پر اصرار اور تاکید کرنا بے فائدہ ہے، لہٰذا حکومت کو اسلامی ہونے کے نظریہ کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے کیونکہ یہ کام ہونے والا نہیں ہے، افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بعض اسلامی انقلاب کے طرفدار اور اسلام کے معتقد افراد بھی اس شبہ کے تحت تاثیر واقع ہوتے جارہے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ اس اعتراض کا مناسب اور محکم جواب دیا جائے تاکہ اسلام کے قوانین پر پابند رہیں اور جن مسائل میں معاشرہ کی ضرورت کے تحت اسلام میں قوانین کو نہ پائیں تو اس کے راہ حل کو پہچان لیں۔

4۔قوانین کی مختلف اقسام اور متغیر قوانین ہونے کی ضرورت

مذکورہ اعتراض کے جواب میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ "قانون" کے ایک وسیع اور عام معنی ہیں اور "تکوینی" قوانین بھی اس میں شامل ہوتے ہیں؛ مثلاً فیزیک اور شیمی کے قوانین اور قانون لاوازہ، جاذبہ نیوٹن اور نسبیت انیشٹین، اس طرح کے قوانین (کہ جو تکوینا موجود ہیں اور واقعیت بھی رکھتے ہیں) دانشمندوں کے ذریعہ کشف ہوتے ہیں اور بنائے جانے والے نہیں ہیں، اور یہ قوانین ثابت اور طبیعی و واقعی چیزوں سے مربوط ہیں، اور حقوقی اور سیاسی مسائل سے ان کا کوئی ربط نہیں ہے، اسی طرح عقلی قوانین؛ مثلاً منطقی اور فلسفی قوانین اور میتہ میٹھک کے مسائل سے ہماری بحث نہیں ہے، بلکہ ہماری بحث ان قوانین سے ہے کہ جو قابل وضع ہیں جن کو اصطلاح میں "اعتباری قوانین" کہا جاتا ہے، ان قوانین کا اعتبار اور ان کا جاری کرنا اس صورت میں صحیح ہے کہ کوئی معتبر مرکز ان کو وضع کرے، اور قوانین کی تین قسمیں ہیں:

الف۔قانون اساسی

قانون اساسی (بنیادی قوانین) ان قوانین کو کہتے ہیں کہ معمولاً ثابت اور ہر ملک کی ثقافت کے اعتبار سے بنائے جاتے ہیں، یہ قوانین نسبتاً ثابت (غیر قابل تبدیل) ہوتے ہیں اور ایک طولانی مدت تک جاری رہتے ہیں، یہ روزمرہ والے قوانین نہیں ہوتے اور انہیں کو معاشرہ کو ادارہ کرنے کی اصل سمجھا جاتا ہے، یہ قوانین ثابت ہونے اور پیہم تبدیلی نہ ہونے کی وجہ سے کلی اور محدود ہوتے ہیں؛ اسی وجہ سے ہر ملک کے اساسی اور بنیادی قوانین چند اہم اور بنیادی اصولوں کو شامل ہوتے ہیں۔

لہٰذا جزئی اور وہ وقتی قوانین کہ جن کی ضرورت بھی زیادہ ہے لیکن زمان و مکان کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، ان کو قانون اساسی میں رکھا جائے، اور قانون اساسی میں کلی قوانین اور ثابت قوانین پر ہی اکتفاء کی جائے اور اس میں جزئی قوانین کو بیان کرنے سے پرہیز کیا جائے، مگر وہ جزئی اور محدود قوانین کہ جو اہم ہیں اور ان کا ذکر ہونا ضروری ہو۔

ب۔ پارلیمینٹ کے بنائے گئے قوانین

قوانین کی دوسری قسم وہ ہے کہ جن کو پارلیمینٹ میں بنایا جاتا ہے، اگر چہ بعض مملکوں میں پارلیمینٹ کے علاوہ "مجلس سنا" بھی بنائی جاتی ہے یا اس کو کوئی دوسرا عنوان دیدیا جاتا ہے، اور اس کے قوانین بھی پارلیمینٹ کے قوانین کی طرح معتبر مانے جاتے ہیں، ہمارے ملک میں بھی پارلیمینٹ کے علاوہ ایک "مجلس شورای نگہبان" ہوتی ہے کہ جو دوسرے ممالک میں مجلس سنا یا قانون اساسی کورٹ کی طرح ہے جس میں کچھ فقہاء اور حقوق داں حضرات شامل ہیں، مجلس شورای نگہبان اسلامی پارلیمینٹ کے بنائے گئے قوانین کو قانون اساسی اور قوانین شرعی سے تطبیق کرتے ہیں، اور اگر وہ قوانین قانون اساسی اور قانون شرعی سے موافق نہ ہوں تو ان کو لوٹا دیتے ہیں تا کہ ان پر نظر ثانی کی جاسکے۔

ج۔ انجمنِ حکومت کے بنائے گئے قوانین

ہر ملک میں پارلیمینٹ کے بنائے گئے قوانین کے علاوہ دوسرے مرکزوں کے ذریعہ بھی قوانین بنائے جاتے ہیں اور وہ بھی لازم الاجراء ہوتے ہیں، جس کا نمونہ انجمن حکومت (ہیئت دولت) کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، قانون اساسی نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ حکومتی انجمن خاص موقعوں پر قانون بنائے، اسی طرح صدر مملکت بھی خاص موقعوں پر اپنے مرضی کے مطابق تصمیم گیری کرے، اور یہ حکومتی انجمن اور صدر مملکت کے بنائے ہوئے قوانین پارلیمینٹ میں نہیں جاتے بلکہ خود ہی قانونی اور لازم الاجراء ہوتے ہیں، اور اسی طرح وہ قانون دستاویز اور بخش نامے جو کسی وزیر کے ذریعہ بعض اداروں اور دوسرے مرکزوں کو دیئے جاتے ہیں، اور ان کو بھی ایک طرح کا قانون کہا جاتا ہے اور حکومت ان کو بھی جاری کرنے کی ضامن ہوتی ہے، لہٰذا ہمارے ملک اور اسی طرح دوسرے بعض ملکوں میں تین طریقہ کے قانون ہوتے ہیں:

1- قانون اساسی۔

2- پارلیمینٹ کے بنائے ہوئے قوانین۔

3- حکومتی انجمن یا صدر مملکت کے بنائے ہوئے قانون اور اسی طرح ان مرکزوں کے قوانین جن کو قانون نے ہی اجازت دی ہو۔

اور ظاہر ہے کہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں کسی بھی زمانہ میں ممکن نہیں ہے کہ تمام قوانین ومقررات کو ایک جگہ اور ایک ہی زمانہ میں بنا لیا جائے، چونکہ وضع شدہ قوانین اور اجرائی آئین نامے زمان ومکان کے بدلنے کے لحاظ سے ضرورت ہے کہ قانون تبدیل ہوں یا ان پر تجدید نظر ہو، مثلاً پارلیمینٹ آج کوئی قانون بناتا ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ کل حالات بدل جائیں اور اس قانون کو بدلنے اور ان میں تجدید نظر کرنے کی ضرورت پیش آجائے، اسی طرح اجرائی مقررات اور قوانین بھی حالات کے لحاظ سے قابل تبدیل ہیں اور ان پر نظر ثانی ہوتی رہتی ہے۔

اسی طرح جب کوئی حکومت بدلتی ہے تو ایک محدود دائرے میں رہ کر کچھ قوانین کو بدل سکتی ہے، البتہ وہ لوگ جو

معاشرہ کی بھبودی چاہتے ہیں ان کی ہمیشہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ قوانین کو اس طرح دقت اور غور وفکر کرنے کے بعد بنایا جائے کہ معاشرہ کے لئے بہت مناسب ہوں اور اس میں کم سے کم خامیاں ہوں، ظاہر ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قوانین کو اسلامی ہونا چاہئے تو اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ تمام قوانین چاہے قانون اساسی ہوں یا پارلیمینٹ کے بنائے ہوئے قوانین، سب کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

5۔قوانین کا اسلامی ہونے کا مطلب

قوانین اور مقررات کے اسلامی ہونے اور ان کے معنی کی وضاحت کے بارے میں، عمومی قوانین کے اوپر نظر کرنا مفید ہے، نمونہ کے طور پر قوہ مجریہ یا ہیئت حکومت اسی دائرے میں رہ کر قوانین کو بنا سکتی ہے کہ جن میں پارلیمینٹ نے اجازت دی ہو، یعنی ان کے دائرہ وسیع نہیں ہے، دوسرے الفاظ یوں عرض کیا جائے کہ ان کے اختیارات کی حد، قانون اساسی اور قانون پارلیمینٹ معین ومحدود کرتے ہیں، اور اجرائی قوانین بھی اسی کے تحت ہونا چاہئے، یعنی یہ قانون ان کلی احکامات کے مصادیق ہیں کہ جو قانون اساسی اور پارلیمینٹ کے قانون میں پاس ہو چکے ہیں، لہٰذا یہ قانون پہلے قانون اساسی اور قانون پارلیمینٹ میں بیان ہوتے ہیں، اس کے بعد ہیئت حکومت یا دوسرے صاحب منصب حضرات خاص موارد میں ان کلیات کے مصادیق کو قانون کی شکل میں تنظیم کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ قانون صرف ان کے دل خواہ نہیں ہوتے بلکہ قانون اساسی اور قانون پارلیمینٹ کے موافق ہوتے ہیں، اور پارلیمینٹ کے قانون بھی شورای نگہبان کے تائید شدہ ہونے چاہئے اور اسی صورت میں یہ قانون معتبر ہوتے ہیں اور ان کے جاری ہونے کی ضمانت ہوتی ہے، لہٰذا ان قوانین کا معتبر ہونا اور لازم الاجراء ہونا اس چیز پر موقوف ہے کہ وہ پارلیمینٹ کے قوانین کے موافق ہوں، اور پارلیمینٹ کے قوانین کے معتبر ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ قانون اساسی کے موافق ہوں، اور قانون اساسی کے معتبر ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خداوندعالم کے تشریعی ارادہ کے تابع ہوں، اس ترتیب کے لحاظ سے یہ قوانین ایک دوسرے کے تابع ہوتے ہیں اور ان کے معتبر ہونے میں اس طرح کا لحاظ ضروری ہے کہ یہ تمام قوانین، اسلام اور خداوندعالم کے تشریعی ارادہ پر ختم ہوتے ہوں؛ نہ یہ کہ تمام قوانین اور مقررات اور آئین نامے اور پارلیمینٹ کے قوانین سب کے سب قرآن مجید اور احادیث شریف میں موجود ہوں۔

اگر خداوندعالم نے پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا اختیار عنایت کیا کہ خاص موارد میں خاص قانون بنا سکتے ہیں، اور چونکہ اس قانون میں خداوندعالم کی اجازت اور اس کا ارادہ شامل ہے، معتبر اور لازم الاجراء ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور ان کی پیروی خداوندعالم کے حکم سے واجب ہے اور اسی حکم خدا کے زیر سایہ پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بنایا ہوا قانون بھی معتبر ہے، اور ہم مسلمانوں پر ان کی اطاعت اور پیروی واجب ہے؛ ورنہ اگر ہم خدا کے حکم سے صرف نظر کرلیں تو پیغمبر کے دستورات خود بخود واجب نہیں رہ جاتے۔

لہٰذا وہ قوانین جو براہ راست خداوند عالم کی طرف سے ہوں اور قرآن مجید میں صاف صاف بیان ہوئے ہوں پہلا درجہ رکھتے ہیں اور خود بخود معتبر ہیں، اس کے بعد خدا کے حکم سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنائے ہوئے قوانین دوسرے درجہ میں قرار پاتے ہیں، اور آپ کے بنائے ہوئے قوانین خدا کے حکم کی وجہ سے معتبر ہیں، اسی طرح ائمہ معصومین علیہم السلام کے بنائے ہوئے قوانین اور احکامات خدا کے حکم کی وجہ سے معتبر ہیں؛ کیونکہ خدا اور پیغمبر نے ائمہ علیہم السلام کی اطاعت کو واجب کیا ہے۔

اب اگر ہم اپنے کو حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے زمانہ میں کسی اسلامی منطقہ میں فرض کریں بے شک آپ کی اطاعت کو اپنے اوپر واجب جانتے، مثلاً آپ مالک اشتر کو اس شہر کا والی بنا کر بھیجتے اور یہ فرماتے کہ ان کے احکامات اور دستورات کے اوپر عمل کریں اور ان کی نافرمانی نہ کریں اور جس نے ان کی اطاعت کی میری اطاعت کی؛ اگرچہ مالک اشتر کے احکامات کا بذات خود کوئی اعتبار نہیں ہے اور وہ بھی دوسروں کی طرح ہوتے، لیکن چونکہ امام کا حکم ہوا ہے لہٰذا اس صورت میں ان کی طاعت واجب اور ان کے احکامات لازم الاجراء ہیں، کیونکہ یہ امام معصوم کی طرف سے مقام ولایت پر فائزھیں اور خدا اور پیغمبر کی طرف سے منصوب ہوئے ہیں لہٰذا ان کی اطاعت واجب مانی جاتی ہے، جب کہ امام معصوم کی طرف سے منصوب شدہ والی اور حاکم کے دستور اور فرمان تیسرے درجہ میں حساب ہوتے ہیں، مثال کے طور پر اگر اسلامی پارلیمینٹ نے کسی صاحب منصب کو یہ اختیار دیدے کہ وہ کسی چیز کے بارے میں کوئی دستور العمل بنائے، اور چونکہ اس کے اس کام کا اختیار دیا گیا ہے لہٰذا اس کے بنائے ہوئے قوانین لازم الاجراء ہیں، اسی طرح قوانین پارلیمینٹ بھی قانون اساسی کی وجہ سے معتبر ہے اور اس کے بنائے ہوئے قوانین قانون اساسی کی وجہ سے معتبر ہوتے ہیں۔

لیکن دوسرے ممالک میں قانون اساسی کا اعتبار لوگوں کے ووٹ اور رائے گیری پر ہوتا ہے، لیکن ہم قانون اساسی کا مقام اس سے بڑھ کر بلند مانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قانون اساسی کا اعتبار خدا کی اجازت پر منحصر ہوتا ہو کہ پیغمبر یا امام معصوم یا کوئی شخص مالک اشتر کی طرح اس قانون اساسی کی تائید کرے، اس وجہ سے قانون کا اعتبار خدا، رسول اور ائمہ علیہم السلام کے کلام کی وجہ سے ہے اور اس کے بعد اس شخص کی وجہ سے ہوتا ہے کہ جو امام معصوم کی طرف سے معین ہو، اور یہی اسلام کا فلسفہ اور تھیوری ہے، امام معصوم علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں چونکہ ولی فقیہ عمومی اعتبار سے امام علیہ السلام کی طرف سے منصوب ہے تو اس کی ولایت امام معصوم علیہ السلام کی طرف سے تائید شدہ اور معتبر ہے، اور ولی فقیہ کی تائید سے قانون اساسی معتبر ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ قانون اساسی بذات خود معتبر نہ ہوگا، اور اس پر سوالیہ نشان باقی ہے کہ اس کا اعتبار کہاں سے ہے اور کس حد تک یہ معتبر ہے، اور کن لوگوں کو حق ہے کہ وہ قانون اساسی کو بدل سکیں، وہ قومیں جو اقلیت میں ہیں اور انہوں نے قانون اساسی کے بارے میں ووٹ نہیں دیا ہے کس وجہ سے یہ لوگ اس قانون اساسی کی پیروی کریں اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات، لیکن اگر ہمارا نظریہ یہ ہو کہ قانون اس صورت میں معتبر ہوگا جب امام معصوم کی طرف سے معین شدہ شخص اس کی تائید کردے، تو پھر کسی سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

6-اسلامی حکومت میں قانون گذاری کا مسئلہ

اب تک یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قانون گذاری کے سلسلہ میں اسلامی حکومت کی تھیوری، یہ ہے کہ قانون کا اعتبار خداوند عالم کی طرف سے ہے اور اس کے بعد جس کو خداوند عالم یہ اجازت دیدے، مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو پھر ان کا کلام بھی معتبر ہے اور اسی طرح پیغمبر جس کو منصوب کردیں ہمارے لئے معتبر ہیں جیسے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کو منصوب فرمایا لہٰذا ان کا کلام ہمارے لئے معتبر ہوا، اور اسی طرح اگر امام معصوم کسی کو عمومی یا خصوصی طور پر منصوب کردیں تو اس کا کلام بھی ہمارے لئے معتبر ہے، وہ فرمان اور احکامات کہ جو درجات عالیہ سے صادر ہوتے ہیں الٰہی اور اسلامی ہیں کیونکہ خداوند عالم کی طرف سے تائید شدہ ہیں، البتہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ اسلامی حکومت میں کبھی کبھی یہ تائید چند واسطوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے، ولی فقیہ کے لئے امام معصوم کی تائید ہوتی ہے اور امام معصوم علیہ السلام کے ارادہ واختیار کی تائید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید سے ہوتی ہے اور آخر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ جن کا اعتبار قرآن کریم کے صاف صاف بیان سے ہوتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ [1]

"اے ایماندارو خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے اولی الامر ہو ان کی اطاعت کرو"

اسی طرح یہ آیت بھی:

اَلنَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ [2]

"نبی تو مومنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں"

بے شک مذکورہ رابطہ اسلام کے وضع شدہ اصول کے اعتبار سے ان لوگوں کے لئے مکمل طور پر قابل قبول ہے کہ جو خدا، پیغمبر اور امام معصوم کا اعتقاد رکھتے ہوں، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہم اس مسئلہ کو سادہ زبان میں ان لوگوں کے لئے بیان کریں کہ جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ ہی رسول خدا کو، اور امام معصوم کی حقانیت میں شک کرتے ہوں، ان کے لئے ایک دوسرے طریقہ سے بحث ہونا چاہئے: سب سے پہلے اسلام کے بنیادی اصول کو بیان کریں اور اس کے بعد دوسرے مسائل کے بارے میں بحث کریں جیسے حکومت وسیاست کے مسائل، البتہ ممکن ہے کہ اس بحث کو آزاد طریقہ سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی قانون گذاری بہتر اور معاشرہ کے لئے مفید تر ہوسکتی ہے یا قانون گذاری کے دوسرے طریقے کہ جو رائج ہیں۔

---

[1] سورہ نساء، آیت ۵۹

[2] سورہ احزاب آیت ۶

۷۔اسلامی حکومت میں قانون کے جاری کرنے والوں کو منصوب کرنا

اسلام کی سیاسی تھیوری میں قانون کو خدا کی طرف سے ہونے کے ساتھ ساتھ، ولایت کے زیر نظر قوانین اور مقررات اگر خدا، رسول خدا، امام معصوم اور ان کے خاص یا عام جانشینوں کی تائید حاصل ہو تو وہ قوانین معتبر ہو جاتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ قوانین کا اجراء کرنے والا بھی خداوند عالم کی طرف سے معین ہو، (البتہ قوہ قضائی بھی قوہ مجریہ سے مربوط ہوتی ہے، لیکن اس کی خاص اہمیت کی خاطر اور اس وجہ سے کہ اختلاف وغیرہ کو حل کرنے کا ایک بہترین مرکز شمار ہو، اور قوانین کو جاری کرنے سے پہلے ان کے مصادیق پر منطبق کرے، اس کے لئے مستقل مقام اور خاص شرائط معین کئے گئے ہیں)

جس وقت پیغمبر یا امام معصوم حاضر ہوں تو وہ خود قانون کے جاری کرنے کے ذمہ دار ہیں یا یہ حضرات کسی کو اپنی طرف سے منصوب کریں کہ قانون کو جاری کرنے کا ذمہ دار ہو؛ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے جناب مالک اشتر کو مصر کا والی وحاکم منصوب کیا تا کہ وہاں جا کر قوانین کا نفاذ کرے، لیکن امام علیہ السلام کی غیبت میں کہ جب عوام الناس امام تک نہیں پہنچ سکتی، قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس شخص کی ہے کہ جس کو امام نے بطور عام منصوب کیا ہو، اور یہ وہی ولایت فقیہ ہے کہ ہم جس کے بارے میں بعد میں گفتگو کریں گے، (انشاءاللہ)

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام کی سیاسی تھیوری اور اسلام کے حکومتی ڈھانچے میں جس طرح قانون کو خدا کی طرف سے ہونا چاہئے (یعنی قانون یا قرآن مجید میں موجود ہو یا احادیث پیغمبر میں موجود ہو کہ جس کا اعتبار بھی خدا کی طرف سے ہے یا امام معصوم کی طرف سے کہ جن کا اعتبار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے ہے، یا اس شخص کی طرف سے ہو کہ جس کو خدا یا رسول یا امام نے قانون گذاری کی اجازت دی ہو،) یعنی اسی طرح قانون کا نافذ کرنے والا بھی خداوند عالم کی طرف منسوب ہو، اور وہ خداوند عالم کی طرف سے خاص یا عام طور پر معین کیا گیا ہو۔

اسی طرح قوہ قضائیہ بھی خداوند عالم کی طرف منسوب ہو یعنی قاضی یا تو براہ راست خداوند عالم کی طرف سے معین ہو یا غیر مستقیم طور پر معین ہو، اور اگر قاضی کسی بھی طرح خداوند عالم سے نسبت نہ رکھتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کو براہ راست قضاوت کے لئے منصوب کرنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

يَٰدَاوُۥدُ إِنَّا جَعَلْنَٰكَ خَلِيفَةً فِى ٱلْأَرْضِ فَٱحْكُم بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِٱلْحَقِّ [1]

"(ہم نے فرمایا) اے داؤد، ہم نے تم کو زمین پر (اپنا) نائب قرار دیا تو تم لوگوں کے درمیان بالکل ٹھیک فیصلہ کیا کرو"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورہ ص آیت ۲۶

........لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىکَ اللّٰہُ ۔[1]

"جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو"

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ....[2]

"پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم اس وقت تک یہ لوگ سچے مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں"

نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی سیاسی تھیوری، حکومت، سیاست اور معاشرہ کی مدیریت اور تمام کے تمام امور خداوند عالم کے تشریعی ارادہ پر ختم ہوتے ہوں۔

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۰۵

[2] سورہ نساء آیت ۶۵

نویں نشست

دینی نظام میں قوانین کا مقام

1-اسلام کے سیاسی نظریہ کے اصول

اس بات کا خیال رہے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ اور فلسفہ کی بحث سے متعلق اصول موجود ہیں، بعض افراد ان سب کو قبول کرتے ہیں اور کچھ لوگ صرف بعض کو قبول کرتے ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو ان میں سے کسی کو قبول نہیں کرتے ہیں، لیکن اس نظریہ کو ثابت اور بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اصول کو بیان کیا جائے اور اس اعتبار سے کہ ان میں سے کچھ اصول بہت واضح ہیں لہٰذا صرف اس کے اشارہ اور مختصر توضیح پر اکتفا کی جائے گی، اور واضح بحثوں کے ذکر سے اجتناب کیا جائے گا کیونکہ واضح اور روشن بحثوں کو کسی بھی علم میں بیان نہیں کیا جاتا، اور زیادہ تر اصولی بحث کی جائے گی تا کہ بحث کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔

الف-قانون

ہماری بحث کے عناوین اور اصول میں بیان ہوا ہے کہ معاشرہ، قانون کا محتاج ہے جیسا کہ یہ بات بیان کی جا چکی ہے، اسلام کے سیاسی نظریہ کی دوسری اصل یہ ہے کہ قانون کو خدا کی طرف سے ہونا چاہئے اور جیسا کہ یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ اس کا نفاذ بھی خدا ہی کی طرف سے ہونا چاہئے، قانون الٰہی سے مراد یہ ہے کہ یا خود خدا نے قانون بنایا ہو اور اس کو قرآن میں نازل کیا ہو یا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معصوم اماموں کو قانون بنانے کی اجازت ملی ہو، تا کہ مختلف حالات میں اسی کے اعتبار سے قانون بنائیں، اسی بنا پر قانون کی تین قسمیں ہیں:

1-وہ قانون جس کو خدا نے بنایا ہے اور پیغمبر اور امام اس کے بنانے میں شریک نہیں ہیں۔

2-وہ قانون جس کو معصوم علیہ السلام نے خدا کی اجازت سے بنایا ہے۔

3-وہ متغیر قوانین جن کو کچھ افراد معصوم علیہ السلام کی اجازت سے بناتے ہیں، یہ قوانین اسلامی معاشرے کے لئے معتبر قرار دیئے گئے ہیں، اس لئے کہ آخر کار ان کی بازگشت حکم خدا اور اس کی اجازت کی طرف ہوتی ہے، اس بنا پر خداوند عالم خود قانون کو بناتا ہے اور خدا کے قوانین قرآن میں ذکر ہوئے ہیں لیکن قانون کا نافذ کرنے والا خدا نہیں ہے قانون کا نافذ کرنے والا ایسا شخص ہونا چاہئے جو معاشرے میں موجود ہو اور لوگ اس کو دیکھتے ہوں، وہ لوگوں کو امر و نہی کرے اور قوانین کو

نافذ کرے، پہلے مرتبہ میں پیغمبر اور امام معصوم ؑ ہیں اور دوسرے مرتبہ میں وہ افراد ہیں جن کو پیغمبر یا امام معصوم ؑ کی طرف سے نفاذ قانون کی اجازت ملی ہو، اس بنا پر کچھ حضرات پیغمبر اکرم یا امام معصوم ؑ کے زمانے میں اسلامی علاقوں اور صوبوں کے والی اور کارندہ کے عنوان سے اجراء قوانین کے لئے بھیجے جاتے تھے اور غیبت امام ؑ میں اس کام کے ذمہ دار فقہاء اور مراجع کرام ہیں جو بطور عام نصب ہوئے ہیں، اور قوانین کے اجراء کے ذمہ دار ہیں۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا اس حکومت کے کلیات تھے کہ جس کے دو حصہ تھے قانون گذاری اور قوانین کا نفاذ، اور جیسا کہ عدالت کا محکمہ درحقیقت اجرائی محکمہ کا ایک جز ہے، انشاءا،،، ہم اس کی اہمیت کی خاطر الگ سے بحث کریں گے۔

2۔ طبعی اور بنائے گئے قوانین کی اہمیت

یہ بات بیان جا چکی ہے کہ ہماری بحث کے اصول اور مسلمات میں سے ایک اصل یہ ہے کہ معاشرہ کیلئے قانون کا ہونا ضروری ہے، اور دوسری اصل یہ ہے کہ ہماری نظر میں ایسا قانون معتبر ہے جس کا بنانے والا بلاواسطہ یا بالواسطہ خدا ہو، اس نظریہ کے مقابلہ میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے کہ معاشرہ قانون کا نیاز مند نہیں ہے خواہ وہ قانون خدا بنائے، خواہ دوسرے افراد، البتہ اس موجودہ دور میں اس نظریہ کے طرفدار موجود نہیں ہیں، کیونکہ جن حالات میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں سب قانون کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو معاشرہ کے لئے قانون کی ضرورت کا منکر ہو، اس دور میں یہاں تک کہ ایک مختصر سے دیہات کے رہنے والے بھی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں کہ ایسے قوانین اور دستورات ہونے چاہئیں کہ جنکی وہ پیروی کریں۔

لیکن گذشتہ زمانے میں زندگی بسر کرنے کا طریقہ بہت سادہ تھا کچھ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ ہمیں قوانین بنانے کی ضرورت کوئی ضرورت نہیں ہے، ان کی نگاہ میں عقل خود بخود فطری قوانین کو پہچان کر ایک طرح کے فطری قوانین سے آگاہ ہو جاتی ہے اور پھر اسے اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ کوئی قانون بنائے گویا قدیم زمانہ میں فطری حقوق اور فطری قوانین کا نظریہ انسانی معاشرہ میں اس شکل میں بیان ہوا کہ جب لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ کس قانون پر عمل کریں؟ تو جواب دیا جاتا تھا کہ اپنے اندر نگاہ کرو یا اس دنیا پر نظر ڈالو تا کہ تمہیں پتہ چلے کہ کون سا حکم اور قانون وہاں پر حکم فرما ہے وہی قانون اپنے معاشرے میں نافذ ہوگا۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا یہاں تک کہ فطری قانون کے نظریہ کی بنا پر بھی قانون کی ضرورت ایک مسلم بات ہے اور یقینی طور پر اس طولانی تاریخ میں ایسے مفکرین کا وجود نہیں ملتا جو یہ دعوی کریں کہ انسان کسی طرح کے قانون کا یہاں تک کہ قانون فطری کا بھی محتاج نہیں ہے اور اس سلسلے فلسفی حضرات کے یہاں جو بھی بحث پائی جاتی ہیں وہ اس بنا پر رہی ہیں کہ کیا قوانین عقلی، فطری اور قوانین الٰہی سے مراد وہی قوانین ہیں جن کو تمام انسان اپنی عقل سے درک کرتے ہیں اور وہی معاشرے کے لئے کافی ہیں یا خاص طور پر جو قوانین بنائے گئے ہیں اس کے بھی ہم محتاج ہیں، اور جیسا کہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اگر

گذشتہ زمانہ میں فطری قوانین یا عقلی قوانین یا مستقلات عقلیہ اپنی مختلف تفسیروں اور تعبیروں کے ساتھ کہ جن کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں، تو بغیر کسی شک وتردید کے، ہمارے زمانے کے حالات کے پیش نظر یہ فریضہ قابل قبول نہیں ہے، یہاں تک کہ بیان وتوضیح کے لائق بھی نہیں ہے۔

آج ہر فرد اپنے گردو پیش مشاہدہ کرنے سے یہ سمجھ جاتا ہے کہ ہر روز اپنے دقیق اندرونی، بیرونی اور بین الاقوامی روابط میں سیکڑوں اجتماعی اور بین الاقوامی قوانین کا نیازمند ہے انہیں میں سے ایک معاشرتی اور اندرونی ملک کے قوانین اور دستورات میں ٹریفک اور ٹریفک سے متعلق قوامین ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر اس زمانے میں قانون نہ ہوں تو ہر شہر اور علاقہ کے ٹرانسپورٹ اور ٹریفک کا نظام کیا ہوگا؟ اگر گاڑیوں کی رفتار، اور ان کے چلنے کی سمت (دائیں سمت چلیں یا بائیں سمت) یا ٹریفک کے دوسرے قوانین نہ بنائے جائیں تو کتنے حادثات رونما ہوں گے؟ دنیا کے کس علاقہ میں ایسا گروہ مل سکتا ہے جو بغیر قانون کے ایک ساتھ ایک جگہ پر زندگی گزارتے ہوں، اور ان کے درمیان خطرات اور حادثات رونما نہ ہوتے ہوں، یہ بات صحیح ہے کہ تمام ممالک میں ٹریفک کا قانون ایک جیسا نہیں ہوا کرتا ہے مثال کے طور پر کچھ ممالک جیسے انگلینڈ، جاپان وغیرہ میں گاڑیاں بائیں سمت سے چلتی ہیں اور کچھ ممالک میں (جن میں سے ایک ایران بھی ہے) گاڑیاں دائیں سمت چلتی ہیں، بہر حال قانون بنایا جاتا ہے، اور انسان اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ رہتا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ کس سمت حرکت کرنا چاہئے، مذکورہ مثال معاشرہ میں قانون کی ضرورت کا ایک نمونہ ہے، اور بے شک یہ ضرورت دوسرے مسائل از جملہ خاندانی اور بین الاقوامی حقوق میں بھی پڑتی ہے اور اس کا احساس ہوتا ہے۔

بین الاقوامی قانون بنانے کی ضرورت کا ایک نمونہ دریائے خزر سے متعلق مسائل ہیں جواب بھی اس کے حاشیہ نشین ممالک کے درمیان اس سے بہرہ مند ہونے کے طریقہ میں اختلاف نظر آتا ہے، فطری طور پر یہ قبول نہیں کیا جاسکتا کہ ہر شخص جس طرح سے چاہے دریا کے نیچے موجود تیل اور منابع اور دوسری ذخائر سے فائدہ اٹھائے اور تیل، گیس اور دوسری چیزوں کے نکالنے میں کوئی قانون نہ ہو، بلکہ ایسے قوانین بنائے جانے چاہئیں جو یہ معین کریں کہ فلاں ملک کس حد تک دریاء کی گہرائی، موجودہ ذخائر سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جو مشکلات اس وقت پڑوسی ممالک کے لئے کھڑی ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ کوئی معین قانون موجود نہیں ہے، اور سب دریا کے ذخائر کے بارے میں ایک عادلانہ تقسیم کے لئے قوانین اور دستورات کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں لہذا بشر کی ضرورت کے پیش نظر قوانین و دستورات کی ضرورت پڑتی ہے، اور جیسا کہ کمیٹیاں اور موافقت نامہ اور دریا اور ساحل سے متعلق قوانین (فضاء، کنویں وغیرہ) چند صدی قبل موجود نہیں تھے، کیونکہ بشر کو اس کی ضرورت نہیں تھی، پھر افراد، گروہوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان ٹکراؤ اور اختلاف کی وجہ سے اس طرح کے قوانین کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ قانون ہر شخص اور معاشرہ کے دائرۂ حقوق کو معین کرتا ہے، قرآن مجید اس اصول کی طرف کہ معاشرتی زندگی قانون کی محتاج ہے خاص توجہ دلائی ہے، البتہ شایانِ ذکر ہے کہ قانون کا وجود عام طور پر سماجی زندگی سے مخصوص ہے بلکہ اگر ایک فرد بھی زندگی گذارنا چاہتا ہے تو وہ کمال تک پہنچنے میں قانون کا محتاج ہے، البتہ فردی زندگی کے لئے اخلاقی قوانین، کافی ہوتے ہیں لیکن جس وقت اجتماعی مسائل میں لوگوں کے حقوق میں ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے تو نتیجہ میں اختلافات وجود میں آتے ہیں اور کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کسی نے حد سے زیادہ نہر کے پانی سے فائدہ اٹھالیا تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہو جاتے ہیں اور ایسی صورت میں اجتماعی قوانین بنانے کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔

لہٰذا، یہ بات بالکل واضح اور روشن ہے کہ معاشرہ قانون کا محتاج ہے، اور ہر عقل مند انسان یہ جانتا ہے کہ بغیر قانون کے اجتماعی زندگی، انسان کا آرام وسکون اور اس سے بڑھ کر معنوی سعادت خطرے میں پڑ جاتی ہے، جو مثالیں ہم نے عرض کی ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس طرح کے مقامات کے لئے کافی نہیں ہیں، اور ہم قوانین کے محتاج ہیں اس لئے کہ عقل، عدل وانصاف کا حکم دیتی ہے، لیکن ایسی حکمت عملی اپنانے کے لئے جو عدل وانصاف قائم کرے ایک دوسرے قانون کے محتاج ہیں مثال کے طور پر عقل یہ حکم دیتی ہے کہ دریائے خزر کے ذخائر کو پڑوسی ممالک میں عادلانہ طور پر تقسیم ہونا چاہئے، تو اس وقت یہ مسئلہ پیش آئے گا کہ عادلانہ تقسیم کسے کہتے ہیں؟ کیا عادلانہ تقسیم اس کو کہتے ہیں کہ جس ملک کا رقبہ زیادہ ہو وہ ذخائر سے زیادہ فائدہ اٹھائے، یا جس ملک کے پاس دریا کا ساحلی حصہ زیادہ ہو یا ساحل نشین کی تعداد زیادہ ہو وہ دریا سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ قانون ساز کے مرکز کو اس طرح کے سوالات کا جواب دینا چاہئے، اسکے علاوہ دوسرے تمام مقامات کے لئے بھی قانون ساز کا ہونا ضروری ہے، دیکھنا یہ ہے کہ قانون ساز کون ہو؟

ب۔ قوانین کا مرضی الٰہی اور دین کے مطابق ہونا ضروری ہے

اسلام کا دعویٰ ہے کہ قوانین کو خدا نے بنایا اور پیغمبر اکرم ﷺ کے ذریعہ لوگوں پر نازل کیا ہے لہٰذا پہلی اصل کو قبول کرنے کے بعد قانون کی ضرورت ہے دوسری اصل یہ ہے کہ دین کو قانون ساز کے مرکز کے عنوان سے قبول کریں، اس مرحلہ میں اسلامی حکومت میں ایسے لوگوں کا ہونا ممکن ہے جو دین کو نہ مانتے ہوں چہ جائیکہ ایک شخص غیر اسلامی حکومت میں دین کو قبول کرتا ہو، اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے خدا کے وجود میں شک ہے لہٰذا میں دین اور اس کے قوانین کو قبول نہیں کرتا ہوں تو پہلے مرحلہ میں آپ اس کے لئے یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ قانون خدا کو بنانا چاہئے، اور بنیادی طور پر جو شخص خدا کو نہیں مانتا ہے وہ قانون الٰہی کو بھی نہیں مانتا ہے، پہلے فلسفی اور کلامی بحثوں سے خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہوگا، پھر کلامی اعتبار سے یہ بات ثابت کرنی ہوگی کہ پیغمبر اور دین کا بھی وجود ہے۔

بعد کے مراحل میں یہ بات بیان کی جائے گی کہ وہ قانون معتبر ہے جس کو خدا نے خود بنایا ہو یا خدا کے کسی وسیلہ کے ذریعہ بنا ہو، اس سے پہلے ہم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ممکن ہے کوئی خدا، دین اور نبوت کو قبول کرتا ہو لیکن وہ اس

بات کا معتقد نہ ہو کہ سماجی قانون خدا کو بنانا چاہئے، اس کی نظر میں انسان کو خدا کی حمد وثنا، عبادت اور اس سے راز و نیاز کرنا چاہئے مسجدوں اور عبادتگاھوں میں آمد و رفت رکھنا چاہئے، لیکن انسان کی سماجی زندگی خدا سے متعلق نہیں کہ جس کے لئے خدا قانون بنائے، اس سے قبل کی بحثوں میں ہم نے عرض کیا تھا کہ اس طرح کا نظریہ اسلام کی رو سے صحیح نہیں ہے دین اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی یہ کہے کہ اصل دین یعنی قرآن، احادیث پیغمبر اسلام، متواتر روایات اور پیغمبر و ائمہ علیہم السلام کی سیرت کو تسلیم کرتا ھوں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلام کے سماجی قوانین سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے؟

3- دین کی ضروری باتوں کو قبول کرنا لازمی ہے

افکار و عقائد کے مجموعہ میں کچھ ثابت اور یقینی اجزاء ہوتے ہیں جن کو اصطلاح میں -ضروریات کہا جاتا ہے اور جو شخص بھی اس مجموعہ سے واقف ہے چاہے اس کو مانے یا نہ مانے، یہ جانتا ہے کہ وہ مجموعہ ان ثابت اجزاء پر مشتمل ہے دوسرے لفظوں میں ممکن ہے ہر مجموعہ کے سیکڑوں ممبر ہوں، لیکن اس کا ایک معیار ہونا چاہئے، تاکہ وہ دوسرے مجموعوں سے الگ ہو سکے، اس بنا پر اگر کسی نے دین کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے قبول کیا ہے تو اسے یہ قبول کرنا ہوگا، کہ یہ مجموعہ مستقل، دائمی اور یقینی ممبر رکھتا ہے تاکہ تمام مجموعہ سے الگ پہچانا جائے، لیکن افسوس! کچھ افراد کہتے ہیں کہ ہم اسلام کو قبول کرتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اسلام ثابت اصول رکھتا ہے اور تمام اشیاء کو مختلف تفسیروں اور مختلف تعبیروں کے قابل جانتا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اسلام کے مخالف نہیں ہیں لیکن اسلام قبول کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب نماز پڑھیں، وہ نماز کا عقیدہ رکھیں اور بعض افراد پڑھنے کے بھی عادی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص مسلمان ہے وہ ضرور نماز پڑھے اور نماز کو اسلام کے ثابت ارکان سمجھے!

روزہ کے سلسلے میں اور اسی طرح دوسرے تمام اجتماعی احکام کے بارے میں معتقد ہیں کہ پیغمبر اکرم، ائمہ معصومین علیہم السلام اور تمام مسلمان اس پر عمل کرتے ہیں لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اسلام کا دارومدار اسی روزہ ہی پر ہے، اگر یہ نہ ہوں تو اسلام باقی نہیں رہے گا، یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کن بنیادوں پر قائم ہے کہ وہ اگر نہ ہوں تو اسلام باقی نہیں رہے گا؟ کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں توحید ایک اصل ہے کہ اگر کوئی اس کو قبول نہ کرے تو مسلمان نہیں ہے؟

تو آپ جواب میں کیا کہتے ہیں کہ ہماری فہم کے مطابق اسلام سے یہ مفہوم سمجھنا صحیح ہے ممکن ہے کہ دوسرا شخص اسلام سے ایک دوسرا مفہوم سمجھتا ہو، لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام سے صرف ہمارا سمجھنا صحیح ہے ممکن ہے دوسرا شخص اسلام سے یہ سمجھے کہ خدا ایک ہے یا چند خدا ہیں یا دین اسلام میں خدا کا وجود بالکل ہے نہیں، -اور ہم ایسی دلیل پیش نہیں کرتے جو یہ ثابت کرے کہ ہم جو اسلام سمجھے ہیں وہ سب سے زیادہ صحیح ہے! اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ہم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور کسی کو دوسری تفسیر کرنے کا حق نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سمجھ ہماری نظر میں بہتر ہے تو ایسا دوسرں

کے بارے میں بھی صحیح ہے۔

بے شک ایسے افراد صرف دھوکہ بازی اور چال بازی کا قصہ رکھتے ہیں ورنہ کسی علم اور علمی مرکز میں دو مجموعہ کہ جن کے ممبران آپس میں شریک ہیں ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے دو مجموعوں کو ایک دوسرے سے اس وقت جدا کیا جا سکتا ہے جب ان دونوں کے ممبران مختلف ہوں یا کم سے کم ان میں سے کچھ کے درمیان فرق موجود ہو ورنہ دونوں مجموعے میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکے گا، ہمیشہ دو قسم کے مجموعہ میں فرق ہونا چاہئے تا کہ ایک مجموعہ کو دوسرے سے جدا کیا جا سکے، اگر ان میں سے ایک مجموعہ کے تمام ممبران دوسرے مجموعہ کی جگہ قائم مقام ہو سکتے ہوں، مثلاً اس مجموعہ کا (الف) ممبر دوسرے مجموعہ کے (الف) ممبر کی جگہ آئے اور اسی طرح اس مجموعہ کا (ب) کا ممبر دوسرے مجموعہ کے (ب) ممبر کی جگہ آئے تو اس وقت ایک دوسرے کو مستقل سمجھنا درست نہ ہوگا۔

اگر کوئی مجموعہ دین اسلام کے عنوان سے پہچانا گیا ہو اس میں دوسرے دین کے مقابلہ میں کوئی خوبی ہونا چاہئے تا کہ اس سے الگ پہچانا جائے، یعنی اس میں ایسے ثابت اصول ہونے چاہئیں جن پر اسلام استوار ہے اور ایسی صورت میں اگر ایسے اصول جیسے توحید، نبوت، معاد یا نماز و عبادت کے اصول کے معتقد ہوں اور اسی کے ساتھ ان سب کو قابل تبدیل سمجھیں اور ان کے بارے میں مختلف تفسیریں بیان کریں تو ہم کسی بھی ثابت رکن کو ثابت نہیں کر سکتے اور نہ ہی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ اصول اسلام کی ایک اصل ہے۔

لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام کے نام پر کوئی معین مجموعہ موجود نہیں ہے، تو ایسی شکل میں ہم کس چیز سے دفاع کریں؟ کس طرح سے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں، اگر ہم ان کو مسلمان ہونے کا طریقہ نہ بتائیں اور ان سے یہ کہیں کہ اسلام کو جس انداز سے اور جس طرح سے سمجھے ہو ویسے ہی اس پر عمل کرو اور اسلام سے اپنی فہم و ادراک کے مطابق عمل کرو! اگر تم اس نتیجہ پر پہنچے کہ نماز پڑھو، تو نماز پڑھو، اور اگر تم اس نتیجہ تک پھونچے کہ نماز نہیں پڑھنا چاہئے تو نماز نہ پڑھو، تم آزاد ہو، اور اپنی فہم کے مطابق عمل کرو!، تو اسلام سے اسطرح کا ادراک، مسیحیت یا دوسرے مذاہب کے ادراک سے کیا فرق رکھتا ہے؟ پھر کیوں لوگوں کو اسلام کی طرح دعوت دیں! اگر یہ طے ہے کہ ہر شخص اپنے فہم و ادراک کے مطابق عمل کرے اور کوئی اصول، اور ثابت کلیہ موجود نہ ہو تو ہم صرف لفظی طور سے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اس فکر کی بنیاد پر پھر یہ فرق باقی نہیں رہ جاتا کہ ہم لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں یا مسیحیت کی طرف یا اصلاً بے دینی کی طرف دعوت دے رہے ہیں!

4- اسلام، اصول اور ثابت معرفتیں

کسی شخص کا یہ کہنا دھوکہ بازی اور نفاق ہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں لیکن اسلام سے ایک ثابت مفہوم کو درک نہیں کرتا، اس کے تمام اصول قابل تبدیل ہیں اور مختلف تفسیریں ہیں، ایسی صورت میں اسلام سے وہی بات سمجھنا ممکن ہے جو

مسیحیت سے سمجھی جاتی ہے تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور ایک مسلمان اور مسیحی میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا، مثلاً ھر ایک بلڈنگ مستحکم اجزاء سے بنتی ہے جیسے ستون، دیوار اور چھت وغیرہ، اور پھر ایک مدت کے بعد ویرانہ میں تبدیل ہوجاتی ہے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ بلڈنگ ۔کے اجزاء مستحکم نہیں ہیں، یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک بلڈنگ میں ستون، دیوار اور چھت ہیں تو بلڈنگ ہے اور اگر نہیں ہیں تب بھی بلڈنگ ہے، اگر زمین، ہوا اور دریا میں ہو تب بھی بلڈنگ اور اسمیں کسی طرح کی خصوصیت اور مستحکم وثابت اجزاء موجود نہیں ہوتے ہیں، اسی طرح اسلام بھی ثابت اور معین اجزاء سے وجود میں آتا ہے اور اگر اسلام میں ثابت اور کلی اصول نہ ہوں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مجموعہ ہے اور وہ اسی طرح کا مجموعہ ہے۔

اس بنا پر اگر کوئی اسلام کو قبول کرے تو اسے چاہئے کہ اس مجموعہ سے ایک حصہ کو ثابت اجزاء کے عنوان سے قبول کرے البتہ ممکن ہے کہ اس مجموعہ کا ایک حصہ مشکوک بھی ہو، یا ایسا کھلا ہوا مجموعہ ہو کہ جس میں کچھ اجزاء کم وزیاد ہوسکتے ہوں، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک مجموعہ میں کسی طرح کے ثابت اجزاء نہیں پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ایک مشخص مجموعہ کے عنوان سے باقی رہے۔

اسلام کے بنیادی اور کلی عناصر کو دوست ودشمن سب جانتے ہیں توحید، نبوت اور معاد کے علاوہ اسلام میں دوسرے بھی سیاسی امور ہیں جو سب جانتے ہیں حد ہے کہ منکرین خدا بھی اس سے واقف ہیں، نمونہ کے طور پر نماز اور حج کو اسلام کے اصلی عناصر کا جزء سمجھا جاتا ہے دنیا کے تمام افراد یہ جانتے ہیں کہ مسلمان مخصوص دنوں میں حج کرتے ہیں، ایسی صورت میں کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ جس اسلام کو میں نے سمجھا ہے اس میں حج نہیں ہے، سبھی یہ جانتے ہیں کہ اسلام میں نماز ہے اب اگر کوئی یہ کہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں لیکن اسلام سے جو میں سمجھا ہوں اس کی بنیاد پر نماز، اسلام میں نہیں ہے تو ایسا شخص یا اسلام کو نہیں سمجھا، یا جھوٹے طریقہ سے اپنے کو مسلمان کھلواتا ہے جبکہ منافق یا دھوکہ باز ہے، اور یہ اس لئے کرتا ہے کہ اپنے کو مسلمان بتا کر ایک مسلمان کی خصوصیت سے محروم نہ کرے، اور اسے اسلامی معاشرہ سے نکالا نہ جائے، ورنہ نماز، روزہ اور حج اس مجموعہ کے ثابت ارکان میں سے ہیں، اور مسلماً تمام مسلمانوں کے نزدیک دین کے ضروری مسائل کا جزء ہیں۔

اگر کوئی اسلام سے واقف ہو تو کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام میں چوری سے روکنے کے لئے سزا کا قانون نہیں ھے جب کہ قرآن نے آیت "اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ" [1] میں اس مسئلہ کی صراحت کی ہے، اسی طرح دوسرے تمام مقامات پر بھی قرآن کی صریح نص موجود ہے

لہٰذا اسلام کے ضروری احکام ثابت کردیئے گئے ہیں اور اب ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم پھر سے انہیں سمجھیں اور ایک ایک کو ثابت کریں، اس بنا پر اگر یہ ثابت ہوگیا کہ اسلام جس کی بنیاد قرآن پر ہے وہ خدا کی جانب سے آیا ہے اور حق ہے تو یہ قبول کریں کہ جو کچھ بھی قرآن میں ہے وہ حق ہے اور قرآن ایک طرح کے محکم، قطعی اور ضروری امور پر

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۳۸

مشتمل، البتہ کچھ آیتوں کی مختلف تفسیریں ہونا ممکن ہیں، لیکن ایک آیت سے صرف دو مختلف تفسیروں کا وجود اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ قرآن سے کسی ثابت اور قطعی امور کا استنباط نہیں ہوسکتا اور ہر شخص جو چاہے اس سے درک کرے۔

اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے اور قرآن کی طرف مراجعہ کرے تو وہ قرآن سے ایک ایسے مطلب کو درک کرسکتا ہے کہ جو انسان کے مختلف ادراکات سے کوئی ربط نہ رکھتا ہو، اور نہ ہی اس کا گذشتہ افکار و مسلمات سے کوئی رابطہ ہو، اور نہ ہی ہمارے ان قوانین کے تابع ہو جن کو ہم علوم سے درک کرتے ہیں مثلاً قرآن کی ایک آیت ہے جو ہمیں نماز کا حکم دیتی ہے یا ایک ایسی آیت ہے جو چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتی ہے وہ شخص جو کسی زمانے میں عناصر چہارگانہ، ساتوں آسمان کا معتقد تھا آیت سے وہی سمجھ رہا تھا جو آج "اینشٹن" کی نسبت کی تھیوری کے بعد سمجھ رہا ہے اور استنباط کر رہا ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج اینشٹن کی نسبت کی تھیوری پائی جارہی ہے لہٰذا آیت کے معنی بدل گئے، ممکن ہے کہ ایسی آیت ہو جس کے کلمات لغات میں تبدیل اور دوسرے علمی مسائل سے مربوط ہوں، لیکن کچھ مطالب ایسے ہیں جن کا سمجھنا دوسرے مختلف علوم سے مربوط نہیں ہے اور فطری طور سے ان میں تبدیلی کا شبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

5-قرآن کریم کے ثابت اور قطعی احکام و مفاہیم

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اسلام میں ایک طرح کے ضروری احکام موجود ہیں جو کہ ثابت ہیں خواہ کوئی مسلمان ہو نہ ہو یہ جانتا ہے کہ اسلام میں کچھ ضروری مسائل ہیں، اسی طریقہ سے ایک طرح کے قطعی مفاہیم قرآن سے بھی استنباط ہوتے ہیں چاہے کوئی قرآن کو قبول کرے یا نہ کرے، وہ قرآن سے ان مطالب کو درک کرتا ہے اور ان مطالب کا سمجھنا عربی سے واقفیت پر موقوف ہے، اس کے مسلمان ہونے پر نہیں، ہماری گفتگو ان چیزوں کے بارے میں ہے جو کسی اعتبار سے قابل تغییر نہیں ہیں اور نظریات کے اختلاف اور ادراک کے اختلاف کے باوجود اس کے معنی اور مفہوم اپنی جگہ پر ثابت اور قطعی اور قابل اعتراض ہیں مثلاً جملہ "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔"[1] کے معنی نماز کے واجب ہونے کے ہیں اور جملہ "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ۔"[2] کے معنی روزہ کے واجب ہونے کے ہیں، چاہے جیسی علمی تھیوریاں ایجاد ہوں اور اس میں تجدید نظر ہو لیکن قرآن کے فہم و ادراک میں تبدیلی نہیں آئے گی اس کے احکام اپنی جگہ پر مسلم ہیں، جس وقت ہم دین کی ضروری مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ان کو یقینی، مستحکم نا قابل تبدیل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کو اسلام کے اصلی اور قطعی منابع یعنی قرآن اور احادیث سے حاصل کیا گیا ہے اور جو لوگ ضروریات دین کے منکر ہیں اور لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں کہ اسلام سے مستحکم اور یقینی اصول نہیں سمجھا جاسکتا، تو یا تو وہ مسئلہ میں شبہ کے شکار اور جاہل ہیں یا تعصب کرتے ہیں اور اسلام پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، بلکہ مسلمانوں سے کھیلتے ہیں۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۴۳

[2] سورہ بقرہ آیت ۱۸۳

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی سیاسی حکمت عملی ثابت اصول اور ضروریات میں سے ایک یہ ہے کہ قانون خدا کی طرف سے بنے اور جو لوگ قانون الٰہی کے منکر ہو گئے ہیں دراصل وہ ضروریات دین کے منکر ہیں جس طریقہ سے قرآن کریم سے نماز پڑھنے کے وجوب کو سمجھا جاتا ہے، زنا کار مرد اور زنا کار عورت کا حکم سمجھا جاتا ہے اور جتنی صراحت کے ساتھ قرآن میں نماز و روزہ کا حکم ثابت ہے اتنی ہی صراحت کے ساتھ پیغمبر کی اطاعت بھی واجب ہے اور شریعت اسلام میں پیغمبر کے مقام کو "مفترض الطاعۃ" کے عنوان سے پہچانا گیا ہے۔ خداوند عالم اس بارے میں فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔[1]

"اے ایماندارو! خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور جو تم میں سے اولی الامر ہوں"

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا...۔[2]

"ہاں جو تم کو رسول دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو"

جب تک مندرجہ بالا آیات کے مطالب کو تسلیم نہ کیا جائے جن میں اسلام کے ضروری احکام بیان ہوئے ہیں ورنہ اس وقت تک اسلام کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور ایسی شکل میں انسان کا ان لوگوں میں شمار کیا ہوگا جن کے قول کی خداوند عالم یوں حکایت کر رہا ہے:

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ۔[3]

"اور کہتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں"

اور اسی کے بعد خدا ان کے بارے میں یہ بھی فرماتا ہے:

أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا۔[4]

"یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں"

لہٰذا جو شخص اسلام کا معتقد ہے اس کو ایک سرے سے اس کے تمام قوانین اور احکام کو ماننا چاہئے، اور یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اسلام کے تمام ضروری احکام علمی تبدیلیوں کے تابع نہیں ہیں کہ جو علمی نظریات یا نئی علمی تھیوریوں کی وجہ سے ان میں تبدیلی رونما ہو جائے ایسی شکل میں جو نماز سے مربوط آیت کو حق سمجھتا ہے اور چوری سے متعلق آیت کو حق جانتا ہے اگر چہ

---

[1] سورۂ نساء آیت ۵۹

[2] سورۂ حشر آیت ۷

[3] سورہ نساء آیت ۱۵۰

[4] سورہ نساء آیت ۱۵۱

اسے قرآن میں متشابہ اور مجمل آیات ملتی ہیں، جن کو وہ اسلام کے متغیر قانون کی حیثیت سے پاتا ہے، لیکن یہ یقین رکھتا ہے کہ قرآن اور اسلام میں ایسے مستحکم اور یقینی اصول موجود ہیں جو دوسرے تمام متغیر اصول سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

6۔ اسلام مختلف تعبیر یں رکھتا ہے (ایک اعتراض اور اس کا جواب)

یہ بات تو واضح ہے کہ کچھ آیات سے مختلف طرح کے مطالب سمجھے جاتے ہیں اور مختلف طرح کی تفسیریں بیان کی جاتی ہیں اور اسلام کے کچھ احکام میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے جو اس بات کا باعث نہیں بنتا کہ اسلام کے سارے قوانین مشتبہ اور اختلافی ہیں، اسلام میں ایسے ہزاروں قطعی احکام موجود ہیں جن کے بارے میں تمام اسلامی فرقوں کا اتفاق نظر پایا جاتا ہے لیکن فرعی اور بہت مختصر احکام میں شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں، اور فقہ کے ایک عظیم حصہ میں فریقین کے یہاں اختلاف نظر نہیں پایا جاتا ہے اسی طرح سے شیعہ فرقے کے کچھ احکام میں فقہا کے درمیان فتوؤں میں اختلاف کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تمام احکام میں اختلاف پایا جاتا ہے، جس طرح ایک مخصوص بیمار کے بارے میں دو ڈاکٹروں کی تجویز کا الگ الگ ہونا اور دونوں کے نسخوں کا فائدہ بھی ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ علم ڈاکٹری میں پائیدار اور استوار قوانین نہیں پائے جاتے ہیں۔

اسی بنا پر اسلام میں ایک طرح کے قطعی اور یقینی احکام موجود ہیں جس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا ہے، اور بعض مقامات پر اختلاف نظر کا ہونا ہمیں اس بات کا سبق نہیں دیتا کہ ہم مسلّم احکام نہیں رکھتے اور اس بہانہ سے ہم اسلام سے الگ ہو جائیں، اس کے باوجود آج جب اسلام کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو قلبی مریض اور قرآن کے ارشاد کے مطابق:

اَلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ۔[1]

"پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے"

کہتے ہیں کہ کونسا اسلام؟ وہ اسلام جس کو شیعہ بتاتے ہیں یا وہ اسلام جس کو سنی بتاتے ہیں؟ یا وہ جس کو فقہاء بتاتے ہیں یا وہ جس کو دانشور حضرات بتاتے ہیں؟ اس کے باوجود کہ ہم اعتقادات، اخلاقیات، فردی احکام، سماجی احکام، تجارت کے قوانین اور بین الاقوامی قوانین میں ایک طرح سے ثابت حقوق اور ہزاروں متفق علیہ قوانین رکھتے ہیں، تو پھر کیوں وہ لوگ بجائے اس کے کہ یقینی اور مسلم قوانین کو اپنائیں اختلافات اور افتراقات کو اپنائے ہوئے ہیں؟ اور جب ان سے یہ کہا جاتا ہے ہماری یونیورسٹیوں کو اسلامی ہونا چاہئے تو کیوں روحی بیمار اور کج فکر لوگ پوچھتے ہیں کہ کون اسلام؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہی اسلام جو یہ کہتا ہے کہ دوسروں کے حقوق کو پامال نہیں کرنا چاہئے، عدالت کو قائم کرنا چاہئے کیا ان چیزوں میں اختلاف پایا جاتا ہے؟

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۷

اگر آپ انہیں یقینی اور متفق علیہ قوانین کو جن کے بارے میں فریقین میں اختلاف نہیں ہے یونیورسٹیوں میں اپنائیں تو آپ نہایت خوش ہونگے، یہ فطری بات ہے کہ جب وہ لوگ نہیں چاہتے کہ اسلام کے مطابق عمل کریں تو بہانہ تلاش کرتے ہیں کہ کس نے کہا ہے کہ فقہاء کا اسلام نافذ کیا جائے اور روشن فکروں کا اسلام نافذ نہ کیا جائے؟

7۔اسلام انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے

اس بات کو ثابت کرنے کے بعد کہ اسلام میں قوانین اور سماجی احکام موجود ہیں مختلف طرح کے سوالات اور شکوک پیدا ہوتے ہیں انہیں میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا یہ بات عقلاً ممکن ہے کہ انسان کی تمام ضروریات مختلف زمانے میں ایک مجموعہ میں بیان کردی گئی ہوں؟ دوسری بات یہ کہ کیا وہ اسلام جس کا منبع قرآن اور معتبر روایات ہیں اس کے اندر اتنی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ تمام چیزوں کو، جس کی انسان کو مختلف زمانوں اور صدیوں میں ضرورت پڑتی ہے اپنے اندر رکھتا ہو، مذکورہ سوال کے دو حصے ہیں ایک ثبوتی حصہ دوسرا اثباتی اور دونوں جھتیں یعنی ثبوتی اور ثباتی قابل بحث وتحقیق ہیں، البتہ یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اعتراض قابل غور وفکر ہے، اور آغاز بحث میں اس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جاسکتا اور توجیہ نہیں کی جاسکتی، لیکن ان توضیحات کے مدنظر جو اس سے قبل ہم نے دی ہے اس کا جواب اتنا مشکل اور دشوار نہیں ہے۔

الف: سوال کے ثبوتی پہلو کی تحقیق

ثبوتی نقطہ نظر سے اس اعتراض کہ کس طرح سے قوانین کا مجموعہ، انسان کی زندگی کے تمام مراحل میں اس کی ضرورتوں کا جواب گو ہوسکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ قطعی طور پر انسانوں کے اندر صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ وہ انسان کے لئے مختلف صدیوں اور زمانوں قانون کا ایک کامل مجموعہ میں بنائے، اس لئے کہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ بشر اپنی محدود ذھنیت اور ناقص معلومات کے ذریعہ یہ صلاحیت نہیں رکھتا ہے کہ وہ انسان زندگی کے تمام گوشوں اور تمام حالات سے بحث کرے اور ہر ایک کے لئے مناسب قانون بنائے۔

لیکن اس ذات کے لئے جس نے بشر کو پیدا کیا ہے جو تمام ما کان وما یکون کے حالات سے واقف ہے جس کی نظر ماضی، حال اور مستقبل پر یکساں ہیں ہزاروں سال قبل وبعد کی اشیاء کو واضح انداز میں دیکھتا ہے اس کے قانون کے مجموعہ کی توضیح اور تشریح ممکن اور میسر ہے، لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان کی اس طولانی تاریخ میں تمام انسانوں کے لئے قوانین کا ایک کامل مجموعہ جو انسان کی زندگی کے تمام مراحل پر مشتمل ہو ممکن نہیں ہے، اس لئے جو گذشتہ اور آئندہ کی چیزوں کی خبر رکھنے والا اور انسانی وجود کے تمام پہلوؤں کی خبر رکھنے والا ہو، وہ اس طرح کے قوانین کو بنا سکتا ہے۔

ب:۔سوال کے اثباتی پہلو

اعتراض کے اثباتی پہلو یعنی جس چیز کو تم خدا کی طرف منسوب کرتے ہو اور وہ قرآن اور متواتر روایات میں بیان

ہوئی ہے، خاص طور سے اگر ہم صرف ان مسلمات اور یقینی قوانین کو اپنائیں، تو کس طرح ہر زمانہ میں محدود قانون بشر کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ہر چیز کے بارے میں خاص قانون پیش کریں جس میں اس جگہ اور اس زمانہ کے تمام شرائط کا لحاظ کیا گیا ہو اور اس وجہ سے کہ قانون کے نیاز مند مسائل محدود نہیں ہیں اور اس کی رغبت بے انتہاء ہے اور اس کے مقابلہ میں ہماری ادراک، فہم، ذہن اور سمجھنے کی صلاحیت محدود ہے لہٰذا ہم تمام مسائل کو ایک خاص اور معین شکل اور مکمل طریقہ سے حاصل اور معین نہیں کر سکتے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ بے شمار مسائل کے بے شمار دستہ نہیں ہیں، اِن مسائل میں ہر مجموعہ ایک کلی عنوان رکھتا ہو اور اس عنوان کا ایک خاص حکم ہو، لہٰذا کلی حکم ثابت اور محدود ہے اور ان کے مصادیق بے شمار ہیں اور ان میں تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے۔

ممکن ہے کہ کسی ایک زمانہ میں کوئی ایک مصداق کسی ایک حکم کو شامل ہو اور دوسرے زمانہ یا دوسرے حالات میں ایک دوسرے عنوان کے تحت قرار پائے اور بدل جائے، لہٰذا موضوعات میں مختلف اور بے شمار تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، لیکن لا محدود اور کلی عناوین ثابت رہتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی کے حالات مختلف ہیں اور ہر روز حالات بڑھتے رہتے ہیں، اور زمانہ کی ترقی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ نئے مسائل بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ جن کے بارے میں خاص قوانین کی ضرورت ہوتی رہتی ہے، تا کہ انسانی ضرورت پوری ہو سکے، البتہ ان متغیر قوانین کو خاص معیار کی ضرورت ہے کہ اگر انسان ان ثابت اور کلی معیار کو پہچان لے اور اس کی اجازت سے کہ جس نے کلی قوانین کو نازل کیا ہے اور لوگوں تک ان قوانین کے کلی معیار کو پہچنوانا ہے تو پھر کسی بھی خاص مقام کے لئے قانون بنا سکتا ہے۔

ہماری اس بات کا کہ (قوم وملت میں اسلام کے قوانین نافذ ہونے چاہئے) مطلب یہ ہے کہ صرف وہی قوانین نہیں ہیں جو براہ راست خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں بلکہ پیغمبر وامام معصوم علیہ السلام اور وہ حضرات کہ جو ان قوانین کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور ان کے معیار کو بخوبی جانتے ہیں اور کلی قواعد اور تزاحم کی صورت میں کسی ایک کی حجیت کو تشخیص دے سکتے ہیں ان کے مصادیق اور قوانین کلی کی حاکیت اور اہمیت کو معین کر سکتے ہیں اور بدون شک یہ کام الٰہی قوانین کی بنیاد پر قائم ہے۔

دسویں نشست

قانون کے سلسلہ میں نظریات میں فرق

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

حکومت وسیاست سے متعلق اسلامی نظریہ پیش کرنے کے سلسلہ میں ہم نے گذشتہ نشستوں میں یہ عرض کیا تھا کہ اسلام کی رو سے قانون ساز اور قانون کا نافذ کرنے والا خدا کی جانب سے منسوب ہونا چاہئے؛ یعنی قانون کو یا خدا بلاواسطہ بیان کرے جیسا کہ سماجی قوانین سے متعلق آیات اس بات کو بیان کرتی ہیں، یا ان قوانین کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات اور آیات قرآن کی تفسیر میں بیان ہوئے ہیں جو کہ سنت کے ذیل میں آتے ہیں، ان قواین میں سے بعض دائمی، مستحکم اور نا قابل تبدیل ہیں اور بعض میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، جو زمانہ اور جگہ سے لحاظ سے ہوتے ہیں، غیبت امام علیہ السلام کے زمانے میں ان کو معین کرنے کا اختیار ان افراد کو دیا گیا ہے کہ جو دینی معلومات، پرہیز گاری اور عدالت اور معاشرہ کی مصلحتوں سے آگاہی کے اعتبار سے امام معصوم علیہ السلام سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ اور نفاذ قانون کے سلسلے میں بھی ہم نے یہ عرض کیا کہ خود خداوند عالم اس کے نفاذ کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ یہ کام اس شخص کے ذریعہ انجام پانا چاہئے جو نفاذ قانون کا ذمہ دار ہو، اور وہ پہلے مرتبہ میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر ائمہ معصومین علیہم السلام اور پھر وہ افراد ہیں جو پیغمبر یا امام علیہ السلام کی جانب سے خاص یا عام طور پر معین کئے گئے ہوں۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے جلسہ میں عرض کیا کہ مذکورہ نظریہ کی بنیاد ایک طرح کے بنائے ہوئے اصول پر ہے کہ جس میں سے پہلی اصل یہ ہے کہ معاشرہ کو قانون کی ضرورت ہے، اور دوسری اصل یہ ہے کہ قانون کو خدا کی جانب سے ہونا چاہئے، ان دو مرحلوں کے بعد نفاذ قانون کے مرحلوں کو بیان کیا جاتا ہے، جو حضرات ان اصولوں کے قائل ہیں مثلاً مسلمان ہیں یا اسلام کے اصولوں کے معتقد ہیں ان سب کے لئے بحث میں داخلی نظم کا لحاظ کرتے ہوئے اس نظریہ کا ثابت کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن جو افراد اسلام کے اصولوں کے معتقد نہیں ہیں یا جو ان مسائل کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تا کہ دشمنوں کے اعتراضات کا جواب دے سکیں ان کے لئے ہر ایک اصول کو بہت تفصیل سے بیان ہونا ضروری ہے۔

2-دور حاضر میں قانون سے بحث کرنے کی ضرورت

اس دور میں سیاسی مسائل کے بارے میں مختلف طرح کے نظریات ہمارے سامنے ہیں، لہٰذا حکومت وسیاست کی فکری بحثوں کے بارے میں اسلام کی رو سے زیادہ توجہ ہونا چاہئے تا کہ ہم مخالف نظریوں کے مقابلہ میں اسلامی نظریہ کو مستحکم ویقینی شکل میں پیش کرسکیں، خاص طور سے اس بات کا لحاظ کریں کہ عالمی استعمار اسلامی حکومت کے نظریہ کو پامال کرنے کی مسلسل کوشش کررہا ہے، اس وقت ہم انقلابی دور میں اور ایسے زمانے میں زندگی بسر کررہے ہیں کہ نظام حکومت کو ثابت کیا جاچکا ہے، اور اسلام کے نظریات کو پیش کرنے کے لئے علمی اور منطقی وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

اور اس بات کے پیش نظر کہ ملک کے راہنماؤں کی طرف سے قانون مندی اور نفاذ قانون کا نعرہ لگایا جاتا ہے، لہٰذا عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ قانون کے مسئلہ کے اصول، حدود اور اہمیت پر توجہ رکھنی چاہئے، اور اس بات سے آگاہ ہوں کہ ہم کیوں؟ اور کس حد تک قانون کی پیروی کریں؟ یہ وہ اسباب ہیں جو اس زمانہ میں، اسلام کے سیاسی اور حکومتی مسائل کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت کو دوگناہ کردیتے ہیں، لہٰذ ہمیں ایک حد تک ان تمام بحثوں کو علمی اور تحقیقی شکل میں پیش کرنا چاہئے۔

3-قوانین کی حدود کو معین کرنے میں دو مختلف نظریے

آج کا انسانی معاشرہ مختلف طرح کے بے شمار قوانین سے دوچار ہے، اور اگر ہم ان کتابوں پر نظر ڈالیں جو پچاس ساٹھ سال قبل ہمارے لئے لکھی گئی ہیں تو ہم یہ سمجھ جائیں گے کہ ان کتابوں کی ضخامت میں اضافہ تقریباً قاعدہ عددی کی ارتقائی شکل میں ہے اور جو قوانین اس زمانے میں پائے جاتے تھے ان کی تعداد آج کے قوانین کی تعداد کی نسبت بہت کم ہیں، پھر خاص طور سے آج کل کے شعبہ جات، آئین ناموں، دفتری اور قوانین منتظمہ کی تعدا میں روز بروز اضافہ ہورھا ہے، اور معاشرے کو نئے قوانین کی ضرورت کا زیادہ سے زیادہ احساس ہورھا ہے، اور ذمہ دار حضرات بھی ان قوانین کے بنانے اور نافذ کرنے میں اپنی پوری کوشش ومحنت لگادے رہے ہیں۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قانون کی تعداد میں اضافہ کرنا معاشرہ کے لئے ضروری ہے؟ یہ سوال پہلی نظر میں سادہ اور عمومی معلوم ہوتا اھے اور کوئی خاص سوال معلوم نہیں پڑتا اس لئے کہ یہ بات واضح ہے کہ معاشرہ کو ہر روز جدید مسائل کا سامنا کرنا پڑرہا ہے، اور یہ معاشرہ جدید قوانین کا بہت زیادہ نیازمند ہے جو کہ بنائے اور نافذ کئے جانے چاہئے ے، لیکن دنیا کے علمی حلقہ میں یہ سوال اہمیت کے ساتھ ذکر ھوتا ہے کہ کیا سماجی قوانین کے بنانے میں صرف ضروری اور کم سے کم پر اکتفاء کی جائے یا معاشرے کے قوانین جامع اور ہمہ گیر ہوں اور عوام کی زندگی کے تمام امور کو شامل ہوں؟ یہ مسئلہ فلسفہ سیاست اور فلسفہ حقوق کے عملی حلقوں میں اعلیٰ پیانہ پر مورد بحث واقع ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں دو مختلف اور متضاد نظریہ پائے جاتے ہیں۔

ایک گروہ کا اعتقاد یہ ہے کہ عوام الناس کو اپنے امور اور سرگرمیوں میں آزاد ہونا چاہئے اور محکمہ قانون سازی کو چاہئے کہ کم سے کم قانون بنائے اور ضرورت سے زیادہ عوام الناس کی فعالیت اور امور کو محدود نہ کرے، یہ وہی خودمختاری اور آزادخیالی نظریہ ہے اور اس کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد جس طرح بھی چاہے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے میں آزاد ہو، اور صرف پیش آنے والی ضرورتوں کے وقت کے لئے قانون بنائے، تاکہ لوگوں کی کارکردگی ضرورت کے تحت محدود ہو، نہ کہ اس سے زیادہ، اور قانون سازی محکمہ اور حکومت کو مسلسل عوام الناس کے امور اور طرز زندگی میں دخالت نہیں کرنا چاہئے اور قدم قدم کے لئے قانون نہیں بنانا چاہئے، مذکورہ نظریہ کے مقابلہ میں قانون کے سلسلہ میں تمامیت گرائی (ھر چیز قانونی) کا نظریہ پایا جاتا ہے کہ تمام چیزیں قانونی ہونا چاہئے اور انسان کے تمام امور خواہ وہ ساجی ہوں یا سیاسی اور اقتصادی یا دوسرے امور، یہ سب کے سب دقیق اور معین قوانین کے تحت ہونے چاہئے، اور حکومت کو بھی ان قوانین کو ہر ممکن طریقہ سے نافذ کرنا چاہئے۔

تو معلوم یہ ہوا کہ مذکورہ سوال سادہ اور عوامی نہیں ہے بلکہ ایسا سوال ہے جو قانون کی حدود کے بارے میں دقیق اور مستحکم ہے اور وہ یہ کہ قانون گذاری کا محکمہ کس طرح کے قوانین اور کتنے قوانین اور عوام الناس کی زندگی کے کن حدود تک اثر انداز ہے؟

4۔ جمہوری حکومت میں قانون کی ضرورت

بنیادی طور پر یہ سوال قوانین کی حدود سے کے بارے میں ہوتا ہے جو کہ قانون سازی کے فلسفہ کے سلسلہ میں مختلف طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں کہ جن میں قانون گذاری اور ان کے معیار کے بارے میں نظریات بیان کئے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پائے جانے والے نظریات کے درمیان کہ کس کو قانون گذاری کا حق ہے اور اس کے معیار کیا ہیں، ایک مشہور نظریہ ہے کہ جس کو آج کل کی دنیا میں قبول کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ (صرف) وہ لوگ قانون بنانے کا حق رکھتے ہیں جو عوام الناس کی طرف سے منتخب ہوئے ہوں، لہٰذا در حقیقت قانون بنانے کا حق خود عوام الناس کو ہے اور وہ خود عوام الناس ہے جو اپنے لئے قوانین بناتی ہے جو نظام سیاسی اس نظریہ کی بنا پر وجود میں آتا ہے اس کو "ڈیموکراسی" یا "جمہوریت" کہتے ہیں۔

جمہوریت کو قبول کرنے کے بعد اور اس بات کو قبول کرنے کے بعد کہ قانون سازی کا حق عوام الناس کے منتخب ممبران کی ذمہ داری ہے، یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ جو بھی اکثریت (یعنی 51 فی صد) نمائندوں کے موافق ہو وہ قانون معتبر سمجھا جاتا ہے یا قانون سازی کے لئے دوسرے قوانین بھی ہونے چاہئے، اور پہلے سے ایسے قوانین بنائے جائیں جو قانون سازی کے میدان میں ممبران کے دائرہ عمل کو معین کریں، تو جواب یہ ہے کہ قانون ساز حضرات کی حدود اور حق کو قانون اساسی معین کرتا ہے یعنی قانون اساسی عام قوانین اور وضع شدہ قوانین پر حاکم اور نگراں ہوتا ہے اور قانون سازی کی حدود کے

بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔

یہاں ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف ممالک میں قانون اساسی مختلف ہوتے ہیں اور کم وبیش اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور کبھی کبھی حکومت کے بدلنے سے قانون اساسی بدل جاتا ہے اور کبھی مجلس ادارات تشکیل پاتی ہے جو قانون اساسی کو مکمل اور اس کے نقائص کو دور کرتی ہے، بہر حال جو تبدیلیاں قانون اساسی میں انجام پاتی ہیں ان کے اعتبار سے کوئی ایسا محکمہ پایا جاتا ہے جو قانون اساسی سے بالاتر ہو اور جو قانون اساسی کی حدود کو معین کرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قانون اساسی سے بالاتر محکمۂ حقوق بشر ہے جس کو کبھی قوانینِ فطری اور حقوق طبیعی سے یاد کیا جاتا ہے کہ جو قانون اساسی پر حاکم ہوتا ہے اور اس کی حدود کو معین کرتا ہے اس لئے کہ مجلس ادارات ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق قانون میں داخل نہیں کر سکتی۔

5۔ حقوق بشر کے اعتبار کا معیار

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوانین جو قانون اساسی پر بھی حاکم ہوتا ہے اور قانون اساسی کے دائرہ کو محدود و معین کرتا ہے اور اسکی بنا پر قانون اساسی میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اس کو کس نے بنایا ہے؟ اور انسانوں کے حقوق جو کہ حقوق بشر کے اشتہارات میں یا فلسفہ حقوق کی کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں کس شخص کے ذریعہ معین ہوئے ہیں اور ان کے اعتبار کی وجہ کیا ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ بین الاقوامی عرف میں اس کا اعتبار ان لوگوں کی تائید سے ہوتا ہے جنہوں نے اس اشتہار پر دستخط کئے ہیں اور چونکہ اس اشتہار کو دنیا کی تمام حکومتوں کے دستخط (تائید) حاصل ہوتی ہے لہٰذا یہ معتبر ہو جاتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس نے اس اشتہار پر دستخط نہیں کئے ہیں ان کے لئے یہ قوانین قابل اعتبار ہیں یا نہیں؟ اور اگر اعتبار نہیں رکھتے تو کوئی یہ حق نہیں رکھتا ہے کہ ان کی مذمت کرے کہ جن لوگوں نے اس اشتہار پر دستخط نہیں کئے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ حقوق بشر کا لحاظ نہیں کرتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حقوق بشر کے اشتہارات میں پیش کئے گئے قوانین اور حقوق وضعی قوانین نہیں ہیں کہ جو بنائے جانے کے بعد دوسروں کے دستخط کے ذریعہ قابلِ اعتبار بن جاتے ہیں بلکہ وہ ایسی حقیقی قوانین ہیں جن کو انسان کی عقل معلوم کرتی ہے اور چاہے عوام الناس قبول کرے یا نہ کرے، وہ قوانین معتبر ہوتے ہیں، البتہ اس زمانے میں کچھ افراد اس طرح کا نظر رکھتے ہیں اور حقوق بشر کو حقیقی امور اور غیر عادی جانتے ہیں، قطعی طور پر زیادہ تر حقوق وسیاست کے فلاسفہ اس طرح کا نظریہ نہیں رکھتے بلکہ اس بات کے قائل ہیں، کہ یہ قوانین کنوانسیون (Convention)، اشتہارات اور اعلانات کا اعتبار حکومتوں کے ممبران کے دستخط سے ہوتا ہے اور چونکہ حکومتوں کے ممبروں نے اس پر دستخط کئے ہیں لہٰذا پوری دنیا میں اعتبار رکھتے ہیں۔

آخر کار ایک سوال اور اعتراض جو بڑی آب و تاب کے ساتھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ضروری ہے کہ تمام حکومتیں ان

قوانین کو قبول ہی کریں؟ اور جن لوگوں نے ان قوانین پر دستخط نہیں کئے ہیں ان پر کس طرح یہ قوانین نافذ ہو سکتے ہیں؟ بہر حال اس طرح کے سوال واعتراض کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا، اور اس اعتبار سے فلسفہ حقوق میں یہ بحث ہوتی ہے کہ قوانین کے اعتبار کا ریشہ اور جڑ کہاں پر ختم ہوتی ہے؟ لیکن ہمارے پاس آسان اور سادہ سا جواب ہے اس لئے کہ ہم دین، اسلام، خدا اور قرآن پر اعتقاد رکھتے ہیں کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قوانین حکم خدا کے مطابق ہونے چاہئے، تو پھر یہ بات ختم ہو جاتی ہے اور کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لیکن جو لوگ اس راہ کو نہیں طے کرتے اور چاہتے ہیں کہ تمام چیزوں کو قرارداد کے ذریعہ بیان کریں، آخر میں وہ ایک جگہ پھنس جاتے ہیں چونکہ ہر قانون کے اعتبار کی اصل حقوق بشر کو سمجھتے ہیں کہ اس کے اعتبار کی دلیل کو بھی تلاش کرنا چاہئے اس کے علاوہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے حقوق بشر کا اشتہار تقریباً 30 بند پر کیوں تدوین ہوا ہے اور اس کے بند کیوں کم زیادہ نہیں ہیں؟

یہ وہ اہم سوال ہے جو دنیا کے حقوق کے ماہرین فلاسفہ قبول کرتے ہیں اور ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا ہے، جو چیز ذکر ہوئی ہے وہ دنیا کے ماہر اور برجستہ دانشوروں کی سطح پر مہارتی اور فنی بحثوں کے دائرہ میں بیان ہوتی ہے اور اگر ہمارا معاشرہ چاہے کہ اپنے عمومی تہذیب وثقافت کو ترقی دے تو اسے چاہئے کہ کم وبیش ان مطالب اور مفاہیم سے آشنا ہو، جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم قانون پر عمل کرتے ہیں اور قانون کے پیرو ہیں، تو ہم کو یہ جاننا چاہئے کہ قانونکا اعتبار کہاں سے ہے اور ہمیں کیوں اور کس حد تک قانون کا پابند ہونا چاہئے؟

آج کل بہت ساری بحثیں اس سلسلے میں تقریروں، مجلوں اور اخباروں میں شایع ہوتی رہتی ہے، اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً دنیاوی علوم رکھنے والا طبقہ اور جو لوگ انسانی علوم کے تعلیم یافتہ ہیں اور خاص طور سے جو لوگ فلسفہ حقوق اور فلسفہ سیاست میں صاحب نظر ہیں ان سوالات سے سامنا کرتے ہیں، لہٰذا ہم اپنے سماج کی تہذیب وثقافت کو بلند کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ اپنے امکان بھر ان تحقیقات کے نتیجہ کو آسان اور سلیس انداز میں بیان کریں، اس لئے کہ اگر ہم ان بحثوں کو دقیق انداز سے اور تفصیل کے ساتھ بیان کریں تو کم سے کم علوم انسانی کے چار قسموں میں یا فلسفہ کی چار قسموں کا سہارا لیں جو اس طرح ہیں: فلسفہ جامعہ شناسی، فلسفہ حقوق، فلسفۂ اخلاق اور فلسفۂ سیاست، اور اگر ہم چاہیں کہ اس موضوع پر بحث کریں تو ہمیں دوسرے فلسفوں پر بھی بحث کرنا ہوگی، یہاں تک کہ معرفت شناسی کہ جو ان تمام فلسفوں کی بنیاد اور اصل ہے اس کے بارے میں بھی بحث کریں، اور یہ بات واضح ہے کہ ان علوم کے نتائج اور ان بحثوں کے درمیان جو رابطہ پائے جاتے ہیں ان کی طرف اشارہ کرنا، تعلیم یافتہ طبقہ اور سمجھ دار عوام کے لئے جو کہ انقلاب اور اس کی تہذیب وثقافت کے دامن میں پلے ہیں، بہت مفید ہے۔

6- حقیقی اور تکوینی قوانین اور انسان کے اختیارات کی اہمیت

یہاں یہ بات ذکر کرنا ضروری ہے کہ لفظ قانون کی دو مختلف اصطلاح ہیں، پہلی اصطلاح علوم تجربیات میں علوم دقیق اور حساب مشہور ہے اور قانون سے مراد اس علوم میں اشیاء کے درمیان واقعی رابطہ ہے مثال کے طور پر اشیاء کے درمیان حقیقی قوانین پائے جاتے ہیں کہ پانی کس وقت بخار میں تبدیل ہوتا ہے، اور کتنے درجہ حرارت پر پانی اُبلتا ہے اور کتنی سردی میں برف بن جاتا ہے، اور لوہا کب پگھلتا ہے؟

لہٰذا اس طرح کی باتیں کہ جب پانی کی حرارت صفر درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو پانی برف بن جاتا ہے اور جب سو درجہ پہنچ جاتی ہے تو پانی اُبلنے لگتا ہے، یہ ایسی حقیقت ہے جو طبیعی اشیاء میں پائی جاتی ہے اور انسان کو کوشش کرنا چاہئے کہ ان حقیقتوں اور قوانین کو جو فیزیکس اور دوسرے سائنسی علوم میں موجود ہیں پہنچانے، ظاہر ہے کہ یہ قوانین پائیدار ہیں اور لا متناہی اور بے شمار ہیں، اور انسان کی علمی ترقی کے ساتھ بہت سارے قوانین معلوم ہونگے، اور ہر علم میں نئے معلومات کے ساتھ سیکڑوں سوال پیدا ہوں گے۔

لہٰذا اتنی تعداد میں نئے قانون بھی معلوم ہوں تاکہ ان سوالوں کے جوابات قرار پائیں، اس بنا پر ہر روز سوالوں میں اضافہ ہوتا ہے، اور بشر ان سوالوں کے حل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ قانون معلوم کرنے میں لگا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں، ہم دنیا کے بے شمار قوانین کے مجموعہ کی حدود میں رہتے ہیں، عناصر سے مربوط زندہ موجودات اور شیمیائی سے مربوط قوانین اور دوسری چیزیں ہیں جو ابھی تک ہماری عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس دنیا میں بے شمار قوانین کے محدود و تنگ دائرہ میں رہتے ہیں تو پھر ہمارے انتخاب اور اختیار کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟ یہ سوال بہت زور و شور کے ساتھ اٹھتا ہے اور اس وجہ سے انسان شناسی کے فلسفہ میں یہ بات ذکر ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ سو فی صد مجبور ہے یا مکمل طور پر مختار ہے یا محدود اور مشروط اختیارات رکھتا ہے، اور اگر اس کے اختیارات محدود اور مشروط ہیں تو ان کی حدود کیا ہیں، اسی طرح دور حاضر میں دنیا کے فلسفی مجلسوں میں قضا و قدر، جبر و تفویض اور اس طرح کے مسائل بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر ہوتے ہیں، اور ان کے بارے میں حسب سابق بحث جاری ہے، ان کے درمیان میں ایک گروہ فلسفہ وجودی کا نظریہ رکھتا ہے جو اس بات کا معتقد ہے کہ انسان لا محدود آزادی رکھتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق ہر کام کرسکتا ہے۔

جیسا کہ " جان پل سارٹر" کہتا ہے کہ اگر میں ارادہ کرلوں تو جنگ ویٹنام کی جنگ تمام ہوجائے! یعنی بشر ایسی طاقت کا مالک ہے کہ اگر ایک شخص ارادہ کرلے تو بھڑکتی ہوئی جنگ جس نے لاکھوں انسانوں کو نابود کردیا ہو روک دے، البتہ یہ بات تعجب خیز ہے، لیکن ایسا نظریہ اُس انسان کے لئے جو ارادہ و نا محدود قدرت کا قائل ہے پایا جاتا ہے۔

مذکورہ نظریہ کے مقابلہ میں ایک گروہ انسان کی آزادی کو خیال خام جانتا ہے اور معتقد ہے کہ انسان جبری قوانین

کے دائرہ میں زندگی بسر کر رہا ہے اور خیال کرتا ہے کہ آزاد ہے آخر کار مذہبی تفکر بھی موجود ہے جو ان دونوں نظریات کے درمیان واسطہ ہے اور انسان کے لئے آزادی کا قائل ہے جو مختلف طرح کے قوانین سے محدود ہے، جو کہ دنیا میں پائے جاتے ہیں یعنی اگر ہم ان قوانین کو جو اس کائنات میں موجود ہیں ان کے لئے دائرہ اور حدود تصور کریں، تو انسانوں کی آزادی، اس کی حدود کے اندر قابل اجرا ہے نہ کا اس سے بڑھ کر۔

پس اب جب کہ یہ بات واضح و روشن ہو چکی ہے کہ ہم لوگ تکوینی لحاظ سے قوانین کے مجموعہ کے تحت واقع ہیں، تو یہاں پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا ہم ان قوانین کو توڑنے اور ان کی نافرمانی کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، اور کیا ہم طبیعت کو تسخیر کر سکتے ہیں اور اس کی حدود و دائرے کو توڑ سکتے ہیں، اور اس طرح زندگی کریں کہ ہمارے اوپر طبیعی قوانین کی حکومت نہ ہو؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ تصور ایک خیال خام ہے اور سوچا سمجھا نہیں ہے، کیونکہ طبیعت کا تسخیر کرنے کا ملازمہ یہ ہے کہ طبیعت کا کوئی دوسرا قانون کشف ہو، مثلاً اگر ماہرین ڈاکٹر کسی بیماری پر کنٹرول کر لیتے ہیں یا اس بیماری کو بالکل ختم کر دیتے ہیں، طبیعت کے دوسرے قانون کے کشف کرنے کی وجہ سے اور ان سب سے استفادہ کرتے ہوئے اس طرح کی کامیابی ملی ہے، درحقیقت ہم نے طبیعت کو تسخیر نہیں کیا ہے بلکہ اس سے ایک دوسرا قانون کشف کر کے اس سے کامیابی حاصل کی ہے۔پس نتیجہ یہ نکلا کہ تکوینی قوانین کے دائرے سے نکلنا محال ہے، لیکن ہم نے جو نئے تکوینی قوانین کو کشف کر کے اس سے استفادہ کیا ہے یہ وہی قوانین الٰہی ہیں جن کو خداوند عالم نے طبیعت میں قرار دیا ہے، اور ان سے خارج ہونا گویا انسان کا خدا کی تکوینی عبادت سے خارج ہونا ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ انسان اپنی محدود دائرے میں رہکر تکوینی قوانین کے مجموعہ میں آمد و رفت کر سکتا ہے، اور مختلف علوم کے قوانین اور تکوینی قوانین جو انسان کے دائرہ اختیار میں ہیں ان سے استفادہ کرے اور ایک قانون کے مقابلہ میں دوسرے قانون سے استفادہ کرے، یعنی یہ محدود دائرہ انسانی اختیار کی حدود کو معین کرتا ہے۔

7۔الٰہی اور تشریعی قوانین، انسان کے کمال اور سعادت کی ضامن ہے

انسان جس قدر بھی انتخاب کی قدرت رکھتا ہے تو کیا جس طرح سے چاہے اس طرح انجام دے سکتا ہے، یا اس کے لئے کوئی ایک حد معین ہے؟ اور کیا اس حد میں بھی کچھ خاص قوانین ہیں کہ جن کو انجام دینا ضروری ہو؟ جواب یہ ہے کہ اس حد میں بھی قوانین معین ہیں البتہ یہ قوانین تکوینی قسم سے نہیں ہیں بلکہ یہ قوانین تشریعی اور اعتباری یا قوانین ارزشی ہیں کہ جن کو قدیم علماء کرام عقل عملی کے دائرہ میں بتاتے ہیں، (ان قوانین کے مقابلے میں کہ جن کا دائرہ عقل نظری ہے) یعنی ہر وہ چیز کہ جو انسان کے اختیار میں ہے اور عقل عملی اس میں فیصلہ دیتی ہے۔ بے شک تشریعی قوانین پر عمل کرنے سے انسان اپنے آخری مقصد اور کمال نھائی تک پہنچ جاتا ہے، اور ان کی مخالفت کرنا انسان کو انسانیت کے گرا دیتا ہے بلکہ جانور سے بھی بدتر بنا دیتا ہے، قرآن مجید اس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۔[1]

"ہم نے انسان کو بہت اچھے کینڈے کا پیدا کیا ہے پھر ہم نے اسے پست سے پست حالت کی طرف پھیر دیا مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے (اچھے) کام کرتے رہے ان کے لئے تو بے انتہا اجر وثواب ہے"

جی ہاں انسان میں اتنی صلاحیت ہے اور وہ خداداد صلاحیتوں کے ذریعہ خدا سے بہت قریب ہوسکتا ہے، اور خدا کی نافرمانی کر کے انسانیت سے بھی پست تر بلکہ جانور اور حیوان سے بدتر بن سکتا ہے۔ لہٰذا قوانین تشریعی اور قوانین اعتباری یعنی خدا کی اطاعت یا خدا کی نافرمانی انسان کے اختیار میں ہے، اگر ان قوانین کو قبول کیا تو گویا انسان نے خدا کی اطاعت کی، اور انسان بلند درجات پر پہنچ جائے گا، اور اس کو چین وسکون اور روحی ومعنوی سلامتی مل جائے گی اور اگر اس نے خدا کے نافرمانی کی تو انسانیت سے گرجائے گا، آج کل کے بہداشت اور صفائی کے قوانین کے طرح، کہ اگر ہم نے ان کی رعایت کی تو ہم صحت وسلامتی کی نعمت سے مالا مال رہیں گے اور اگر ہم نے ان قوانین کی رعایت نہ کی تو بیماریوں میں جتلا ہو جائیں گے۔

انسان کے مختار ہونے کے پیش نظر اگر انسان ڈاکٹری قوانین کی رعایت کرتا ہے یا نہیں کرتا، اگر اپنی صحت وسلامتی کی فکر ہے اور چاہتا ہے کہ صحیح وسالم رہے تو اس کو ڈاکٹری دستورات کی پابندی کرنی ہوگی، اور اگر اس کو صحت وسلامتی نہیں چاہئے تو پھر ان قوانین پر عمل کرنا کوئی ضروری نہیں ہے، لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ انسان کی صحت وسلامتی کے لئے ڈاکٹری قوانین کی رعایت کرنا ہوگی اور بغیر اس کے صحت وسلامتی ممکن نہیں ہے، البتہ یہ باتیں کوئی زبردستی والی نہیں ہیں؛ کیونکہ ان قوانین کی رعایت کرنا یا نہ کرنا سب کچھ انسان کے اختیار میں ہے، اور اپنے اختیار سے ان قوانین کی رعایت کر کے صحیح وسالم رہتا ہے اور ان کی رعایت نہ کر کے بیمار پڑ جاتا ہے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

اب تک جو کچھ جسم اور بدن کے بارے میں کہا گیا یہ سب کچھ انسان کی روح کے بارے میں بھی ہے، اور جس طرح انسان کا بدن بیمار ہوتا ہے اسی طرح انسان کی روح بھی بیمار ہوجاتی ہے، روح کی صحت وسلامتی بھی روح سے متعلق قوانین کی رعایت پر موقوف ہے کہ اگر انسان ان قوانین پر عمل کرتا ہے تو معنوی کمال اور سکون وسلامتی اس کو نصیب ہوتی ہے اور اس کے علاوہ انسان کی روح بیمار ہوجاتی ہے، خداوند عالم اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا......[2]

"ان کے دلوں میں مرض تھا ہی، اب خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا"

وہ انسان جو کسی نشیب میں ہو اور وہاں سے تیز دوڑنا چاہے اور اپنے کو کنٹرول نہ کر سکے اور گر پڑے اور اپنی جان

---

[1] سورہ والتین آیات ۴ تا ۶

[2] سورہ بقرہ آیت ۱۰

کھو بیٹھے، لیکن اگر وہ خود کو صحیح و سالم چاہتا ہے تو اس کو احتیاط کے ساتھ دوڑنا ہوگا، اور اپنے کو اس طرح کنٹرول کرے کہ اگر کسی بلندی سے نیچے کی طرف آ بھی رہا ہے اور کوئی خطرناک جگہ آ گئی ہے تو وہاں پر رک جائے اور سنبھال کر قدم اٹھائے۔ معنوی مسائل میں بھی خاص روابط و ضوابط ہیں اور خدا کے احکام پر پابندی کرنے سے روح کی سلامتی اور اخروی سعادت ابدی مل جاتی ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ ان قوانین پر عمل نہ کرنے سے اس سعادت پر نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ انسان آزاد اور مختار ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ میں سعادت اور کامیابی نہیں چاہتا اور میں جہنم میں جانا چاہتا ہوں؛ تو کسی انسان بھی اس سے کوئی مطلب واسطہ نہیں رکھتا، اور تکوینی انتخاب کا راستہ اس کے لئے ہموار ہے۔ لیکن اگر خدا کا قرب اور اخروی سعادت چاہتا ہے تو پھر اس کو خدا کے حکم کی پیروی کرنی ہوگی، اور اپنی مرضی نہیں چلے گی، کیونکہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے یا ہوائے نفس کی پیروی گمراہی اور حق و حقیقت سے منحرف ہونے کا سبب ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ۔ [1]

"بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو معبود بنا رکھا ہو اور (اس کی حالت) سمجھ بوجھ کر خدا نے اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہو اور اس کے کان اور دل پر علامت مقرر کر دی ہے (کہ یہ ایمان نہ لائے گا) اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، پھر خدا کے بعد اس کی ہدایت کون کر سکتا ہے تو کیا تم لوگ (اتنا بھی) غور نہیں کرتے"

جو کوئی شخص اگر اپنے نفس اور دل کا تابع ہو گیا ہے تو گونگا اور بہرا ہو جاتا ہے اور حقیقت و واقعیت کو نہیں سمجھ سکتا، اگرچہ بہت زیادہ علم بھی رکھتا ہو، اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے حقیقتیں چھپ جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں "بلعم باعورا" کا واقعہ ہمارے لئے باعث عبرت ہے کہ اتنے علم کے باوجود کہ اپنے زمانہ کے بڑے دانشمندوں میں شمار ہوتا تھا لیکن کس طرح سے پستی کی طرف گرا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۚ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث۔ [2]

"(اے رسول) تم ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کی تھیں پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا اور آخر کار وہ گمراہ ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ہم اسے انہیں آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے مگر وہ تو خود ہی پستی کی طرف جھک پڑا اور اپنی نفسانی خواہش کا تابعدار بن بیٹھا، تو اس کی مثل اس کتے کی مثل ہے کہ

---

[1] سورۂ جاثیہ آیت ۲۳

[2] سورہ اعراف آیات ۱۷۵، ۱۷۶

اگر اس کو دھتکار دو تو بھی زبان نکالے رہے اور اس کو چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے"

جی ہاں خدا کی عطا کردہ آزادی سے انسان اتنا بھی گر سکتا ہے، لیکن اگر انسان سعادت و کامیابی چاہتا ہے تو پھر اس کو مربوط قوانین کی رعایت کرنی ہوگی، اور یہ قوانین ایک طرح کے نہیں ہیں بلکہ مختلف قسمیں ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اسلامی احکامات کے چاہنے والے حضرات کو معلوم ہو جائے کہ ہماری زندگی میں کس طرح کے قوانین کی ضرورت ہے۔

8۔ حقوقی قوانین اور اخلاقی قوانین میں فرق

قانون کے نام سے جو چیز ہمارے درمیان مشہور ہے وہ "حقوقی قانون" ہے ان قوانین سے مراد ایک طرح کے دستور ہیں جو معتبر مرکز یا اداروں کی طرف سے بنتے ہیں اور وہ ایک طاقت ہے جس کا نام قوہ مجریہ (حکومت) ہے جو ان قوانین کے نفاذ کی ضامن ہوتی ہے اور ضرورت کے وقت پولیس یا فوج کے ذریعہ قوانین کا نفاذ کراتی ہے، اور جرائم کی روک تھام کرتی ہے، حقوقی قوانین عام معنی میں سزاؤں کے قوانین کو بھی شامل ہیں جو کہ علم حقوق میں بیان کئے جاتے ہیں، ایسے موقع پر اگر کوئی یہ کہے کہ حکومت کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ عوام کو بتائے ان سے کہے کہ چوری نہ کریں، کسی کی عزت پر حملہ نہ کریں، تو قطعی طور پر کوئی بھی حکومت اس بات کو تسلیم نہیں کرے گی، اس بات کا مطلب (کہ چونکہ انسان آزاد ہے لہٰذا اگر وہ قوانین حقوقی کی خلاف ورزی کرے تو کوئی اسے سزا نہ دے) یہ ہے کہ حقوقی قوانین کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، جبکہ قوانین ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ اس کا نفاذ کا کوئی ذمہ دار بھی ہو اور قوانین حقوقی اور قوانین اخلاقی کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے۔

اگرچہ دوسرے فرق بھی پائے جاتے ہیں مثلاً اخلاقی قوانین میں یہ ذکر ہوتا ہے کہ امانت کا خیال رکھیں اور اس میں کبھی خیانت نہ کریں، یہ ایک اخلاقی حکم ہے، اب اگر کوئی امانت میں خیانت کرے تو اخلاقی خلاف ورزی کی وجہ سے سزا یا قید میں نہیں ڈالا جائے گا بلکہ دھوکہ دھڑی کرنے پر قانون سزا کے مطابق اسے خاص سزا دی جائے گی، لہٰذا کوئی ایسا محکمہ ہونا چاہئے کہ جو قانون شکنی کرنے والوں کے ساتھ مقابلہ کر سکے اور طاقت کے ذریعہ ان پر قانون کو لاگو کر سکے، اس لئے قوانین کا لازمہ یہ ہے کہ طاقت کا استعمال کیا جائے کہ جس کے بغیر قوانین حقوقی بے معنی اور بے کار ہیں، لیکن قوانین اخلاقی ایسے نہیں ہیں، اور نہ ہی کسی محکمہ کی ضرورت ہے، مگر یہ کہ حقوقی پہلو رکھتے ہوں، بے شک دین میں ایسے احکام پائے جاتے ہیں جو انسان اور خدا کے درمیان رابطہ کو برقرار کرتے ہیں جیسے نماز، روزہ اور حج وغیرہ یہ احکام فقط ادیان (الٰہی) میں موجود ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین میں قوانین حقوقی بھی پائے جانے چاہئے یا دین صرف خدا اور بندے کے درمیان رابطہ کو قائم کرنے کے لئے ہے، یہ ایسا شبہ اور سوال ہے جو آج کل وسیع پیمانہ پر یونیورسٹیوں اور ان کی نشریات میں ذکر ہوتا رہتا ہے اور تمام حضرات چاہے وہ یونیورسٹیوں میں رہنے والے ہوں کہ جن سے بلاواسطہ تعلق ہوتا ہے یا ان کے والدین اور رشتہ داروں سے متعلق ہو، ان اعتراضات اور سوالوں کی طرف توجہ کرنا چاہئے، چاہے یہ باتیں آخرکار طالب علموں اور دانشوروں کے ذریعہ تمام افراد تک پہنچتی ہوں اور ہمارے عمومی تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہوتی ہیں، ایک دن یہی

جوان طالب علم اپنے ماں باپ کی جگہ لیتے ہیں اور ایک مؤثر اور نمایاں شخصیت بن کر معاشرہ کے بنیادی افراد میں قرار پاتے ہیں، اب اگر اس وسیع طبقہ کی تہذیب و کلچر بدل جائے تو ایک نسل کے بعد معاشرے کا کلچر پورے طور سے بدل جائے گا، لہٰذا ہمیں ہمیشہ اس بات کی طرف توجہ کرنا ہوگی کہ کون سی تہذیب اس وقت ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہے اور رواج پا رہی ہے۔

9۔اسلامی اور خودمختاری کے نظریات میں فرق

دور حاضر میں جو مسائل ذکر ہوتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ قانون کو کم سے کم ہونا چاہئے، یہ ایک خودمختاری نظریہ ہے جو دور حاضر کی دنیا میں پایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں بہت سی بحثیں ہوئی ہیں اور بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اسی نظریہ کی بنا پر کچھ افراد اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت اور قانون ساز حضرات کو انسان کی زندگی اور اس کے امور میں وسیع پیانے پر دخالت نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ جس قدر حکومت کی دخالت کم ہوگی معاشرہ اتنا ہی زیادہ ترقی کرے گا، البتہ اس نظریہ کے کچھ لوازمات بھی ہیں، جو معاشرے کے دوسرے حالات میں بھی سرایت کرتی ہیں۔

مذکورہ نظریہ کا تعلق سماجی آگہی سے ہے اور جامعہ شناسی کے بارے میں پائے جانے والے دو نظریوں میں سے ایک نظریہ پر موقوف ہے:

پہلے نظریہ میں: معاشرہ کو اصل قرار دیا گیا ہے، اس بنا پر قوانین کو جامع اور ہمہ گیر ہونا چاہئے، جو انسانی زندگی کے تمام حالات پر مشتمل ہو، اور شخصی آزادی کم سے کم ہونا چاہئے۔

دوسرے نظریہ میں: شخصی زندگی کو اصل قرار دیا گیا ہے اس بنا پر انسان کو مکمل آزاد ہونا چاہئے اور سماجی قوانین بہت کم ہونے چاہئیں تا کہ انسان کو کم پابند بنا سکے۔

آج کل جو بات مغربی معاشرے میں پائی جاتی ہے یہی انفرادی اور شخصی زندگی بسر کرنے کا نظریہ ہے کہ جس سے خودمختاری اور آزاد خیالی کا نظریہ پیدا ہوتا ہے، جو نظریہ اس بات کا قائل ہے کہ قوانین کو کم سے کم ہونا چاہئے اور عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہئے تا کہ عوام الناس جس چیز پر چاہے عمل کرے۔

اسلام کے نظریہ کو پیش کرنے سے پہلے اس نکتہ کو بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قانون سے دل چسپی کا موضوع (کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ) علوم انسانی کے چند شعبوں سے مربوط ہے جیسے جامعہ شناسی فلسفہ (یعنی معاشرہ اصل ہے یا شخص اصل ہے) اور فلسفہ اخلاق، اس بات کو سمجھنے کے لئے قدر و قیمت کا معیار کیا ہے؟ کیا اخلاق، قانون پر حاکم ہے یا اخلاق کو، قانون معین کرتا ہے، اسی طرح فلسفہ حقوق اور پھر فلسفہ سیاست میں بھی یہی بحثیں جاری ہیں، اسی نقطہ نظر سے انسان کی زندگی کے تمام پہلو اس کے عاقبت اور انجام سے مربوط ہیں یعنی ہر طرح کی سعی و کوشش اس زندگی میں ہماری ابدی خوش بختی یا بدبختی پر اثر انداز ہوگی۔

اسلامی تفکر سے مراد یہ ہے کہ " الدنیا مزرعۃ الآخرۃ " یعنی جو کچھ انسان دنیا میں بوئے گا یا جو رفتار و کردار اپنائے گا، آخرت میں اس کا نتیجہ ویسا ہی ظاہر ہوگا، اس کی سعادت کا سبب بنے گا یا اس کی شقاوت و بدبختی کا باعث بنے گا، اگر ہم اس نظریہ کو اصل قرار دیں تو پھر کیا انسان کی زندگی میں کوئی چیز باقی رہے گی جو قانون کی محتاج نہ ہو؟ یہاں پر قانون کا محتاج ہونا یعنی قانون ہماری راہنمائی کرے کہ انسان کس راستہ کو انتخاب کرے اور کس راہ و روش کو اپنائے تا کہ اپنے مقصود تک پہنچ جائے یعنی اگر معاشرہ امن و سلامتی چاہتا ہے، تو انسان کسی کی عزت اور مال و دولت پر دست درازی نہ کرے ورنہ اس کی عزت اور مال پر بھی حملہ ہوگا، اور بقول شاعر:

ببری مال مسلمان وچون مالت ببرند
داد وفریاد برآری کہ مسلمان نیست

" تم مسلمان کے مال کو اٹھالے جاؤ کیونکہ وہ تمہارے مال کو اٹھالے گئے اور پھر آہ وفریاد کرو کہ وہ مسلمان نہیں ہو "

انسان کی طبیعت منفعت طلب ہے اور انسان صرف اپنے فائدہ کے بارے میں سوچتا ہے، اور اس راستہ میں کسی بھی طرح کی سعی و کوشش سے دریغ نہیں کرتا لیکن جس وقت اس کے بارے میں منافع کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو قانون کا سہارا لیتا ہے، لہٰذا مزاحمتوں اور اختلافات کی برطرف کرنے کے لئے اور معاشرے میں امن و تعاون قائم کرنے کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے، جو دوسروں پر ظلم و ناانصافی کرنے سے روکے، اور ہر شخص کے حقوق کو بیان کرے اور عدل و انصاف کی حدود معین ہوں تا کہ عوام الناس کو یہ پتہ چل سکے کہ کون سا فعل ظلم اور بُرا ہے اور کونسا کام عدل و انصاف کے مطابق ہے۔ ورنہ ہر شخص دوسرے کے حقوق پر تجاوز کرتا ہے اور دوسرے بھی اس کے حقوق کو پامال کرتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں نا امنی پیدا ہوتی ہے، اور نہ ہی آرام و سکون ملتا ہے اور نہ ہی سعادت اخروی حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی شخص اپنی فطری خواہشوں کو حاصل کر سکتا ہے۔

اسی بنا پر اسلامی نظریہ کے تحت ہماری ساری حرکات و سکنات، چاہے وہ انفرادی و شخصی زندگی سے مربوط ہو خواہ سماجی و معاشرتی زندگی کے بارے میں ہو، سب کے لئے احکام و قوانین موجود ہیں، حد ہے کہ بین الاقوامی روابط کے لئے بھی قوانین پائے جاتے ہیں، اور اسلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے قانون رکھتا ہے انہیں میں سے حقوقی اور سماجی قوانین بھی ہیں، حد ہے کہ اسلام میں انسانوں کے ذہنی خطورات کے لئے بھی قانون موجود ہے اور اسلام کا کہنا یہ ہے کہ تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ جو چاہو اپنے دل میں سوچو، اور ہر طرح کا خیال کو اپنے دماغ میں لاؤ، اور دوسروں کے بارے میں بدگمانی کرو اس لئے کہ:

إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۔[1]

---

[1] سورہ حجرات آیت ۱۲

بعض گمان گناہ ہیں۔

جس طرح صفائی اور نظافت کا خیال نہ کرنے سے بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور انسان اور معاشرہ کی سلامتی خطرہ میں پڑ جاتی ہے، اسی طرح قوانینِ اسلام کا لحاظ نہ کرنے سے سماج و معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے۔

اور جو بات کہی گئی ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو اسلامی قوانین کے دائرے سے خالی نہیں ہے، یہاں تک کہ انسان کو اپنے دل، خیال اور فکر پر بھی کنٹرول رکھنا ضروری ہے، اور اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان کی آزادی کو چھین لیا جائے بلکہ آزادی سے صحیح فائدہ اٹھانے کا سلیقہ اسے بتایا گیا ہے اور اس کے راستہ کا چراغ ہے، تا کہ وہ آزادی سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھا سکے، البتہ یہ قوانین اس اعتبار سے کہ انسان کی سماجی زندگی سے مربوط نہیں ہیں اور صرف اخروی سزا رکھتے ہیں؟ جو شخص اپنے مومن بھائی کے بارے میں سوئے ظن رکھتا ہے اسے دنیا میں سزا نہیں ملتی بلکہ آخرت میں سزائیں ملتی ہیں۔

اگر سماجی قوانین واحکام کی مخالفت ہو اور معاشرتی مصلحتوں کو پامال کیا جائے تو دنیا کی سزائیں رکھی گئی ہیں اور در اصل دنیاوی سزائیں تمام حقوقی قوانین کا لازمہ ہیں، اور اسلام حقوقی قوانین پر منحصر نہیں ہے، اور جو شعبہ سماجی نظام کے نظم وضبط کے لئے قانون بنانا چاہئے وہ مجبور ہے کہ خلاف ورزیوں اور قانون شکنیوں کے بارے میں بھی سزا کو معین کرے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سماجی زندگی بغیر ایسے قوانین کے جو انسانی آزادی کو محدود کر دیں، قائم نہیں رہ سکتی ہے اور جس قدر سماجی روابط زیادہ وسیع ہوں گے اتنا ہی زیادہ سماجی قوانین کی ضرورت اور اس کے نفاذ کی ذمہ داری بڑھتی چلی جائے گی۔

گیارہویں نشست

قانون کے اعتبار کا معیار

1۔ بڑے سیاسی مسائل کی عمیق تحقیق کی ضرورت

ہم اپنے گذشتہ نشستوں میں اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کر چکے ہیں اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ اس بارے میں دو طریقوں سے بحث کی جاتی ہے:

1۔ بحث کا پہلا طریقہ جدَلی ہے جس میں اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ مخاطب مسلمان ہے، اسلام اور شیعت کا عقیدہ رکھتا ہے یا کسی اور مسلک سے وابستہ ہے، اس میں تو صرف طرفین کے توافق وتفاہم کی خاطر ابتدائی اصول اور مبانی کو اصول موضوعہ قرار دیکر بحث کی جاتی ہے اور انہیں مقدمات پر اعتماد کرتے ہوئے بحث کو جاری رکھا جاتا ہے۔

2۔ بحث کا دوسرا طریقہ بڑھانی ہے، جس میں بحث کو منظم، عمیق اور عقلی دلیلوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور گفتگو کے تمام اطراف وجوانب یہاں تک کہ اصول موضوعہ کی بھی تحقیق وجستجو کی جاتی ہے اور یقینی وظاہری چیزوں پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے مدعا کے لئے عقلی اور غیر قابل اعتراض دلیلوں کو قائم کیا جاتا ہے۔

اگر چہ برہانی بحث خستہ کنندہ ہوتی ہے اور علمی محفلوں اور اعلیٰ تعلیم گاہوں کے لئے مناسب ہوتی ہیں اور ان کے سننے والے بھی خاص افراد ہونے چاہئے، لیکن اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ ہمارے معاشرہ میں اپنی ثقافت کو بلند کرنے اور معلومات حاصل کرنے کے لئے قدم اٹھالئے گئے ہیں اور آج کل ہمارے بہت سے جوانوں کی معلومات خاص طور سے دینی اور سیاسی مسائل پر گذشتہ اندیشمندوں سے کہیں زیادہ ہے اسی وجہ سے برہانی ومدلل اور عمیق مباحث کی ضرورت ہے تا کہ ہمارے معاشرہ کی فکری اور ثقافتی معیار میں خاص طور سے جو مراکز اصل نظام اور اسلامی اصیل عقائد سے متعلق ہیں ان میں ترقی ہو، ان میں مقابلہ کرنے اور اعتراضات کے جوابات دینے کی طاقت پیدا ہو، تا کہ دوسروں سے متاثر نہ ہوں، اسی لئے ہم اصول موضوعہ سے مربوط مطالب کو علمی اور فلسفی پیچیدہ اصطلاحوں کے بغیر سادہ طریقہ سے بیان کریں گے، اور ان عقلی عقیدوں کو ذہن میں راسخ اور مستحکم کرنے کی کوشش کریں گے تا کہ وہ اعتراضات کے سیلاب سے بہت کم متاثر ہوں۔

حکومت اور سیاسی نظام کا ایک بنیادی کام یہ ہے کہ اس کی بیک سائڈ مضبوط ہو اور وہ معاشرہ میں حقوقی قوانین جاری کرنے کی ضامن ہو، اور یہیں سے اخلاقی قوانین کا حقوقی اور سیاسی قوانین سے فرق واضح ہو جاتا ہے، چونکہ اخلاقی

قوانین اس لحاظ سے کہ اخلاقی ہیں ان کو الگ سے نافذ کرنے کی ضمانت کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور ہر انسان اپنے عقائد اور اپنی معنوی حیثیت کی وجہ ان کا پابند ہوتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے، لیکن حقوقی قوانین کے لئے الگ سے ضامن کا ہونا ضروری ہے حقوقی قوانین کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کو معاشرہ یا کسی ادارہ کے ذریعہ عوام الناس کے لئے جاری کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی ان کا معتقد بھی نہ ہو تو بھی اس پر ان قوانین کی پابندی کرنا ضروری ہوتا ہے اور اگر کوئی ان قوانین کو ماننے سے سرپیچی کرے تو حکومت کا وظیفہ ہے کہ اس کے ساتھ طاقت و زبردستی سے پیش آئے اور اگر ضرورت پڑے تو ان قوانین کے نفاذ کیلئے اسلحہ کا بھی استعمال کرسکتی ہے۔

انہیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انقلاب کے بعد خاص طور سے اندرونی حالات اور بے رحمانہ قتل و غارت کے بعد نظام کے ذمہ دار افراد نے قانون مندی پر زور دیا یہاں تک کہ انقلاب کے ابتدائی سالوں میں سے ایک سال کا نام "سال قانون" رکھا گیا اور اب تک تمام حکومتوں نے اس اعلان کی پابندی کی ہے، اور اسی وجہ سے موجودہ حکومت کا ایک اصلی اور اہم مقصد قانون کے نعرہ کو ملکی پیمانے پر جاری کرنا اور خلاف ورزی سے لوگوں کو منع کرنا ہے، لہٰذا سب سے پہلے قانون اور اس کے معتبر ہونے کے بارے میں بحث کرنا ضروری ہے تاکہ اس بارے میں جو سوالات و اعتراضات درپیش ہوں ان کا قانع کنندہ جواب دیا جاسکے۔

2۔ قانون کے معتبر ہونے کا معیار اور اس کی وسعت

بہت سے لوگوں کے سامنے یہ اعتراضات و سوالات پیش آتے ہیں کہ مثلاً قانون کس حد تک معتبر ہے اور اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ اور افراد کو کس حد تک قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے؟ اور کون سا قانون اتنا معتبر ہے کہ افراد کو سو فی صد اس کا تابع اور مطیع ہونا ضروری ہے؟ بحث کو آگے بڑھانے اور ان سوالوں کے بارے میں کچھ بیان کرنے سے پہلے اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہم مسلمانوں کے نظریہ کے اعتبار سے اسلامی نظام کے تابع ہیں اور حضرت امام خمینیؒ اور مقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی کے اقوال ہمارے لئے حجت ہیں۔

لہٰذا اس بات کا کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ کہ ہم اسلامی حکومت کے قوانین چاہے وہ پارلیمنٹ نے بنائے ہوں یا حکومت کے کسی دوسرے ادارہ نے بنائے ہیں یہاں تک کہ قوانین کے وہ بخشنامہ جو مختلف وزارتخانوں سے اداروں کو دیئے جاتے ہیں ان سب کا نافذ کرنا ضروری ہے، اور امام خمینیؒ کے فرمان کے مطابق اسلامی حکومت کے تمام قوانین و مقررات لازم الاطاعت ہیں، لہٰذا ہمارے لئے ان سب پر عمل کرنا ضروری ہے، اور ہم سب کو ذاتی طور پر اسلامی حکومت کے چھوٹے سے چھوٹے قوانین و مقررات کی بھرپور رعایت کرنا چاہئے اگرچہ کسی مقام پر وہ ہمارے فقہی فتوے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اور اس بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلامی حکومت کے احکام و قوانین و مقررات اور ولی امر مسلمین کی اطاعت ہم سب پر واجب ہے، اب اگر ہم قانون کے اعتبار کے معیار و ملاک کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو

کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ ہم اسلامی حکومت کے قوانین کے لازم الاطاعت ہونے کے بارے میں شک کر رہے ہیں بلکہ اس سے تو ہمارا مقصد فکری بنیادوں کو اس بات کے لئے مستحکم کرنا ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔

اور ہماری کوشش تو اس سوال کی وضاحت کرنا ہے کہ ہم اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کیوں کریں؟ اور یہ معین ہونا چاہئے کہ قانون کے معتبر و معین ہونے کی وجہ کیا ہے؟ جب حکومت کسی دن عمومی چھٹی کا اعلان کر دیتی ہے یا قوانین و مقررات کے تحت آنے والے افراد کے لئے کچھ ٹیکس معین کرتی ہے یا معمول کے مطابق کچھ احکام نافذ کرتی ہے یا جداگانہ شرائط جیسے جنگ کی شرطوں میں عمومی طور پر عوام الناس کو طلب کرتی ہے اور خاص قوانین جاری کرتی ہے کہ عوام الناس یہ جان لیں کہ وہ قوانین اور مقررات پر کیوں عمل کریں، اور صرف یہ کہ کوئی شخص حکم صادر کر دے اور عوام الناس اس کی پیروی کر کے اس پر عمل شروع کر دے، یہ کافی نہیں ہے۔

دوسری طرف سے ہماری بحث "سیاسی فلسفہ" سے مربوط ہے، مسئلہ قانون اور اس کا معتبر ہونا اور اس کی اطاعت کا لازم ہونا یہ تمام سیاسی نظاموں کی بنیادی بحثوں میں سے ہے اور یہ صرف اسلامی نظام سے مخصوص نہیں ہے، "فلسفۂ سیاست اور فلسفہ حقوق" سے تقریباً سبھی لوگ واقفیت رکھتے ہیں، اور محققین اور ماہرین حضرات نے معارف بشری کے ان دو موضوعات کو بیان کرنے میں بڑی کوششیں اور محنتیں کی ہیں اور مختلف نظریات کو مناسب دلیلوں کے ذریعہ بیان کیا ہے، لیکن پھر بھی آج تک وہ اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے جو برہانی اور مدلل ہو، اور مکمل طور سے قانع کنندہ ہوتا کہ اس کا دفاع کیا جا سکے، اور قانون کے معتبر ہونے کے باب میں ان محققین نے مندرجہ ذیل تین اہم نظریات قائم کئے ہیں:

الف: نظریۂ عدالت

بعض محققین نے قانون کے معتبر ہونے میں عدالت کو معیار قرار دیا ہے، کہ اگر کوئی قانون عدالت اور عوام الناس کے حقوق کی رعایت کی بنیاد پر بنایا جائے گا تو وہ معتبر ہوگا اور عوام الناس پر اس کی اطاعت کرنا واجب ہوگی، لیکن اگر قانون عدل کی بنیاد پر نہ بنایا گیا ہو بلکہ غیر عادلانہ طور پر بنایا گیا ہو تو وہ قانون معتبر نہیں ھے۔

ب: معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرنا

قانون کے معتبر ہونے میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ قانون معتبر ہے کہ جو معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کر سکے، کیونکہ معاشرہ کے افراد اجتماعی زندگی سے سروکار رکھتے ہیں جن میں ان کی مخصوص ضرورتیں ہوتی ہیں اور ان میں ان کا کوئی فردی اور ذاتی پہلو نہیں ہوتا ہے، اگر چہ تمام لوگوں کو ان ضرورتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے لیکن اصل میں وہ لوگ اجتماعی ہیں اور اجتماعی زندگی کی شرطوں کا خیال رکھتے ہیں، مثال کے طور پر عمومی نظافت کی رعایت کرنا معاشرہ کی ایک اہم ضرورت ہے اگر چہ ہر شخص اگر وہ چاہے تو اپنی ذاتی زندگی اور گھر کی چھار دیواری کے اندر رہ کر اس کی رعایت کر سکتا ہے۔

لیکن عمومی نظافت کی رعایت کرنے کی خاطر ہر شخص کو اس کی رعایت کرنے پر آمادہ کرنا ایک مشکل کام ہے اور اس

بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فرد کے عملی اقدام سے بالاتر کوئی ادارہ یا قانون موجود ہو جو عمومی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ مثال کے طور پر اگر معاشرہ میں وبا اور طاعون جیسی خطرناک بیماریاں پھیل جائیں تو ان بیماریوں پر کنٹرول کرنے کے لئے فردی اقدامات سودمند ثابت نہیں ہو سکتے بلکہ اس چیز کی ضرورت پیش آئے گی کہ حکومتی پیمانہ پر کسی ادارہ کی طرف سے بیماری پر کنٹرول کرنے اور عمومی نظافت کو ایجاد کرنے کے لئے واکسن (سوئی) وغیرہ لگائے جائیں۔ تو حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قوانین وضع کرکے اگرچہ وہ موسم کے لحاظ ہی سے کیوں نہ ہوں، لوگوں کو اس بات کا پابند بنادے کہ فلاں مدت تک سب کو واکسن لگوا لینے چاہئے، (جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قانون سے ہماری مراد عام معنی ہیں جو تمام لازم الاجراء دستور العمل اور آئین نامہ وغیرہ کو بھی شامل ہوتا ہے)

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ کیا چونکہ عمومی نظافت معاشرہ کی ضرورت ہے اور اس کی رعایت کرنا ایک اجتماعی ضرورت ہے، لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کچھ خاص قوانین بنائے گئے ہیں، اور سب پر ان قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح اپنے مقام و محل زندگی کے اچھے اور سالم رکھنے کے لئے حکومت کی طرف سے کچھ ادارے معین کئے گئے ہیں جو ان ضرورتوں کو پورا کرنے کا اقدام کرتے ہیں اور عوام الناس پر بھی ان اداروں کی طرف سے صادر ہونے والے قوانین اور دستور العمل کی پیروی کرنا لازم ہوتا ہے، نتیجہ کے طور پر حکومت کی طرف سے بھی ادارے معین کئے گئے ہیں جیسے تعلیمی ادارے، نظافت و معالجہ کے ادارے، وزارتخانے، اور ان کے دستور العمل جو معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور اسی بنا پر ان کو شرعی حیثیت ہے لہٰذا ان کے دستورات کے مطابق ہر فرد پر عمل کرنا واجب ہے۔

ج: عوام الناس کیا چاہتی ہے

بعض محققین قانون کے معتبر ہونے کا معیار و ملاک عوام الناس کو خواہش سمجھتے ہیں ان کے نظریہ کے مطابق قانون معاشرہ کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے، لہٰذا جب بھی عوام الناس کوئی چیز حکومت اور قانون بنانے والے ادارہ سے طلب کرے تو حکومت کے پارلیمینٹ میں عوام الناس کے نمائندے عوام الناس کی خواہش کے مطابق قانون بنائیں، اور چونکہ جب قانون لوگوں کی خواہش کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے، تو پھر عوام الناس کا بھی فریضہ یہ ہے کہ اس کی پیروی اور اس کی حفاظت کرے اور اس سلسلہ میں بھرپور کوشش کرے، درحقیقت عوام الناس کی عینی خواہش کا تحقق ہونا پارلیمینٹ کے ممبروں کا منتخب کرنا ہے اور ان کو چاہئے کہ وہ عوام الناس کی خواہش کے مطابق قوانین بنائیں، اس بنا پر اگر عوام الناس کے منتخب کئے ہوئے نمائندے قانون بنانے کا حق نہ رکھتے ہوں تو عوام الناس کی طرف سے ان کا منتخب کرنا بے فائدہ اور بے سود ہوگا، اور اگر ان کو قانون بنانے کا حق ہو لیکن ان کی جانب سے وہ قانون لازم الاجراء نہ ہو تو قانون گذاری ایک عبث امر ہوگا۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ قانون کے اعتبار کے سلسلہ میں حقوق و سیاست کے کے فلاسفہ کے نظریات کا خلاصہ تھا، اور یہ فطری تقاضا ہے کہ ہم مسلمان ہونے کے ناطے قانون کے معتبر ہونے کا معیار خداوندعالم کی طلب اور مرضی جانتے

ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس چیز کا خداوند عالم نے حکم دیا ہے وہی قانون شمار کیا جائے گا اور اسی کو معتبر سمجھا جائے گا، البتہ یہ آخری نظریہ وہ لوگ مانتے ہیں جو خداوند عالم کو قبول کرتے ہیں۔

(ہم مندرجہ بالا نظریوں کی تفصیلی طور پر تحقیق وتنقید اور تجزیہ وتحلیل کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں اور صرف اسی تحقیق اور تنقید پر اکتفاء کرتے ہیں جو عام افراد کی فہم ودرک کے مناسب ہے)۔

3۔ پہلے نظریہ پر اعتراض

پہلے نظریہ میں بیان کیا جاچکا ہے کہ قانون کے معتبر ہونے میں عدالت کا رعایت کرنا ضروری ہے، یہاں پر ایک بنیادی سوال یہ پیش آتا ہے جس کو دنیا کے بڑے بڑے محققین نے بھی بیان کیا ہے اور اس سوال کے جواب میں انہوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھیں ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ عدالت کیا ہے اور عدالت کیسے محقق ہوتی ہے؟ درحالیکہ عدالت کا مفہوم سب کے لئے واضح ہے پھر بھی سیاسی اور حقوقی نظریہ بیان کرنے والوں کے لئے یہ سوال اتنا وسیع ہوگیا اور ان کو اس بھنور میں پھنسا دیا، لیکن یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے عدالت کا مطلب مختلف نکالا ہے۔

اگر تمام لوگ معاشرہ کے مال ودولت سے برابر استفادہ کریں تو عدالت قائم ہوگی یا نہیں؟ یعنی اگر ایک سیاسی نظام ان تمام مقدمات ووسائل کو فراہم کردے کہ تمام افراد گھر، لباس اور سواری وغیرہ کے اعتبار سے بالکل مساوی طور پر استفادہ کریں تو عدالت برقرار ہے ورنہ ظلم ہے؟ اس طرح کی چیزیں مکتب "مارکسیسم" (سیاست ومعاش کا مسلک) میں وقوع پذیر ہوئیں اور آخرکار "کمیونیزم" کا نظریہ پیدا ہوا۔

اور اس نظریہ کو بیان کرنے والوں نے یہ اعلان کئے کہ ہم ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جس میں کوئی طبقہ بندی نہ ہو، اور اس معاشرہ کا ہر فرد اپنی طاقت وقدرت کے لحاظ سے کام کرے، اور اپنی ضرورت کے مطابق استفادہ کرے، اس کے بعد وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان چیزوں کو عمل کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مندرجہ بالا نظریہ کی طرف ہونے کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا انہیں مشکلات میں سے عدالت کے مقابلہ میں آزادی آگئی تھی، اسی وجہ سے ان لوگوں نے اپنے نظریہ کا پھر سے بغور مطالعہ کیا اور کچھ تنزل کرتے ہوئے اپنے اعلانات میں "سوسیالسٹی" (عمومی سہولتیں) حکومت کو اپنایا، جب کہ وہ کمیونیزم حکومت کا ایک نمونہ کے طور پر بیان کررہے تھے۔

جس وقت مارکسیسم نے یہ دیکھا کہ لوگوں کی اکثریت پر خاص طور پر مزدوروں اور کسانوں پر ظلم ہورہا ہے تو اس نے اس بے عدالتی اور ظلم سے منع کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو وہ امور انجام دینا چاہئیں کہ حقوق کے اعتبار سے تمام افراد یکساں استفادہ کریں یعنی معاشرہ میں کوئی طبقہ بندی نہ ہو، اور سب کے درمیان بطور کامل مساوات ہو سب ایک دوسرے کے لئے نمونہ عمل ہوں اور سب کے لئے زمین جنت کے مانند ہو، ادھر بعد مسلمانوں نے اس میں ایک لفظ کا اور اضافہ کردیا اور کہا "توحید کے اعتبار سب لوگ ایک ہوں" تو اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا عدالت کا مطلب یہی ہے کہ تمام افراد ایک جیسے اور برابر

ہوں؟

اس کے مقابلہ میں بعض محققین کا عقیدہ یہ ہے کہ عدالت کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد اپنی محنت وزحمت کے مطابق معاشرہ سے استفادہ کرے، یعنی اگر کوئی شخص کسی کام کو انجام دیتا ہے تو اس کو اس کی محنت کے مطابق مزدوری ملنا چاہئے، اب اگر کوئی شخص کاہلی اور سستی کرے اور کوئی کام انجام نہ دے تو اس کو دوسروں کی زحمت کے برابر استفادہ نہیں کرنا چاہئے اور اجتماعی منفعتوں کو اس کے حوالے نہ کیا جائے اس بہانہ سے کہ عدالت ایجاد ہو سکے۔ اور جب عدالت ایجاد ہو جائے گی تو جو افراد کام انجام دیں گے وہ اپنے کام کی مزدوری حاصل کر لیں گے اب اگر کوئی اپنی محنت و کوشش سے زیادہ کام کرے اور اس کو اس کام کا کوئی نتیجہ نہ ملے تو یہ اس کے حق میں ظلم ہوگا۔

4۔ اسلامی قوانین کی برتری

بغیر کسی شک وشبہ کے عدالت کی دونوں مندرجہ بالا تفسیریں (کہ جن کو نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا) مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف اور مقام عمل میں ناہم آہنگ ہیں، جن سے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ احکام، عقائد اسلامی اور مسائل توحید سے سازگاری نہیں رکھتے، نمونہ کے طور پر ہمارے دین اسلام میں بہت سے ایسے احکام ہیں جو خود ہمارے عقیدہ کے مطابق معاشرہ کے لئے بہترین اور سب سے زیادہ مفید ہیں اور مسلماً عدالت کے مطابق ہیں لیکن دنیا کے بہت سے افراد ان کو نہیں مانتے اور نہ ہی ان کو عادلانہ سمجھتے ہیں، مثال کے طور پر بہت سے مقامات پر ارث کے مسئلہ میں مرد وعورت کے درمیان فرق رکھا گیا ہے اگر چہ بعض مقامات میں ان دونوں کی میراث بھی مساوی اور برابر ہے اور اس فرق کی نص صریح قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ۔[1]

"مرد کو عورت کے حصہ کے دوگنا ملے گا"

اس میں کوئی شک شبہ نہیں ہے کہ جو افراد اسلام کے نظریات اور اعتقادی اصول کی معرفت نہیں رکھتے وہ اس طرح کے قانون کو ظالمانہ قانون سمجھتے ہیں، چونکہ ان کے نظریہ کے مطابق خداوند عالم مرد وعورت کے درمیان تبعیض کا قائل ہے، دوسری طرف یہ کہ گھریلو مشترک زندگی میں اسلام نے مرد کو اس بات کا مکلف قرار دیا ہے کہ وہ مشترک زندگی کے تمام مخارج خواہ وہ عورت کے کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا لباس ہو یا گھر، سب کچھ مرد کو ہی پورا کرنا ہے، اور اسلامی نقطہ نظر سے عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمام درآمد کو بینک میں جمع کردے اور اس کی میراث اور اس کی درآمد کا خود اسی سے متعلق ہو، اور اس پر اپنی زندگی کے لئے کچھ بھی خرچ کرنا لازم نہیں ہے اور اس کو اپنے گھر کے تمام خدمات جیسے لباس دھونا، کھانا بنانا، یہاں تک کہ بچہ کو دودھ پلانے کی مزدوری لینے کا بھی حق ہے، البتہ جو افراد نزدیک سے اسلام کو نہیں جانتے جب وہ اس طرح کے احکام کو

[1] سورۂ نساء آیت ۱۷۶

دیکھتے ہیں اگر انصاف سے کام بھی لیں تو یہی کہتے ہیں کہ اسلام نے عادلانہ قانون نہیں بنائے ہیں۔

ان تہمتوں کو دور کرنے اور اسلام کے احکامات کی مناسب وضاحت کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام کے قوانین عادلانہ ہیں یا نہیں؟ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم عدالت کے کیا معنی کرتے ہیں، کیونکہ اگر عدالت کے معنی مساوات ہے تو تمام قوانین غیر عادلانہ ہیں اس لئے کہ ان میں مساوات کی رعایت نہیں کی گئی ہے، اور اگر عدالت کے کوئی اور معنی ہیں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ معنی کیا ہیں؟ البتہ عدالت کی ماہیت اور کیفیت کی معرفت حاصل کرنا اور عدالت کا تحقق کرنا آسان کام نہیں ہے اسی وجہ سے بڑے بڑے فیلسوف حضرات نے عدالت کے بارے میں بڑی بڑی تحقیقات کی ہیں اور ان میں سے بعض نے عدالت اور آزادی کے درمیان رابطہ کی تحقیق کی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر ہم قانون کے معتبر ہونے کا ملاک و معیار عدالت قرار دیں تو ہماری مشکل رفع نہیں ہوگی اور ہمارے ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ آتا ہے کہ عدالت سے کون سے معنی مراد ہیں؟ کیونکہ ہر انسان اپنے لحاظ سے عدالت کے معنی اور تفسیر کرتا ہے، اور اسی بنا پر قانون کو عادلانہ اور معتبر سمجھتا ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتا ہے اس کے مقابلے میں دوسرا انسان عدالت کی اپنی تفسیر کے بنا پر اس قانون کو غیر عادلانہ اور غیر معتبر سمجھتا ہے۔

5۔ دوسرا نظریہ عملی نہیں ہے

قانون کے معتبر ہونے کا دوسرا معیار یہ تھا کہ اس سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے، البتہ یہ معیار کسی حد تک قابل قبول ہے چونکہ تمام افراد کم وبیش اجتماعی ضروتوں کو سمجھتے ہیں، اور یہ جانتے ہیں کہ معاشرہ کو کن چیزوں کی ضرورت ہے، خاص طور سے جس معاشرہ میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں اور ہم سے پہلے جس معاشرہ میں ہمارے آباء اجداد زندگی بسر کرتے تھے یقیناً ایسا قانون اور حاکم موجود تھا جو ضرورتوں کو درک کرے اور اس کو یہ معلوم تھا کہ کس طرح معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

اس نظریہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ معاشرہ کی ضرورتوں کو مختلف طریقوں سے پورا کیا جاسکتا ہے اور یہی امر قانون کو منظم کرنے میں فرق کا سبب بنتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شہر کو خوبصورت اور اچھا بنانا اور اس کو صاف ستھرا رکھنا ایک عام ضرورت ہے اور اس ضرورت کو ضرور پورا ہونا چاہئے، لیکن اس کا خرچ کہاں سے آئے؟ تو کیا گھر کے ہر فرد پر کچھ خاص رقم رکھی جائے اور اس کو جمع کیا جائے؟

یعنی گھر کے ہر فرد کو اس بات کا پابند بنا دیا جائے کہ وہ شہر کی نظافت اور اس کو صاف و ستھرا رکھنے کی بابت کچھ رقم ادا کرے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شہر کے جاری مخارج کو عمومی سرمایہ سے پورا کیا جائے یعنی وہی سرمایہ جو عام طور سے مالی ٹیکس کے ذریعہ جمع کیا جاتا ہے اور اکثر وہ سرمایہ مالدار لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے، اور جو غریب لوگ شہر کے پسماندہ علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کے مکانات نامناسب ہوتے ہیں تو وہ اس ٹیکس کے ادا کرنے سے معاف ہوتے ہیں۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حکومت اس چیز کی پابند ہوتی ہے کہ وہ زمین کے اندر سے نکلنے والی چیزیں جیسے تیل، لوہا، وغیرہ ان کو فروخت کر کے ان کی وصول کی گئی رقم سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرے۔

ان تمام باتوں کے باوجود قانون کے معتبر ہونے کا معیار معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا بیان کیا گیا ہے اور مندرجہ بالا نظریات میں سے ہر ایک نظریہ معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے تو ان میں سے کس نظریہ کو عملی جامہ پہنایا جائے اور معتبر قانون کے عنوان سے پیش نظر رکھا جائے اور عوام الناس کون سے قانون کو سب سے زیادہ صحیح اور عادلانہ سمجھتے ہیں؟ لہذا صرف یہ معیار بھی قانون کو معتبر مشخص کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔

6۔ تیسرے نظریہ کی کمی اور اسلامی لحاظ سے ضرورتوں کی وسعت

تیسرے ملاک کے اعتبار سے صرف وہی چیزیں جس کو عوام الناس معتبر سمجھی ہے اور جس کو وہ طلب کرتے ہیں وہ ایک قانون کی صورت میں جاری ہونا چاہئے، یہاں پر ایک سوال یہ پیش آتا ہے کہ کیا معیار یہ ہے کہ تمام لوگ سوفی صد کسی ایک ہی چیز کو طلب کریں؟ اور یقیناً ایسا نہیں ہوتا ہے کہ تمام لوگ کسی ایک چیز پر متفق ہو جائیں اور شاید لاکھوں قوانین میں سے کوئی ایک قانون بھی ایسا نہ ہو کہ جس کی تمام افراد نے سوفی صد موافقت کی ہو اور ایک قانون چاہے عام طور پر لوگوں کے من پسند ہی کیوں نہ ہو پھر بھی کم سے کم ایک دوفی صد افراد اس کی مخالفت ضرور کرتے ہیں، اس بنا پر مخالفت کرنے والوں کے لئے قانون کے معتبر ہونے کا ملاک کیا ہے؟

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جو کچھ عوام الناس چاہتے ہیں، وہ عدالت کی میزان پر پوری نہ ہو تو کیا وہ قانون معتبر نہیں ہے؟ اسی طرح اگر عوام الناس کا مطالبہ دوسرے معیار سے اختلاف رکھتا ہو، یعنی عوام الناس کے مطالبہ معاشرہ کو ضروتوں کو پورا رکنے والی ضرورتوں میں شامل نہ ہو تو کیا وہ پھر اعتبار رکھتا ہے؟ اگر کسی قانون میں یہ لازم کیا جارہا ہو کہ عوام الناس سے کچھ رقم وصول کی جائے تو شاید اکثر افراد اس کی مخالفت کریں چونکہ جب نئے ٹیکس مقرر کئے جاتے ہیں تو عوام الناس اس کو زبردستی قبول کرتے ہیں (یعنی بڑی مشکل سے مانتے ہیں)۔ معمولی طور پر کسی بھی جگہ بھی قانون مالیات کو عام طور پر خوشی سے قبول نہیں کیا جاتا، جب کہ یہ طے ہے کہ حکومت معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے یہ رقم وصول کرتی ہے، تو عوام الناس بڑی مشکل سے اس کو قبول کرتی ہے۔

اس صورت میں اگر لوگوں کی خواہش کی مطابق عمل کیا جائے تو معاشرہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں، جبکہ ایک نظریہ میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ قانون کے معتبر ہونے کا معیار معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، اور جب لوگوں کا مطالبہ عام ضرورتوں کو پورا کرنے کے منافی ہو تو کیا اس وقت معاشرہ کی مصلحتوں کو مدنظر رکھا جائے یا اکثر لوگوں کی مرضی کے مطابق عمل کیا جائے؟ بغیر کسی شک وشبہ کے قانون بنانے والے اور جو لوگ معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ عملی طور پر مشاہدہ کرتے ہیں، کہ اگر ان موقعوں پر اکثر لوگوں کی مرضی کے مطابق عمل کیا جائے تو وہ کسی عمل میں پیشرفت نہیں کرسکتے،

(البتہ یہ بحث ڈیموکراسی (جمہوریت) کے اصول کی طرف پلٹ جاتی ہے جس کو ہم آئندہ تفصیل سے بیان کریں گے)

بہر حال اس طرح کے اعتراضات قانون کے معتبر ہونے کے معیار و ملاک پر پیدا ہوتے ہیں، البتہ ہمارے نظریہ کے مطابق سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ مصالح اور ضرورتیں جو بیان ہوئی ہیں وہ صرف عادی ضرورتیں بیان ہوئی ہیں اور عام معیار بھی ہے کہ معاشرہ میں انسان کی صرف یہی ضرورتیں متحقق ہونا چاہئیں؟ کیا حکومت کا صرف یہی وظیفہ ہے کہ وہ لوگوں کی صرف مادی اور دنیاوی ضرورتوں کو ہی پورا کرے یا حکومت کے دوسرے فرائض بھی ہوتے ہیں؟ اس سے واضح الفاظ میں عرض کریں کہ ہم تمام مسلمانوں اور وہ تمام افراد جو ادیان الٰہی میں سے کسی ایک دین کو مانتے ہیں ہم سب کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک بدن اور دوسرے روح، اور اکثریا تمام ادیان کا نظریہ یہ ہے کہ روح بدن سے افضل واشرف ہے اور بدن روح کا خادم ہے۔ ان سب کا عقیدہ یہ ہے کہ بدن کو نظافت کی ضرورت ہے اور بدن کو بیمار ہونے سے بچانا ضروری ہے اور اگر بدن مریض ہو جائے تو اس کا علاج کرنا چاہئے، اسی طرح انسان کی روح کو بھی نظافت کی ضرورت ہے، اور بیمار ہونے سے اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے، اور اگر مریض ہو جائے تو اس کا علاج بھی ضروری ہے، اگر ہم مادی ضرورتوں کا معنوی ضرورتوں سے مقابلہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ روحی اور معنوی ضرورتیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں، روح کی بیماری بدن کی بیماری سے بہت زیادہ خطرناک اور اہمیت رکھتی ہیں، کیونکہ انسان کی انسانیت کا امتیاز اس کی روح کی وجہ سے ہی ہے اور اگر اس کی روح مریض ہو جائے تو وہ انسانیت سے گر جاتا ہے، تمام حیوانات بھی بدن رکھتے ہیں اور اس کو سالم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی مادی اور جسمانی لذتوں کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں، جو کچھ انسان سے مخصوص ہے اور جوہر انسانیت کو اُجاگر کرتا ہے وہ ہے انسانی روح، اب اگر انسانیت کے معیار کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو انسان کی حقیقی موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔[1]

"کیا جو شخص پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں بے تکلف چلتا پھرتا ہے اس شخص کا سا ہو سکتا ہے جس کی یہ حالت ہے کہ (ہر طرف سے) اندھیروں میں (پھنسا ہوا ہے) کہ وہاں سے کسی طرح نکل نہیں سکتا، (جس طرح مومنوں کے لئے ایمان آراستہ کیا گیا ہے) اسی طرح کافروں کے لئے ان کے اعمال (بد) آراستہ کر دیئے گئے ہیں"

مندرجہ بالا مطالب کو مدنظر رکھتے ہوئے جو حکومت معاشرہ کی مصلحتوں کو پورا کرنے کے درپے ہے تو کیا اس کو عوام الناس کے روحی اور معنوی امور کی طرف توجہ نہیں دینا چاہئے؟ کیا حکومت کا صرف یہی وظیفہ ہے کہ وہ لوگوں کی صرف مادی

[1] سورۂ انعام آیت ۱۲۲

ضرورتوں کو پورا کرے، یا معنوی مصالح کو پورا کرنا بھی حکومت کا ہی فریضہ ہے؟

7۔ اسلامی انقلاب اور اس کا معنوی مصلحتوں سے برتر مقام

یہاں پر ایک پیچیدہ مسئلہ جو بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی مقام پر معنوی اور مادی پیشرفت میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو دونوں میں سے کس کو مقدم کرنا چاہئے؟ اگر کسی خاص زمان و مکان میں معاشرہ کی مادی پیشرفت، معنوی مصلحتوں کو چھوڑ دینے کا سبب بنے اور اگر مادی اور اقتصادی وسعت اور معنوی مصلحتوں کو پورا کرنے میں تزاحم (یعنی ایک دوسرے کے روبرو ہونا) پیدا ہو جائے، تو کیا حکومت مادی وسعت کو محدود کر سکتی ہے تا کہ معنوی مصلحتیں بھی محفوظ رہ جائیں یا یہ کہ معنوی پیشرفت کا حکومت سے کوئی سروکار نہیں ہے اور حکومت کا وظیفہ صرف مادی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے اور معنوی مصالح کو پورا کرنا خود عوام الناس کی ذمہ داری ہے؟ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور ہماری اجتماعی زندگی میں عملی نتیجہ رکھتا ہے، اور آج کل بڑے بڑے اخباروں اور خبروں میں شائع کیا جاتا ہے اور اس سے متعلق بڑے بڑے مناظرہ اور بحثیں ہوتی ہیں۔

کچھ افرد کہتے ہیں: حکومت کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ سیاست، معاش اور فرہنگ و ثقافت میں وسعت دے، وسعت کا مطلب وہی ہے جو عرف عام میں مشہور ہے اس بنیاد پر ثقافتی وسعت کے وہ مصادیق ہیں جن کو خاص طور سے ہم معنوی مصلحتوں کے لئے بیان کرتے ہیں اس سے مختلف ہے اور اس سے مراد قومی میراث کی حفاظت کرنا اور ورزش اور موسیقی جیسے امور میں وسعت کرنا ہے۔

بلا کسی شبہ جو افراد دین اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اور انقلاب اسلامی کے طرفدار ہیں، مصالح معنوی کی ایک خاص اہمیت کے قائل ہیں اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انقلاب برپا کرنے کا اصلی ہدف معنوی مصالح کی حفاظت کرنا تھا۔ البتہ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اسلام کے زیر سایہ ہی مصالح مادی بھی پورے ہوں۔

اگر چہ کچھ زمانہ ہی کیوں نہ لگ جائے ان سب باتوں کے باوجود ہماری قوم نے معنوی اور الٰہی پختہ اعتقاد اور معنوی مصالح کی حفاظت کی خاطر عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ ہم معاشی نا کابندی اور مہنگائی اور دوسری مشکلات کے باوجود زندگی بسر کر سکتے ہیں، ان کے عزیز و اقارب اسلام کی خاطر قربان ہو سکتے ہیں، عورتیں بغیر شوہر اور بچے بغیر باپ کے ہو سکتے ہیں جیسا کہ شہیدوں کے وصیت ناموں سے اس بات کا مسلم ثبوت ملتا ہے کہ ان کا ہدف اسلام کی حفاظت اور معنوی مقاصد کو برقرار رکھنا تھا۔

جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے لئے مصالح مادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ دوسرا معیار و ملاک بھی موجود ہے اور وہ مصالح معنوی کی ضرورت کو پورا کرنا ہے اور اگر معاشرہ کی مصلحتوں کو پورا کرنے کو ہم قانون کے معتبر ہونے کا ایک معیار جان لیں تو ہمارے لحاظ سے "مصالح" مصالح مادی و مصالح معنوی دونوں کو شامل ہو گا۔ البتہ معاشرے کے مصالح کی تحقیق و جستجو اور اس کے مصداق کو معین کرنا ایک عمیق اور سلسلہ وار بحث ہے یہ اس سے بھی

کہیں زیادہ وسیع ہے جو فلسفہ سیاست اور حقوق میں بیان کی جاتی ہے اور وہ بحث اس بات پر موقوف ہوتی ہے کہ کیا حقیقت میں انسان مادی امور کے علاوہ مصالح واقعی بھی رکھتا ہے یا یہ کہ انسان کے مصالح وہی مصالح مادی ہی ہیں اور اس کے علاوہ کچھ آداب ورسومات ہیں کہ جو کبھی کبھی بدلتے رہتے ہیں اور دوسرے معنوی مصالح اور اہم ضرورتوں کے وجود میں کچھ نہیں ہیں؟ کیا مصالح اور واقعی ضرورتیں وہی مادی امور جو علمی تجربوں سے انجام پاتے ہیں اور مادی طریقوں سے ہی ان کو معین کیا جاتا ہے جیسے نظافت، معاش میں پیشرفت کرنا صنعت اور ٹکنالوجی یا اس کے علاوہ دوسرے مصالح روحی ومعنوی بھی موجود ہیں، جو تجربہ حسی کے قابل نہیں ہیں۔

البتہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ واقعی ومصالح وہی معنوی وروحی مصالح ہیں جو "متافیزیک" (حکمت ماوراء الطبیعۃ) سے متعلق ہوتے ہیں اور اصطلاح میں وہ علمی مسائل کا جزنہیں ہوتے اور علمی طریقے سے قابل اثبات نہیں ہوتے ہیں، لہٰذا نتیجہ کے طور پر اگر ہم یہ بیان کریں کہ معاشرہ میں معنوی مصالح کی ضرورت کو پورا کرنا چاہئے اور ان کو پورا کرنا حکومت کا وظیفہ ہے اور ہم ایک برہانی اور مدلل بحث پیش کرنا چاہیں تو ہم کو اس مسئلہ کو ضرور بیان کرنا چاہئے کہ ہمارے مادی مصالح کے علاوہ کچھ اور بھی مصالح رکھتے ہیں یا نہیں؟۔

بارہویں نشست

اقتدار کے بارے میں اسلام اور مغربی تمدن میں نظریاتی فرق

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہماری بحث کا موضوع اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کرنا تھا جس کے چند فرضیہ تھے اور اس نظریہ کو عقلی طور پر ثابت کرنے کے لئے ان مقدموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر ان کے بارے میں بحث ہونا چاہئے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ اسلام کے سیاسی نظام میں خدا کا قانون کسی ایسے شخص کے ذریعہ جاری ہونا چاہئے، اور حکومت کا ذمہ دار اس شخص کو ہونا چاہئے جو خدا کی طرف سے منصوب ہو اور خدا کی طرف سے اس کو اجازت دی گئی ہو، مندرجہ بالا نظریہ کے بارے میں مندرجہ ذیل مقدموں کی ضرورت پیش آتی ہے:

پہلا مقدمہ: معاشرہ کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے۔

دوسرا مقدمہ: قانون خدا کی جانب سے نازل ہونا چاہئے۔

تیسرا مقدمہ: ان قوانین کا اجرا کرنا لازم ہے اور ان کی جاری کرنے والی اسلامی حکومت ہے۔

مندرجہ بالا مقدموں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمان افراد مندرجہ بالا نظریہ کو قبول کرنے میں کوئی شک وشبہ نہیں کریں گے، لیکن بحث کو واضح کرنے کے لئے اور دوسرے افراد پر بھی حق ظاہر ہونے کے لئے ان مقدموں کو عقلی استدلال کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

معاشرہ میں قانون کا ہونا ضروری ہے تو جہاں تک ہم کو علم ہے کوئی شخص بھی اور وہ افراد بھی جنہوں نے اس بارے میں بحث کی ہے وہ اس میں شک نہیں کرتے کہ بشر کو اپنی اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے قانون کی ضرورت ہے لیکن معاشرہ میں کس قانون کو حاکم ہونا چاہئے اس بارے میں بہت زیادہ اختلاف پائے جاتے ہیں اور اس بنیاد پر قانون کے معتبر ہونے کے بارے میں فلاسفہ حقوق اور حقوق داں حضرات نے بہت زیادہ تحقیق وجستجو کی ہے اور ہم کس بارے میں بہتر قوانین اور دوسروں سے برتر قوانین کو مشخص ومعین کریں اس بارے میں ہم نے گذشتہ نشستوں میں قانون کے معیار وملاک کو بیان کرنے کی خاطر تین اہم نظریوں کی طرف اشارہ کیا تھا، البتہ اس بارے میں دوسرے نظریات بھی ہیں لیکن وہ اس اہمیت کے قابل نہیں ہے کہ ان کے بارے میں بحث کی جائے۔

قانون کے معیار و ملاک کے بارے میں پہلا نظریہ عدالت اور قانون کا اصول عدالت کے موافق ہونا ہے اور ہر وہ قانون جس میں جتنا عدل ہوگا اسی کو معاشرہ میں جاری ہونا چاہئے، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ قانون بہتر اور برتر ہے جو معاشرہ کے نظام اور امنیت کو پورا کر سکے، اور آخر کار تیسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ قانون بہتر اور برتر ہے جو لوگوں کی زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے، یہ تین نظریہ ان افراد کے مقابل میں ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ برے قانون کو اچھے قانون سے اور بہتر قانون کو برے قانون سے تشخیص وتعیین کرنے کا کوئی بنیادی معیار نہیں ہے، اور صرف معیار و ملاک لوگوں کی خواہش ہے: معاشرہ جس چیز کو پسند کرے وہ بہتر ہے اور قانون بھی اسی بنیاد پر بننا چاہئے، یہ "پوزیٹو" (مثبت) نظریہ ہے جو ہماری نظر میں بالکل واضح طور پر باطل ہے اس لئے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہر دن جس شخص کا جو دل چاہے وہی قانون برتر ہو جائے بلکہ ایک عقلی معیار ہونا چاہئے تاکہ اس کے بارے میں کوئی بحث کر کے کسی منطقی نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔

2۔ دین کی نظر میں بہترین قانون اور دوسروں کے نظریہ کے تحت تاثیر واقع ہونے کا خطرہ

دین اسلام کی نظر میں وہ قانون سب سے اچھا اور سب سے بلند قانون ہے جو انسانوں کی مادی اور معنوی ضرورتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچائے اور ایسا قانون ہو کہ اس قانون کے سایہ میں انسانوں کی مادی اور معنوی ضرورتوں کو چاہے وہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں سب سے اچھے طریقہ سے فراہم ہو سکتی ہوں اس نظریہ کا دوسرے نظریوں سے فرق یہ ہے کہ اس میں معنوی مصالح کو بہت زیادہ تاکید اور اس پر بہت زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔

لیکن افسوس کہ "رنسانس" (وہ نظریہ جو یورپ میں پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی کے شروع میں پیدا ہوا اور ان کا نظریہ گذشتہ آثار کی تقلید کرنا تھا) کے بعد "اومانیسٹ" کو تقویت ملی اور آہستہ آہستہ انسان کے ذہن سے خدا اور معنویت اور آخرت سے اس کی توجہ ہٹ گئی اور علمی سطح سے خارج ہو گیا، اور آخر کار ان سب چیزوں کو بھلا بیٹھا، اگر چہ کہیں کہیں گوشہ وکنار میں محدود دائرے میں معنوی امور پر بھی اعتماد کیا جاتا تھا، لیکن دنیا کی فلسفی اور حقوقی محفلوں میں اصلی اعتماد اور مسلط رغبت یہ ہے کہ ایسا قانون ہونا چاہئے جو انسانوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کر سکے، درحالیکہ معنوی ضرورتوں سے اس کا کوئی سروکار نہ رکھتا ہو، البتہ ہمارے نظریہ کے اعتبار سے یہ بات واضح ہے کہ قانون و معنوی ضرورتوں پر بھی بھر پور توجہ رکھنا چاہئے، اس لئے کہ انسان کے وجود کا سب سے اہم اور اصلی جز روحی، معنوی اور الٰہی اشیاء پر کامل یقین ہے اس بنیاد پر ہم اس بلند و بالا پہلو اور مصالح معنوی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اب ہمارا موضوع بحث یہ ہے کہ کیا قانون کو معنوی ضرورتوں پر توجہ دینا ضروری ہے یا نہیں؟

اس بات کی تاکید اور اس بارے میں بحث کرنا دلیل انحرافی کے ذریعہ جو آج کل التقاط فکری کی وجہ سے مختلف سطح کے افراد میں وقوع پذیر ہوئی ہے ہم اس مطلب کی اور زیادہ وضاحت کے لئے ایک مثال کے ذریعہ کر دینا چاہتے ہیں، فرض کیجئے کہ جسم کے سلسلے میں بعض محققین اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اس علم کے اعلیٰ درجات پر پہنچے ہوئے ہیں

جیسے "انشٹن" ایسے ہی افراد جسم کے بارے میں اظہار خیال کرسکتے ہیں۔

لیکن اگر انہیں سے نفسیاتی علم کے بارے میں کسی نظریہ کی تائید یا رد کے بارے میں خود ان کا نظریہ مانگا جائے تو وہ اپنا نظریہ نہیں دیتے ہیں، کیونکہ ان کو اس علم میں مہارت نہیں ہے اور اگر نظریہ دیں تو بھی اس علم کے ماہرین سے مشورہ اور معلومات حاصل کر کے اپنی زبان کھولتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اس علم میں مہارت حاصل نہیں کی ہے، اسی طرح وہ افراد جو کسی علم میں مہارت نہیں رکھتے صاحب نظر افراد کے کسی نظریہ کی تائید کی بنا پر کسی نظریہ کی تائید یا تصدیق کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص مختلف علوم کے ماہرین کے نظریات کا مطالعہ کر کے ان پر گامزن ہوجاتا ہے لیکن اسکو اتنا وقت میسر نہیں ہوتا کہ ان نظریات کا آپس میں ایک دوسرے سے موازنہ کرسکے کہ یہ نظریات آپس میں ایک دوسرے کے موافق ہیں بھی یا نہیں؟ کیا ان منسجم آراء و نظریات کا مجموعہ انسانیت کو تشکیل دے سکتا ہے یا نہیں؟ وہ ایسا کرنے کے لئے بالکل ہی فکر ہی نہیں کرتا ہے اور نہ ہی اس کو فکر کرنے کا کوئی انگیزہ ہوتا ہے وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا عقیدہ ہے کہ فلاں علم النفس کا جاننے والا یا معاشرہ کی شناخت رکھنے والا یا حقوق کا جاننے والا بہتر نظریہ رکھتا ہے اور یہی امر فکری التقاط کا سبب ہوتا ہے، لیکن اہل نظر اور محقق حضرات تمام نظریات کو جمع کر کے ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آپس میں ایک دوسرے سے سازگار ہیں یا نہیں، اگر فلاں علم النفس کے جاننے والے کے کسی نظریہ کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جامعہ شناسی کے دوسرے نظریہ سے اس لئے مطابقت کرتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں؟ اور اسی طرح دوسرے موضوعات کے دوسرے نظریات کو مختلف نظریات سے موازنہ کرتے ہیں۔

اہل نظر و تحقیق کے قطع نظر کم علم رکھنے والے افراد میں بھی نظریہ منتخب کرنے کا سلیقہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے، اور جب بھی ان افراد کو کوئی کتاب مل جاتی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس کتاب کا لکھنے والا معتبر ہے یا نہیں اس کے نظریات دوسرے نظریات سے مناسبت رکھتے ہیں یا نہیں اس کے تحت تاثیر واقع ہوجاتے ہیں اور نتیجۃً فکری التقاط سے دوچار ہوجاتے ہیں، لہٰذا ہر کتاب کی تحقیق اور اس کا مطالعہ کرنے سے پہلے توجہ رکھنی چاہئے کہ اس کتاب کا لکھنے والا معتبر ہے یا نہیں؟ کیا اس کے نظریات دوسرے موضوعات کے نظریات سے مناسبت رکھتے ہیں یا نہیں؟

3۔ دینی نظریات میں دوسروں سے متأثر ہونا

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اسلامی معاشرہ میں اس صدی کے آدھے دوسرے حصہ میں دوسروں کے نظریات کے تحت تاثیر ہونے کا بڑا زور و شور پیدا ہوگیا ہے، بعض افراد اپنی زندگی کے ایک مرحلہ میں اپنے ماں باپ، ماحول اور علماء سے عقائد اسلام کو حاصل کرتے ہیں اور قبول کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ زندگی کے دوسرے مراحل میں داخل ہوتے ہیں اور جب اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں تو اس ماحول میں رہکر دوسروں کے عقائد اور نظریات اور مختلف علوم کے مختلف موضوعات سے آشنا ہوجاتے ہیں اور یہ توجہ کئے بغیر کہ یہ افکار و نظریات دوسرے مختلف علوم کو حاصل

کرنے والے افراد کے علوم سے سازگار ہے یا نہیں؟ ان کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر جس نظریہ کو وہ فلسفہ میں قبول کرتے ہیں، وہ نظریہ علم الحیات، فیزیک اور علم حساب کے نظریہ سے یا کسی دوسرے دینی نظریہ سے مناسب اور سازگاری رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ہم غور و خوض کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ بعض موارد میں ایک دوسرے کے سازگار نہیں ہیں اور ایک کامل مجموعہ کو تشکیل نہیں دیتے اس طرح کی شکل تفکر کو تفکر التقاطی (دوسروں کے تحت تاثیر ہونا) کہتے ہیں؟

آج ہمارے دینی معاشرے کے افراد بہت وسیع سطح میں تفکر التقاطی میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ ایک طرف تو وہ اسلامی معاشرے سے اپنے وراثتی اور خاندانی عقائد کو حاصل کرتے ہیں اور ان کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں، اور دوسری طرف سے مختلف علوم انسانی کے مسائل کو ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ ان کو بھی مان لیتے ہیں اور دینی عقائد کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ وہ اس چیز سے غافل رہتے ہیں کہ یہ مختلف نظریات آپس میں ایک دوسرے سے تال میل نہیں کھاتے اور ہم کو یا تو دینی عقائد کو تسلیم کرنا چاہئے یا ان افکار کو جو دین کے مخالف ہیں۔

اس بنا پر اگر ہم جامعہ شناسی، حقوق، سیاست اور ان کے مانند نظریات جو ہمارے دینی عقائد سے ہم آہنگ ہوں ان کو تسلیم کرنا چاہیں تو ہم کو جن نظریات کو دوسرے ممالک کی کتابوں کا ترجمہ کر کے اور ان کی تبلیغ کر کے ہم تک پہنچایا گیا ہے اس کو نظر انداز کریں، اور انسانی علوم کے ان جدید نظریات کو جو علمی نقطہ نظر اور اصولی لحاظ سے بھی ہمارے دینی عقائد سے سازگار ہوں ان کو بیان کرنا چاہئے، اور اگر ایسا نہیں کریں گے تو یا تو ہم اپنے دینی عقائد سے دست بردار ہو جائیں یا پھر اپنے دینی عقائد کے مخالف نظریات اور افکار کو چھوڑ دیں، اس لئے کہ دونوں کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جا سکتا، جس طرح یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اب دن بھی ہے اور رات بھی۔

نتیجہ کے طور پر ہم نے جو اساسی اور بنیادی نکتہ بیان کیا ہے اس پر توجہ کئے بغیر تمام نظریات کی تلاش میں نہیں نکلا جا سکتا اور ہر حصہ کو قبول نہیں کیا جا سکتا اور التقاط فکری اور دنیا میں سر نہیں کھپایا جا سکتا ہے اس صورت میں ہمارے اندر شناخت و معرفت میں "افراطی پلورالیزم" کا نظریہ ظاہر ہو جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص جو کچھ کہے وہ صحیح ہے اور ہم صرف باطل نہیں کہتے ہیں، اور ہر شخص حقیقت کے کچھ حصہ کو بیان کرتا ہے اور ہر مکتب کے اندر کچھ نہ کچھ حق ضرور پایا جاتا ہے، فلسفہ میں اس طرح کا نظریہ (جو آج بھی یورپی فلاسفہ حضرات میں رائج ہے) وہ شک و تردید میں ختم ہوتا ہے یہ نظریہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ عام طور سے علوم میں مختلف نظریات ہوتے ہیں اور ہر نظریہ میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے اور ہم کسی چیز پر یقینی اعتقاد نہیں رکھ سکتے، تو ہمارے لئے کسی چیز پر بھی قطعی اور جزمی اعتقاد نہ رکھنا بہتر ہے اور نظریہ کے صواب یا غلط ہونے کے احتمال پر کفایت کرنا چاہئے، اور دین کے باب میں بھی ہم کو پلورالیزم دینی کو قبول کرنا چاہئے، اور اسی بنیاد پر خدا کی وحدانیت پر مسلمانوں کا عقیدہ اور جو شخص کوئی دوسرا عقیدہ رکھتا ہے اس کو ابدی عذاب کا مستحق سمجھتے ہوئے ان کو تسلیم کر لیں اور صحیح

سمجھیں، اور عیسائیت کہ جو تین خداؤں کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے عقیدہ کو بھی صحیح سمجھیں اور جو دو خداؤں (خدائے خیر وخدائے شر) کا عقیدہ رکھتے ہیں اس کو بھی درست سمجھیں، اس لئے کہ ان میں سے کوئی ایک عقیدہ بھی قطعی اور صحیح نہیں ہے، ممکن ہے ہر ایک درست ہو یا ایک بھی درست نہ ہو اور ہم یہ بنا بھی نہیں رکھتے کہ ان میں سے کسی ایک سے برخورد کریں، چونکہ وہ تمام خوب اور درست ہو سکتے ہیں۔

تمام مختلف اور متضاد عقائد ونظریات شک گرائی وشکاکیت (کہ جن پر کوئی شخص مکمل طور پر اعتقاد نہیں رکھتا) اور پلورالیزم کے نظریہ کی بنا پر ہیں، اجتماعی تساہل (سہل انگاری) اور تسامح جو اس چیز پر مبنی ہے کہ اجتماعی طور پر نہ تو تعصب ہو نہ کسی نظریہ کی طرفداری کی جائے، اور نہ غصہ سے کام لیا جائے اور اسی بنیاد پر آج کل کے دور میں ان کو رائج کیا جائے کہ کسی کو تعصب نہیں کرنا چاہئے اور ہر شخص جو کچھ کہے اس کے بارے میں یہ سوچنا چاہئے کہ شاید یہ صحیح ہو، تو حقیقت میں انسان کے اندر دینی عقائد، فلسفی اور علمی اعتبار سے بے تفاوت کی حالت ایجاد کرتا ہے۔

آج کل یورپ میں اکثر افراد یہی نظریہ رکھتے ہیں اور ہمارے لئے یہ نظریہ ایک تحفہ سے کم نہیں ہے اس لئے کہ ہمارے معاشرہ کو بھی محنت ومشقت وتحقیق کے ذریعہ اپنے اندر یہ حالت پیدا کر لینی چاہئے کہ ان کو دینی، علمی اور فلسفی عقائد سے متعصب نہیں ہونا چاہئے اور ہر نظریہ کے بارے میں کہنا چاہئے کہ ممکن ہے یہ نظریہ درست ہو اور ممکن ہے دوسرا نظریہ درست ہو، کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم کو اپنے علم کو مطلق نہیں سمجھ لینا چاہئے اور نہ ہی یہ کہنا چاہئے کہ یہ سوفی صد درست ہے اس کے علاوہ اور کچھ صحیح نہیں ہے، ہم کو ایسا یقین نہیں رکھنا چاہئے، ہمیں تو صرف اپنے اعتقاد پر برقرار رہنا چاہئے اور اس کا احترام کرنا چاہئے اور دوسرے بھی اپنا عقیدہ رکھیں، (ہم سے کوئی مطلب نہیں) یہ وہی ثقافت ہے جس کو یورپ کی دنیا نے اپنے لئے منتخب کر رکھا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمام عالم میں اسی ثقافت کے زیر سایہ زندگی ہونی چاہئے۔

یعنی ان کا عقیدہ یقینی اور جزمی اعتقاد کا انکار کرنا اور اس چیز کا انکار کرنا کہ دین حق، مذہب حق اور نظریہ حق ایک ہے اور افراد کے اذھان عالیہ میں اس بات کا ڈالنا کہ ممکن ہے نظریہ حق متعدد ہوں اور انسان کو ایک چیز پر ہی یقینی اور جزمی اعتقاد نہیں کر لینا چاہئے۔ اور مقام بحث میں تعصب سے کام نہیں لینا چاہئے، دینی غیرت اور مذہب کے اندر تعصب کو ختم کر دینا چاہئے، افراد کو ایک دین ایک مذہب اور ایک فکر کی طرف رجحان کو ختم کرنا چاہئے تا کہ سب مل کر ایک اجتماعی زندگی بسر کر سکیں اور مذہبی مسائل میں کوئی اختلاف نہ ہوں، کیونکہ یہی دینی اختلاف قتل وغارت اور جنگ جدال کے باعث ہوئے ہیں اب تو تمام مذاھب، ادیان اور افکار کو صحیح اور حق کہنا چاہئے تا کہ آپس میں صلح وآشتی کا راستہ ہموار ہو جائے۔

4۔ پلورالیزم دینی کا مطلب

اگر چہ ہم خصوص طور پر پلورالیزم کے مسئلہ کو بیان کرنا نہیں چاہتے لیکن مختصر طور پر یہ عرض کرتے ہیں کہ مقام عمل میں ایک موقع پر ہم یہ کہتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے طرفداروں کے ساتھ اور فلسفہ میں مختلف نظریے رکھنے والوں اور مختلف

علوم کے ماننے والوں کے ساتھ مودبانہ طریقے سے ملنا چاہئے اور ان کو اس بات کی اجازت دینا چاہئے کہ وہ اپنے نظریات کو بیان کریں اور ان کا دفاع کرسکیں، اور مختلف طریقوں سے بحث و گفتگو اور بحث کریں، آج دنیا میں ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک عیسائی یہودی اور زرتشتی کے ساتھ دوستانہ زندگی بسر کرتا ہے اور ان کے درمیان کشمکش، اختلاف، برادر کشی اور قتل و غارت بالکل بھی نہیں پائی جاتی۔

اس چیز کو تقریباً اسلام کے علاوہ کسی بھی مذہبی دینی اور سیاسی نظام میں مدنظر نہیں رکھا گیا ہے اور اس حد تک صاحبان ادیان کی خاطر و مدارات نہیں ہوئی ہے، حالانکہ اسلام میں اعتقادات کا مرکز عظیم "توحید" (خدا کی وحدانیت کا اقرار) ہے اور توحید کو رائج اور ثابت کرنے کے لئے "تثلیث" (تین خداؤں کا ماننا) اور شرک سے مقابلہ کرنا ضروری مانا گیا ہے، پھر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام میں عیسائیت اور یہودیت دونوں مذہب کو رسمی مذہب کے عنوان سے پہچنوایا گیا ہے اور ان دونوں مذہبوں کے پیروکار اسلام کی پناہ میں ہیں ان کی جان و مال اور ناموس محفوظ ہیں اور کسی شخص کو ان کے حقوق کو پامال کرنے کا ذرا سا بھی حق نہیں ہے۔

تمام الٰہی مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ اس طرح پیش آنا، اولیاء دین اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے سیرت میں سے ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ عراق کے کسی شہر میں ایک کافر ذمی کی لڑکی کے پیر سے پازیب نکال لی گئی ہے مسلمانوں کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے، کیونکہ اسلامی ملک اور اسلامی ملک کی پناہ میں ایک غیر مسلمان لڑکی پر یہ ستم ہوا، دوسرے مذہبوں کے طرفداروں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ اسلام کی بلندی اور افتخار کو بیان کرتا ہے جس کے لئے قرآن مجید کی واضح و روشن آیت موجود ہے:

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ. [1]

"(اے رسول) تم (ان سے) کھو کہ اے اہل کتاب تم ایسی (ٹھکانے کی) بات پر تو آؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان یکساں ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں......"

اور دوسری آیت ہم کو احسن (سب سے اچھا) سلوک کی طرف دعوت دیتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ. [2]

"اور (اے ایماندارو) اہل تاب سے مناظرہ نہ کیا کرو مگر عمدہ اور شائستہ الفاظ و عنوان سے......"

اگر پلورالیزم کا یہ مطلب ہے تو ہم کو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ اسلامی افتخارات میں سے ہے، اگر پلورالیزم کا یہی مطلب ہے تو ہم کو دل سے یہ کہنا چاہئے کہ عیسائیت بھی اسلام کے مانند ہے یہودیت بھی اسلام کے مانند ہے اور یہودی ہونے اور

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۶۴

[2] سورہ عنکبوت آیت ۴۶

مسلمان ہونے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اس لئے کہ ہر ایک میں کچھ نہ کچھ حقیقت پائی ہی جاتی ہے، نہ اسلام مطلقاً طور پر حق ہے اور نہ ہی یہودیت مطلق طور پر حق ہے، یا یہ کہیں کہ دونوں حق ہے اس راستہ کے مانند حق ہیں کہ جو ایک ہی مقصد پر پہنچاتے ہیں چاہے کسی راستہ سے چلے جاؤ مقصد تک پہنچ جاؤ گے، بے شک اس طرح کے نظریہ کو کوئی بھی مذہب قبول نہیں کرتا اور نہ ہی عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔

مگر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ توحید کا عقیدہ رکھنا اور تثلیث کا عقیدہ رکھنا دونوں برابر ہیں؟ یعنی خدا کی وحدانیت کے اعتقاد اور تین خداؤں کا اعتقاد رکھنے کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا؟ کیا اس دین کی اساس اور بنیاد پر جو یہ کہتا ہوا نظر آرہا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭاِنْتَھُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۔ [1]

"اور تین (خداؤں) کے قائل نہ بنو (تثلیث سے) باز رہو (اور) اپنی بھلائی (توحید) کا قصد کرو"

یا قرآن ان افراد کے بارے میں جنہوں نے خدا کی طرف ناروا چیزوں کی نسبت دی اور یہ کہا کہ خدا اولاد رکھتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۔ [2]

"قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شگافتہ ہو جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں"

جب اسلام اس طرح کے شرک آمیز اعتقادات کا اس طرح قطعی رویہ اختیار کرتا ہے تو ہم کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ اگر تم چاہو تو مسلمان بن جاؤ اور نہیں چاہتے تو بت پرست بن جاؤ، کیونکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اور تم کو ایک ہدف اور مقصد تک پہنچانے والے ہیں، اور دونوں راستے صراط مستقیم شمار کئے جاتے ہیں!! اور میں تو اس چیز کو بہت بعید سمجھتا ہوں کہ کوئی صاحب عقل انسان بغیر کسی غرض اور باطل ہدف کے اس طرح کی باتیں کرے اور اس طرح کے عقیدہ کو قبول کرے۔

بہر حال التقاط فکری اس زمانے کی ایک بڑی مشکل ہے اس لئے اس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے اور تاکہ ہمارے افکار صحیح و سالم رہیں اور اصل نظریہ کو حاصل کر کے اس پر برقرار رہنا چاہئے۔

5۔بندگی خدا کی عظمت اور اس کا مطلق آزادی سے ٹکراؤ

تمام نظریات کا ہماری بحث سے رابطہ یہ ہے کہ جن افراد نے یورپی ثقافت سے الھام کے ذریعہ اصل آزادی کو مطلق طور پر انسان کی سب سے بڑی قیمت اور اہمیت کے عنوان سے قبول کیا ہے اور آزادی کو انسان کے لئے سب سے بڑی ارزش سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے کہ خود کو اسلام اور دستورات اسلامی کا پابند سمجھتے ہیں اور خود کے دیندار ہونے کا دعویٰ کرتے

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۷۱

[2] سورہ مریم آیت ۹۰

ہیں، اس یورپی ارزش کی اس طرح حمایت کرتے ہیں کہ جیسے دیگ سے زیادہ چمچہ گرم ہوگیا ہو، اور بے شک یہ ایک قسم کا انحطاط ہے اگر یہ مبنیٰ ہو کہ ہم اس گروہ کے ساتھ منطقی بحث کرنا چاہیں تو ہم کو یہ کہنا چاہئے کہ اسلام کی اساس و بنیاد خداوند عالم کی پرستش اور عبادت ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ......... [1]

"اور ہم نے تو ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو خدا کی عبادت کرو اور بتوں (کی عبادت) سے بچے رہو"

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ ہر آسمانی دین کی بنیاد خداوند عالم کی خالصانہ عبادت و بندگی ہے۔

مگر ایک صاحب دین اور ایک مسلمان یا یہودی اور نصرانی اس کے علاوہ دین الٰہی سے اور کیا تصور کرسکتا ہے، ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اسلام تمام ادیان توحیدی کے ساتھ ان احکام کے علاوہ جو زمان اور مکان کے مناسب صادر ہوتے ہیں تمام کلیات اور اصول اعتقادی میں یکساں و برابر ہے۔

اور اگر اس بارے میں کوئی اختلاف نظر آئے تو یہ اس تحریف کا اثر ہے جو بعض ادیان الٰہی میں کی گئی ہے، نتیجتاً اسلام میں سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ انسان خالص خدا کا بندہ ہو اور خداوند عالم اس حقیقت کو قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان فرماتا ہے:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ.... [2]

"انہیں امر نہیں دیا گیا مگر یہ کہ خداوند عالم کی کامل اخلاص کے ساتھ دین میں پرستش و عبادت کریں"

اور سورہ زمر میں ارشاد ہوتا ہے:

أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ۔ [3]

"آگاہ رہو کہ عبادت تو خاص خدا ہی کے لئے ہے۔

اور سورہ لقمان میں فرماتا ہے:

وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ۔ [4]

"اور جو شخص خدا کے آگے اپنا سر (تسلیم) خم کرے اور وہ نیکوکار (بھی) ہو تو بے شک اس نے (ایمان کی) مضبوط

---

[1] سورہ نحل آیت ۳۶

[2] سورہ بینہ آیت ۵

[3] سورہ زمر آیت ۳

[4] سورہ لقمان آیت ۲۲

رسّی پکڑی۔"

اب جب انسان اپنے کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے خدا کی بندگی کو سب سے زیادہ باارزش جانتا ہے اور اس نے اپنے کو مکمل طور سے خداوند عالم کے اختیار میں قرار دیدیا ہے تو وہ مطلق آزاد کا معتقد ہوسکتا ہے اور جس چیز کو اس کا دل چاہے اس کو اہمیت دے سکتا ہے؟ کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے موافق اور سازگاری رکھتے ہیں؟ اگر میں درحقیقت اسلام حق کا عقیدہ مند ہوں اور یہ اقرار کرتا ہوں کہ خدا کا ایک دین ہے اور اس کو قبول کرنا چاہئے اور میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ ایک خدا اور اسکی عبادت کروں اور تمام چیزوں کو اسی کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہئے اور اسی کے ارادہ کے تابع ہیں تو میں کس طرح مطلق طور پر آزاد رہنے کا معتقد رہ سکتا ہوں اور جس طرح چاہوں عمل کروں؟ فکر کرنے کے یہ دو طریقے کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوسکتے ہیں، جو لوگ اس طرح کا ادّعا کرتے ہیں یا بے خبری کی بنیاد پر التقاط سے دوچار ہو گئے ہوں، یا دل میں اسلام کا عقیدہ نہیں رکھتے ہیں یا دوسروں کو فریب دینے کی وجہ سے یہ ادعا کرتے ہیں یا اصلاً وہ اس بات کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتے ہیں کہ یہ دو نظریہ آپس میں ایک دوسرے سے ناسازگار ہیں؟ اس صورت کے علاوہ میں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان ایک طرف تو یہ کہے کہ میں کاملاً اور میرا تمام وجود خدا کے ارادہ کا تابع ہے اور صرف اپنے لئے مطلق آزادی کا قائل ہو اور یہ کہے کہ جو میرا دل چاہے گا وہی انجام دوں گا۔

یہ طرز تفکر یعنی انسان کے مطلق طور پر آزاد ہونے کا اعتقاد یورپ والوں کی فکر کی پیداوار ہے وہاں پر مسیحیت کے معتقد گروہ اپنے دین کا عقیدہ رکھتے ہوئے (شاید اپنے فطری لگاؤ کی بنیاد یا اپنے ماحول اور دینی تربیت کی وجہ سے اپنے دین سے دست بردار نہیں ہوتے) خاص دلیلوں اور استدلالوں کی وجہ سے یا چند اہم اعتراضوں کی وجہ سے انسان کے مطلق آزاد ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، بے شک کوئی انسان بغیر کسی دلیل کے اس طرح کی بات نہیں کرسکتا، بلکہ ایک نقطہ سے اپنی بات شروع کرتا ہے اور اس طرح گفتگو کرتا ہے کہ جو دوسروں کے لئے جذاب اور قابل قبول ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ کیا ایک پرندہ کو پنجرہ میں بند کر دینا اور اس پنجرہ کو لوھے کے پنجرہ میں رکھ دینا بہتر ہے یا پرندہ کے اڑنے کے لئے پنجرہ کا دروازہ کھول دینا بہتر ہے؟ کہ وہ جدھر چاہے چلا جائے، ظاہر ہے کہ پرندہ کو آزاد کر دینا بہت اچھا ہے اور وہ بھی یہی چاہتا ہے، اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ جس آزادی کے بارے میں ہم بحث کرتے ہیں اس سے مراد یہی آزادی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں مکمل طور پر اسلامی قوانین ہوتے ہیں اس کے بعد "ولایت فقیہ" سے مربوط قوانین بھی اس میں رکھے جاتے ہیں، اور ان کے اندر پارلیمینٹ کے بنائے ہوئے قوانین بھی رکھے جاتے ہیں اور اسی طرح "مجمع تشخیص نظام" اپنی جگہ پر مسلم ہے اور آخر میں "شورای نگہبان" وضع شدہ قوانین پر اظہار نظر کرتی ہے، اس طرح قوانین بنانا یقیناً پنجرہ کو دوسرے پنجرہ کے اندر رکھنے کے مانند ہے! بہترین قانون وہ ہے جو انسانوں کو جس طرح وہ چاہیں اس طرح عمل کرنے کی

اجازت دیدے اور جس طرح چاہیں گفتگو کرنے کی اجازت دیدے، یعنی کلی طور پر وہ آزادانہ زندگی بسر کریں؟! اور ظاہری بات ہے کہ پہلا قانون پنجرہ ہے اور دوسرا قانون آزادی ہے۔

اگر ہم دوسری ثقافتوں کے عقائد وافکار اور آراء کی مشکل سے دوچار ہو جائیں تو ایسے موقع پر اس چیز کی تاکید کرتے ہیں کہ ابتدا میں ہم کو ان کا ریشہ ڈھونڈنے کی کوشش کرنا چاہئے اس کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ نظریات اسلامی نظریات سے سازگاری رکھتے ہیں یا نہیں؟

اگر اسلامی نظریات کے موافق ہیں تو قبول کریں اور اگر اسلامی نظریات کے مخالف ہیں تو ان کو چھوڑ کر اپنے دین کے اصول کی تلاش میں نکلنا چاہئے اور انہیں اصول کو اپنے عقائد اور نظریات کی بنیاد قرار دیں۔

6۔ یورپ اور علم و دین کے ٹکراؤ کا دور ہونا

علم و دین سے ٹکراؤ کو حل کرنے کے لئے یورپی متدین حضرات نے دین کے دائرہ فرمانروائی میں شک کرتے ہوئے کچھ راہ حل پیش کئے اور اس شبہ کو بیان کیا کہ بنیادی طور پر علم و فلسفہ کی کو دین سے جدا بتایا ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلسفی قدر و قیمت، اخلاقی قدر و قیمت اور یا انسانی قدر و قیمت دین کے ساتھ سازگار ہے یا نہیں یہ اس فرض کی بنا پر کہتے ہیں کہ دونوں ایک نقطہ پر مل جائیں چونکہ جب دو خط ایک دوسرے کی طرف مائل ہے تو ایک نقطہ پر وہ دونوں خط ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں لیکن اگر دو خط ایک دوسرے کے برابر ہوں مقابل میں ہوں تو کبھی بھی وہ آپس میں ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے، اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراؤ نہیں ہوگا چونکہ ان میں سے ہر ایک خط اپنے ہدف پر ختم ہوتا ہے جو اس کا دوسرے خط کے علاوہ مستقل ہدف ہے۔

وہ علم و دین کے ایک دوسرے سے رابطہ کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ دین اور علم، دین اور فلسفہ، دین اور عقل دین اور اخلاقی قدر و قیمت کے مابین صلح برقرار رکھنی چاہئے دو جہت اور دو مستقل حوزوں کو ان کے لئے ترسیم کرنا چاہئے یعنی حوزۂ دین علوم کے دوسرے حوزوں سے جدا ہے اور حوزہ دین کا ارتباط خدا سے ہوتا ہے اور جو کچھ اس ارتباط سے پیدا ہوتا ہے جیسے نیائش، نماز، دعا اور کچھ شخصی مسائل ان کا دوسروں سے کوئی ربط نہیں ہوتا، اس سلسلہ میں نہ علم کو کوئی دخالت ہے نہ فلسفہ کو اور نہ کسی دوسرے عامل کو کوئی دخالت ہے یہ تو صرف اور صرف دل سے مربوط ہوتا ہے اور اگر کوئی چیز اس حوزہ میں دین کے ساتھ شریک ہوگی تو وہ عرفان ہے چونکہ دین اور عرفان دونوں ایک مقولہ سے ہیں اور دونوں کا ایک ہی کاسہ سے پانی پیتے ہیں، نتیجتاً علم، فلسفہ اور عقل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہوتا بلکہ ان تینوں کا فرمانروائی میدان ایک دوسرے سے الگ الگ ہے اور ہر ایک کے اپنے خاص وسائل ہوتے ہیں۔

لیکن حوزۂ اخلاق میں وہ قدر و قیمت اور وہ چیزیں جن کو انجام پانا چاہئے یا وہ چیزیں جن کو انجام نہیں پانا چاہئے، یہ چیزیں خدا سے مربوط ہیں جیسا کہ کیا نماز پڑھی جانی چاہئے یا نہیں؟ یہ دین سے مربوط ہے اور اس سلسلہ میں علم سے کوئی

معارضہ نہیں ہے، لیکن اگر کچھ چیزوں کو انجام پانا چاہئے اور کچھ چیزوں کو انجام نہیں پانا چاہئے یہ انسانی کی اجتماعی زندگی سے مربوط ہوتی ہیں جیسا کے چور کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہئے؟ کیا اس کو مجازات دینا چاہئے یا نہیں؟ کیا خیانت کرنے والے اور گناہ کار شخص کو اس کی سزا دینی چاہئے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں خاص طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ: جو شخص کسی جرم اور خیانت کا مرتکب ہوتا ہے وہ بیمار ہے اس کا علاج ہونا ضروری ہے اور نرمی اور محبت کے ساتھ اور مناسب مقام پر اس کا علاج کرنا چاہئے اور اس کی نگرانی کرنا چاہئے تا کہ وہ اس خیانت سے دست بردار ہو جائے۔

ہم دنیا کے کسی ملک میں کسی ایسی جگہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتے کہ جہاں خیانت کرنے والے اور گناہ کار کے ساتھ بیمار جیسا برتاؤ کیا جاتا ہو اور اس کو سزا نہ دی جاتی ہو لیکن پریکٹیکل کے میدان میں وہ یہ کہتے ہی کہ: خیانت کرنے والوں کو سزا نہیں دینی چاہئے اور اصل میں انسان کو سزا دینا یہ اس کی شایان شان نہیں ہے، اور نہ ہی انسانی کرامت سے سازگار ہے اور کلی طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر چہ انسان سب سے برے ظلم کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو جائے اس کو مطلق طور پر سزا نہیں دی جانا چاہئے اس لئے کہ انسان سے اس طرح کا برتاؤ کرنا اسکی شان اور مرتبہ کے خلاف ہے، اس نظریہ کے مقابل، ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دین زندگی کے تمام امور میں حق دخالت رکھتا اور اس نے قانون بیان کر دیا ہے کہ

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ...[1]

"چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں"

اجتماعی مسائل کو دین سے جدا کرنے والے کہتے ہیں کہ دین کو ان چیزوں کے بارے میں دخالت کرنے کا کوئی حق نہیں، دین تو صرف اور صرف یہ کہتا ہے کہ نماز پڑھو یا یہ کہہ سکتا ہے کہ خداوند عالم سے کس طرح دعا کی جائے لیکن یہ کہ ایک گناہ کار سے کس طرح پیش آیا جائے اس کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے اور یہ امر بھی تسلیم شدہ ہے کہ اس بارے میں علم تجربی کا بھی کوئی دخل نہیں ہے اس لئے کہ تجربیات ان صفتوں کا ایسا سلسلہ ہے کہ جو آشکار طور پر عینی چیزوں کے رابطہ کو بیان کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں علم موجودہ چیزوں کے بارے میں بیان کرتا ہے لیکن علم "کن چیزوں کو انجام دیا جائے یا کن چیزوں کو انجام نہ دیا جائے" بیان کرتا ہے، احکام ارزشی کو بیان کرنا علم کا کام نہیں ہے، لہٰذا اخلاقی اور اجتماعی مسائل چاہے وہ حقوقی قوانین ہوں یا مدنی اور کیفری قوانین یہ تمام صرف اخلاقی مسائل ہیں اور ان میں صرف یہ بیان ہوتا ہے کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے، ان میں نہ دین دخالت رکھتا ہے اور نہ علم (علم سائنس اور علم تجربی) دخالت رکھتا ہے۔

7۔ اسلام اور آزادیخواہ مکتب میں عوام الناس کی اہمیت

جب اخلاقی قدر و قیمت، کن چیزوں کو انجام دینا چاہئے اور کن چیزوں کو انجام نہیں دینا چاہئے ان مسائل میں دین کا کوئی دخل نہیں ہے، اور نہ ہی علم کی کوئی دخالت ہے، تو یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل میں کس کو حق دخالت ہے؟

---

[1] سورہ مائدہ آیت 38

آج کل کے دور میں یورپ کی ثقافت میں اس سوال کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ قدر و قیمت، کن چیزوں کو انجام دینا چاہئے اور کن چیزوں کو انجام نہیں دینا چاہئے، یہ اعتباری امور ہیں یہ خاص اہمیت کے حامل نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں تو یہ دیکھنا چاہئے کہ عوام الناس کیا چاہتی ہے؟ ان کے نقطہ نظر سے کون چیزیں انجام دینا چاہئے اور کن امور کو انجام نہیں دینا چاہئے، ان کی قدر و قیمت یہ سب اعتباری چیزیں ہیں یعنی ان کی بنا حقائق عینی، خارجی اور نفس الامری پر نہیں ہے، یہ تو صرف عوام الناس کے سلیقہ پر موقوف ہیں، اب ہم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے تو نہ دین کی تلاش کرنا چاہئے، نہ علم کے پیچھے دوڑنا چاہئے اور نہ ہی فلسفہ کی تلاش کرنا چاہئے بلکہ عوام الناس سے سروکار رکھنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

قانون گذاری کے بارے میں یورپی جمہوریت کی بنیاد اس چیز پر استوار ہے کہ عوام الناس کی خواہش (طلب) کے علاوہ کسی اور واقعیت کا کوئی وجود نہیں ہے کہ انجام دینے والی چیزیں اور نہ انجام دی جانے والی چیزیں اس کی بنیاد پر کشف کیا جائے۔

مادی امور میں انجام دینے والے امور اور انجام نہ دیئے جانے والے امور یہ سب امور تجربی کے دائرہ میں شامل ہیں اور علوم تجربیات سے مربوط ہیں جن کو تجربہ گاہ میں ثابت کیا جاتا ہے، لیکن خدا سے ارتباط کے وقت جن امور کو انجام دینا چاہئے اور جن کو انجام نہیں دینا چاہئے یہ سب دینی دائرہ سے مربوط ہو جاتے ہیں اور جو کچھ دین کہے گا اس کو بجالانا چاہئے اور ان کا علم سے کوئی مطلب نہیں ہے، لیکن جن امور کو انجام دینا چاہئے اور جن امور کو انجام نہیں دینا چاہئے یہ خود انسانوں کی اجتماعی زندگی سے مرتبط ہوتے ہیں نہ ان میں خداوند عالم کو دخالت کرنے کا حق ہے اور نہ ہی علم ان کو معین و مشخص کرسکتا ہے۔

اگر آپ یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ یورپ میں عوام الناس کی رائے اور عمومی آراء پر اعتماد کیا جاتا ہے تو یہ وہاں کی موجودہ خاص ثقافت کی اساس و بنیاد کی وجہ سے ہے، اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دین، انسان کی زندگی کے تمام امور کو شامل ہوتا ہے، اور ہمارے وہ تمام امور جو ہماری زندگی سے مربوط ہیں کہ ہم کو کون سے کام انجام دینے چاہئے اور کون سے کام انجام نہ دینے چاہئے انہیں خداوند عالم سے حاصل کرنا چاہئے، اور اس بارے میں ہم کو عوام الناس کی رائے کا تابع نہیں ہونا چاہئے، اگر خدوند عالم کسی چیز کو معین فرمادے اور اس کے انجام دینے کا حکم صادر فرمادے لیکن عوام الناس کی طلب دوسری ہو تو اس میں کون معتبر ہوگا؟

تمام معاشروں میں عوام الناس کی طلب اور دین میں بیان ہونے والے احکام کے مابین کم و بیش تضاد پایا جاتا ہے، تحریف ہونے والے تمام ادیان سے ہمارا کوئی مطلب نہیں ہے بلکہ ہماری بحث تو ان ملکوں سے ہے جن میں اکثر افراد مسلمان ہیں، اور وہ کسی دین کے پیروکار ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں خواہ وہ فردی ہوں یا اجتماعی گھریلوں مسائل ہوں یا بیوی کے انتخاب کا مسئلہ یا اولاد کی تربیت کی بات ہو، یا اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل ہوں، تو کیا اس صورت میں وہ

افراد یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہم نے اس دین کو تسلیم کرلیا ہے درحالیکہ ان کا ادعا ہے کہ قانون کے معتبر ہونے کا معیار و ملاک عوام الناس کی رائے ہے؟ کیا وہ کم سے کم ان دونوں کو اس صورت میں بھی تسلیم کرسکتے ہیں جہاں پر دونوں میں تعارض ہو؟

لیکن افسوس آج ہمارے نشریات میں جو کچھ غرب (یورپ) میں ہو رہا ہے وہ رواج پا رہا ہے جب ایک دین میں ہم جنس بازی کو سب سے بری چیز بتلا رہا ہے تو خدانخواستہ اگر عوام الناس ہم جنس بازی کے جائز ہونے کے حق میں ووٹ دیں تو کیا عوام الناس کی مرضی اور مانگ کو دین پر مقدم کرتے ہوئے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟! اور کیا حقیقت میں یہ دونوں ایک ساتھ جمع ہو جائیں گے؟ یورپ کی دنیا نے دین اور عوام الناس کی خواہش کے مطابق متضاد مسائل کو حل کردیا ہے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل دین کو دخالت کرنے اور عوام الناس کی خواہش کو نظر انداز کرنے کا کوئی حق نہیں ہے دین کا تعلق کلیسا سے ہوتا ہے جہاں پر افراد اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور کچھ دعا وغیرہ کرنے سے افراد کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں جس کے بعد کلیسا ان کو بھشت کے لئے روانہ کردیتا ہے، لیکن اجتماعی مسائل سے دین کا کوئی تعلق نہیں ہے، اجتماعی مسائل کو تو صرف عوام الناس کی رائے ہی مشخص و معین کرسکتی ہے، کناڈا میں نئے مذہبی فرقے کی بنیاد ڈالنے والے کشیش (عیسائیوں روحانی پیشوا) سے ایک ٹی وی پروگرام میں سوال کیا گیا کہ ہم جنس بازی کے بارے میں آپ کے مذہب کا کیا نظریہ ہے؟ اس نے جواب دیا: میں فوراً تو اپنا قطعی نظریہ نہیں دے سکتا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ انجیل کا سرے سے مطالعہ کرنا چاہئے!!

8۔ اسلام اور یورپ میں جمہوریت اور قانون گذاری کا مرجع

قارئین کرام آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یورپین لوگوں نے دین اور اجتماعی مسائل کو جدا کر کے اپنا من پسند راہ حل تلاش کر کے دین اور عوام الناس کے مابین تعارض کا حل ڈھونڈ نکالا، کیا ہم بھی اسلام کے ماننے والے اس طرح کے راہ حل کی تلاش میں ہیں؟ یہ وہی اندیشہ (فکر) ہے جو "سیکولاریزم" کے نام سے مشہور ہے یعنی دین کو مسائل اور زندگی کے امور سے جدا کرنا چاہے وہ اجتماعی، حقوقی سیاسی، اور گھریلو ہی مسائل کیوں نہ ہوں، کچھ افراد اس بارے میں "ایرانی ثقافت کی خدمت" کی وجہ سے دسیوں تقریروں اور متعدد مضامین میں یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ دینی کا دائرہ، سیاست، اجتماعی، حقوقی اور اقتصادی مسائل سے جدا ہے اور اس بارے میں رات دن محنت کیا کرتے ہیں، تو کیا ہم بھی ایسا ہی عقیدہ رکھ سکتے ہیں؟ اگر ہمارا ایسا عقیدہ نہیں ہے تو ہم کو توجہ رکھنا ہوگی کہ ہم ان کے دھوکہ میں نہ آئیں اور یہ جان لیں کہ جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں وہ ہمارے عقیدہ کے ہم آہنگ نہیں ہے اور اس بات کی طرف بھی توجہ رکھنا ہوگی کہ خواستِ خدا اور عوام الناس کی طلب کے مابین معارضہ ایجاد ہو جائے تو جو کچھ دین خدا نے معین کیا ہے اسکو اپنائیں اور حقیقت میں خدا کی مرضی کو مقدم کریں۔

البتہ حقیر تکالیف کو مشخص و معین کرنے کا قصد نہیں رکھتے کہ افراد ہمارے بیان سے آزادی کے خلاف کوئی مطلب نکالیں لیکن ان کو منتخب کرنے غور و فکر اور دقت سے کام لے کر آگاہ اور آزاد طور پر کسی چیز کو منتخب کرنا چاہئے ان کو متوجہ رہنا

چاہئے کہ آج کل جو "قانون گذاری میں جمہوریت" کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے یعنی عوام الناس کی طلب کو خدا کی مرضی اور طلب پر مقدم رکھنا یعنی دین اور خواست خدا کا ایک طرف رکھ دینا، اگر عوام الناس کسی چیز کو منتخب کرنا چاہتے ہیں تو ان کو متوجہ رہنا چاہئے کہ وہ ان کے چنگل میں نہ پھنس جائیں کہ اسلام کو تو مجموعہ مقررات وقوانین بر حاکم جامعہ کے عنوان سے قبول کرلیں اور قانون گذاری میں جمہوریت کو قبول کرلیں، درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے سے سازگار نہیں ہیں۔

جو افراد عوام الناس کو دھوکہ دینے، معاشرہ میں التقاط رائج کرنے اور بحث کو مخلوط کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہ میری تقریروں اور مثالوں سے بہت زیادہ پریشان حال ہو جاتے ہیں چونکہ ان کی نیت اور ان کے سازش کا راز فاش ہوتا ہے اس لئے وہ پریشان ہوتے ہیں البتہ کچھ افراد کو سیاسی اغراض ومقاصد کی وجہ سے میری باتیں اچھی نہیں لگتیں، لیکن یہ باتیں چاہے کسی کو اچھی لگیں یا بری، ہم اپنی زندگی کے آخری لمحے تک دین اسلام کے احکام کو بیان کرنے میں کوئی دریغ نہیں کریں گے، اور دین اسلام کی حمایت میں اپنی تمام کوششیں صرف کردیں گے، اور تمام ناگوار واقعات کو اپنے لئے برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہیں نہ کسی دھمکی سے ڈرتے ہیں، اور اور نہ کسی کے دھوکہ میں آتے ہیں۔

ہم یہاں پر احکام کو قطع وجزم دینے کا ارادہ نہیں رکھتے لیکن یہ یاددہانی کرادینا چاہتے ہیں کہ عوام الناس ہوشیار رہیں اور واقعیات کو حاصل کرنے کی خاطر اپنی عقل سلیم کو کام میں لائیں یورپ والوں کی باتوں اور ان کے مفاہیم سے دھوکہ میں آنے سے ہوشیار رہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں، ضروری ہے کہ نظریات وآراء کے جو مبانی بیان کئے جاتے ہیں ان کی معرفت حاصل کریں۔

مثال کے طور پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ قانون کو تسلیم کرنے کا معیار عوام الناس کی خواہش اور ان کی مانگ ہے اور "قانون گذاری میں جمہوریت" کو بیان کیا جاتا ہے تو ان کو یہ سوچنا چاہئے کہ کیا انسان کو صرف یہی بدن عطا کیا گیا ہے، اور ایک مادی زندگی دی گئی ہے اور اس کو حیوان کا مجسمہ بنا کر بھیجا گیا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو اس صورت میں تو عوام الناس کو قانون گذاری کا حق ہے جیسا کہ اسی نظریہ کو یورپین لوگوں نے تسلیم کررکھا ہے، یا جیسا کہ اسلامی نظریات میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان مادی بند کے علاوہ وہ بلند وبالا مقام اور روحانی اور معنوی اہمیت کا بھی حامل ہے تو اس بنیاد پر قانون گذاری میں مادی مصلحتوں، نظم اور اجتماعی امنیت کی رعایت کے علاوہ معنوی مصلحتوں کی بھی رعایت کرنا ضروری ہے، اس صورت میں انسان خدا کے ارادہ کا تابع ہوگا اور قانون کا معیار وملاک خداوند عالم کی مرضی ہوگی۔

اس بات کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں کہ کیا واقعاً انسان مادی اور حکمت ماوراء الطبیعۃ سے بالا ایک معنوی پہلو بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ کیا انسان مادی بدن اور حیوانی خصلتوں کے علاوہ کوئی اور پہلو بھی رکھتا ہے، تاکہ وہ اسی اساس وبنیاد پر خداوند عالم سے ارتباط برقرار رکھ سکے؟ کیا واقعاً مرنے کے بعد انسان کے لئے کوئی اور دوسری زندگی بھی ہے؟ کیا واقعاً اس مادی زندگی اور مرنے کے بعد والی زندگی کے مابین کوئی رابطہ ہے؟ مسلمانوں اور متدین افراد کے لئے ان سوالات

کے جوابات واضح ہیں۔

لیکن ہم کو یہ غور وفکر کرنا چاہئے کہ ہمارے سیاسی اور اجتماعی رجحان کو ہمارے اعتقاد کے ہم آہنگ ہونا چاہئے اور ہماری فکر واندیشہ اور عمل میں انتقاط ظاہر نہیں ہونا چاہئے، اگر واقعاً ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ خدا ہے، قیامت ہے، اور حساب وکتاب درکار ہے تو ہم کو یہ واضح کرنا ہوگا اور اس قطعی نتیجہ پر پہنچنا ہوگا کہ ایک حقیقت میں غیر خدائی قانون (کو عوام الناس کی طلب کے معیار قانون ہے) پر عمل کرنا ہماری ابدی آرامگاہ میں منفی اثر رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال وجواب قطعی ویقینی طور پر ہونے چاہئیں چونکہ شک وتردید سے مشکل حل نہیں ہوتی اور نہ ہی اس بارے میں شک کرنا عقلمندی کا کام ہے۔

یورپ میں یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے وہ بھی بڑے عجیب وغریب انداز میں یا تو عالم غیر مادی اور معنوی کا انکار یا افکار واندیشہ کو شک واحتمال وتردید میں قرار دینا اور ذھنوں میں یہ ڈالنا کہ کن امور کو انجام دینا چاہئے اور کن کاموں سے اجتناب کرنا چاہئے، ان امور کی ارزش واہمیت عینی اور خارجی حقائق پر مبنی نہیں ہے جو ان کو متعلق یقین قرار دیا جائے یہ تو صرف اعتباری اور قراردادی چیزیں ہیں جن کی بنا عوام الناس کی خواہش ہے بقیہ ان کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور اسی وجہ سے ہمارے وہ روشن فکر افراد جن پر یورپ والوں کا سایہ پڑ گیا وہ ان مطالب کو اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں اور ہمارے عزیز نوجوانوں کے حوالے کر دیتے ہیں جس کی وہ مذہب شک گرائی اختیار کر لیتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں!! لیکن دین کے نقطہ نظر سے یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے بلکہ ہم کو شک وتحیر اور تردید سے باہر نکلنا چاہئے اور آگاہی اور یقین کے ذریعہ صرف ایک ہی راستہ کو منتخب کرنا چاہئے جیسا کہ قرآن کریم کے ابتداہی میں یقین کی تاکید کرتا ہوا نظر آرہا ہے اور فرماتا ہے:

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ [1]

"متقین وہ لوگ ہیں جو عالم آخرت پر یقین رکھتے ہیں" قرآن کریم "یشکون" نہیں فرمارہا ہے، اب اگر کوئی قرآن کریم سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو اسکو عالم آخرت پر یقین رکھنا ہوگا اور قرآن کریم دوسری جگہ پر فرماتا ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ۔ [2]

"اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں"

دوسری طرف یورپی ثقافت سے متاثر افراد کہتے ہیں کہ انسان کسی مسئلہ میں بھی منطقی طور پر یقین پیدا نہیں کر سکتا، اور خاص طور سے جو مسائل ماوراء مادہ سے مربوط ہوتے ہیں ان میں تو انسان کو یقین ہو ہی نہیں سکتا، قرآن کریم انسان کے لئے جس انحطاط اور پستی کی حالت کو بیان کرتا ہے وہ شک وتردید کی حالت ہے قرآن مجید فرماتا ہے:

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۴

[2] سورہ ذاریات آیت ۲۰

فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ۔ [1]

"تو وہ اپنے شک میں ڈانواڈول ہورہے ہیں (کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں"

اور اسی طرح قرآن کریم ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

ءَأُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ۚ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْ ذِكْرِي .... [2]

"کیا ہم سب لوگوں میں بس (محمد ہی قابل تھا کہ) اسی پر قرآن نازل ہوا، نہیں بات یہ ہے کہ ان کو (سرے سے) میرے کلام ہی میں شک ہے کہ میرا ہے یا نہیں....."

قرآن کریم ہم کو خاص طور سے اصول دین یعنی خدا، عدل، نبوت، امامت اور قیامت کے بارے میں اہل یقین میں سے ہونا چاہتا ہے، اب ہم کو ان دو راستوں میں سے ایک راستہ کو منتخب کرنا چاہئے یا اس راستہ کو اختیار کرنا چاہئے جس میں انسان بنیادی طور پر ہی یقین تک نہیں پہنچتا، اور ہمیشہ شک وتردید کی حالت میں دوچار رہتا ہے، یا اس مذہب کو منتخب کرنا چاہئے جو ہم کو انتخاب آگاہانہ اور یقین کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے جب تک اہل یقین نہ ہوؤ گے کتاب خدا سے استفادہ نہیں کرسکو گے۔

ان دونوں ثقافتوں میں یہ فرق ہے کہ ان میں سے ایک انسان کے لئے سب سے بری شک وتردید اور حیرت کی حالت کو جانتا ہے اور انسان کو شک وتردید میں اس شخص کے مانند گرفتار کردیتا ہے جو خوفناک اور بھیانک جنگل میں پہنچ گیا ہو اور جو شخص بھی اس کو کسی طرف بلانا چاہے وہ اس راستہ کو اسی حیرانی و پریشانی میں منتخب کرلیتا ہے اس کے برعکس یورپی ثقافت میں شک وتردید کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک انسان اہل حیرت وشک نہ ہو اس وقت تک وہ انسان نہیں ہوسکتا ہے، نتیجہ کے طور پر انسان کو ان دونوں میں سے ایک راستہ قبول کرنا ہوگا، اسلام کو یا اس ثقافت کو جس میں حیرت وشک کو بہترین چیز بتایا جاتا ہے، لیکن ان دونوں راستوں کو ایک ساتھ تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے جس طریقہ سے یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اب دن بھی ہے اور رات بھی، اور اسی طرح توحید، تثلیث (تین خداؤں کو ماننا) بھی ایک عقیدہ میں نہیں سما سکتے ہیں۔

۹۔ جوانوں کے لئے ایک نصیحت

میرے وہ پیارے نوجوان جو علمی اعتقادات پیدا کرنے کی فکر میں ہیں واضح اہل فکر ہونا چاہتے ہیں اور اہل تقلید ہونا پسند نہیں کرتے، ان کے لئے میری نصیحت یہ ہے کہ وہ پہلے ان سیاسی مسائل کو حل کریں ان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اہل شک ہوں یا اہل یقین، دین کی پیروی کریں یا سیکولریزم رہیں، خدا پرست بنیں یا ہر قسم کی عبودیت سے آزاد یہاں تک

---

[1] سورہ توبہ آیت ۴۵

[2] سورہ ص آیت ۸

کہ خدا کی عبودیت سے بھی آزادی چاہتے ہیں، ان کے لئے ان دونوں داستوں میں سے ایک راستہ کا اپنانا ضروری ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ کبھی اس راستہ پر چلیں اور کبھی دوسرے راستہ پر چل پڑیں، کبھی ان کی باتوں کو قبول کریں اور کبھی دوسروں کی باتوں کو قبول کریں، اس طرح کا رویہ بہت خطرناک ہے، اور ہماری عاقبت کفر کی حالت اور ابدی عذاب جہنم کا باعث بن جائے۔ اگر ہم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور اس کی حقانیت کو قبول کرتے ہیں تو کیوں انسان کی مطلق آزادی کو تسلیم کریں؟! کس طرح ہم دین کے بھی معتقد ہوسکتے ہیں اور لیبرالیزم اور سیکولریزم کے بھی؟ اس طرح کا عقیدہ رکھنا ناممکن ہے، کسی بھی بلند وبالا راستہ کو منتخب کرنے سے پہلے کچھ چیزوں کو فرض کرکے ان کے بارے میں بحث کرنا چاہئے جیسے یہ کہ کیا ہم کو انسان کو ایک موجود مادی سمجھیں اور اس کی سعادت کو صرف حیوانی لذتوں میں تلاش کریں، آزادی کا مطلب صرف خواہشات نفسانی بیان کریں؟ یا یہ کہ انسان کی انسانیت ماوراء مادہ کے لئے ایک جوہر ہے، روح الٰہی ہے، اور بدن صرف روح کو کامل کرنے کا وسیلہ ہے اور ہماری حقیقی زندگی ابدی زندگی ہے جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ [1]

"اور اگر یہ لوگ سمجھیں بوجھیں تو اس میں شک نہیں کہ ابدی زندگی (کی جگہ) تو بس آخرت کا گھر ہے (باقی لغو)" اور دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ [2]

"اور دنیا کی (چند روزہ) زندگی دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

اگر جہان آخرت ہماری اصلی اور حقیقی زندگی ہے تو دنیا میں ہم کو اپنی توجہ اور ہمت اس چیز میں صرف کرنی چاہئے جو ہم کو بڑی سعادت تک پہنچائے یہ ان مذاہب کے برعکس ہے جن کا عقیدہ ہے کہ اُخروی سعادت دنیا کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی ہے اور اگر کوئی شخص آخرت میں سعادت کا خواہاں ہے تو اس کو دینا میں گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہئے اور دنیا سے بہت کم استفادہ کرنا چاہئے، خوشبختانہ بڑی اقبال مندی کی بات ہے کہ دین اسلام دنیا

وآخرت کی سعادت کو ایک جگہ جمع ہونا ممکن جانتا ہے اور معتقد ہے کہ انسان خاص طور سے زندگی میں سعادت دنیا کو بھی حاصل کرسکتا ہے اور سعادت ابدی آخرت کو بھی حاصل کرسکتا ہے۔

---

[1] سورہ عنکبوت آیت ۶۴

[2] سورہ آل عمران آیت ۱۸۵

تیرہویں نشست

قانون کے سلسلے میں اسلام اور یورپ کے درمیان بنیادی فرق

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ گذشتہ نشستوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ہماری بحث کا موضوع اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کرنا ہے، اور اس نظریہ کو بیان کرنا کچھ وضع شدہ اصول اور کچھ مقدموں پر مبنی ہے کہ جن کی بنیاد پر ہماری بحث قائم ہوئی ہے اور ہم سب سے اہم مقدموں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بحث کو آگے بڑھائیں گے اور وہ تین مقدمہ درج کئے جا رہے ہیں:

1۔ انسان کی اجتماعی زندگی بغیر قانون کے مکمل نہیں ہو سکتی، یعنی انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے قانون کی سخت ضرورت ہے۔

2۔ قانون کو قانون گذاری کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے مناسب قوانین کو وضع کر کے قانون کے اغراض ومقاصد کو مکمل کیا جا سکے۔

3۔ قانون کو بنائے جانے کے بعد اس پر عمل درآمد کرانے کے لئے ایک طاقت کا ہونا ضروری ہے کہ اگر کوئی قانون کی مخالفت کرنا چاہے تو اس کو قانون کا پابند بنانے کے لئے اس طاقت کا استعمال کیا جائے۔

ہر ایک معاشرہ کیلئے قانون کا ہونا ضروری ہے اس موضوع کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہر زمانہ میں تقریباً تمام انسانوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور شاید بہت کم ہی ایسے اسلامی محقق ہوں گے جو معاشرہ کیلئے قانون کے قائل نہ ہوئے ہوں، البتہ کچھ گنے چنے افراد کا یہ عقیدہ ہے کہ اخلاقی قدر و قیمت کا ہونا ہی معاشرہ کو قوانین حقوقی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

لیکن یہ ایک نمونہ آئیڈیل اور آرزو ہی ہے اور ہرگز تاریخ میں کوئی ایسا اتفاق پیش نہیں آیا کہ تمام افراد اخلاقیات پر ہی گامزن ہو گئے ہوں اور مستقبل میں بھی کسی ایسے وقت کا امیدوار نہیں رہا جا سکتا کہ تمام افراد اخلاقی اصولوں کی اس طرح رعایت کریں کہ پھر ان کو حقوقی قوانین کی ضرورت نہ رہے، لہٰذا ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ وہ تمام محققین جو اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کرنے کا قصد رکھتے ہیں ان سب نے قانون کی اصل ضرورت کو تسلیم کیا ہے اور ہم اس بارے میں جس مسئلہ پر بحث کر کے ایک دوسرے کی موافقت چاہتے ہیں وہ مسئلہ یہ ہے کہ جس قانون کو ہم معاشرہ میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس

قانون کی کیا خصوصیات ہیں؟ یعنی ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ اصل قانون کی ضرورت ہے لیکن کیا معاشرہ میں بیان ہونے والے ہر قانون کا ہونا کافی ہے اور وہ معاشرہ کو فلاح و بہبود تک پہنچا سکتا ہے یا ایسا نہیں ہے، بلکہ بہتر قانون کو خاص خصوصیات کا متحمل ہونا چاہئے؟ ہم اس بارے میں مختلف نظریات کو بیان کر چکے ہیں:

کچھ افراد کا کہنا ہے کہ قانون کو عادلانہ ہونا چاہئے اس صورت میں قانون کی خاصیت اس کا اصول عدالت پر مبنی ہونا چاہئے، کچھ دوسرے افراد کہتے ہیں کہ قانون کو مصالح اجتماعی کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہونا چاہئے، اور آخر میں تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ: قانون صرف معاشرہ کے نظم و امنیت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ہوتا ہے، یورپ میں ان تین نظریوں کو سب سے مشہور و معروف نظریے مانا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف خدا پرستوں کے نظریہ مخصوصاً اسلام کے ماننے والوں کے نظریے، جو کہتے ہیں کہ قانون کو انسانوں کی دنیوی اور اخروی مصالح کا حامل ہونا چاہئے، صرف لوگوں کی خواہش، نظم اور امنیت کا خواہاں نہیں ہونا چاہئے بلکہ قانون کو ایسا ہونا چاہئے جو دنیا اور آخرت میں انسانوں کی مصلحتوں کو مدنظر قرار رکھتا ہو، قانون ایسا نہ ہو کہ جس سے معاشرہ کی تمام مصلحتیں چاہے وہ مادی اعتبار سے ہوں یا معنوی اعتبار سے چاہے دنیوی اعتبار سے ہوں یا اخروی اعتبار سے یہ سب خطرہ میں پڑ جائیں، یعنی اگر قانون ان مصلحتوں میں سے کسی ایک مصلحت کے لئے خلل بن رہا ہو، تو وہ قانون بے کار ہے، اور وہ انسان اور معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا، اس بارے میں بہت زیادہ بحث کی جا چکی ہیں، لیکن اب بھی کچھ تحصیل کرنے والے گروہ اور صاحب نظر افراد کے اذہان عالیہ میں شبہات باقی رہ گئے ہیں لہٰذا اس مسئلہ کو خصوصی توضیح دینا ضروری و لازم ہے۔

2۔ فردی آزادی اور قانون کے درمیان رابطہ

آجکل ریڈیو، ٹیلیویژن، اخباروں اور تقریروں میں اس نکتہ پر بہت زیادہ تاکید کی جارہی ہے کہ فردی آزادی اتنی اہم ہے کہ جس کو کوئی قانون محدود نہیں کر سکتا، اور ان آزادیوں میں کسی شخص کو رخنہ ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہوتا یعنی فردی آزادیوں کی حفاظت کرنا یہ قانون سے بالاتر ہے اور جو قانون فردی آزادیوں میں مانع ہو تو ایسے قانون کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اب ہمارے لئے اس نظریہ کی تحقیق و جستجو کرنا لازمی ہو گیا ہے تا کہ ہم اس کی تحقیق و جستجو کے بعد اس سے منطقی اور علمی نتیجہ حاصل کر سکیں در حقیقت یہ طرز فکر یورپی ثقافت کی پیداوار ہے جس کو ہم بالکل پسند نہیں کرتے، اور اس سے اجتناب کرتے ہیں اور ہمارے حکومتی ذمہ دار حضرات نے معاشرہ میں اس طرح کی ثقافت کے رائج ہونے سے خبردار کیا ہے، ہم اصلی بحث کو بیان کرنے سے پہلے مقدمہ کے طور پر کچھ موضوعات کو بیان کر رہے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ اسلام کے نظریات آسانی سے مل جائیں گے۔

یورپی ثقافت کی بنیاد کچھ عناصر پر ہے اور انسان مداری یا انسان محوری کی طرف جھکاؤ کو اس ثقافت کا سب سے

پہلا، اور اصلی و بنیادی عنصر مانا جاتا ہے، یورپ میں "هیومانیزم" (Humanism) درمیانی صدیوں کے آخری زمانہ کے مشہور و معروف رائیٹر اور رادباء جیسے اٹلی کے "ڈانٹا" کے ذریعہ ایجاد ہوئی، درحقیقت یہ نظریہ مسیحیت سے پہلے موجود تھا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عیسائیت مشرقی ممالک اور فلسطین میں پھیلی، قبل اس کے کہ عیسائیت یورپ میں پہنچے، یورپی معاشرہ بت پرست تھا، اور اس زمانہ کے سب سے اہم امپراطور (روم کے بادشاہوں کے القاب) رومی تھے جس میں شرقی روم (موجودہ ترکی) اور غربی روم (اٹلی) شامل تھے، ان ممالک میں یہودیوں کو چھوڑ کر بقیہ سب کے سب افراد بت پرست تھے ان کے معاشرہ میں مسیحیت کے داخل ہوجانے اور اس کے حاکم ہونے کی وجہ سے مسیحیت میں تحریفات ہونا شروع ہوگئیں اور بت پرستی کی کچھ چیزیں اس میں داخل ہوگئیں، اور یورپی معاشرہ نے اس طرح کی مسیحیت کے سامنے سر تسلیم خم کردیا، ان تحریفات کے نمونے مسئلۂ تثلیث اور اس کے بعد کلیساؤں میں حضرت مریم سلام اللہ علیہا اور فرشتوں کے مجسموں کو نصب کرنا ہے، لہٰذا یہ کلیسا بھی پہلے بت خانوں کی طرح ہوگئے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں تحریف شدہ عیسائیت رائج ہوگئی، اور اس نے شرک کی جگہ لے لی، درحقیقت وہ شرک کی بنیاد پر قائم ہونے والی دنیاوی حکومت تھی جس میں معنویت نہیں پائی جاتی تھی جو یورپ پر عیسائی حکومت یا الٰہی حکومت اور آسمان وملکوت کی طرف دعوت دینے والی حکومت کے نام سے حاکم ہوئی اور ان حکومتوں کے نام سے لوگوں پر ظلم وستم کیا۔

یہاں تک کہ لوگ آہستہ آہستہ اس ظلم وستم سے تنگ آگئے اور مسیحیت سے پہلے والی زندگی کی طرف پلٹ گئے، درحقیقت اومانیزم نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی جگہ انسان اور آسمان کی جگہ زمین اور آخرت کی زندگی کی جگہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دی جائے۔

یہ اومانستی نظریہ کا ماحصل ہے جو انسان کو خدا کی جگہ قرار دیتا ہے، اور یہ نظریہ آہستہ آہستہ اس زمانہ کے مختلف محققین جیسے اٹلی کے مشہور و معروف شاعر و محقق "ڈانٹا" کے ذریعہ یورپ کے تمام ممالک میں اس کا رواج پیدا ہوگیا، اور اس طرح سے بیان کیا گیا ہے جس کے اندر ہر طرح کی چیز موجود ہو، اس بنا پر اومانیزم تمام نظریات کی ماں سمجھی جانے لگی کہ جن کی بنیاد پر یورپی ثقافت وجود پائی ہے، اور جب ہم یورپی ثقافت کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد نہ تو یورپی جغرافیائی ثقافت ہے اور نہ وہ لوگ مراد ہیں جو مغرب (یورپ) میں زندگی بسر کرتے ہیں چونکہ وہاں پر دوسرے مذہبوں کو ماننے والے افراد بھی رہتے ہیں، کچھ اچھے عقائد والے اور دوسرے مذاہب کے افراد بھی زندگی بسر کرتے ہیں اور ہم جس ثقافت کو یورپی ثقافت کہتے ہیں وہ ایک جامع ثقافت ہے جو انسانوں کو غیر الٰہی راستہ بلکہ کفر کی طرف لے جاتی ہے، لہٰذا بہت سے مشرقی ممالک جیسے جاپان وغیرہ میں بھی ممکن ہے یہی ثقافت موجود ہو، لہٰذا ہم یورپی ثقافت کو جغرافیائی لحاظ سے نہیں مانتے۔

3۔اومانیزم اور لیبرالیزم کا قانون میں داخل ہونا

قارئین کرام ہماری بحث اور گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی ثقافت کفر والحاد کی ثقافت ہے جس میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ انسان کے تصور سے خدا کو غائب کر دیا گیا ہے اور خود انسان کو خدا کی جگہ رکھ دیا گیا ہے، یعنی انسان ہی تمام اقتدار اور قدرت کا محور ہے۔اس نظریہ کے تحت انسان ہی تمام ارزش اور اہمیت کو پیدا کرتا ہے، اور انسانوں کی فکر سے زیادہ ان کی کوئی واقعیت نہیں ہوتی، انسان قانون وضع کرتا ہے اور انسان کے علاوہ کسی اور کو قانون بنانے کا کوئی حق نہیں ہوتا، انسان انسانوں کی سرنوشت کو خود معین ومشخص کرتے ہیں خدا نہیں، یہ تمام فکر اومانیستی کے اصلی عناصر ہیں کہ جن کے پیچھے پیچھے دوسرے مذاہب بھی وجود میں آگئے اور وہ طول زمان میں آہستہ آہستہ اسی ریشہ سے اُگے اور اسکے دو بہت اہم مذاہب (جو آجکل یورپی ثقافت میں اسلامی ثقافت کے مقابل بیان کیے گئے ہیں) سیکولریزم اور لیبرالیزم ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ اگر انسان کی زندگی سے خدا کا تصور ختم کر دیا جائے تو انسانی زندگی کے اہم مسائل کی دین کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے گی، اور اس لحاظ سے دین کو اجتماعی، سیاسی اور حقوقی مسائل سے الگ رکھنا ہوگا، اس نظریہ کی بنیاد پر اگر کچھ افراد دین کے نام پر کچھ ارزشیں اور اہمیتیں ایجاد کرنا چاہیں تو وہ ان ارزشوں کو صرف معابد اور اپنی فردی زندگی کے لحاظ سے تصور کریں، یعنی درحقیقت دین اقدار کی قرارگاہ خاص طور سے افراد کی فردی زندگی ہے اجتماعی زندگی نہیں ہے یہ وہی فکر ہے جو دین کو سیاست اور اجتماعی زندگی کے جذی مسائل سے جدا کرتا ہے جسکو سکولاریزم کہا جاتا ہے، اور آخر کار یورپی ثقافت کا دوسرا ثمرہ لیبرالیزم ہے۔

جب تمام اقدار کا محور انسان ہو اور اس کے علاوہ دوسری کوئی اور چیز اسکی سرنوشت پر حاکم نہ ہو، تو یہ کہنا چاہئے کہ ہر وہ کام جسکو انسان کا دل چاہے اسکو انجام دے اور یہ وہی مطلق آزادی یا لیبرالیزم ہے لیکن اگر ہر انسان مطلق طور پر آزاد رہنا چاہتا ہو تو عسر وحرج لازم آئیگا اور قانون کا کوئی مقام باقی نہ رہے گا اور ظاہری بات ہے کہ اس طرح کی شرطوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا اور واضح طور پر معاشرہ میں قانون کی ضرورت کا احساس ہوگا، کہ ایسا قانون ہونا چاہئے جو عسر وحرج کو روک دے اور جب نظم برقرار ہو جائے اور عسر وہرج ختم ہو جائے تو پھر قانون کی ضرورت بھی ختم ہو جائے گی، تو پھر ہر فرد کا دل جو چاہے گا وہ آزادانہ طور پر اس کو انجام دے گا۔

4۔یورپی ثقافت کے اصول اور اسلامی ثقافت سے ان کا موازنہ

قارئین کرام آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اومانیزم نظریہ کا خلاصہ سیکولریزم اور لیبرالیزم پر ہوتا ہے۔

اور انہیں دو عناصر سے اصلی یورپی ثقافت وجود پاتی ہے اور بار بار یہ جو یاد آوری کی جاتی ہے کہ تم اپنی حفاظت کرتے رہنا کہ کہیں تم پر یورپی ثقافت حملہ کر کے تمہاری ثقافت کا جنازہ نہ نکال دے ان سے ہماری مراد یہی ثقافت ہے جسکا لازمہ لیبرالیزم اور سیکولریزم ہے، یہ ثقافت یورپ میں رائج ہوئی اور اس نے صنعت اور ٹیکنالوجی کی پیشرفت کے ساتھ ساتھ

معاشرہ بشری میں مختلف پرکشش چیزوں کو ایجاد کیا اور دوسرے ممالک بھی کم و بیش اس ثقافت سے متاثر ہوئے اس لئے کہ معاشرہ کی معرفت رکھنے والے محققین کا یہ عقیدہ ہے کہ یورپی ٹیکنالوجی کے صادر ہونے کے ساتھ ساتھ یورپی ثقافت بھی صادر ہونے لگی، یہ وہ واقعیت ہے جس پر موجودہ دور میں ترقی کرنے والے ممالک کو غور و فکر کرنا لازمی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا یورپی ثقافت کو قبول کئے بغیر ٹیکنالوجی کو تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ البتہ اسی موضوع کے بارے میں دوسرے مقام پر بحث کی جائیگی لیکن ہم یہاں پر مختصر طور پر یہ بتادیں کہ اب تک تو یورپی ٹیکنالوجی کے صادر ہونے کے ساتھ ساتھ یورپی ثقافت بھی تمام ممالک میں صادر کی گئی ہے، اور تمام انسان کم و بیش اس ثقافت سے متاثر ہوئے ہیں یہاں تک کہ ہمارے اسلامی معاشرہ اور اسلامی ممالک بھی اس ثقافت سے استفادہ کئے بغیر نہ رہ سکے (البتہ یہ سب اس لئے ہوا کہ اسلامی اقدار کی حفاظت کرنے میں لا پرواہی سے کام لیا گیا، یہ نہیں کہ ان دونوں ثقافتوں کو جدا کرنا ممکن نہ تھا)۔

افسوس کہ آج یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہترین فکر رکھنے والے افراد کے مختلف طبقوں میں التقاط و اختلاط (مختلف نظریوں کا آپس میں مل جانا) پیدا ہو گیا ہے کہ اسلامی ثقافت کے التقاطی تفکر کو یورپی الحادی ثقافت سے ملا دیا ہے، البتہ مختلف سطح (طبقہ) کے اعتبار سے یہ اختلاط فرق کرتا ہے:

بعض موارد میں یورپی ثقافت کا بول بالا ہے جبکہ ان موارد میں اسلام کا اتنا بول بالا نہیں ہے اور دوسرے موارد میں اسلام نے جلوہ دکھلایا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ یورپی ثقافت نے غبار آلود اور تاریک فضا ایجاد کر دی ہے اور اسلام ناب محمدی کی صاف و شفاف فضا دنیا کے کسی کونے میں بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی ہے، ہمارے اعتقاد کے مطابق جو سب سے اہم فضا اسلامی ثقافت کو صاف و شفاف کر سکتی ہے اور اس سے دوسری ثقافتوں کے غبار کو صاف کیا جا سکتا ہے وہ جمہوری اسلامی ایران کی فضا ہے اور جب اس نظام میں اس طرح کی طاقت و قدرت موجود ہے اور عوام الناس اسلام اور اسلامی ثقافت کیلئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہیں اس بنا پر انقلاب اسلامی یورپی ثقافت کے لئے سب سے بڑے خطرہ کے عنوان سے بن کر ابھرا ہے۔

جیسا کہ کچھ دن پہلے واشنگٹن کے نزدیک ایک یورپی سیاست کی تحقیق کرنے والے ادارہ کے ایک رئیس نے کہا تھا کہ جمہوری اسلامی ایران دنیا کے لئے سب بڑا خطرہ ہے، ظاہر ہے کہ جس چیز سے وہ ڈرتے ہیں اور اپنے لئے ایک اہم خطرہ سمجھتے ہیں وہ اقتصادی خطرہ نہیں ہے اس لئے کہ ان کا اقتصاد ہم سے کہیں بہت زیادہ اچھا ہے، اسی طرح ان کو نظامی خطرہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ ان کے پاس ایسے خطرناک اسلحے موجود ہیں کہ دوسرے ممالک میں ان جیسے نمونے نہیں ملتے، ان کے پاس ایسی فوج موجود ہے کہ دنیا کے تمام ممالک میں نہ کمیت کے اعتبار سے اور نہ کیفیت کے اعتبار سے ایسی فوج موجود نہیں ہے، بلکہ وہ تو جمہوری اسلامی ایران کی فکری، عقیدتی اور ثقافتی توانائی سے خوف کھائے ہوئے ہیں اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں:

جمہوری اسلامی ایران ایسا خطرہ ہے جو زمین کے اعتبار سے نامحدود اور منحصر بہ فرد ہے، یہی چیز ان کے یورپی معاشرہ کے لئے سب سے بڑے خطرہ کا باعث ہوئی ہے، اسی وجہ سے وہ اس نظام کو ضعیف کرنے کی مسلسل جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ نظام ولایت فقیہ ایسا نظام ہے اور جب تک محور نظام ولایت کو سرنگوں نہ کر دیا جائے اس میں نفوذ نہیں کیا جاسکتا۔

5۔علماء اور اسلامی تالیفات کی ذمہ داریاں

جو چیز اسلامی ثقافت کے جوہر کو مجسم کرتی ہے انسان محوری کے مقابل میں خدا محوری ہے اس اساس و بنیاد پر یہاں پر ایک سوال پیش آتا ہے کیا اقدار وارزش و اہمیت کا ملاک و معیار خدا کو قرار دیا جائے یا انسانی خواہشات کو؟ کیا واقعی حاکمیت خدا سے مخصوص ہے یا انسانوں سے؟ کیا ہماری اصلی فکر اندیشہ، حقوق اور زندگی کے تمام دوسرے لوازمات خدا سے مربوط ہیں یا انسانی خواہشات سے؟

اگر چہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ان مطالب کا بیان کرنا ہمارے لئے ناگوار واقعات کا سبب ہیں لیکن عصر حاضر میں علماء کا سب سے بڑی ذمہ داری موجودہ غبار آلود فضا کو اسلام کے صاف وشفاف مطالب بیان کر کے دھوڈالنا ہے، تاکہ لوگ کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کر کے مختلف نظریوں کی تحقیق وجستجو کریں اسلام اور منابع اسلامی کے نظریہ دوسروں کے نظریوں سے جدا کریں تا کہ اسکے ذریعہ اسلام اور کفر وشرک کی حد واضح ہو جائے اور کفر والحاد والتقاط کا نظریہ رکھنے والوں کو اسلامی محققین سے الگ کیا جاسکے، علماء کی بنیادی اور اصلی ذمہ داری یہی ہے اور قرآن بھی خاص طور سے اس بارے میں فرماتا ہے کہ: اگر علماء اور اہل علم بدعتوں کو پھیلائیں اور حقائق کو واضح نہ کریں تو ان پر خدا، فرشتے اور تمام مخلوق لعنت کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ...[1]

"یہی لوگ ہیں جن پر خدا (بھی) لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔"

ہمارا اصلی فریضہ یہ ہے کہ ہم فضا کی وضاحت کریں تا کہ مفاہیم اور اسلام و کفر کے مابین کی حدود معین و واضح ہو جائیں اور یہ بھی معین ومشخص ہو جائے کہ کن افکار میں اختلاط والتقاط پایا جاتا ہے؟ چونکہ انہیں التقاط واختلاط کی وجہ سے حق و باطل کے مابین عاشورا جیسا واقعہ رونما ہوا اور واقعہ عاشورا سے پہلے مسلمانوں اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی نسل پاک سے ایک شخص نے قیام کیا اور بہت سے اسلامی حقائق کی وضاحت فرمائی، لوگوں نے بھی اسلامی حقائق کو درک کیا اور سمجھداری سے کام لیا اور امام کی آواز پر لبیک کہا اور ایران میں ایک عظیم اسلامی انقلاب برپا ہو گیا۔

یہ بدیہی ہے کہ جب تک دین اسلام کے لئے اپنی تمام چیزوں کو قربان کرنے والے غیر تمند جوان موجود رہیں گے اس وقت تک دین اسلام پر ذرہ برابر بھی آنچ نہیں آنے دیں گے، اور الحمد اللہ ہمارے برادران سیاسی اور اجتماعی کافی

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۱۵۹

معلومات رکھتے ہیں، اور اپنے فرائض سے بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ان پر کیسے عمل کرنا چاہئے، ہم ان کے عملی فریضہ کو معین و مشخص کرنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ ہمارا کام تو صرف فکری اور عقیدتی مسائل کو بیان کرنا ہے، ہم تو صرف اسلام کے عملی اور نظری اصولوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کیا ہیں؟

ہم تو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلامی ثقافت کیا ہے اور یورپی اور کفر والحادی ثقافت کیا ہے، ہم تو لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کفر والحاد ثقافت کے اصلی عناصر اومانیزم وسیکولریزم اور لیبرلیزم ہیں اور ان کے مقابل میں اسلامی نظریہ کے اصلی عناصر خدامحوری، اصالت دین وولایت فقیہ اور خدا کی اطاعت کے دائرہ میں محدود رہ کر انسان کا فعالیت کرنا ہیں، یہ دونوں ثقافتیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہیں: پہلی ثقافت انسان کی مطلق آزادی یہاں تک کہ خدا کی اطاعت سے بھی آزاد رہنے کی دعوت دیتی ہے اور دوسری ثقافت ہم کو صرف اور صرف خداوند عالم کی اطاعت کی دعوت دیتی ہے پہلی ثقافت انسان کے تفکر اور اسکی زندگی سے خدا کو حذف کرنے اور انسان کو خود ہمت باندھنے کی دعوت دیتی ہے، اور دوسری ثقافت پرچم توحید کو بلند کرنے اور انسانی زندگی میں یکتا پرستی کی فکر کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور یہی ہمارا نظریہ اور انقلاب کا محور ہے۔

6۔ قانون کی حقیقت اور اسلام اور لیبرالیزم میں اس کی اہمیت

جس طرح ہم نے پہلی تقریروں میں بیان کیا ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے قانون ایسا ہونا چاہئے جو انسان کو اسکے مصالح اور معنوی مقصود تک پہنچائے اور صرف نظم وضبط اور اجتماعی امنیت کو پورا کرنا ہی قانون کا خاص کام نہیں ہے لیبرالی نقطہ نظر سے انسان کا صرف اور صرف دنیا سے لذت حاصل کرنا ہے، جبکہ قانون کا کام صرف اسباب لذت فراہم کرنا نہیں ہے جو چیز انسانوں کی زندگی میں ان کو لذت حاصل کرنے اور ان کا اپنی قدرت سے استفادہ کرنے میں مخل ہوتی ہے وہ دوسروں کیلئے مزاحمت ایجاد کرنا ہے، اگر قدرت اور لذتوں سے اس طرح استفادہ کیا جائے کہ اس سے دوسروں کی آزادی میں کوئی مزاحمت نہ ہو تو قانون اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قانون کا کام صرف دوسروں کی آزادی کی حفاظت کرنا اور ان کی خواہشات نفسانی کو مکمل کرنا ہے، قانون کا یہ ہدف یورپ کی اومانیزم اور لیبرلیزم کے نظریہ کا نتیجہ ہے، اور اس بنیاد پر قانون کا دائرہ بہت محدود ہو جائے گا۔

اور لوگوں کی زندگی سے حکومت کو بہت کم سروکار رکھنا ہوگا چونکہ اصل یہ ہے کہ لوگ آزاد رہیں اور جس کام کو ان کا دل چاہے اس کو انجام دیں اور اس اساس وبنیاد پر تو اس جملہ کا یہ مطلب ہوگا کہ قانون سے بالاتر آزادی کی حفاظت کرنا ہے، لیکن اسلام کی نظر میں قانون اس کو کہا جاتا ہے جو انسانوں کو صحیح زندگی بسر کرنے کے صحیح راستہ کی ہدایت کرے اور معاشرہ کی مادی اور معنوی مصالح کی طرف ہدایت کرے، اسلامی حاکم بھی وہی شخص ہو سکتا ہے جو ان مصالح کو معاشرہ میں جامہ عمل پہنائے اور ان مصالح میں رخنہ ڈالنے والوں کو روکے، لہٰذا اسلامی حاکم اور ڈیموکریٹک اور لیبرل حاکم کے درمیان بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے اس لئے کہ اس کو اجازت دیں تاکہ وہ موقع آئے اور لوگ اپنی خواہشات اور ہوئی وہوس کے مطابق عمل کریں اور وہ

صرف بے نظمی اور ہرج و مرج سے روکیں اور ان کو پاسکے علاوہ کسی مانع کے ایجاد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آزادی قانون سے بھی بلند و بالا ہے وہ خاص طور سے اہل علم و تحصیل اور محققین ہیں اور وہ جو لوگ اپنے کو صاحب نظر سمجھتے ہیں ان کو زیادہ دقت اور مطالب کی دقیق تحقیق و بررسی کرنا چاہئے۔

اصولی طور پر ماہیت قانون کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کیلئے کوئی حق اور دوسروں کیلئے کسی تکلیف کو معین کرنا، قانون آزادی کو روکنے والا ابزار ہے، اگر یہ بنا قرار دیدی جائے کہ شخص جو اس کا دل چاہے وہ کام انجام دے تو پھر قانون کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوگی، قانون اس مقام پر بنایا جاتا ہے جہاں پر افراد اپنی بعض خواہشوں سے صرف نظر کریں ورنہ قانون کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، اگر یہ بنا قرار دیدی جائے کہ ہر شخص جو کچھ چاہے وہ انجام دے تو پھر ہم کو قانون کی کیا ضرورت ہے؟ نتیجہ کے طور پر ماہیت قانون کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے لئے حق اور دوسروں کیلئے کچھ وظایف معین کئے جائیں، اگر ہمارے پاس کوئی ایسا قانون ہو جو کسی حق کو تمام انسانوں کیلئے ثابت کرے تو پھر بھی وہ کسی وظیفہ فریضہ کا متضمن ہوگا، مثال کے طور پر اگر ایک بین الاقوامی یہ قانون ہو اور وہ قانون یہ حکم صادر کرے کہ ہر انسان آزاد ہے اور اس کو یہ حق ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں اپنے رہنے کے لئے جگہ کا انتخاب ہے تو اس قانون کا مفاد تمام انسانوں کیلئے حق کا اثبات کرنا ہے۔

لیکن وظیفہ معین کئے بغیر دوسروں کیلئے حق ثابت کرنا نہیں ہے ورنہ ایسے قانون کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص کسی بھی جگہ رہنے کا حق رکھتا ہے اور دوسروں کو اس حق کا احترام کرنا چاہئے اور اسکی مزاحمت نہیں کرنا چاہئے، نتیجہ کے طور پر قانون یا تو تصریحی طور پر اور یا اشارہ کے طور پر کن امور کو انجام دینا چاہئے اور کن امور کو انجام نہیں دینا چاہئے کا متضمن ہے، یہاں تک کہ اگر ہر فرد کیلئے بھی حق کو ثابت کرتا ہے تو اس کا مفاد یہ ہے کہ دوسرے اس حق کی رعایت کریں اور اس کا احترام کریں۔

جو قانون یہ کہتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہئے یعنی اسکے علاوہ عمل نہیں کرنا چاہئے اور اس سے مراد یہ ہے کہ آزادی محدود ھے یعنی کن افعال کو انجام دینا چاہئے اور کن افعال کو انجام نہیں دینا چاہئے ے کی معرفت ہے، نتیجتاً جو قانون آزادی کے محدود ہونے کو ناپسند کرتا ہو وہ قانون تناقض رکھتا ہے، اور قانون یعنی وہ چیز جو آزادی کو محدود کردے تو اس بنا پر قانون سے اوپر کوئی آزادی نہیں ہے مگر کچھ مقامات پر کچھ خاص آزادیاں ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں کہ ان آزادیوں کی رعایت ہونا چاہئے، تو یہ بھی کچھ دوسرے قوانین کے اوپر ایک قانون ہو جائیگا۔ لیکن اگر کوئی قانون آزادی کیلئے کسی طرح کی محدودیت کا قائل نہ ہو تو وہ بھی لغو اور تناقض کا متضمن ہوگا۔

اور کوئی بھی عاقل اس طرح کی باتیں نہیں کرسکتا، اس لئے کہ اصل میں قانون کی شان ہی آزادی کو محدود کرنا ہے لیکن اگر اس شعار سے کہ قانون کو آزادی کے محدود کرنے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ مطلق آزادی ہونا چاہئے یہ مراد ہو تو یہ تناقض ہے اور اگر ان کی مراد شرعی آزادیاں ہیں تو ہم ان سے یہ عرض کرتے ہیں کہ شرعی آزادی کونسی ہے؟ اور کون شخص یہ معین کرے گا کہ مشروع آزادیاں کونسی ہیں اور نامشروع آزادیاں کونسی ہیں؟

7۔ مشروع آزادی کا نسبی ہونا

ھر نظام اپنی خاص ثقافت کی بنیاد پر کچھ امور کو جائز اور معقول سمجھتا ہے اگر چہ دوسرے افراد ان کو کتنے ہی نامشروع کیوں نہ سمجھتے ہوں، تو پھر مطلق آزادی کا کیا مطلب؟ یعنی کوئی بھی قانون مطلق آزادی کی ضمانت نہیں لے سکتا، جب کسی قانون میں یہ لکھا جائے کہ قانون کو مشروع آزادیوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے، تو ایک ایسی میزان ہو جو یہ بتائے کہ مشروع آزادیاں کونسی ہیں؟ یعنی مشروع، معقول اور مفید آزادیوں کو کس معیار کے ذریعہ معین کیا جائے؟ اس مقام پر یہ کہا جاتا ہے کہ مشروع آزادیوں کو معین کرنے کا ذمہ دار قانون ہوتا ہے۔

بہر حال ہم پھر اپنے اصلی مطلب کی طرف پلٹتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ معاشرہ میں ہر طرح کی آزادی جائز ہے تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ معاشرہ کیلئے کسی قانون کا ہونا لازمی نہیں ہے، !! لیکن کوئی عاقل انسان اس طرح کی باتیں نہیں کرتا مگر وہ انسان جو اپنی باتوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہو اور پس جو شخص بھی آزادی کا دم بھرتا ہے یقیناً اس کی مراد محدود آزادی ہے، اب یہاں پر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ آزادی کی حدود کو کون شخص اور کس معیار سے معین کرے گا؟ اگر افراد اپنی دلخواہ مرضی کے مطابق آزادی کی حدوں کو معین کریں گے تو بھی ہرج و مرج لازم آتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ہر انسان اپنے منافع کو پورا کرنے کی کوشش کریگا۔

لہٰذا آزادی کی حدوں کو معین کرنے والا کوئی شخص ہونا چاہئے ے، اب قانون کو کس قانون گذار کے ذریعہ مشخص و معین ہونا چاہئے، بدیہی ہے اگر قانون گذار کا ارادہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو اور قانون کا معیار و ملاک لوگوں کی خواہشات ہوں تو عملی طور پر ہوسباز افراد غالب ہوں گے یعنی وہی چیز جو اومانیزم اور لیبرالیزم نظریہ کا بنیادی پہلو ہے، اس نظریہ میں قانون کا کردار عسر و حرج کو روکنا ہے اور لوگوں کی مرضی کے مطابق ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ موضوع قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ بنیادی اشکال رکھتا ہے۔

8۔ اسلام کا لیبرالیزم سے ٹکراؤ

یہ طے ہے کہ ہم اسلام کو تسلیم کر لینے کے بعد لیبرالیزم کو قبول نہیں کر سکتے ہیں اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ قانون یعنی جو انسانوں کے مصالح کو پورا کرے تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر انسان جو اس کا دل چاہے وہ فعل انجام دے چونکہ یہ دونوں آپس میں سازگار نہیں ہیں، یا محور خدا ہو یا انسان، دوسرے لفظوں میں ! یا ہم اللہ کو مانیں یا اومانیزم کو مانیں، اب یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان کو بھی ملاک قرار دیں اور خدا کو بھی، اس طرح کی دو اصل کو قبول کرنا تعارض اور تضاد کے ساتھ ساتھ ایک قسم کا شرک بھی ہے، اور اگر خدا کو نہ مانے تو یہ کفر و الحاد ہے، اس لئے کہ اسلام اور کفر و الحاد آپس میں ایک دوسرے کے متناقض ہیں، اور یہ آپس میں ایک بنیادی جنگ رکھتے ہیں اور اسی دلیل کی وجہ سے امریکا کے بڑے بڑے سیاست دانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک ایران میں اسلامی نظام حاکم رہے گا، ہم ایران سے سازش نہیں کر سکتے چونکہ یہ دونوں متناقض نظریے ہیں اور ان کے

نظام بھی ایک دوسرے کے سازگار نہیں ہیں۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف نظریات میں بہتر قانون کی کیا کیا خصوصیتیں ہیں؟ کیا قانون کو معاشرہ میں صرف نظم برقرار کرنا چاہئے فردی خواہشات اور آزادیوں کو اگر وہ ایک دوسرے کی مزاحمت نہ کریں تو ان کو پورا کرنا چاہئے، یا قانون کو انسان کے واقعی مصالح کو پورا کرنا چاہئے چاہے اکثر افراد اس کو چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں، البتہ اگر لوگوں نے اسکو تسلیم کرلیا تو اسکو عملی جامہ پہنا دیا جائیگا اور اگر تسلیم نہ کیا تو اسی طرح عالم اسماء میں باقی رہیگا۔

پس اصل افراد ہیں لیکن یہ دیکھنا چاہئے کہ مشروعیت قانون کیا ہے؟ کیا مطلوب قانون صرف وہ قانون ہے جو لوگوں کے دل خواہ ہو اور ان کی خواہشوں کو پورا کرتا ہو یا قانون مطلوب وہ قانون ہے جو لوگوں کی مصلحت کو پورا کرتا ہو؟ یہ دو نظریے آپس میں ایک دوسرے سے صلح نہیں کر سکتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے ملا دینا ایک تاریک فضا کو ایجاد کرنا ہے تاکہ جو افراد غلط طریقہ سے استفادہ کرنے کے چکر میں ہیں وہ گندے پانی سے مچھلی کا شکار کرلیں، ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ فضا کو صاف وشفاف کریں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام کیا ہے اور کفر کیا ہے اور پھر انسان جس کو چاہے انتخاب کرے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ [1]

شاعر کہتا ہے:

متاع کفر و دین بی مشتری نیست
گروہی این گروہی آن پسندند

"دین اور کفر ایسی دو چیزیں ہیں کہ جس کے خریدار بہت ہیں، کچھ لوگ اسلام کے اور کچھ لوگ کفر کے خریدار بن گئے"۔

ہر حال میں لوگوں کو یہ جاننا چاہئے کہ کونسا متاع (مال) متاع دین ہے اور کونسا متاع متاع کفر ہے، تاکہ دونوں میں سے ایک کو منتخب کرلے، ہمارا وظیفہ دینی مفاہیم کو صاف وشفاف کرنا ہے اور اس سے ہر طرح کے غبار کو دور کرنا ہے تاکہ لوگ آگاہ طور پر انتخاب کریں، اور کچھ لوگوں نے ایسی فضا بنائی ہے اور چاہتے ہیں کہ دین کی جگہ ڈیموکریسی اور آزادی کو حاکم کردیں، لیکن ہمیں ہر حال میں ان لوگوں سے ہوشیار ہونا چاہئے اور توجہ رکھنا چاہئے کہ کیا کہیں اور کیا کریں۔

9۔اسلام اور ڈیموکراسی میں قانون گذاری

ہم اس سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ اسلام اور ڈیموکراسی کے درمیان کبھی صلح نہیں ہو سکتی ہے، ڈیموکراسی یعنی مردم سالاری یا لوگوں کی حکومت، دوسرے الفاظ میں لوگوں کی رائے اور نظریہ کو معتبر سمجھنا، اب اس اعتبار کو

---

[1]

محدود ہونا چاہئے یا لامحدود؟ کیا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اصالت و میزان لوگوں کی رائے کے ساتھ ہے یعنی چاہے وہ کتنا ہی خدا کی مرضی کے خلاف کیوں نہ ہو یا لوگوں کی رائے اس حد تک معتبر ہے کہ حکم خدا اور ارادہ خدا کے متضاد نہ ہو؟ یورپ میں اس چیز کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اصلی ملاک لوگوں کا نظریہ ہے اور آسمان و زمین میں کسی دوسری طاقت کو لوگوں کی سرنوشت اور قانون گذاری میں لوگوں کے مابین دخالت کرنے کا کوئی حق نہیں قانون وہی ہے جسکو لوگ چاہتے ہیں۔

یہاں پر ایک یہ سوال پیش آتا ہے کہ قانون کے معتبر ہونے کا ملاک و معیار تمام افراد کا ایک نظریہ پر متفق ہونا ہے یا اکثر افراد کا متفق ہو جانا ہی کافی ہے؟ عملی میدان میں تو تمام افراد متفق نہیں ہو سکتے ہیں، اور اگر اکثر افراد کا متفق ہونا کافی ہے تو تمام افراد کا وظیفہ کیا ہوگا اور اکثر افراد کی رائے ان کیلئے کتنی معتبر ہوگی؟ درحقیقت آجکل کی ڈیموکراسی، ڈیموکراسی اور نخبہ گرائی (منتخب کی ہوئی چیز) سے بنتی ہے۔

یعنی لوگ قانون بنانے کے لئے نمائندوں کو انتخاب کرتے ہیں، اب اگر اکثر افراد کی نظر چنیدہ افراد کے نظریہ سے مختلف ہو، تو دونوں میں سے کس کا نظریہ معتبر ہوگا؟ البتہ عام طور سے چنیدہ افراد لوگوں کی خواہش کے مطابق قانون بناتے ہیں اس لئے اگر وہ ایسا نہ کریں تو اگلے الیکشن میں کوئی ان کو ووٹ نہیں دے گا اور وہ منتخب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے لوگوں کی خواہش کو پورا کرتے ہیں اور انہیں کی مرضی کے مطابق قانون بناتے ہیں، لیکن بعض موقعوں پر لوگوں کے نظریہ اور اکثر چنیدہ افراد کے نظریہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کا ہدف یہ ہے کہ ایران میں حکومت علماء، ولایت فقیہ اور حکومت اسلامی کے مقام پر ڈیموکریٹک حکومت قائم ہونی چاہئے، ڈیموکریٹک کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی خواہش کے علاوہ کوئی دوسری چیز قانون کو معین کرنے میں دخالت نہیں رکھتی ہے کیا مسلمان اس کو تسلیم کر سکتے ہیں یا نہیں؟

اسلام ڈیموکراسی کے ساتھ سازگار ہونے کا دعوی کرنے والے افراد کے بارے میں یہ سوال پیش آتا ہے کہ لوگوں کی رائے اگر وہ خدا کے قطعی حکم کے برخلاف ہو تو کیا وہ پھر بھی معتبر ہے یا نہیں؟ اگر معتبر نہ ہو تو ڈیموکراسی ایجاد نہیں ہوئی ہے اور اگر ملاک اعتبار لوگوں کی رائے ہے اور خدا کے قطعی حکم کے خلاف ہو تو اس صورت میں ڈیموکراسی اسلام کے ساتھ سازگار نہ ہوگی، کیا اسلام خدا اور رسول کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

کیا اس کے علاوہ بھی کوئی دوسرا اسلام ہے؟ آجکل یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں متعدد قرائت ہیں لیکن جس قرائت کی بنا پر انقلاب برپا ہوا وہ یہ ہے کہ احکام خدا اور الٰہی اقدار کو معاشرہ میں حاکم ہونا چاہئے، اور جن افراد نے اس انقلاب کو برپا کیا اور اپنے خون کے آخری قطرہ تک اس کی حمایت کی اور آیندہ بھی حمایت کرتے رہیں گے ان کا ہدف اسکے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

اب اگر قانون گذاری کے مسئلہ میں ڈیموکریٹک کا مطلب انسانوں کی رائے کو اصل قرار دینا ہے یہاں تک کہ اگر چہ ان کی رائے حکم خداوندی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو اسلام کے نقطہ نظر سے ایسی ڈیموکریٹک مردود ہے، لیکن اگر

ڈیموکریٹک کا مطلب دوسرا ہو اور لوگ مبانی اور اصول اور اسلامی اقدار کی محافظت کرتے ہوئے اپنے اجتماعی معاشرہ اور قانونی مسائل میں اپنے چنے ہوئے افراد کے ساتھ حق دخالت رکھتے ہوں اور اپنے منتخب کئے ہوئے افراد کے ساتھ زمان و مکان کی خاص شرطوں کا خیال رکھتے ہوئے قوانین بنائیں تو یہی چیز ہمارے اسلامی ملک ایران میں پائی جاتی ہے، اور پارلیمنٹ کے ممبران بھی اس لائحہ کے بارے میں بحث اور مشورہ کرکے اسکو تصویب کر سکتے ہیں، لیکن پارلیمنٹ کے تصویب کئے ہوئے قوانین اس وقت معتبر ہوں گے جب وہ اسلامی احکام کے مخالف نہ ہوں۔

بہر حال یہ جو لوگوں کو زمان و مکان کی خاص شرائط کے ساتھ متغیر مقررات (قوانین) کو معین کرنے کی خاطر افراد کو منتخب کرنا پڑتا ہے، یہی چیز ہمارے ملک میں رائج ہے اور امام خمینیؒ نے بھی اسی روش کی تائید فرمائی ہے، اور ہمارے اساسی (بنیادی) قوانین نے بھی اس کی تائید کی ہے اگر قانون گذاری میں ڈیموکریٹک کا یہی مطلب ہے تو ایسی ڈیموکریٹک کا کوئی مخالف نہیں ہے۔

10۔ اسلامی حکومت میں معتبر قانون

جامع مسئلہ کی یہ اہمیت ہوتی ہے کہ جب لوگوں کے نمائندے اسلامی پارلیمنٹ میں کسی قانون کو تصویب کرتے ہیں تو کیا یہ قانون اس لئے معتبر ہے کہ لوگوں کے نمائندوں نے اس کو ووٹ دے کر منتخب کیا ہے اور اصل میں لوگوں کے نمائندوں کو اسی کام کیلئے منتخب کیا ہے یا اس لئے معتبر ہے کہ ولی فقیہ نے اسکی تائید فرمائی ہے؟ ہمارے نقطہ نظر سے انسان کو اپنی زندگی میں سب سے پہلے جس حق کی رعایت کرنا چاہئے وہ حق خدا ہے، اور اگر یہ بنا ہے کہ ہم حقوق کی رعایت کریں تو خداوند عالم کا حق سب سے پہلے مقدم ہے اور انسانوں پر خداوند عالم کا سب سے بلند و بالا حق، حق ربوبیت ہے اور یہ ربوبیت دو شعبہ رکھتی ہے:

1۔ ربوبیت تکوینی۔

2۔ ربوبیت تشریعی

ربوبیت تشریعی کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم جو دستور دے وہ انسانوں کیلئے واجب الاجرا ہے، اب اگر خداوند عالم کسی چیز کی نہی فرمائے تو اس کو انجام نہیں دینا چاہئے اور خداوند عالم کے قوانین و احکام سے سرپیچی کرنا ربوبیت الٰہی کے حق کو ضائع کرنا ہے اور اس قانون کا انکار کرنا اور اسکو معتبر نہ جاننا ایک قسم کا شرک ہے، اس بنیاد پر اسلامی معاشرہ میں وہ قانون معتبر ہوگا جو خداوند عالم کی رضا کے مطابق ہوگا اگر خدا کسی قانون کی نہی فرمائے تو وہ قانون معتبر نہیں ہوگا، چونکہ حق خدا ضائع ہوا ہے اور جب حق خدا ضائع ہوگیا تو اسی کے زیر اثر انسانوں کا حق بھی ضائع ہو جائے گا، لیکن قانون گذاری کے مسئلہ میں خدا نفع کو اپنے سے مخصوص کرتا ہے؟ مگر خداوند عالم تشریعی احکام اور ہم کو امر و نہی کرنے میں انسان کی مصلحت کے علاوہ اور کیا چاہتا ہے؟ اب اگر کسی مقام پر ہم سے خدا کی مرضی کے خلاف رفتار ہوئی ہے تو گویا وہ انسانوں کی مصلحت کے خلاف رفتا

رہوئی ہے۔

نتیجہ کے طور پر انسانوں کے مصالح کی حفاظت جو قانون کے معتبر ہونے کا اصلی رکن ہے وہ مخطرہ میں پڑ جائے گا تو پھر ایسا قانون معتبر نہ ہوگا، اسی وجہ سے نمائندوں کے ذریعہ کسی قانون کے تصویب ہو جانے کے بعد ایک اور چیز یہ معین کی گئی ہے کہ کچھ قانون اور دین کی معرفت رکھنے والے افراد اس قانون کی شرع سے مطابقت کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ قانون خداوند عالم کے حکم کے خلاف ہے یا نہیں؟ اس کو شورائے نگہبان کہا جاتا ہے۔

اگر صرف قانون کے معتبر ہونے میں لوگوں کی رائے کا ہی کافی ہوتی تو فقہاء شورائے نگہبان کس لئے؟ چنانچہ لوگ اپنے نمائندوں کو رائے (ووٹ) دیتے ہیں اور ان کے نمائندے بھی لوگوں کی درخواست پر ایک قانون تصویب کر کے وضع کر دیتے ہیں اور وہی قانون معتبر ہوتا ہے!

لہٰذا جمہوری اسلامی نظام میں شورائے نگہبان کا پہلا اور بالذات مقام یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے وضع کئے ہوئے قوانین یعنی جس کو لوگوں نے نمائندوں کے ذریعہ ووٹ دیا ہے اسکی احکام شرع سے مطابقت کریں کہ کہیں وہ قانون حکم خداوندی کے خلاف تو نہیں ہیں؟ یورپی ثقافت سے متاثر افراد اور جو لوگ دشمن کی مدد کرتے ہیں شوارئے نگہبان کو حذف کرنے کا دم بھرتے ہیں اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا فلٹر نہ ہو جو قوانین اسلام کو غیر اسلامی قوانین سے الگ کرے۔

حقیر صرف آپ حضرات کی اطلاع کے لئے یہ عرض کر رہا ہے (شاید آپ کو یقین نہ آئے اور انشاء اللہ وہ دن نہ آئے کہ اسکا حقیقی مصداق وجود میں آجائے) کہ یورپی ثقافت اور لیبرال کے سارے افراد اسلام اور ولایت فقیہ کو اساسی قانون سے حذف کرنے کے چکر میں ہیں، خدا دشمنان اسلام اور نظام اسلامی کے دشمنوں کو کبھی ایسا موقع نہیں دے گا۔ انشاء اللہ۔

چودھویں نشست

قانون کے سلسلے میں غرب کی مادی نگاہ

1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے معاشرہ کو قانون کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ایسا قانون جو انسان کی دنیا وآخرت کی سعادت کا ضامن ہو، اور مجری قانون کو بھی قانون کو اسکے مصادیق پر مطابقت کرنے میں مکمل طور پر آگاہ، دلسوز، متقی، عادل اور طاقت ور ہونا چاہئے، جیسا کہ مدیریت کا لازمہ بھی یہی ہے۔

حکومت کے سلسلہ میں اسلام کا یہ اصل نظریہ ہے کہ جس کو ہمارا معاشرہ ولایت فقیہ کے نام سے جانتا ہے اس نظریہ کو بیان کرتے وقت ہم نے بیان کیا تھا کہ انسان کا تنہا جنگل یا غار میں زندگی بسر کرنا ممکن ہے، لیکن کبھی کبھی انسان کی مادی او رمعنوی پیشرفت اجتماعی زندگی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، تمام علوم، فنون اور ٹیکنالوجی اجتماعی زندگی کا ہی ثمرہ ہے، یہاں تک کہ جو افراد خودسازی اور تہذیب واخلاق اور سیر وسلوک اور عرفان کے راستوں کو طے کئے ہوئے ہیں وہ اجتماعی زندگی کے اثر اور اپنے اخلاق کے اساتذہ اور مربیوں کے ذریعہ اس مقام پر پہنچے ہیں۔

اگر بشر کے مابین یہ ارتباط ورابطہ نہ ہوتا تو وہ کبھی مادی اور معنوی پیشرفت حاصل نہیں کرسکتے تھے، اس بنا پر انسان کیلئے اجتماعی زندگی کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس لئے کہ افراد اس نعمت الٰہی سے استفادہ کریں تو اجتماعی زندگی کو گذارنے کے لئے ان سب پر حاکم ہونے والے کچھ قوانین کا ہونا ضروری ہے۔

بدیہی ہے کہ اگر قوانین نہ ہوں تو معاشرہ میں بے نظمی، اختلال اور عسر وحرج لازم آئے گا اور انسانی زندگی حیوانی زندگی میں تبدیل ہوجائے گی، بعض محققین کہتے ہیں کہ انسان ذاتی طور پر ایک دوسرے کیلئے بھیڑیے کی مانند ہیں اور ان کو کسی زبردستی طاقت کے ذریعہ معتدل کرنا چاہئے لیکن اس طرح کا رویہ افراط کرنے والے انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، بہرحال انسان کے اندر بہت سے ایسے جاذبات پائے جاتے ہیں کہ اگر ان کو نظم اور قانون کے ذریعہ مہار نہ کیا جائے تو معاشرہ میں فساد پھیل جائے گا۔

اس کے بعد یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ قوانین کس طرح کے قوانین ہونے چاہئیں اور ان میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں تا کہ وہ انسانی معاشرہ کی دنیا اور آخرت کی سعادت کی طرف ھدایت کرسکیں؟ مختصر طور پر یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ

ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کو معاشرہ میں صرف نظم اور امنیت برقرار کرنے والا ہونا چاہئے اسکے علاوہ قانون کا اور کوئی فریضہ نہیں ہے، دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ قانون کو معاشرہ میں نظم وامنیت کے علاوہ عدالت کو بھی برقرار کرنے والا ہونا چاہئے اس بنا پر قانون کی تعریف کرنے میں مختلف نظریے بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ ہم نے مجمل طور پر بیان کیا ہے، اسی بارے میں کچھ افراد کہتے ہیں کہ معاشرہ میں نسانوں کے طبیعی حقوق کے خلاف ہونے والے قوانین کو نافذ نہیں کرنا چاہئے۔

اس مندرجہ بالا نظریہ کی تائید میں اخباروں، رسالوں اور تقریروں میں مختلف طرح کے انگیزہ بیان کئے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ آزادی انسانوں کے طبیعی حقوق کی بیان گر ہے، اور کوئی قانون انسانوں سے اس طبیعی حق کو چھین نہیں سکتا ہے، ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ نظریے مختلف اشخاص کی طرف سے اور مختلف انگیزوں کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور میرا بذات خود ان افراد کے ساتھ کوئی واسطہ بھی نہیں ہے کہ ان مطالب کو بیان کرنے والے کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا کیا انگیزہ ہے اور وہ کیوں ان مطالب کو بیان کرتے ہیں؟ میں صرف اس عنوان سے کہ طالب علم ہوں اور پچاس سال سے میرا علوم دینی سے سروکار ہے میں صرف فلسفہ حقوق یا فلسفہ سیاست کے بارہ میں اسلامی نقطہ نظر سے تو بحث کرسکتا ہوں اور اپنا نظریہ پیش کر سکتا ہوں، اور شاید اکثر افراد کو معلوم ہوگا کہ میرا کسی گروہ، کسی حزب، اور کسی تشکیلات سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور حقیر صرف وظیفہ شرعی کے حکم سے مطالب پیش کر رہا ہوں۔

اگر کچھ افراد معاشرہ میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں، لوگوں کے سامنے غلط تفسیروں کو پیش کرتے ہیں یا مطالب میں تحریف کیا کرتے ہیں، وہ ان تفسیروں کی ابتدا یا آخر سے کچھ کلمات کو حذف کر دیتے ہیں اور ایک جملہ ہوتا کسی کا ہے اور اس کو کسی اور سے منسوب کر کے بیان کیا کرتے ہیں اور اس کو ذرہ بین کے سامنے رکھکر اس سے غلط استفادہ کرتے ہیں تو میرا ایسے افراد سے کوئی رابطہ نہیں ہے، معاشرہ میں ایسے افراد ہمیشہ رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔

اگر آپ کے یاد ہو تو میں نے پہلے بھی مکرر اس مسئلہ کی تاکید کی ہے کہ ہم کبھی کبھی ایسا کلمہ استعمال کرتے ہیں کہ اس کا دقیق اور مشخص و معین مفہوم نہیں ہوتا اور ہر شخص اپنی قوت فہم کے مطابق اس سے مطلب اخذ کرتا ہے اور یہی اشتباہ غلطی کا سبب ہوتا ہے اور اس چیز کا باعث ہوتا ہے کہ سننے والا صحیح طریقہ سے کہنے والے کی بات کو نہیں سمجھ سکا اور بعض موقعوں پر یہ مغالطہ کا سبب ہوتا ہے، کبھی تو اتفاق سے مغالطہ ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی شخص جان بوجھ کر مغالطہ کرتا ہے۔

منجملہ ان کلمات میں سے ایک کلمہ "حق طبیعی" ہے جو اس جگہ پر بیان کیا گیا ہے جبکہ اصولی طور پر اس طرح بیان ہونا چاہئے کہ "حق" کیا ہے اور اسکے طبیعی ہونے کا کیا مطلب ہے؟

2۔ مکتب حقوق طبیعی

جو افراد فلسفہ حقوق سے آشنا ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ فلسفہ حقوق کے مکاتب میں سے ایک "حقوق طبیعی" ہے، گذشتہ زمانہ اور جب سے تاریخ فلسفہ مدون ہوئی ہے کچھ لوگوں نے اس موضوع سے متعلق بحث کی ہے۔

یونان کے بعض قدیم فلاسفہ معتقد تھے کہ: انسان حقوق رکھتے ہیں جن کو طبیعت نے ان کو دیئے ہیں انسان کی طبیعت میں حقوق وضع کئے گئے ہیں اور کوئی شخص ان حقوق کو ان سے سلب نہیں کر سکتا، اس لئے کہ انسانی طبیعت نے افراد کیلئے ان حقوق کا ایجاب کرلیا ہے اور اسی بنیاد پر وہ نتیجہ گیری کرتے ہیں اور ظاہراً یہ نتائج ایک دوسرے کے سازگار نہیں ہوتے اور یہیں سے فلسفہ حقوق واخلاق کے باب میں ایک معروف مغالطہ ایجاد ہوا جس کو "مغالطہ طبیعت گرایانہ" کہا جاتا ہے، کیونکہ کچھ افراد کہتے ہیں کہ انسان متعدد طبیعتیں رکھتا ہے مثال کے طور پر سفید گورے انسانوں کی ایک طبیعت ہوتی ہے اور کالے انسانوں کی دوسری طبیعت ہوتی ہے، کالے انسان جسم کے اعتبار سے گورے انسانوں سے زیادہ طاقتور اور فکری اعتبار سے ضعیف (کمزور) ہوتے ہیں، اسی طرح کا نظریہ ارسطو کا بھی نقل ہوا ہے (یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ حقیر ان نظریات کو تسلیم نہیں کرتا ہوں اور فقط نقل کرتا ہوں) جب کالے انسان بدن کے اعتبار سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں تو ان کو صرف بدنی کام انجام دینا چاہئے؟! اور گورے افراد فکری اعتبار سے زیادہ قوی ہیں تو معاشرہ کے تمام اداری کام ان کے حوالہ کر دینے چاہئیں، نتیجتاً بعض انسان دوسرے انسانوں کی خدمت کیلئے پیدا ہوئے ہیں اسی وجہ سے غلامی ایک "طبیعی" قانون ہے، ہم ابھی اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ کیا کالے انسانوں کی طبیعت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے یا نہیں؟ یہ خود ایک مفصل بحث ہے اور اس کے لئے بہت زیادہ وقت درکار ہے۔

بہر حال طول تاریخ میں حقوق طبیعی کے باب میں سب سے زیادہ عاقلانہ، معتدل اور سالم مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی چیز انسانوں کی طبیعت کلی کی مقتضی ہوتی ہے تو وہ محقق ہوتی، انسان کو اس طرح کی طبیعت کلی کے اقتضا سے محروم نہیں کرنا چاہئے، یہاں تک تو مطلب کچھ قابل تسلیم ہے لیکن اس کے قطعی اثبات کے لئے استدلال کی ضرورت ہے کہ کیوں جو چیز انسان کی طبیعت کے متقاضی ہے اس کو بجالایا جائے اور انسان کو اس سے محروم نہ رکھا جائے؟ یہ بہر حال اس مطلب کے اصل مشترک کے عنوان سے تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جو انسان کی طبیعت کی اقتضا کرتی ہے اور طبیعی طور پر وہ تمام انسان تقاضہ کے اعتبار سے مشترک ہیں تو انسان کو اس طرح کی ضرورتوں سے محروم نہیں کرنا چاہئے اس مطلب کی تائید میں عقلی استدلال بھی موجود ہیں جن کو ہم فعلی طور پر بیان نہیں کرنا چاہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان ضرورتوں کے مصادیق کیا ہیں؟ انسان کی طبیعت کو کھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور تمام انسانوں کو غذا کی ضرورت ہے اس بنا پر کسی انسان کو کھانا کھانے سے محروم نہیں کرنا چاہئے یعنی نہ اسکی زبان کاٹی جائے یا اسکو کوئی ایسی دوا کھلا دی جائے جس کی وجہ سے وہ بات کرنے سے محروم ہو جائے اور یا اسی طرح کے دوسرے امور، لیکن اس بات کی طرف متوجہ رہنا چاہئے کہ اس طرح کے مطالب بیان کرنے کے خاص اہداف ہوتے ہیں۔

۳۔ یورپ میں حقوق بشر کی حدود

آپ حضرات جانتے ہیں کہ اس دور کے آخر میں عالمی پیمانہ پر حقوق بشر کے عنوان سے ایک مسئلہ کا اعلان کیا گیا،

شروع میں اس اعلان کی چھیالیس ملکوں کے نمائندوں نے تائید کی اس کے بعد آہستہ آہستہ دوسرے ممالک بھی ان سے ملحق ہو گئے اور نتیجتاً وہ اعلان عالمی اعلان کی صورت میں بدل گیا، اس اعلان میں انسانوں کیلئے حقوق بیان کئے گئے، منجملہ یہ حقوق کہ آزادی بیان، مکان منتخب کرنے کی آزادی، شغل اختیار کرنے کی آزادی، مذہب انتخاب کرنے کی آزادی اور ہمسر انتخاب کرنے کی آزادی ہے۔

یہ حقوق (جن کیلئے اس اعلان میں استدلال بھی نہیں کی گیا) کہاں سے وجود میں آئے اور کس طرح تمام انسانوں کے حقوق کے عنوان سے بیان کئے گئے اسکا مفصل ایک تاریخچہ ہے، فلسفہ حقوق سے آشنا حقوق دانوں کو (خاص طور سے مسلمان حقوق دان) کی طرف سے اس اعلان میں بہت سی بحثیں بیان کی گئی ہیں، منجملہ یہ بحث کہ! وہ فلسفی مطالب جن کو تم انسانوں کے حقوق کے عنوان سے بیان کرتے ہو اور ان کو مطلق جانتے ہو اور تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ ان کو کسی کو محدود کرنے کا حق نہیں وہ کیا ہیں؟ اور ان کیلئے کون سا استدلال پایا جاتا ہے؟

کیا ان کی مشخص و معین کرنے کی کوئی حد ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ حقوق مطلق طور پر یہ حقوق قانون سے بلند درجہ رکھتے ہیں اور کسی قانون کو ان حقوق کو محدود کرنے کی اجازت نہیں؟ کیا کوئی قانون آزادی بیان کی حدود کو معین کرنے کی اجازت نہیں رکھتا؟ کیا کسی قانون کو انتخاب ہمسر کو محدود کرنے کی اجازت نہیں؟ کیا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو یہ بیان کر سکے کہ تم کو اپنی مملکت کی حدود سے باہر مسکن کو انتخاب کرنے کا حق نہیں ہے؟ کیا کسی قانون کو ان حقوق کی حدود کو مشخص و معین کرنے کی اجازت نہیں ہے؟

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں مطلب طبیعی حق ہے اور انسان کی طبیعت کے متقاضی ہے اور بالفرض اس پر عقلی استدلال بھی موجود ہو تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حقوق کی کوئی حد نہیں ہے؟ اگر حد بندی ہے تو کون اس حد بندی کو کون معین ومشخص کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خود اعلان کو لکھنے والے اور اکثر اس اعلان کی تفسیر کرنے والے (جہاں تک حقیر کی اطلاع میں ہے) بھی ان سوالوں کا صحیح جواب دینے سے کتراتے نظر آتے ہیں۔

آخر کار یہ کہ آزادی قانون سے بلند و بالا ہے اس سے مراد کیا ہے؟ کیا کچھ ایسی آزادیاں بھی ہیں جن کو محدود کرنے کا کسی قانون کو حق نہیں؟ کیا ہم یہ سوال نہیں کر سکتے کہ ان آزادیوں کی حد کہاں تک ہے؟ کیا آزادی بیان کا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص جو کچھ اسکا دل کھے وہ سب کہہ ڈالے؟! ہم تو یہ مشاھدہ کرتے ہیں کہ کوئی ملک ایسی اجازت نہیں دیتا اور آزادی بیان کیلئے حد بندی کا قائل ہوتا ہے، مثال کے طور پر باشخصیت افراد کی توہین کرنا دنیا میں کہیں بھی جائز نہیں ہے۔

۴۔ آزادی کی حد بندی میں تعارض کا ظاہر ہونا

اب یہ سوال درپیش ہے کہ آزادیوں کی حد بندی کہاں تک ہے اور کون اس کو معین کرتا ہے؟ اس کا مجمل جواب یہ ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ آزادی قانون سے بلند و بالا ہے اور اس کو محدود نہیں ہونا چاہئے اس سے مراد شرعی آزادیاں ہیں،

کچھ افراد کہتے ہیں کہ مشروع اور معقول آزادیاں اور کچھ دوسرے افراد نے دوسری قید کا اضافہ کیا ہے، حقوق بشر کے اعلان میں اس کو" اخلاقی" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی اخلاقی موازنہ کے ساتھ حقوق کی رعایت کرنا اور کم و بیش یہ ایک مبہم معنی رکھتا ہے اور مشروع قانون سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ دین اسلام جیسی شریعت نے اس قانون کو جائز قرار دیا ہو، اگر چہ لغت کے اعتبار سے ریشہ مشروع اور شریعت ایک ہے لیکن حقوق و سیاست کے بارے میں مشروع سے مراد وہ قانون ہے جسکو حکومت معتبر جانتی ہو نہ یہ کہ ہر حال میں شریعت نے ہی اس کو اجازت دی ہو، بعض متدین افراد کو یہ مطلب شک و شبہ میں نہ ڈال دے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مشروع حقوق یا مشروع آزادیاں تو ان کو شریعت اسلام نے مشخص و معین کیا ہے، مشروع سے ان کی مراد وہ حقوق ہیں جو معتبر اور قانونی ہیں، اور نامشروع سے مراد دوسروں کے حقوق سے تجاوز کرنا ہے۔

لیکن یہ سوال درپیش ہے کہ کون سے حقوق مشروع اور معقول ہیں اور کون سے نامشروع اور نامعقول ہیں؟ اور کس شخص کو انہیں معین و مشخص کرنا چاہئے؟ ان کے پاس اس جواب کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ آزادی سے مربوط جزئیات اور حدود کو قانون معین و مشخص کرتا ہے اور یہیں سے سب سے پہلے تناقض اور تعارض کا آغاز ہوتا ہے کہ: ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ حقوق اور آزادیاں قانون سے زیادہ اونچا درجہ رکھتی ہیں اور کوئی قانون ان کو محدود نہیں کر سکتا ہے، لیکن جب ہم ان سے کہتے ہیں کہ یہ آزادی مطلق ہے یا محدود؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ: مطلق آزادی نہیں ہے چونکہ وہ صحیح جواب نہیں دے سکتے اس لئے کہتے ہیں کہ ہماری مراد مشروع آزادیاں ہیں۔

جب ہم ان سے کہتے ہیں کہ مشروع سے کیا مراد ہے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ جس چیز کو قانون نے تصویب کر دیا ہو، یعنی قانون آزادی کی حد بندی کو مشخص و معین کرتا ہے، اور ابھی تو تم نے تو یہ کہا تھا کہ یہ آزادیاں قانون سے بلند و بالا ہیں۔

ممکن ہے آپ اس کا یہ جواب دیں کہ مشروع اور معقول آزادیوں سے تمام انسان اور عقلائے عالم واقف ہیں، ہم ان سے کہتے ہیں کہ جس مطلب کو تمام انسان اور عقلائے عالم جانتے ہوں تو پھر بحث ہی ختم ہو جاتی ہے، چونکہ ہم اور تمام مسلمان انہیں میں شمار کیے جاتے ہیں، اور دنیا میں تقریباً ایک میلیارد اور چند لاکھ مسلمان ہیں اور عقلاء بھی انہیں میں شامل ہیں، اور سب یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں کس قسم کی آزادیوں کو قبول کیا گیا ہے اور وہ کس قسم کی آزادیوں کو قبول کرتے ہیں اور کس قسم کی آزادیوں کو رد کرتے ہیں، ہماری تمام معلومات اور مطالعات کے مطابق ابھی تک یہ سوال بلا جواب ہے اور فلاسفہ حقوق کے پاس اس کا کوئی قطعی جواب نہیں ہے کہ آزادیوں کو کونسی چیز محدود کرتی ہے؟

5۔ حقوق بشر میں آزادی کی اہمیت

حقوق بشر کے اعلان کی شرح کرنے والوں اور فلاسفہ حقوق نے اپنی فلسفہ کی کتابوں میں آزادی کی حد بندی کے بارے میں مندرجہ ذیل چیزیں لکھی ہیں:

1۔ جس چیز کو فردی آزادیوں کو محدود کرنے کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے وہ دوسروں کی آزادی ہے، یعنی ہر فرد

وہاں تک آزاد ہے جہاں تک وہ دوسروں کا مزاحم نہ ہو اور دوسروں کے حقوق سے تجاوز نہ کرے، فلاسفہ حقوق نے اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کے بارے میں بہت زیادہ پافشاری کی ہے اور حقیقت میں حقوق بشر کے اعلان میں جو یورپ کے فلاسفہ حقوق کی انجیل کے مانند ہے اس چیز پر بہت زیادہ تاکید کی ہے کہ ہر انسان وہاں تک آزاد ہے جہاں تک وہ دوسروں کا مزاحم نہ ہوتا ہو، لیکن اگر فردی آزادی سے دوسروں کو زحمت ہوتی ہو وہ اس طرح کی آزادی سے محروم ہوگا اور یہیں پر آزادی محدود ہو جاتی ہے۔

یہاں پر بہت سے سوال پیش آتے ہیں: پہلا سوال: تم دوسروں کی مزاحمت کرنے کو کن مقولوں سے تعبیر کرتے ہو؟ کیا یہ مزاحمت صرف امور مادی میں ہے یا امور معنوی کو بھی شامل ہوتی ہے؟ کیا لوگوں کے دینی مقدسات کی مخالفت کرنا ان کی آزادی کی مخالفت کرنا ہے یا نہیں؟ یورپی لیبرال کا نظریہ یہ کہتا ہے کہ آزادیوں کی حد بندی معنوی ادوار کو شامل نہیں ہوتی اور امور معنوی کی مخالفت آزادی کو محدود نہیں کرتی۔

لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین اسلام خدا و پیغمبرؐ اور مقدسات اسلام کی اہانت کرنے والے کو مرتد سمجھتا ہے، مثال کے طور پر اسلام، سلمان رشدی کو مقدسات اسلام کی اہانت کرنے کی وجہ سے واجب القتل سمجھتا ہے تو وہ اس چیز کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ بیان آزاد ہے، وہ محقق ہے جو چاہے لکھ سکتا ہے، تم بھی جو چاہو وہ لکھو! تو ہمارا ان سے یہ سوال ہے کہ اس کتاب کے مطالب سے دوسروں کی مقدسات کی اہانت ہوتی ہے؟ تو حقیقت میں وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ توہین آمیز نہیں ہے۔

کیا آزادی بیان اتنا وسیع ہے کہ ایک شخص دنیا کے اس کونہ سے ایک میلیارد سے زیادہ مسلمانوں کی مقدس شخصیت پیغمبر جن کو مسلمان اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اور اپنے ہزاروں عزیزوں کو آپ پر فدا کرنے کیلئے تیار ہیں ان کی شان میں گستاخی کرے؟ کیا اس کام کو آزادی بیان کہا جاتا ہے؟ اور یہ وہی مطلب ہے جس کو تمام لوگ درک کرتے ہیں؟ کونسی عقل، منطق استدلال اور شریعت اجازت دیتی ہے کہ ایک انسان دوسرے ایک میلیارد مسلمانوں کی مقدس شخصیت کی شان میں گستاخی کرے؟ اگر حقوق بشر کے اعلان میں آزادی بشر سے یہی چیز مراد ہے تو ہم بغیر کسی چون و چرا کے آرام کے ساتھ ایسے اعلان کو تسلیم نہیں کرتے۔

6۔ یورپ میں آزادی کی حد بندی پر اعتراضات

جو افراد اس اعلان کو معتبر سمجھتے ہیں اور اس کا انجیل کی حد تک احترام کرتے ہیں ان سے ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ اعلان کیسے معتبر ہوتا ہے؟ کیا تمہارے پاس کوئی عقلی دلیل ہے؟ اس صورت میں تم کو اس پر عقل سے بھی استدلال کرنا چاہئے، بڑے آرام سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "آزادی قانون سے بلند درجہ رکھتی ہے اور اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا ہے" اگر تم یہ کہتے ہو کہ اس کا اعتبار اس وجہ سے ہے کہ ممالک کے نمائندوں نے اس اعلان پر دستخط کر دیئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اعتبار دستخط کا تابع ہے، اب جن ممالک نے اس اعلان پر دستخط نہیں کئے ہیں یا کسی شرط کے ماتحت دستخط کئے ہیں ان کے بارے

میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ بھی بغیر کسی چون و چرا کے اس کی اتباع کر سکتے ہیں؟

ہر معاشرہ ثقافت، مقدس چیزیں اور خاص احکام رکھتا ہے اور اسی حقوق بشر کے اعلان کے ایک حصہ میں آیا ہے کہ ہر شخص اپنا مذہب منتخب کرنے میں آزاد ہے اور جب انسان کسی مذہب کا انتخاب کر لیتا ہے تو اس کو اسکے احکام پر عمل کرنا چاہئے کسی مذہب کے منتخب کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ صرف زبان پر جاری کر لیا جائے بلکہ انسان کو عمل کرنے میں بھی آزادانہ طور پر اپنے مذہب پر عمل کرنا چاہئے۔

اب ہم نے بھی اسلام کو آزادانہ طور پر منتخب کیا ہے، اسلام کا بھی فرمان ہے کہ جو شخص بھی اولیائے اسلام کی اہانت کرے گا اسکی سزا موت ہے، یورپی ثقافت کہتی ہے کہ اسلام کا یہ حکم حقوق بشر کے خلاف ہے انسانوں کے طبیعی حقوق کے بر خلاف ہے، اس لئے ہر انسان اپنی طبیعت کے اقتضاء کے مطابق جو کچھ چاہے لکھنے کا حق رکھتا ہے! نتیجہ کے طور پر حقوق بشر کے اعلان میں جو یہ دو مطلب آئے ہیں یہ ایک دوسرے کے معارض ہیں۔

ہم اپنی پہلی بحث کی طرف پلٹتے ہیں کہ ہر شخص جو چاہے وہ لکھنے کا حق رکھتا ہے اس مطلب پر کونسی دلیل ہے؟ تو تم اپنے ملک میں ہر شخص کو جو کچھ وہ کہنا چاہے اسکی اجازت کیوں نہیں دیتے ہو؟ اگر کوئی شخص تہمت لگاتا ہے تو عدالت میں اسکی کیوں شکایت کرتے ہو، اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ "آزادی بیان" ہے اور جو میں نے چاہا وہ کہا ہے تو کس دلیل کی بنا پر اس سے یہ کہتے ہو کہ اس طرح کی باتیں مت کرو؟ معلوم ہوتا ہے کہ مطلق آزادی بیان نہیں ہے اور بعض مطالب کو بیان نہیں کرنا چاہئے، اس مطلب کو دنیا کے تمام انسان تسلیم کرتے ہیں کہ مطلق آزادی نہیں ہے ورنہ انسانیت اور معاشرہ باقی نہ رہتا جس میں کوئی قانون حاکم اور حقوق کی رعایت ہوتی۔

نتیجہ کے طور پر کوئی شخص مطلق آزادی کو تسلیم نہیں کرتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اسکی حد کہاں تک ہے؟ آزادی بیان کو نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا اور ہم نے عرض کیا کہ آزادی کو لامحدود نہیں کہہ سکتے اور ایسا کسی شخص نے بھی نہیں کہا ہے اور عملی طور پر کوئی مملکت اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ ہر انسان کا جو دل چاہے وہ بیان کرے اور لکھے اگر چہ وہ تہمت و افتراء ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے لوگوں کی گمراہی کا سبب ہو، قومی امنیت کے برخلاف ہو۔

اگر گفتگو کرنا آزاد ہے تو ہم بھی گفتگو کرتے ہیں، اگر وہ ہم کو اجازت دیں تو ہم بھی ان سے ایک سوال کرتے ہیں، اور حقوق بشر کا اعلان لکھنے والوں کی خدمت میں مودبانہ زانوئے ادب تہہ کریں اور ان کے سامنے اپنا سوال بیان کریں، ہمارا ان سے سوال یہ ہے کہ کس دلیل کی بنیاد پر انسان آزاد ہے کہ وہ جو چاہے لکھے؟ اگر آزادی مطلق ہے تو تم خود کیوں تسلیم نہیں کرتے ہو؟ تہمت لگانے اور افتراء باندھنے اور اہانت کرنے کو کیا تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ آزادی مطلق ہے؟

نتیجتاً تم نے یہ تسلیم کر لیا کہ آزادی محدود ہے، لیکن وہ کہاں تک محدود ہے؟ جہاں تک تمہارا دل چاہے وہاں تک محدود ہے؟ جب تم یہ کہتے ہو کہ دوسروں کی آزادی کا مزاحم نہیں ہونا چاہئے تو ہمارا تم سے سوال یہ ہے کہ تم دوسروں کی آزادی کو

کس حد تک معتبر سمجھتے ہو؟ کیا آزادی کی حد بندی یہ ہے کہ جہاں تک دوسروں کا جانی مالی اور ان کی حیثیت کا نقصان نہ ہوتا ہو؟ کیا اور وروح، حیات معنوی، افکار اور ان کی مقدس آرزوں پر صدمات وارد ہوتے ہیں وہ ممنوع ہیں یا نہیں؟ اگر ممنوع ہیں تو ہمارا بھی یہی نظریہ ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ آزادی بیان حد بندی رکھتی ہے، مقدس چیزوں کی اہانت نہیں کرنا چاہئے چوں کہ یہ دوسروں کے حق سے تجاوز کرنا ہے۔

7۔ مادی اور معنوی مصالح پر قانون اسلام کی توجہ

اب اس بحث کو برقرار رکھنے میں یہ سوال پیش آتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے آزادی کی اساس و بنیاد کیا ہے اور اس کی حد بندی کیا ہے؟ قانون کیلئے پہلے بیان کی گئی خصوصیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے معاشرہ میں اجتماعی زندگی کے اہداف و مقاصد اور مادی و معنوی مصالح کی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر قانون کا موجود ہونا ضروری ہے، اگر اجتماعی زندگی نہ ہوتو افراد کے مادی اور معنوی مصالح پورے نہیں ہوسکیں گے، اجتماعی زندگی کے ماتحت انسان اس چیز کا منتظر رہتا ہے کہ وہ خداداری نعمتیں جیسے علوم، ٹیکنالوجی اور صنعتوں سے بھی اور معارف وکمالات روحی کے بلند پایہ کے استادوں سے بھی کما حقہ استفادہ کرے گا، ان معارف وعلوم کا صرف اجتماعی زندگی میں ہی حاصل کرنا میسر ہے۔

نتیجتاً قانون ایسا ہونا چاہئے جو انسانی رشد کی مادی اور معنوی جہتوں میں ضمانت لے قانون کا صرف معاشرہ میں نظم برقرار کرنا ہی کافی نہیں ہے، مثال کے طور پر اگر دو افراد یہ طے کریں کہ وہ دوسروں کو کوئی نقصان پہنچانے اور معاشرہ کے نظم میں خلل ڈالے بغیر ایک دوسرے کو قتل کرڈالیں گے تو کیا وہ یہ صحیح کام انجام دیں گے؟

اگر آپ حضرات کو یاد ہوتو کچھ دن پہلے امریکہ کے ایک شہر میں انسانوں کے ایک گروہ کو جلا دیا گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ وہ افراد تھے جو اپنے رسم ورواج میں خودکشی کو کمال سمجھتے تھے! البتہ ذھن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے خود امریکا کی حکومت کے ممبران نے جب ان افراد کو اپنے نظام کے مخالف دیکھا ھو، تو سب کو نیست و نابود کردیا ہو، فرض کر لیجئے کہ اس گروہ نے اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق اس فعل کو انجام دیا تو کیا ان کا ایسا کرنا صحیح ہے؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کسی کو کوئی اذیت نہیں دی اور خود ایک دوسرے سے موافقت کر کے ایک دوسرے کو قتل کردیا تو انھوں نے یہ صحیح کام انجام دیا ہے؟ کیا حکومت کو ایسے قانون کی اجازت دیدینی چاہئے؟ کیا قانون کو ایسی اجازت دیدینی چاہئے یا نہیں؟ اگر نظم اور امنیت کی رعایت کرنا ہی صرف ملاک ہے تو یہ نظم وامنیت تو کچھ افراد کے ایک ساتھ قتل کردینے سے بھی باقی رھتی ہے! اور قانون دوسرا کوئی اور وظیفہ نہیں رکھتا۔

لیبرل نظریہ میں حکومت کا وظیفہ صرف نظم وامن برقرار کرنا ہے اور قانون کا کام ہرج ومرج کو روکنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اس طرز تفکر کا نتیجہ وہی چیز ہے جسکا یورپی ممالک میں مشاھدہ کیا جاتا ہے جیسے اخلاقی، جنسی، اور اجتماعی فساد وغیرہ یہ تمام مسائل ان کے اس قول کا نتیجہ نہیں کہ: حکومت کو افراد کے حقوق اور ان کی زندگی میں دخالت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے

اور حکومت کو تو صرف نظم برقرار رکھنا چاہئے، حکومت کو تو صرف مسلح پولیس کی طرح اسکولوں میں رہنا چاہئے تا کہ بچے ایک دوسرے کو یا اپنے استادوں کو قتل نہ کر دیں، وہاں پر برقراری نظم و امنیت اسی حد تک ہے کیا قانون کا وظیفہ صرف یہی ہے؟ یا دوسرے وظایف جیسے انسانوں کے اندر رشد و نمو کرنا بھی قانون کی ذمہ داری ہے؟ اور کیا قانون کو اخلاقی برائیوں سے بھی روکنا چاہئے؟

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کا نتیجہ کہ: قانون کو مصالح معنوی کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے، اس بنا پر جو کچھ انسانوں کے معنوی مصالح اور ان کی شخصیت، روح الٰہی، مقام خلیفہ الٰہی اور انسانیت کیلئے مزاحمت ایجاد کرتا ہے اور اسی طرح جو مصالح مادی اور انسانوں کی امنیت اور سلامتی کو ضرر پہنچاتا ہے وہ بھی ممنوع ہونا چاہئے، کیا اجتماع اسلئے نہیں ہوتا کہ انسان اپنی انسانیت کی وجہ سے رشد کرے اور صرف اپنے حیوانی مقاصد ہی نہیں بلکہ انسانی مقاصد کو بھی حاصل کرے؟ تو قانون مصالح مادی اور معنوی دونوں کا متکفل ہونا چاہئے، لہٰذا کسی کی حیثیت، کرامت اور لوگوں کی مذہبی مقدس گاھوں سے معارضہ کرنا یہ انسانوں کی روحی اور معنوی رشد و نمو کو روکتا ہے یہ بھی ممنوع ہونا چاہئے، جس طرح سے مواد مخدر کا رائج کرنا یا زہریلی دوا کا انجکشن لگانا منع ہے اس لئے کہ وہ انسان کو بیمار کرتا ہے اور ہستی سے ساقط کر دیتا ہے، اور اس کے مصالح مادی کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

اب اگر کوئی اس زہر کا عادی ہو جائے اور اسکے حیوانی انفعال میں کوئی خلل ایجاد نہ ہو اور وہ ظاہراً صحیح و سالم ہو لیکن اس کا فہم و شعور ختم ہو گیا ہو تو کیا یہ اس کیلئے جائز ہو جائے گا؟ اور اگر دوسری طرح کی آفتیں اور زہر اپنا کام کر جائے جو اس کی سلامت معنوی اور ایمان کے ختم ہو جانے کا باعث ہو جائے تو کیا ان امور کا انجام دینا ممنوع نہیں تھے؟ کیا یہ انسان کی انسانیت کو ضرر پہنچانا نہیں ہے؟ اگر کچھ افراد معاشرہ میں ایسی شرطیں فراہم کریں جو لوگوں کو دینداری سے دور کریں تو ان کو آزاد ہونا چاہئے؟ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے کہ:

وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ... [1]

"اور (یہ بھی یاد رہے) کہ خدا کی راہ سے روکنا اور خدا سے انکار اور مسجد حرام (کعبہ) سے روکنا (اس سے بڑھ کر گناہ ہے)"

جو چیز خداوند عالم کی راہ، ترقی اور انسانوں کے حقائق دین سے آشنا ہونے کے راستہ کو بند کر دے اور دین کو جوانوں کے نزدیک مشتبہ جلوہ دینے کا باعث ہوتا ہے وہ منع ہے چونکہ وہ انسان کی انسانیت کو ضرر پہنچاتا ہے، کیسے جو چیز انسان کی حیوانیت کو لطمہ پہنچاتی ہے تو وہ ممنوع ہوتی ہے لیکن جو چیز انسان کی انسانیت کو ضرر پہنچائے وہ آزاد ہوتی ہے؟ دنیا کہتی ہے: ھاں، لیکن دین کہتا ہے کہ: نہیں، ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ معاشرہ میں اس قانون کا اجراء ہونا چاہئے جو انسانوں کی مصالح معنوی کی رعایت کرے اور مصالح معنوی کی رعایت کرنا مصالح مادی سے زیادہ اہم ہے۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۱۷

قارئین کرام! اس بات کا خیال رکھیں کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کا علمی بحث سے تعلق ہے اور ممکن ہے اس کا عینی مصداق نہ مل سکے لہٰذا اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم نے اقتصاد کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

8۔ مصالح معنوی اور دینی کا مصالح مادی پر مقدم ہونا

اگر کوئی ایسا موقع آجائے کہ ہماری اقتصادی حالت تو اچھی ہوتی ہو لیکن ہمارے دین پر آنچ آتی ہو یا دینی حالت تو سدھرتی ہو لیکن اقتصادی حالت پر آنچ آتی ہو تو ہم کو دونوں میں سے کونسی چیز انتخاب کرنی چاہئے؟ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ اسلام کی پیشرفت اقتصادی پیشرفت کی بھی ضامن ہے، مگر ایک طولانی عرصے کے بعد، لیکن کبھی یہ امکان ہے کہ اقتصادی منافع کچھ تھوڑی مدت تک کیلئے ختم ہو جائیں اور افراد کیلئے کچھ تنگی کا باعث ہو جائے، اب اگر اس طرح کی وضعیت پیش آجائے تو بیان کئے گئے مقدمات اور استدلال کو مدنظر رکھتے ہوئے مصلحت دینی کو مقدم ہونا چاہئے یا دنیوی کو مقدم کرنا چاہئے؟ جیسا کہ نہج البلاغہ میں امام حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:

"فَإِنْ عَرَضَ بَلَاءٌ فَقَدِّمْ مَالَكَ دُونَ نَفْسِكَ، فَإِنْ تَجَاوَزَ الْبَلَاءُ فَقَدِّمْ مَالَكَ وَ نَفْسَكَ دُونَ دِينِكَ." [1]

"اگر تمہاری جان خطرہ میں پڑ جائے تو تم اپنے مال کو اپنی جان پر فدا کر دو اگر جان و مال کے درمیان خطرہ ہو تو مال کو قربان کر دو لیکن اگر جان اور دین کے درمیان خطرہ ہے یعنی زندگی کفر کی حالت میں ہو اور ایمان کی حالت میں شہادت ہو تو پھر اپنی جان و مال کو دین پر قربان کر دینا چاہئے، اس موقع پر اگر انسان قتل ہو جائے تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا"

کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ. [2]

"(اے رسول) تم منافقوں سے کہہ دو کہ تم تو ہمارے لئے (فتح یا شہادت) دو بھلائیوں میں سے ایک کے (خواہ مخواہ) منتظر ہی ہو"

جو شخص دین اسلام کی راہ میں قتل ہو جائے اس کا کیا نقصان ہوتا ہے؟ وہ سیدھا جنت میں جائے گا لیکن بالفرض اگر کوئی شخص بے دین سو سال تک زندہ رہے تو دن بہ دن اسکے عذاب میں زیادتی ہونے کے علاوہ اس کا اور کیا فائدہ ہوگا؟ پس اسلامی نقطہ نظر سے مصالح دینی اور معنوی مصالح مادی سے اہم ہیں، اس بنا پر قانون کو مصالح معنوی کی رعایت کے علاوہ مصالح معنوی کو اولویت بھی دینا چاہئے، ہماری بحث استدلالی ہے اور ہم اپنے استدلال کو کسی دوسرے پر نہیں چھوڑ دیتے ہیں جو افراد تسلیم نہیں کرنا چاہتے وہ رد کر سکتے ہیں، ان استدلالوں کی بنیاد پر ہم نے کوئی غیر منطقی مطلب بیان نہیں کیا۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۸ ص ۲۵۰

[2] سورۂ توبہ آیت ۵۲

۹۔اسلام اور لیبرالیزم کے مابین آزادی اور قید میں فرق

ساری دنیا کے تمام عقلائے کے مانند ہماری نگاہ میں بھی آزادی محدود ہے،لیکن ان کے اور ہمارے مابین یہ فرق ہے کہ ان کے یہاں آزادی کے مقید ہونے کا یہ مطلب دوسروں کی آزادی سے تجاوز کرنا ہے اور ہمارے یہاں آزادی کے محدود ہونے کا مطلب مصالح اجتماعی کی ہر مصلحت سے تجاوز کرنا ہے،انسان اپنی زندگی میں آزاد ہیں وہ بات کریں،کھائیں،کام کریں،تجارت کریں،اقتصادی حالت درست کریں،بحث کریں،سفر کریں،قرارداد پر دستخط کریں،بہ طور خلاصہ ان کو ہر کام کرنے کی اجازت ہے لیکن کس حد تک؟ جہاں تک معاشرہ کے مادی اور معنوی مصالح تباہ و برباد نہ ہوتے ہوں۔

جہاں آزادی مادی لحاظ سے معاشرہ کے مصالح کو نقصان پہنچانا شروع کردے وہ ممنوع ہے،اور اسی طرح جہاں پر آزادیوں سے استفادہ کرنا معاشرہ کی معنوی مصالح سے معارضہ کرجائے تو ایسی آزادیاں ممنوع ہیں مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں آزادی سے استفادہ کرنا منع ہے یہ ہماری دلیل و منطق ہے،اور اگر کسی کے پاس ہم سے بہتر منطق ہے تو ہم اس کو سننے اور اس سے استفادہ کرنے کیلئے تیار ہیں،فلسفہ حقوق کے استادوں سے میری گذارش ہے کہ وہ زیادہ دقت سے کام لیں۔

جہاں تک ہم کو اطلاع ہے آج تک حقوق اور سیاست کے فلاسفہ نے اس سوال کا کوئی قطعی اور منطقی جواب نہیں دیا کہ آزادی کی حد بندی کیا ہے؟ اگر ہمارے اساسی قانون یا عادی قوانین یا بزرگان عالم کے کلمات میں یہاں تک کہ اگر امام خمینی قدس سرہ کے کلمات میں اس سے مشابہ کوئی تعبیر موجود ہو تو اسکی تفسیر کی خاطر اسکے اہل سے رجوع کرنا چاہئے،ہم بھی قانون کے جاری ہونے کے طرفدار ہیں اسلامی ملک میں قوانین کی بہ نسبت ہماری ذمہ داری دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔

لیکن ہمارا دوسروں سے یہ فرق ہے کہ ہم قانون کو اس لئے معتبر سمجھتے ہیں کہ ولی فقیہ نے ان پر دستخط کردیئے ہیں، اور چونکہ امام خمینی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ "اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا واجب ہے" کچھ افراد کہتے ہیں کہ: چونکہ لوگوں نے اپنے ووٹ بھی دیئے ہیں،اب کونسی منطق قوی ہے؟ کس کا اثر زیادہ ہے؟ جب کسی شخص سے کہا جائے چونکہ لوگوں نے ووٹ دیئے ہیں،اس لئے اس قانون پر عمل کرنا واجب ہے؟ ممکن ہے وہ شخص یہ جواب دے کہ میں نے اس نمائندے کو ووٹ ہی نہیں دیا ہے،یا میں اس قانون سے راضی ہی نہیں ہوں!

لیکن امام خمینی (رہ) قدس سرہ نے فرمایا دیا ہے کہ: اگر اسلامی حکومت کوئی حکم صادر کرے اور مجلس شورائے اسلامی کسی حکم کو تصویب کردے تو وظیفہ شرعی کے عنوان سے اس کی اطاعت کرنا چاہئے؟ اس وقت دیکھیں کیا چیز وقوع پذیر ہوتی ہے،اب ہم قانون کے پابند ہیں یا وہ؟ یہاں تک کہ اگر کسی اساسی (بنیادی) قانون میں بھی کوئی ابہام پایا جاتا ہو تو اسکی تفسیر کی خاطر کسی صلاحیت دار مرجع کی طرف رجوع کرنا چاہئے کسی اور کی طرف نہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ تمام ملتوں اور تمام عقلاء کے درمیان آزادی محدود ہے،لیکن اسلامی نقطہ نظر سے معاشرہ کی مصالح مادی اور معنوی اسکی حد ہیں،تمام انسان وہاں تک آزاد ہیں جہاں تک معاشرہ کے مادی اور معنوی مصالح کو کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو۔

پندرھویں نشست

اسلامی حکومت اور ثقافتی حربے

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ہماری بحث اسلام کے سیاسی نظریہ کے بارے میں ہے اور گذشتہ نشستوں میں اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں بیان ہوئیں کہ جس میں مہم چیز سیاست کا دین سے جدا نہ ہونا تھا، اور ہم نے عرض کیا کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے وہ قانون معاشرے میں معتبر ہے جو یا خدا کی طرف سے براہ راست قرآن کریم میں بیان ہوا ہو، یا پیغمبر اکرم اور ائمہ معصومین علیہم السلام یا اس شخص کی طرف سے بیان ہوا ہو جس کو امام معصوم نے اجازت دی ہو بہر حال قوانین خدا کی مرضی کے مطابق اور اسلامی نظریہ کے مطابق ہو، اس سلسلہ میں گفتگو بہت زیادہ ہے، اور ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ بعض لوگ اس کے مخالف ہیں کہ معاشرہ میں احکام دینی کی حکومت ہو، ان مخالف لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

1۔ جو لوگ دین کو بالکل نہیں مانتے، ظاہر ہے کہ یہ لوگ بالکل بھی پسند نہیں کریں گے کہ کسی ملک میں دینی احکام جاری ہوں، لیکن الحمد للہ ایسے افراد ہمارے معاشرے میں بہت کم ہیں۔

2۔ جو لوگ دین کو قبول کرتے ہیں لیکن مغربی کلچر کے تحت تاثیر واقع ہیں ان کا اعتقاد یہ ہے کہ دین کا دائرہ سیاست و معاشرے سے جدا ہے اور دین کو فقط انفرادی اور خدا سے رابطہ میں منحصر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اجتماعی زندگی کے مسائل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے اسی نظریہ کو عمومی طور پر سیکولیزم یا دین کا مسائل زندگی سے جدا کرنا کہا جاتا ہے۔

3۔ جو حضرات واقعاً معتقد ہیں کہ اسلام میں اجتماعی اور اسلامی مسائل موجود ہیں، لیکن ناخواستہ طور پر مغربی کلچر سے متاثر ہیں اور کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

2۔ علماء اور ان کی خطرناک ذمہ داری

بہر حال، ہم خداوند عالم کے معین کردہ وظیفہ اور ذمہ داری کے تحت موظف ہیں کہ حتی المقدور اسلامی عظمت کو بیان کریں اور فکری دینی انحرافات سے لوگوں کو روکیں، اور اس چیز کی طرف بھی اشارہ کریں کہ بعض احباب اور خیر خواہ حضرات فکر کرتے ہیں کہ اس سیاسی و اجتماعی زمانے میں ان بحثوں کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے! یہاں تک کہ بعض حضرات کا تصور یہ ہے کہ ان باتوں کو چھیڑنا نقصان دہ ہے، کیونکہ ان سے افکار و عقائد متاثر ہوتے ہیں، ان حضرات کا تصور یہ ہے کہ ہم جس قدر

سعی و کوشش کر سکتے ہیں کریں کہ فکری و اعتقادی وحدت ایجاد ہو جائے، لہٰذا ان چیزوں سے پرہیز کریں کہ جن کی وجہ سے اختلاف وافتراق ہوتا ہے تو یہ معاشرے کیلئے زیادہ سودمند ہے۔

بعض حضرات خیر خواہی کی وجہ سے کہتے ہیں آپ ان بحثوں کو چھوڑ کر دوسری ضروری اور بہتر بحثوں کو معاشرے میں بیان کریں اور بلند مقامات کو حاصل کریں اور ایسے کام کریں جو آپ کے لئے بھی سودمند ہوں اور معاشرے کیلئے بھی مفید ہوں۔

ان حضرات (کہ جن میں بعض خیر خواہ بھی ہیں) کی خدمت میں عرض کریں کہ ہم بھی اس راستہ کو اچھا سمجھتے ہیں کہ جس میں عافیت و بھلائی ہو، اور ان لوگوں کے مزاج کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو واہ واہ کرتے ہیں، لیکن ہماری یہ شرعی ذمہ داری ہے کہ جس کو خداوند عالم نے ہم پر واجب کیا ہے البتہ یہ ذمہ داری سب سے پہلے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی ہے اور اسکے بعد علمائے کرام کی ذمہ داری ہوتی ہے اور واقعاً یہ راستہ بہت مشکل اور خطرناک ہے اور واہ واہ، سبحان اللہ سبحان اللہ کی جگہ تہمت، بہتان، بدگوئی اور کبھی کبھی جلاوطنی، زنداں اور قتل وغیرہ کو قبول کرتے ہیں، بہر حال اس راہ میں بہت سی مشکلات ہیں جیسا کہ ہمیں تاریخ میں انبیاء، ائمہ معصومین علیہم السلام نے ان کو برداشت کیا ہے لہٰذا ہم بھی اس راستہ پر قائم ہیں اگر چہ ہمارے دوست واحباً بھی ہم پر ملامت کریں، کیونکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ. [1]

"بے شک جو لوگ (ہماری) ان روشن دلیلوں اور ھدایتوں کو جنہیں ہم نے نازل کیا ہے اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ ہم کتاب (توراۃ) میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن پر خدا (بھی) لعنت کرتا ہے (اور) لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں"

جو حضرات اپنے حقائق سے آگاہ ہیں لیکن اپنے ذاتی یا کسی خاص گروہ کے نفع کی خاطر ان حقائق کو مخفی رکھتے ہیں ان پر خدا، ملائکہ اور اولیاً خدا کی لعنت ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بیان ہوا ہے:

إِذَا ظَهَرَتِ الْبِدَعُ فِي أُمَّتِي فَلْيُظْهِرِ الْعَالِمُ عِلْمَهُ وَإِلَّا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ. [2]

"جس وقت دین میں بدعت ہونے لگیں تو علماء پر واجب ہے کہ اپنے علم کو بیان کریں، اور لوگوں کو انحرافات سے روکیں، ورنہ اس پر خدا کی لعنت ہوگی"

لہٰذا ہمارے سامنے دو راستے ہیں یا تو ہم اپنے دوستوں کی ملامت اور دشمنوں کی تہمتوں کو برداشت کریں، اور خدا

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۱۵۹

[2] وسائل الشیعہ

کی رضایت حاصل کریں، یا لوگوں کی داد و تحسین کو پسند کریں اور خدا کی لعنت کے مستحق ہوں، لہٰذا ہم ترجیح دیتے ہیں کہ لوگوں کی تہمتوں اور بدگوئیوں کو برداشت کریں، لیکن ہم خدا کی لعنت کے مستحق نہ بنیں، لہٰذا ہم پر یہ اہم ذمہ داری ہے اور ہمارے لئے نیز دوسرے علماءٔ کیلئے ان مسائل پر بحث و گفتگو کرنا دوسری چیزوں سے زیادہ واجب ہے۔

ٹھیک ہے آج کل سرحدی علاقوں میں ہمارے لئے بہت سی مشکلات ہیں اور ہوسکتا ہے کہ آئندہ ہمارے لئے فوجی مشکلات کا سامنا ہو، ٹھیک ہے افغانستان میں طالبان کے ذریعہ کہ ہمارے سفارتخانہ کے ذمہ دار افراد اور 35 ڈرائیور گرفتار ہوں کہ جس کی وجہ سے ہماری ملت اور حکومت کو دکھ پہنچا، مظاہرے ہوئے اور بین الاقوامی سطح پر اس مسئلہ کو پیش کیا گیا، لیکن ان 40 یا 50 لوگوں کا دشمن کے ذریعہ گرفتار ہونے کا خطرہ ہماری یونیورسٹیوں میں ہزاروں جوان مسلمانوں کا امریکائی عناصر کے ذریعہ ان کے جال میں پھنسا زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

یعنی مغربی ثقافتی عناصر کے ذریعہ گرفتار ہونے کا خطرہ، چند ایرانیوں کا دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، اگرچہ وہ لوگ مشکلات میں ہیں لیکن ان کا اجر خداوند عالم کے نزدیک محفوظ ہے، لیکن اگر ہمارے جوان و نوجوان خصوصاً شہداء و اسیروں کے کی اولاد یونیورسٹیوں میں دین سے منحرف ہوجائیں تو پھر کیا کیا جاسکتا ہے؟ کیا فکری گرفتاری مزید خطرناک نہیں ہے؟ کیا اس سلسلے میں کسی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟

(ممکن ہے کوئی ہم کو مقصر ٹھہرائے اور کہے کہ آپ غلط سوچتے ہیں اگر انسان آزاد ہے تو پھر اس کو اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہئے، تو پھر ہمیں بھی حق ہونا چاہئے کہ ہم بھی اپنی رائے کا اظہار کریں چونکہ ہم بھی تقریباً 50 سال سے دینی علوم کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں اور ہم بھی اپنی رائے کا اظہار کرسکتے ہیں)

ہماری بحث یہ تھی کہ ہماری اس بات (کہ معاشرے میں اسلامی و الٰہی قوانین کو حاکم ہونا چاہئے) کے مقابلے میں بعض لوگوں شبہات و اعتراض کئے تھے اور ہم بھی اس چیز کی طرف اشارہ کیا تھا، بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ معاشرے میں اسلامی احکام کا جاری ہونا انسان کے مسلّم حقوق سے ہم آہنگ نہیں ہے، انسان کے مسلّم حقوق میں سے ایک آزادی ہے تو پھر فکر، دین، سیاست اور بیان میں آزادی ہونا چاہئے، طبیعی طور پر ہر انسان یہ حق رکھتا ہے کہ کسی بھی دین کو منتخب کرے، اور اس کو یہ اختیار ہے کہ اپنے دین کو بدل دے، اور اس کو یہ بھی حق ہے کہ اپنے نظریات و عقائد کی ترویج و تبلیغ کرے، اگر آپ یہ کہیں کہ اس ملک میں اسلامی قوانین کا حاکم ہونا ضروری ہے، تو بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو ان قوانین کو نہیں چاہتے، کیا ان کو حق ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کریں اور کہیں کہ ہم ان قوانین کو نہیں چاہتے، ظاہر ہے کہ جو لوگ دیں کے منکر ہیں ان کی طرف سے اس طرح کے سوالات پر کوئی تعجب نہیں ہے لیکن افسوس تو ان لوگوں پر ہوتا ہے کہ جو دیندار ہونے کا دم بھرتے ہیں اور اس طرح کے سوالات پیش کرتے ہیں یہاں تک کہ اپنے ساتھ اسلامی القاب بھی شامل کرتے ہیں یا خود کو امام خمینی کا پیرو کھلاتے ہیں!!

3۔ ملکی اخباروں میں مغربی غلط آزادی کی تبلیغ

حد تو یہ ہے کہ بعض اخباروں میں (کبھی مزاحاً اور کبھی حقیقتاً کبھی کسی کے قول کو نقل کرتے ہیں کبھی کسی لڑکے یا لڑکی کی طرف سے) لکھتے ہیں کہ کیوں صرف مرد کیلئے چند بیویوں کا رکھنا جائز ہے لیکن عورتوں کیلئے چند شوھروں کا رکھنا جائز نہیں ہے، یا یہ کہ کبھی کبھی مشورہ، پیش کیا جاتا ہے کہ چند مرد مل کر کسی ایک عورت سے شادی کر سکتے ہیں! توجہ رہے کہ یہ باتیں کسی کیمونسٹ ملک کے اخباروں کی نہیں ہے بلکہ جمہوری اسلامی ایران کے اخباروں میں ایسی باتیں لکھی جاتی ہیں! یا کسی ایک اسلامی یونیورسٹی میں اس طرح کی تقریر ہوتی ہے اور خود کو کسی اسلامی ادارہ سے منسلک ہونے کے اعتبار سے تقریر ہوتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ آج کل رہبری (ولی فقیہ) کی مخالفت، پیغمبر کی مخالفت میں کوئی حرج ہی نہیں بلکہ اگر چاہیں خدا کے خلاف بھی مظاہر کریں تو کوئی ایسا قانون نہیں کہ ان کو روک سکے! یہ باتیں اگر کسی غیر اسلامی یا کسی کافر و مشرک سے سنی جائیں تو کوئی جائے تعجب نہیں لیکن اگر یہی باتیں جمہوری اسلامی ایران، حاکیت اسلامی اور حاکیت ولایت فقیہ میں یونیورسٹیوں کے درمیان کی جائیں اور کوئی بھی ان کے مقابلہ کیلئے کھڑا نہ ہو تو واقعاً شرم آور ہے، اور اگر کوئی طالب علم اعتراض کرے تو اس کو اہمیت نہیں دی جاتی۔

اس وجہ سے ہم نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا، اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ واقعاً یہ چیزیں بدعت اور خطرناک ہیں اور اسلام کے مخالف ہیں اور اگر کوئی شخص اپنی تقریروں میں ایسی باتیں کرنا چاہتا ہے تو کم از کم اسلام کے نام سے ایسی باتیں نہ کرے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کیا ہے اور کفر کیا ہے اور ہر انسان اپنی مرضی کے مطابق اس کا انتخاب کرے، یہ آزادی دین اور آزادی بیان مغربی ثقافت کا ثمرہ ہے یہ ایسا انپورٹ پھل ہے کہ جو ظاہر میں بہت عمدہ اور میٹھا ہے لیکن اندر سے زہریلا ہے، یہ پھل مغربی ثقافت کے درخت کے مناسب ہے لیکن ہمارے اسلامی ثقافت سے اس صورت اور اس وسعت میں بالکل بے تکا ہے۔

مغربی ماحول اور کلچر کی عکاسی کرنے کے لئے ہمیں مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے کہ آج کل مغربی ممالک میں مذہب کو صرف ایک پارٹی کے نظریہ کی طرح دیکھا جاتا ہے مثلاً کسی ملک میں چند پارٹیاں ہوں اور وہاں کوئی نئی پارٹی وجود میں آئے، یا کوئی کسی دوسری پارٹی میں چلا جائے تو یہ کام ہمارے لئے باعث تعجب نہیں ہے، مذہب کے سلسلے میں بالکل اسی طرح کا ماحول مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں موجود ہے جہاں ہر روز ایک نیا مذہب اور نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے یہ مسئلہ واقعاً ہمارے لئے باعث تعجب ہے، تقریباً سو سال پہلے ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام "باب" تھا اس نے دعویٰ کیا کہ "میں ایک نیا اسلام لے کر آیا ہوں، اور میں شیعوں کا امام زمانہ ہوں جس نے ظہور کر لیا ہے" اس بات پر سب کو تعجب ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ایک نیا مذہب لے کر آئے (البتہ ایران سے باہر خصوصاً امریکہ میں اس باطل و بے بنیاد مطلب کو جدید اسلام کے نام سے ترویج کیا جاتا ہے، اور وہاں کوئی جائے تعجب نہیں ہے) لیکن امریکہ، کناڈا اور یورپی ممالک میں ہر سال چند جدید مذہب اور فرقے پیدا ہوتے ہیں، مثال کے طور پر عیسائیت کہ اصل مذہب ارنوڈوکس، کاتولیک اور پروٹستان ہیں لیکن صرف پروٹستان کے پانچ سو

سے زائد فرقے مغربی مالک میں موجود ہیں۔

جس وقت ہم نے سال گذشتہ امریکہ لاتین کا سفر کیا تو ہم نے دیکھا کہ امریکہ میں کئی نئے مذہب وجود میں آچکے ہیں اوران کے مبلغ تبلیغ کرنے میں مشغول ہیں، وہاں اس طرح کے مسائل ہوتے رہتے ہیں جب کسی اخبار میں اعلان ہوتا ہے کہ ایک نیا فرقہ پیدا ہو چکا ہے اور اس جدید فرقہ کا کشنیس (اس مذہب کا عالم) پیدا ہو چکا ہے اور اس کی کلیسا بن چکی ہے تو وہاں کوئی تعجب نہیں ہوتا، اور لوگ بھی بہت آسانی سے اس فرقہ میں شامل ہو جاتے ہیں، اسی کو "مذہب کی آزادی" کہا جاتا ہے۔

4۔اسلامی پروٹسٹانیزم، اسلام پر ایک حملہ

بعض لوگوں کی توقع اور امید یہ ہے کہ اسلامی جمہوری ایران میں بھی مذہب جیسی آزادی ہونا چاہئے اس بنا پر بہت سے لوگوں نے مشورہ پیش کیا کہ اسلام میں بھی ایک مذہب پروٹسٹانیزم ہونا چاہئے ہماری اصطلاح کے مطابق اس مشورہ کو سب سے پہلے فتح علی آخوندزادہ (آخونداف) نے پیش کیا، اس کے بعد دوسرے دانشمند نے بھی اپنی اپنی تقریروں میں اس مسئلہ کو بیان کیا، بعض مورخوں، رائیٹروں نے اپنی کتابوں میں لکھا اور مشورہ پیش کیا کہ اسلام میں بھی ایک پروٹسٹانیزم ہونا چاہئے، اور آج کل امریکہ میں اس طرح کی تبلیغات ہوتی رہتی ہیں کہ ایران میں بھی ایک دوسرا "مارٹن لوتر" پیدا ہو جو ایک نیا پروٹسٹاں اور جدید اسلام کو تشکیل دے، تاکہ آج کی اس ماڈرن زندگی کے مناسب ہو اور یہ 1400 سال پرانا اسلام آج کی زندگی کیلئے مناسب نہیں ہے اگر امریکہ ایسا مشورہ پیش کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

کیونکہ ان کا مقصد اسلام کو ختم کرنا ہے خود ان کے کہنے کے مطابق انہوں نے اس سلسلے میں پروگرام بنا رکھے ہیں اور اس کے لئے مخصوص کوٹہ بھی معین کر رکھا ہے اور بارہا اس چیز کا اقرار بھی کیا ہے کہ اس زمانے میں ان کا اصلی دشمن اسلام ہے لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کی تبلیغات کا اثر آہستہ آہستہ ہمارے ملک میں بھی ہوتا جا رہا ہے، اور بعض لوگ ایسے ملتے ہیں جو اخباروں اور ماہانہ رسالوں میں اسلام کے ضروری مسائل پر اعتراض کر ڈالتے ہیں مثال کے طور پر کیوں ارث میں مرد وعورت کا حصہ برابر نہیں ہے یا یہ کہ عورت چند شوہر کیوں نہیں رکھ سکتی وغیرہ وغیرہ اور کبھی کبھی تو اسلام کے ضروری احکام کا مذاق بناتے ہیں۔

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ انقلاب کے شروع میں جب قصاص کے بارے میں بحث ہوئی تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ قصاص کی بحث انسانیت سے دور ہے، اس وقت امام خمینیؒ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی جانتے ہوئے ایسی باتیں کرتا ہے تو ان کی مسلمان بیویاں ان پر حرام ہیں، اور انکا مال مسلمان ورثاء میں تقسیم ہوگا، لیکن ان کی جان قابل احترام نہیں ہے، البتہ ارتداد کے احکام صرف قصاص کے منکر میں منحصر نہیں ہیں، لیکن اگر کوئی اسلام کے کسی بھی ضروری حکم کا انکار کرے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ بغیر کسی شرم وحیاء کے اخباروں، رسالوں یہاں تک کہ کبھی ان اخباروں کے ذریعہ کہ جو بیت المال سے نکلتے ہیں، ایسی باتوں کو کہتے ہیں اور اسلام کے ضروری احکام کا انکار کرتے ہیں۔

واقعاً کوئی ہونا چاہیئے جوان لوگوں کو یاددہانی کرے کہ امام خمینی کا نظریہ صرف قصاص کے منکروں سے مخصوص نہیں ہے (بلکہ ہر اس شخص کو شامل ہے جو اسلام کے کسی بھی ضروری احکام کا منکر ہو) اور کبھی کبھی تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ مسائل جو شیعہ و سنی دونوں فرقوں میں متفق علیہ ہیں اور سنیوں نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی، ان پر بھی اعتراض کرتے ہیں یا ان کا مذاق بناتے ہیں!

کیا باصلاحیت مراجع اس طرح کے مسائل کی تحقیق و بررسی کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں؟ یا کم از کم یہ ضروری نہیں کہ کوئی یاددہانی کرائے کہ ایسا خطرہ آئندہ کی نسل کیلئے موجود ہے؟ جن لوگوں نے امام خمینی کے بیان کو نہیں سنا ہے، اور ان کے درس میں شرکت نہیں کی ہے کیا ان کیلئے خطرہ نہیں ہے کہ وہ جمہوری اسلامی ایران کے اخباروں میں لکھے گئے ان مطالب کے تحت تاثیر قرار پائیں اور سوچیں کہ ان نظریات سے ہماری اسلامی حکومت بھی متفق ہے اور یہ اسلامی نظریات ہیں؟ کم از کم کوئی تو ہو جواُن کو بتائے کہ ان نظریات کا اسلام سے کوئی ربط نہیں ہے۔

بہرحال یہ نظریہ واقعاً خطرناک ہے کہ دین ایک طرح کا سلیقہ ہے اور انسان جس دین کو چاہے انتخاب کرے، اور اس کو عوض کرنا چاہے تو عوض کرلے، مغربی ممالک میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک جوان اپنے دوست کے ساتھ کسی ایک کلیسا میں جاتا ہے اور اس کا دوست کہتا ہے کہ میں فلاں کلیسا کو بہت دوست رکھتا ہوں جس کے نتیجہ میں وہ اپنے مذہب کو بدل دیتا ہے اس کا دوست بھی تحت تاثیر قرار پاتا ہے اور اپنے دوست کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی اپنا مذہب بدل لیتا ہے کیا مذہب ایک لباس کی طرح ہے، کہ جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا بدل لیا یا اس کا ماڈل عوض کرلیا، اسلام کی بنیاد اس چیز پر نہیں ہے کہ انسان کی سعادت وشقاوت دلخواہ اور مختلف طریقوں سے حاصل ہو سکے، تاکہ یہ نتیجہ نکل سکے کہ دین ایک طرح کا سلیقہ ہے کبھی یہ دین کبھی دوسرا دین، کبھی وہ مذہب جس کو بھی چاہو انتخاب کرلو، اور حکومت بھی لوگوں کو اس طرح کی آزادی دے، اسلام دین کو زندگی کا اہم مسئلہ مانتا ہے اور دنیا و آخرت کی سعادت وشقاوت کو صحیح دین کے انتخاب کرنے میں جانتا ہے۔

لہٰذا اس طرح کی گفتگو کرنے میں یہ خطرہ موجود ہے کہ جس کو احساس کرتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں افسوس کہ بعض لوگ غفلت کرتے ہیں یا خود کو غافل بنا لیتے ہیں، اب ان بحثوں کو بیان کرنے کی وجہ ہمارا ان انحرافات سے مقابلہ کرنا اور اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنا ہے۔

5۔حق مسلّم کا مفہوم حقیقی

یہاں پر اس مسئلہ کی وضاحت کرنا بہت ضروری ہے کہ طبیعی اور حق مسلم سے کیا مراد ہے؟ اور آزادی کس معنی میں انسان کا حق مسلم ہے؟ جن ضروریات کا انسان کی طبیعت تقاضا کرتی ہے اس کو حق طبیعی کہا جاتا ہے لہٰذا گفتگو کرنا، اپنی رائے کا اظہار کرنا یہ انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے اور کسی کو بھی اس کو منع کرنے کا حق نہیں ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ کھانا پینا انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے بلکہ انسان کا سب زیادہ طبیعی ترین حق کھانا پینا ہے لیکن

صرف اس وجہ سے کہ کھانا پینا انسان کا حق طبیعی ہے تو کیا وہ دوسروں کے مال کو کھا سکتا ہے؟ اور کیا کسی بھی قانون کو یہ معین کرنے کا حق نہیں ہے کہ کونسی چیز کھانا حلال ہے اور کون سی چیز کا کھانا حرام ہے؟ کس کے مال کو کھا سکتا ہے اور کس کے مال کو نہیں کھا سکتا، کیا کوئی عقلمند انسان اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ انسان آزاد ہے اور اپنی مرضی سے جو بھی چاہے کھائے کسی کا بھی مال ہو اس کو تناول کرے؟ اس طرح گفتگو کرنا بھی ہر انسان کا مسلم حق ہے لیکن اس کو یہ حق نہیں کہ جو بھی منہ میں آجائے وہ بکتا پھرے، جس طرح قانون کو یہ اجازت ہے کہ وہ یہ کہے کہ کیا کھائے اور کیا نہ کھائے؟ جس طرح دین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ کہے کہ خنزیر کا گوشت یا الکحل والی چیزوں کو نہ کھائے، جبکہ کھانا پینا انسان کا طبیعی حق ہے، گفتگو کے بارے میں بھی اس طرح ہے گفتگو کی قسم، زمانہ اور جگہ سب قانون معین کرتا ہے جس کو تقریباً تمام دنیا نے قبول کیا ہے لیکن مغربی حضرات دین کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ جو چاہیں کہیں کیونکہ دین ایک ذاتی امر اور ایک سلیقہ ہے انسان کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی ربط نہیں ہے بلکہ انسان کے خدا سے رابطہ کا نام دین ہے، اور خدا سے یہ رابطہ مختلف طریقوں سے ہوسکتا ہے، انسان کوئی بھی طریقہ اپنا سکتا ہے۔

یہ دین بھی صراط مستقیم ہے اور وہ دین بھی صراط مستقیم ہے، بت پرستی بھی صراط مستقیم ہے اور اسلام بھی صراط مستقیم ہے!! لیکن اسلام کا یہ نظریہ نہیں ہے، کس اسلام کا، اس اسلام کا جس کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 1400 سال پہلے لے کر آئے تھے نہ کہ "باب" اور "مارٹن لوتر" جیسے کذاب لوگوں کا اسلام، پھر ہم تو اس اسلام کی بات کرتے ہیں جس کو حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

6۔ اسلام کی حقیقی قرائت اور اس کا صحیح مطلب

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بھی اس اسلام کو مانتے ہیں، لیکن اس اسلام کی مختلف قرائتیں ہیں آپ ایک قرائت کو بیان کرتے ہیں، تو کچھ لوگ دوسری قرائت بھی بیان کرتے ہیں، یہ نظریہ بھی مغربی ثقافت کا ایک ثمرہ ہے کہ اسلام کیلئے مختلف قرائت کے معنی کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ کینیڈا میں چند سال پہلے عیسائیت کا ایک فرقہ بنا، اور اس فرقے کے پاپ سے سوال کیا گیا کہ ہم جنس بازی کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا تھا کہ اس وقت تو میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا لیکن میرا یہ مشورہ ہے کہ انجیل کو دوبارہ پڑھا جائے! کیونکہ تورات وانجیل میں اس کا کام کی سخت مذمت کی گئی ہے جس طرح اسلام نے بھی اس کی مذمت کی ہے، جب اس سے سوال ہوا کہ تو اس مقدس کتاب کا احترام کرتے ہیں آپ اس بارے میں اپنی نظر بیان کریں؟ وہ اگرچہ ہم جنس بازی کا حامی تھا لیکن صاف صاف بیان نہیں کر سکتا تھا تو اس نے جواب دیا انجیل کا پھر سے مطالعہ کرنا چاہئے!!

اس طرح یہ لوگ بھی کہتے ہیں کہ اسلام اور قرآن کی دوبارہ قرائت کی جائے، ان کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ ہم لوگ شیعہ وسنی علماءؒ کی 1400 سال پرانی قرائت کو معتبر جانتے ہیں ہم جس اسلام کا دم بھرتے ہیں یہ وہی اسلام ہے کہ جس کی آئمہ معصومین علیہم السلام نے قرائت کی ہے اور ان ہی کی اتباع میں 14 صدی کے علماء نے اسلام کی قرائت کی ہے، یہی

قرائت ہمارا معیار وملاک ہے، اور اگر اسی اسلام میں جدید قرائت پیدا ہو جائیں اور ان کی بنا پر اسلامی احکامات بدل دیئے جائیں تو ہم اس اسلام کو نہیں مانتے، اور نہ ہی ایسے اسلام کو پسند کرتے ہیں اور ہماری نظریہ کے مطابق کوئی بھی عقلمند مسلمان "پاپ" اور "مارٹن لوتھر" جیسے افراد کا اختراع کئے ہوئے اسلام کو پسند نہیں کرے گا۔

ہم جس اسلام کو مانتے ہیں اور اس کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اس کے منابع قرآن، سنت پیغمبر و آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں، جنھیں شیعہ اور اہل سنت فقہاء چودہ سو سال سے بیان کرتے آرہے ہیں، خصوصاً وہ احکام کہ جن میں شیعہ سنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ اسلام ہم سے کہتا ہے کہ جس طرح کھانے پینے میں قوانین کی رعایت ضروری ہے اسی طرح گفتگو کرنے میں بھی قوانین کی رعایت ضروری ہے اسلام کوئی لباس تو ہے نہیں کہ جس کو آج پہنا اور دوسرے دن اتار پھینکا، دین کے سلسلے میں تحقیق و جستجو کرنا ضروری ہے اور دین حق کو قبول کرنا چاہئے۔

اسلام کے دامن میں اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کیلئے اتنی دلیلیں موجود ہیں کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نہیں سمجھ سکا کہ کون سا دین حق ہے؟ مگر یہ کہ کوئی صحیح طریقہ سے تحقیق و مطالعہ نہ کرے، اگر کوئی "میکرونیزی جزائر" کا رہنے والا یہ کہے کہ مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح نہیں ہوسکی ہے، تو شاید اس کی یہ بات قبول کرلی جائے لیکن اگر کوئی 1400 سالہ اسلامی تاریخ کے بڑے بڑے علماء اسلام کی مہم ترین کتابوں کے ہونے کے باوجود بھی یہ کہے کہ میں اسلام کو نہیں پہچان سکا تو کوئی بھی اس کی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

بہر حال جس اسلام کو ہم مانتے ہیں وہ یہ کہتا ہے کہ جس طرح آپ نے کھانے پینے کی چیزوں کی حد بندی کر رکھی ہے اسی طرح گفتگو کرنے میں بھی قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہے، یعنی کسی کو یہ حق بالکل نہیں ہے کہ جو چاہیں کہہ ڈالیں، بلکہ اسلامی قوانین کے تابع ہونا ضروری ہے، اگر اسلامی قوانین کے برخلاف عمل کیا تو آپ کا یہ کام اسلامی معاشرے کیلئے نقصان دہ ہے، جس طرح آپ حضرات بھی جانتے ہیں کہ گمراہ کنندہ اور کتب ضالہ کی خرید و فروخت حرام ہے، اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ جن لوگوں میں حق و باطل کے شناخت کی صلاحیت نہیں ہے وہ کسی بھی کتاب کو خریدیں اور پڑھنا شروع کردیں، ہر کس و ناکس کی تقریروں کو سنیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صاف صاف ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖ..... [1]

"اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں بے ہودہ بحث کررہے ہیں تو ان (کے پاس) سے ٹل جاؤ یہاں تک کہ وہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات میں بحث کرنے لگیں"

یا مومنین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے جو لوگ دین پر اعتراض کرتے ہیں ان کی صحبت میں نہ بیٹھو:

وَقَدۡ نَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکۡفَرُ بِہَا وَیُسۡتَہۡزَاُ بِہَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا

---

[1] سورۂ انعام آیت ۶۸

مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ۔[1]

"(مسلمانو) حالانکہ خدا تم پر اپنی کتاب قرآن میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سن لو کہ خدا کی آیتوں کا انکار کیا جاتا ہے اور اس سے مسخرا پن کیا جاتا ہے تو تم ان (کفار) کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں غور کرنے لگیں ورنہ تم بھی اس وقت ان کے برابر ہو جاؤ گے اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا تمام منافقوں اور کافروں کو (ایک نہ ایک دن) جہنم میں جمع ہی کرے گا"

بس وہ لوگ جو اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن اسلام کے دشمنوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اور اسلام کے دشمنوں کی باتوں کو رائج کرتے ہیں یہ وہی منافقین ہیں جن کا ٹھکانہ بھی کافروں کی طرح جہنم ہے، ایک بار پھر تاکید کرتا ہوں کہ اسلام فرماتا ہے:

جاؤ اور حقیقت کو تلاش کرو اس کے بعد دشمنوں سے بحث کرو اور اسلام کے تعلیم شدہ حقائق کے ذریعہ ان کو مغلوب کرو، لیکن جب تک تم میں اتنی صلاحیت نہ ہو کہ اسلامی عقائد سے اچھی طرح دفاع کر سکو، تو پھر تم گمراہ اور انسانی شیاطین کی ہم صحبت نہ ہو، اس کشتی گیر کی طرح کہ جس کو پہلے تمرین اور پریکٹس کرنا ہوتی ہے تب وہ کشتی کے میدان میں اترتا ہے اور کشتی لڑتا ہے اور وہ جوان کہ جس نے ابھی تک تمرین نہیں کی ہے وہ کس پہلوان سے کشتی نہیں لڑ سکتا، چونکہ پہلوان اس کو ذرا سی دیر میں زمین پر دے مارے گا، اور اس کی ھڈیاں ٹوٹ جائیں گی، یہ آزادی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ اپنے جوانوں کو ایک نصیحت ہے کہ پہلے اسلامی علوم اور اسلامی معارف کو حاصل کریں، اس کے بعد دشمن سے بحث کریں۔

بہر حال جس اسلام کو ہم پہچانتے ہیں اس کی آزادی محدود ہے، اور اس نظریہ کا مخالف ہے کہ جب گفتگو کرنے کو انسان کی طبیعت تقاضا کرتی ہے لہٰذا گفتگو کرنا آزاد ہو ورنہ تو انسان کی دوسری خواہشات بھی ہیں اور وہ بھی انسان کے طبیعی حق میں شمار ہوتی ہیں مثلاً جنسی خواہشات کھانا پینا ان میں بھی کوئی محدودیت نہیں ہونا چاہئے، جس طرح کھانے پینے میں محدودیت کا قائل ہونا کسی بھی عقلمند انسان کو قابل قبول نہیں ہے گفتگو کرنے میں بھی اس طرح ہے، لہٰذا چونکہ گفتگو انسان کی فطرت کا تقاضا ہے اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ کوئی حد و قانون نہ ہو لہٰذا عقل اور دین ان حدود کو بیان کرنے میں اور اس کی حدیں معاشرے کی مادی اور معنوی مصالح ہیں کہ جن کو دین نے بیان کر دیا ہے۔

7۔ شرعی آزادی

شاید آپ حضرات نے اخباروں میں پڑھا ہو کہ بعض لوگوں نے ہماری باتوں پر اعتراضات کرتے ہوئے کہا ہے کہ فلاں صاحب مغالطہ کرتے ہیں، ہم آزادی کو مطلق نہیں کہتے ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کچھ جائز آزادی ہونا چاہئے۔

---

[1] سورۂ نسا آیت ۱۴۰

ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ جائز آزادی سے آپ کی مراد کیا ہے؟ کیا آپ کی مراد وہ چیز ہے کہ جس کو شرع پسند کرتی ہے ملت میں مشروع کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں:

1۔ مشروع یعنی جس کو شریعت نے جائز کیا ہے (البتہ آپ کی مراد یہ ہونا مشکل ہے کیونکہ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ شریعت کے زیادہ پابند نہیں ہوتے) بہر حال اگر مشروع کا مطلب یہ ہے کہ جس کو شرع پسند کرتی ہو تو اسی کو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ آزادی شرعی قوانین کے تحت ہونا چاہئے۔

2۔ مشروع کے دوسرے معنی از لحاظ قانون جائز ہو اس معنی کے لحاظ سے بھی جیسا کہ ایران کے قانون اساسی میں بیان ہوا ہے قانون کو اسلام کے موافق ہونا چاہئے، ہمارے قانون اساسی اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ تمام قوانین واحکام اسلام کے موافق ہونا چاہیں، اور قانون اساسی میں فقہائے شورائے نگہبان کا فلسفہ ہی یہی ہے کہ وہ قوانین جو پارلیمنٹ میں بنائے جا چکے ہیں ان کی تحقیق کریں کہ یہ قوانین اسلام کے موافق ہیں یا نہیں؟ کیونکہ پارلیمنٹ کے تمام ممبران (اقلیت کے نمائندوں کے علاوہ کہ ان کے حقوق بھی محفوظ ہیں) مسلمان، مومن اور متقی ہیں، لیکن ممکن ہے کہ یہ ممبران کبھی کبھی غفلت کر بیٹھیں اور اس قانون کو اپنی رائے دیں کہ جو اسلام کے مخالف ہو، یعنی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین شورای نگہبان میں جانچے جائیں کہ یہ قانون، قانون اساسی اور اسلامی نقطہ نظر سے موافق ہیں یا نہیں؟ اور شورائے نگہبان پارلیمینٹ کے بنائے قانون کی تائید کرتے ہیں اور شورای نگہبان کے حقوق دان مشورت قانون اساسی سے موافق ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

اگر ہمارا قانون اساسی قانون کے اسلامی ہونے کو ضروری نہ سمجھے تو پھر شورائے نگہبان کا کیا مطلب؟ اور یہ سب تاکید حاکیت اسلام اور ولایت فقیہ کا قانون اساسی میں ہونے کا کیا مطلب؟ اس وقت کوئی جائے تعجب نہیں کہ کوئی حقوق دان کے عنوان سے کہے چونکہ قانون اساسی کہتا ہے آزادی کی رعایت کی جائے تو پھر کوئی بھی اس آزادی کو محدود نہیں کر سکتا، قانون اساسی کہتا ہے کہ آزادی مشروع ہو یا نا مشروع؟ اور آپ کہتے ہیں مشروع آزادی؟ مشروع آزادی یعنی کیا؟ اگر مشروع شرع سے بنا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آزادی جس کو شرع اجازت دیتی ہو اور اگر مشروع قانون ہو تو پھر بھی قانون اساسی کے مطابق وہ آزادی کہ جن کو شرع اور قانون نے تائید کیا ہو مشروع اور جائز آزادی ہیں۔

8۔ دین اور قانون آزادی کو محدود کرتے ہیں۔

آزادی قانون کے مافوق نہیں ہوسکتی، لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ آزادی دین اور قانون سے بالاتر ہے، تو پھر ان سے ہمارا یہ سوال ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر دین اور قانون کس لئے ہیں؟ حقیقت قانون کیا ہے؟ کیا قانون اس کے علاوہ ہے کہ کہے فلاں پروگرام خاص قوانین کے تحت ہو، فلاں کا انجام دیں اور فلاں کام انجام نہ دیں۔

مجبوراً گذشتہ مطالب کی یاددہانی کرنا ضروری ہے کہ ہر قانون صاف صاف یا اشارہ کے طور پر یہ کہتا ہے کہ انسانی کردار کو محدود ہونا چاہئے اور خاص دائرے میں انجام پائیں، لہٰذا قانون کا کام ہی آزادی کو محدود کرنا ہے، اگر دین اور قانون

آزادی کو محدود کرنے کا حق نہ رکھتے ہوں تو پھر دین اور قانون کا ہونا بے کار ہے، چونکہ دین اجتماعی وسیاسی مسائل پر مشتمل ہوتا ہے اور انسان کے اجتماعی وسیاسی امور کو محدود کرتا ہے اور دین کا حکم ہوتا ہے کہ یہ امور خاص قوانین کے تحت انجام پائیں اور اگر دین کے معنی اس کے علاوہ ہوں تو پھر دین کی کیا ضرورت ہے؟

اگر دین اس وجہ سے آیا ہو کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام کرے تو پھر دین کا کیا فائدہ؟ دین کی جایگاہ ومقام کہاں ہے؟ دین کا وجود بالفاظ دیگر قانون انسان کی آزادی کو محدود کرتے ہیں، لہٰذا آزادی کو دین اور قانون سے اوپر کہنا باطل ہے۔

جی ہاں ممکن ہے کہ بعض حضرات دین کی وجہ سے مشروع آزادی سے بھی روکیں اور جس چیز کو خدا نے حلال کیا ہے خرافات وقومی رسم ورواج کی وجہ سے حرام قرار دیں، جیسا کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج بھی ہمارے ملک کے مختلف مقامات پر بعض قومیں اور عشائری قوموں میں کہ جس نے خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کر رکھا ہے، اور اسی طرح ہمارے معاشرے میں اب بھی خدا کی حلال کردہ چیزوں کو برا سمجھا جاتا ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت سی جنسی برائیاں ختم ہو جاتیں، حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

لَوْلَا مَا سَبَقَ من ابن الخطاب فی المتعة ما زنا الا شقی۔۔۔[1]

"اگر عمر متعہ کو حرام نہ کرتا تو کوئی بھی زنا نہ کرتا مگر یہ کہ شقی ہو"

افسوس کہ ابھی بھی اس حلال خدا کو برا سمجھا جاتا ہے جو بہت سی مشکلات کو ختم کرنے والا ہے ہاں اگر کوئی شخص دین کے نام پر خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنا چاہے، تو یہ کام بھی برا ہے نہ صرف یہ کہ برا ہے بلکہ حرام اور بدعت ہے، جس طرح اس کے برعکس خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنا بھی بدعت ہے:

اِنَّ اللهَ يُحِبُّ اَنْ يُؤْخَذَ بِرُخَصِهٖ كَمَا يُحِبُّ اَنْ يُؤْخَذَ بِعَزَائِمِهٖ۔[2]

خداوند عالم جس طرح دوست رکھتا ہے کہ لوگ مباح اور حلال کردہ چیزوں سے فیض اٹھائیں اسی طرح دوست رکھتا ہے کہ واجبات کو انجام دیں اور محرمات کو ترک کریں۔

تو معلوم یہ ہوا کہ دین یا قوم کے نام پر خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے، اور آزادی کو اس طرح محدود کرنا حرام وبدعت ہے، اور کوئی بھی اس کا موافق نہیں ہے لیکن اگر اس آزادی سے مراد نامشروع آزادیاں ہیں تو کسی کو یہ توقع نہیں ہونی چاہئے کہ دین نامشروع آزادی کی بھی مخالفت نہ کرے!

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ آزادی دو حال سے خالی نہیں: یا مشروع ہیں، یا نامشروع، اگر مشروع ہیں تو دین نے ان کو

---

[1] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج12، ص253

[2] بحار الانوار، ج69، ص360

جائز قرار دیا ہے، اور اس کی کوئی مخالفت نہیں کی ہے، اور پھر یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ دین اور قانون کو یہ حق نہیں ہے کہ معاشرے سے مشروع آزادی کو بھی چھین لے، اور اگر کوئی دین اس کی اجازت دے تو پھر کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جس چیز میں ہم نے اجازت دی ہے اس کو انجام نہ دیں؟ یہ تو خود ایک تناقض ہے لیکن اگر آزادی نامشروع ہو، اور دین نے اس کو منع کیا ہو تو پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اس کو منع کرنے کا حق نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ایک طرح کا تناقض ہے۔

۹۔ آزادی کو محدود کرنے کی ضرورت

ہماری مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہم آزادی کو شریف چیز، خدائی عطا اور انسان کی معنوی و مادی ترقی کیلئے ایک شرط جانتے ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر انسان آزادی نہ رکھتا ہو اپنے اعتبار سے دین کا انتخاب اور اس پر عمل نہ کرے، تو پھر اس کے اعتقاد کی کوئی قیمت نہیں ہوگی، انسان کی ترقی اور کمال اسی میں ہے کہ دین کو اپنے علم کے ذریعہ انتخاب کرے، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی اشارہ ہوتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ... [1]

"دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے"

اجبار کا مطلب ہی یہی ہے، ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آزادی خداوند عالم کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے لیکن ہر نعمت سے استفادہ کیلئے بھی حد معین ہے:

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. [2]

"اور جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہ ہی لوگ تو ظالم ہیں"

اپنی حدود سے تجاوز کرنا شقاوت اور الٰہی نعمت کے چھن جانے کا سبب ہے، جو چیز انسان کی سعادت و کامیابی کا سبب ہے، اگر اس سے تجاوز کیا جائے تو پھر یہی چیز اس کیلئے شقاوت و بدبختی کا سبب بن جاتی ہے، جب انسان کھانے پینے میں حد سے بڑھ جائے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی مرنے کی نوبت بھی آجاتی ہے، جنسی شہوت کا ہونا بھی ایک خداداد نعمت ہے، وہ جب اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر معاشرے میں برائیاں پھیل جاتی ہیں اور کبھی کبھی معاشرے کی ھلاکت اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہونے کی باعث ہوتی ہیں۔ لکھنا، گفتگو کرنا بھی اس طرح ہے، ہمیں اس چیز کا حق نہیں ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ انسان کی طبیعت گفتگو کا تقاضا کرتی ہے لہٰذا جو چاہے کہیں، جبکہ ان تمام چیزوں میں حدود کی رعایت کرنا ضروری ہے، ٹھیک ہے کہ اسلامی حکومت کو لوگوں کو مشروع آزادی دینا ضروری ہے لیکن اسلامی حکومت کو بھی نامشروع آزادی کو روکنے کا حق ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

[2] سورۂ بقرہ آیت ۲۲۹

اٹھاروں کے بیان کردہ شبہات میں سے ایک شبہ یہ بھی ہے کہ ہم اور آپ (مولف) اس طرح گفتگو کر کے قانون اساسی اور قومی حاکمیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ قانون اساسی کے مطابق ہر انسان اپنی زندگی کے مالک ہیں اور اگر ان کو مجبور کیا جائے کہ فقط دین کی رعایت کریں تو پھر انسان اپنی زندگی کا مالک نہیں اور واقعا یہ شبہ بڑا ہی فریب دینے والا ہے۔

ہم ان کے جواب میں یہ عرض کرتے ہیں کہ کیا قانون اساسی میں صرف اس چیز کو بیان کیا گیا ہے؟ کیا اس قانون اساسی میں یہ نہیں ہے کہ حاکیت وحکومت کا مالک خدا ہے؟ کیا اس قانون میں یہ نہیں ہے کہ معاشرے میں وہ قانون جاری ہوں جو اسلام کے موافق ہوں؟ کیا یہ چیزیں قانون اساسی میں نہیں ہیں کیا صرف قانون اساسی میں یہی ہے کہ لوگ اپنی زندگی پر خود حاکم رہیں؟

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ قانون اساسی کی یہ دو باتیں آپس میں ٹکراتی ہیں لہٰذا ان کے لئے تفسیر اور کسی راہ حل کی ضرورت ہے، لیکن اگر واقعا غور کیا جائے تو یہ ان دو باتوں کو سمجھنا آسان ہے جب پہلی اصل میں یہ کہا جاتا ہے کہ حاکیت اور حکومت کا خدا مالک ہے اور دوسری اصل میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنی زندگی پر خود حاکم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ خدا کی حاکیت کے زیر سایہ دین زندگی پر حاکم ہیں، لہٰذا اسلامی معاشرے کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنا مذہب اور اپنا قانون ہم پر تھوپے، یعنی امریکہ کو اپنا قانون ہم پر نافذ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، ہمارے افراد خود اپنے لئے مفید قانون کو ووٹ دیں، اور ہمارے افراد نے ہی اسلامی قانون کو اپنا ووٹ دیا ہے۔

ایک شخص "اہواز یونیورسٹی" میں اپنی تقریر کے دوران کہتا ہے: اگر لوگ خدا کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہیں تو قانون کو ان کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے؟! کیا انسانوں کی حکومت کا یہی مطلب ہے؟ کیا قانون اساسی اس چیز کو کہتا ہے؟ اگر کوئی قانون اساسی کو نہ جانتے ہوئے اس طرح کی باتیں کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو خود کو قانون داں کہلاتے ہیں، لیکن پھر بھی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں!

ممکن ہے کوئی یہ کہے ہم نہیں مانتے کہ جو آپ کہتے ہیں وہی قانون اساسی ہے، تو اس کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر قانون میں کسی طرح کی پیچیدگی ہے تو اس کی مفسر شورائے نگہبان ہے اگر آپ اس قانون اساسی کو قبول کرتے ہیں تو بھی یہ قانون آپ کو تفسیر کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اور پیچیدگی اور تعارض کے حل کو بھی خود ہی معین کرتا ہے اگر آپ اسی قانون اساسی کو مانتے ہیں تو اس کی تفسیر شورائے نگہبان سے پوچھیے، وہ شورائے نگہبان جو اسلام و قانون اساسی کی محافظ ہے، اور یہ شورائے نگہبان احکام اسلامی کی محافظت کیلئے نہیں ہے، اس وقت اگر آپ کی تائید ہوتی ہے تو پھر آپ اسلام پر اعتراض کرنے میں حق بجانب ہیں۔

بہر حال جو کچھ ہم نے بیان کیا اسلام کے دشمنوں کے بعض شبہات تھے جو مکڑی کے جالے سے بھی ضعیف و کمزور ہیں، اور اسلام کے دشمنوں کے پاس ان سست اور کمزور باتوں کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

سولہویں نشست

قانون اور آزادی کے لحاظ سے الٰہی اور والحادی ثقافت میں فرق

1۔ انتخاب کی اہمیت اور ہدف تک پہنچنے کے لئے قوانین کی آگاہی اور رعایت

اسلام کے سیاسی نظریہ کے بارے میں بحث کے دوران مذکورہ نظریہ سے متعلق اصول موضوعہ اور مقدمات تمہیدکے سلسلے میں بہت سی چیزیں عرض کی، اور اس سلسلہ میں کئے گئے اعتراضات کا جواب بھی دیا، اس وقت بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مجموعی اعتبار سے اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں:

اسلامی نظریہ کے مطابق ہر موجود متحرک ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک ایسے مسافر سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو ایک جگہ سے اپنے سفر شروع کر کے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھ رہا ہے (اور یہی آخری منزل اس کی سعادت اور اخروی کمال ہے) زندگی کا طول وعرض ایک ایسے راستے کی طرح ہے کہ اصل مقصد تک پہنچنے کے لئے اس راستہ کا طے کرنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں آپ حضرات کے سامنے ایک مثال پیش کرتے ہیں، تاکہ یہ بات ہمارے جوانوں کے ذھنوں میں اچھی طرح بیٹھ جائے: فرض کریں ایک ڈرائیور کو تہران سے مشہد جانا چاہتا ہے لیکن اگر اس ڈرائیور کے ہاتھ پیر مفلوج ہو جائیں تو اس صورت میں یہ ڈرائیو ڈرائیونگ نہیں کرسکتا، یعنی ڈرائیونگ اس صورت میں کرسکتا ہے جب اس کا بدن اور دوسرے اعضاء صحیح وسالم ہوں، اور ان پر قدرت واختیار رکھتا ہو۔

یعنی جب وہ چاہے گاڑی کو دائیں بائیں موڑ دے یا ایکسیلیٹر یا بریگ کو دبا سکے، اسی طرح انسان اپنی زندگی کے کمال کو حاصل کرنے وترقی یافتہ بنانے میں بھی آزاد، اختیار، صاحب قدرت اور انتخاب کرنے والا ہے، ورنہ اس کمال کے راستہ پر گامزن نہیں رہ سکتا، اسی وجہ خداوند عالم نے انسان کو انتخاب واختیار کی قدرت دی ہے کہ اپنی مرضی سے اس راستہ پر قدم بڑھائے اور منزل مقصود تک پہنچ جائے، اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر انسان اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر کوئی شخص بغیر سوچے سمجھے اور بغیر اختیار کے اس کمال کے راستہ پر چلے اور مقصد تک پہنچنا چاہے، تو یہ اس کی غلط فہمی ہے، انسان کا آزاد ہونا اور قدرت انتخاب رکھنا ضروری ہے تاکہ اس راستہ کو طے کرسکے۔

انسان جتنا انتخاب میں آزاد ہوتا ہے اتنا ہی اس کا کام ارزشمند ہوتا ہے، لیکن جس طرح ایک صحیح وسالم ڈرائیور ہونے کے باوجود کوئی گارنٹی نہیں ہے وہ منزل مقصود تک پہنچ ہی جائے گا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بھول چوک یا جان بوجھ کر غلط راستہ

کا انتخاب کر بیٹھے، اور کسی جبر و اکراہ کے بغیر اپنے ہاتھوں سے اسٹیرنگ گھما کر اور اپنے پیروں کے ذریعہ اکسیلیٹر کو دبا دے اور گاڑی کو کسی کھائی میں گرا دے، لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ کسی مقصد کے لئے صرف انتخاب و اختیار کافی نہیں ہے، بلکہ علت تامہ کو حاصل کرنے کے لئے یہ شرط بھی ضروری ہے، یعنی ہماری اصطلاح کے لحاظ سے انسان کو سعادت اور کمال تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ راہنمائی کی علامتوں اور نشانیوں پر توجہ کرے اور ڈرائیورنگ کے تمام اصولوں کی صحیح رعایت کرے تاکہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔

اگر کوئی شخص یہاں پر یہ کہے کہ میں جسم و جسمانیت کے اعتبار سے طاقتور بھی ہوں اور صحیح انتخاب کرنے والا بھی ہوں، لیکن میرا دل یہ چاہتا ہے کہ ڈرائیورنگ کے اصولوں کے خلاف عمل کروں اور کسی کو میرے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس شخص کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ اس کے سفر کا نتیجہ ھلاکت ہے اور اس کا کسی کھائی میں گرنا یقینی ہے، لہٰذا انسان کو صحیح و سالم ہونے کے ساتھ ساتھ راستہ کا علم بھی ضروری ہے اور قوانین کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے۔

ٹریفک قوانین کی دو قسمیں ہیں:

1۔ کچھ ایسے قوانین ہیں کہ اگر ان کی رعایت نہ ہو تو خود ڈرائیور کو نقصان پہنچے گا، مثال کے طور پر اگر سڑک سے ہٹ کر چلے تو ممکن ہے کہ کسی کھائی میں گر پڑے، یا پل سے نیچے جا گرے، تو اس صورت میں اس کا نقصان خود اس کو یا اس کی گاڑی کو پہنچے گا، ایسے خطروں سے بچانے کے لئے ہوشیار کرنے والے بورڈ لگائے جاتے ہیں مثلاً خطرناک موڑ کا بورڈ، یا بائیں طرف ڈرائیورنگ کریں یا رفتار کم کریں وغیرہ، تاکہ ڈرائیور قوانین کے خلاف ڈرائیورنگ نہ کرے اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے صحیح و سالم اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

2۔ کچھ ایسے قوانین ہوتے ہیں کہ جن کی خلاف ورزی سے صرف ڈرائیور کو ہی کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ دوسروں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اور کبھی کبھی ایسے حادثات رونما ہوتے ہیں کہ سیکڑوں لوگوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔

کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض "ھائی وے" یا بڑے بڑے چوراھوں پر خصوصاً دوسرے ممالک میں کہ جہاں تیز رفتار سے گاڑی چلانا جائز ہے، بعض خلاف ورزیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیکڑوں گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں کہ جن میں بہت سے لوگوں کی جان چلی جاتی ہے، آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ جرمنی میں 150 گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں، ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر صرف احتیاط کی رعایت اور ہوشیار ہونے والی نشانیوں پر ہی اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ ریڈ لائٹیں (لال بتی) یا ہوشیار رہنے والے کی بڑے بڑے بورڈ لگائے جاتے ہیں، اور بعض جگھوں پر پولیس کو الکٹرونیک آنکھیں اور مختلف ویڈیو کیمرے لگانے پڑتے ہیں تاکہ خلاف ورزی کرنے والے ڈرائیوروں کو پکڑ کر ان کا چالان کر کے سزا دی جاسکے، خلاف ورزی کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے گاڑی سڑک سے نیچے اتر جاتی ہے اور الٹ پلٹ ہو جاتی ہے اور ڈرائیور وں کے ہاتھ پیر ٹوٹ جاتے ہیں اور کبھی کبھی مر بھی جاتے ہیں، اس صورت میں ڈرائیوروں کا چالان نہیں کیا جاتا کیونکہ نقصان

خود اسی کا ہوا ہے، لیکن اگر خلاف ورزی کے نتیجہ میں کسی دوسرے کو نقصان پہنچا ہے تو پھر پولیس ان کو پکڑ کر ان کے خلاف کاروائی کرتی ہے۔

2۔ اخلاقی اور حقوقی قوانین میں فرق

انسان کی زندگی میں دو طرح کے خطرے لاحق ہیں:

1۔ وہ خطرہ جس کا تعلق صرف ہم سے ہوتا ہے، کہ اگر قوانین کی رعایت نہ کریں تو خود ہم کو نقصان پہنچتا ہے، در حقیقت قوانین کی خلاف ورزی کا نقصان ذاتی اور شخصی ہے، اس موقع پر جو احکام وضع کیے جاتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کی تاکید ہوتی ہے اصطلاح میں ایسی چیزوں کو قواعد اخلاقی یا قوانین اخلاقی کہا جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا یا نعوذ باللہ تنہائی میں دوسرے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے کہ کوئی بھی اس کے گناہوں کو نہیں دیکھ پاتا تو ایسی صورت میں خود اس شخص نے اپنے اوپر ظلم کیا، لہٰذا کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے اور کوئی نہیں پوچھے گا کہ کیوں آپ نے تنہائی میں ایسا گناہ کیا ہے، ایسے موقعوں پر کسی کو حق بھی نہیں کہ کوئی اس کے کاموں کی تحقیق و جستجو کرے، کیونکہ انسان کے خصوصی کاموں میں تجسس (جاسوسی) کرنا حرام ہے۔

کیونکہ یہ کام خود اس کی ذات سے مربوط ہیں، اگرچہ اس کو اخلاقی نصیحت ضرور کی جاتی ہے، اور اس کے بارے میں حکم ہوتا ہے کہ کوئی شخص تنہائی میں گناہ یا گناہ کا تصور بھی نہ کرے، لیکن یہ نصیحتیں ان بورڈوں کی طرح ہیں جو سڑکوں پر ہوشیار اور متوجہ رہنے کے لئے لگائے جاتے ہیں، مثلاً لکھا جاتا ہے کہ آہستہ چلیں لیکن اس کی خلاف ورزی کرنے پر رفتار بڑھ جاتی ہے اور موڑ وغیرہ میں خود ڈرائیور کو نقصان پہنچتا ہے ایسی صورت میں پولیس اس کا پیچھا نہیں کرتی۔

2۔ وہ خطرہ ہے جس کا تعلق صرف اسی شخص سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر دوسروں تک بھی پہنچتا ہے اس صورت میں ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کو قوانین حقوقی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی اس خطرے کا اثر اس شخص پر بھی ہوتا ہے اور معاشرے پر بھی، نتیجۃً یہ قوانین اجرائی اس بات کی ضمانت رکھتے ہیں کہ اگر ان کی خلاف ورزی کی جائے تو خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف قانونی کاروائی ہو سکے، جس طرح ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر اس کے خلاف کاروائی ہوتی ہے، یہ وہ موقع ہے کہ جب اخلاقی قوانین کے مقابلہ میں حقوقی قوانین کی بات آتی ہے ان ہی حقوقی قوانین کے تحت جزائی و کیفری قانون میں آتے ہیں؛ یعنی یہ دائرہ علم حقوق اور قانون بنانے والے اداروں کے قوانین جن کی اجرائی ضامن حکومت ہوتی ہے ان سے کام پڑتا ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ اخلاقی اور حقوقی قوانین میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اخلاقی قوانین میں کوئی بھی شخص ضامن نہیں کہ ان کو عملی جامہ پہنائے، اگر کسی نے ان قوانین کی مخالفت کی تو اس کو سزا دی جائے اور اگر کسی کے خلاف کبھی کوئی کاروائی ہوتی بھی ہے تو اخلاقی خلاف ورزی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ حقوقی پہلو کی وجہ سے ہوتی ہے کہ جو قانون سے متعلق

ہے اور اگر کوئی مخصوص شکایت کرنے والا ہے تو حقوقی بمعنی خاص ہوگا ورنہ جزائی و کیفری ہوگا۔

بہر حال جس طرح ایک ڈرائیور اپنی اور مسافروں کی جان کو خطرات سے بچانے کی ذمہ داری رکھتا ہے اسی طرح انسان بھی ایک مسافر کی طرح ہے کہ ایک جگہ سے اپنا راستہ شروع کرتا ہے اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے بہت سے خطروں سے روبرو ہوتا ہے، یہ خطرات کبھی تو خود اسی سے مخصوص ہیں، کہ جن کے احکام خود اس کی ذات سے مربوط ہیں اور ان کے لئے اخلاقیاتی نصیحتیں موجود ہیں، لیکن اگر کسی موقع پر کسی دوسرے کے لئے خطرہ ہے یا کسی بھی طرح سے دوسروں کے عقائد کو خراب اور لوگوں کے جان مال اور ناموس پر تجاوز کرتا ہے تو پھر اس پر حقوقی قوانین جاری ہونگے کہ جن کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔

ہم نے جو ڈرائیور کی مثال پیش کی، کوئی مغرور ڈرائیور کہے کہ "میں تو آزاد ہوں، اور قوانین کی مخالفت کرتا ہوں" تو اگر خود اس کا نقصان ہے تو صرف اس کو نصیحت کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ احتیاط کرو دھیان رکھو، ورنہ آپ کی جان خطرہ میں ہے، لیکن اگر کسی دوسرے کی جان کا مسئلہ ہو تو پھر اس کو روکا جاتا ہے اور پولیس اس کا پیچھا کرتی ہے اور مختلف طریقوں (راڈار الکٹرونیک آنکھوں یا مختلف ویڈیو کیمرے) سے اس کو تلاش کرتی ہے اور اس کو سزا دیتی ہے، اس موقع پر کوئی نہیں کہتا کہ پولیس کا پیچھا کرنا انسان کی آزادی کے مخالف ہے، پوری دنیا میں کے عقلمند حضرات اس کو مانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لئے خطرہ پیدا کر رہا ہے تو اس کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے تاکہ خلاف ورزی کرنے والے کو روکا جاسکے، کیونکہ یہ آزادی مشروع اور قانونی نہیں، اس آزادی کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔

کیونکہ اس سے دوسروں کو خطرہ لاحق ہے، اس بات کو تمام ہی عقلاء مانتے ہیں، اور ہم کسی ایسے عقلمند انسان کو نہیں دیکھا کہ جو یہ کہے کہ انسان اپنی زندگی میں اس قدر آزاد ہے کہ جو چاہے کرے یہاں تک اپنی جان کے علاوہ دوسروں کی جان و مال اور عزت کو بھی نقصان پہنچائے، اس بات کو کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ قوانین کا ہونا ضروری ہے، اور معاشرہ کو بھی چاہئے کہ ان قوانین کو قبول کرے، اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اگر اختلاف ہے تو دین میں، کہ کیا دین میں اخلاقی قوانین کافی ہیں یا حکومتی قوانین کا بھی ہونا ضروری ہے؟ اور کیا اس سلسلہ میں کسی اجرائی ضامن کی ضرورت ہے، یا صرف اخلاقی نصیحتوں پر اکتفاء کی جاسکتی ہے؟

جو لوگ کہتے ہیں کہ حکومت ضروری نہیں ہے اور انسان خود ہی اخلاقی نصیحتوں کے ذریعہ تربیت پاسکتا ہے، اور اسے حکومت و قانون کی کوئی ضرورت نہیں، ! ہم ان کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے اور انسانی تاریخ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ کوئی معاشرہ صرف اخلاقی نصیحتوں کے ذریعہ ہدف تک نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا قانون و حکومت کا ہونا بہت ضروری ہے۔

3۔ الٰہی اور کفر و الحاد کی ثقافت میں فرق اور قانون کے بارے میں اختلاف نظر

یہاں تک یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قوانین کی ضرورت ہے، اختلاف یہاں سے

شروع ہوتا ہے کہ جو قانون آزادی کو محدود کرتا ہے اور کہتا ہے: "داہنی طرف چلو نہ کہ بائیں طرف، یا آہستہ چلو" تو اس قانون کو انسان کی آزادی کو محدود کرنے کا کہاں تک حق ہے؟

اس چیز کو سب مانتے ہیں کہ اگر دوسروں کی جان و مال خطرے میں ہو، تو قانون آزادی کو محدود کر دیتا ہے مثلاً اجازت نہیں دیتا کہ کسی پر اسلحہ نکال لو یا کسی کو جان سے مار ڈالو، ممکن نہیں ہے کہ قانون کسی کو حق دے کہ کسی کو بغیر دلیل کے قتل کر ڈالو!

اب جبکہ یہ مان لیا گیا کہ قانون اس آزادی کو محدود کرتا کہ جو دوسروں کے لئے نقصان دہ ہے، تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قانون گذار فقط انسان کی زمانی آزادی کو محدود کرتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی مادی منافع کو ضرر پہنچائے یا قانون گذاری کے وقت انسان کے معنوی اور روحی منافع کو بھی نظر میں رکھا جائے؟ اصل اختلاف اسی جگہ ہے۔

ہم فرہنگ وثقافت کو دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں: ایک الٰہی ثقافت کہ جس کا سب سے روشن نمونہ اسلامی ثقافت ہے کہ جس کو ہم مانتے ہیں اور ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ الٰہی ثقافت دین اسلام سے مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے آسمانی ادیان میں بھی یہ الٰہی ثقافت پائی جاتی تھی، اگر چہ ان میں تحریفات اور انحرافات پیدا ہو گئے، اس ثقافت کے مقابلے میں کفر والحاد یا غیر الٰہی ثقافت رائج ہوئی کہ آج جس کا نمونہ مغربی ممالک ہیں، البتہ توجہ رہے کہ مغرب سے ہماری مراد صرف جغرافیائی علاقہ نہیں ہے بلکہ اس ثقافت کو مغربی ثقافت کا نام اس وجہ سے دیتے ہیں کہ جو امریکہ اور یورپ میں رائج ہے، اور دوسرے ممالک بھی اس ثقافت کی حمایت کرتے ہیں، اور ان کی تمام تر کوشش اس کو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلانا ہے، لہٰذا آسان طریقہ سے سمجھانے کے لئے ثقافت کی دو قسم کرتے ہیں:

اول: الٰہی اور اسلامی ثقافت۔

دوم: غربی (الحادی) ثقافت۔

ہم یہاں پر ان دونوں ثقافتوں کے اہم فرق کو بیان کرتے ہیں:

4۔ مغربی ثقافت کے تین اہم رکن ہیں

یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی تمدن وثقافت تشکیل دینے کے لئے تین چیزیں بہت اہم ہیں، اگر چہ ان کے علاوہ بہت سی دوسری چیزیں بھی ہیں لیکن یہ تین چیزیں اس ثقافت کی جڑ ہیں:

پہلا رکن: "رومانیزم" ہے یعنی انسان کی زندگی میں ہر طرح کی خوشی، چین وسکون ہونا چاہئے اور بس، لفظ "اومانیزم" خدا پرستی اور دین پرستی کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے، اگر چہ اس سے دوسرے معنی بھی لئے جاتے ہیں کہ جن سے ہماری کوئی بحث نہیں ہے اور اس لفظ کے مشہور معنی یہ ہیں کہ انسان صرف اپنی اور اپنی لذتوں اور اپنی خوشی وراحتی کی فکر میں ہو، اور اگر کوئی خدا یا فرشتہ کا وجود ہے بھی تو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یہ اس نظریہ کے مقابلہ میں نظریہ ایجاد ہوا کہ جو درمیانی صدیوں

میں یورپ میں اور اس سے پہلے مشرقی زمین میں تھا کہ انسان کی اصل توجہ خدا اور معنویات پر ہوتی تھیں۔

یہ نظریہ رکھنے والے کہتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جائے ہم اس زمانے سے تھک چکے ہیں ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس زمانے کی کلیساؤں کی بحث کے بدلے اصل انسانیت کی طرف پلٹ جائیں اور انسان وطبیعت کے ماورائی خصوصا خدا کے بارے میں بحث نہ کریں؛ البتہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کا انکار کریں لیکن ان سے ہمارا کوئی مطلب بھی نہیں ہے اور ہمارا معیار انسان ہوتا ہے۔

اس اصل کو الٰہی ثقافت کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے، یہ الٰہی ثقافت کہتی ہے کہ "سب کچھ اللہ" ہے اور ہماری تمام تفکرات خدائی ہونا چاہئے اور ہماری تمام توجہ خدا کی طرف جا کر رکیں، اور اپنی سعادت وکمال کو خدا کے قرب میں تلاش کریں، کیونکہ تمام تر سعادتوں، زیبائیوں، اصالتوں اور کمالات کا وہی سرچشمہ ہے، پس اللہ محوری ہے، اور اگر "ایزم" لگانا ہی چاہتے ہیں تو یہ نظریہ "اللہ ایزم" ہے یعنی خدا کی طرف توجہ ہونا چاہئے، انسان کی طرف نہیں، یہ تھا الٰہی اور مغربی ثقافت کا پہلا فرق، (البتہ ہم یہ تاکید کرتے ہیں کہ مغرب میں بھی استثناء کے قائل ہیں اور وہاں بھی بعض لوگ معنوی اور الٰہی نظریہ کے قائل ہیں اور ہماری مراد وہاں کی اکثریت ہے کہ جس کو مغربی تمدن کہا جاتا ہے۔)

دوسرا رکن: غربی تمدن کا دوسرا اہم رکن "سیکولریزم" ہے، یعنی اصل انسان ہے اور انسان کو محور قرار دینے کے بعد اگر کوئی انسان کسی دین کی طرف مائل ہونا چاہے تو وہ اس طرح ہے کہ کوئی شاعر یا پینٹر بننا چاہے کہ کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں، جس طرح بعض فرقے مجسمہ سازی اور نقاشی کو پسند کرتے ہیں، بعض لوگ مسلمان یا عیسائی ہونا پسند کرتے ہیں ان کے لئے کوئی ممانعت بھی نہیں ہے، کیونکہ انسان کی مرضی کا ادب واحترام ہونا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے ایک طرف کسی دین کا انتخاب کرنا چاہے اس کی مثال اس شخص کی طرح کہ جو شاعری، ادبیات اور کسی دوسرے کام کو منتخب کرے اور اس کا انتخاب مورد احترام ہے؛ لیکن توجہ رہے کہ دین انسان کی زندگی کے اہم مسائل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور دین انسان کی زندگی کا رخ نہیں بدل سکتا، جس طرح شاعری یا کوئی دوسرا کام اگرچہ اہم ہے، اسی طرح دین بھی اہم ہے، فرض کیجئے کہ کچھ لوگ آرٹ میں مشغول ہیں اور انہوں نے ایک آرٹ گیلری بنائی کہ جس میں اپنے اپنے آرٹ کی نمائش لگائی، ہم بھی ان کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آرٹ ان کے لئے سیاست، اقتصاد، اور بین الاقوامی مسائل کا محور بن جائے؛ یعنی آرٹ ایک سائڈ کا کام ہے۔

ان کی نظر میں دین بھی اسی طرح ہے کہ اگر کوئی شخص خدا سے راز ونیاز کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ عبادتگاہ میں جائے اور شاعر کے شعر کی طرح خدا سے مناجات کرے، ہم سے کوئی مطلب نہیں ہے؛ لیکن اگر کسی ایک معاشرے میں کون سے قوانین حکومت کریں یا اقتصادی اور سیاسی نظام کس طرح کا ہو؟ دین کو ان چیزوں سے کوئی مطلب نہیں ہے، دین کی جگہ عبادتگاہ، مسجد یا بت خانہ ہے، اور انسان کے زندگی کی حقیقی مسائل علم سے متعلق ہیں اور دین کو زندگی کے مسائل میں کوئی

دخالت نہیں کرنا چاہئے۔

اس نظریہ کو کلی طور پر "سیکولرایزم" کہا جاتا ہے یعنی دین کو زندگی کے مسائل سے دور رکھنا، یا دنیاداری بھی کہا جاتا ہے، یا اصطلاح میں "آسمانی فکر کرنے" کے بجائے "اس دنیا کی فکر کرنے" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ پیغمبر پر ملائکہ کا نازل ہونا یا عالم آخرت میں ملکوت سے مل جانا وغیرہ وغیرہ جیسی باتوں کو چھوڑ دو اور اس دنیا کے بارے میں سوچو! کھانے، لباس، ناچ گانا اور میوزک کے بارے میں باتیں کرو کہ جن کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے، اور انسانی زندگی کے اہم امور بالخصوص اقتصاد، سیاست اور حقوق علم سے مربوط ہیں، اور دین کو ان میں کوئی دخالت نہیں کرنا چاہئے، یہ ہے مغربی تمدن کا دوسرا رکن۔

تیسرا رکن: "لیبرالیزم" ہے، چونکہ اصل انسان ہے اور انسان مکمل طور پر آزاد ہے مگر بعض ضرورتوں کے پیش نظر، انسانی زندگی کے لئے کوئی قید و شرط نہیں ہونا چاہئے، کوشش یہ کرنا چاہئے کہ محدودیتوں کو کم کیا جائے اور ارزشوں کو محدود بنایا جائے، یہ صحیح ہے کہ ہر معاشرہ میں کچھ ارزشیں ہوتی ہیں لیکن ان کو مطلق قرار نہیں دیا جاسکتا، ہر انسان کسی بھی گروہ کے رسم ورواج کو اپنانے میں آزاد ہے، لیکن ان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ان کو اجتماعی ارزش قرار دیدیا جائے اور ان کو سیاست وحقوق اور اقتصاد میں ان کو دخالت کرنے دیا جائے، انسان آزاد ہے جس طرح کا معاملہ کرنا چاہے کرے، اور جو چیز بنانا چاہے بنائے کسی بھی کام میں مشغول رہے، اور جہاں تک ممکن ہو اقتصاد میں آزادی ہو، اور مفید معاملات میں کسی محدودیت کا قائل نہ ہو، چاہے فائدہ ہو یا نہ ہو، اور جہاں تک ممکن ہو مزدور سے کام لیا جائے اور اس کے کام کے وقت کو معین نہیں کرنا چاہئے، تاکہ مالدار لوگوں کو مزید فائدہ پہنچے۔

مزدور کی مزدوری جتنی کم ہو بہتر ہے، انصاف ومحبت اور عدالت لیبرالیزم سے ہم آہنگ نہیں ہے، لیبرال انسان صرف اپنے فائدہ کی فکر میں ہو، البتہ کبھی کبھی قانون کی رعایت بھی کی جائے تاکہ بغاوت اور دوسری مشکلات پیش نہ آئیں، لیکن اصل یہ ہے کہ انسان جس طرح بھی چاہے کرے، لباس میں بھی انسان آزاد ہے یہاں تک کہ اگر چاہے تو برھنہ باہر نکل آئے، کوئی بات نہیں، اور اس کو روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے، البتہ کبھی کبھی ایسا موقع آتا ہے کہ اگر کوئی برھنہ باہر نکلنا چاہے تو لوگ اس کو گالی دیتے ہیں برا بھلا کہتے ہیں اور اس چیز کو برداشت نہیں کرتے، یہ ایک الگ بات ہے، ورنہ کوئی بھی قانون انسان کو محدود نہیں کرسکتا کہ کیسا لباس پہنے لمبا ہو یا چھوٹا، کسا ہوا ہو یا ڈھیلا، مرد برھنہ ہو یا عورت، سب کو آزاد ہونا چاہئے، اور جہاں تک ممکن ہو مرد وعورت کے درمیان رابطہ آزاد ہونا چاہئے، صرف معاشرہ میں مشکلات پیدا ہونے کی صورت میں تھوڑا بہت کنٹرول کیا جائے! آزادی کی حد یہاں تک ہے، لیکن اگر اس حد تک نہ پہنچے تو عورت مرد آزاد ہے جو ان کا دل چاہے کریں، جہاں چاہیں جائیں، جس طرح کا رابطہ رکھنا چاہیں، رکھیں۔

سیاسی مسائل اور دوسرے مسائل میں بھی اسی طرح ہے، اصل یہ ہے کہ کوئی بھی قید وشرط انسان کو محدود نہ کرے مگر

یہ کہ ضرورت اس چیز کا تقاضا کرے، یہ ہے لیبرالیزم کا اصل ھدف، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مغربی تمدن کے تھرے رکن ہیں، "اومانیزم، سیکولرایزم اور لیبرالیزم" اور یہ قانون گذاری میں اہم کردار رکھتے ہیں۔

5۔اسلامی اور مغربی تمدن کا بنیادی فرق

پہلا مسئلہ "اومانیزم" ہے کہ جو اصالت خدا کے مقابلہ میں ہے جو لوگ اس نظریہ کو مانتے ہیں مسلمانوں کی طرح خدا اور اس کے قانون گذاری کو نہیں مانتے، یہ لوگ صرف اپنے فائدہ، لذتوں اور اپنے آرام کے چکر میں ہیں، اگر چہ مغربی مکاتب میں کم وزیادہ اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً یہ کہ لذت ومنفعت میں اصل انفرادیت ہے یا اجتماعی؟ البتہ یہ تمام مکاتب ایک اصل میں متفق ہیں اور وہ یہ ہے کہ حتی الامکان قید وشرط میں کمی ہونا چاہئے، اس الحادی نظریہ کے مقابلہ میں الٰہی مکتب فکر اور الٰہی تمدن ہے، کہ جس کا کہنا یہ ہے کہ انسان اصل نہیں ہے، بلکہ خدا اصل ہے اور خدا ہی تمام کمالات وزیبائی وسعادت کا سرچشمہ ہے وہی حق مطلق ہے انسان پر سب سے بڑا حق اسی کا ہے اور انسان اس طرح عمل کرے تا کہ اس سے رابطہ رہے، اپنی زندگی میں خدا کو نادیدہ نہیں کیا جاسکتا، انسان کا کمال خدا پرستی میں ہے اور انسان کا فطری طور پر اللہ سے لگاؤ رکھتا ہے اور اگر ہم اس لگاؤ کو نادیدہ کریں تو انسان خود اپنی انسانیت کو نابود کر رہا ہے، لہٰذا تمام افکار واندیشہ میں اصلی محور خدا ہے کہ اس کا نقطۂ مقابل انسان کو محور بنانا ہے۔

دوسرا مسئلہ سیکولریزم" ہے کہ جس کے مقابلہ میں اصالت دین ہے، ایک مومن انسان کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور اہم امر دین کا انتخاب کرنا ہے اس کے لئے آب ونان کی فکر سے پہلے اپنے منتخب دین کی تحقیق ضروری ہے کہ یہ دین حق ہے یا نہیں، اس کا دین صحیح ہے یا فاسد؟ اور کیا خدائے واحد پر اعتقاد رکھنا صحیح ہے یا غلط؟ کیا خدا کی یاد بہتر ہے یا خدا سے بے توجہی؟ ایک خدا کا اعتقاد صحیح ہے یا تین یا چند خداؤں کا اعتقاد؟ لہٰذا جس روز اس پر تکلیف واجب ہوتی ہے اسی دن اس کو یہ طے کرنا ہوگا کہ خدا، وحی، قیامت وغیرہ کو قبول کرتا ہے یا نہیں؟ سب سے پہلے دین کا انتخاب کرے؛ کیونکہ دین زندگی کے تمام شعبوں میں دخالت رکھتا ہے، پس الٰہی تمدن میں دوسرا رکن دینداری ہے کہ جس کے مقابلے میں سیکولریزم ہے جو دین کو زندگی کی ایک سائڈ کا کام کہتا ہے جس کا ماننا یہ ہے کہ دین کو زندگی کے اہم کاموں میں دخالت نہیں کرنا چاہئے، اور دین کو اہم مسائل کے عنوان سے پیش نہیں کیا جانا چاہئے اور زندگی تمام مسائل کو تحت تاثیر قرار نہ دے، جبکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو حلال وحرام سے خارج ہو، اور کسی بھی چیز کے حلال یا حرام ہونے کو دین معین کرتا ہے، یہ نظریہ سیکولریزم کا نقطۂ مقابل ہے۔

تیسرا مسئلہ لیبرالیزم ہے؛ یعنی آزادی، ہوس بازی اور کسی قید وشرط کا نہ ہونا، لیبرالیزم یعنی اصل اپنی مرضی ہے، کیونکہ آزادی کے مختلف معنی کئے گئے ہیں لیکن یہاں اس کے معنی دلخواہ لیتے ہیں، اس لیبرالیزم کے مقابلہ میں حق وعدالت اور انصاف ہے، لیبرالیزم کہتی ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کیا جائے جبکہ الٰہی ثقافت کہتی ہے کہ حق وعدالت سے کام لینا

چاہئے، اور کوئی بھی ایسا کام نہ کیا جائے جو ناحق ہو، اسی طرح عدالت کی رعایت کی جائے، البتہ ان دونوں میں آپس میں رابطہ ہے کیونکہ حق کے کما حقہ معنی کئے جائیں تو عدالت کو بھی شامل ہوتا ہے:

"العدالۃ اعطاء کلّ ذی حقٍّ حقّہ"

عدالت ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کرتی ہے۔

پس عدالت میں حق پوشیدہ ہے، لیکن اس وجہ سے کہ اس میں کوئی غلط فہمی نہ ہو ان دونوں اصولوں کو ذکر کرتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ لیبرالیزم دلخواہی کو اصل ماننے کے نظریہ پر اعتقاد رکھتی ہے، اور اس کے مقابلہ میں دین عدالت وحق کا طرفدار ہے، دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ واقعاً حق و باطل دونوں ہیں ایسا نہیں ہے کہ جو بھی چاہیں مان لیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ تلاش کریں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ کیا عدالت ہے اور کیا ظلم ہے؟ اگر میں کسی پر ظلم کو اچھا مانوں تو کسی پر ظلم نہ کروں: لیبرالیزم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حق و عدالت کی رعایت وہاں تک کریں کہ اس کی مخالفت سے معاشرے میں بحرانی کیفیت طاری نہ ہو، ہر کوئی اپنے فائدہ کی فکر میں رہے۔

کہا جاتا ہے کہ مروّت وانصاف ایسی چیزیں ہیں جن کو انسان کمزوری کی وجہ سے ان کو اپناتا ہے، اگر آپ میں طاقت وقدرت ہے تو پھر جو چاہو انجام دو، مگر یہ کہ آپ کو احساس ہو جائے کہ اس آزادی سے معاشرہ میں بحران ہو سکتا ہے اور اس وقت بحران کی زد میں وہ خود بھی آسکتا ہے اس کا وقت محدود ہو جاتا ہے، پس الٰہی واسلامی تمدن میں اصل عدالت وحق ہے۔

غربی تمدن میں ان تین ارکان کے علاوہ بھی اور دوسری چیزیں ہیں کہ یا تو عمومی نہیں ہے یا اصالت نہیں مانا جاتا، کہ جن میں سے "اخلاقی پوزیٹیونیزم" (Positivisme) ہے یعنی اخلاقی ارزشیں انسان کے سلیقہ اور مرضی کے مطابق ہیں کہ جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے، مثلاً آج اگر کسی چیز کو پسند کیا اور اس کو اچھا لگا اور اس کی حمایت میں ووٹ دیا تو یہ با ارزش ہو جائے گا، لیکن اگر بعد میں اس میں کوئی برائی دکھائی دی، تو اس کو چھوڑ دیا تو یہ ارزش کے خلاف ہو جائے گا۔

ہم نے متعدد بار عرض کیا ہے کہ ہمارے معاشرے کے لوگ چونکہ ان کا ذہن صاف ہے، وہ جانتے ہیں کہ مغربی تمدن کس قدر برا ہے، مثال کے طور پر کہ جس معاشرے میں ہم جنس بازی کو بہت برا سمجھا جاتا تھا آج اسی کو قبول کیا جا رہا ہے، اس کو اچھا مانا جا رہا ہے، اس کے بارے میں بہترین فلسفہ تراشی اور بہترین اشعار پیش کئے جاتے ہیں اور باقاعدہ اس بارے میں انجمن بنائی جاتی ہیں کہ ملک کے بڑے بڑے عہدہ دار افراد، منسٹر اور ایڈوکیٹ حضرات اس انجمن کے ممبر بنائے جاتے ہیں!!

سننے کی بات ہے کہ اس کام کی حمایت میں جو مظاہرے ہوتے ہیں ان کی تعداد عام مظاہروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ لوگوں کا سلیقہ بدل چکا ہے، اب تک ان میں یہ رواج تھا کہ مخالف جنس کے ساتھ زندگی ہوتی تھی، لیکن

اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم جنس کے ساتھ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں!! مرد سے مرد اور عورت سے عورت کی شادی کو باقاعدہ طریقوں سے حکومتی اداروں میں درج کرایا جاتا ہے!!

اس نظریہ کو "اخلاقی پوزیٹونیزم" کا نام دیا جاتا ہے کہ واقعاً جس میں اخلاقی اہمیتیں کسی بھی طرح عقلانی نہیں ہیں اور صرف لوگوں کی مرضی پر ہے، معیار لوگوں کے نظریات ہیں آج جس چیز کو بھی اچھا کہا وہی اچھا ہے اور اگر اسی کام کل برا کہنے لگیں تو برا ہے، لوگوں کی مرضی کے ماوراء کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو ارزشوں کا ملاک و معیار بنایا جائے؛ یہ ایک نظریہ ہے نیز اسی طرح کے بہت سے نظریات ہیں جن کو بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں، پس جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مغربی تمدن کے تین اہم رکن ہیں؟

1۔ اومانیزم، 2۔ سیکولریزم، 3۔ لیبرالیزم، اور یہی تین اہم رکن قانون گذاری میں بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہیں

6۔ آزادی کی حدود کو معین کرنے میں اسلام اور مغربی تمدن میں فرق

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ دنیا بھر کے تمام عقلمند افراد، مطلق آزادی کا انکار کرتے ہیں، اور ہم کسی عاقل کو نہیں پہچانتے کہ جو یہ کہے کہ انسان اس قدر آزاد ہے کہ جس وقت جو چاہے انجام دے، لہٰذا جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آزادی مطلق نہیں ہے بلکہ محدود ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی حد کیا ہے؟ مشہور یہ ہے کہ آزادی کی حد کو قانون بیان کرتا ہے، یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ قانون کس درجہ آزادی کو محدود کر سکتا ہے؟

ہم نے گذشتہ مطالب میں بیان کیا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ کچھ اس طرح کی آزادیاں ہیں کہ جن کو کوئی بھی قانون محدود نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ قانون اور دین کے مافوق ہیں، اور ہم نے گذشتہ نشستوں میں یہ وضاحت کی ہے کہ قانون کی شان آزادی کو محدود کرنا ہے اور قانون گذار کو آزادی کو کافی حد تک محدود کرنے کا حق ہوتا ہے، اور قانون کے اصل معنی ہی یہی ہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون آزادی کو کس حد تک محدود کر سکتا ہے، اس کا جواب الٰہی و مغربی تمدن کے لحاظ سے الگ الگ ہے: مغربی تمدن کے لحاظ سے، اگر انسان کا مادی خطرہ در پیش ہو تو اس وقت آزادی محدود ہو جاتی ہے اگر انسان کی زندگی میں اس کی جان و مال کو خطرہ لاحق ہو تو قانون آگے بڑھ کر اس کے مانع ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر، اگر قانون یہ ہے کہ صفائی کا خیال رکھنا ضروری ہے یا یہ کہ پینے کے پانی کو زہریلا نہیں کرنا چاہئے، (کیونکہ اس سے لوگوں کی جان کا خطرہ ہے،) اس طرح کی آزادی کو محدود کرنا قابل قبول ہے، ایسی آزادی کو محدود ہونا چاہئے تاکہ لوگوں کی صحت محفوظ رہے، اور اس قانون کے قبول کرنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، لیکن اگر کسی کام سے لوگوں کی عزت، ہمیشگی سعادت اور اس کی معنویات کو خطرہ ہو اور انسان کی روح گندی ہو جائے تو قانون کو اس سے ممانعت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اس موقع پر الٰہی اور مغربی ثقافت میں اختلاف پایا جاتا ہے:

الٰہی نظریہ کے تحت انسان ہمیشگی کمال کی طرف بڑھ رہا ہے اور قانون کو اس کے لئے راستہ کو ہموار کرنا چاہئے، اور اس

راستہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو بھی ختم کرنا چاہئے، (قانون سے ہماری مراد وہ قانون ہے جو حقوقی وحکومتی قانون ہیں کہ جن کے جاری کرنے کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے اور فردی مسائل (اخلاقی مسائل) سے ہماری بحث نہیں ہے) اگر یہاں یہ سوال ہو کہ کیا قانون کو انسان کے معنوی فائدوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے؟ کیا ان چیزوں سے روکے کہ جو انسانی آخرت کی کامیابی کے خطر کو دور کرنا ضروری ہے؟

الٰہی تمدن کہتا ہے کہ ان چیزوں سے روکنا ضروری ہے، لیکن کفر والحاد کی ثقافت کا جواب منفی ہے (یعنی ان کی نظر میں ضروری نہیں ہے) شروع سے اب تک بحث اسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے تھی اگر ہم مسلمان ومومن ہیں اور خدا، رسول، حضرت علی علیہ السلام اور امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کو مانتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ان معنوی وابدی ارزشوں کو قبول کریں۔

ہمارے قانون گذار حضرات الٰہی ومعنوی مصلحتوں کا لحاظ رکھیں اور جو چیز انسانی معنویات کے لئے خطرناک ہیں ان سے روکا جائے ورنہ مغربی تمدن کے پیرو ہو جائیں گے، ایسا نہیں ہے کہ قانون فقط صحت وسلامتی اور مادی آسائش کو فراہم کرے اور جو چیزیں معاشرے میں ناآرامی کا سبب بنے ان سے روکے، نیز ان کاموں سے روکے کہ جن سے معاشرے کی اقتصادی امنیت خطرہ میں پڑتی ہے، بلکہ قانون کے لئے ضروری ہے کہ معنویات کو بھی مدنظر رکھے، ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں: یا اسلامی قانون کو قبول کریں یا مغربی قانون کو، البتہ ان دو چیزوں میں بہت سی ملاوٹ موجود ہے کہ جس کو ہم نے گذشتہ بحث میں ذکر کیا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں:

"يُؤْخَذُ مِنْ هٰذَا ضِغْثٌ وَمِنْ هٰذَا ضِغْثٌ فَيُمْزَجَانِ" [1]

تھوڑا یہاں سے لیا اور تھوڑا وہاں سے اور آپس میں ملا دیا۔

کچھ چیزیں اسلام سے لیں اور کچھ چیزیں مغربی تمدن سے اور ایک غیر ہم آہنگ مجموعہ بنالیا، اسلام اس طریقہ کو قطعاً پسند نہیں کرتا، قرآن کریم اس چیز کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ .... [2]

"بے شک جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں سے انکار کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵۰

[2] سورہ نساء آیت ۱۵۰، ۱۵۱

ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس (کفر و ایمان) کے درمیان ایک دوسری راہ نکالیں، یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں"

آج بعض لوگ یہی چاہتے ہیں کہ کچھ چیزیں اسلام سے لیں اور کچھ چیزیں مغربی تمدن سے لیں اور ان کو ملا کر جدید اسلام کے نام سے دنیا والوں کے سامنے پیش کریں! حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا اسلام پر یقین نہیں ہے، اور اگر اسلام پر یقین ہوتا تو ان کو معلوم ہوتا کہ اسلام اس مجموعہ کا نام ہے کہ جس کی ضروریات کو قبول کرنا چاہئے، اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے اسلام تو قبول کرلیا ہے لیکن اس کی بعض چیزوں کو نہیں مانتا، تو اس کی یہ بات قابل قبول نہیں ہے، لہٰذا قانون گذاری اور آزادی کو محدود کرنے میں ہمارے پاس ان دو راستوں کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے، اور ان میں سے ایک کا انتخاب ضروری ہے: یا تو آزادی کو محدود کرنے کا معیار مادی و دنیوی خطرات مانیں یا مادی اور معنوی خطرات کو معیار قرار دیں، اور اگر پہلے راستہ کو اپنایا تو گویا ہم نے مغربی الحادی تمدن کو قبول کرلیا، اگر دوسرے راستہ کو اپنایا تو اسلامی تمدن کو قبول کیا، اور جس حد تک بھی پہلے والے راستہ کے نزدیک ہوئے، مغربی تمدن کے قریب ہوئے، اور جس قدر بھی دوسرے تمدن کے نزدیک ہوئے اسلام سے نزدیک ہوئے، بہر حال ان دونوں میں کوئی رابطہ نہیں ہے، کیونکہ جہاں تک مادی فائدوں کی بات ہوتی ہے تو وہاں مغربی تمدن اور اسلامی تمدن دونوں کہتے ہیں کہ ان کا خیال رکھا جائے مثلاً دونوں کہتے ہیں کہ صفائی کا خیال رکھا جائے، لیکن جہاں معنوی مسائل کی بات آتی ہے تو وہاں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

جس وقت صرف مادی فائدے پیش نظر ہوں تو آزادی محدود کردیا جاتا ہے، اگر اس کے ساتھ معنویات کو شامل کردیا جائے تو اس کے مقابلہ میں دو چیزیں ہو جاتی ہیں کہ جو ایک دوسرے کے متداخل ہوتے ہیں، کہ جس کے نتیجہ میں محدودیت کا دائرہ وسیع تر اور آزادی کا دائرہ محدود تر ہو جاتا ہے، اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام کی آزادی مغربی آزادی کی طرح نہیں ہے تو اس کے معنی یہی ہیں یعنی دلیل یہ ہے: کہ جب ہم معنوی مصلحتوں کی رعایت کرتے ہیں تو پھر مغرب کی طرح بے لگام نہیں ہوسکتے، بلکہ انسانی روح سے متعلق امور کی بھی رعایت کرنا ضروری ہے، جن کی وجہ سے ہماری آخرت سنورتی ہے، لیکن مغربی تمدن کہتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اجتماعی قوانین سے متعلق نہیں ہیں، حکومتی قوانین معاشرہ کے مادی مسائل میں جاری ہوتے ہیں، اور ان کے علاوہ اخلاق سے مربوط ہیں کہ جن کا سروکار حکومت سے نہیں ہے۔

جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی مقدسات خطرہ میں ہے حکومت کے بعض ذمہ دار افراد کہتے ہیں کہ مجھ سے کیا ربط! میرے کام تو لوگوں کی زندگی کے مادی مسائل سے مربوط ہیں، دین کے مسائل علماء سے متعلق ہیں، اس کی حفاظت کرنا ان کی ذمہ داری ہے، حکومت کا ان سے کوئی مطلب نہیں ہے، لیکن اگر اسلامی حکومت ہوتی ہے تو پہلے دین پھر دنیا کی بات کرتی ہے۔

اس بنا پر، ان دونوں تمدن کے پیش نظر بہت غور و خوض سے کام لیں اور ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ جس وقت ہمارے

قدم اسلامی ارزشوں کے مقابلہ میں لڑکھڑا ئیں اور اپنے اندر کاحلی کا احساس کریں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کفر کے ماحول سے نزدیک ہوتے جارہے ہیں، اور اسلام کی حقیقت کو بھولتے جارہے ہیں، ہمارا یہ انقلاب صرف مادی فوائد کو پورا کرنے کے لئے نہیں ہوا ہے، بلکہ ہم نے یہ انقلاب اسلام کی ترقی کے لئے کیا ہے، کیونکہ اس انقلاب میں اس قدر لوگ شہید ہوئے، اپنے عزیزو کی قربانی پیش کی، صرف اس وجہ سے کہ اسلام باقی رہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ مادی آسائش یا اقتصادی وسیاسی تعلقات میں اضافہ ہو، ان شہیدوں نے اپنی جان کو قربان کیا تا کہ اسلام پھیلے، اسلامی حکومت کے لئے سب سے پہلے اسلامی مسائل پر توجہ دینا ضروری ہے، اور اگر کوئی بعض چیزوں کے غلط معنی وتفسیر کرے اور مختلف مفاد کی خاطر حقائق کی تحریف کریں ہمیں ان سے کوئی مطلب نہیں، ہم تو مسلمانوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ دین کی حد کہاں تک ہے؟ اسلامی ارزشیں کتنی اہم ہیں اور ان کی محافظت کے لئے کس قدر جانفشانی کی ضرورت ہے؟ ہمارے برادران واقف ہیں، اسی لئے ایک عالم دین کی یہ ذمہ داری ہے کہ جس وقت معاشرہ میں کسی روحانی ومعنوی بیماری کے پھیلنے کا خطرہ ہو تو لوگوں کو متوجہ کریں اور خطرے کا اعلان کرے۔

سترہویں نشست

ربوبیت تشریعی، حاکمیت اور قانون گزاری میں رابطہ

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

اسلام کے سیاسی نظریے کے تحت ہم نے گذشتہ جلسات میں عرض کیا کہ ایک حکومت کا اسلامی ہونا اس بات پر متوقف ہے کہ اس حکومت کے ارادے، اسلامی مقاصد اور اس کا معین کردہ راستہ کو اپناتے ہوئے قدم بڑھائیں، لہٰذا وہ حکومت، اسلامی کہ جس میں قانون گزار یا ور، عدالت یا ور اور مجری یا ور اسلامی راہ پر چلیں، یا یہ کہا جائے کہ خدائی اور اسلامی رنگ ہونا چاہئے، اور اجمالی طور پر وضاحت کردی گئی کہ ان طاقتوں کا الٰہی و اسلامی رنگ ہونا معنی کیا۔

اسی طرح یہ بھی بیان ہو چکا کہ قوانین کے لیے مرحلے ہیں، اسلامی مقاصد کو مدنظر رکھا جائے اور یہ قوانین خدا کے براہ راست احکام کہ جو پیغمبر یا ان کے معصوم جانشینوں کے ذریعے پہنچے میں کے مخالف نہ ہوں، اور دوسرے مرحلہ میں قانون کا جاری کرنے والا عام معنوں میں کہ قوۂ قضائیہ کو شامل ہے کے ذریعے منصوب ہو، یا تو خدا براہ راست اس کو معین کرے، جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا خدا کی طرف سے کسی کے ذریعہ منصوب ہو، جیسے پیغمبر کے ذریعہ ائمہ معصومین علیہم السلام کو منصوب کرنا، یا عمومی طور پر منصوب ہو، جیسے ولی فقیہ کہ جس کے بارے میں در حد امکان بحث ہو چکی ہے۔

2۔ اصول موضوعہ کو معین کرنے کی ضرورت

اس چیز کو ثابت کرنے کیلئے کہ ایک اجتماعی اور صحیح و سالم حکومت مذکورہ شکل و صورت رکھتی ہو، اور ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا کہ اگر ہم اس مسئلہ کو ان لوگوں کیلئے بیان کریں کہ جو ہمارے فقہی و اعتقادی بنیادوں پر عقیدہ رکھتے ہیں، تو ان کے لئے شرعی دلیلوں خصوصاً قرآنی آیات کے ذریعہ ثابت کر سکتے ہیں، لیکن وہ حضرات جو دین کی حقانیت، یا دوسرے بنیادوں کو کہ جو اس نظریہ کی بنیادیں قبول نہیں کرتے، لھذا اگر ان افراد کے لئے اس نظریہ کو ثابت کرنا ہے تو پہلے اصول موضوعہ کے بارے میں بتانا پڑے گا کہ اس بحث کے اصول موضوعہ کیا ہیں؟ اور پہلے ان کو اصول موضوعہ کو ثابت کرنا ہوگا، اصول موضوعہ ان مسائل کو کہتے ہیں کہ جو بدیہی اور ظاہری چیزوں سے شروع ہوتے ہیں اور اس نظریہ پر ختم ہوتے ہیں۔

جو لوگ استدلال حساب یا ھندسہ کے ذریعے کچھ چیزوں کو ثابت کرنے کے طریقوں سے واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ھندسی بحثیں اس طرح شروع ہوتی ہیں کہ پہلے کسی قضیہ کو اصل موضوع کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے، اور اس

کی بنیاد پر دوسرے قضیہ کو ثابت کیا جاتا ہے اور اس طرح قضیہ سوم کو اثبات کرتے ہیں اور اس طرح چوتھے اور پانچویں کو اثبات کرتے ہیں اور اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اگر بیسوں قضیوں کو ثابت کرنا چاہیں تو اس کیلئے انیسوں قضیہ کو پہلے سے ثابت ہونا ضروری ہے اور اس طرح انیسویں کو ثابت کرنے کے لئے اس سے پہلے والا قضیہ ثابت ہونا چاہئے۔

اگر کسی کے لئے کسی ایک قضیہ کو ثابت کرنا ہو تو یہاں پر یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اس سے پہلے قضیوں کو کہاں تک درک کیا ہے، تا کہ ان کو بحث کا اصل موضوع قرار دیں وگرنہ اگر ہر ایک قضیہ کو اثبات کرنے کیلئے پہلے والے قضیوں کے اثبات کو تکرار کرنا پڑے گا، مثال کے طور پر جب ایک سیدھی لائن کی تعریف دو نقطوں کے درمیان چھوٹے فاصلہ یا دونوں ایک دوسرے کے مقابل لائن آپ ان کو کتنا بھی بڑھائیں وہ ایک دوسرے کو قطع نہیں کر سکتی ہیں ان کو بیان کریں، اسی طرح ہر ایک قضیہ کو بیان کرنے کیلئے کوئی نئے مسائل کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ گذشتہ مطالب ہی کی تکرار ہوتی رہتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی ایک عقلی قضیہ کو ثابت کرنا چاہیں تو اس کے اصول موضوعہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، کہ جن کو الگ کسی دوسرے علم یا دوسری بحثوں میں ثابت کیا جا چکا ہے، مثال کے طور پر اگر یہ کہیں کہ قانون کو الٰہی قانون ہونا چاہئے تو خدا کا اثبات ثابت ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر کوئی کہے کہ میں خدا ہی کو نہیں مانتا تو پھر اس کے ساتھ کلامی اور فلسفی بحث کریں تا کہ اس پر ثابت ہو سکے کہ ہاں خدا بھی ہے، اور وہ خدا ایک ہے اور ہمارا رب ہے، تا کہ بحث کے دوران حکومت کے سلسلہ میں حکومت کی نسبت خدا کی طرف دی جا سکے۔

لہٰذا اگر اصول اولیہ سے بحث شروع کریں تو یہ بحث تکراری اور خستہ کنندہ ہوگی، مجبوراً اس اصل کو بیان کریں جس کو مد مقابل بھی قبول کرتا ہے اور دوری بحثوں کو اس کے علم پر چھوڑ دیں، البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب ہم ھندسہ کے دسویں قضیہ سے بحث کو شروع کریں تو اس سے پہلے قضیوں کو اثبات نہ کیا جا سکے، کیونکہ ان کو تو پہلے ثابت کر چکے ہیں، لھذا جن اصولوں کو پہلے ثابت کر چکے ہیں ان سے بعد میں نتیجہ حاصل کرتے ہیں، اس نکتہ کو بیان کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ اپنے مبانی (بنیادی نظریات) کے اعتبار سے گفتگو کرتے ہیں جبکہ دوسرے ان کو قبول نہیں کرتے، لھذا ان حضرات کے جواب میں یہ عرض کرتے ہیں کہ ہمارا مخاطب بھی ہمارے ساتھ بہت سی چیزوں کو مانتا ہے تا کہ ان کی بنیاد پر دوسری چیزوں کو ثابت کیا جا سکے اور اگر ان اصول و مقدمات کو نہیں مانتا تو پھر دوسرے علم کی طرف رجوع کریں اور وہاں ان مقدمات کو ثابت کریں۔

یہاں اس چیز کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے مغربی ثقافت کو" اور مانیزم و لیبرالیزم" کی بنیاد پر اس کو کفر و الحاد کی ثقافت بتایا ہے جبکہ مغربی ممالک میں بہت سے افراد خدا کو ماننے والے ہیں، ہم نے مکرر عرض کیا ہے کہ مغربی ثقافت سے مراد صرف جغرافی علاقہ نہیں ہے اور ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ سبھی لوگ جو مغربی ممالک میں زندگی بسر کرتے ہیں اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں کیونکہ وہاں پر بہت سے لوگ خدا کو مانتے ہیں اور اخلاقی قوانین

کی رعایت کرتے ہیں اور ہم ان کا احترام کرتے ہیں لیکن مغربی ثقافت میں جو چیز عمل ہے وہ انہیں اصول پر مبنی نہیں کرتے، بعض خود ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کس منطق کے تحت گفتگو کر رہے ہیں، جو حضرات اہل بحث واستدلال ہیں اس طرز تفکر کی بنیاد کی معرفت رکھتے ہیں؟ اسی طرح ہم نے اس سے قبل التقاط (دوسروں کے نظریات سے متاثر ہونا) کے بارے میں بیان کیا کہ بعض لوگ مختلف ادیان سے کچھ چیزوں اخذ کر کے ایک جگہ جمع کرتے ہیں، ان چیزوں کی استدلالی اور بنیادی کو پہلو کو ثابت کئے بغیر، کیونکہ کبھی کبھی یہ چیزیں آپس میں سازگار اور ہم آہنگ نہیں ہوتیں، درنتیجہ ہم یہ عرض کردینا چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے تمام عقائد کو ملاحظہ کیا جائے تو اس طرح کے اشکالات ہمارے یہاں نہیں پائیں گے۔

بہرحال اس چیز کو اثبات کرنے کیلئے کہ ہمارا یہ سیاسی نظام وحکومت جو اسلامی نقطہ نظر سے ہے اور سب سے زیادہ عقلائی اور سب سے زیادہ حکیمانہ ہے، لہٰذا ہم اس کا استدلال شروع کرتے ہیں، ہم یہاں پر خدا کے اصل وجود اور انہیں صفات کو مسلم مانتے ہوئے اسی بنیاد پر اس مسئلہ کو بھی اثبات کرتے ہیں، گرچہ کچھ لوگ خدا کو قبول نہیں کرتے یا اس کے بعض صفات کو نہیں مانتے تو ان کو چاہئے کہ علم کلام کا مطالعہ کریں کیونکہ اس وقت ہماری بحث علم کلام میں نہیں ھے بلکہ سیاسی فلسفہ سے متعلق ہے لہٰذا یہاں پر علم کلام کی بحث نہیں کی جاسکتی۔

3۔خدا کی حاکمیت اور تشریعی الوہیت

ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ اسلامی حکومت کے سیاسی نظام کی اصل بنیاد خداوند عالم کی حاکمیت ہے، درحقیقت اس نظریہ کا سرچشمہ خدا کی تشریعی ربوبیت کا قائل ہونا ہے، اس سلسلہ میں اس مطلب کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ نہ صرف یہ کہ اسلام کا بلکہ تمام آسمانی ادیان کا معیار توحید ہے، کلمہ "لَا خَالِقَ اِلَّا اللّٰہُ" ہے، جو ہمارے نبی اکرم کا اصلی نعرہ ہے، اور یہی تمام ادیان کا نعرہ تھا، اگرچہ اس میں تھوڑی بہت تحریفات ہوتی ہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "لَا خَالِقَ اِلَّا اللّٰہُ" کا کیا مطلب ہے؟

بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ اس جہان کا خالق و پیدا کرنے والا ایک ہے، لیکن کیا توحید کے یہی معنی ہیں؟ بعض "لَا خَالِقَ اِلَّا اللّٰہُ" (خدا کے علاوہ کوئی خالق نہیں ہے) کیا اسلام کی نظر میں توحید کے معنی صرف خلقت میں یگانیت ووحدانیت کا اعتقاد رکھنا ہے؟ چند سال پہلے اسلام کے نظام عقیدتی ونظام ارزشی میں توحید کے عنوان سے بحث میں ہم نے بیان کیا تھا کہ توحید کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خالقیت میں یگانیت ووحدانیت کا قائل ہو جائے، اسلام کے لحاظ سے توحید کے معنی اس میں محدود نہیں ہیں، مکہ کے مشرکین بھی خالقیت میں توحید کا عقیدہ رکھتے تھے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ.... [1]

[1] سورہ لقمان آیت ۲۵

"اور (اے رسول) تم اگر ان سے پوچھو کہ سارے آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہہ دیں گے کہ اللہ نے"

اس طرح شیطان بھی خدا کے وجود کا اعتقاد رکھتا تھا اور خالقیت میں توحید کو قبول کرتا تھا لیکن خدا نے پھر بھی اس کو کافروں میں شامل کر دیا

جیسا کہ قرآن مجید میں ابلیس کی خدا سے گفتگو سے نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ توحید در خالقیت اور خدا کی تکوینی ربوبیت کا معتقد تھا نیز معاد و عاقبت کا بھی اعتقاد رکھتا تھا:

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ [1]

"شیطان نے کہا کہ اے میرے پروردگار خیر تو مجھے اس دن تک کی مہلت دے جبکہ (لوگ دوبارہ زندہ کر کے) اٹھائے جائیں گے خدا نے فرمایا: وقت مقرر کے دن تک کی تجھے مہلت دی گئی، شیطان نے کہا اے میرے پروردگار چونکہ تو نے مجھے راستہ سے الگ کیا ہے، میں بھی ان کے لئے دنیا میں (ساز و سامان کو) عمدہ کر دکھاؤں گا اور سب کو ضرور بھکاؤں گا۔"

نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان بھی توحید در خالقیت اور خدا کی تکوینی ربوبیت کا قائل تھا اور قیامت پر بھی اعتقاد رکھتا تھا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے کفر کی وجہ کیا تھی؟ شیطان کے کفر کی وجہ کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اسلامی نقطہ نظر سے توحید کا نصاب پہچاننا پڑے گا، یعنی اسلامی لحاظ سے انسان کب موحد یعنی اہل توحید بنتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ خلقت میں خدا کی وحدانیت خدا کی تکوینی و تشریعی الوہیت میں وحدانیت اور وحدت معبود کے اعتقاد سے انسان موحد بنتا ہے یعنی انسان خدا کو تنہا خالق مانے اور اسی کو کردگار، صاحب اختیار جہان، اور اصل قانون گذار مانے، اور الوہیت و عبودیت میں توحید کے اعتقاد کے ساتھ ساتھ اس کو عبادت کا مستحق مانے، توحید کے نصاب کی پہچان سے معلوم ہوا کہ شیطان کے کفر کی وجہ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کا انکار تھا خداوند عالم کی تکوینی ربوبیت کا انکار نہیں تھا۔

اس طرح خداوند عالم اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ اہل کتاب سے بحث کرتے وقت ان عقائد کی طرف دعوت دیں کہ جن میں خود آپ اور وہ لوگ مشترک ہیں، اور وہ اعتقاد خدا کی وحدانیت اور اس کی عبودیت کا عقیدہ ہے اس کے بعد خداوند عالم ایک جملہ ارشاد فرماتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کو ان کے غیر خدا کی تشریعی ربوبیت کے عقیدہ سے روکے، کہ جس کی وجہ سے وہ اس دائرہ میں پہنچ چکی ہیں:

قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا

---

[1] سورہ حجر آیت ۳۶ تا ۳۹

وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ [1]

"(اے رسول) تم (ان لوگوں) سے کھو کہ اے اہل کتاب تم ایسی (ٹھکانے کی) بات پر تو آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہو کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور ہم سے کوئی خدا کے علاوہ کسی کو اپنا پروردگار نہ بنائے۔"

اس آیت کی تفسیر میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان کا مضمون یہ ہے کہ اہل کتاب اپنے جیسے افراد کو اپنا خالق نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے احبار و رھبان (روحانی علماء) کو اپنا تشریعی رب مانتے تھے اور ان کے حکم کو خدا کا حکم سمجھتے تھے۔ قرآن مجید میں احبار و رھبان کی بدون قید و بند اطاعت کو رب ماننے کے مترادف کہا ہے:- ولا یتّخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ" یعنی اپنے بزرگوں کی بدون قید و شرط اطاعت نہ کرو کہ یہ کام ایک طرح کا شرک ہے لیکن یہ شرک تکوینی خالقیت و ربوبیت کا شرک نہیں ہے اور نہ ہی الھیت و عبودیت کا شرک ہے، کیونکہ وہ لوگ احبار و رھبان کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا شرک تشریعی ربوبیت میں تھا، یعنی خدا کے ساتھ ساتھ ان کو بھی قانون گذار مانتے تھے، کہتے تھے کہ خدا کے علاوہ دوسرے افراد اور خود پر بھی قانون بنانے کا حق رکھتے ہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ صرف خداوند عالم کا قانون معتبر ہو، اور جو بھی کہے اس کی اطاعت کرنا ضروری ہو؟

جس طرح شیطان بھی خدا کی تشریعی ربوبیت کا منکر ہوا، اور اس نے کہا: "اَنَا خَیْرٌ مِنْہُ" (میں اس سے بہتر ہوں) مجھے جناب آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کرنا چاہئے جبکہ خدا کا حکم ہے کہ جناب آدم کو سجدہ کر، شیطان نے کہا میں آدم کو سجدہ نہیں کروں گا، کیونکہ میں اس سے بہتر ہوں، یعنی شیطان خداوند عالم کے اس حکم کو تسلیم نہ کرتا تھا، دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ شیطان حق حاکمیت کو خدا سے مخصوص نہیں سمجھتا تھا، جس کی وجہ سے کافر ہوگیا، ورنہ تو وہ خدا اور اس کی ربوبیت اور قیامت کا منکر نہ تھا، شیطان کے کفر کی وجہ خدا کی مطلق حاکمیت کا انکار تھا، اسلام جس کفر کی نسبت اہل کتاب کی طرف دیتا ہے اور اس سے روکتا ہے اور توحید کی طرف دعوت دیتا ہے وہ تشریعی کفر و شرک ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰھًا وَّاحِدًا۔ [2]

"ان لوگوں نے تو اپنے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں کو اور اپنے زاھدوں کو اور مریم کے بیٹے مسیح کو اپنا پروردگار بنا ڈالا حالانکہ انہیں سوائے اس کے اور حکم ہی نہیں دیا گیا کہ خدائے یکتا کی عبادت کریں۔"

---

[1] سورہ آیت آل عمران آیت ۶۴

[2] سورہ توبہ آیت 31.

وہ لوگ کبھی بھی احبار و راھبوں کو سجدے نہیں کرتے تھے، لیکن بغیر کسی قید و شرط کی اطاعت کو ان کو رب ماننے کے برابر سمجھا گیا ہے، درحقیقت وہ لوگ قانون گذاری کو خداوند عالم میں مخصوص نہیں جانتے تھے۔

4۔ خالص توحید کا مطلب

خالص توحید وہ ہے کہ جو اِن شرکوں سے خالی ہو، نہ شیطان جیسا شرک ہو اور نہ اہل کتاب والا شرک، اسلام میں توحید کا حد نصاب خدا کی توحید خالقیت، اس کی معبودیت اور راب ولایت تکوینی کے اعتبار کے ساتھ ساتھ تشریعی ربوبیت میں توحید کا اعتقاد بھی ضروری ہے، پس توحید کے یہ چار رکن ہیں کہ اگر ان میں کوئی ایک بھی نامکمل رہ گیا، تو پھر بھی توحید، حقیقی توحید نہیں ہوگی، اور اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ خدا کی خالقیت کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا بھی خالق ہے، یا کوئی دوسرا بھی رب تکوینی ہے جو مستقل طور پر عالم کا ادارہ کرتا ہے، یا حق حاکیت یا حق عبادت رکھتا ہے وہ اسلامی توحید سے خارج ہے۔

لہٰذا تشریعی ربوبیت میں توحید کا قائل ہونا اسلامی توحید کا ایک رکن ہے اور تشریعی ربوبیت میں توحید کے عقیدہ کے بغیر اسلامی توحید نہیں ہوسکتی، ممکن ہے کوئی شخص ظاہری طور پر کلمہ شہادتین پڑھے اگر چہ اس پر طہارت کا حکم بھی ہوتا ہے لیکن یہ ظاہری احکام جن کی وجہ سے اس کو مسلمان شمار کیا جائے گا، اگر فقہا کرام اپنے توضیح المسائل میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شہادتین پڑھے تو اس پر طہارت کا حکم جاری ہوگا اور اس سے نکاح کرنا صحیح ہے اور اس کا ذبح کردہ حیوان حلال ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس نے کلمہ شہادتین پڑھ لیا ہو، وہ جنتی ہے اور عذاب جہنم سے نجات یافتہ ہے، بلکہ اس کے لئے اسلام کے دوسرے ضروریات کو پورا کرنا ضروری ہے اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے، ورنہ تو کلمہ شہادتین پڑھنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا، کیا اگر کوئی معاد کا منکر ہو تو اسے مسلمان کہا جائے گا؟ یا اگر نماز و زکواۃ کا منکر ہو تو اس کو مسلمان کہیں گے؟ کلمہ شہادتین صرف اس چیز کی نشانی ہے کہ اس نے "ما انزل اللہ" پر اعتماد کرلیا ہے اور ظاہراً مسلمان شمار کرلیا جائے گا۔

لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا اعتقاد نہ ہو، یا قیامت کو قبول نہ کرتا ہو، یا اسلام کی ضروریات کو دل سے قبول نہ کرتا ہو، تو وہ ظاہری طور پر تو مسلمان ہے لیکن حقیقت میں وہ کافر ہے، اگر چہ اس پر اسلامی احکام اس پر جاری ہونگے، پس ظاہری اسلام اور چیز ہے اور واقعی ایمان جو عذاب اخروی سے نجات کا باعث ہوتا ہے، وہ دوسری چیز ہے۔

جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ توحید کا ایک معیار تشریعی ربوبیت میں توحید کا اعتقاد ہے تو اس کا مقصد وہ توحید ہے جو سعادت اخروی اور عذاب جہنم کے عذاب سے نجات کا باعث ہے ورنہ ظاہری احکام کے اثبات کیلئے کلمہ شہادتین کا پڑھ لینا کافی ہے۔

5۔ قانون گذار حضرات اور اسلام میں حاکمیت

اسلامی نظریہ اور تشریعی ربوبیت کی بنیاد پر یہ کہا جائے کہ قانون گذاری کا اصل حق خداوند عالم کو ہے اور خدا کے مقابلہ میں کسی کو قانون گذاری کا حق نہیں ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا قانون گذاری کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ خدا کے قانون گذاروں کے مقابلہ میں ان لوگوں کو قانون گذاری کا حق ہے جن کو خداوند عالم نے اجازت دی ہے، اور ان کا قانون اس صورت میں قابل اجرا ہے وہ قانون خدا کے اذن سے ہو:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۔ [1]

"اور جھوٹ موٹ جو کچھ تمہاری زبان پر آئے (بے سمجھے بوجھے) نہ کہہ بیٹھا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ اس کی بدولت خدا پر جھوٹ، بہتان باندھنے لگو اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ اور بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے"

پس اپنی طرف سے نہیں کہنا چاہئے کہ فلاں چیز حلال اور فلاں چیز حرام، حلال وحرام آپ کے حساب سے نہیں ہے بس لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے، لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ خدا کا کہنا ہے:

قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ ۖ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ۔ [2]

"(اے رسول) تم کہدو کہ کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہتان باندھتے ہو"

جی ہاں خدا نے اپنے پیغمبر کو قانون گذاری اور امور دینی کی اجازت دی ہے۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۔ [3]

"(اے ایمان دارو) خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو"

نیز فرمایا:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۔ [4]

"اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی"

البتہ رسول خدا بھی اپنی مرضی کے مطابق عمل نہیں کرتے بلکہ آپ کا عمل بھی خدا کی وحی والھام کے مطابق ہوتا ہے اور جب تک آیات نازل نہیں ہوتیں، الٰہی الھام اور غیر قرآنی وحی کے ذریعہ خداوند عالم کا تشریعی ارادہ ان تک پہنچتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ ۔ [5]

---

[1] سورۂ نحل آیت ۱۱۶

[2] سورۂ یونس آیت ۵۹

[3] سورہ نساء آیت ۵۹

[4] سورہ نساء آیت ۸۰

[5] سورہ نجم آیت ۳، ۴

"اور وہ ہر رسول) تو اپنی نفسانی خواہش سے کچھ بھی نہیں کہتے، یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے"

اس بنا پر اگر کسی کو خدا کی طرف سے اجازت ہو تو وہ قانون کو واضع کر سکتا ہے اور اس کا بنایا ہوا قانون لازم الاجراء ہے شیعہ حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قانون بنانے کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح ائمہ معصومین علیہم السلام کو بھی خدا کی طرف سے قانون بنانے کی اجازت ہے البتہ اس مطلب کی دلیل علم کلام میں واضح طریقہ سے بیان ہوئی ہے، ان میں سے ایک حدیث ثقلین ہے کہ جس میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کو قرآن کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے:

"اِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُم بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي. كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي. [1]

میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہوگے ایک کتاب خدا اور دوسرے میری عترت (اہل بیتؑ)۔

ہم یہاں پر شیعیت کے عقائد کو اثبات نہیں کرنا چاہتے، لیکن پھر بھی اشارہ کرتے ہیں کہ جو لوگ شیعوں کے اس قبول شدہ عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ ائمہ معصومین علیہم السلام کو اس طرح کی اجازت ملی ہوئی ہے، اس نظریہ کے مقابل میں بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم اور واجب الاحترام ہیں لیکن اس اختلاف نظر سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مثلاً اگر فرض کریں کہ ہم لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے اور آپ کسی شہر کیلئے کوئی حاکم بنا کر بھیجتے، اور فرماتے کہ اس حاکم کی اطاعت کریں، تو کیا یہ اطاعت واجب تھی یا نہیں؟ کیا یہ اطاعت، اطاعت پیغمبر خدا اور حاکمیت خدا کے مخالف ہوتی؟ ہرگز نہیں؟ کیونکہ وہ شخص اس پیغمبر کا نمائندہ ہے کہ جس کو خدا نے معین فرمایا ہے۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام بھی ایسا ہی اختیار رکھتے ہیں، اور ائمہ نے اس عصر حاضر کیلئے نوعی (عمومی) طور پر (نہ کہ شخصی طور پر) ان افراد کو منصوب فرمایا ہے جو ائمہ کی طرح سب صالح سے زیادہ ہیں ان کو حکومت کی اجازت ملی ہوئی ہے، اور یہ نظریہ چاہے مقبولہ عمر ابن حنظلہ یا مرفوعہ ابو خدیجہ یا دیگر روایات کے ذریعہ ثابت کیا جائے، یا عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جائے جیسا کہ فقہا کرام نے مختلف طریقوں سے اس نظریہ کو ثابت کیا ہے۔

پس جس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے زمانہ میں کسی کو کسی شہر یا اسلامی علاقہ کا حاکم بنا کر بھیجتے تھے، اور ان کی اطاعت وہاں کے رہنے والوں پر واجب ہوتی تھی، یا جس طرح حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے دوران بہت سے لوگوں کو اسلامی ممالک منجملہ بحرین، اہواز، مصر وغیرہ کیلئے والی اور حاکم بنا کر بھیجا، اور ان حضرات کی اطاعت واجب تھی، اس غیبت کے زمانہ میں جو حضرات فقاہت و سیاست میں مالک اشتر کی طرح ہیں اور اسلامی معاشرہ کے چلانے کی صلاحیت اور توانائی رکھتے ہیں، ولایت فقیہ کے دلائل کے تحت ان کو اجازت ہے اور ان کی اطاعت بھی ہم لوگوں پر واجب ہے، اور وہ خدا کی

---

[1] ۱۔ مسند حنبل ج ۳، ص ۱۷، ۲۔ صحیح المسلم۔ ص ۲۳۸، ۳۔ کنز العمال ج ۷۔ ص ۱۱۲، ۴۔ صحیح ترمذی ج ۲۔ ص ۳۰۸، ۵۔ الحاکم المستدرک ج ۳، ص ۱۰۹، ۶۔ ینابیع المودت ص ۲۵۔ ۷۔ الصواعق المحرقہ ص ۱۵۰، مکتبہ القاہرہ۔ ۸۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲، ص

تشریعی ربوبیت کے مخالف بھی نہیں ہے بلکہ ان کی حاکمیت بھی خدا کی شان میں سے ایک شان ہے۔

جس طرح خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے اور پیغمبر اس حاکم کو فرمان دیتے ہیں یا امام معصوم اپنے خاص جانشین اور والی کو اجازت دیتے ہیں ان کی اطاعت ہم لوگوں پر واجب ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہ والی و حاکم کی اطاعت پیغمبر اور خدا کی اطاعت ہے، اور اس والی و حاکم کی مخالفت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔

اس طرح ولی فقیہ کی اطاعت، امام معصوم کی اطاعت اور امام معصوم کی اطاعت پیغمبر کی اطاعت اور پیغمبر کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوگی، اور اس کی مخالفت معصوم کی مخالفت اور معصوم کی مخالفت خدا کی مخالفت ہوگی، یہ مطلب مقبولہ عمر ابن حنظلہ کی روایت سے واضح و روشن ہے جس میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ینظرنی من کان منکم ممن قد روی حدیثنا ونظر فی حلالنا وحرامنا وعرف احکامنا فلیرضوا به حکما فانی قد جعلته علیکم حاکما. فاذا حکم بحکمنا فلم یقبله فانما استخف بحکم الله وعلینا ردوالراد علینا الراد علی الله وهو حد الشرک بالله". [1]

"اگر کوئی ہماری احادیث کو نقل کرنے والے کو دیکھے اور ہماری حلال وحرام کردہ چیزوں بیان کرنے والے کو دیکھے اور ہمارے احکام کو جانتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس کے حکم کو قبول کرے کیونکہ ہم نے اس کو تم پر حاکم قرار دیا ہے، لہٰذا اگر ہمارے حکم کے مطابق عمل کرنے اور کوئی اس کو قبول نہ کرے تو گویا اس نے خدا کے حکم کو سبک (ھلکا) سمجھا، اور ہم کو رد کیا اور جس نے ہم کو رد کیا گویا اس نے خدا کو رد کیا، اور یہی شرک باللہ ہے"

حضرت امام صادق علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ "وھو علی حد الشرک" کی کیا وجہ ہے کہ شرک کو توحید کے مقابلہ میں قرار دیا ہے اور توحید کے ارکان میں سے ایک رکن تشریعی ربوبیت میں توحید ہے اب اگر ہم نے خدا کی حاکمیت اور اس کے ساتھ ساتھ پیغمبر، ائمہ، اور ان لوگوں کی حاکمیت کو قبول کیا ہے کہ جن کو خدا وائمہ نے منصوب کیا ہے، تو ہم نے تشریعی ربوبیت میں توحید کو قبول کیا ہے اور اگر اس کو نہیں مانا تو پھر تشریعی ربوبیت میں شرک کیا، پس "الراد علیھم" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے ان فقہا کرام کو رد کیا جن کو لوگوں پر حکومت کرنے کا حق ہے اس نے گویا ائمہ کو رد کیا ہے یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ میں ولایت فقیہ کو نہیں مانتا گویا وہ یہ کہتا ہے کہ میں امام معصوم کو نہیں مانتا، اور اگر کوئی امام کو قبول نہیں کرتا اس نے خداوند عالم پر ایک قسم کا شرک کیا ہے کیونکہ اس نے خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کا انکار کیا ہے البتہ یہ شرک معنوی اور باطنی ہے، اور انسان کی نجاست کا سبب نہیں بنتا۔

لہٰذا ثابت یہ ہوگیا کہ اگر کوئی قبول کرتا ہو کہ درحقیقت حکومت کا حق خدا سے مخصوص ہے اور اس کے بعد رسول اللہ سے مخصوص ہے اور خدا کی حاکمیت کے زیر سایہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام اور ان کے جانشین حضرات کی حاکمیت تحقق

---

[1] کافی ج ۱ ص ۶۷

اور مشروعیت پیدا کرتی ہے، لیکن اگر ہم حاکمیت کی مشروعیت کو کسی دوسرے راستہ سے مانیں تو درحقیقت خدا کی حاکمیت کے بارے میں شرک کے قائل ہوئے ہیں، اس بنا پر، اسلامی حکومت میں الٰہی قوانین اور اس حاکم کے بنائے قانون کے تحت ہو کہ جو خدا کی طرف سے اذن رکھتا ہو اس کی عقلی دلیل خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت ہے، اگر توحید کو صحیح معنوں میں سمجھا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے اور اگر انسان اس نتیجہ کا انکار کرے تو گویا اس کا عقیدہ کمزور ہے اور اس کی توحید خالص نہیں ہے اور اس میں شرک کی آمیزش ہے۔

ممکن ہے کوئی سوال کرے کہ معاشرہ میں الٰہی قوانین کے ہونا کا کیا فلسفہ ہے؟ اگر کوئی خدا اور اس کے قوانین کو قبول نہ کرے اور خود اپنے لئے قوانین بنائے تو کیا معاشرہ کی فلاح و بہبود نہیں ہو سکتی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کس طرح جو معاشرے خدا کے قوانین کو تسلیم نہیں کرتے لیکن پھر بھی ان کی زندگی بہتر ہے؟ یہ وہ نظریہ ہے جس کو بہت سے روشن فکر لوگ بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قانون کا خدا کی طرف ہونا، کیا ضروری ہے؟ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خود ہم اپنے لئے قانون بنا کر اس پر عمل کریں اور کوئی مشکل نہیں ہے۔

6۔ قانون گذاری حق خدا سے مخصوص ہونے کے دلائل

اس اعتراض کا جواب واضح ہونے کیلئے یہ توجہ رکھنا ضروری ہے کہ انسان ایک ایسا موجود واحد ہے جو مختلف پہلو رکھتا ہے اور یہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے مرتبط ہیں انسان میں صرف اقتصادی پہلو نہیں ہے کہ اگر اقتصادی قانون بنا دیا تو معاشرہ میں اس کی اقتصادی مشکل آسان ہو جائے، کیونکہ اس کا اقتصاد اس کی سیاست سے مربوط ہے اور اس کی سیاسی، اجتماعی اور مدنی احکام سے مرتبط ہیں اس کے مدنی احکام اس کے جزائی احکام سے مربوط ہیں اور یہ سب بین الاقوامی قوانین سے مرتبط ہیں، اور تمام کے تمام انسان کے روحی و معنوی اور اخلاقی پہلو سے گہرا ارتباط رکھتے ہیں، انسان دس موجود نہیں ہیں اور نہ ہی دس روح رکھتا ہے، انسان ایک الٰہی روح رکھتا ہے جس کے مختلف پہلو اور گوشہ ہیں لیکن تمام ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔

لہٰذا اگر کسی ایک پہلو میں کوئی نقص و کمی پیدا ہو جائے تو پھر اس کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے، وہ خدا جس نے انسان کو پیدا کیا اور انسان کیلئے اجتماعی زندگی مقرر فرمائی ہے، اجتماعی زندگی کی خاطر انسانی فطرت میں ایسے اسباب قرار دیئے جن کی وجہ سے انسان طبیعی طور پر اجتماعی زندگی کی طرف رجحان پیدا کرتا ہے، لہٰذا خداوند عالم نے انسان کی خلقت ایک مقصد کے تحت کی ہے، اور وہ مقصد یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ انسانی کمالات تک پہنچے، اور اسی کے تمام پہلو، معنوی پہلو کے تحت کام کریں، اور وہ ترقی کی منزلوں کو طے کرتا ہوا انسانی کمالات تک پہنچے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔[1]

"ہم نے نہیں پیدا کیا جن و انس کو مگر یہ کہ ہماری عبادت کرے"

---

[1] سورہ ذاریات آیت ۵۶

جو کچھ بھی ہم نے عرض کیا یہ سب کچھ عبادت کے زیر سایہ ہوں وہ عبادت جو توحید اور ربوبیت سے جداناپذیر ہونے والا ارتباط رکھتی ہے، ورنہ انسانی کمال پیدا نہیں ہوسکتا، البتہ اس کے علاوہ بھی معاشرہ میں ظاہری طور پر نظم وضبط پیدا ہوسکتا ہے لیکن یہ بھی یقینی نہیں ہے، مثلاً جیسا کہ آج کل مختلف ممالک جن کا نمونہ امریکہ ہے اور امریکہ کے کالج تمام ممالک کیلئے نمونہ قرار پائے ہیں، جب کہ ان کالجوں میں پولیس اسلحہ کے ساتھ رہتی ہے لیکن پھر بھی وہاں قتل وغارت ہوتا رہتا ہے، ملاحظہ کریں کہ یہ وہی نظام ہے جس کو انسان نے بنایا ہے اور اس طرح کے دوسرے کارنامے ہیں، جن کے بیان کرنے سے انسان کو شرم آتی ہے۔

یہاں تک کہ اگر فرض کیا جائے کہ خدا کے قوانین پر عمل انسان کے معنوی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے معاشرہ میں ظاہری طور پر نظم وضبط قائم ہوجائے، تو پھر بھی اس کی زندگی کا اصل ہدف پورا نہیں ہوا ہے، کیا انسان کی زندگی موریانہ (ایک قسم کے حشرات ہیں جو شھد کی مکھی کی طرح ایک جگہ مل کر زندگی کرتے ہیں) زندگی کی طرح ہے؟ یا انسان کی زندگی شھد کی مکھیوں کی طرح ہیں کہ جن کا ظاہر نظم کافی ہے، انسان کی زندگی یہ تمام نظام، امنیتیں، ترقیاں، علام اور ٹکنالوژی صرف اس وجہ سے ہیں تا کہ انسان کمال حاصل کر سکے اور خدا سے نزدیک ہوسکے، کون ہے جو ان روابط کو اچھے طریقہ سے سمجھتا ہے؟ کون حضرات ہیں جو بتائیں کہ کس کھانے سے یا کس کام سے انسان خدا کے نزدیک ہوتا ہے؟ کون یہ معین کرے کہ خنزیر کا گوشت کھانے، شراب پینے سے ہماری سعادت وکامیابی پر اثر ہوتا ہے یا نہیں؟ آج ڈاکٹروں نے ترقی کرکے یہ بتایا ہے کہ الکحل (شراب) زیادہ پینے کی وجہ سے انسان کا ذہن خراب ہوسکتا ہے، لیکن یہ نہیں جانتے کہ شراب کے پینے سے آخرت کو بھی نقصان پہنچتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس سلسلہ میں تجربہ نہیں کیا ہے اور اس مسئلہ کو تجربہ کیا بھی نہیں جاسکتا۔

انسانی زندگی کے قوانین اس طرح ترتیب دیئے جائیں کہ زندگی کے تمام پہلو پیش نظر رہیں، اور صرف جسمانی بہداشت ونظافت، اقتصادی اور سیاسی وضعیت پر اکتفاء نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو دوسرے پہلوؤں سے جدا سمجھا جائے، بلکہ ان تمام پہلوؤں کو ایک مرتب اور ہم آہنگ نظام میں ڈھالا جائے، ظاہر ہے کہ ان تمام پہلوؤں کی مکمل آگاہی اور ان کے ایک دوسرے سے ارتباط اور ان کے ذریعہ آخری کمال تک پہنچانے کا علم خدا کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے، لہٰذا قوانین کو بھی خدا ہی بنائے، اس کے علاوہ کونسا ایسا قانون گذار ہے کہ جو قانون بناتے وقت اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کرسکے، اور ظاہر ہے کہ جو گروہ بھی قدرت وحکومت پر قابض ہوگا وہ اپنے فائدوں کے بارے میں قوانین کو بنائے گا، مثال کے طور پر انہیں اسلامی ممالک میں جب کوئی نئی حکومت بنتی ہے تو ایسے قوانین اور بخش نامے تیار کرتی ہے کہ جو اس گروہ کے فائدے میں ہو، اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ چاہے سمت راست پارٹی ہو یا بائیں بازو کی پارٹی، یہ انسان کی خاصیت اور طبیعت ہے اور بہر حال تمام انسان معصوم بھی نہیں ہیں۔

ان مسائل سے صرف وہ ذات مبرّا ہوسکتی ہے کہ جس کو ان مسائل سے کوئی فائدہ نہ ہو، اور ایسی ذات خداوند عالم کی ذات ہے، اور اگر کوئی دوسرا قانون بنائے گا تو ممکن ہے کہ وہ قوانین اس کے لئے یا ضرر ہونگے یا نفع بخش، لیکن خدا کے

بنائے قوانین سے خدا کو نہ کوئی نفع ہے اور نہ کوئی نقصان، وہ تو صرف انسانیت کے نفع و نقصان کو دیکھتا ہے، لہٰذا چونکہ خدا کا علم بے نہایت ہے اور قوانین کے بنانے سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے؟ جبکہ انسان پر حق حکومت ربوبیت بھی رکھتا، اور اگر انسان حقیقی کمال تک پہنچتا ہے تو خدا کے حق ربوبیت کو ادا کرے، البتہ یہ ایک الگ بحث ہے اور مزید وضاحت کی ضرورت ہے جس کی تحقیق اس کتاب میں ممکن نہیں ہے۔

انسان ایک دوسرے پر حق رکھتے ہیں اور عرفی حقوق کی معرفت رکھتے ہیں، مثلاً کسان مزدور پر حق رکھتا ہے اور مزدور کسان پر حق رکھتا ہے، یا ایک وزیر لوگوں پر حق رکھتا ہے، اور لوگ بھی وزیر پر حق رکھتے ہیں، لیکن کیا خدا لوگوں پر حق نہیں رکھتا؟ اور اس حق کو ادا کرنے کا راستہ بھی معلوم ہے، اسلامی نظریہ کے مطابق، ان تمام حقوق میں سب سے پہلے خدا کا حق ہے، لہٰذا سب سے پہلے خدا کے حق کو ادا کیا جائے، تا کہ خدا کے حق کے زیر سایہ لوگوں کے حقوق بخوبی انجام دیئے جاسکیں۔

تو کیا ممکن ہے کہ بنائے ہوئے قوانین میں انسان کے حقوق کا لحاظ کیا جائے لیکن خدا کے حقوق کو نظر انداز کر دیا جائے؟ اور اگر خدا کے حقوق کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو کیا خدا کے حقوق پر ظلم و جفا نہیں ہوا ہے؟ اور کیا اس ناشکری کے بعد انسان کمال کی منزل تک پہنچ سکتا ہے؟ خدا کی ناشکری سے بڑھ کر کون سی ناشکری ہوسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ [1]

"بے شک شرک بڑا سخت گناہ ہے (جس کی بخشش نہیں)"

سب سے بڑا ظلم خدا پر ظلم کرنا ہے، لہٰذا اگر خداوند عالم کے حقوق نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ظلم عظیم ہے، اس وقت کس طرح دوسروں کے ساتھ عدالت برقرار کر سکتے ہیں؟ انسان کس طرح عدل کر سکتا ہے درحالیکہ خود اپنے خالق پر ظلم کرتا ہے؟ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ غیر خدا کیلئے حق قانون گذاری کا عقیدہ ایک شرک ہے، لہٰذا چونکہ خداوند عالم ہمارے نفع و نقصان سے مکمل آگاہی رکھتا ہے اور خدا کیلئے قانون گذاری کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اور خداوند عالم ہر پر تشریعی ربوبیت کا حق رکھتا ہے، سب سے پہلے مرحلہ میں خدا کے قوانین کی رعایت کی جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کے قوانین پر عمل کیا جائے کہ جن کو خدا کی طرف سے اجازت ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ جس کی خدا نے اجازت دی ہے، تا کہ انسان اس آیت کا مستحق قرار نہ پائے:

قُلْ أَرَءَيْتُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ لَكُم مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا ۖ قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ ۖ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ۔ [2]

---

[1] سورۂ لقمان آیت ۱۳

[2] سورۂ یونس آیت ۵۹

"(اے رسول) تم کہہ دو کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ خدا نے تم پر روزی نازل کی تو اب اس میں سے بعض کو حرام، بعض کو حلال بنانے لگے، (اے رسول) تم کہہ دو کہ کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہتان باندھتے ہو۔"

اس طرح دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ۔ [1]

"اور جھوٹ موٹ جو کچھ تمہاری زبان پر آئے (بے سمجھے بوجھے) نہ کہہ بیٹھا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تا کہ اس کی بدولت خدا پر جھوٹ، بہتان باندھنے لگو اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ اور بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

اس بنا پر، خدا کے تشریعی حق ربوبیت کی ادائیگی کیلئے پہلے خدا کے قانون پر عمل کریں، اور اس کے بعد تحقیق و بررسی کرے کہ اس نے کسی کو قانون گذاری کی اجازت دی ہے، یا کسی کو قانون کو جاری کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ اگر قانون کو اس کی اجازت سے جاری نہ کیا جائے تو پھر بھی خدا کے بندوں پر تصرف کرنا ان کے مولا و آقا کی اجازت کے بغیر ہوگا، اسلامی نظریہ کے مطابق خدا کی مرضی کے خلاف دوسروں پر تصرف کرنا تو دور کی بات ہے خود پر تصرف کرنا بھی جائز نہیں ہے، اس وجہ سے انسان کو خودکشی کا حق نہیں ہے۔

ممکن ہے مغربی ممالک میں لیبرالی نظریہ کے تحت چونکہ انسان خود اپنا مالک ہے، لہٰذا اس کو خودکشی کا بھی حق حاصل ہے، لیکن اسلام میں اس طرح نہیں ہے، کیونکہ انسان خود اپنا مالک نہیں ہے بلکہ خدا اس کا مالک ہے، لہٰذا اس کو خودکشی کا بھی حق نہیں ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے اس کو اس کام کی اجازت نہیں ہے، خداوند عالم نے اگر انسان کو زندگی عطا کی ہے تو اس کا اختیار بھی خود اسی کو ہے، کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہے تو پھر کس طرح کسی غیر کو اس کی جان لینے کی اجازت ہوگی؟

جب انسان اپنا ہاتھ کاٹ ڈالنے یا اپنی آنکھ پھوڑ ڈالنے کا حق نہیں ہے اس لئے کہ ان کا مالک خدا ہے اور انسان کو ان کام کی اجازت نہیں ہے، تو پھر کسی دوسرے کو کہاں سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے یا کسی مجرم کو قید کردے؟ کسی کو بھی اس طرح کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ دوسرے لوگ بھی خدا کے بندے ہیں اور خدا کی اجازت کے بغیر ان میں تصرف نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا قانون گذاری اور قانون کو جاری کرنے میں خدا کی اجازت ضروری ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس سلسلہ میں اسلام کا سیاسی نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کی تشریعی ربوبیت، توحید کا رکن ہے، اور اگر کسی نے اس کی رعایت نہ کی تو پھر وہ شیطان کے کفر کی طرح کفر کا مرتکب ہوا ہے۔

---

[1] سورہ نحل آیت ۱۱۶

اٹھارہواں نشست

قانون گذاری کے شرائط اور اسلام میں اس کی اہمیت

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

گذشتہ نشستوں میں عرض کیا جاچکا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث میں دو سوالوں کا جواب دینا بہت ضروری ہے:

پہلا سوال: یہ ہے کہ معاشرے کے لئے قانون کا ہونا کیوں ضروری ہے؟

دوسرا سوال: یہ ہے کہ کون سا قانون مفید اور مطلوب ہے اور اس کے وضع کرنے کا اور پھر اس کو معاشرہ میں جاری کرنے کا مقصد کیا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں گذشتوں نشستوں میں ہم نے عرض کیا کہ دنیا کے تقریباً تمام ہی عقلاء کا اتفاق اس بات پر ہے کہ معاشرے میں اخلاقی قوانین کے علاوہ حکومتی قوانین بھی ہونا چاہئے، لیکن دوسرے سوال کا جواب کہ قانون کا ہدف کیا ہے؟ اس سلسلے میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے، ایک نظریہ یہ ہے کہ قانون معاشرہ کے نظم وضبط سنوارنے کے لئے ہوتا ہے، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قانون معاشرہ میں عدل وانصاف کے لئے ہوتا ہے، تیسرا نظریہ اس وقت لیبرالیزم نے بیان کیا ہے کہ قانون انسان کی انفرادی آزادی کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے یعنی انسان اپنی زندگی میں ہر طرح سے آزاد ہونا چاہئے کہ جو چاہے وہ انجام دے سکے، لیکن اس طرح مقام عمل میں مزاحمت اور ٹکراؤ ہوگا کہ بعض افراد کی وجہ سے دوسروں کی آزادی خطرہ میں پڑجاتی ہے، لہٰذا قانون اس وجہ سے وضع کیا گیا ہے کہ سب کی آزادی برقرار رہ سکے، اور مزاحمت سے روکا جاسکے۔

جیسا کہ گذشتہ بحث میں ہم نے عرض کیا کہ اسلام کے سیاسی نظریات میں انسانوں کی امنیت ونظم وضبط اور عدالت وغیرہ کی حفاظت متوسط قسم کے اہداف ہیں، لیکن اسلام کی قانون گذاری کا اصل ہدف انسانوں کے مادّی اور معنوی فوائد کی حفاظت ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معنوی فائدے مادی فائدوں سے کہیں زیادہ اہم ہیں، لہٰذا قانون اس طرح ہونا چاہئے کہ جس سے انسان کی کمال تک پہنچنے کے لئے راہ ہموار ہوسکے یعنی جو تقرب خداوند متعال کا باعث بنے، لہٰذا جو چیزیں خدا کی طرف جانے میں مانع ہوں، وہ معاشرہ سے ختم ہوجانا چاہئے، مختصر الفاظ میں یہ کہا جائے کہ قانون وہ ہے جس میں تمام انسانوں کے مادی اور معنوی مصالح ومنافع کی حفاظت ہو۔

یہاں پہنچنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون گذار کون ہونا چاہئے؟ اس سلسلے میں بھی مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، خلاصہ یہ کہ سیاسی اور حقوق الناس کے دعویدار حضرات کے درمیان دو شرطوں کو معتبر جانا گیا ہے:

پہلی شرط: قانون گذار وہ ہو جو قانون کے ہدف کو اچھی طرح جانتا ہو۔

دوسری شرط: قانون گذار معاشرہ کے منافع کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان نہ کرے، اور وہ قانون کے اہداف و مقاصد کو اچھی طرح جانتا ہو۔

ان دو چیزوں کو تقریباً تمام ہی لوگ قبول کرتے ہیں، اگر چہ ان کے قانون بنانے کے اہداف مختلف ہیں، بہر حال قانون بنانے سے کسی کا کوئی ہدف ہو وہ یہ ضرور مانتا ہے کہ قانون گذار کو قانون کے اہداف سے اچھے طریقہ سے واقفیت ہونا چاہئے، اور ان اہداف تک پہنچنے کے راستوں سے واقف ہو، تا کہ اس کے بنائے ہوئے قوانین کے ذریعہ ان اہداف تک پہنچا جاسکے، قانون گذار کا علم ایسا ہو کہ جس کے ذریعہ قوانین کے اہداف تک پہنچنے کا راستہ کا پتہ لگا سکے، اور قوانین کو اسی کے مطابق بنائے، اور اخلاقی صلاحیت ایسی ہو کہ معاشرہ کے مفاد کو اپنے مفاد پر قربان نہ کرے۔

2۔ قانون گذاری کے شرائط خداوند عالم میں منحصر ہیں

اسلامی نظریہ کے مطابق مذکورہ شرطوں کے علاوہ، قانون گذار کی انسانی مادّی و معنوی مصلحتوں سے واقفیت ضروری ہے اور کسی خاص فرد یا کسی خاص گروہ کے فائدہ کی خاطر معاشرہ کے فائدوں کو قربان نہ کرے۔

اسلام اس نکتہ کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ قانون گذاری کا اصل حق اسی کو ہے جو انسانوں کو امر ونہی کرسکتا ہو، اگر کوئی معاشرہ کی مصلحتوں کا علم رکھتا ہو اور وہ معاشرہ کی مصلحتوں کو اپنی ذاتی مصلحتوں پر مقدم کرے پھر بھی قانون گذاری کا حق اصالۃً اس کو نہیں ہے؛ کیونکہ ہر قانون خواہ نا خواہ امر ونہی رکھتا ہے، جیسا کہ ہم نے بحث "حق و تکلیف" کے بارے میں گذشتہ نشستوں کے دوران عرض کیا کہ ہر قانون صریحاً یا اشارۃً امر ونہی رکھتا ہے، مثلاً تا یک دفعہ کہا جاتا ہے کہ دوسروں کے مال کا احترام کرو اور اس میں تجاوز نہ کرو، یہ امر صریح اور واضح ہے لیکن کبھی قانون میں ظاہری طور پر امر نہیں ہوتا، مثلاً کہا جائے کہ آپ کے لئے اس طرح کا حق ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرے اس حق کی رعایت کریں، ان تمام چیزوں کا قانون ضامن ہوتا ہے، یعنی یہ ساری باتیں قانون کے اندر ہونا چاہئے گویا اس طرح کا امر پر بھی قانون مشتمل ہوتا ہے۔

لہٰذا قانون کو یہ حق ہے کہ دوسروں کو امر ونہی کرے اور یہ اصل حق خدا سے مخصوص ہے، چاہے شرط اول کے لحاظ سے دیکھا جائے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ قانون گذار کو انسانوں کے مصالح سے آگاہ ہونا چاہئے ے، یا شرط دوم کے لحاظ سے دیکھا جائے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ قانون گذار وہ ہے جو اجتماعی مصالح پر فردی مصالح کو مقدم نہ کرے، ان دونوں شرطوں کے اعتبار سے خدا متحقق ہے کیونکہ وہ انسانوں کے مصالح کا سب سے زیادہ عالم ہے، چنانچہ مذکورہ شرطیں سب سے زیادہ کامل خدا میں موجود ہیں؛ کیونکہ انسان کے اعمال کا کوئی بھی فائدہ خدا کو نہیں پہنچتا، مثلاً اگر تمام انسان مومن و متقی بن جائیں تو خدا کا کوئی

فائدہ نہیں ہے اور اسی طرح اگر تمام لوگ کافر ہو جائیں تو بھی خدا کا کوئی نقصان نہیں ہے، اگر تمام لوگ قوانین کی رعایت کریں تو بھی خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے اسی طرح اگر تمام لوگ قوانین کی مخالفت کریں تو بھی خدا کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

لیکن تیسری شرط، (امر ونہی) خدا کے علاوہ کوئی بھی انسان اصالۃً یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی کو امر ونھی کرے، انسان دوسرے کو اس وقت امر ونھی کر سکتا ہے جس اس کا دوسرے پر کوئی حق ہو اور لوگوں کا ایک دوسرے پر اس طرح کا کوئی حق نہیں ہے، خدا کی نظر تمام کے تمام انسان برابر ہیں، خدا ان سبھی کا مالک ہے اور انسان اور اس کا تمام وجود خدا سے متعلق ہے، لہٰذا صرف خدا کو انسانوں پر امر ونھی کا حق ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ عرض کیا جائے کہ انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی ربوبیت کو پہچانیں اور اس کی ربوبیت کے حق کو ادا کرے اور خداوند عالم کی ربوبیت انسانوں کے لئے دو اعتبار سے ظاہر ہے:

1۔ تکوینی، یعنی کائنات کے چلانے کا حق صرف ذات باری تعالیٰ سے مخصوص ہے وہی کائنات کا مدبّر ہے، لہٰذا انسان اس چیز کا عقیدہ رکھے کہ خداوند عالم نے اس کائنات میں کچھ تکوینی قوانین نافذ کئے ہیں جن کے تعاون سے یہ کائنات رواں دواں ہے، چاند سورج اسی کے حکم سے گردش میں ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے اشارہ پر چلتا ہے، لہٰذا اس کائنات کا صاحب اختیار، ربّ تکوینی اور اس کائنات کا چلانے والا خدا وحدہ لاشریک ہے، اسی طرح یہ عقیدہ بھی رکھے کہ اس کائنات کا ربّ تشریعی بھی خداوند عالم ہے، گذشتہ جلسہ میں اس سلسلہ میں گفتگو ہو چکی ہے کہ ربوبیت تشریعی بھی خدا ھی کا حق ہے اور ربوبیت تشریعی میں توحید اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان فقط خدا سے احکامات کو لے اور اس سے قانون کو اخذ کرے، اور قانون کو جاری کرنے والے افراد خدا کی اجازت سے معاشرہ میں جاری کریں۔

3۔ قانون بنانے والے متعدد ہو سکتے ہیں (ایک اعتراض)

یہاں پر کچھ شبہات بیان کئے جاتے ہیں: (گذشتہ گفتگو میں ان اعتراضات وشبہات کے بارے میں ایک اشارہ ہو چکا، لیکن کبھی کبھی اخباروں یا تقریروں یا کانفرنس وغیرہ میں کچھ چیزیں بیان کی جاتی ہیں کہ جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یا تو ان لوگوں نے اس سلسلہ میں توجہ نہیں کی یا یہ کہ یہ بحث ان کو ھضم نہیں ہوئی، لہٰذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کر دی جائے) ان شبہات میں سے ایک یہ ہے: کہ آپ کہتے ہیں کہ قانون کو خدا وضع کرے، جیسا کہ ربوبیت تشریعی اس بات کا تقاضا کرتی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے میں ایسے قوانین کی ضرورت ہے کہ جن کو خدا نے نہیں بنایا بلکہ خود لوگوں نے ان قوانین کو بنایا ہے، اور اگر ان کو نہ بنایا جاتا تو معاشرہ میں بہت بڑی مشکل ہوتی، مثلاً وہ قوانین جو ہمارے اسلامی معاشرہ میں اسلامی پارلیمینٹ کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں، ان قوانین کی ہمارے معاشرہ کو ضرورت ہے، لیکن ان کو خدا و پیغمبر نے نہیں بنایا، جن کا سب سے واضح نمونہ ٹریفک قوانین ہیں، کہ اگر یہ قوانین نہ ہوتے تو پھر کتنے حادثہ ہوتے کتنے لوگوں کی جان خطرہ میں ہوتی اور کتنا مال برباد ہوتا۔

لہٰذا ایک طرف تو معاشرہ کو ایسے قوانین کی ضرورت ہے جبکہ خدا کی طرف سے ایسے قوانین نہیں بنائے گئے ہیں، نہ ہی قرآن مجید میں اس طرح کے قوانین موجود ہیں اور نہ ہی حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ کے کلمات میں یہ قوانین ملتے ہیں، پس آپ کس طرح یہ کہتے ہیں کہ قوانین کو خدا کی طرف سے ہونا چاہئے اور خدا قوانین کو بنائے؟ اور اگر انسانی قانون گذار کے ذریعہ یہ قوانین بنائے جائیں اور ان کو معتبر سمجھا جائے تو اس بات کا نتیجہ یہ ہے کہ قانون بنانے والے دو مرجع ہوئے ایک خدا اور دوسرے انسان، اور یہ آپ کے بیان کے مطابق تشریع میں شرک ہے، یہ ایک اہم اعتراض ہے کہ جو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے البتہ اس کا جواب بھی دیا جا چکا ہے لیکن جواب کو وہ لوگ صحیح ہضم نہ کر سکے۔

4۔ گذشتہ اعتراض کا جواب

گذشتہ اعتراض کے جواب میں دو نکتوں پر توجہ کرنا ضروری ہے، پہلا نکتہ یہ ہے کہ قانون کی مختلف اصطلاحیں ہیں، کبھی کبھی کلی قواعد کو قانون کہا جاتا ہے، اور ان میں جزئی اور دوسرے دستور العمل شامل نہیں ہوتے، اور کبھی قانون کو اتنی وسعت دی جاتی ہے کہ اس دستور العمل کو بھی شامل ہوتا ہے جو ایک ادارہ کا رئیس اپنے کارکن کو دیتا ہے، البتہ یہ اطلاق بھی نادرست نہیں ہے بہر حال دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ قانون کی دو اصطلاح ہیں ایک خاص اور ایک عام، اور دونوں صحیح ہیں، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں بہت سے ثابت قوانین ہیں، جو کسی بھی وقت تبدیل نہیں ہو سکتے، اور ہر زمانہ میں تمام لوگوں کے لئے ثابت ہیں اور اسلام کے کچھ قوانین متغیر ہیں، جو زمان و مکان سے لحاظ سے ہیں اور ان قوانین کو فقہاء و مجتہدین جن کو دین کی صحیح شناخت و معرفت ہوتی ہے کلی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے بناتے ہیں۔

ہم جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ ایسے قوانین ہیں جو خدا کی طرف سے ثابت قوانین ہیں اور متغیر قوانین کے لئے خاص شرائط ہیں، ورنہ ممکن نہیں ہے کہ تمام ثابت متغیر قوانین کسی ایک قانون گذار کے ذریعہ بنائے جائیں، اور لوگوں کو تک پہنچائے جائیں، متغیر قوانین اپنے زمان و مکان کے اعتبار سے لاتعداد ہیں، اور ان کی کوئی حد نہیں، اور انسان کی ذھنیت آغاز دنیا سے لے کر آخر تک کے متغیر قوانین کے تصور سے عاجز ہے، لہٰذا متغیر قوانین اپنے زمانہ کے اعتبار سے جو اس زمانہ اور مکان کا تقاضہ ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے بنائے جاتے ہیں، مثال کے طور پر چونکہ رسول اسلام کے زمانہ میں کوئی بھی موٹر گاڑی نہیں تھی تو اس موقع پر اگر یہ کہا جاتا کہ گاڑیوں کو داہنی طرف چلنا چاہئے یا بائیں طرف، تو کیا اس وقت کے لوگ اس قانون کو سمجھ سکتے تھے، اور اس قانون کے معنی کو درک کر سکتے تھے؟ لہٰذا قانون کو اس کے زمانہ کے لحاظ سے ہونا چاہئے، البتہ ان قوانین کے کچھ خاص شرائط ہیں کہ جن کو خدا بیان کرتا ہے، لہٰذا جو لوگ ان متغیر قوانین کو مرتب کریں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان شرائط کی رعایت کریں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قوانین وہ حضرات بنا سکتے ہیں کہ جو ثابت قوانین اور متغیر قوانین کے شرائط کو بہتر طور پر جانتے ہوں۔

پس ہماری مراد اس قول سے کہ قوانین کو خدا کی طرف ہونا چاہئے، یہ ہے کہ ثابت قوانین ہمیشگی ہیں اور متغیر

قوانین کے لئے بھی شرائط خدا کی طرف سے معین شدہ ہوں، جن کو متغیر قوانینکا میزان قرار دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ۔ [1]

"اور ترازو (انصاف) کو قائم کیا تا کہ تم لوگ ترازو (سے تولنے) میں حد سے تجاوز نہ کرو"

الٰہی اور توحیدی نظریہ جس بات کی تاکید ہے اور تقاضا کرتا ہے وہ تیسرا نکتہ ہے جس کو ہم نے قانون بنانے کے سلسلہ میں گفتگو کے دوران بیان کیا، اور وہ یہ ہے: چونکہ قانون میں امر ونھی ہوتا ہے، اور جس کو قانون بنانے کا حق ہے اس کو امر ونھی کرنے کا بھی حق ہونا چاہئے، اور وہ خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہے، خود انسان ایک دوسرے پر امر ونھی کا حق نہیں رکھتے لہٰذا قانون کو بھی نہیں بنا سکتے اور نہ ہی اس کو جاری کر سکتے، لہٰذا اگر زمان ومکان کے لحاظ سے متغیر قوانین کو بنانا پڑے تو اس کی اجازت بھی خدا کی طرف سے ہو، کیونکہ صرف وہی ہے کہ جسے امر ونھی کا حق ہے، اور وہی دوسروں کو یہ حق عطا کر سکتا ہے تا کہ ان کے بنائے ہوئے قوانین معتبر ہو سکیں۔

5۔ قانون گذاری میں خدا کی اجازت بے اثر ہے (دوسرا اعتراض)

ایک دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ قانون گذاری میں خدا کی اجازت کا معتبر ماننا صرف ایک دعویٰ ہے، جس کا کوئی اثر نہیں ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ اس شرط سے قانون گذاری میں کوئی تغیر و مشکل ایجاد ہو، اور یہ صرف ایک الفاظ کا کھیل ہے، مثلاً اسلامی پارلیمینٹ میں ممبران جمع ہو کر کسی اجتماعی متغیر امر کے لئے قانون بنانے کا مشورہ کریں، اور اس کے بعد کوئی خاص قانون بنا کر پیش کریں، اس موقع پر کیا فرق ہے کہ خدا نے اجازت دی ہے یا نہیں؟ یہ صرف ایک لفظ ہے جس کو استعمال کیا گیا ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہے، لہٰذا قانون کا معیار یہ ہے کہ اچھائیوں اور برائیوں کو جاننے والے حضرات اس کی تحقیق و بررسی کر کے کوئی قانون بنا دیں، اب یہاں کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ قانون اس کی طرف سے قانون گذاری کا حق ہے یا قانون دان افراد کے ذریعہ یہ قانون بنا دیا جائے، (توجہ رہے کہ یہ اعتراض بھی اپنی جگہ اہم ہے)۔

6۔ گذشتہ اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ ہم اس طرح کی اجازت کو معتبر جانتے ہیں، اور اصطلاح میں اس کو ایک امر اعتباری کہا جاتا ہے، اور کسی کا کسی دوسرے کو کسی کام کی اجازت دینے سے کام کی حقیقت نہیں بدلتی، لیکن کیا انسان کی اجتماعی زندگی ان اعتبارات کے علاوہ ہے؟ مثلاً اگر کسی شخص نے اپنی گاڑی کو کسی جگہ کھڑا کر دیا ہے اور آپ کو اس گاڑی کی ضرورت پڑ جاتی ہے، آپ اس پر بیٹھیں اور اپنے کام کر کے واپس آ جائیں تو کیا آپ اس کی اجازت کے بغیر اس گاڑی کو لے جا سکتے

---

[1] سورہ رحمٰن آیات ۷، ۸

ہیں؟ اور ہو سکتا ہے کہ گاڑی کا مالک آپ کو اجازت بھی دیدے، لیکن جب تک اس کی اجازت نہیں ہے کیا آپ کو حق ہے کہ اس کی گاڑی کو لے جائیں؟

اگر آپ کو اجازت دیدے تو آپ اس کو لے جاسکتے ہیں، لیکن اگر اس کی اجازت نہیں ہے اور آپ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیں تو کیا یہ آپ کا کام خلاف قانون نہیں ہے؟ اور گاڑی کا مالک آپ پر مقدمہ میں دائر کر سکتا ہے کیونکہ اس نے آپ کو اجازت نہیں دی تھی۔

دوسری مثال تصور کیجئے کہ کوئی مرد و عورت آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں، کافی مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں مثلاً کافی مدت سے کسی ایک ادارے میں کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے اخلاق سے بھی واقف ہیں، ایک دوسرے کے گھر والوں کو بھی جانتے ہیں کہ مومن متدین ہیں، اور اب شادی کی تمام تیاریاں پوری ہوگئی ہیں؛ لیکن جب تک نکاح نہ ہوجائے یا ہر مذہب کے رسم و رواج پورے نہ ہوجائیں، اس وقت تک ان مرد و عورت میں جنسی رابطہ غیر مشروع ہے، ٹھیک ہے کہ نکاح الفاظ کے علاوہ کچھ نہیں ہے، دونوں کی مرضی سے یہ نکاح ہوتا ہے، لیکن یہ ایسے الفاظ ہیں جن سے ہزاروں حرام چیزیں حلال ہوجاتی ہیں، اور ہزاروں حلال چیزیں حرام ہوجاتی ہیں، انسان کی اجتماعی زندگی انہیں اعتباروں چلتی ہے، یعنی اجتماعی زندگی انہیں اجازت، دستخط، یا رد کرنے پر متوقف ہوتی ہے۔

تیسری مثال: فرض کریں کہ کسی کو شہر کا ڈی ایم (M-D) معین کیا جائے لیکن ابھی تک اس کا حکم نامہ نہیں آیا ہے اور اس کو اس عنوان سے نہیں پہچنوایا گیا ہے، تو کیا اس کا حق ہے کہ وہ (M-D) کے دفتر میں جاکر بیٹھ جائے اور دستوارت صادر کرے، ظاہر ہے کہ اس کو یہ حق نہیں ہے، اور ذمہ دار لوگ اس کو وہاں سے باہر نکال کھڑا کریں گے، اور کہیں گے کہ یہ ڈی ایم کی کرسی ہے! لیکن اگر وہ کہے کہ مجھے ایک مہینہ کے بعد اس شہر کا ڈی۔ ایم بنایا جائے گا، تو اس کو جواب ملے گا کہ جس وقت تم کو یہ عہدہ سونپ دیا جائے گا تو آپ ہمارے ڈی ایم ہونگے، لیکن اگر وہ کہے کہ صرف رئیس اعلیٰ کا ایک دستخط اور اجازت ہی باقی ہے، کوئی بات نہیں، جواب ملے گا کہ وہی ایک دستخط تو آپ کے اعتبار کے لئے ضروری ہے، تو معلوم ہوا کہ تمام اجتماعی امور صرف ایک دستخط اور اجازت پر متوقف ہوتے ہیں، قانون گذاری بھی اسی طرح ہے، حق قانون گذاری خدا کا حق ہے، صرف اسی کی ایک اجازت سے دوسروں کے بنائے ہوئے قانون معتبر ہوجاتے ہیں، اس کے علاوہ یہ قوانین معتبر نہیں ہو سکتے:

قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ۔ [1]

"(اے رسول) تم کہہ دو کہ کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہتان باندھتے ہو"

اگر خدا نے تم کو اجازت نہ دی ہو تو پھر تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم کسی چیز کو حلال کہو یا حرام؟ قانون بنانا یعنی یہ کام جائز ہے یا وہ کام جائز نہیں، یہ کام حلال ہے اور وہ کام حرام ہے، جب تک تم کو خدا کی طرف سے اجازت نہ ہو تو کیا تم کو اس

---

[1] سورۂ یونس آیت ۵۹

طرح کے احکام صادر کرنے کا حکم ہے؟ جمہوری اسلامی ایران کی اسلامی پارلیمنٹ اور شاہ کے زمانہ کی پارلیمنٹ میں صرف اسی ایک بات کا فرق ہے کہ یہ پارلیمنٹ اس کے حکم سے کام کرتی ہے کہ جو خدا کی طرف سے ماذون (اجازت یافتہ) ہے، یعنی ولی فقیہ اس پارلیمنٹ کو متغیر قانون بنانے کی اجازت دیتا ہے اور انھیں کی اجازت کی وجہ سے یہ پارلیمنٹ معتبر ہوتی ہے۔

جب اس وقت ولی فقیہ امام زمانہ (عج) کی طرف سے یہ حق رکھتا ہے تو پھر دوسروں کو یہ حق نہیں ہے، جس طرح امام زمانہ (عج) کو خدا کی طرف سے یہ حق ہے تو پھر کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے، بہر حال جس شخص کو براہ راست یا غیر مستقیم طور پر خداوند کی طرف سے اجازت ہے وہ دوسروں کے امور میں تصرف اور دوسروں کو امر و نہی کر سکتا ہے، لیکن جس کو خدا کی طرف سے اذن نہیں ہے وہ امر و نہی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، چنانچہ اس کی امر و نہی کا کوئی اثر نہیں ہے۔

(ہم اپنی نظری اور تھیوری بحث میں نہیں چاہتے کہ کسی کی گفتگو کی بنا پر بحث کریں، لیکن امام خمینیؒ کو دوسروں کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا، ان کی گفتگو قرآن و حدیث سے اخذ شدہ ہوتی تھی، لہٰذا ان کی گفتگو سے دلیل پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے) امام خمینیؒ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں: "یہاں تک کہ اگر کوئی صدر بھی ولی فقیہ کی طرف سے منصوب نہ ہو تو وہ طاغوت ہے اور اس کی اطاعت جائز نہیں ہے"[1]

صدر کو خود افراد اپنے ووٹ کے ذریعہ انتخاب کرتے ہیں لیکن اگر ولی فقیہ کی طرف سے اجازت نہ ہو تو امام خمینیؒ کے فرمان کے مطابق طاغوت ہے، اور اس کا امر و نہی معتبر نہیں ہے، اور اس کی اطاعت بھی جائز نہیں ہے، حضرت امام خمینیؒ نے تمام صدر و رئیس جمہور کو منصوب کرتے وقت فرمایا کہ میں تم کو منصوب کرتا ہوں، (بعض موقع پر آپ نے وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ میں چونکہ تم پر الٰہی ولایت رکھتا ہوں اس وجہ سے صدارت پر منصوب کرتا ہوں) در حالیکہ لوگوں نے ان کو ووٹ دیا ہے اور ان کا ووٹ دینا بھی صحیح اور مورد تائید ہے۔

البتہ تمام لوگ بھی اجتماعی کاموں میں شرکت کریں اور ان کا شرعی وظیفہ ہے کہ ووٹنگ میں شرکت کریں، اسی وجہ سے جس وقت انتخابات شروع ہوتے تھے امام خمینیؒ فرماتے تھے: انتخابات میں شرکت کرنا ایک شرعی وظیفہ ہے اور تمام لوگوں کو شرکت کرنا ضروری ہے؛ لیکن ہر قانون گذار و صاحب منصب کا اعتبار خدا کی طرف پلٹنا چاہئے، کیونکہ وہی صاحب اختیار ہے، خدا ہی نے پیغمبر اور ائمہ معصومین علیہم السلام کو حکومت و قانون گذاری کی اجازت دی ہے، اور پیغمبر و ائمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے عمومی طور پر ولی فقیہ منصوب ہوتا ہے جس طرح ان حضرات کے زمانے میں والی شہر و حاکم شہر معین ہوتے تھے، اور امام معصوم کی اجازت سے مشروعیت پیدا کرتا ہے اور جب ان کو اجازت مل گئی تو وہ معتبر ہو گئے۔

پس یہ اعتراض کہ اجازت ہونا یا نہ ہونا یا دستخط کرنا یا نہ کرنا قانون کے اجراء اور وضع کرنے میں کوئی فرق نہیں کرتا،

---

[1] صحیفہ نور ج۹ ص251

تو جواب یہ ہے کہ فرق وہی فرق ہے کہ جو تمام اجتماعی امور میں فرق ہوتا ہے، جس ڈی ایم کا ابھی حکم نامہ نہ آیا ہو اس کا دوسروں سے کیا فرق ہے؟ یا تعلیمی بورڈ کا آفیسر جس کا ابھی حکم نامہ نہیں آیا دوسروں سے کیا فرق رکھتا ہے؟ اگر چہ طے یہ ہے کہ ابھی کچھ دنوں کے بعد ان کا حکم نامہ آجائے گا، لیکن جب تک ان کا حکم نامہ نہ صادر ہو اس وقت تک ان کی کوئی اہمیت نہیں، جس وقت یہ حکم نامہ ان تک پہنچ جائے گا اس وقت سے وہ اس عہدے پر فائز ہو جائیں گے، صرف ایک دستخط سے یہ حضرات دوسروں کے مال میں تصرف کر سکتے ہیں، جس طرح اگر کوئی شخص اپنی لاکھوں کی دولت آپ کے سپرد کر دے یا آپ کو بخش دے اور آپ کو اجازت دے دے کہ جس کام میں بھی چاہیں خرچ کریں یا کوئی اپنا مال عمومی طور پر وقف کرے یا کسی خاص آدمی کو بخش دے، بہر حال صرف ایک لفظ کہنے سے کہ "میں نے اپنا مال تمہیں بخش دیا" کام تمام ہو جاتا ہے اور اس مال میں دخل و تصرف حلال ہو جاتا ہے، لیکن اگر اس کی اجازت نہ ہو اور اس نے نہ بخشا ہو، تو اس کے مال میں تصرف کرنا حرام ہے اور اگر کوئی اس کے مال میں اس طرح تصرف کرے تو وہ مجرم ہے۔

نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ تمام اجتماعی مسائل اسی طرح کے اعتبارات پر ہوتے ہیں اور جب تک یہ اذن و اجازت نہ ہوں اجتماعی امور میں وہ کام معتبر نہیں سمجھا جاتا، تو پھر کس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے حکومت کرنے والے اور ان کو امر و نہی کرنے والے کو اجازت کی ضرورت نہیں ہے؟

کیا خدا کی اجازت کے بغیر اس کے بندوں پر حکومت کی جاسکتی ہے؟ لوگ ہمارے بندے تو ہیں نہیں کہ ہم کو ان پر حکومت کرنے کا حق ہو، لوگ خدا کے بندے ہیں حاکم و رعایا خدا کی نظر میں برابر ہیں اور جب تک خدا اجازت نہ دے تو پھر رہبر، امت، رئیس اور عوام الناس سب برابر ہیں اور جب خدا اجازت دے دے تب لوگوں پر اس کے امر و نہی معتبر ہوتے ہیں۔

7۔ کیا انسان اپنی زندگی پر حقِ حاکمیت رکھتا ہے؟

یہاں پر ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی پر خود حق حاکمیت رکھتا ہے، اگر چہ ہم نے اس موضوع کے سلسلہ میں گفتگو کی ہے لیکن چونکہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اخباروں اور دوسرے رسالوں اور بعض مؤدب افراد کی تقریروں میں بیان ہوتا ہے یہاں تک "ٹی۔وی" کے بعض کانفرنسوں میں بیان ہوتا ہے کہ لوگوں کی آزادی قابل احترام ہے، جیسا کہ قانون اساسی میں بھی موجود ہے کہ لوگ اپنی زندگی پر خود حق حاکمیت رکھتے ہیں، یعنی از جانب پروردگار انسان خود مختار ہے؛ لہٰذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کر دی جائے:

لفظ "حاکمیت" کا استعمال حقوق الناس میں دو جگہ استعمال کیا جاتا ہے (البتہ چونکہ الفاظ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، چنانچہ جن کو اچھی طرح واقفیت نہیں ہوتی وہ ان الفاظ کو جا بجا استعمال کرتے ہیں)

اول: پہلی وہ جگہ ہے جہاں اقوام عالم کے حقوق کا ذکر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہر قوم و ملت اپنی سرنوشت پر

حاکم ہے، یہ ایک اصطلاح ہے کہ جو بین الاقوامی حقوق میں بیان ہوتی ہے، یہ اصطلاح مختلف ممالک کے آپسی روابط اور ایک دوسرے کے سامنے ان کا موقف اور پھر استعماری طاقتوں سے مقابلہ آرادئی کرنا جیسے مباحث اور موارد میں استعمال ہوتی ہے۔ 18ویں اور 19ویں صدی عیسوی میں خصوصاً مغربی ممالک میں استعمار گری کا دور دورہ شروع ہوا، چنانچہ جس کے پاس جتنی طاقت ہوتی تھی اسی مقدار میں دوسرے ملکوں پر قبضہ کرلیتا تھا، یا اپنی طرف سے کسی ملک پر حاکم معین کر دیتا تھا کہ جو وہاں پر حکومت کرتا تھا، یعنی ایک ملت کی سرنوشت (مقدر) پر دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی یا پھر دوسرا ملک ان ک قیم اور ذمہ دار ہوتا تھا، اصل "قیمومیت" ان موضوعات میں سے ہے جو بین الاقوامی حقوق میں بیان کیا جاتا ہے، پس جب لوگ عالمی ظلم سے واقف ہوگئے اور اپنے حقوق کے طالب ہوگئے تو ملت کی حاکمیت کا مسئلہ پیدا ہوا، اور آہستہ آہستہ مسئلہ حاکمیت ملت نے بین الاقوامی حقوق میں اپنی جگہ بنالی، اور کہا جانے لگا کہ ہر قوم اپنی سرنوشت پر حاکم ہے؛ یعنی دوسروں کو استعمار اور قیمومیت کا حق نہیں ہے، "حاکمیت ملی" یعنی ہر قوم وملت مستقل ہے اور اپنی سرنوشت پر خود حاکم ہے اور کسی ملت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسری ملتوں کا اپنے کو حاکم سمجھے، کسی بھی حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی دوسرے ملک میں اپنی حاکمیت چلائے، پس یہ ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جو بین الاقوامی روابط میں بیان ہوتی ہے۔

حاکمیت کی دوسری اصطلاح خود معاشرہ سے متعلق ہے، اور یہ اصل اساسی وبنیادی حقوق سے مربوط ہے، یعنی ایک وہ معاشرہ کہ جس میں مختلف گروہ مختلف اقوام شامل ہیں، (قطع نظر اس چیز سے کہ اس معاشرہ کا دوسرے ملکوں سے کیسا رابطہ ہے) ان میں سے کسی قوم یا گروہ کو یہ حق نہیں ہے کہ خود کو دوسروں پر حق حاکمیت رکھتا ہو، برخلاف اس نظریہ کے کہ جو دنیا کے بعض ملکوں میں پایا جاتا ہے، کہ جن طبقاتی نظام قائم ہے اور ایک قسم قوم ذات پات کے لوگ حاکم ہوتے تھے جیسے ھندوستان میں ٹھاکر، پنڈات کے حاکم ہونے کا رواج تھا یا مسلمانوں میں سید اور پٹھان حاکم ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ اصل یہ بیان کرتی ہے کہ ہر شخص اپنی سرنوشت پر حاکم ہے، دوسرا اس پر حاکمیت نہیں رکھتا، پس کسی بھی معاشرہ کا کوئی فرد یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فلاں گروہ یا فلاں قبیلہ کا حاکم ہوں، (یہ تھی ایک اصل)۔

ہم نے جو کچھ ذکر کیا، اس بات پر توجہ کرنے کے لئے تھا کہ ان دونوں اصول کا ماحصل یہ تھا کہ انسانوں کے درمیان رابطہ کی فضاء کو ہموار کیا جائے چاہے پہلی اصل ہو یا دوسری اصل، کیونکہ پہلی اصل جو عمومی بین الاقوامی حقوق سے متعلق ہے، جس کا کام ملکوں اور حکومتوں کے درمیان رابطہ کو بیان کرنا تھا اور واضح طور پر اس بات کو کہتی ہے کہ ہر ملت اپنی سرنوشت پر حاکم ہے، اور کسی دوسرے ملک کو ان پر حاکمیت کا حق نہیں ہے، لہٰذا اس اصل کے اندر اس چیز کو دیکھا گیا ہے کہ ایک معاشرہ دوسرے معاشرہ کے افراد سے کیا روابط رکھنے کے لئے نظر رکھتا ہے، دوسری اصل میں خود اپنے ملک کے افراد کے حقوق کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے یعنی دوسری اصل ملکی افراد کے حقوق کے بارے میں بحث کرتی ہے، اس میں یہ بیان ہوتا ہے ہر انسان اپنی سرنوشت پر حاکم ہے، یعنی دوسرے کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے پر حکومت کرے۔

بہر حال یہ تمام اصول انسان کے ایک دوسرے سے رابطہ سے متعلق ہیں نہ کہ انسان کے خدا سے رابطہ سے، جن لوگوں نے ان اصول کو بیان کیا ہے (چاہے کسی دین کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں) اس سے مراد کبھی بھی انسان کے خدا سے رابطہ کو مراد نہیں لیا ہے تا کہ یہ کہا جائے کہ خدا بھی انسانوں پر حق حاکمیت نہیں رکھتا، وہ یہ بیان نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ انسانی روابط یا حکومتی روابط کو بیان کرنا چاہتے تھے، کہ کیا کسی استعماری حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ کسی دوسری حکومت پر قبضہ کرے یا نہیں؟ یا ملکی پیمانے پر کسی ایک گروہ یا قبیلہ کو یہ حق ہے کہ وہ ایک دوسرے پر حکومت کریں یعنی کسی قبیلہ کی سرنوشت دوسرے قبیلہ سے متعلق ہے یا نہیں؟

انسان اپنی سرنوشت پر حاکم ہے اس کے معنی یہ ہیں، کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی آقائی کو کسی دوسرے پر مسلط کرے، نہ یہ کہ یہ حق خدا کو بھی نہیں ہے، اب اگر فرض کریں کہ وہ تمام لوگ کہ جنہوں نے ان قوانین کو بنایا اور ان اصولوں کو بیان کیا، کیا وہ بے دین تھے اور خدا کو نہیں مانتے تھے، لیکن جب اسلامی جمہوری ایران کا قانون اساسی بن رہا تھا کہ انسان اپنی سرنوشت پر حاکم ہے تو کیا یہاں بھی خدا کو نادیدہ قرار دیا گیا؟ یعنی کیا خدا کو بھی حق نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو حکم دے؟

یا یہ کہ یہ اصل وہی ہے کہ جو اس وقت کی دنیا میں رواج یافتہ ہے، کہ جس کی بنا پر کسی انسان کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے، اور دوسروں کی سرنوشت پر حاکم نہیں ہیں؟ وہ لوگ یہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ یہ کہیں کہ خدا حق حاکمیت نہیں رکھتا، اس بات کی شاہد وہ بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کو قانون اساسی بیان کرتا ہے اور اس بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ معاشرہ میں الٰہی قوانین کا جاری ہونا ضروری ہے، ان اصول کے باوجود کس طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی یہ سوچے کہ یہ حاکمیت جو انسانوں کے لئے طے ہے اس سے خدا کی حاکمیت کی نفی کریں، ! کیا کوئی عقلمند جمہوری اسلامی کے قانون اساسی سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے؟

8۔انسان کی حاکمیت خدا سے نہیں ٹکراتی

تا کہ ہماری بحث اچھے طریقے سے واضح ہو جائے دوسرے علوم کی مثالیں پیش کرتے ہیں، تا کہ ان باتوں کو اچھی طرح واضح کیا جا سکے، اور شیطانی شبہات اور سوء استفادہ کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے: "اعتماد بنفس" ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کو ہماری ملت بلکہ دنیا کے تمام لوگ اس سے اچھے طرح واقف ہیں (کیونکہ یہ عالمی تمدن کا ایک جز بن چکا ہے) اور یہ مسئلہ "علم نفسیات" علم سے مربوط ہے کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر اعتماد رکھنا چاہئے، یہ جملہ مکرر سنا جاتا ہے اور کتابوں میں بھی اس کو بہت پڑھا جاتا ہے، اور ریڈیو، ٹی، وی، میں اس مسئلہ کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے خصوصا تربیتی اور فیملی گفتگو میں، اور کہا جاتا ہے کہ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اپنے نفس پر اعتماد پیدا کریں، اور جوانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں کہ اعتماد بنفس پیدا کریں، اسی طرح اخلاقی مسائل میں اس بات پر بہت توجہ دی جاتی ہے کہ لوگوں کو اپنے نفس پر اعتماد رکھنا چاہئے، اور دوسروں بوجہ نہ بنیں، جبکہ اسلام اس کے مقابلہ میں ایک دوسری چیز بیان کرتا ہے جو "توکل علی اللہ" ہے

یعنی خدا پر بھروسہ اور اعتماد کرنا اپنے تمام امور میں یعنی انسان کو خدا کے مقابلہ میں اپنے کو کچھ نہیں سمجھنا چاہئے، اور تمام چیزوں کو اسی سے طلب کرے اور صرف اسی کو سب کچھ مانے۔

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ • وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ • يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ • وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔ [1]

"(یاد رکھو کہ) اگر خدا کی صرف سے تمہیں کوئی برائی چھو بھی گئی تو پھر اس کے سوا کوئی اس کا دفع کرنے والا نہیں ہوگا، اور اگر تمہارے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو پھر اس کے فضل و کرم کا پلٹنے والا بھی کوئی نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے فائدہ پہنچائے اور وہ تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے"

نفع و نقصان اس کی طرف سے ہے اور خدا کے مقابلہ میں انسان کا ارادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، انسان خدا کی عظمت کے مقابلہ میں ایک معمولی چیز ہے، اسلامی اور قرآنی تعلیمات میں اس چیز کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کی اس طرح تربیت ہو کہ اپنے کو خدا کے مقابلہ میں بہت چھوٹا اور ناچیز تصور کرے، اور اسلام میں تربیت اسی بنیاد پر ہوتی ہے کہ انسان اللہ کی ربوبیت اور اپنی عبودیت کا قائل رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح یہ ممکن ہے کہ ایک طرف سے انسان اپنے نفس پر اعتماد بھی رکھے، اور دوسری طرف خدا کے مقابلہ میں اپنے کو ناچیز بھی سمجھے؟ کیا خود کو خدا کے مقابلہ میں ناچیز سمجھنا، اعتماد بنفس کے ساتھ ہم آہنگ ہے؟ یہ نظریہ اس اعتراض کی طرح ہے کہ جو حاکمیت کے بارے میں بیان ہو چکا ہے، کہ جو سیاسی مسائل سے مربوط ہے، اور یہ شبہ واعتراض علم نفسیات اور اخلاقی تربیت میں بیان ہوتا ہے۔ ہم نے ان دو چیزوں کا موازنہ نہ کیا ہے، چونکہ یہ دو چیزیں آپس میں مشترک ہیں ان کو سمجھنے کے لئے ذہن تیار ہونا چاہئے، عرض کرتے ہیں کہ یہ علم نفسیات کا مسئلہ جو دوسروں پر اعتماد کے مقابلہ میں اپنے نفس پر اعتماد پر تاکید کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اپنے ماں باپ اور دوستوں پر تکیہ نہ کریں، اور دوسروں پر بوجھ نہ بنیں، نہ یہ کہ اپنے کو خدا کا بھی محتاج نہ مانیں۔

انسان کا ایک دوسرے سے رابطہ کے متعلق گفتگو اور اسی طرح "اعتماد بنفس" کا مسئلہ جس میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے کردار کو اتنا مضبوط بنالو کہ کسی دوسرے پر تکیہ نہ کرو یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اسلام میں بھی اس کی تاکید ہوئی ہے، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت میں اس بات پر تاکید ہوئی ہے، لیکن افسوس کہ ان مسائل پر کم توجہ کی گئی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے مسائل مغربی ممالک کی نئی طرز تفکر ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے ائمہ اطہار علیہم السلام ان چیزوں کو پہلے بتا چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے اصحاب اس طرح کی تربیت سے آراستہ تھے، چنانچہ اگر کوئی گھوڑے پر بیٹھا جا رہا ہے اور اس کے ہاتھ سے تازیانہ گر گیا ہے تو وہ اس دوست سے نہیں کہتے تھے جو اس کے ساتھ چل رہا ہے کہ اس کے

---

[1] سورۂ یونس آیت ۱۰۷

آپ حضرات کو قبول کرنا پڑے گا، کیونکہ یہ مقدمات علم کلام، فلسفہ اور الٰہیات سے مربوط ہیں جن کو سبھی لوگ تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ اگر ہم ان مقدمات کی توضیح اور تفسیر میں وارد ہوتے ہیں تو اصل گفتگو سے دور ہو جائیں گے، البتہ ان میں سے بعض مقدمات، مقدمات قریبی ہیں کہ جن پر یہاں بحث کی جاسکتی ہے۔

2۔ حکومت سے مخصوص کاموں کے بارے میں تین نظریے

جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ میں قانون کو جاری کرنے کے لئے حکومت کا ہونا ضروری ہے، یا حکومت کے دو اہم اور بنیادی رکن قانون گذاری اور قانون کا جاری کرنا، لہٰذا ان قوانین کے لئے ایسے معیار وضوابط ہونا چاہئے جن کی روشنی میں یہ قوانین بنائے جائیں۔ اور وہ معیار وضوابط جن کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ان میں سے کچھ اس چیز سے مربوط ہیں کہ حکومت کی تشکیل اور قوانین بنانے کا ہدف اور مقصد کیا ہونا چاہئے؟ اسی وجہ سے بحث فلسفہ سیاست میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت تشکیل دینے کی وجہ کیا ہے البتہ اس سلسلہ میں ہم نے گذشتہ بحث میں مختصر طور پر عرض کیا ہے، لیکن اس جگہ تفصیلی طور پر اس مطلب پر بحث کی تحقیق کرتے ہیں۔ (لیکن ابتداء میں ہم حکومت کے فلسفہ کے بارے میں فہرست وار تین نظریوں بیان کرتے ہیں تا کہ ان مطالب کی ارتباط کو بہتر طور پر پہچان لیا جائے اور پھر تفصیلی طور پر بحث میں وارد ہونگے):

1۔ "رنسانس" کے زمانہ کے بعد بعض سیاسی فلاسفہ حضرات مثل "ھابز" کا ماننا یہ ہے کہ حکومت بنانے کا ہدف اور اس کی ذمہ داری فقط معاشرہ میں نظم وامنیت کو برقرار کرنا ہے؛ دوسرے رسا الفاظ میں یوں کہا جائے: حکومت کی ذمہ داری داخلی وخارجی امنیت کو برقرار کرنا ہے، یعنی حکومت کی اصلی ذمہ داری یہ ہے کہ ایسے قوانین کو جاری کرے، جس سے معاشرہ میں بدنظمی اور عسر وحرج نہ پھیلے، اور اس سلسلے میں اندرونی وخارجی خطرات سے نپٹنے کے لئے دفاعی قوت (پولیس اور فوج) تشکیل دے، تا کہ وہ ملک اور اس کے تمام باشندوں کی حفاظت کر سکے۔

2۔ بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے: حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ معاشرہ میں نظم وامنیت کے ساتھ ساتھ عدالت کو بھی برقرار رکھا جائے۔

یہاں سے قانون، عدالت اور آزادی کے بارے میں ایک عمیق بحث (خصوصاً سیاسی اور جامعہ شناس حضرات کے درمیان) شروع ہوجاتی ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں بھی لکھی گئیں کہ آزادی، قانون اور عدالت میں کیا ہیں اور ان میں آپس میں کیا رابطہ ہے؟

اگر ہم قبول کریں کہ حکومت کی ذمہ داری معاشرہ میں امنیت برقرار کرنے کے ساتھ ساتھ عدالت کا برقرار کرنا بھی ضروری ہے، تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ عدالت کے کیا معنی ہیں؟ عدالت کی حقیقت اور اس کے اصول کے بارے میں، مسلم وغیر مسلم دانشمندوں کے بارے میں مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں، اور جس بات کو سبھی قبول کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ "ہر انسان کو اس کا حق دیا جانا چاہئے" اور عدالت کے اس معنی کو تقریباً سبھی دانشمندوں نے قبول کیا ہے؛ لیکن حق کیا ہے اور اس کی حدود کیا

یعنی خدا پر بھروسہ اور اعتماد کرنا اپنے تمام امور میں یعنی انسان کو خدا کے مقابلہ میں اپنے کو کچھ نہیں سمجھنا چاہئے، اور تمام چیزوں کو اسی سے طلب کرے اور صرف اسی کو سب کچھ مانے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ.[1]

"(یاد رکھو کہ) اگر خدا کی صرف سے تمہیں کوئی برائی چھو بھی گئی تو پھر اس کے سوا کوئی اس کا دفع کرنے والا نہیں ہوگا، اور اگر تمہارے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو پھر اس کے فضل و کرم کا پلٹنے والا بھی کوئی نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے فائدہ پہنچائے اور وہ تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے"

نفع و نقصان اس کی طرف سے ہے اور خدا کے مقابلہ میں انسان کا ارادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، انسان خدا کی عظمت کے مقابلہ میں ایک معمولی چیز ہے، اسلامی اور قرآنی تعلیمات میں اس چیز کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کی اس طرح تربیت ہو کہ اپنے کو خدا کے مقابلہ میں بہت چھوٹا اور ناچیز تصور کرے، اور اسلام میں تربیت اسی بنیاد پر ہوتی ہے کہ انسان اللہ کی ربوبیت اور اپنی عبودیت کا قائل رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح یہ ممکن ہے کہ ایک طرف سے انسان اپنے نفس پر اعتماد بھی رکھے، اور دوسری طرف خدا کے مقابلہ میں اپنے کو ناچیز بھی سمجھے؟ کیا خود کو خدا کے مقابلہ میں ناچیز سمجھنا، اعتماد بنفس کے ساتھ ہم آہنگ ہے؟ یہ نظریہ اس اعتراض کی طرح ہے کہ جو حاکمیت کے بارے میں بیان ہو چکا ہے، کہ جو سیاسی مسائل سے مربوط ہے، اور یہ شبہ و اعتراض علم نفسیات اور اخلاقی تربیت میں بیان ہوتا ہے۔ ہم نے ان دو چیزوں کا موازنہ نہ کیا ہے، چونکہ یہ دو چیزیں آپس میں مشترک ہیں ان کو سمجھنے کے لئے ذہن تیار ہونا چاہئے ے، عرض کرتے ہیں کہ یہ علم نفسیات کا مسئلہ جو دوسروں پر اعتماد کے مقابلہ میں اپنے نفس پر اعتماد پر تاکید کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اپنے ماں باپ اور دوستوں پر تکیہ نہ کریں، اور دوسروں پر بوجھ نہ بنیں، نہ یہ کہ اپنے کو خدا کا بھی محتاج نہ مانیں۔

انسان کا ایک دوسرے سے رابطہ کے متعلق گفتگو اور اسی طرح "اعتماد بنفس" کا مسئلہ جس میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے کردار کو اتنا مضبوط بنالو کہ کسی دوسرے پر تکیہ نہ کرو یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اسلام میں بھی اس کی تاکید ہوئی ہے، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت میں اس بات پر تاکید ہوئی ہے، لیکن افسوس کہ ان مسائل پر کم توجہ کی گئی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے مسائل مغربی ممالک کی نئی طرز تفکر ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے ائمہ اطہار علیہم السلام ان چیزوں کو پہلے بتا چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے اصحاب اس طرح کی تربیت سے آراستہ تھے، چنانچہ اگر کوئی گھوڑے پر بیٹھا جارہا ہے اور اس کے ہاتھ سے تازیانہ گر گیا ہے تو وہ اس دوست سے نہیں کہتے تھے جو اس کے ساتھ چل رہا ہے کہ اس کے

[1] سورۂ یونس آیت ۱۰۷

تازیانہ کو اٹھا کر دیدو، بلکہ خود گھوڑے سے اتر کر اس کو اٹھا لیتے تھے، اور پھر گھوڑے پر سوار ہو جاتے تھے، !یہ اسلامی تربیت ہے کہ جو ہم سے یہ چاہتا ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں، ہم خود اپنا بوجھ سنبھالیں، اور خود کو دوسروں کا محتاج نہ بنائیں، اور دوسروں پر نظریں نہ دوڑائیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا کے مقابلہ میں بھی اپنے کو بے نیاز سمجھیں:

يَآأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ إِلَى اللهِ ۚ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔ [1]

"لوگو! تم سب کے سب خدا کے (ہر وقت) محتاج ہو اور (صرف) خدا ہی (سب سے) بے پروا سزاوار حمد (وثنا) ہے"

کیا یہ فقر و ناداری والا انسان اپنے کو خدا سے بے نیاز سمجھے؟ خدا کے مقابلہ میں بے نیازی کا اظہار کرنا شرک ہے، لہٰذا اعتماد بنفس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا پر بھی اعتماد نہ رکھا جائے، اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا پر بھی اعتماد نہ کیا جائے، تو یہ قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے، سیکڑوں آیات و روایات اس سلسلہ میں موجود ہیں کہ انسان اپنے کو خدا کے مقابلہ میں اپنے کو ہیچ سمجھے، اور تمام چیزوں کو خدا سے طلب کرے، اور اس بات کا اعتماد بنفس سے کوئی مطلب نہیں ہے، کیونکہ اعتماد بنفس کا مسئلہ انسانوں کے درمیان رابطہ کو بیان کرتا ہے چونکہ کوئی بھی کسی پر کچھ امتیاز نہیں رکھتا۔

لہٰذا اس بات کا جواب کہ اعتماد بنفس اور خدا پر توکل و بھروسہ ایک ساتھ کیسے جمع ہو سکتے ہیں، یہ ہے کہ اعتماد بنفس کا تعلق انسانوں کے رابطہ سے ہے، کہ ایک دوسرے پر تکیہ نہ کریں اور کوئی بھی دوسروں سے آگے قدم بڑھا کر نہ رکھیں نہ یہ کہ خدا پر بھی اعتماد نہ رکھے۔ اسی طرح سیاسی مسائل میں، انسان کی فردی حاکمیت کا مسئلہ ہے اور حاکمیت ملّی میں بھی اسی طرح ہے، حاکمیت ملّی یعنی ہر ملت خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور دوسروں کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ان پر حکمرانی کریں۔ حاکمیت انسان پر خود یعنی کوئی بھی انسان خود بخود اپنے کو دوسروں کا حاکم تصور نہ کرے، نہ یہ کہ خداوند عالم بھی کسی پر حاکمیت نہیں رکھتا، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ فردی اور ملّی حاکمیت خدا کی حاکمیت کے طول (بعد) میں ہے یعنی اصل حاکمیت خدا سے مخصوص ہے، اور اس کے طول میں خدا نے جن کو حاکمیت کی اجازت دی ہے، یعنی خدا نے حکومت کرنے کا جو دائرہ جن کے لئے بیان کیا ہے وہ لوگ صرف اسی دائرہ اور حد کے اندر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں لہٰذا اگر خدا کی طرف سے اجازت نہ ہو تو پھر کسی انسان کو حق حاکمیت نہیں ہے۔

---

[1] سورہ یونس آیت ۱۰۷

انیسویں نشست

حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کی خصوصیت

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

گذشتہ گفتگو میں ہم نے بیان کیا کہ بعض لوگ اسلامی حکومت پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت سے انسان کی انفرادی آزادی محدود ہو جاتی ہے، اور چونکہ یہ آزادی انسان کا طبیعی حق ہے، لہٰذا اسلامی حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ ان آزادیوں کو محدود کرے، چنانچہ ایسی حکومت کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس اعتراض کے جواب میں ہم نے عرض کیا کہ قانون کی حقیقت یہ ہے کہ قانون آزادی کو محدود کرتا ہے۔ اور چونکہ انسان اپنے آزاد ارادہ سے اپنی مختلف خوھشات کی تحقیق و بررسی کر کے وہ اپنے لئے بہتر چیز کا انتخاب اور تعین کرنے کا حق رکھتا ہے، اس بات کا امکان ہے کہ کبھی یہ انتخاب، معاشرہ یا خود اس کے ضرر و نقصان میں تمام ہو؛ لہٰذا اس کی ان آزادیوں کو کسی ایک قانون کے ذریعہ محدود ہونا چاہئے۔ لہٰذا یہ اعتقاد رکھنا کہ انسان کو مطلق آزادی ہونا چاہئے اور وہ اپنے تمام معاملات میں خود مختار ہو یہ سراسر نا مناسب اور باطل ہے، اور نہ ہم کسی ایسے آدمی کو جانتے اور پہچانتے ہیں جو آزادی کو مطلق اور بے قید و بند مانے، بلکہ تمام دانشورں کا ماننا یہ ہے کہ آزادی کو مشروع اور قانونی دائرے میں ہونا چاہئے، کیونکہ اگر آزادی کو بے لگام مان لیا جائے تو پھر عسر و حرج لازم آتا ہے اور اس کا نقصان انسانیت پر پڑتا ہے۔

ہمارے ملک کے قانون اساسی میں مشروع آزادی کو قبول کیا گیا ہے، اور شرعی اصطلاح کے مطابق، مشروع آزادیاں یعنی وہ آزادیاں جن کو شریعت مقدس نے جائز قرار دیا ہے، اور عرفی اصطلاح کے مطابق یعنی قانونی آزادی، اور چونکہ ہمارے ملک میں وہ قوانین معتبر ہیں جو اسلامی اصول کے مطابق ہوں، اسی طرح وہ آزادی معتبر ہے جو اسلام کی نگاہ میں مُجاز اور جائزھیں، البتہ یہ جواب ان لوگوں کی نظر میں قابل قبول ہے کہ جو اسلامی نظام اور جمہوری اسلامی کے قانون اساسی کو قبول کرتے ہوں، لیکن اگر کوئی اسلامی نظام اور قانون اساسی کو قبول نہ کرتا ہو، اور اسلام اور قانون اساسی سے صرف نظر کرتے ہوئے اس سوال کو اچھالے اور کہے کہ کیا دلیل ہے کہ آزادی کو محدود اور اسلامی ہونا چاہئے؟ اسلام کی تجویز کردہ آزادی کی حد سے کیوں آگے نہیں بڑھا جاسکتا؟

اس سوال کے جواب کے لئے کچھ مقدمات کو بیان کرنا ضروری ہے جن میں سے بعض کو اصول موضوعہ کے لحاظ سے

آپ حضرات کو قبول کرنا پڑے گا، کیونکہ یہ مقدمات علم کلام، فلسفہ اور الٰھیات سے مربوط ہیں جن کو سبھی لوگ تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ اگر ہم ان مقدمات کی توضیح اور تفسیر میں وارد ہوتے ہیں تو اصل گفتگو سے دور ہو جائیں گے، البتہ ان میں سے بعض مقدمات، مقدمات قریبی ہیں کہ جن پر یہاں بحث کی جاسکتی ہے۔

2۔ حکومت سے مخصوص کاموں کے بارے میں تین نظریے

جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ میں قانون کو جاری کرنے کے لئے حکومت کا ہونا ضروری ہے، یا حکومت کے دو اہم اور بنیادی رکن قانون گذاری اور قانون کا جاری کرنا، لہٰذا ان قوانین کے لئے ایسے معیار وضوابط ہونا چاہئے جن کی روشنی میں یہ قوانین بنائے جائیں۔ اور وہ معیار وضوابط جن کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ان میں سے کچھ اس چیز سے مربوط ہیں کہ حکومت کی تشکیل اور قوانین بنانے کا ہدف اور مقصد کیا ہونا چاہئے؟ اسی وجہ سے بحث فلسفہ سیاست میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت تشکیل دینے کی وجہ کیا ہے البتہ اس سلسلہ میں ہم نے گذشتہ بحث میں مختصر طور پر عرض کیا ہے، لیکن اس جگہ تفصیلی طور پر اس مطلب پر بحث کی تحقیق کرتے ہیں۔ (لیکن ابتداء میں ہم حکومت کے فلسفہ کے بارے میں فہرست وار تین نظریوں بیان کرتے ہیں تا کہ ان مطالب کی ارتباط کو بہتر طور پر پہچان لیا جائے اور پھر تفصیلی طور پر بحث میں وارد ہونگے):

1۔ "رنسانس" کے زمانہ کے بعد بعض سیاسی فلاسفہ حضرات مثل "ھابز" کا ماننا یہ ہے کہ حکومت بنانے کا ہدف اور اس کی ذمہ داری فقط معاشرہ میں نظم وامنیت کو برقرار کرنا ہے؛ دوسرے رسا الفاظ میں یوں کہا جائے: حکومت کی ذمہ داری داخلی وخارجی امنیت کو برقرار کرنا ہے، یعنی حکومت کی اصلی ذمہ داری یہ ہے کہ ایسے قوانین کو جاری کرے، جس سے معاشرہ میں بدنظمی اور عسر وحرج نہ پھیلے، اور اس سلسلے میں اندرونی وخارجی خطرات سے نپٹنے کے لئے دفاعی قوت (پولیس اور فوج) تشکیل دے، تا کہ وہ ملک اور اس کے تمام باشندوں کی حفاظت کر سکے۔

2۔ بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے: حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ معاشرہ میں نظم وامنیت کے ساتھ ساتھ عدالت کو بھی برقرار رکھا جائے۔

یہاں سے قانون، عدالت اور آزادی کے بارے میں ایک عمیق بحث (خصوصاً سیاسی اور جامعہ شناس حضرات کے درمیان) شروع ہوجاتی ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں بھی لکھی گئیں کہ آزادی، قانون اور عدالت میں کیا ہیں اور ان میں آپس میں کیا رابطہ ہے؟

اگر ہم قبول کریں کہ حکومت کی ذمہ داری معاشرہ میں امنیت برقرار کرنے کے ساتھ ساتھ عدالت کا برقرار کرنا بھی ضروری ہے، تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ عدالت کے کیا معنی ہیں؟ عدالت کی حقیقت اور اس کے اصول کے بارے میں، مسلم وغیر مسلم دانشمندوں کے بارے میں مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں، اور جس بات کو سبھی قبول کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ "ہر انسان کو اس کا حق دیا جانا چاہئے" اور عدالت کے اس معنی کو تقریباً سبھی دانشمندوں نے قبول کیا ہے؛ لیکن حق کیا ہے اور اس کی حدود کیا

ہیں اس سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ عدالت کے معنی میں "حق" کا لحاظ کیا گیا ہے، مجبوراً ہم کو ایک دوسری بحث کرنا ہوگی اور وہ یہ کہ آزادی، حق، قانون اور عدالت میں کیا اور حق وعدالت میں کیا رابطہ ہے۔ بالآخر بحث یہاں پہنچتی ہے کہ ہر انسان کا یہ حق ہے کہ اس کے منافع اور طبیعی مصالح پورے ہوں اور یہ صرف عادلانہ قوانین کے ذریعہ ہی ممکن ہوسکتا ہے، جس میں لوگوں کی اجتماعی زندگی کے تمام حقوق (یعنی وہ چیزیں کہ جن کو انسان کی طبیعی ضرورتیں اقتضاء کرتی ہوں) پورے ہوتے ہیں۔

اب چونکہ حقوق کی بات آگئی ہے لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں کون لوگ صاحب حق ہیں؟ کیا اجتماعی زندگی میں تمام لوگ صاحب حق ہیں یا اجتماعی زندگی میں صرف بعض لوگوں کو حق حاصل ہے کہ اجتماعی کاموں میں دخیل ہوں؟ واضح طور پر عرض کریں کہ وہ انسان جو معلول (اپاج) ہیں اور معاشرہ کی کوئی بھی خدمت انجام نہیں دے سکتے اور ہاسپٹل یا آسائشگاہ[1] میں رہتے ہیں اور اجتماعی زندگی میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا، کیا وہ بھی معاشرہ میں حق رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر حق اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ میں کچھ خدمت انجام دیں، تو ایسے افراد کو کوئی حق نہیں ہے؛ کیونکہ یہ لوگ تو صرف معاشرہ کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ معاشرہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہے ہیں۔

البتہ ممکن ہے کہ بعض معلول افراد ذہنی طور پر معاشرہ کی خدمت کریں، لیکن ہماری گفتگو ان اپاج لوگوں کے سلسلہ میں ہے جو جسمی اور ذہنی طور پر محروم پیدا ہوتے ہیں اور معاشرہ کو جسمانی اور ذہنی خدمات نہیں پہنچا سکتے، کیا ایسے لوگ معاشرہ میں حق رکھتے ہیں؟ یا ایسا شخص جس نے صحت وسلامتی کے وقت معاشرہ کی خدمت کی ہے، لیکن اس وقت اپاج ہو گیا ہے اور معاشرہ کی کوئی بھی خدمت نہیں کرسکتا کیا ایسا شخص معاشرہ میں حق رکھتا ہے یا نہیں؟

بعض جامعہ شناس حضرات کے مطابق ایسے لوگوں کے لئے معاشرہ میں کوئی حق نہیں ہے، اور حکومت پر بھی ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، قدیم روس کی مارکسسٹی حکومت میں ایسے افراد کو معاشرہ میں کوئی حق نہیں تھا، اور کسی نہ کسی بہانہ سے ان کو ختم کردیا جاتا تھا۔

دوسرے ممالک میں بھی اس طرح کا نظریہ موجود ہے۔ کیا معاشرہ میں حق پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بدلے معاشرہ کی خدمت کی جائے؟ کیا وہ اپاج کہ جو معاشرہ میں کچھ خدمت نہیں کرسکتا، صرف اس وجہ سے کہ وہ انسان ہے اور انسانوں میں پیدا ہوا ہے اور انسانوں میں زندگی گذارتا ہے، معاشرہ پر حق نہیں رکھتا؟

افسوس کہ وہ بعض افراد جو کہتے ہیں کہ حق معاشرہ کی خدمت کرنے سے حاصل ہوتا ہے، لہٰذا ان لوگوں کو کوئی حق نہیں ہے کہتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ رحم ومحبت کی وجہ سے ان لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور ان کی حفاظت کے لئے آسائشگاہ بنواتے ہیں، ٹھیک ہے بنوائیں، ورنہ کوئی بھی ان کی موت کا ذمہ دار نہیں ہے!

---

[1] وہ جگہ جہاں بوڑھوں اور بے وارث بچوں کو رکھا جاتا ہے۔

2۔ حکومت کی تشکیل کے ہدف کے بارے میں تیسرا نظریہ اسلامی ہے جس کے اندر حکومت کی ذمہ داری عدالت وامنیت کو برقرار رکھنے کے علاوہ معنوی اور روحانی ضرورتوں کو بھی پورا کرنا ہے۔

3۔ اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے کاموں میں ایک امتیازی فرق

اسلامی نظریہ کے مطابق، امنیت اور خارجی دشمن کے مقابلہ میں اپنا دفاع، اور عدالت کو برقرار کرنا نیز معاشرہ کی خدمت کرنے والے کے حق کو ادا کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری میں شمار کیا جاتا ہے، احسان، یعنی ضعیف وکمزور اور معاشرہ کے وہ لوگ کہ جو کچھ بھی خدمت انجام نہیں دے سکتے ان تمام لوگوں کی خدمت کرنا بھی حکومتوں کا وظیفہ ہے؛ جس طرح کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ [1]

"بے شک خدا انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے کا حکم کرتا ہے"

مسلمانوں کی ذمہ داری صرف عدل نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھکر بعض موارد میں احسان بھی کریں، وہ فقیر لوگ جو کچھ نہیں کر سکتے یا وہ اپاہج کہ جو معاشرہ میں کوئی خدمت نہیں کر سکتے، یہاں تک کہ وہ مادرزاد اپاہج چونکہ انسان ہیں انسانی معاشرہ میں حق رکھتے ہیں اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی روزمرہ ضرورتوں کو پورا کرے۔

مذہب اسلام اور دوسرے مذاہب میں ایک دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اسلام انسان کی ضرورتوں کو صرف مادّی اور بدنی ضرورتوں میں منحصر نہیں سمجھتا بلکہ معنوی اور اخروی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھتا ہے؛ اسی وجہ سے اسلامی حکومت کی ذمہ داری، لیبرل حکومتوں سے کہیں زیادہ ہیں: لیبرال حکومت صرف ان لوگوں جو معاشرہ میں کچھ خدمات کرتے ہیں ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں مانتی، لیکن اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ معاشرہ کی خدمت کرنے والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ اپاہج اور ناتواں لوگوں کی بھی مدد کرے، اور اس کے علاوہ انسانوں کی معنوی وروحانی احتیاجات کو پورا کرے، اسی وجہ سے اسلامی حکومت کی ذمہ داری بہت زیادہ ہوجاتی ہے، اس بنا پر اسلامی حکومت میں ایسے قوانین بنائے اور جاری کئے جائیں جن سے انسان کی انفرادی، اجتماعی، مادی اور معنوی، دنیاوی اور اخروی مصلحتوں کو پورا کیا جاسکے، نہ کہ صرف معاشرہ کے سرگرم افراد کی مادی منافعوں کی فکر میں رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ کی صحت پر کیا دلیل ہے؟ اور کیوں دوسرے نظریات صحیح نہیں ہیں؟ (توجہ رہے کہ ہماری یہ بحث صرف دینی نہیں ہے کہ ہم آیات وروایات کے ذریعہ دلیل قائم کردیں، اگرچہ جہاں آیات وروایات کا موقع ہوتا ہے وہاں آیات وروایات سے بھی بحث کی ہے) کیا واقعاً انسانی معاشروں میں تمام مادی ومعنوی منفعتوں کا پورا ہونا ضروری ہے یا صرف مادی منفعتوں کا پورا ہونا کافی ہے؟

---

[1] سورۂ نحل آیت ۹۰

دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ جس طرح حکومت کی تشکیل کے ہدف کے تحت یہ سوال ہوا تھا کیا حکومت اور قانون کا ہونا صرف امنیت کا برقرار ہونا اور عسر وحرج سے روکنا ہے یا حکومت کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ انسان کی معنوی مصلحتوں پر بھی توجہ ضروری ہے؟ اس مسئلہ کو حل کرنے اور گذشتہ سوال کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ ایک قدم پیچھے ہٹیں اور یہ سوال کریں کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل کا کیا ہدف ہے؟

4۔انسانی معاشرہ کی حقیقت اسلام کی نگاہ میں

قبل اس کے کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل کے ہدف کو پہچانیں، ضروری ہے کہ پہلے یہ بحث کی جائے کہ انسان ذاتی طور پر ایک اجتماعی موجود ہے جس طرح شھد کی مکھی اور چیونٹی جو اجتماعی زندگی کا حق انتخاب نہیں رکھتے؟ یا یہ کہ اجتماعی زندگی وہ چیز ہے جس کا انسان نے خود انتخاب کیا ہے؟ اس سلسلہ میں بھی بہت زیادہ بحث ہوئی ہیں ہم ان میں جانا نہیں چاہتے، صرف اس سلسلہ میں دو اہم نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

پہلا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے لئے کوئی خاص مقصد مانا جائے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

جیسا کہ یہ نہیں کہا جاتا کہ کیوں شھد کی مکھیاں اجتماعی زندگی گذارتی ہیں، اور اس اجتماعی زندگی سے ان کا کیا مقصد ہے؟ ظاہر ہے کہ شھد کی مکھیاں ایک طبیعی ہدف رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ شھد بناتی رہیں اور اپنی عمر اسی میں گذارتی رہیں، اس کے علاوہ ان کا کوئی ہدف نہیں ہے، البتہ خداوند عالم کی نظر میں ان شھد کی مکھیوں کے پیدا کرنے کے بھی بہت سے اہداف ومقاصد ہیں جن میں سے انسانوں کی خدمت ہے، الٰہی ہدف کے علاوہ شھد کی مکھیاں اپنی اجتماعی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رکھتیں، تو کیا انسان کی اجتماعی زندگی بھی اسی طرح خود بخود پیدا ہوگئی ہے اور ان کا کوئی ہدف نہیں ہے؟ یا یہ کہ انسان کی اجتماعی زندگی ایک خاص ہدف کے تحت ہے جس کا لازمہ ایک دوسرے سے رابطہ ہے اور یہ رابطہ خاص قوانین کا تقاضا کرتا ہے؟

اسلامی اور الٰہی نظریہ کے مطابق، انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک ہدف اور مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے سایہ میں رشد وترقی کرے اور انسانی کمال تک پہنچے۔ اس وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی خلقت کا ہدف کیا ہے؟ الٰہی نظریہ کے مطابق خصوصاً حضرت امام خمینیؒ اور دوسرے علماء کرام نے انقلاب اور اس کے بعد میں لوگوں کے سامنے جو بیانات پیش کئے ہیں، ہم کو اسلامی معارف سے مزید آشنا کرتے ہیں، اور یہ بات ہمارے معاشرہ کے لئے روشن ہے کہ انسان کا نھائی اور آخری ہدف قرب خدا ہے اور یہ انسانی کمال کی حد ہے۔

البتہ اس مسئلہ میں ایک مقدار ابہام پایا جاتا ہے اور اس کی وضاحت کی ضرورت ہے، لیکن ہم اس وقت اس کو تفصیل سے بیان نہیں کرسکتے، بہر حال جو ہم نے عرض کیا کہ انسان کی خلقت ایک مقصد رکھتی ہے، لہٰذا انسان اپنی اس اجتماعی زندگی سے قرب پروردگار حاصل کرے یہی اس کا آخری اور نھائی مقصد ہونا چاہئے، اور یہ نظریہ اجمالی طور پر سبھی لوگ

تسلیم رکھتے ہیں لہٰذا اگر ہم اس بات کو قبول کرلیں کہ انسان کی خلقت کا ہدف وہ کمال ہے جو خدا کی قربت میں حاصل ہوسکتا ہے، اور اجتماعی زندگی اس تک پہنچنے کے لئے ایک وسیلہ ہے تا کہ انسان کے لئے زمینہ ہموار ہوسکے کہ وہ اس کمال تک پہنچ سکے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اجتماعی زندگی نہ ہو تو انسان ضروری معرفت حاصل نہیں کرسکتا اور نہ ہی ضروری عبادت انجام دے سکتا۔

نتیجتاً وہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس اجتماعی زندگی ہی وہ وسیلہ ہے جس میں انسان تعلیم و تعلم حاصل کرتا ہے اور انسان بہتر زندگی کے راستہ کو پہچان سکتا ہے، اور اس کو طے کرنے کے لئے موقع فراہم ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں کمال تک زیادہ نزدیک ہوسکتا ہے، اگر ان برہانی مقدمات (جو اپنے مقام پر ثابت ہوچکے ہیں اور ان پر دلائل بھی موجود ہیں) کو قبول کریں تو نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اجتماعی زندگی کا ہدف انسانی کمال تک پہنچنا ہے نہ کہ صرف مادی چیزوں کو حاصل کرلینا، بلکہ انسان کے تمام پہلوؤں کو کامل ہونا چاہئے۔

پس اجتماعی زندگی کا ہدف تمام انسانوں کے دنیوی اور مادّی منافع اور معنوی واخروی منافع کو فراہم کرے، اور چونکہ تمام انسانوں کا یہ ہدف ہے لہٰذا تمام انسان اس زندگی میں حق رکھتے ہیں۔

اب جبکہ یہ ثابت ہوچکا کہ انسان کی اجتماعی زندگی کا ہدف صرف مادی منفعتوں کا پورا ہونا نہیں ہے، اور قانون کا ہدف بھی صرف امنیت کا برقرار ہونا نہیں ہے بلکہ امنیت کے علاوہ دوسرے اہداف بھی ہیں، جن کو پورا ہونا چاہئے، لہٰذا امنیت وآسائش اور مادی احتیاجات کا پورا ہونا اس نھائی کمال اور تقرب الٰہی تک پہنچنے کے لئے ایک مقدمہ ہے۔

بہرحال، اسلامی نظریہ کے اعتبار سے انسان کی خلقت کا ہدف یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام اطراف وجوانب میں تکامل وتقرب الی اللہ کے وسائل فراہم کرے اور اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو الٰہی اور اسلامی سانچے میں ڈھالے، چونکہ انسان کے مختلف پہلو ہیں، اس بنا پر تمام ہی پہلوؤں کی پیشرفت، انسان کی حقیقی پیشرفت وترقی ہے، نہ کہ صرف مادی، اجتماعی اور ٹیکنیکی ترقیاں، لہٰذا مادی پہلوؤں کے ساتھ معنوی پہلو مل کر انسان کی حقیقت سنوارتے ہیں، پس اجتماعی زندگی کا ہدف انسان کی تمام پہلوؤں کی پیشرفت وترقی ہے، اور وہ قانون سب سے بہتر ہے کہ جس میں انسان کے تمام پہلوؤں کی ترقی کے لئے راہ ہموار ہو اور ان چیزوں کو مقدم کرے کہ جن کے ذریعہ سے نھائی ہدف یعنی قرب الٰہی تک پہنچا جاسکے۔

5۔ قانون گذار کی ضروری صفات

اسلامی حکومت یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہماری ذمہ داری فقط معاشرہ کی امنیت کو پورا کرنا ہے، کیونکہ یہ تو "ھابز" کا نظریہ ہے کہ جو کہتا ہے کہ انسان بھیڑئے کہ طرح ہیں، جو ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑے ہیں کسی ایک طاقت کا ہونا ضروری ہے تا کہ ان کو کنٹرول کرسکے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنا اختیار کسی ایسے انسان یا گروہ کے ہاتھ میں دیدے جو ان کو کنٹرول کرسکے اور ان کے ظلم وستم سے بچا سکے، پس یہ کہنا کہ حکومت کی ذمہ داری صرف لوگوں کی امنیت پورا کرنا اور عسر وحرج سے روکنے کے

علاوہ کچھ نہیں ہے، بے شک یہ نظریہ باطل ہے اور جانوروں کی اجتماعی زندگی کے لئے مناسب ہے، نہ کہ انسانی معاشرے کے افراد کے لئے جو اشرف المخلوقات اور بہت سی قابلیتوں کے مالک ہیں، بلکہ ان کا ہدف بہت بلند و بالا ہے۔

لہٰذا اسلامی حکومت کو وہ قوانین جاری کرنا چاہئے جن سے انسان کے تمام پہلو رشد و ترقی کر سکیں اور انسان کے تمام مصالح کو تمام پہلوؤں میں پورا کر سکیں، اور یہ سب اسلامی پرچم کے زیر سایہ عملی ہو سکتے ہیں؛ اور چونکہ ایسے قوانین کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے تمام پہلوؤں کا علم ہونا چاہئے۔ہم ایسے افراد کو جانتے ہیں جو انسان کے بعض پہلو میں مہارت رکھتے ہیں۔لیکن عام لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جسے انسان کے تمام پہلوؤں کا علم ہو۔اگر قدیم زمانہ میں ایسے فلاسفہ ہوا کرتے تھے جو اس طرح کا دعویٰ کرتے تھے۔

لیکن آج انسان کا جہل اور لاعلمی پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہے۔انسان کے پہلو اس حد تک مخفی ہیں کہ کوئی دانشمند یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں انسان کے تمام زاویوں پر احاطہ رکھتا ہوں اور انسان کی تمام ضرورتوں کو بتا سکتا ہوں، اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ ہے کہ کبھی کبھی انسان کی ضرورتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، ممکن ہے کہ بعض مقامات پر معاشی ترقیاں، الٰہی و معنوی امور سے ٹکرائیں، البتہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ الٰہی احسن نظام نے انسانی تمام مصالح کو پورا کیا ہے، لیکن ممکن ہے کہ کسی معاشرہ میں کسی مقام پر انسانی مصلحتوں کے درمیان ٹکراؤ دکھائی دے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ان مصالح کی طبقہ بندی کی جائے اور بعض چیزوں کو مقدم کرنے کے قائل ہوں، تاکہ اگر دو مصلحتوں میں ٹکراؤ ہو تو ذمہ دار افراد کو معلوم ہو کہ کس کو مقدم کیا جائے؟ قانون گذار کا یہ بھی ایک وظیفہ ہے کہ ان امور کو مشخص کرے جو اولیت رکھتے ہیں یعنی قانون گذار کے اندر یہ صلاحیت ہونا چاہئے کہ وہ اولویات کو مشخص اور معین کر سکے یہاں آنے کے بعد انسان کی ناتوانی اور کمزوری مزید ظاہر ہو جاتی ہے، کیونکہ انسان کی اولویات کو پہچاننا انسان کے بس میں ہی نہیں ہے۔

بہر حال انسان کے تمام پہلوؤں پر احاطہ رکھنے کے ساتھ ساتھ، قانون گذار کے لئے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اپنے کو ذاتی اور گروہی خواہشات سے خالی کرے، اور معاشرہ کے مصالح و منافع کو اپنے یا اپنے گروہ کے مصالح پر مقدم کرے اور یہ کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔صرف انسان متقی و پرہیز گار ہی اپنے و معاشرہ کے منافعوں کے ٹکراؤ کی صورت میں معاشرہ کے منافعوں کو مقدم کرے اور اپنے یا اپنے گروہ کی منافعوں سے چشم پوشی کر سکتا ہے اور آزادانہ طور پر معاشرہ کے منافعوں کو اپنے منافع پر ترجیح دے سکتا ہے، لیکن معاشرہ میں ایسے افراد کا ملنا مشکل ہے اور شاید تقریباً محال کی منزل میں ہو۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ قانون گذار کو تمام مصلحتوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی صلاحیت ہونا چاہئے اپنے منافع پر معاشرہ کے منافع کو مقدم کرے۔

یہیں سے الٰہی قانون کی افضلیت بشری قانون پر مکمل طور پر واضح و روشن ہو جاتی ہے، کیونکہ خداوند عالم تمام لوگوں

سے انسانی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے اور صرف انسان کی مصلحتوں کی رعایت کرتا ہے اور اس کو انسانی کردار کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تا کہ انسان کے اعمال سے خدا کی کوئی مصلحت اور اس کے لئے فائدہ ہو، جس کے نتیجہ میں مزاحمت پیدا ہو: خدا انسان کے کاموں سے کوئی نفع نہیں حاصل کرتا ہے تا کہ اس کا نفع دوسروں کے نفع سے ٹکرائے۔

یہ تمام چیزیں اس وقت ہیں کہ جب ہم اپنے منافع کو خدا کے حق ربوبیت کے علاوہ سمجھیں، لیکن اسلامی نظریہ کے مطابق ان تمام چیزوں سے بلند تر وہ بلند کمال ہے جس تک انسان کو پہنچنا ہے، ہم اسی بنیاد پر کہتے ہیں: بالفرض اگر انسانی زندگی کے مادی مصالح اور اجتماعی روابط یہاں تک کہ روحی ومعنوی مصالح پورے ہوجائیں، پھر بھی ایسا معاشرہ نمونہ نہیں بن سکتا۔ ایسا انسان اور معاشرہ نھائی ہدف تک نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ نھائی کمال خدا کی قربت میں ہے، اور یہ قربت خدا کی عبادت واطاعت اور بندگی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

اگر انسان صحت وسلامتی کے ساتھ ساتھ معاشرہ کا چین وسکون، اور دشمن کے مقابلہ میں دفاع اور عدالت سے ہمکنار ہو یعنی انسان تمام اجتماعی حقوق سے مالامال ہو، لیکن اس زندگی میں خدا کی عبادت نہ کی جائے، تو ایسا انسان نھائی کمال تک نہیں پہنچا ہے اور خدا کی رضا وخوشنودی کا مستحق نہیں ہوا ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق، یہ تمام چیزیں انسان کے خدا سے رابطہ کا مقدمہ ہیں، انسان کا حقیقی کمال اسی خدا سے رابطہ میں ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کا حقیقی کمال خدا کے قرب میں ہے۔ خدا کا قرب ایک نعرہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت اور ایسا معنوی ارتباط ہے جو خدا اور انسان کے درمیان برقرار ہوتا ہے، اور انسان اپنی زندگی کے مراحل کو طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے یہاں تک اس بلند مقام تک پہنچتا ہے۔ اس بلند مقام کی پہچان ہر عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے، اور اس کو نہیں معلوم کہ انسان کے لئے کتنا عظیم مرتبہ ہے، تا کہ مادی ودنیوی خواہشات کے ساتھ ساتھ اس روحانی ومعنوی کمال تک پہنچ جائے۔

اور یہ بات بھی یہاں سے واضح ہوجاتی ہے کہ خداوند عالم کو ہماری عبادت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن پھر انسان کو عبادت کے لئے کیوں پیدا کیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ [1]

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں"

جواب یہ ہے کہ انسان کا نھائی کمال عبادت کے علاوہ حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا خدا کی پہچان اور اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے تا کہ انسان اپنے حقیقی کمال تک پہنچ سکے۔ ان مقدمات کے پیش نظر اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قانون مناسب ومطلوب ہے جو معاشرہ کے سرگرم افراد کی مادی ومعنوی احتیاجات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ، ناتوان وکمزور واپاہج لوگوں کی بھی احتیاجات پورا کرے جو کہ معاشرہ میں کچھ بھی خدمات انجام نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ بھی حقوق رکھتے ہیں۔

[1] سورہ ذاریات آیت ۵۶

اسلامی حکومت کا یہ وظیفہ ہے کہ ان لوگوں کے حقوق کو بھی تامین کرے، اور فقراء و مساکین اور اپاہج لوگوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کیا جائے کیونکہ یہ بھی خدا کے بندے ہیں اور اس انسانی معاشرہ میں پیدا ہوئے ہیں اور جب تک زندہ ہیں ان کے حقوق کو دیئے جائیں۔ لہٰذا معاشرہ میں وہ قوانین جاری ہوں ان لوگوں کے حقوق کو مد نظر رکھا جائے، اسی وجہ سے قرآن نے عدالت کے علاوہ احسان پر بھی توجہ دلائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ۔ [1]

"بے شک خدا انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے کا حکم کرتا ہے"

خداوند عالم کے احکامات صرف اخلاقی احکامات نہیں ہیں، بلکہ واجب احکام ہیں جن کی رعایت کرنا ضروری ہے، اور اگر صرف عدالت کی رعایت کرنا ضروری ہوتا تو پھر احسان کا اضافہ کرنا کیا ضروری تھا؛ پس جس طرح معاشرہ میں عدالت کا اجرا کرنا ضروری ہے، اسی طرح احسان کی رعایت بھی واجب ہے، یعنی صرف خدمات انجام دینے والے افراد ہی صاحب حقوق نہیں، بلکہ کچھ ایسے حقوق ہیں جن کو خداوند عالم نے ہر انسان کے لئے مقرر فرمائے ہیں، یہاں تک خداوند عالم نے ان افراد کے لئے بھی حقوق معین فرمائیں ہیں جو اس دنیا میں بدترین حالات میں زندگی گذار رہے ہیں مثلاً ہاتھ پیر آنکھ اور کان سے محروم ہیں لیکن جب تک وہ سانس لے رہے ہیں اور زندہ ہیں تو اسلامی حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ ان کے حقوق کی رعایت کریں۔ لہٰذا اس طرح کے قوانین پر حکومت اسلامی کو توجہ قرار دینا چاہئے، اور یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ہماری ذمہ داری فقط اتنی ہی ہے جس کو مغربی دانشوروں جیسے "ھابز" یا "روسو" وغیرہ نے کہا ہے، کیونکہ یا تو ان لوگوں کی نظر میں انسانی بلند مراتب نہیں تھے یا انسان کو بھیڑیا صفت یا شہد کی مکھیوں کی طرح مانتے ہیں، لیکن اسلام کی نظر میں انسان کی عظمت (اگر چہ اجتماعی زندگی بھی رکھتے ہیں) حیوانوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

پس قانون ایسا ہونا چاہئے جو انسان کی مادی اور معنوی ضرورتوں پورا کرے جو نہائی کمال تک پہنچنے کا مقدمہ ہوں، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ قانون کو انسان کی تمام مادی و معنوی مصلحتوں کی رعایت کرنا ضروری ہے تو پھر کیا انسان کو ہر طرح کی آزادی دی جاسکتی ہے؟ انسان کو اگر اس بلند مقصد تک پہنچنا ہے تو پھر اس کے ارادہ کو محدود اور سسٹمیک ہونا چاہئے، انسان کو ایک خاص راستہ پر چلنا ہوگا تا کہ اس بلند مقصد تک پہنچ سکے۔ کیا انسان کسی بھی راستہ پر چل کر اس بلند ہدف تک پہنچ سکتا ہے؟

کیا وہ لوگ جنہوں نے خدا کو نہیں پہچانا یا خدا کا انکار کیا یا اس سے اور اس کے ماننے والوں سے مقابلہ کیا اس انسانی کمال تک پہنچ سکتے ہیں؟ کیا انسان کے کمال تک پہنچنے کا راستہ عبادت نہیں ہے؟ تو پھر کس طرح وہ انسان جو خدا اور خدا پرستی سے مقابلہ کرتا آیا ہے انسانی حقیقی کمال تک پہنچ سکتا ہے؟ اگر اسلامی حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ انسانی پیشرفت کے لئے

---

[1] سورۂ نحل آیت ۹۰

تمام پہلوؤں خصوصاً معنوی پہلو کے لئے راستہ ہموار کرے تو پھر انسانی ارادوں کو محدود ہونا چاہئے اور اس طرح کے قوانین بنائے جائیں جو انسان کے لئے ان کمالات عالیہ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہ بنیں۔

6۔اسلامی اور لیبرالیزم قوانین میں اختلاف

ہمارے گذشتہ مطالب کے پیش نظر کہ اسلامی قوانین اور انسان کے بنائے قوانین (خصوصاً لیبرالیزم قوانین، جن کا ماننا یہ ہے کہ انسان کو حق معاشرہ کی خدمت کے عوض میں ملتا ہے) میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ ہم اس بات کو چند نکات میں بیان کرتے ہیں۔

الف: لیبرال معاشرہ میں اپنی نظر کے مطابق، جو لوگ اپنی مشکلات کی وجہ سے معاشرہ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے ان کے لئے کسی بھی طرح کے حق کے قائل نہیں ہیں، لیکن اسلام ان کے لئے بھی حق کا قائل ہے، اور ظاہر ہے کہ ان کے حق کی رعایت کے لئے اس کے منابع ہونا ضروری ہیں کیونکہ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کوئی ادارہ ہونا ضروری ہے، اور اس ادارہ کی تامین کے لئے لازم ہوتا ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کے ارادوں کو محدود کریں، یعنی معاشرہ کے مال کا کچھ حصہ ان لوگوں سے مخصوص کیا جائے، جبکہ دوسرے لوگ اس کو نہیں چاہیں گے، لہٰذا ان کی خواہشات کو لا محالا محدود کیا جانا پڑے گا۔

ب: اجتماعی زندگی میں معاشرہ کے اندر ایسے حقوق کو پیش نظر رکھا جائے کہ اگر کسی موقع پر بعض افراد کے حقوق معاشرے کے حقوق سے ٹکرائیں تو معاشرے کے حقوق کو مقدم کی جائے، اور معاشرے کے حقوق اور افراد کے حقوق میں ٹکراؤ پیدا ہونے کی صورت میں، معاشرے کے حقوق کو مقدم ہونا چاہئے، اور یہ کہنا کہ اگر معاشرہ کے حقوق اور فردی حقوق میں تعارض پیدا ہو جائے تو معاشرہ کے حقوق کو مقدم کیا جائے گا یا فردی حقوق کو، ہمیں اس بات کو مختلف نظریوں سے دیکھنا ہو گا کیونکہ اس بارے میں دو مختلف نظریہ پائے جاتے ہیں بعض لوگ انفرادی حقوق کو مقدم کرتے ہیں چنانچہ اس وقت مغربی دنیا میں جامعہ گرائی کے مقابلہ میں فرد گرائی زیادہ رائج ہے اگر جامعہ گرائی سوسیالسٹی (Socialistl) نظریہ بھی قدرے پایا جاتا ہے جس کی طرف سے گاھے گاھے فرد گرائی (صرف اپنے فکر کرنا) والوں پر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں۔

بہر حال لیبرال (Liberal) نظریہ کے مقابلے میں اسلام معاشرہ کے حقوق کو لوگوں کے حقوق سے زیادہ مانتا ہے یعنی اگر معاشرہ اور افراد کے حقوق میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے خصوصاً اگر کوا ہم ٹکراؤ ہو تو معاشرہ کے حقوق کو مقدم کیا جاتا ہے۔لیکن لیبرال حکومتیں اس وجہ سے کہ مارکیٹ کا ریٹ نہ ٹوٹے اور مالداروں کا نقصان نہ ہو لاکھوں ٹن کھانے پینے کے سامان کو جلا دیتے ہیں یا دریا میں ڈال دیتے ہیں، لاکھوں لوگوں کا بھوک سے مرنا ان کو منظور ہے لیکن ان کا مادی نقصان نہ ہو، لیکن اسلام ہرگز اس طرح کی اجازت نہیں دیتا یعنی اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ ایسے افراد کو روکا جائے اور ان کو محدود کیا جائے۔لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشی آزادی بھی اس طرح بے لگام نہیں ہے بلکہ یہ آزادی بھی محدود ہونا چاہئے۔پس جس طرح معاشرہ کے معذور و محروم افراد کی وجہ سے معاشرہ کا منافع محدود ہونا ضروری ہے اسی طرح معاشرہ کے کلی مصلحتوں کی خاطر افراد کے

ارادوں کو محدود ہونا چاہئے تاکہ تمام معاشرے کے مصالح تامین ہوسکیں۔

ج: اسلامی معاشرہ میں کچھ ایسے بھی مسائل ہیں جو خود اپنی ذات سے متعلق ہیں لیکن چونکہ ان کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے لہٰذا اجتماعی مسائل حساب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے گھر میں تنہائی کے عالم میں جبکہ اس کو کوئی نہ دیکھ رہا ہو کسی گناہ کا مرتکب ہو تو بے شک اس کا یہ گناہ فردی ہے اور جو قوانین اس طرح کی چیزوں کو محدود کرتے ہیں ان کو "اخلاقی قوانین" کہتے ہیں (قطع نظر اس چیز سے کہ یہاں پر "اخلاقی" کہنا صحیح ہے یا نہیں)

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تنہائی میں کسی گناہ کا مرتکب ہو تو دوسروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور حکومت کو بھی مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے اس بات کو تقریباً تمام ہی سیاستداں حضرات قبول کرتے ہیں کیونکہ حکومت کا دائرہ معاشرہ تک محدود ہے نہ کہ شخص سے، لیکن یہاں اس بات پر اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح کا کارنامہ انجام دے جس کا تھوڑا بہت اثر دوسروں پر پہنچتا ہو یا کم سے کم یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو اسے دیکھ کر گناہ کرنے کا شوق ہوتا ہے تو کیا یہ کام اجتماعی شکل پیدا کرے گا یا نہیں؟

اگر کوئی شخص سڑک پر یا کوئی ایسی جگہ کہ دوسرے لوگ اس کو دیکھ رہے ہوں کوئی گناہ کرے، اور اس کو دیکھ کر گناہ کرنے پر جرأت پیدا کرتے ہیں اور اس گناہ کے کرنے کا رجحان پیدا ہو، تو اب اس کا یہ کام فردی حالت سے نکل کر اجتماعی شکل پیدا کر لیتا ہے؛ کیا ہمیں حق نہیں ہے کہ اس کام میں دخالت کریں اس وجہ سے کہ اس گناہ کا ضرر و نقصان خود اسی کو پہنچے گا؟!

اسلام تو اس چیز کی اجازت نہیں دیتا، اسی وجہ سے تظاہر بہ فسق (کھلے عام گناہ کرنا) ایک اجتماعی مسئلہ حساب ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص دوسروں کے سامنے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ گناہ حقوقی جرم (اخلاقی خلاف ورزی کے مقابلہ میں) ہے اور حکومت اس میں دخالت کرسکتی ہے۔ وہ قانون جو اس طرح کے گناہوں سے منع کرتا حکومتی قانون کہا جاتا ہے جس کے جاری کرنے کی حکومت ذمہ دار ہوتی ہے۔

لہٰذا اگر تنہائی میں گناہ انجام پائے اور کسی کو پتہ بھی نہ لگے تو اس سے حکومت کا کوئی سروکار نہیں ہے اور کوئی عدالت ایسی نہیں کہ جو اس کو محکوم کرے، لیکن اگر گناہ اجتماعی صورت پیدا کر لے جس سے دوسروں میں بھی گناہ کا رجحان پیدا ہو تو اس وقت حقوقی اور اجتماعی پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے گناہوں سے روکے۔

د: گناہ اور معاشرے کو ضرر پہنچانا صرف مادّی چیزوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ حیثیت اور آبرو کو ضرر پہنچانا بھی گناہ و جرم حساب ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرہ کو لے لیجئے کسی کی بے حرمتی اور توہین کرنا چاہے فیزیکی اور ظاہری طور پر نہ ہو (مثلاً کسی کو توہین آمیز اور مذاق بنانے والی باتیں کہنا) گناہ سمجھا جاتا ہے، اور چونکہ دوسرے سے متعلق ہوتا ہے تو حکومت کو اس سلسلہ میں سزا دینے کا حق حاصل ہے، اسلامی معاشرہ میں دینی مقدسات کی توہین کرنا مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی خلاف

ورزی ہے، اور اگر کوئی دین کی توہین کرے تو اس کی سزا بھی زیادہ ہونا چاہئے، کیونکہ اسلامی معاشرہ میں دینی مقدسات سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے، لہٰذا دینی مقدسات کی توہین سب سے بڑا جرم ہے۔

چنانچہ اس کے لئے سزا بھی سب سے بڑی ہونا چاہئے، اسی بنا پر اگر کوئی مرتد ہو جائے یا اسلامی مقدسات کی توہین کرے تو اس سے کوئی معاملہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر کوئی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا دوسری مقدسات کی توہین کرے تو اسلام کی نظر میں اس کی سزا پھانسی ہے؟ کیونکہ اس نے سب سے بڑا جرم کیا ہے کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک اس سے مقدس ترین کوئی چیز نہیں ہے اور ان مقدسات کی توہین سب سے بڑا جرم ہے لہٰذا اس کی سزا بھی سب سے بڑی یعنی پھانسی ہے اور یہ ایک بنیادی اختلاف ہے کہ جو اسلام اور لیبرال نظریہ میں پایا جاتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے آپ کو گالی دی ہے تو آپ بھی گالی دیدیں، یہ کوئی جرم نہیں ہے: کیونکہ زبان چلانا آزاد ہے! مثلاً اگر کسی نے آپ کے پیغمبر کو برا کہا ہے تو آپ ان کے پیغمبر کو برا کہہ دیں۔ لیکن اسلام کا نظریہ یہ نہیں ہے، اسلام میں اسلامی مقدسات کی توہین کرنا سب سے بڑا جرم ہے اور صرف حقوقی پہلو نہیں ہے بلکہ جزائی اور سزائی پہلو رکھتا ہے، لہٰذا اس کے لئے سزا بھی اتنی ہی سخت رکھی گئی ہے اس طرح کی توہین کسی ایک فرد کی توہین نہیں ہے بلکہ پورے اسلامی معاشرہ کی توہین ہے۔ حقوقی مسائل ایک کے رابطہ سے مربوط ہے: اگر کسی نے کسی کو طمانچہ مارا ہے تو اسے بھی بدلے کا حق ہے، وہ اس کی شکایت بھی کرسکتا ہے اور ممکن ہے اس کو جیل بھیج دیا جائے یا اس کو مالی جرمانہ دینا پڑے: لیکن اگر وہ شخص اس کو معاف کردے تو پھر قضیہ تمام ہو جاتا ہے اور عدالت بھی اس کو کچھ نہیں کہے گی، لیکن سزائی احکام میں اس طرح نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر شکایت کرنے والا بھی اس کو معاف کردے تو بھی مدعی العموم (جو لوگ معاشرہ کے حقوق کے دفاع کرنے والے ہیں) حق رکھتے ہیں کہ اس کی پیروی کرے، کیونکہ یہ بے احترامی پورے معاشرے کی بے احترامی ہے، لہٰذا مدعی العموم اس کی شکایت کرسکتے ہیں۔

اسلامی مقدسات کی توہین کسی ایک فرد کی توہین نہیں ہے کہ کوئی خاص فرد اس کی شکایت کرے اور اگر شکایت کرنے والے نے معاف کردیا تو مسئلہ تمام ہو جائے گا، پھر عدالت بھی اس کی تعقیب نہیں کرے گی۔ لیکن اگر کوئی اخبار یا تقریر میں اسلامی مقدسات کی توہین کرے تو ایسا شخص اسلام کی نظر میں محکوم ہے اور اسلامی قاضی کو اس کی تعقیب کرنا ہوگی: کیونکہ اس نے اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کے حقوق کو پامال کیا ہے اور شخصی و فردی مسئلہ نہیں ہے بلکہ کیفری و سزائی مسئلہ ہے کوئی اس جرم کو معاف نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ ایک ایسا حق ہے کہ جو تمام مسلمانوں سے متعلق ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ خدا سے مربوط ہے، یہ ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں مسلمان دانشور طبقہ خصوصاً ہمارے یونیورسٹی کے طالب علم توجہ رکھیں اور خیال نہ کریں کہ اسلام کے سیاسی و حقوقی مسائل مغربی نظریہ کی طرح ہیں اور صرف اس دنیا کے مادی و دنیوی مسائل سے مربوط ہیں۔ اسلامی نظریہ کے مطابق معاشرہ کے حقوق فردی حقوق پر مقدم ہیں، اور صرف خدمت کے عوض کسی کو حق نہیں ملتا۔

بلکہ ہر وہ شخص جو اسلامی معاشرہ میں زندگی گذارتا ہے حق رکھتا ہے اور یہ حق کسی خاص گروہ سے مربوط نہیں ہے؛ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ معاشرہ بھی کچھ حقوق رکھتا ہے اور اس کے حقوق دوسرے افراد کے حقوق پر مقدم ہیں اور یہ حقوق صرف مادی نہیں ہیں بلکہ ان میں معنوی حقوق بھی شامل ہیں، اور صرف دنیاوی منافع سے مربوط نہیں ہیں بلکہ اخروی و معنوی مصالح سے بھی مربوط ہیں۔

اب تک جو کچھ ہم نے عرض کیا اس سے اسلامی قوانین کا دوسرے قوانین سے امتیاز واضح ہو جاتا ہے، اور سمجھ میں آتا ہے کہ کیوں اسلامی معاشرہ میں انسانوں کے فردی ارادوں کو محدود کرنا ضروری ہے اور سیکولر، لائک اور لیبرال نظریات کی طرح نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز ارادوں کو محدود کر سکتی ہے وہ مادی اور فردی منافع ہیں۔ لیکن اسلام میں معنوی واخروی منافع بھی ہیں، اور ان مصلحتوں میں سے ہر ایک خاص محدودیت چاہتی ہے جس کا لازمہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں فردی آزادی، لائک ولیبرال معاشروں سے کمتر پائی جاتی ہے، اور اسی چیز کا اسلامی حکومت مذہبی اعتقاد کی بنا پر تقاضا کرتی ہے اور ہم کمال وضاحت اور شجاعت کے ساتھ اس کا دفاع کرتے ہیں۔

بیسویں نشست

قانون وحکومت کی ایک نئی تصویر

1۔معاشرہ پرایک طبقاتی اوراحزابی نظر

گذشتہ نشستوں میں ہماری بحث اسلامی حکومت اور سیاست میں قانون گذاری کے بارے میں تھی، اس وقت ہم مذہب اسلام کی روشنی میں سیاسی اور حکومتی احزاب کی معاشرہ میں کیا اہمیت ہے اس پر بحث کریں گے، اس کی وضاحت کے لئے ہم ایک مثال اور تشبیہ عرض کریں گے تا کہ اصل موضوع کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

قدیم زمانہ میں دانشور حضرات معاشرہ کو انسانی پیکر سے تشبیہ دے کر کہا کرتے ہیں: جس طرح انسان کا بدن مختلف اعضاء وجوارح سے مل کر بنتا ہے، اسی طرح معاشرہ بھی مختلف ذات پات، طبقات اور احزاب سے مل کر بنتا ہے اور ان میں سے ہرایک بذات خود چند اقسام پر مشتمل ہوتا ہے اور ہرایک طبقہ اور حزب چند افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو انسان کے اعضاء کی طرح حکم رکھتا ہے۔ البتہ بعض اوقات اس تشبیہ میں افراط وتفریط ہوئی ہے، جس سے درست استفادہ نہیں ہو پایا ہے۔

معمولاً علمی وعملی سرگرمیوں میں افراط وتفریط ہوتی رہتی ہے، چنانچہ صحیح راستہ کی معرفت حاصل کرنا ایک مشکل کام ہوتا ہے، ایسا ہی بعض افراد نے مذکورہ تشبیہ کے بارے میں کیا ہے: چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان کا بدن مختلف اعضاء سے مل کر بنتا ہے، اور یہ اعضاء طبیعی طور پر آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ان میں سے ہرایک اپنی جگہ ایک خاص ذمہ داری رکھتا ہے، اسی طرح معاشرہ کے اعضاء بھی مختلف ہوتے ہیں اور ان میں سے ہرایک خاص کام کے لئے ہوتا ہے اور اس کو وہی کام کرنا ہوتا ہے، اور اس کو اپنے کام سے آگے قدم نہیں بڑھانا چاہئے۔

مثال کے طور پر، ہم جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اعضاء صرف ایک "سلول Cellule" (عنصر) سے بنتے ہیں، اور پھر اسی سلول سے ہمارے بدن کے تمام اعضاء بنتے ہیں، بعض سلول بہت لطیف وظریف ہوتے ہیں کہ جن سے آنکھ یا مغز ودماغ تشکیل پاتے ہیں، اور بعض سلول مضبوط ومحکم ہوتے ہیں جن سے ھڈی بنتی ہے، اور یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آنکھ کا سلول ھڈی کی جگہ یا ھڈی کا سلول آنکھ کے سلول کی جگہ استعمال کیا جائے، یعنی آنکھ سے کان کا کام لیا جائے اور اور ھڈی سے آنکھ کا کام لیا جائے، جبکہ یہ تمام سلول ایک ہی سلول سے بنے ہوئے ہیں، لیکن آپس میں اتنا اختلاف رکھتے ہیں کہ صرف اپنے معین شدہ کام ہی کو انجام دے سکتے ہیں، لہٰذا ان کو ایک دوسرے کی جگہ نہیں رکھا جاسکتا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ معاشرہ کے افراد بھی طبیعی طور پر اسی طرح مختلف طبایع کے اوپر خلق ہوئے ہیں ان کے مختلف طبقات ہیں، ہر ایک کے خاص کام معین ہیں اور صرف اپنا ہی کام انجام دے سکتے ہیں، قدیم زمانہ میں فلاسفہ حضرات معتقد تھے کہ معاشرہ کی مختلف قومیں اور طبقات اپنے لئے ایک معین حد رکھتی ہیں، اور ہر ایک کا کام میں الگ الگ ہوتا ہے (مثلاً حبشی (سیاہ فام قوم) کی ذات سخت اور محنتی کام کے لئے پیدا کی گئی ہے اور سرخ یا زرد رنگ والی قوم فکری کاموں کے لئے پیدا ہوئی ہیں) یہ لوگ اسی تشبیہ سے اس چیز کا استفادہ کرتے تھے۔ ان لوگوں کا ماننا یہ تھا کہ رنگ کا اختلاف، قوموں کا اختلاف اور انسان کے خون کے اختلاف ہونے کا سبب بنتا ہے جس کی وجہ سے انسان کی ہر قوم الگ الگ کاموں کے لئے مخصوص ہے، لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نظریہ افراط (زیادہ روی) ہے، علم و فلسفہ اور دین اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں۔

2۔ معاشرہ کے طبقاتی اور احزابی نظام کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اسلامی نظریہ کے مطابق، تمام انسان اپنے بدن اور روح کے اعتبار سے معاشرہ میں مختلف کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ البتہ انسانوں کی قابلیت و صلاحیت مختلف ہوتی ہے اور برابر نہیں ہوتی، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کالے اور گوروں کے درمیان ایک ایسا فرق ہو جو ایک دوسرے کے کاموں کو انجام نہ دے سکیں، کالے گوروں کا کام نہ کر سکیں یا گورے کالوں کا کام نہ کر سکیں، اسلامی نظریہ کے مطابق، اگرچہ انسانی بدن اور معاشرہ میں شباہت پائی جاتی ہے، جس سے گروہوں اور افراد کی وضعیت کو معین کرنے کے لئے دو نتیجہ نکالے جا سکتے ہیں، لیکن معاشرہ کی ان اعضاء بدن سے تشبیہ دینا جو طبیعی طور پر ہر ایک عضو سے متفاوت اور مختلف ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ معاشرہ کے افراد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہ صحیح نہیں ہے، اس زمانے کے بعض جامعہ شناس افراد بھی بالکل اسی طرح کہتے ہیں کہ معاشرہ بھی ایک طرح کا "ارگانیزم" (Organisme) ہے اور معاشرہ کے مختلف گروہ قوم ذات و پات انسان کے جسم کے اعضاء و جوارح کی مانند ہیں اور ان کا رابطہ اعضاء بدن کے رابطہ کی طرح ہے۔ یہی رابطہ ایک دوسرے کو آپس میں متصل کرتا ہے، ہماری نظر میں یہ نظریہ بھی افراطی ہے۔ لیکن کیا معاشرہ کے افراد کا آپسی رابطہ بالکل انسانی بدن کے اعضاء کے رابطہ کی طرح ہے؟ نہیں اس طرح کا کوئی حقیقی رابطہ اعضاء بدن کے سلول اور معاشرہ کے افراد کے درمیان نہیں ہے؟

معاشرہ کے افراد اس طرح کا ارتباط رکھتے ہیں اس چیز کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے؛ ایسا رابطہ مثلاً آنکھ کے سلول کا ایسا باہمی رابطہ جو ایک عضو کو تشکیل دیتے ہیں یہ ایک مخصوص رابطہ ہے لیکن یہی دیگر اعضاء و جوارح کی مدد سے ایک انسان کے جسم کو تشکیل دیتے ہیں، لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ انسان کے بدن اور معاشرہ میں ایسی شباہت پائی جاتی ہے جس سے انسان کی اجتماعی موقعیت کی پہچان ہو سکتی ہے، مرحوم سعدی نے اپنے مشہور معروف اشعار میں اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بنی آدم اعضاء یکدیگر اند　　که در آفرینش زیك گوهر اند

چو عضوی بہ درد آورد روزگار　　دگر عضوها را نماند قرار

"تمام انسان ایک بدن کی اعضاء کی طرح ہیں کیونکہ ان کی خلقت ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے"
"مثلاً اگر بدن کے کسی ایک حصہ کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضاء بھی بے قرار ہوجاتے ہیں"

بے شک یہ تشبیہ معاشرہ کے افراد کے درمیان ایک محبت و ہمکاری کو ثابت کرتی ہے، انسان میں محبت وعطوفت کا احساس ہوتا ہے تا کہ وہ کوشش کرے کہ ایک دوسرے سے اس کا رابطہ ہمدردی والا ہو، اس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے سے محروم نہ رہیں، یہ ایک معقول تشبیہ ہے کہ جس سے بہت سے استفادہ کئے جاسکتے ہیں، اور یہ تشبیہ حضرت رسول خدا اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی احادیث سے کسب کی گئی ہے، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْمُؤْمِنُونَ فِي تَبَارِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمِثْلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكَىٰ تَدَاعَىٰ لَهُ سَائِرُهُ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى" [1]

"مومنین ایک دوسرے کے ساتھ محبت و پیار اور ہمدردی سے اس بدن کی طرح پیش آئیں کہ جب ان میں سے کسی عضو کو تکلیف پہنچے تو دوسرے اعضاء بھی بے خوابی اور بخار وغیرہ میں اس کی ہمراہی کرتے ہیں"

البتہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام علیہ السلام نے اسلامی معاشرہ کو ایک پیکر کی طرح تعارف کرایا، اور سعدیؒ نے اس کو وسعت دی، اور انسانی معاشرہ کو ایک پیکر کی طرح نقشہ کشی کی ہے۔

البتہ توجہ رہے کہ اس تشبیہ کا کام یہ ہے کہ وہ جہت جو دو موجود میں مشترک اور ایک میں زیادہ اور مشہور اور دوسرے میں کچھ کم ہوتی ہے، اس کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیتی ہے، اور چونکہ یہ خاص جہت دوسرے موجود میں کافی مقدار میں شناختہ شدہ نہیں ہے، لہٰذا تشبیہ کی وجہ سے اس میں بھی پہچان لی جائے، اسی بنا پر "مشبہ بہ" کے تمام خصوصیات اور صفات "مشبہ" میں نہیں لئے جاسکتے، مثلاً اگر کسی بھادر انسان کو شیر کہا جائے، تو اس سے اس کی بھادری کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ اگر شیر کی گردن پر مخصوص بال ہوتے ہیں تو یہ بھی بال رکھتا ہو، یا یہ کہ اگر شیر ہاتھ پیر سے چلتا ہے تو یہ بھی اسی طرح چلتا ہو!

3۔ معاشرہ اور پیکر انسانی میں دیگر شباہتیں

معاشرہ اور انسانی بدن میں گذشتہ تشبیہ کے علاوہ اور بھی تشبیہیں دی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چونکہ انسان کے بدن میں مختلف اقسام کے سسٹم ہیں، جو ایک دوسرے سے ہم فکری اور ہمکاری رکھتے ہیں، جو انسانی سسٹم کی حیات اور اس کے رشد میں موثر ہوتے ہیں، اسی طرح معاشرہ بھی مختلف شعبے اور مختلف مرکز رکھتا ہے جس کے نتیجہ میں معاشرہ میں زندگی کرنا آسان ہوجاتا ہے، مثال کے طور پر انسان کے بدن میں ایک سسٹم ہوتا ہے جس کا کام خون کو تمام جگھوں پر پہنچانا ہے اور اس کا مرکز دل میں ہوتا ہے۔ دل اس خون کو جو معدہ، جگر اور گوارشی مشین کی ہم آہنگی سے بنتا ہے چھوٹی بڑی رگوں کے ذریعہ تمام سلولوں تک پہنچاتا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان کی حیات رواں دواں رہتی ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ج 12 ص 424

خون کو تمام سلول میں پہنچانے والی مشین خود کئی چیزوں سے مل کر بنتی ہے مثلاً دل کا کام خون کو پمپ کرنا ہوتا ہے اور دوسری رگیں خون کو سارے بدن میں میں پہنچاتی ہیں، اسی طرح دوسری مشین خون پھیلانے والی مشین سے وابستہ ہیں جیسے خون کے لئے اکسیجن بنانا کیونکہ خون میں اکسیجن ہونا چاہئے تا کہ بدن کے سلول زندہ رہیں، اور اس وجہ سے پھیپھڑے اور سانس لینے والی مشین بدن کے لئے اکسیجن بناتی ہیں، اور یہ اکسیجن خون کے ساتھ تمام بدن میں پھیل جاتا ہے، اسی طرح غذا خون کے ساتھ تمام بدن میں پھیلتی ہے اور یہ غذائیت گوارشی مشین سے بنتی ہے، پس یہ تین مشین گردش خون، دستگاہ تنفس اور دستگاہ گوارش آپس میں مل کر کام کرتی ہیں جن کی وجہ سے انسان کی حیات ممکن ہوتی ہے، ان کے علاوہ بدن میں اور دوسری مشینیں بھی ہوتی ہیں جن کا کام مختلف مشینوں پر نظارت اور ان کی ہدایت کرنا ہوتا ہے، مثلاً بدن کے مختلف غدے اپنی اپنی مصروفیات میں لگے ہوتے ہیں اور اعصاب (رگیں) دماغ کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں، جن کی وجہ سے دوسرے اعضاء اپنا اپنا کام کرتے ہیں منجملہ ان کے معدہ اور دوسرے اعضاء، اعصابی مشین کے ذریعہ فعالیت کرتے ہیں۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ انسان کی زندگی کے لئے بدن کے مختلف سسٹم ایک ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتے ہیں، اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کے مختلف مرکز اور شعبہ جات کو انسان کے مختلف سسٹم سے تشبیہ کریں اور ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک مشابہ نمونہ کی عکاسی کریں:

مثلاً جس وقت ہم انسان کے معدہ اور تمام بدن تک غذائیت پہنچانے والی مشین کو دیکھتے ہیں؛ یعنی بدن میں غذا کو هضم کرنے اور اس کو مختلف اعضاء تک پہنچانے والی مشین کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد معاشرہ پر نظر ڈالتے ہیں، تو معاشی معاملات میں ان جیسے کام کا مشاہدہ کرتے ہیں، معاشی شعبہ جات کا خصوصی کام کھانے پینے کی چیزوں کو پیدا کرے، اور دوسرے شعبوں کے ذریعہ ان کو لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ جس طرح خون بدن میں بنتا ہے اور دل اور رگوں کے ذریعہ دوسرے اعضاء تک پہنچتا ہے۔

اگر خونی مشین میں کچھ خرابی ہو جائے مثلاً کسی رگ کے بند ہونے سے خون کی حرکت بند ہو جائے، تو اس صورت میں انسان بیمار ہو جاتا ہے، اور جس عضو تک غذائیت نہیں پہنچتی، وہ بے کار ہو جاتا ہے، اور ممکن ہے بعض اوقات اس حصہ کو بدن سے کاٹنا بھی پڑے، اور ممکن ہے کسی سسٹم کی خرابی کی وجہ سے انسان مر جائے۔ لہٰذا انسان کی تندرستی اور زندگی کیلئے ضروری ہے کہ خون آسانی کے ساتھ تمام رگوں میں حرکت کرتا رہے، اسی طرح معاشرہ میں بھی تمام ضروری سامان پہنچتا رہے، اور اگر یہ ضروری سامان کسی ایک جگہ جمع کر لیا جائے اور لوگوں تک نہ پہنچایا جائے، اگر معاشی نظام (کہ جو کاشتکار اور دوسرے اداروں پر مشتمل ہوتا ہے) میں کچھ خرابی ہو جائے اور لوگوں تک کھانے پینے کا ضروری سامان نہ پہنچ پائے تو پھر یہ معاشرہ خواہ ناخواہ بیمار ہو جائے گا، لہٰذا یہ تشبیہ صحیح اور بجا ہے کہ جس میں معاشی شعبہ کی مثال دستگاہ گوارشی خون سے دی جاتی ہے۔

اسی طرح حکومت کی اعصابی مشین سے تشبیہ کی جا سکتی ہے کہ جس کا کام بدن کو حکم دینا ہے، اور یہ اعصاب کے

دو حصوں (حسّی اور حرکتی) سے تشکیل ہوتی ہے۔ لہٰذا حکومت کو اعصابی سسٹم کے مثل قرار دیا گیا ہے، معاشرہ بھی بدن کی طرح دماغ کی ضرورت رکھتا ہے تا کہ اس کو حکم دے سکے اور اسی طرح اس کے حکم کو معاشرہ کے اعضاء میں جاری کرنے کے لئے کچھ مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ حرکت کرتے رہیں۔ اسی بنیاد پر حکومت کے بھی دو بنیادی حصے ہوتے ہیں:

1۔ قانون گذاری حصہ جو معاشرہ کی منفعتوں کی تشخیص اور ان کی فراہمی کے راستوں کو معین کرتا ہے۔

2۔ ان قوانین کو جاری کرنے والا حصہ جو ان احکامات کو معاشرہ میں اجراء کرتا ہے۔

ہمارے حسی اعضاء شناخت کی راہ فراہم کرتے ہیں اور حرکتی اعضاء بدن میں احکام جاری کرنے کی راہ فراہم کرتے ہیں، جس کے مقدمات کو حسی اعضاء فراہم کرتے ہیں اور دماغ سے فکر و سوچ کا کام لیا جاتا ہے، اگر چہ انسان کی روح دماغ کے وسیلہ سے سوچتی ہے، ہمارا ذہن فکر و سوچ کا کام کرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے اعضاء ان کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ نفس انسانی میں ایک قدرت علم ہے جس کا کام علم و معرفت کی تحصیل ہے اور دوسری قوت کا کام حرکت کرنا ہے، اور یہ دونوں دماغ کے تحت کام کرتے ہیں۔ یہ سسٹم بدن کے اعضاء پر نظر رکھتا ہے اور ضروری علم کو حاصل کرتا ہے اور ضروری احکامات کا حکم دیتا ہے اور دوسرے اعضاء کے ذریعہ وہ کام ہوتے ہیں، اس سسٹم کو دماغی اور اعصابی سسٹم کا نام دیا جاتا ہے، اور اس سسٹم کی وجہ سے معاشرہ میں حکومت کی اہمیت کو پہچانا جا سکتا ہے۔

4۔ معاشرہ میں طبقاتی نظام کی روشنی میں حکومت کی اہمیت

جس وقت ہم اپنے بدن کے اعضاء اور ان کی ہم آہنگ اور منظم کارکردگی کو ملاحظہ کرتے ہیں تو یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ہم ان اعضاء کے بنانے اور ان کی منظم کارکردگی میں بالکل دخالت نہیں رکھتے، علمی اصطلاح کے مطابق، طبیعت کا کام ان کو منظم طور پر چلانا ہے۔ لیکن دینی اصطلاح کے مطابق ہم کہیں گے کہ یہ خداوند عالم کی ذات کا کرشمہ ہے کہ ان میں اتنی صلاحیت و استعداد اور قدرت عطا کی ہے، یہ اسی کا کمال ہے کہ جس سے انسانی اعضاء میں اتنی عظمت و پیچیدگی اور ظرافت پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ ہماری روح اس سے کہیں زیادہ باعظمت اور پیچیدہ تر ہے۔

جس خداوند عالم نے ہم کو بدن اور اعضاء عنایت کئے ہیں تو پھر ہم کو ان سے صحیح طریقہ سے استفادہ کرنے کی معرفت ہونا چاہئے اور ہم کو اپنے اعضاء سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہئے کہ ہماری عمر طولانی اور صحت و سلامتی اور خوشی کے ساتھ ساتھ بسر ہو؛ ایسا نہ ہو کہ ہم جس طرح چاہیں ان سے کام لینا شروع کر دیں، اگر ہم جو ہمارے ہاتھ لگا کھا لیا، جو ملا پی لیا، جس کام کی ہوس کی اس میں مشغول ہو گئے، نامناسب غذا کھائی یا خدا نخواستہ نشیلی چیزوں سے پرہیز نہ کیا، تو کیا ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہمارا بدن صحیح و سالم رہ پائے گا، اور ہماری عمر طولانی اور صحت و سلامتی کے ساتھ گذر پائے گی؟

ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بے شک صفائی کی رعایت کے بغیر ہماری عمر طولانی اور صحت و سلامتی کے ساتھ نہیں ہو پائے گی۔ یعنی ہمیں چاہئے کہ دلخواہ آزادی کو محدود کریں اور اپنی مرضی کے مطابق ہر چیز نہ کھائیں، غذا کی کیفیت اور اس کی مقدار

پر بھی توجہ رکھیں، اسی طرح غذا کی قسم اور اس کے اوقات کی بھی رعایت کریں، کیونکہ اگر ان چیزوں کی رعایت نہیں کریں گے، مثلاً خراب شدہ کھانے کو کھائیں گے تو بیمار ضرور ہو جائیں گے، اور ہو سکتا ہے کہ ہماری جان بھی چلی جائے۔

صفائی اور ڈاکٹری کے قوانین واقعاً طبیعی ہیں جن کی ہمارے بدن کو ضرورت پڑتی ہے اور یہ قوانین دانشمندوں کی مسلسل کوششوں کے نتائج میں بنائے جاتے ہیں اور انسان کی زندگی صحیح وسالم طریقہ سے گذرنے کیلئے دوسروں کو تعلیم دی جاتی ہے۔

بدن کے لئے ان قوانین کی رعایت کے سلسلہ میں ہم نے جو کچھ عرض کیا اس کے پیش نظر اگر کوئی ڈاکٹر کہے کہ فلاں غذا کو نہ کھاؤ، نشیلی چیزوں کا استعمال نہ کرو، کیونکہ تمہارا ذہنی توازن ختم ہو جائے گا، اور تمہارے معدہ یا جگر یا کے لئے نقصان دہ ہے تو ہمارا کیا فرض ہے؟! کیا اس کا شکریہ نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ اس نے ہماری راہنمائی کی اور ہمارے لئے سلامتی کی راہ بتائی، یا اس پر اعتراض کریں کہ آپ سے کیا مطلب ہم کچھ بھی کھائیں؟! جس نے ہماری سلامتی کا راستہ بتایا گویا اس نے بہت بڑی خدمت کی، لہٰذا ہمیں اس کے ہاتھوں کے بوسہ لینا چاہئے۔

جس وقت ہم بیمار ہو جاتے ہیں، بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس جانے کے لئے کئی کئی دن پہلے وقت لے تے ہیں اور بڑی منت وسماجت سے کہتے ہیں کہ ہمارا معاینہ کر لیجئے، اور اس کے بعد ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخہ کی دوائی کی تلاش میں شہر کے چکر لگاتے ہیں تا کہ اس کو کھائیں، اور ٹھیک ہو جائیں، ہم ان تمام زحمتوں کو صحت وسلامتی اور تندرستی کے لئے برداشت کرتے ہیں، کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری عمر صحت وسلامتی کے ساتھ بسر ہو، لہٰذا اس مقصد کے تحت ڈاکٹری قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہے، اور اس طرح ہماری آزادی محدود ہو جاتی ہے اور جو بھی مرضی ہوتی ہے اس پر عمل نہیں کرتے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان قوانین پر عمل کرنا ہماری صحت وسلامتی کا باعث ہے، نہ کہ ہماری خوشی میں رکاوٹ، ہمیں چاہئے کہ ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے ے، جنھوں نے ہمیں صحت وسلامتی کا راستہ بتایا، کیا دنیا کا کوئی عقلمند انسان ڈاکٹری قوانین کو فردی زندگی میں دخالت کرنا کہتا ہے، یا اس کو معاشرہ کی بہترین خدمت کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے؟

ہم نے اب تک جو کچھ بیان کیا وہ انسان کی ذاتی اور فردی زندگی سے متعلق تھا، معاشرہ کے سلسلہ میں بھی بالکل اسی طرح ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ میں زندگی کے معنی کو نہیں سمجھ سکا اور نہیں چاہتا کہ زندہ رہوں، اور میرے زندہ رہنے اور مرجانے میں کوئی فرق نہیں ہے! تو ظاہر ہے ایسے شخص کو کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا۔ اور اگر وہ ان قوانین کی رعایت کرنا پسند نہ کرے تو کوئی بھی حادثہ ہو سکتا ہے کیونکہ ہر چیز کے اسباب ہوتے ہیں اور انسان طبیعی کاموں میں کوئی اثر نہیں رکھتا، اور اس کا نتیجہ یا بیماری ہوگا یا موت۔ اگر کوئی انسان اپنی زندگی میں ہدف نہ رکھتا ہو، اور جو چاہے کھائے تو اس کو اپنی زندگی کو حوادث کی نذر کرنا ہوگا، کیونکہ خود اس کے کاموں کی وجہ سے بیماری میں مبتلا ہوگا اور آخر کار موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔

لیکن اگر کوئی اپنی زندگی کا ہدف رکھتا ہو اور طولانی عمر اور سلامتی چاہتا ہو اور اس سلامتی سے ترقی خصوصاً معنوی ترقی

چاہتا ہو تو وہ ڈاکٹری قوانین سے بے توجہی نہیں کر سکتا، یعنی ڈاکٹروں اور ماہر افراد کے بتائے ہوئے قوانین کو لفظ بلفظ عمل کر کے اپنی آزادی کو محدود کرلے۔

اگر معاشرہ کو بھی بے ہدف افراد کی طرح فرض کرلیا جائے کہ جن کے نزدیک زندگی وموت برابر ہوتی ہے، نہ اپنا بقا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنے لئے شرف چاہتے ہیں، نہ ہی عزت چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنا استقلال اور نہ ہی اپنی شخصیت اور عزت چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنے لئے آخرت ومعنویت چاہتے ہیں، مسلماً ایسا معاشرہ جو چاہے کرے بالکل آزاد ہے اس کے لئے کسی بھی قانون کی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن ایسے شخص کے لئے زندگی وموت برابر ہے۔

انسان کو صرف اس وقت کسی قانون ومقررات کی ضرورت نہیں ہوتی جب موت وزندگی اس کی نظر میں مساوی ہو، یہاں تک کہ اگر موت کو بھی نہیں چاہتا اور زندہ یا مرنا اس کے لئے کوئی فرق نہیں رکھتا، تو اس کو کسی بھی قانون کی ضرورت نہیں ہے ورنہ اگر موت بھی چاہے تو اس کے لئے بھی خاص قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہے، اور اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ کن کاموں سے موت آسکتی ہے، لہٰذا کوئی بھی با مقصد کام بغیر کسی قانون کے ممکن نہیں ہے اور مطلق آزادی کے ساتھ کسی بھی مقصد تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، اگر کوئی ہدف ہے تو اس کے لئے محدودیت کا قائل ہونا پڑے گا، اور ہر کام کے مقدمات اس کے قوانین وضوابط کے تحت ہونا چاہئے، چاہے اس کا ہدف موت ہی کیوں نہ ہو۔

اگر معاشرہ کچھ ہدف رکھتا ہے تو اس کے لئے قانون کی رعایت کرنا ضروری ہے، یعنی اپنی آزادی کو کم کر کے اپنی بعض خواہشات سے صرف نظر کرے۔ اور جو چاہے کرے تو پھر ہدف تک نہیں پہنچ سکتا، ہاں اگر اس کا کوئی ہدف نہ ہو، تو پھر اسے کسی قانون کی ضرورت نہیں ہے، ایسے معاشرہ کی مثال اسی شخص کہ جس کا کوئی ہدف نہیں ہے اور کچھ ہی دنوں میں موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے، اس بنا پر، اگر معاشرہ کو دوام اور ترقی وپیشرفت کرنا ہو اور ہمیشگی سعادت وعزت درکار ہو تو پھر اس کو دقیق قوانین کی ضرورت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرہ کے لئے کس طرح قوانین بنائے جائیں؟ کون بنائے؟ کیا یہ قوانین ایک طرح کے واقعی امور ہیں جن کو کشف ہونا چاہئے، یا صرف اعتباری امور ہیں کہ جن کو بنایا جائے؟ یہ مسئلہ فلسفہ حکومت میں بہت اہم ہے۔

ہم انسان کی فردی زندگی میں دانشمند حضرات کے کشف کئے ہوئے کچھ قوانین کا مشاہدہ کرتے ہیں، یعنی فلاں مکروب فلاں بیماری کا سبب بنتا ہے یہ اس واقعی رابطہ کی وجہ کہ جو حقیقی علت ومعلول کے درمیان پایا جاتا ہے اور دانشمند حضرات اس کو اپنے تجربوں سے کشف کرتے ہیں اور اس کو ڈاکٹری قانون کے عنوان سے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ: فلاں بیماری سے بچنے کے لئے فلاں مکروب سے پرہیز کرنا ضروری ہے، یا اگر فلاں بیماری پھیل گئی تو اس بیماری سے محفوظ رہنے کے لئے فلاں ٹیکا لگوانا ضروری ہے۔ معاشرہ کو بھی اگر صحیح وسالم زندگی گذارنا ہے تو اس کے لئے بھی قوانین کی رعایت

کرنا ضروری ہے تو کیا یہ قوانین واقعاً طبیعت میں موجود ہیں کہ کچھ لوگ ان کو کشف کریں؟ یا نہ، یا قوانین اعتباری اور فرضی ہیں، اور لوگوں کی رضایت کی خاطر ان کو کبھی کبھی بدلا بھی جا سکتا ہے، کیونکہ یہ قوانین اکثر لوگوں کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ واقعاً یہ مسئلہ بہت اہم اور بنیادی ہے اور اس کا ایک پہلو فلسفہ سے متعلق ہے اور ایک پہلو انسانی علوم سے وابستہ ہے اور اس کا ایک پہلو معرفت شناسی سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے بہت سے پیچیدہ مسائل ہیں جن کی بحث یونیورسٹیوں یا علمی مرکزوں میں ہونی چاہئے، اور ان تمام مطالب کو بیان کرنا اس وقت ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن سب کے استفادہ کے لئے ہم ان میں سے کچھ منتخب مسائل کو بیان کرتے ہیں۔

5۔ واقعی مصالح ومفاسد قانون کے پشت پناہ

کیا واقعاً امنیت اور چوری سے روکنے کے درمیان کوئی رابطہ ہے؟ یعنی اگر امنیت چاہتے ہیں تو چوری نہیں ہونا چاہئے؟ یا نہ، ان کے درمیان صرف ایک قراردادی رابطہ ہے، اور امنیت اور چوری دونوں ہی ممکن ہیں۔ کیا قتل اور نا امنی میں کوئی رابطہ ہے؟ یعنی اگر کوئی ہر کسی کو قتل کرنا چاہے قتل کردے تو کیا واقعاً اس سے نا امنی پیدا ہوتی ہے یا یہ صرف قراردادی رابطہ ہے؟ کیا جنسی آزادی گھر کے اجڑنے کا سبب بنتی ہے یا نہیں؟ مثلاً اگر کسی زمانہ میں لوگوں کی پسند ہونے کی وجہ سے جنسی رابطہ کو آزاد قرار دیدیا جائے تو ایک روز کہنا بھی محدود ھے کیونکہ اکثر لوگ اس کو پسند نہیں کرتے ہیں، تو کیا ایسا قانون بنانا جس میں جنسی آزادی موجود ہو یا موجود نہ ہو، صرف ایک قراردادی مسئلہ ہے؟ یعنی کیا یہ کام کا ایک سلیقہ ہے کہ لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں یا ناراض ہوتے ہیں، اور ان کی مرضی کے مطابق قانون ہونا چاہئے؟ یا نہ، بلکہ ایک واقعی رابطہ پر موقوف ہے، اور وہ یہ کہ اگر جنسی آزادی ہو تو پھر معاشرہ میں جسمی اور روحی بیماریاں جیسے ایڈز وغیرہ پھیل جائیں گی، اور لوگوں کے گھر اجڑ جائیں گے، عورت مرد میں روحانی بیماریاں پھیل جائیں گی، بچے بے تربیت اور دوسری تباہی پھیل جائیں گی۔

بعض لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اجتماعی قوانین، واقعی مصالح ومفاسد کے تابع ہیں، اور ایسا نہیں ہے کہ یہ قوانین لوگوں کی مرضی اور ان کے سلیقہ پر ہوں۔ جس طرح اگر شراب رائج ہو جائے تو روحی، قلبی اور تنفسی بیماریاں پھیل جائیں گی یا اگر بیڑی سگریٹ کا رواج ہوا تو بہت سی بیماریاں پیدا ہو جائیں گی، اجتماعی مسائل بھی اسی طرح ہیں: اگر عورت مرد میں آزادانہ روابط ہو جائیں تو پھر معاشرے میں اس کے اثرات خطرناک ثابت ہونگے جس کے نمونے مغربی ممالک (کہ جہاں نامشروع روابط کافی حد تک رائج ہیں) میں ملاحظہ کرتے آئے ہیں، لہٰذا قانون بناتے وقت ان کے واقعی آثار بھی مدنظر رہیں، نہ یہ کہ صرف لوگوں کی مرضی کے مطابق ہی عمل کیا جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ لوگوں کی اکثریت جنسی آزادی کو پسند کرتی ہے یا پسند نہیں کرتی۔ یا لوگوں کی اکثریت افیم وچرس کی آزادی کی خواہاں ہے یا نہیں؟ کیا قانون کو اسی طریقہ پر ہونا چاہئے یا یہ کشف کریں کہ نشیلی چیزوں سے کیا کیا نقصانات ہیں اگرچہ اکثریت اس کے موافق بھی ہو؟ آپ کی نگاہ میں کون سا راستہ صحیح ہے؟ اجتماعی قوانین لوگوں کی اکثریت کی بنا پر ہوں یا واقعی (نفع ونقصان کی) بنا پر؟ یعنی اجتماعی مصالح ومفاسد حقیقی اور واقعی

امور ہیں یا صرف اعتباری یا سلیقہ ائی امور ہیں؟

"ہیوم" کے زمانہ کے بعد سے، مغربی ممالک میں معرفت شناسی میں یہ بحث بیان ہوئی ہے کہ "بایدھا و نبایدھا" (کیا ہونا چاہئے کیا نہیں ہونا چاہئے) خارجی واقعیت نہیں رکھتے اور ان پر عقلانی امور اور استدلال کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ "خوب وبد" انہیں سلیقوں کی طرح ہے جو لوگوں کے درمیان پائے جاتے ہیں، مثلاً اگر کسی کو "گلابی رنگ" پسند ہے تو اس سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ کیوں آپ کو یہ رنگ کیوں پسند ہے، کیونکہ کسی کو یہ رنگ پسند ہے دوسرے کو کوئی دوسرا رنگ پسند ہے، تو کیا اجتماعی مسائل بھی رنگوں کی طرح ہیں؟ یا نہیں، بلکہ اجتماعی مسائل، واقعی مصالح ومفاسد کے تابع ہیں؟ انسانی کردار کا اثر جو انسان کی فردی اور اجتماعی، مادی ومعنوی زندگی پر ہوتا ہے ایک حقیقی رابطہ ہے، یعنی در حقیقت ان میں علّت ومعلول کا رابطہ ہے، اور اجتماعی اور فردی زندگی میں انسانی کردار سعادت یا شقاوت کا سبب ہوتا ہے، لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سے کام سعادت کے باعث ہیں تا کہ وہ کام جائز ہوں، اور کون سے کام شقاوت وبدبختی کے باعث ہیں تا کہ ممنوع اور حرام ہوں۔ اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا کہ انسانی کردار کا سعادت وشقاوت سے واقعی اور حقیقی رابطہ ہے تو ضروری ہے کہ ان روابط کو پہنچانا جائے اور انہیں کی بنیاد پر قوانین بنائے جائیں۔ اس وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون انسان کے مصالح ومفاسد کو بہتر طور پر جانتا ہے؟ ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ان کو بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا قانون گذاری میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی فردی اور اجتماعی زندگی کے اعمال اور سعادت وشقاوت میں علّی اور معلولی رابطہ ہے جن کو مصلحت ومفسدہ کہا جاتا ہے، لہٰذا ان مصلحتوں اور مفسدوں کو پہچاننا ضروری ہے اور انہیں کی بنیاد پر قوانین بنائے جائیں، اور اکثر لوگوں کی مرضی کے مطابق قوانین نہیں بنانے چاہئے۔

اکیسواں جلسہ

اسلام اور جمہوریت

(پہلا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے گذشتہ بحث کے دوران اسلام کے سیاسی نظریہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا: ایک قوہ مقننہ (قانون گذاری) دوسرا قوہ مجریہ (قانون کو جاری کرنے والی طاقت)، اور اس سلسلہ میں ہونے والے اعتراضات کے جوابات بھی دیئے، نظریہ کی بنیاد یہ تھی کہ سیاسی حکومت منجملہ اسلامی حکومت کے دو حصے ہوتے ہیں، (البتہ ممکن ہے کہ دوسرے نظریات کے تحت تین یا چار حصے بھی ہو سکتے ہیں) پہلا حصہ قانون گذاری کا ہے اور دوسرا حصہ قوانین کا جاری کرنا ہے، قانون گذاری کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ معاشرہ میں وہ قوانین حاکم ہوں جن کے ذریعہ معاشرہ کے مادّی و معنوی مصلحتوں کو پورا کیا جاسکے، اسی بنا پر وہ شخص معاشرہ کے لئے مکمل قانون بنا سکتا ہے جو انسان کے مادی و معنوی تمام پہلوؤں اور اجتماعی زندگی کے مختلف شرائط سے باخبر ہو، اور یہ قوانین اس طرح بنائے جائیں کہ جن سے عالم آخرت میں انسانی سعادت فراہم ہو سکے، اور ظاہر ہے کہ خداوند عالم یا خداوند عالم کا منتخب بندہ ہی ایسے علم و دانش کا مالک ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت میں توحید کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے بندے خدا کے احکامات کی اطاعت کریں اور خداوند عالم کے تشریعی ارادہ کو اپنی زندگی میں حاکم قرار دیں، اور اس کے مرضی کے خلاف قدم نہ اٹھائیں، لہٰذا قانون گذاری میں خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کی رعایت کی جائے۔ چونکہ اسلامی قوانین مخصوص حقیقت کے حامل ہیں لہٰذا انسان کے بنائے ہوئے قوانین سے امتیاز رکھتے ہیں۔

مختصر الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ اسلامی قوانین خدا یا جس کو خدا اجازت دے کر بھیجے، اس کی طرف سے ہونا چاہئے۔ اسی طرح قوانین کو جاری کرنے والوں کے لئے بھی ہے، کیونکہ قانون کا مجری گویا معاشرہ کے لوگوں میں تصرفات کرتا ہے، اور ان کو قوانین الٰہی پر عمل کرنے پر آمادہ کرتا ہے، کبھی کبھی حدود و تعزیرات کو جاری کرتا ہے اور کبھی جرم کے مقابلہ میں خاص پابندیاں لگاتا ہے۔

بہر حال یہ کچھ تصرفات ہیں جو خدا کے بندوں میں ہوتے ہیں، اور یہ تصرفات صرف وہ حضرات کر سکتے ہیں جو

خداوند عالم کی طرف سے اذن یافتہ ہیں، ان کے علاوہ یہ تصرفات جائز نہیں ہیں۔

2۔ قانون کے جاری کرنے والوں کے لئے بھی اذن خدا ضروری

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ سوال کریں کہ جب ہم نے قانون کو قبول کرلیا اور ان کے جاری ہونے والے راستوں کو اچھی طرح پہچان لیا اور یقین کرلیا کہ فلاں خاص موقع پر فلاں قانون جاری ہونا چاہئے، تو اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ قانون کا جاری کرنے والا زید ہو یا عمرو؟ جب خدا کا صحیح قانون جاری ہوجائے تو پھر خدا کی اجازت کی کیا ضرورت؟ ہم نے قبول کرلیا کہ معاشرہ میں قوانین الٰہی جاری ہوں، لیکن پھر جاری کرنے والے کے بارے میں اجازت کی کیا ضروت؟

گذشتہ اعتراض کو اگر فقہی فضاء میں بیان کیا جائے تو جواب بھی فقہی روش کے لحاظ سے دیا جائے گا، اگر کوئی اس اعتراض کو فقہی تحقیق اور آزاد طریقہ سے بیان کرے، اور ہم سے جواب لینا چاہے اور یہ چاہے کہ عمومی طور پر قابل فہم ہو تو پھر ہم اجتماعی مثالوں کے ذریعہ عام فہم زبان میں عرض کریں گے، مثلاً آپ کی گھریلو زندگی میں کچھ قوانین ہوتے ہیں جن کو آپ کی بیوی اور بچوں کو رعایت کرنا ہوتا ہے، مثلاً یہ کہیں کہ کوئی دوسرا کسی کی چیز کو ہاتھ نہ لگائے، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے کھلونے اور کاپی پینسل وغیرہ میں اس قانون کی رعایت کرتے ہیں، اور ان میں سے کوئی دوسرا بغیر اجازت کے کسی دوسرے کی چیز کو اٹھاتا ہے، تو اس پر اعتراض ہوتا ہے، یا اگر آپ کا کوئی پڑوسی آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے گھر میں داخل ہوکر آپ کے سامان کو لے جائے، اگرچہ وہ سامان آپ کے نزدیک بے کار ہی کیوں نہ ہو، تو آپ فوراً اعتراض کردیتے ہیں کہ میری اجازت کے بغیر کس طرح میرے گھر میں داخل ہوئے، یا کیوں ہمارے سامان کو اٹھا کر لے گئے، یہاں تک کہ اگر اس نے آپ کے ساتھ کچھ احسان بھی کر رکھا ہو، پھر بھی آپ کو حق ہے کہ اس پر اعتراض کریں۔

ایک دوسری مثال کو فرض کیجئے کہ کسی ادارہ میں کچھ قوانین نافذ ہونا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک اس ادارہ کے رئیس کا حکم نامہ نہیں آیا ہے، اگر کوئی آکر کہے کہ میں ایک با اطمینان اور با امن انسان ہوں، اور قوانین کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں اور اب رئیس کی کرسی پر بیٹھتا ہوں اور ان قوانین کو یکے بعد دیگرے جاری کرتا ہوں، تو کوئی بھی اس کو اس کام کی اجازت نہیں دیگا؛ یہاں تک کہ اگر وہ شخص بعد کا ہونے والا رئیس ہی کیوں نہ ہوں، جب تک اس کا حکم نامہ نہ آجائے اس کو حق نہیں ہے کہ کرسی پر آکر بیٹھے اور لوگوں کو حکم دے۔

اور اگر کوئی ایسا کام کرے بھی تو وہ مجرم مانا جائے گا، اور ہوسکتا ہے کہ اس کو عدالت میں بھی بھیج دیا جائے اور اس کو سزا بھی ہو، جب اس نے خدمت انجام دی ہے اور اس نے وہی کام انجام دیا ہے کہ جو ابھی کچھ دنوں کے بعد ہونے والا ہے، کیوں اس اصل کو تمام عقلمند حضرات قبول کرتے ہیں؟ اس لئے جب تک اس کے اوپر والا رئیس اس کو اس کام کی اجازت نہ دے تو اس کو ایسے کاموں کی اجازت نہیں ہے خلاف قانون کی تو دور کی بات ہے۔

معاشرہ میں اجتماعی زندگی کے اندر اس قبول شدہ اصل کے پیش نظر ہم آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتے ہیں، کہ وہ

معاشرہ جو خدا سے متعلق ہے اور لوگوں نے خدا کو ربّ مانا ہے، اگر کوئی اپنے ربّ کی اجازت کے بغیر حکومت کرنا چاہے اس کی مثال اس شخص کی ہے کہ جو کسی ادارہ میں ریاست کرنا چاہے، یا مثلاً کوئی رئیس مملکت بننا چاہے، اور اس کے کاموں میں مشغول ہو؛ بغیر اس کے اس بلند رتبہ والا اس کو اجازت دے، یہاں تک کہ اگر اس کا کام بھی صحیح اور بجا ہو، تو اس سے باز پرس کی جاتی ہے، اور ممکن ہے کہ اس کو سزا بھی ہو، اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین کا اجراء کرنے والا بھی خدا کی طرف سے ہو، جو لوگوں کا مالک حقیقی ہے، ورنہ اس سے باز پرس ضرور ہوگی، جیسا کہ ہم نے گذشتہ مثال میں عرض کیا، اور اگر یہ فرض کریں کہ اس سے باز پرس بھی نہ ہو، تو لوگوں پر اس کی اطاعت واجب نہیں ہے، یہاں تک کہ اسی قانون کے بارے میں لوگ کہیں گے کہ جب تک آپ کا حکم نامہ نہ آجائے تب تک آپ کیسے رئیس بن بیٹھے؟ اور جب تک لوگ یہ یقین نہ کرلیں کہ اس کو بلند مرتبہ رئیس نے اس رتبہ پر فائز کیا ہے اس کی اطاعت بھی نہیں کرتے۔

اسلامی نظریہ کے لحاظ سے، معاشرہ کے تمام ہی افراد خدا کی مخلوق ہیں، اور خدا ان کا مالک اور خالق ہے، لہٰذا مالک کی اجازت کے بغیر کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے امور میں دخالت کرے جب تک کہ ان کا مالک (خدا) اس کام کی اجازت نہ دے، یہاں تک کہ قانون الٰہی کو وہی معین شخص جس کو خدا کی طرف سے اجازت ہے، جاری کرسکتا ہے، اسی وجہ سے اسلامی انقلاب کے بانی حضرت امام خمینیؒ نے اسلامی نظریہ کے مطابق اپنے کو اسلامی حاکم صدر مملکت کے لئے جو حکم نافذ کیا اس میں یہ تحریر کیا کہ میں تم کو نصب کرتا ہوں یعنی آپ نے کسی بھی موقع پر لوگوں کے ووٹ کو کافی نہ جانا، یہاں تک بعض موقعوں پر فرمایا: میں اُس ولایت کی رو سے جو تم پر رکھتا ہوں تم کو منصوب کرتا ہوں، ایک موقع پر آپ نے فرمایا:

"ان لوگوں کی باتوں کو نہ سنو کہ جو اسلامی نظریات کے خلاف ہیں، اور خود کو روشن فکر تصور کرتے ہیں اور ولایت فقیہ کو قبول نہیں کرتے، اگر ولی فقیہ اس کو منصوب نہ کرے تو اس کی حکومت غیر مشروع ہے اور جب غیر مشروع ہوئی تو وہ طاغوت ہے، اور اس کی اطاعت طاغوت کی اطاعت ہوگی"۔ [1]

یہ کوئی امام خمینیؒ کا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ یہ نظریہ قرآن وحدیث سے اخذ کیا گیا ہے، بہرحال یہ اس شخص کا نظریہ ہے جس نے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی ہے۔

لہٰذا قانون کو جاری کرنے والا، اولاً اسلامی نظریہ کے مطابق تمام قوانین کو جاری کرنا، ثانیاً وہ خدا کی طرف سے اذن یافتہ ہو۔ اور یہ اذن کبھی خاص ہوتا ہے جیسا کہ حضرت رسول خدا اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں ہے یا ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کو خود آنحضرت نے منصوب فرمایا ہے، یا جس طرح حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی طرف سے بعض اسلامی ریاستوں کے والی وحاکم معین ہوئے ہیں، یا جس طرح امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے زمانہ میں نواب اربعہ خاص طور پر منصوب ہوئے۔

---

[1] صحیفہ نور ج 9 ص 251

ان تمام مقامات میں یہ افراد اس شخص کی اجازت سے منصوب ہوئے جو اپنی حکومت میں الٰہی قوانین کو بیان اور کو جاری کرتے تھے۔ کبھی یہ منصوب کرنا عام ہوتا ہے؛ جیسے امام زمانہ علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں، یا ان ائمہ علیہم السلام کے زمانہ میں کہ جو مبسوط الید (آزاد) نہ تھے اور حکومت ان کے ہاتھوں میں نہ تھی، ایسے موقعوں پر باصلاحیت افراد اذن عام کی بنا پر منصوب اور احکام الٰہی کے جاری کرنے کے لئے معین ہوتے تھے، مثلاً حضرت امام صادق علیہ السلام نے اپنے شیعہ فقہاء کو اجازت دی ہے کہ جن علاقوں میں لوگوں کی امامؑ تک رسائی ممکن نہ ہو، وہاں علماء احکامات الٰہی کو جاری کریں اور حکومتی کاموں میں مشغول رہیں، زمانہ غیبت میں یہ مسئلہ بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔

کیونکہ جب امام حاضر اور مبسوط الید نہیں ہے یا امام تقیہ کی عالم میں ہے، تو وہ بطور عام ان افراد کو منصوب کرتا ہے جو اس کی طرف سے حکومتی مسائل میں دخالت رکھتے ہیں، کیا یہ کام امام علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں کہ جس میں امام علیہ السلام تک رسائی ممکن نہیں اولیٰ اور مناسب نہیں ہے؟

اس وقت ہم فقہی مبانی اور شرعی دلیلوں کو ثابت کرنا نہیں چاہتے، صرف اس مسئلہ کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام میں حتیٰ اسلامی قانون کو جاری کرنے والے کے لئے بھی خدا کی اجازت کی ضرورت ہے، اور کس طرح خداوند عالم قانون کو جاری کرنے والوں کو اجازت دیتا ہے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ اجازت یا کسی خاص شخص کے لئے بصورت خاص ہوتی ہے، یا بصورت عام جیسا کہ جامع الشرائط فقہاء کرام کے لئے ہے۔

اس نظریہ پر چاہے وہ قانون گذاری پہلو ہو یا قانون کو جاری کرنے والا پہلو بعض اعتراض ہوتے تھے، جن میں سے سب سے اہم یہ تھا کہ یہ نظریہ انسانوں کی آزادی کے مخالف ہے، البتہ ہم نے اس اعتراض کا گذشتہ گفتگو میں مفصل جواب عرض کر دیا ہے۔ ان اعتراضات کا دوسرا حصہ قانون کو جاری کرنے کے بارے میں تھا، کہ یہ ولی فقیہ والا نظام، جمہوریت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ جمہوریت ایک ایسی حکومت ہے جس کو تمام ہی عقلاء عالم نے قبول کیا ہے، یہاں تک وہ ممالک کہ جن میں سوسیالسٹی (Socialisty) حکومت تھی عملی میدان میں جمہوریت کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکیں، اور مجبوراً ڈیموکراسک نظام کو قبول کر لیا۔ لہٰذا آج کا انسان ڈیموکراسک نظام کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رکھتا، اور یہ اسلامی حکومت جو ولایت فقیہ کی حکومت کے نام سے معروف ہے، ڈیموکراسک سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

3۔ جمہوریت کے معنی اور اس کے استعمال میں ایک بحران

پہلے ضروری سمجھتے ہیں کہ لفظ "جمہوریت" (ڈیموکراٹک) "Democratique" کے بارے میں کچھ وضاحت کریں، کیونکہ ہو سکتا ہے بعض لوگ اس لفظ کے بارے میں کافی معلومات نہ رکھتے ہوں، جمہوریت کے لفظی معنی: لوگوں کی حکومت، مراد یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد بھی قانون گذاری اور اجرائے قانون میں اہم کردار رکھتے ہیں اور کوئی دوسرا قانون گذاری اور اجرائے قانون میں حق دخالت نہیں رکھتا، یہ ہیں لفظ ڈیموکراسک کے معنی۔

تاریخ کے اوراق پر جمہوریت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے؛ جیسا کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی ولادت سے پانچ صدی پہلے یونان کے پائے تخت "آتن" میں یہ نظریہ وجود میں آیا اور کچھ مدت کے لئے یہ نظریہ اجراء کیا گیا اس طرح کہ تمام لوگ سوائے غلاموں اور 20 سال سے کم عمر والوں کے سبھی لوگ سیاسی اور اجتماعی مسائل میں براہ راست دخالت کرتے تھے۔ جس وقت کوئی ۲۰ سال کا ہوجاتا تھا تو اپنے شہر کے سیاسی کاموں میں دخالت کر سکتا تھا۔ البتہ کسی پر ضروری نہیں تھا بلکہ یہ لوگ آزاد تھے۔ اس زمانہ میں لوگ کسی بڑے میدان میں جمع ہوتے تھے اور اپنے شہر کے بارے میں نظریات پیش کرتے تھے، بحث و گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے نتیجہ میں تصمیم گیری ہوتی تھی اور انہیں پر عمل ہوتا تھا، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی خاص شخص یا خاص گروہ حکومت کے لئے معین ہوتا تھا، بلکہ خود افراد براہ راست اجتماعی و سیاسی مسائل میں دخالت کرتے تھے۔

اس طرز فکر کو جمہوریت یا لوگوں کی حکومت کا نام دیا جاتا تھا، حکومت کا یہ انداز ایک مدت تک یونان کے پائے تخت آتن میں چلتا رہا، لیکن بڑے بڑے دانشمند اور فلاسفہ حضرات نے اس نظریہ کی بھرپور مخالفتکی، اور اس کو برے نام سے یاد کیا کرتے، یعنی اس کو جہال (جمع جاہل) کی حکومت کہتے تھے، ادھر عملی طور پر بھی اس جمہوری حکومت کے برے نتائج سامنے آئے، اسی وجہ سے حکومت کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

طبیعی ہے کہ بڑے بڑے ممالک اور کثیر آبادی والے شہروں میں یہ طریقہ کار مشکل تھا کیونکہ ممکن نہ تھا کہ ہمیشہ اجتماعی مسائل میں تمام لوگ براہ راست دخالت رکھیں۔ چھوٹے شہروں میں یہ انداز کچھ مدت کے لئے ممکن ہے، لیکن لاکھوں والے شہروں میں کس طرح ممکن ہے کہ روزمرہ کے کاموں میں سب مل کر کوئی فیصلہ لیں؟!

بہر حال یہ انداز ختم ہوگیا، یہاں تک کہ "رنسانس" کے زمانہ میں ڈیموکراٹک کی ایک دوسری تصویر پیش کی گئی، وہ اس طرح کہ لوگوں کے کچھ نمائندے حکومت کے کاموں کے لئے منتخب ہوں، اور وہ سبھی لوگوں کی نمائندگی میں حکومت کریں؛ کیونکہ لوگوں کی براہ راست دخالت ممکن نہ تھی۔ اس کے بعد سے اس نظریہ کے بہت زیادہ حامی پائے جانے لگے اور آہستہ آہستہ بعض ممالک میں اس طرح کی حکومت رائج ہوگئی، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں تقریباً یورپ اور دوسرے ممالک میں اس طرح کی حکومت لوگوں میں مقبول ہوگئی اور اسی طرز پر حکومتیں بننے لگیں۔

ہمارے ملک میں بھی ڈیموکراٹک کا یہی طریقہ ہے، تمام لوگ حکومتی شعبوں کے مختلف ووٹنگ میں شرکت کرتے ہیں۔ مثلاً صدر مملکت اور اسلامی پارلیمنٹ کے نمائندگان کو ووٹوں کے ذریعہ انتخاب کرتے ہیں کہ جو لوگوں کی نمائندگی میں قوانین بناتے اور ان کو جاری کرتے ہیں۔

اسی طرح شوریٰ اور دوسرے انتخابات جن کا ذکر قانون اساسی میں آیا ہے شرکت کرتے ہیں۔ پس ڈیموکراسک کی دوسری تصویر جس میں سیاسی و اجتماعی مسائل میں لوگ خود اپنی رائے اور اپنے ووٹوں کے ذریعہ نمائندوں کو منتخب کرتے ہیں۔

4۔ دور حاضر میں جمہوریت کا مفہوم

آج کے زمانے میں ڈیموکراسک کچھ اور ہی خاص معنی پیدا کرتی جارہی ہے اس حکومت کو ڈیموکراسی حکومت کہتے ہیں جس میں دین کا کوئی نقش نہ ہو لہٰذا جس وقت یہ کہا جاتا ہے: "فلاں حکومت جمہوری ہے اور فلاں ملک ڈیموکراسک طریقہ پر حکومت کرتا ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاشرہ میں دین کا کوئی کردار نہیں ہے، یعنی قانون کے بنانے والے اور قانون کو جاری کرنے والے کسی بھی موقع پر دین کی دخالت کو نہیں مانتے۔

البتہ ڈیموکراٹک کا یہ انداز دین کی نفی نہیں کرتا، لیکن سیاسی واجتماعی مسائل میں دین کی دخالت کو قبول نہیں کرتے، اور اس چیز کی اجازت نہیں ہے کہ قانون کے جاری کرنے والے قوانین کو جاری کرتے وقت دین کی کوئی بات کریں، اور کوئی بھی طریقہ کار دینی احکام کی بنا پر نہ ہو۔ درحقیقت ڈیموکریسی کا یہ طریقہ "لائک" اور "سیکولر" نظام کی بنیاد پر ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ سیاسی واجتماعی مسائل سے دین کو بالکل جدا اور الگ ہونا چاہئے۔ البتہ ہوسکتا ہے کہ خود قانون گذار یا قوانین کے جاری کرنے والے افراد متدین اور دیندار ہوسکتے ہیں کہ ہر ہفتہ کلیسا (گرجا گھر) میں جائیں اور وہاں نذرونیاز کریں۔ ممکن ہے یہ لوگ دینی انجمنوں کے ممبر بھی ہوں اور حکومتی کاموں کے علاوہ ایک معمولی انسان کے طرح دینی کاموں میں بھی مشغول رھیں۔ لیکن حکومت کے کاموں میں چاہے قانون گذاری شعبہ ہو یا شعبہ اجراء قوانین دین کی کوئی بات نہ کریں۔

اگر آپ سنیں کہ مثلاً "فرانس" میں (جو آزادی اور جمہوریت کا گھوارہ مانا جاتا ہے) ایک باحجاب لڑکی کو کالج اور یونیورسٹی میں جانے سے روکا جاتا ہے، تو اس کی وجہ یہی ڈیموکراٹک ہے جس میں دینی کاموں سے روکنا اس کا ایک وظیفہ ہے، اور کہتے ہیں کہ ہماری حکومت ایک لائک حکومت ہے، لہٰذا دین کی کوئی علامت ہمارے کسی بھی سرکاری شعبوں میں نہیں ہونا چاہئے، روسری اور نقاب کا لگانا دینی طرفداری کی ایک نشانی ہے، اور سرکاری شعبوں مثلاً مدرسہ میں اس کا پہننا ممنوع ہے؛ ہاں اگر کوئی مدرسہ کلیسا سے مربوط ہوتا یا کوئی پبلک اسکول ہوتا تو اگر تمام لڑکیاں روسری پہنتی تو کوئی پریشانی والی بات نہ تھی، لیکن سرکاری کالج یا یونیورسٹی میں جہاں سرکاری سند دی جاتی ہے وہاں یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح دوسرے وزارتخانوں میں دین کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تھی جمہوریت کی ایک نئی تفسیر جس کی بنا پر دینی اثرات جمہوریت کے خلاف ہیں۔

ڈیموکراٹک کی اصلی اور نئی تصویر کے مطابق جس میں ڈیموکراسی کے معنی لوگوں کی حکومت ہے، اگر کچھ لوگ دیندار ہوں اور چاہیں کہ ادارہ جات میں دینی آداب ورسوم پر عمل کریں، تو پھر مخالفت نہیں ہونا چاہئے؛ کیونکہ یہ کام لوگوں کی مرضی کے مطابق اور ان کے بنائے قوانین کے اعتبار سے ہے، ڈیموکراسک کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ ہر جگہ حتی مدارس اور وزارتخانوں اور دوسرے ادارجات میں لباس پہننے میں آزاد ہو، اور اگر لوگوں کی اکثریت دیندار ہے اور اسی دین کی وجہ سے کوئی خاص قسم کا لباس پھننا چاہیں یا دینی پروگرام کرنا چاہیں، تو پھر کسی کو حق نہیں ہے کہ ان کو روکے۔ جس وقت لوگوں کی مرضی سے یہ قانون بنایا گیا کہ وزارتخانوں، یونیورسٹیوں اور دوسرے اداروں میں نماز جماعت کا ہونا ضروری ہے یہ ڈیموکراسک (جس معنی میں

ہم مانتے ہیں) کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ خود لوگوں نے اس قانون کو بنایا ہے اور خود ہی جاری کرتے ہیں، لیکن ڈیموکراسک کی دو حاضر کی تصویر کے مطابق اجتماعی وسیاسی مسائل میں دینی رجحان نہیں ہونا چاہئے۔

5۔ جمہوریت کی نئی تصویر سے استعمار کا بے جا فائدہ اٹھانا

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ڈیموکراٹک کی نئی تصویر جسے استعماری حکومتیں پیش کرتی ہیں اور اپنے مقاصد کے تحت اس کو جاری کرتی ہے، لائک اور سیکولر حکومتوں کے برابر ہے جو ذرہ برابر بھی یہ نہیں چاہتیں کہ سیاسی واجتماعی امور میں دین کی دخالت ہو۔ یہاں تک کہ اگر خود لوگ یہ کہیں کہ ہم اس دین کو قبول کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سرکاری دفاتر میں دینی رسم ورواج پر عمل کریں، پھر بھی لوگوں کی مرضی کو ڈیموکراسک کے مخالف سمجھا جائے گا۔

اسی وجہ سے جب "الجزائر" میں انتخابات ہوئے اور وہاں ایک اسلامی پارٹی کامیاب ہوئی اور ڈیموکراٹک اصولوں اور اس ملک کے قوانین کے مطابق حکومت بنانا چاہی اور اسلامی قوانین کو جاری کرنا چاہا، مخالفوں نے احساس کیا کہ یہ پارٹی تو مضبوط ہوتی جارہی ہے اور مستقبل میں اسلامی حکومت بنانا چاہتی ہے تو بغاوت کردی اور انتخاب کو رد کر کے اس پارٹی کے لیڈروں کو پکڑ پکڑ کر جیل میں ڈال دیا، اور اس پارٹی کو ختم کر کے اس کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اور چند سال گذرنے کے بعد بھی اس پارٹی کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں ہے، جب کہ اس اسلامی ملک نے لاکھوں قربانی دے کر اس آزادی اور استقلال کو حاصل کیا تھا، اور قربان ہونے والے وہی مسلمان تھے کہ جنھوں نے اسلام کی خاطر اس وقت کی استعماری حکومت سے جنگ لڑی تھی یہاں تک کہ الجزائر کے لوگوں کو آزادی نصیب ہوئی، آج وہاں کی حالت بہت زیادہ خراب ہے جیسا کہ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ ہر روز دسیوں لوگ کو خطرناک طریقے سے قتل کیا جاتا ہے۔

وہاں رونما ہونے والے ان تمام حادثوں کے پیش نظر وہاں کی وہ حکومت جو بغاوت کر کے بنائی گئی ہے اس قتل وغارت گری کے ذریعہ اپنی حکومت کو مضبوط کرتی جارہی ہے، اور استعماری حکومتوں کے نزدیک وہاں کی یہ حکومت مقبول تر ہے، اس حکومت کے مقابلہ میں جو ووٹنگ اور لوگوں کی رائے سے بنی تھی جو دین اور اس کے احکامات کو جاری کرنا چاہتی تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں دنیا میں ایک نئی اسلامی حکومت نہ بن جائے" اس طرح کی حکومت کو جمہوری نام رکھا، لیکن اگر خود لوگ اپنی رائے اور اپنی مرضی سے اسلام اور اسلامی حکومت کو چاہیں اس کو غیر ڈیموکراٹک کہتے ہیں کیونکہ لوگ اسلام کی طرف رجحان رکھتے ہیں" لہٰذا جمہوریت کی نئی تفسیر کی بنا پر دین کو اجتماعی وسیاسی مسائل میں بالکل دخالت نہیں کرنا چاہئے، یہاں تک کہ کوئی لڑکی چادر یا مقنعہ پہن کر کالج نہیں جاسکتی؛ جیسا کہ ترکی میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

استعماری پٹھو، اسلامی ممالک میں بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں بھی اسی طرح کی جمہوریت ہونا چاہئے حکومتی مسائل میں دین کے لئے کوئی جگہ نہ ہو چاہے قانون گذاری والا شعبہ ہو یا قانون کے جاری کرنے والا شعبہ، وہ ممالک جو اسلامی حکومت بنانے کے لئے بہت زیادہ راغب ہیں ان میں ثقافتی حملہ اور یونیورسٹیوں میں نفوذ کے ذریعہ اسلامی

رجحان کو ضعیف و کمزور کرنا چاہتے ہیں، اور جمہوریت کی اس تصویر کو رائج کرنا چاہتے ہیں، اپنے خیال ناقص میں یہ گمان کرتے ہیں کہ چند سال بعد جب یہ نسل بدل جائے گی تو انقلابی نسل ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ وہ نسل آجائے گی کہ جو انقلاب کے اصولوں سے واقف نہیں ہے، وہ نسل ڈیموکراٹک کی اس نئی تصویر و تفسیر کو بروئے کار لائے گی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت کے تین معنی اور تفسیر ہیں:

1۔ لوگوں کا حکومتی مسائل میں براہ راست دخالت دینا جیسا کہ کچھ مدت کے لئے یونان میں رہی اور پھر ختم ہو گئی۔

2۔ اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ حکومت میں دخالت، جیسا کہ آج کل کے بعض ممالک میں رائج ہے اور خود ہمارے ملک میں بھی موجود ہے۔

3۔ حکومت کے تمام کام (قانون گذاری ہو یا اجرائے قانون) دین سے جدا ہوں، یعنی ڈیموکراٹک کا سیکولر اور لائک ہونا شرط ہے۔

6۔ اسلامی نظریہ کے مطابق جمہوریت کی مناسب تصویر

ہم نے اس سوال کے جواب میں کہ اسلام حکومت کے کس انداز کو قبول کرتا ہے؟ ہم نے قانون گذاری کے بحث میں عرض کیا کہ اگر قانون گذاری میں جمہوریت کے یہی معنی ہوں کہ اگر لوگوں کی اکثریت (51 فی صد) جس قانون کی حمایت کریں وہ قانون معتبر اور واجب الاتباع ہے چاہے قرآن کی صریح آیات کے خلاف کیوں نہ ہو، تو اسلام ایسی ڈیموکراٹک کو نہیں مانتا، وہ اسلام جو خود حکومت کے مختلف پہلوؤں پر منجملہ عدالت (کورٹ) معاشی مسائل، وغیرہ وغیرہ تمام مسائل میں قوانین رکھتا ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دے تا کہ اس کے صریح قوانین کے مخالف قوانین رواج پیدا کریں، اور اگر ہم اس طرح کے قوانین کو رسمی مانے تو گویا ہم نے اسلام کو نادیدہ قرار دیا ہے۔

ایسی جمہوریت کا اسلامی قانون گذاری سے مخالف ہونا ایک بدیہی اور ظاہری بات ہے اور کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جمہوریت قانون گذاری یعنی قانون کے معتبر ہونے میں اسلام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اسلام بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوسکتا، اور جب کسی مجموعہ میں اسلام کی مخالفت پائی جاتی ہو تو اس کی بارے میں دلیل بھی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور جب کسی مجموعہ میں اصل اسلام سے ایسی مخالفت موجود ہو تو پھر یہ سوال نہیں ہونا چاہئے کہ اسلام کے ساتھ ہم آہنگ ہے یہ نہیں؟ کیونکہ خود مجموعہ اس کی مخالفت میں بنایا گیا ہے، پس اگر جمہوریت یعنی وہ قوانین جو اسلام سے متفق نہ ہوں ان کو معتبر ماننا تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ اسلام اس جمہوری قانون کو معتبر جانتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو چیز اسلام سے سازگار نہیں ہے وہ سازگار ہو جائے، یہ ایک تناقض اور واضح البطلان نظریہ ہے استدلال کی ضرورت نہیں۔

بہر حال جس چیز کی وضاحت کی ضرورت ہے جس کا ہم نے وعدہ بھی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جمہوریت کا اجرائی سلسلہ

ہے؛ یعنی قانون کو جاری کرنے والوں کے یقین میں لوگوں کا کیا کردار ہے؟ اسی طرح ان لوگوں کے انتخاب میں جو قوانین کو اسلامی نظریات کے تحت بنانا چاہتے ہیں (مثلاً اسلامی پارلیمینٹ کے ممبران) ان کے سلسلہ میں لوگوں کی کیا ذمہ داری ہے؟۔ اور جہاں پر اسلام کے ثابت اور دائمی قوانین نہیں ہیں، اور آج کی ترقی یافتہ دنیا میں انسانی حالات کے پیش نظر نئے قوانین کی ضرورت ہوتی ہے، اسلام نے ان موارد میں حکومت کو اجازت دی ہے کہ اسلامی دائرہ میں ضروری قوانین کو بنائے، مثلاً گاڑی چلانے سے متعلق قوانین وہ داہنی طرف چلیں یا بائیں طرف، یا ان کی رفتار کتنی ہو، ظاہر ہے کہ قرآن واحادیث میں اس سلسلہ میں کوئی واضح حکم تو ہے نہیں، اور ایسے متغیر قوانین زمان ومکان کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، یہ کام اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ اسلام کے کلی نظریات کے مطابق مناسب قوانین بنائے۔

مذکورہ بحث کی رو سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جمہوریت اور لوگوں کی اہمیت کا اندازہ قانون گذار اور قانون کے جاری کرنے والے جو اسلامی بنیادوں کی رعایت کرتے ہوئے مؤقت اور متغیر قوانین بناتے ہیں ان کی تعین میں لگتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ جمہوریت یعنی لوگوں کا جدیت کے ساتھ اسلامی حدود وقیود کی رعایت کرتے ہوئے نمائندگان کے انتخاب کی معین شدہ خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے چننے کے لئے انتخابات میں شرکت کرنا، اور اس پر شروع انقلاب اور امام خمینیؒ کے زمانہ سے عمل ہوتا آیا ہے۔ مثلاً اسلامی پارلیمنٹ کا انتخاب، صدر مملکت کا انتخاب، خبرگان رہبری کا انتخاب اور شوریٰ کا انتخاب۔ لہٰذا لوگوں کے منتخب شدہ افراد میں خاص شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

یعنی مسلمان اور اسلامی احکامات کا دلسوز ہو اور قانون بناتے وقت اسلامی قوانین کی رعایت ضروری ہے۔ اقلیت کے نمائندوں کے علاوہ تمام نمائندوں میں ان صفات کے علاوہ مسلمان اور احکامات اسلامی کا دلسوز ہونا ضروری ہے، اور اس کے ساتھ شورای نگہبان ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ پارلیمینٹ کے نمائندوں نے غفلت یا غلطی سے ایسے قوانین بنا ڈالے ہوں جو اسلام کے مخالف ہوں، شورای نگہبان کا وظیفہ یہ ہے کہ پارلیمینٹ کے بنائے ہوئے قوانین کو دیکھے کہ آیا اسلام سے مطابقت کرتے ہیں یا نہیں، اور اگر اسلام کے مطابق ہیں تو ان کی تائید کرتی ہے اور اگر اسلامی نظریات کے موافق نہیں ہیں تو پارلیمینٹ کو واپس بھیج دیتے ہیں تاکہ ان پر تجدید نظر کرے، ہمارے ملک میں اس طرح کے قوانین سسٹامیٹک ہیں جن کو سب قبول کرتے ہیں اور کوئی بھی ان کی مخالفت نہیں کرتا۔

اسی طرح قانون کو جاری کرنے والے جن میں سب سے اوپر صدر مملکت ہوتا ہے یہاں بھی اسلامی قوانین کی رعایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے صدر مملکت میں ایسے صفات ہوں جو قانون اساسی میں ذکر ہوئے ہیں جو کہ اسلام سے ماخوذ ہیں ذکر ہوا ہے، اور اپنی حکومت کو چلانے میں خدا کی طرف سے اذن رکھتا ہو، اس طرح کہ لوگوں کی اکثریت کی حمایت کے بعد ولی فقیہ کے ذریعہ منصوب ہو، لہٰذا اس صورت میں اس کی حکومت مشروع اور جائز ہوگی، یہ وہ چیزیں ہیں کہ جو ہمارے ملک میں انجام پاتی ہیں۔

لوگوں کے نقش اور اسلامی نظام میں ان کے دخالت کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش کرتے ہیں؛ فرض کریں کہ ہم لوگ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے زمانہ میں ہوتے اور اپنے شہر میں کسی شائستہ، مناسب اور صالح شخص کو ولایت کے لئے مناسب سمجھتے اور امام علیہ السلام کی خدمت میں جاکر عرض کرتے کہ فلاں شخص ہمارے شہر میں والی ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، ممکن تھا امام علیہ السلام ہمارے اس مشورے پر اس شخص کو والی کے عنوان سے منصوب فرماتے۔

اب اگر لوگوں کی اکثریت امام علیہ السلام کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کریں تو بطریق اولیٰ امام علیہ السلام اس مشورہ کو قبول فرماتے، اور اس شخص کو اپنی حکومت کے اس علاقہ کی ولایت کے لئے منصوب فرماتے۔ پس معلوم یہ ہوا کہ لوگوں کے کردار کی اہمیت حکومت اور حکومتی کاموں میں تھیوری کے لحاظ سے ہے اسی طرح کہ افراد تحقیق و بررسی کریں کہ قانون گذاری اور ان کے اجراء کے لئے کون افراد مناسب ہیں ان کو ووٹ دیں اور لوگوں کا ووٹ دینا گویا رہبری کو مشورہ دینا ہے اور در حقیقت ولی فقیہ سے ایک عہد و پیمان ہے کہ اگر اس کو ہمارا حاکم معین کریں تو اس کی اطاعت کریں گے، اسی وجہ سے جب امام خمینیؒ کے زمانے میں لوگوں کی اکثریت کسی کو صدر مملکت کے عنوان سے منتخب کرتی تھی، تو حضرت امام خمینیؒ فرماتے تھے:

میں ان کو جنہیں لوگوں کی تائید بھی حاصل ہے صدر کے عنوان سے منصوب کرتا ہوں، یعنی لوگوں کے ووٹ ایک مشورہ کی طرح ہیں کہ ہم اس کو قبول کریں گے۔

یہ اسلامی حکومت کی تھیوری اور نظریہ ہے جو جمہوریت کے دوسرے معنی کے لحاظ سے کوئی مخالفت نہیں رکھتا، اور ۲۰ سال سے ہمارے ملک میں نافذ ہے اور کوئی بھی مشکل نہیں آئی۔ لیکن اگر جمہوریت کے معنی یہ ہوں کہ معاشرہ میں دین کی دخالت نہ ہو سرکاری اداروں میں کوئی بھی دینی پروگرام نہ ہوں تو کیا ایسی چیز اسلام سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟ بے شک تیسرے معنی کی جمہوریت جو آج کا استعمار اس کی تفسیر کرتا ہے اور دوسروں پر اس کو تحمیل کرنا چاہتا ہے، سوفی صد اسلام ایسی جمہوریت کا مخالف ہے، کیونکہ یہ اسلام کے منافی ہے۔

لیکن جمہوریت دوسرے معنی یعنی اسلام کے ان شرائط کا لحاظ رکھنا جن کو اسلام نے قانون گذار اور قانون کے جاری کرنے والوں کے لئے معین کئے ہیں، گویا لوگ صالح اور باصلاحیت افراد کو قانون گذاری اور اجرائے قانون کے لئے انتخاب کریں اور اپنی شرکت سے اسلامی حکومت سے ہمدردی اور ہمکاری کو ثابت کریں اور خود کو ملک کے مسائل میں شریک جانیں۔ جمہوریت کی یہ تصویر اسلام کی نظر میں مقبول ہے اور ہمارے ملک میں اس پر عمل ہوتا ہے، اور اگر کسی مقام پر اس خلاف ورزی ہوتی ہے دیگر خلاف ورزیوں کی طرح جو گاھے گاھے وجود میں آتی رہتی ہیں تو ہم کو اس کی پیگیری کرنا چاہئے تاکہ دوبارہ اس قسم کی خلاف ورزی کی تکرار نہ ہو۔

بائیسویں نشست

اسلام اور جمہوریت

(دوسرا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے گذشتہ بحث کے دوران اسلام کے سیاسی نظریہ پر ہوئے بعض اعتراضات کے بارے میں گفتگو کی تھی، جن میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر قوانین خداوند عالم کی طرف سے معین ہوں اوران کو جاری کرنے والے بھی خدا کی طرف سے معین ہوں تو یہ جمہوریت سے ہم آہنگ نہیں ہے، ہم نے اس اعتراض کے جواب میں عرض کیا تھا کہ جمہوریت کے کوئی خاص واضح وروشن معنی بیان نہیں ہوئے ہیں۔ "آتن" میں جمہوریت کا آغاز اس طرح ہوا کہ شہر کے تمام لوگ شہری مسائل میں براہ راست دخالت کیا کرتے تھے۔ اور اس طریقہ کے عملی نہ ہونے اور دوسرے دلائل کی وجہ سے دانشمندوں اور فیلسوف حضرات کو اس پر اعتراض ہوا۔ یہاں تک کہ "رنسانس" کے زمانہ سے خود پسند اور ظالم حکومتوں کے مقابلہ میں جمہوریت کی دوسری تصویر پیش کی گئی، اور مغرب زمین کے بڑے بڑے فیلسوف حضرات اس پر تنقید کرنے لگے، یہاں تک کہ اس کی ایک قابل قبول شکل نکالی گئی اور اس کے بعد دوسرے ملکوں مین جانے لگی۔ اس کی موجودہ صورت یہ ہے کہ لوگ فقط پارلیمینٹ کے ممبران کے انتخابات میں شرکت کرتے ہیں، اور قوۃ مجری (صدر یا وزیر اعظم) یا مسئول قوۃ قضائیہ (رئیس قضاۃ) کے انتخاب میں لوگوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ اس نظریہ میں حکومت کی کوئی خاص شکل وصورت معین نہیں ہوتی اسی وجہ سے مختلف حکومتیں بادشاہی، پارلیمینٹی، یا ریاست جمہوری حکومتیں اپنے کو جمہوری حکومت تصور کرتی ہیں، کیونکہ اس حکومت میں کسی نہ کسی طریقہ سے لوگوں کا کردار ہوتا ہے۔

2۔ سیکولر جمہوری اور اس کے فلسفہ کی وضاحت

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، مغربی ممالک کے سیاست داں حضرات نے جمہوریت کی ایک نئی شکل پیش کی ہے کہ جس جمہوریت میں "لائیزم" کے معنی پائے جاتے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو لوگ بھی حکومت میں دخالت رکھتے ہوں اور دوسری طرف یہ کہ کسی بھی سرکاری دفتر میں دین کی کوئی نشانی نہ پائی جائے۔

دین نہ تو قانون گذاری میں کوئی دخالت ہو اور نہ ہی قانون کے جاری کرنے والے دین کے نام پر حکومت کریں،

یہاں تک کہ جو شعبہ جات حکومت سے وابستہ ہیں ان میں بھی دین کی کوئی نشانی نہ ہو، دینی اعتقاد یا اس کی طرف داری کا کوئی وجود نہ ہو۔ اسی وجہ سے بعض حکومتوں میں لڑکیوں کو کالج میں باپردہ جانے سے روکا جاتا ہے، کیونکہ دینی نشانی کے ساتھ کالج میں جانے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اس کی حمایت کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت کے یہ جدید معنی سو فی صد دین کے مخالف ہیں، اور ایسی حکومتوں کو جمہوریت کا نام دینے کے بجائے "بے دینوں کی ڈکٹیٹری" کہنا مناسب ہے، کیونکہ یہ لوگ جمہوریت کے نام پر معاشرہ میں دینی اعتقادات اور مذہبی امور کو انجام دینے کی اجازت نہیں دیتے، اور سرکاری دفاتر میں دینی امور پر عمل کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔

یہ طریقہ کار کہ جس کی کوئی فلسفی بنیاد نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی فلسفی نظریہ ہے، لیکن دشمنان دین کا مقصد یہ ہے کہ مغربی اور یورپین ممالک میں دین، خصوصاً اسلام کو پھیلنے سے روکا جائے، اور اپنی تمام تر کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ممالک یہاں تک کہ اسلامی ممالک میں جمہوریت کے نام پر اسی جمہوری انداز کو اپنائیں کہ جس کا نمونہ الجزائر اور ترکی میں دیکھنے میں آتا ہے۔

ڈکٹیٹری کی سخت شکل سے نکالنے کے لئے اور اس کی جگہ جمہوریت کی نرم و ملائم شکل پیش کرنے کے لئے ایک فلسفہ تراشی شروع کی، تاکہ دینداروں کے اعتراضات کا مقابلہ نہ کرنا پڑے، اور ان کے غصہ کو کم کرسکیں، اسی وجہ سے حکومتی دفاتر میں دینی نشانیاں نہ ہونے کی توجیہ اور وضاحت کرتے ہیں اور فلسفہ کا راہ حل پیش کرتے ہیں کہ (جیسا کہ حقوق بشر کے نشریہ میں بھی موجود ہے) تمام انسان انسانیت میں برابر ہیں اور ان میں کوئی درجہ بندی نہیں ہے اور ہمارے پاس درجہ اول یا درجہ دوم کے انسان نہیں ہیں، اسی بنا پر اگر کسی دین کے لئے کسی امتیاز کے قائل ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس دین کو دوسرے دیگر ادیان پر ترجیح دی اور اس کا سب سے بڑا درجہ مانا۔ پس کسی دین کا احترام کرنا یا سرکاری دفاتر میں اس کے دینی رسم و رواج کی اجازت دینا، گویا اس دین کو ایک خاص امتیاز دینا ہے جبکہ ہم تمام انسان برابر ہیں اور کسی ایک کے دوسرے پر امتیاز کے قائل نہیں ہیں!

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکومتیں کس طرح اجازت دیتی ہیں کہ جس طرح چاہیں عمل کریں جس طرح کا کپڑا پہننا چاہیں پہنیں، لیکن دیندار لڑکیوں کے باحجاب ہونے پر پابندی ہے، درحقیقت یہ بعض شہریوں کی آزادی کی نفی اور ان کے حقوق کی پامالی ہے۔

3۔ سیکولر نظام کی فلسفی بنیاد میں مغالطہ

بہر حال، وہ اپنی کارگردگی کے لئے مذکورہ توجیہ وضاحت پیش کرتے ہیں، لیکن اس میں ایک بہت بڑا مغالطہ اور غلطی یہ پائی جاتی ہے کہ تمام انسانوں کا انسانیت میں برابر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام شہری، شہری ہونے میں برابر

ہوں۔ کیونکہ تمام انسانوں کا انسانیت میں برابر ہونے کی بحث کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسلام نے تاکید کی ہے، جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ...[1]

"لوگوں ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم ہی نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرلے، اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو"

قرآن کریم واضح طور پر انسانوں کے درمیان فرق اور امتیاز کی نفی کرتا ہے اور ان کو ایک آدم کی اولاد کہتا ہے کہ جو آپس میں بھن بھائی ہیں، اور ان میں کوئی فاصلہ و امتیاز نہیں ہے۔ یہ مطلب کسی بھی آسمانی کتاب میں اس کیفیت کے ساتھ بیان نہیں ہوا ہے۔ اور ہم بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے معتقد ہیں کہ تمام انسان برابر ہیں اور انسانیت درجہ اول اور دوم نہیں رکھتی، مشہور و معروف شاعر سعدی کا یہ شعر بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہیں

بنی آدم اعضای یکدیگراند
کہ در آفرینش زیك گوھرند

لہٰذا جوہر انسانیت تمام انسانوں میں برابر ہے اور انسانوں میں درجہ اول اور دوم نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام انسان تمام چیزوں میں برابر ہیں یہاں تک کہ ایک ملک کے تمام شہری تمام سہولتوں میں برابر ہوں۔ اور تمام دنیا میں اس کو ایک اصل کے عنوان سے بین الاقوامی حقوق میں قبول کیا گیا ہے کہ کسی ملک کی تابعیت (نیشنلٹی) خاص شرائط اور خاص سہولتیں رکھتی ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص اپنے ملک سے مہاجرت کرے اور چند سال کسی دوسرے ملک میں زندگی بسر کرے، اس ملک کو فیض پہنچائے اور وہاں کے لوگوں کیلئے کافی خدمات انجام دے؛ لیکن پھر بھی اس کو وہاں کی نیشنلٹی اس کو نہیں ملے گی۔

چونکہ مہاجر افراد کو نیشنلٹی ملنے کے لئے خاص شرائط و قوانین درکار ہوتے ہیں۔ اور جس وقت اس کو نیشنلٹی دیں بھی تو ممکن ہے اس کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دیں، اور اس کو اول درجہ کی شہریت والی سہولتیں اس کو نہ دیں۔ یہ مسئلہ تمام دنیا میں پایا جاتا ہے درحالیکہ تمام انسانوں کو انسانیت میں برابر مانا جاتا ہے، لیکن شہریوں کے حقوق اور سہولتیں نیشنلٹی کے لحاظ سے برابر نہیں ہیں، اور نیشنلٹی کا اول درجہ اور دوسرا درجہ ہے، لہٰذا یہ کہنا محض ایک مغالطہ ہے کہ تمام انسان چونکہ انسانیت میں شریک ہیں لہٰذا انسانیت کا درجہ اول و دوم نہیں، لیکن شہریت میں دو درجہ ہو سکتے ہیں اور اس کو اسلام نے بھی قبول کیا ہے۔

---

[1] سورۂ حجرات آیت ۱۳

ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے اور توجہ رکھنا چاہئے کہ مغربی ڈکٹیٹری حکومتیں اپنے کو جمہوری حکومتیں کھلاتی ہیں، تا کہ اپنے نامشروع مقاصد میں کامیاب ہوجائیں، ہمیں ان کی فریب کار شکل سے دعوکا نہیں کھانا چاہئے، حقیقت میں جمہوریت کی جدید شکل ایک ڈکٹیٹری ہے جس کی وجہ سے مسلمان عورتیں حجاب اور دوسرے مذہبی مراسم سے محروم ہیں۔ جبکہ "حقوق بشر نشریہ" میں موجود ہے کہ دین آزاد ہے اور سبھی لوگ دینی وظائف پر عمل کرنے میں آزاد ہیں، اس میں یہ کوئی قید و شرط نہیں ہے کہ سرکاری دفاتر میں کوئی مذہبی کام ہو یا نہ ہو، لیکن اپنی مرضی کے مطابق اس کی تفسیر و معنی کرتے رہیں اور جنگ کو صلح کے نام سے اور دوسروں پر ظلم کو حقوق بشر کی حمایت کے نام سے جائز جانتے ہیں، اور ہم آپ ہر روز ان کے ظلم و جور اور دھوکہ دھڑی کو دیکھتے رہتے ہیں۔

۴۔ مدیریت کے میدان میں جمہوریت کا دوسرا رخ

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ جمہوریت کے تین معنی ذکر کئے گئے ہیں کہ ان سب کا تعلق فلسفہ سیاست سے ہے، لیکن بعض مؤلفین جو خود کو دینی روشن فکر کھلاتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ جمہوریت کا فلسفہ سیاست سے کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ جمہوریت مدیریت سے مربوط ہے، اور اس کو حکومت یا حکومتی ادارہ سے کوئی ربط نہیں ہے، اور اس بحث کی جگہ سیاسی فلسفہ میں نہیں ھے۔ ہم ان لوگوں کے جواب میں مختصر طور پر اتنا عرض کرتے ہیں: کہ فلسفی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سیاسی فلسفہ کے بارے میں ایسی کوئی کتاب نہیں ہے کہ جس میں جمہوریت سے بحث نہ کی گئی ہو، اب اگر جمہوریت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر سیاسی فلسفوں کی کتابوں میں اتنی زیادہ بحث کے کیا معنی؟ ان کے دعوی کا راز یہ ہے کہ جمہوریت کی جو نئی تصویر مغربی ممالک کے لیبرل دانشمندوں اور مؤلفوں نے پیش کی ہے تا کہ اس کو سیاسی مفہوم سے خارج کردیا جاسکے، اور اس کو دوسرے اجتماعی میدانوں میں داخل کردیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جمہوریت صرف کسی حاکم کی قدرت کو محدود کرنے یا چند مخالف گروہوں کے درمیان سازش (خلاف قانون تال میل) کرانے یا صرف حکومتی اداروں سے مربوط نہیں ہے بلکہ کسی بھی مدیریتی شعبہ میں ہوسکتی ہے: فرض کیجئے اگر کسی کارخانہ کے مختلف شعبوں کے مدیروں کے درمیان اختلاف ہوجائے، تو ان میں اتفاق کرانا ضروری ہے کیونکہ اگر یہ اختلاف بڑھتا چلا جائے تو اس کارخانہ کی دیوالیہ نکل جائے گا، لہٰذا اس کارخانہ کے منافع کو فراہم کرنے کے لئے سبھی کو ایک دوسرے سے مشورہ کریں اور ان میں اتفاق ہو یا یہ کہ اکثر لوگوں کی رائے کو مانا جائے، اس طریقہ کار کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ جمہوریت کسی سازمان کے اندر ہوئے اختلافات کو ختم کرنے کے لئے ہے، اور جمہوریت کے یہ معنی سیاسی فلسفہ سے خارج ہے اور مدیریت کے دائرے میں شامل ہے۔ اگرچہ حکومت بھی چونکہ معاشرہ کی کثیر تعداد کو ادارہ کرنا بھی ایک مدیریتی کام ہے، لیکن بہرحال اس کے خاص حدود ہیں، یہ لوگ جمہوریت کے معنی میں وسعت دینے کے لئے کہتے ہیں کہ اگر دو گروہوں میں اختلاف ہوجائے اور مذکورہ طریقہ سے آپس میں سازش کرلیں تو اسی کا نام جمہوریت ہے۔

اس بارے میں مزید وضاحت اس طرح ہے کہ دو گروہوں کے درمیان اختلاف کی صورت میں ممکن ہے کہ ایک گروہ زیادہ مضبوط ہو اور دوسرے پر مسلط ہو جائے اور اپنے نظریہ کو اس پر زبردستی تحمیل کردے، تو ظاہر ہے کہ یہ طریقہ جمہوری نہیں ہے؛ لیکن اگر آپس میں اتفاق ہو جائے اور آخر کار اکثریت کے نظریہ کو تسلیم کرلیں تو گویا انہوں نے جمہوریت کو تسلیم کرلیا ہے۔

البتہ ہم کسی اصطلاح کو بنانے یا کسی علمی اصطلاح میں وسعت دینے کے مخالف نہیں ہیں، لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ درحقیقت یہ معنی سیاسی میدان سے مربوط ہیں جس کو دوسرے مسائل میں بھی وسعت دی گئی ہے۔ اور اجتماعی علوم میں ایسے بہت سے معنی موجود ہیں جن کو شروع میں کسی خاص میدان میں استعمال کیا جاتا تھا لیکن ان میں وسعت دینے کے بعد ان کو دوسرے میدانوں میں بھی استعمال کیا جانا لگا، مثال کے طور پر آپ "اسٹراٹیجی" (Strategie) (یعنی لشکر کشی) کے لفظ سے آگاہ ہیں جو تمام ہی محافل میں مشہور ہے۔ کہ دراصل اس کے معنی "سوق الجیشی" (لشکر کشی) کے ہیں اور اس کو فوجی سطح پر بولا جاتا ہے اور اسٹراجسٹ اس کو کہا جاتا ہے جو جنگ کا نقشہ اور اس کو کمانڈ کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، مثلاً کسی حملہ کا پلان بناتا ہے، اور اس حملہ کی راہنمائی کرتا ہے، یہ لفظ جنگی فوج کی ہدایت یا اس کے طریقہ حرکت یا جہاں سے حرکت ہوتی تھی یا جہاں پر پڑاؤ ڈالا جاتا تھا یا جہاں سے حملہ شروع ہوتا تھا اس علاقہ کو سوق الجیشی یا اسٹراٹیجک علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد اس لفظ میں وسعت دی گئی اور دوسرے علوم میں بھی اس کو استعمال کیا جانے لگا، مثلاً خود ہماری سیاسی بحث میں بھی "اسٹراٹیجک سیاست" ایک اصطلاح ہے۔ یہاں تک کہ تعلیمی شعبہ کی بعض مدیریتوں میں اسٹراٹیجک مسائل بیان ہوتے ہیں، اور ہمارے قانون اساسی میں بھی ایسے بہت سے اصول ہیں جو اسٹراٹیجک پہلو رکھتے ہیں، اس اصل کے مانند جو یہ کہتی ہے کہ ملک کے قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق ہونا چاہئے۔ لیکن بعض ان لوگوں پر تعجب ہے کہ جو قانون اساسی کا دم بھرتے ہیں اور اسی کو سند بناتے ہیں کہ گویا قانون اساسی قرآن سے بالاتر کوئی چیز ہے لیکن کبھی ایسی مخالفت کرتے ہیں کہ گویا قانون اساسی کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جہاں پر قانون اساسی میں لوگوں کی رائے کے احترام کے بارے میں ملتا ہے تو گویا قرآن مجید کو بھی ان کے برخلاف بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ پیغمبر اور ائمہ معصومین اور امام زمانہ علیہم السلام کو بھی لوگوں کی رائے کی مخالفت کا حق نہیں ہے۔؟!

لیکن جب قانون اساسی یہ کہتا ہے کہ ملک کے قوانین اسلامی قوانین کے مطابق ہونے چاہئیں، تو وہ اس کو بھول جاتے ہیں اور اس کی مخالفت شروع کردیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معیار لوگوں کی رائے ہے!!

کیا اسی قانون اساسی میں نہیں ہے کہ اس ملک کے قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق ہونا چاہئے؟ لہٰذا اگر کوئی چیز اسلامی نظر سے حرام ہو تو پھر آپ قانون اساسی کو سند بنا کر کس طرح اس کو جائز کرسکتے ہیں؟ اس قانون اساسی کے پیش نظر کہ جو قوانین اسلام کی رعایت پر اتنی تاکید کرتا ہے یہ کہہ کر کہ اخبارات آزاد ہیں، کس طرح اسلامی مقدسات اور اسلام کے ضروری احکامات کی توہین کی جائے؟

اخبارات خاص قوانین کے تحت آزاد ہیں نہ یہ کہ قانون سے بڑھ کر آزاد ہو جائیں۔ جب قانون اساسی اسلامی مقدسات کے احترام کو واجب کرتا ہے اور ضروریات دین کا انکار اور اسلامی قوانین کا مسخرہ کرنا، نیز خدا و پیغمبر کا مذاق بنانا جو مرتد ہونے کا سبب ہے تو پھر اخبارات کے قوانین اس کو کس طرح جائز کر سکتے ہیں۔ قانون اساسی اس وجہ سے لکھا گیا تا کہ اسلامی جمہوری کے مفہوم کو واضح و روشن کر سکے۔

5۔ جمہوری اسلامی میں اسلام و ولایت فقیہ کا سب سے اہم مقام

انقلاب کی کامیابی کے پہلے سال یعنی 1358ھ شمسی میں جمہوری اسلامی کا "رفرنڈم" ※※Referendum※※ (ھمہ پرسی) ہونے والا تھا جس میں حکومت کی شکل وصورت کے لئے خاص نشانات پیش کئے گئے تا کہ سبھی لوگ اس کے حساب سے ووٹ ڈالیں۔ ان میں سے بعض جمہوری، جمہوری ڈیموکراٹک، جمہوری ڈیموکراٹک اسلامی، جمہوری اسلامی تھے۔ لیکن امام خمینیؒ نے فرمایا: "جمہوری اسلامی" نہ ایک لفظ کم نہ زیادہ، اور اس میں 98 فی صد لوگوں نے "جمہوری اسلامی" کو ووٹ دیئے، یعنی اسلامی حکومت کی قید و شرط کو نہیں ہٹایا جا سکتا اور اس کی جگہ "ڈیموکراٹک" لفظ کو نہیں رکھا جا سکتا۔ اور اگر ڈیموکراٹک کا لفظ اسلام سے بالاتر کوئی چیز تھی تو کیوں امام خمینیؒ نے اجازت نہ دی کہ اس لفظ کو اسلامی حکومت کے ساتھ اضافہ کیا جائے؟

اور اگر جمہوریت اور ڈیموکریسی میں کوئی فرق نہیں ہے تو جب جمہوریت ہے تو ڈیموکریسی بھی ہے، لہٰذا ڈیموکریسی لفظ کے لانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پس جب بعض لوگ "جمہوری ڈیموکراٹک" پر تاکید و اصرار کر رہے تھے، تو امام خمینیؒ نے ان کی مخالفت کی؛ معلوم یہ ہوا کہ ڈیموکراسی کے مختلف معنی ہو سکتے تھے اور جمہوریت میں بعض چیزوں کا اضافہ ہو سکتا تھا کہ جن کی نفی کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام سے بڑھ کر لوگوں کے ووٹوں اور ان کے نظریات پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال ہماری حکومت، جمہوری اسلامی ہے کہ جن کے ستون لوگوں کے شانوں پر ہیں اور انہیں لوگوں نے انقلاب کیا ہے اور اپنے انقلاب کی اسلامی قوانین کے تحت حفاظت کرتے ہیں۔ مرحوم شہید استاد مطہریؒ اس سلسلہ میں ہماری بحث کو وضاحت کرتے ہوئے بیان دیتے ہیں کہ:

"جمہوریت حکومتی شکل کو بیان کرتی ہے اور اسلامیت حکومت کے محتویٰ کو بیان کرنے والا ہے" حکومت کا محتویٰ یہ ہے کہ اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے لیکن حکومت کی شکل وصورت بادشاہت کے مدمقابل ہے۔ لہٰذا ہماری حکومتی بادشاہی نہ ہو گی، بلکہ اس کی شکل جمہوری اور اس کے قوانین اسلامی ہونگے۔ اصل احکام اسلامی ہوں گے اور اسلام سے پہلے یا اسلام کے بعد کوئی چیز نہ ہوگی۔

حضرت امام خمینیؒ مکرر فرمایا کرتے تھے:

جمہوری اسلامی میں ہر حکومت یا کسی بھی حکومتی پوسٹ کی مشروعیت ولی فقیہ کی اجازت پر موقوف ہے، اور یہ وہ چیز

ہے جس پر ولایت فقیہ کی تصویری قائم ہے، اور ہم نے اس مسئلہ کو فقہاء کرام اور سب سے زیادہ امام خمینیؒ سے حاصل کیا ہے، جس پر عقلی و نقلی دلیلیں بھی قائم ہیں۔ کیونکہ ولی فقیہ امام معصوم کا جانشین ہوتا ہے اور تمام چیزوں کو الٰہی ارادے کے تحت ہونا چاہئے اور چونکہ ولی فقیہ امام معصومؑ اور خداوند عالم کی طرف سے اجازت رکھتا ہے، لہٰذا کسی بھی نظام کی مشروعیت ولی فقیہ کی اجازت پر موقوف ہے۔

البتہ یہ طریقہ ان لوگوں کے نظریات سے موافق نہیں ہے جو مغربی تمدن سے متاثر ہیں۔ اور ہماری اس نظریہ کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظریہ توحید کے نظریہ سے لیا گیا ہے اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہے؛ نہ یہ کہ علماء کرام کی صنف سے اخذ شدہ ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے وضاحت کی تھی کہ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت تقاضا کرتی ہے کہ قانون گذاری اور نفاذ قانون دونوں خدا کی اجازت سے ہونے چاہئیں، اور اگر اس کے علاوہ ہے تو یہ ایک قسم کا شرک ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس معاشرہ میں لوگ کوئی کردار نہیں رکھتے، اس حکومت میں لوگوں کا کردار (اسلام کے معین کردہ پہلو سے) سو فی صد ہے اور اس سلسلہ میں کوئی دوسری چیز اس کے بدلہ نہیں رکھی جاسکتی، لیکن مشروعیت اور مقبولیت میں ایک فرق کا قائل ہونا ضروری ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ "رنسانس" کے بعد سے مغربی نظریہ کے لحاظ سے حقوقی و فلسفی اور اجتماعی گفتگو میں خدا یا دین کی کوئی بات نہیں ہونی چاہئے، البتہ مغربی نظریہ سے ہماری مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں کہ جو مغربی ممالک میں زندگی بسر کرتے ہیں، بلکہ ہماری مراد وہ نظریہ ہے، جو مغرب میں موجودہ نظام کے نزدیک قبول شدہ ہے۔ مثلاً جس وقت حقوق بشر کے نشریہ میں انسانوں کے حقوق کی بات آتی ہے تو اس میں تو خدا سے انسانی رابطہ کا بیان ہے ہی نہیں۔ اور اگر کسی مذہب کی بات ہوتی ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ہر انسان مذہب کو اختیار کرنے میں آزاد ہے، وہاں یہ کوئی گفتگو نہیں ہوتی کہ کون سی چیز حق ہے یا کون سی چیز باطل ہے، خدا ہے یا نہیں، ایسی چیزیں بالکل بیان نہیں ہوئی ہیں۔

اور جس وقت اجتماعی حقوق منجملہ حقوق اساسی، حقوق شہری یا کیفری حقوق کی بات ہوتی ہے تو اگر کسی جگہ یہ حقوق خدا سے مربوط ہوتے ہیں تو ان کی کوئی گفتگو نہیں ہے، وہاں بالکل یہ بات بیان نہیں ہے کہ خدا بھی لوگوں پر حق رکھتا ہے یا نہیں؟ یا خدا کی طرف سے انسانوں پر کوئی تکلیف ہے یا نہیں؟ انہوں نے حقوقی گفتگو میں خدا کے حقوق کی بالکل کوئی بات نہیں کی، لیکن اگر ہم چاہیں اپنے اعتقادات کی بنا پر اسلامی تعلیمات اور حقوق الٰہی پر مبنی اپنے ملک کے حقوق کو معین کریں تو ان کو ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم مسلمان اور موحد ہونے کے لحاظ سے معتقد ہیں کہ تمام حقوقی مسائل، اجتماعی، شہری اور سیاسی حقوق میں تمام جگھوں پر خدا کا لحاظ رکھیں اور تمام حقوق سے بالاتر خدا کے حق کو مانیں، اور اس کے حق کے بدلے میں ہم پر کچھ تکالیف عائد ہوتی ہیں جن کو ہمیں انجام دینا چاہئے۔

دوسری طرف یہ کہ صرف انسانوں کے حقوق کی ہی بات نہیں ہونا چاہئے بلکہ حق و تکلیف ساتھ ساتھ بیان ہونے چاہئیں اور سب سے اہم خدا کے معین کردہ تکلیف ہے۔ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کا حق یہ ہے کہ تمام انسان سیاسی

واجتماعی مسائل میں خدا کے احکام کو قبول کریں۔ اور ہم چونکہ مسلمان ہونے کے ناطے یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے اعتقادات کی بنا پر اپنے ملک میں قوانین بنائیں اور ان پر عمل کریں۔ اور ہمارے قانون اساسی میں یہ کام ہوا ہے اسی وجہ سے ہمارے نزدیک یہ اہم اور اول درجہ رکھتا ہے اور قانون اساسی کا احترام، اسلام کے احترام کے مانند ہے۔

6۔ اسلام کی مورد قبول جمہوریت

جمہوریت کے ایک معنی اسلام کے موافق ہے اور ایک معنی (یعنی تیسرے معنی) اسلام کے سوفی صد مخالف ہے۔ جمہوریت کے دوسرے معنی خاص شرائط کے ساتھ قابل قبول ہے لیکن بغیر کسی قید وشرط کے قبول نہیں ہے۔ اور چونکہ اسلامی قوانین کی رعایت ضروری ہے لہٰذا قانون گذاری میں کسی بھی مرکز کو یہ حق نہیں ہے کہ اسلام کے ضروری احکام کی مخالفت کرے اور یہ ایک ایسی اصل ہے جو دینی لحاظ سے مقبول ہے، لہٰذا اس اصل کو قبول کرتے ہوئے ہم جمہوریت کو قبول کرتے ہیں؛ لیکن اگر اس اصل کو نہ مانا جائے اور جمہوریت کا یہ مطلب ہو کہ الٰہی حدود اور احکامات اسلامی کی مخالفت کو بھی جائز کر لیا جائے تو پھر ہم اس جمہوریت کو سوفی صد رد کرتے ہیں۔ اور جمہوریت کے اختلاف کو حل کرنے کے طریقہ کی حد تک لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ جہاں تک اختلافات کو حل کرنے کے لئے اسلامی احکامات کافی ہیں تو یہ مقدم ہیں لیکن اگر کوئی ایسی جگہ ہو کہ اسلام نے اس کے راہ حل کے لئے کوئی معین راستہ پیش نہ کیا ہو اور کوئی باصلاحیت مرجع نہ ہو تو پھر اکثریت کی رائے کو مانا جائے گا، یعنی اگر کسی مقام پر کوئی دلیل شرعی یا تحقیقی نظریہ موجود نہ ہو یا اس اختلاف کو حل کیا جا سکے۔

مثلاً کچھ لوگ قانون کے تحت کسی مہم کام کے لئے کوئی شورائی بنائیں اور تمام لوگ اسلام کا اعتقاد رکھتے ہوں اور اسلامی قوانین کی رعایت کریں لیکن کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے اور اکثر لوگوں کی کچھ نظر ہو اور اقلیت کی کچھ نظر، اور ان دو نظریات کو ترجیح دینے کے لئے بھی کوئی راستہ نہ ہو تو یہاں پر اکثریت کی نظر مقدم ہے اور اکثریت کی نظر کی مخالفت کرنا ترجیح مرجوح ہوگی (جو قبیح ہے)۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر کسی مقام پر کوئی مرجح نہ ہو اور اکثریت کی نظر سے ہمیں ظن (گمان) حاصل ہو جائے تو یہ ظن ہمارے نزدیک معتبر اور مرجح ہے، اور اگر اکثریت کی وجہ سے ظن حاصل نہ ہو تو اس کو ترجیح دینا بغیر کسی مرجح کے ہوگا جو عقلا مذموم اور نادرست ہے۔ یہ طریقہ بس اسی حد تک معتبر ہے، لیکن اس طریقہ سے ناجائز فائدہ اٹھانا صحیح نہیں ہے کہ لوگوں کی اکثریت کو اقلیت کے مقابلہ میں کیا جائے، مثلاً فرض کیجئے ایک فوجی نقشہ بنانے کے لئے دہ افسر معین ہوئے اور دوسری طرف ایک ہزار عام آدمی ہوں کہ جن کو فوجی مسائل سے بالکل بھی کوئی آشنائی نہ ہو، اگر عام لوگوں کی رائے پر توجہ کی جائے اور ان کو مانا جائے اور ان ماہر افسروں کی رائے پر عمل نہ کیا جائے تو یہ کام عقل سے دور ہے۔ لہٰذا جمہوریت اختلافات کو حل کرنے کے لئے خاص شرائط کے ساتھ معتبر ہے؛ لیکن ہر اکثریت کو ہر اقلیت پر ترجیح دی جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

تیئیسویں نشست

انسانیت میں اصل وحدت کی تحقیق اور شہریوں کی اتباع

1۔ اسلامی نقطہ نظر کسی کا صاحب حق ہونا

فلسفہ سیاست کی بحثوں میں فلسفہ حقوق بہت قریب ہے اور دونوں میں مشترک یا مشابہ مسائل بیان کئے جاتے ہیں مثال کے طور پر سیاست کی بحث میں حقوقی مسائل کی تحقیق کی جاتی ہے اسی بنیاد پر ہم نے فلسفہ حقوق (یعنی انسانوں کا انسانیت کے اعتبار سے اہم ہونا) کی بحث میں اس سے پہلے والے جلسہ میں اشارہ کیا تھا اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ اگر چہ تمام انسان انسانیت میں مشترک ہیں اور اسلام کی نظر میں انسانوں کے مابین پہلے طبقہ اور دوسرے طبقہ کے انسان نہیں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اجتماعی مسائل میں تمام انسان حقوق اور تکالیف کے اعتبار سے مساوی ہیں، اس بارے میں جو افراد مکمل طور پر ان مسائل سے آگاہ نہیں ہیں یا ان کے ذریعہ سوئے استفادہ کرتے ہیں تا کہ اسلام اور انقلاب کے مخالف نظریات رکھتے ہوئے بھی اپنے کو مسلمان اور انقلابیوں کی فہرست میں کھڑا کر سکیں اور اس کی وجہ سے انقلاب سے فائدہ اٹھا سکیں، اور صرف یہی نہیں بلکہ انقلاب کے خلاف مطالب تلاش کر سکیں انہوں نے اس بارے میں مغالطہ کیا ہے کیونکہ معاشرہ میں پہلے طبقہ اور دوسرے طبقہ کے انسان نہیں ہیں لہذا تمام افراد کے حقوق برابر ہونا چاہئے جیسے گروہ بنانے کے لئے اقدام کرنا اور ملک ملت میں کسی بلند عہدے کا پانا۔ ان کے نظریہ کے مطابق ہر شخص چاہے وہ کسی بھی عقیدہ کا تابع ہی کیوں نہ ہو وہ صدر مملکت یا وزیر اعظم ہو سکتا ہے اور کوئی بھی پارٹی بنا سکتا ہے۔

چونکہ ان کا استدلال یہ ہے کہ جب انسانوں کے مابین پہلا طبقہ اور دوسرا طبقہ نہیں ہے اور تمام انسان برابر ہیں اور ہم جو انقلاب اسلامی اور قانون اساسی کو تسلیم نہیں کرتے ہیں تو ہم کو یہ حق ہے کہ تمام حقوق میں برابر حصہ ملے اس مغالطہ کے بارے میں یہ عرض کر دیا گیا ہے کہ صحیح ہے کہ انسانوں میں پہلا طبقہ اور دوسرا طبقہ نہیں ہے، یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن تمام حقوق و وظائف اصل انسانیت میں سب کے درمیان مشترک نہیں ہیں بلکہ بعض حقوق و وظائف میں اصل انسان کے علاوہ دوسری خاصیتیں ہوتی ہیں، بہر حال کچھ افراد نے اس مطلب کو درست نہیں سمجھا یا اپنی کسی غرض کی وجہ سے اس مطلب کی غلط تفسیر کی، اور کہا کہ فلاں صاحب کہتے ہیں کہ ہم شہریوں کے مابین پہلا طبقہ اور دوسرا طبقہ موجود ہے اور شہریوں کے پہلے طبقہ سے مراد روحانیت ہے اور بقیہ دوسرے شہری دوسرے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

حقیر اس شبہ کے لئے اس وقت کے نشست کو مخصوص کرتا ہے، قارئین کرام اس موضوع کے واضح ہونے کے لئے جو بحث حقوق عالم کے فلسفیوں کے مابین بیان ہوتی ہے اور اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں اس کی طرف توجہ دیجئے وہ بحث یہ ہے کہ اصولی طور پر ریشہ حق کیا ہے؟ یعنی کس طرح کوئی صاحب حق بنتا ہے، یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص حق رکھتا ہے یا نہیں رکھتا یہ حق کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ ہم کس بنیاد پر کہتے ہیں کہ کوئی شخص فلاں کام کو انجام دینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں رکھتا؟ فلسفہ حقوق کے مختلف، جیسے مکاتب حقوق تاریخی، پوزیتویزم حقوق طبعی اور دوسرے حقوقی مکاتب ہر ایک نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں۔

اسلام کا اس بارے میں خاص نظریہ ہے یعنی اسلام کی نگاہ میں تمام حقوق دراصل خداوند عالم کی طرف بازگشت ہوتی ہے۔ چونکہ ہستی اسی کے کرم سے ہے اور ہر شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے۔ اور تکوینی میں ہمارا وجود اور کچھ ہمارے پاس ہے وہ خدا کے لئے ہے (اِنَّا لِلّٰہِ) اور تمام چیزیں "مِنَ اللّٰہِ" (اللہ کی طرف سے) ہیں اسی طرح تشریعی امور بھی خدا کی طرف سے مستند ہونے چاہئیں۔ حقوق کے پیدا ہونے کے بارے میں یہ ہمارا کلی نظریہ تھا جس کو ہم نے مختصر طور پر بیان کیا ہے کہ خداوندہ عالم تمام انسانوں کو مساوی حقوق عطا کرتا ہے؟ یا بعض بندوں کو خاص حق عطا کرتا ہے کہ دوسروں کو وہ حق نہیں دیتا؟ مختصر طور پر ہم یہ جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے انبیاء کو جو حقوق عطا کیئے ہیں وہ دوسروں کو عطا نہیں کیئے ہیں اس نے ماں باپ کو کچھ حقوق عطا کیئے ہیں اور اولاد کو دوسرے حقوق دیئے ہیں۔

لیکن کیا (معاذ اللہ) خداوند عالم کا قانون بغیر حساب وکتاب کے ہے یعنی خداوند عالم بغیر کسی معیار وملاک کے کسی کو کوئی حق دیتا ہے اور دوسرے کو وہ حق عطا نہیں کرتا ہے یا اس کی نظر میں کوئی خاص ملاک ومعیار پایا جاتا ہے؟ اور اگر کوئی ملاک ومعیار ہے تو کونسا ملاک ہے؟ تو جن حقوق کو خداوند عالم اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے وہ ان خاص وظائف کی وجہ سے ہے جن کو وہ انجام دیتے ہیں۔ ہم کو خداوند عالم نے اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ ہم اپنے ارادہ واختیار سے کمال حقیقی اور سعادت ابدی کی طرف حرکت کریں، لہٰذا ہم پر ایک کلی فریضہ عائد کیا گیا ہے جسکو اسلامی ثقافت میں خدا کی عبادت سے کہا جاتا ہے اور خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَیۡكُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۶۰﴾ وَّ اَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۱﴾ [1]

"اے آدم کی اولاد کیا میں نے تمہارے پاس یہ حکم نہیں بھیجا تھا کہ (خبردار) شیطان کی پرستش نہ کرنا وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ دیکھو صرف میری عبادت کرنا یہی (نجات کی) سیدھی راہ ہے"

اور دوسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ یٰسین آیات ۶۰، ۶۱

فَأَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ ...[1]

"اور ہم نے انہیں میں سے (ایک صالح کو) رسول بنا کر ان لوگوں میں بھیجا (اور انہوں نے اپنی قوم سے کہا) کہ خدا کی عبادت کرو۔"

نتیجہ کے طور پر تمام انبیاء کی دین کی طرف دعوت پرستش خدا سے شروع ہوتی ہے اور تمام انسانوں کے لئے یہ کلی وظیفہ اقتضاء حقوق رکھتا ہے یعنی جب انسان اللہ سے قریب ہونا چاہتا ہے تو لازم چیزیں اس کے اختیار میں ہونی چاہئے اسی طرح معاشرہ میں کچھ راستے اور قونین ایسے ہونا چاہئیں جو ان کی راہنمائی کرسکیں۔ جب انسان خداوند عالم کی طرف بڑھنا چاہتا ہے تو اس میں حیات ہونا چاہئے تو معلوم ہوا کہ حق حیات پہلا حق ہے۔ دوسرا حق راستہ چلنے کے لئے آزادی ہونا چاہئے اس کے لئے کہ یہ راستہ اجباری نہیں ہے بس انسان کو کسی راستہ کو انتخاب کرنے کے لئے آزاد ہونا چاہئے، تیسرا حق اس مادی دنیا کی نعمتوں کو استعمال کرنا ہے اس لئے اگر انسان اس دنیا کی نعمتوں سے استفادہ نہیں کرے گا تو زندگی نہیں گذار سکے گا اور اپنی حیات کو باقی نہیں رکھ پائے گا، وہ اپنی حیات کو باقی رکھنے اور کمال حقیقی وابدی اور خدائے ہستی تک مکمل سیر کے لئے اس دنیا کی کھانے اور پینے کی چیزوں سے استفادہ کرنے کا حق رکھتا ہے، خداوند عالم نے جن خواہشات کو انسان میں رکھا ہے ان میں سے جنسی شہوت بھی ہے اور انسان کو اس سے استفادہ کرنے کا حق ہے، اس لئے اس کو اپنے لئے ہمسر کی تلاش کرنا ہوگی، چونکہ انسان خود مشاہدہ کر رہا ہے کہ حقوق اور وظیفہ آپس میں مربوط ہیں۔

گذشتہ بحثوں میں ہم نے حق اور وظیفہ کے سلسلہ میں یہ اشارہ کیا تھا کہ ہم پر خداوند عالم کی طرف سے یہ حکم ہے کہ ہم خدا کی طرف چلیں اور اس کی اطاعت کریں، اور اس کے مقابلہ میں ہمارے کچھ حقوق ہیں جن سے ہم استفادہ کرتے ہوئے اس راہ کو ہموار رکھیں۔

اس بنیاد پر معاشرہ میں جو کچھ لوگوں کی عمومی زندگی میں ان کے خدا تک پہنچنے میں رکاوٹ بن رہا ہو تو اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کی روک تھام کرے اور حکومت کو چاہئے کہ وہ اسلامی معاشرہ سے ان چیزوں کو دور کرے جو خدا کی خوشنودی میں حائل ہو رہی ہیں، اسی طرح انسان اپنی شخصی اور فردی زندگی میں بھی انسان مکلف ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کامل بنانے میں آنے والی ہر چیز کو مہیا کرے اور ان کو مظبوط بنائے، اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرے، اس بنا پر حقوق پانے کا معیار اور ملاک افراد کی قابلیت اور ان میں شرائط کا پایا جانا ضروری ہے تاکہ ان کے ذمہ کچھ وظائف اور ذمہ داریاں دی جاسکیں اور انہیں کی وجہ سے ان کو حقوق دیئے جائیں۔

۲۔ تکالیف اور حقوق کے مابین طبیعی اور کسبی اختلاف کا اثر

اب تک بیان کیئے گئے مطالب کی روشنی میں صرف اس وجہ سے کہ تمام انسان ایک ہیں اور اصل انسانیت میں

---

[1] سورۂ مومنون آیت ۳۲

مشترک ہیں تو کیا سب کے حقوق ووظائف میں برابر ہونے چاہئیں؟ یہ درست ہے ہم تمام انسان اصل انسانیت میں شریک ہیں لیکن خود انسانوں کے اندر بہت زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیں جن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(الف)۔ اختلافات طبیعی اور جبری

میں فرق انسانوں کے مابین سب سے زیادہ اختلافات طبیعی اختلافات ہیں۔ جیسے جنسی فرق مفہوم زیست شناسی کے عنوان سے (منطقی مفہوم کے اعتبار سے نہیں) جو مرد اور عورت کے مابین پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کے مابین فیزیولوجی (علم اعضا) اور بائی لوجی (علم حیات) روانی اور عاطفی مسائل میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ انہیں اختلافات کی وجہ سے ان کے مابین وظائف اور حقوق کے لحاظ سے فرق رکھا جاتا ہے یعنی یہ صحیح ہے کہ عورت بھی انسان ہے اور مرد بھی انسان ہے اور دونوں ایک ہی درجہ میں ہیں اور انسانیت میں دو درجہ نہیں ہوتے ہیں لیکن عورت کے جسم میں خاص بناوٹ کے ساتھ ساتھ روحانی بناوٹوں کی وجہ سے اس کے ذمہ خاص وظائف عائد کیے گئے ہیں، عورت جو کردار بچے کی ولادت اور اس کو دودھ پلانے میں ادا کرتی ہے مرد کبھی اس ذمہ داری کو وفا نہیں کرسکتا۔ اور اس بارے میں ان دونوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ چونکہ یہ مسئلہ عورت اور مرد کے طبعی (فطری) اختلاف سے مربوط ہے اور اسی وجہ سے خاص وظائف اس کے ذمہ عائد کئے گئے ہیں۔ اب جب عورت اپنی ذاتی اور طبیعی خصوصیات کی وجہ سے اس چیز کی پابند ہے جیسے بچے کو نو مہینے تک اپنے پیٹ میں رکھے، اور اس کے بعد دو سال تک بچہ کو دودھ پلانے کی ذمہ داری اور پرورش اس کے ذمہ ہے انہیں سب امور کی وجہ سے اس کے لئے خاص حقوق نظر میں رکھے گئے ہیں۔

اگر یہ طے ہو کہ عورت اپنی طبیعی اور ذاتی خاصیتوں کی وجہ سے بچہ دار ہو اس کے بعد میں بچہ کو دودھ پلا کر اس کو بڑا کرے اور اسی حالت میں بالکل مردوں کی طرح کام کرے اور اپنی زندگی کے خرچ فراہم کرے، تو یہ اس کی اصلی ذمہ داری نہ ہوگی بلکہ اس پر ظلم ہوگا بچہ دار ہونے اور بچہ کو غذا دینے جیسی مشکل ذمہ داریوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے خاص حقوق ہونے چاہئیں یعنی مرد کا وظیفہ ہے کہ وہ عورت کا خرچ پورا کرے، اگر یہ طے ہو کہ عورت خود کام کرے تو بہت سے کام ایسے ہونگے جن سے بچہ ساقط ہو جائگا یا بہت سے کام ایسے ہوں گے کہ وہ بچہ کو وقت پر دودھ نہیں پلاسکے گی عاطفی نقطہ نظر سے بھی اگر عورت چین وسکون نہ رکھتی ہو اور اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر میں ہے تو یہ اضطراب وبے چینی بھی بچہ میں اثر انداز ہوتی ہے۔

علمی اعتبار سے یہ ثابت ہوا ہے کہ عورت کو جتنا بھی روحی آرام ہوگا وہ اسی لحاظ سے بچہ کی تربیت کرے گی۔ اسی وجہ سے اسلام میں عورت کے لئے خاص حقوق رکھے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیوی کا خرچ شوہر کے ذمہ ہے، یہاں تک کہ عورت بچہ کو دودھ پلانے کی اجرت اپنے شوہر سے لے سکتی ہے یعنی یہ اجرت ان زحمتوں کی ہوتی ہے جو بچہ کو دودھ پلانے میں اٹھاتی ہے، اسی وجہ سے گھر میں اس کو خاص اہمیت ہونی چاہیئے۔

لہٰذا مرد و عورت کے مابین حقوق اور وظائف کے اعتبار سے یہ تصور کرنا دونوں انسان ہیں، لہٰذا ان کے حقوق اور ذمہ داریاں بھی ایک ہی طرح کی ہوں، یہ غلط ہے۔ ہاں دونوں انسانیت میں شریک ہیں لیکن عورت اور مرد ہونے میں شریک نہیں ہیں مرد اپنی خاص خصوصیات کا حامل ہے اور عورت اپنی خصوصیات کی متحمل ہے یہی خاص خصوصیات وظائف اور حقوق میں اختلاف کا سبب ہیں۔

اس وجہ سے انسانوں کے درمیان کچھ اختلافات طبعی اور جبری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی کوئی شخص بھی اپنے لئے عورت ہونے کو منتخب نہیں کرتا اور اسی طرح کوئی عورت اپنے کو مرد ہونا منتخب نہیں کرتی ہے یہ مسئلہ تو ارادہ الٰہی سے مربوط ہے، خدا فرماتا ہے:

يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ۔ [1]

"اور جسے چاہتا ہے (فقط) بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (محض) بیٹے عطا کرتا ہے" نتیجہ یہ نکلا کہ افراد کا ارادہ اختیار اپنی اور اپنی اولاد کی نسبت معین کرنے میں دخالت نہیں رکھتا لیکن جب کسی کو جنسیت کے لحاظ سے مرد یا عورت بنا دیا گیا تو اس کے ذمہ خاص تکلیفیں قرار دیدی گئیں جن کا انجام دینا اختیاری ہے اور اس کے کچھ حقوق بھی ہوں گے جن کو وہ وفا کر سکتا ہو۔ لہٰذا اس طرح کے اختلافات کو اختلافات طبیعی کہا جاتا ہے۔

(ب) انسانوں کے مابین دوسرا اختلاف اختیاری ہے

جو افراد زندگی بسر کرنے کی خاطر خاص شرطوں کو حاصل کرتے ہیں فرض کر لیجئے جو شخص علم دین حاصل کرتا ہے وہ اپنے اندر اتنی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے، معاشرہ میں کسی عہدہ کو سنبھال سکے لیکن جاہل شخص اس عہدہ کو نہیں سنبھال سکتا۔ یا وہ افراد جو کسی فن میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں وہ لوگ اس لحاظ سے کہ انسان کے حقوق مساوی ہیں ان کا زحمت نہ اٹھانے والے افراد اور جنہوں نے کسی فن میں کوئی مہارت حاصل نہیں کی ان سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی درس پڑھ کر اور زحمت اٹھا کر پائیلیٹ بن جائے تو اس کے مقابل میں اگر کوئی درس نہ پڑھنے والا۔ زحمت نہ اٹھانے والا اور اس فن میں مہارت نہ رکھنے والا یہ ادعا کرے کہ میں بھی پائیلیٹ بننا چاہتا ہوں تو اس کا یہ دعوی قابل قبول نہیں ہوگا بیشک تمام افراد اس کو یہی کہیں گے کہ اگر تم پائیلیٹ بننا چاہتے ہو تو پہلے علم حاصل کرو۔

اسی طرح اگر جاہل اور مسائل سیاسی سے ناواقف شخص یہ کہے کہ میں بھی وزیر اعظم ہونے کا حق رکھتا ہوں تو اس سے یہی کہیں گے کہ: وزیر اعظم بننے کی کچھ شرطیں ہوتی ہیں تم ان شرطوں کو حاصل کر لیتے اور تمہارے اندر ذاتی توانائی ہوتی تو تم بھی کنڈیڈیٹ ہو سکتے تھے اور لوگوں کے ووٹ حاصل کر کے منتخب ہو سکتے تھے۔ لہٰذا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ انسانوں کے مابین پہلا اور دوسرا درجہ نہیں ہے لہٰذا میں بھی وزیر اعظم ہونے کا حق رکھتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر انسان خواہ وہ ملت کی راہ

---

[1] سورہ شوریٰ آیت ۴۹

کے خلاف ہی کیوں نہ چل رہا ہو، اور ملک کے اساسی و بنیادی قانون کو قبول نہ کرتا ہو یہ کہے:

چونکہ میں بھی انسان ہوں لہٰذا وزیر اعظم ہونا چاہتا ہوں؟ لہٰذا صرف اس وجہ سے کہ تم انسان ہو، تم کو ملک کی کوئی پوسٹ دے دی جائے کیونکہ ہر پوسٹ کے لئے کچھ نہ کچھ شرطیں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی ملک میں وزیر اعظم مسلمان ہونا چاہئے، ایک غیر مسلمان شخص (درحالیکہ ہم اس کے احترام کے قائل ہیں اور قانون اساسی بھی اس کے لئے حق کا قائل ہوا ہے) وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔

3۔ افراد کے لئے شہریت کے قوانین میں مختلف درجات کا معین ہونا

پوری دنیا میں خاص منصب کے لئے خاص شرطیں رکھی گئی ہیں منجملہ جن امور میں خاص شرطیں رکھی گئیں ہیں ان میں سے ایک نیشنلٹی کا مسئلہ ہے اور عالمی حقوق میں یہ بات مسلم ہے کہ نیشنلٹی یکساں اور برابر نہیں ہے اور خصوصی حقوق بین الملل سے مختصر سی آشنائی رکھنے والا انسان بھی اس مطلب کو درک کرتا ہے۔ فرض کر لیجئے اگر ایک ایرانی شخص کسی یورپی ملک یا امریکا کے کسی ملک میں رہنا چاہتا ہے پہلے تو اس کے وہاں پر رہنے کے لئے اس میں کچھ شرطوں کا ہونا ضروری ہے اگر اتفاقاً اس کو نیشنلٹی دے بھی دی جائے تو اس کو وزیر اعظم ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ کیوں کہ وہ درجہ دوم کا شہری ہے ممکن ہے وہ ایک طولانی مدت تک اپنے تمام امتحانوں میں کامیاب رہا ہو، اور درجہ دوم کی نیشنلٹی سے درجہ اول کی شہریت میں آجائے۔

بہر حال اگر کوئی شخص جس ملک کی شہریت رکھتا ہو ایسا نہیں ہے کہ وہ تمام حقوق جو اس ملک کے باشندے رکھتے ہیں اس شخص کو بھی وہی حقوق دیدے جائیں۔ چونکہ شہریت میں فرق ہے اور کئی درجہ رکھتی ہے، اگر ہم مان لیں کہ انسانیت کے درجات نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہریت بھی درجے نہیں رکھتی،۔ ہر ملک اپنے باشندوں کے لئے خاص شرطوں کا قائل ہے اسلام میں بھی خاص شرطیں ہیں صرف یہ کہ تمام انسان انسانیت میں شریک ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہریت میں بھی سب برابر ہیں۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک کے افراد اس ملک کے باشندے شمار کئے جاتے ہیں وہ بھی منصب اور مقام کے لحاظ سے ایک نہیں ہیں اور ان کے حقوق بھی جدا جدا ہیں۔ لیکن کونسا معیار و ملاک ان کے حقوق معین کرتا ہے اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں، حقیر کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ تمام اذن الٰہی کی طرف پلٹتے ہیں جو لوگ لیبرال (آزادی خواہ) ممالک یا ڈیموکریٹ (جمہوری) ممالک میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ قوانین کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کو لوگوں کی رائے کا تابع ہونا چاہئے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ: لوگوں کی رائے کے علاوہ خدا کی اجازت بھی ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہماری رائے اور خواہش خدا کے قانون کے خلاف نہیں ہوں۔

بہر حال کوئی بھی ملک تمام افراد کے لئے مساوی شہریت کا قائل نہیں ہے اور چونکہ انسانیت میں درجہ نہیں ہے لہٰذا شہریت بھی درجات نہیں رکھتی اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا، ہمارے اساسی اور بنیادی قوانین میں بھی اس مسئلہ کو بیان کیا گیا

ہے، اور ہمیں تعجب ہوتا ہے ان لوگوں پر جو قانون اساسی کے اس بند پر توجہ نہیں کرتے، قانون اساسی کا بند یہ کہتا ہے:

"جو اشخاص بھی ایرانی نیشنلٹی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا حاصل کریں گے وہ تمام حقوق جو ایرانیوں کے لئے مقرر ہیں وہی حقوق ان کے لئے بھی ہیں سوائے وزیر اعظم، وزرات، یا ہر طرح کی خارجی سیاست کے عہدہ"

یعنی جو شخص بھی ایران کی شہریت میں آجائے اس کو سیاسی عہدہ دار یا سفیر بننے کا حق نہیں وہ کونسلیٹ اور وزیر نہیں بن سکتا ہے حالانکہ اس نے ایرانی شہریت قبول کر لی اور ایرانی حکومت نے بھی اس کو اپنی نیشنلٹی دے دی لیکن اس کو اس طرح کے حقوق مانگنے کا کوئی حق نہیں یہ ہمارے (ایران) کے قانون۔

4۔ اسلام کی نگاہ میں پہلے اور دوسرے طبقہ کی شہریت

ہم اب شہریت کے متحقق ہونے اور اس کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو تفصیلی طور پر بیان نہیں کر سکتے، اس لئے کہ یہ بحث فلسفہ حقوق سے مربوط ہے اور ہماری بحث کا موضوع فلسفہ سیاست ہے۔ لیکن مختصر طور پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ ممالک کی حد بندی میں اسلام کا حقوقی نظریہ کی رو سے اعتقادات اصل ہیں، اور جغرافیائی اعتبار سے حد بندی کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اسلام کا سب سے پہلا ہدف یہ ہے کہ دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو (انشاء اللہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے بعد قائم ہوگی) اس میں جغرافیائی حد بندی اٹھالی جائے گی اور تمام افراد امت اسلام اور ایک حکومت کے شہری ہونگے اور ان کی شہریت کا ملک اسلام ہے اس حکومت میں غیر مسلمان افراد کے حقوق اور وظائف مسلمانوں سے متفاوت ہونگے، غیر مسلمان کو ایک مسلمان کے تمام وظائف اور عہدہ نہیں ملے گا، اور نہ ہی اس کو مسلمان کے تمام حقوق اس کو دیئے جائنگے یہ اسلام کا پہلا ہدف ہے۔

لیکن خاص شرائط کے اعتبار سے ولی فقیہ اور اسلامی حکومت عنوان ثانوی کے ماتحت جغرافیائی حد بندی کو معتبر سمجھ سکتے ہیں اس بنا پر اگر ہم جغرافیائی حد بندی کو معتبر سمجھ سکتے ہیں تو اسلام کی طرح حکم اولی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ثانوی طریقہ اور مصلحتوں کی وجہ سے ہے جو منطقہ اور بین الاقوامی قوانین کے ماتحت ہے اور وہ قوانین ولی فقیہ کے دستخط کے ذریعہ ہمارے لئے معتبر ہوتے ہیں اور حقیقت میں وہ تمام حد بندی ولی فقیہ کے ذریعہ متعین کی جاتی ہے

نتیجتاً پہلے طریقہ اور آئیڈیل اسلام میں شہریت کے دوسرے درجہ میں شمار ہونگے لیکن خاص شرطوں کی وجہ سے جغرافیائی حد بندی معتبر مانی گئی ہے اور قانون کی بنیاد پر شہریت کے لئے خاص شرطوں کو نظر میں رکھا گیا ہے، ولایت فقیہ کے نظریہ پر کی بنیاد پر جب ان شرائط و قوانین پر ولی فقیہ دستخط فرما دیں تو تمام احکام اسلامی کی طرح وہ بھی واجب الاطاعت ہوں گے، جبکہ حضرت امام خمینیؒ نے فرمایا ہے کہ "اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کرنا واجب ہے"

5۔نظام ولایت فقیہ کا دوسرے نظاموں سے فرق

جو افراد ہمیشہ جمہوریت کا دم بھرتے ہیں اور اپنی حکومت کو ولایت فقیہ کی بنیاد پر اچھا نہیں سمجھتے انہوں نے اس ملک کے لئے ولایت فقیہ کی خدمات کی طرف توجہ نہیں دی ہے، اور وہ یہ بھی توجہ نہیں کرتے کہ ولایت فقیہ کے نظریہ کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے احکام وقوانین اور اسلامی پارلیمینٹ کے وضع کئے ہوئے قوانین کی شورای نگہبان کی تائید کے بعد اطاعت کرنا واجب ہے، چونکہ وہ ولی فقیہ کی اجازت سے اس مرحلہ تک پہنچے ہیں، اور ان کا اذن خدا کا اذن ہے، اس نظام کا ایک بڑا امتیاز یہی ہے، لیکن اگر ہم ولایت فقیہ کو تسلیم نہ کریں تو کم از کم وجوب عرفی کی بنا پر قوانین کی اتباع کرنا ہوگی، جو لوگ اپنی خواہش کے قانون کو رائے دے چکے ہیں، ورنہ خود اپنے ہی عہد پر وفادار نہیں ہوں گے، اور اگر دل چاہے تو اس عہد سے لوٹ جائیں اور اپنی درخواست پر تجدید نظر کریں اور اپنی خواہش کے مطابق قانون میں تغیر وتبدیلی کرسکتے ہیں، جمہوری حکومت میں لوگوں پر قوانین کی اطاعت کرنا کوئی واجب نہیں ہے۔

اسلامی حکومت میں ولی فقیہ کی اجازت اور دستخط سے قانون معتبر جانے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ لوگوں کے خود لازم کردہ اور وجوب عرفی کی بنا پر ان کے لئے لازم ہوتے ہیں اور وجوب شرعی بھی رکھتے ہیں اور ان کی مخالفت کرنا گناہ اور سزا کا باعث بھی ہوتا ہے۔

اسلامی حکومت کے قوانین کی اتباع کرنے اور جو قوانین اکثر لوگوں کی رائے کا نتیجہ ہوتے ہیں ان کی اتباع کرنے میں کتنا فرق ہے اور چونکہ نمائندہ مجلس کو اکثر لوگوں نے اپنے ووٹ دے کر منتخب کیا اور خود اس کی اتباع کرنے کو لازم قرار دیا ہے اب جن افراد نے اس قانون کی ووٹ نہیں دیئے یا وہ اقلیت جنہوں نے اس نمائندہ مجلس کو ووٹ نہیں دیئے ان افراد کو اس قانون کی کسی حد تک اتباع کرنا چاہئے؟ جو قانون اکثر افراد کی رائے سے بنایا گیا ہو تو کیا نفسیاتی، عاطفی اور قلبی اعتبار سے اس قانون کے مخالف افراد پر بھی اس قانون کی اتباع کرنا لازم ہے؟ اور کس طرح قلبی طور پر بھی وہ اکثر لوگوں کی خواہش کی مطابق ملتزم ہوں؟

جو قوانین اسلامی حکومت کے ذریعہ نمائندگان مجلس کے توسط سے بنائے جاتے ہیں، اور ولی فقیہ نے بھی ان کی تائید فرمادی وہ خداوند عالم کی طرف سے واجب ہوگئے اور ان کی اطاعت کرنا واجب ہے، اور جن افراد نے ان قوانین کو اپنی رائے نہیں دی ہے ان پر بھی شرعی طور پر ان کی اتباع کرنا لازم ہے، البتہ تمام افراد اس بات سے واقف ہیں اور اسلامی حکومت کے قوانین کو تہہ دل سے تسلیم کرتے ہیں ان کو شرعی قوانین کی حیثیت دیتے ہیں اور ان کی مخالفت نہیں کرتے۔

چونکہ وہ الٰہی اور اسلامی حکومت کے قوانین وضوابط سے آشنا ہیں اس طرح سے قوانین کے ضوابط کو قبول کرنا اور اس کی اتباع کرنا یہ نظام الٰہی کی خصوصیات میں سے ہے جو ہمارے ملک میں نظام ولایت فقیہ کے ماتحت وجود میں آئی ہے، اسلامی انقلاب سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ تمام لوگوں پر رہبر اور ولی فقیہ کی اطاعت کرنا ضروری ہے اور ان کے اوامر اور

راہنمائی کی طرف خالصانہ قدم اٹھانے ہی سے ہم کامیاب ہوئے ہیں، چاہے وہ دوران انقلاب ہو یا انقلاب کے بعد کا زمانہ، اور فی الواقع جنگ میں کامیابی اور سرفرازی کا راز بھی یہی ہیں۔

دنیا میں کون سا ایسا شخص ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی میں ایک اہم چیز لوگوں کا اپنی مذہبی رہبر پر اعتقاد رکھنا اور ان کی اطاعت کرنا تھا، اس وقت یہ کہنا بہت ہی بے انصافی ہوگی کہ جس ملک میں شہیدوں نے اپنی جانفشانی اور فداکاریوں سے امام خمینیؒ اور مرجع تقلید کے امر سے جہاد کیا اور اسی راہ میں شہید ہو گئے اور جس کی برکت سے اسلامی نظام وجود میں آیا اور یہی آزاد فضا جو شہیدوں کے خون اور ان کی فداکاریوں کا نتیجہ ہے اس میں کچھ لوگ یہ کہیں کہ: امام خمینیؒ نے ایک دفعہ ہوا طوفان مچایا اور لوگوں کی تحریک کو نہضت انقلاب اسلامی کا نام دیدیا، کیا اس دعوے کی کوئی حقیقت ہے؟ اگر ایران کی عوام انقلاب کے موقع پر اپنے دینی اور شرعی وظیفہ کو انجام دینے کے لئے قیام نہ کرتے اور گولیوں کی بوچھار میں اپنے سینوں کو سپر نہ بناتے تو کیا انقلاب کامیاب ہو جاتا؟ اور اگر امام خمینیؒ کا حکم نہ ہوتا تو کیا وہ اس کام کو کرتے؟ حقیقت کو بھلانا اور اس کا انکار کرنا بے انصافی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دین اور امام خمینیؒ کے رہبریت نے ہمیشہ انقلاب کے کامیاب ہونے، اس کے دوام پانے اس کے بعد جنگ میں کامیابی پانے اور تمام مشکلوں اور سختیوں میں ثابت قدم رہ کر اہم کردار ادا کیا ہے، اور انشاء اللہ حضرت امام خمینی قدس سرہ کے لائق وشائستہ جانشین (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی) اور ان کی حکیمانہ تدبیروں کے زیر سایہ یہ کامیابی وموفقیت ایران کے فدارکار لوگوں کی یکتائی اور ہمدلی کے ذریعہ اسی طرح باقی رہے گی، اور لوگ ولی فقیہ کے سایہ میں کمال اور ترقی کے مزید مراحل کو طے کریں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ شہریت کی درجہ بندی کرنا ایک ایسی چیز ہے جس کو پوری دنیا کی تمام حکومتوں میں تسلیم کیا گیا ہے البتہ اسلام کے نقطۂ نظر اور دوسروں کے نقطۂ نظر سے شہریت کے ملاک اور اس کی شرطوں میں فرق ہے، لیکن شہریت کے درجہ میں اختلاف ایسی چیز نہیں ہے کہ ہم اس کو ایجاد کیا ہو، اور شہریت کے درجہ میں یہ فرق انسانیت میں لوگوں کے مشترک ہونے سے کوئی ربط نہیں رکھتا ہے، تمام انسان انسانیت کے درجہ میں ایک ہیں، لیکن یا تو ان میں طبیعی طور پر وہ شرطیں موجود ہوتی ہیں جو وظائف اور حقوق کے اختلاف کا سبب ہوتی ہیں یا وہ جو خصوصیات، طاقت اور قابلیت کو حاصل کرتے ہیں ان کی وجہ سے ان کو کچھ منصب دیئے جاتے ہیں اور ان کے عوض میں ان کو حقوق دیئے جاتے ہیں، تو اب حقوق اور وظائف کے مابین فرق یا تو طبیعی ہے یا افراد کے انتخاب اور اختیار میں ہے، مثال کے طور پر وہ خاص دین کو تسلیم کرلیں یا کسی فن میں مہارت حاصل کر کے کسی منصب کو حاصل کرلیں، اور اس میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں ہے کہ یہ اختلاف اور کسب شدہ خصوصیات اور منجملہ اصول مبانی کو تسلیم کرنا وہ انسان کی شہریت میں مؤثر ہوسکتا ہے۔

چوبیسویں نشست

حکومت کی عظیم منصوبہ بندی

(پہلا حصہ)

1۔ حکومت کی ضرورت

ہم نے اسلامی سیاسی فلسفہ کے شروع ہی میں یہ بات عرض کی تھی کہ دوسری حکومتوں کی طرح اسلامی حکومت کے بھی دو بنیادی محور ہوتے ہیں:

1۔ قانون اور قانون گذاری۔

2۔ مدیریت اور قوانین کو نافذ کرنا۔

ہماری گذشتہ بحث پہلے محور پر ہوئی ہے مثلاً قانون کی اہمیت، مطلوبہ قانون کے خصوصیات، اسلام کی نظر میں قانون گذاری، اور اس کے شرائط کے سلسلہ میں بحث ہوئی، نیز اسی بحث کے ضمن میں مذکورہ سلسلہ میں ہونے والے بعض اعتراضات وشبہات کا بھی جواب دیا گیا۔

لیکن اب ہم دوسرے محور (یعنی مدیریت اور نفوذ قوانین) کے سلسلہ میں بحث کریں گے، اس بحث کے نقشہ کو روشن کرنے کے لئے اس مقدمہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ کسی مؤسسہ یا سازمان کا ہدف جس قدر واضح اور صاف وشفاف ہو گا اسی مقدار میں اس سازمان کا نقشہ یا اس میں کام کرنے کی شرائط، اسی طرح اس کے منتخب ہونے والے اعضاء کی خصوصیات واضح اور روشن ہوگی اس بنا پر اگر ہم اسلامی حکومت یا حکومت بمعنی خاص یعنی حکومت اسلامی کی مدیریت کے بارے میں بحث کرنا چاہیں اور اس بات کا پتہ لگانا چاہیں کہ اس طاقت کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں کون افراد فعالیت اور کارکردگی کر سکتے ہیں اور ان کی خصوصیات اور ان کے اختیارات کیا کیا ہیں؟

تو سب سے پہلے اسلامی حکومت کی تشکیل کے اہداف اور ان میں بھی اسلامی حکومت کی مدیریت کے ہدف اور مقصد سے آگاہ ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر حکومت کی تشکیل کا ہدف معین اور مشخص نہ ہو تو پھر مدیریت کا ڈھانچہ، اس کے ذمہ دار افراد کی خصوصیات اور ان کے اختیارات واضح نہیں ہو پائیں گے لہٰذا مناسب ہے کہ پہلے حکومت (خاص شکل میں یعنی قوہ مجریہ) کی تشکیل کے اغراض ومقاصد کے سلسلہ میں بحث کریں۔

ان لوگوں کے نظریہ کو نظر انداز کرتے ہوئے جو حکومت کو ضروری نہیں مانتے اکثر فلسفہ سیاسی دانشمند افراد حکومت کو ضروری مانتے ہیں یعنی ان کا ماننا یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسی انجمن یا مجموعوں کا ہونا ضروری ہے جو احکامات صادر کریں اور دوسرے افراد ان کی اطاعت کریں، یا وہ قوانین جن کو معاشرہ قبول کرتا ہے ان کو معاشرہ میں نافذ کریں اور ان قوانین کی مخالفت کرنے والوں کو مخالفت سے روکیں، یا ان کو مخالفت پر سزا دیں چنانچہ اس بات پر تقریباً سبھی دانشمند اتفاق رکھتے ہیں تجربہ کی بنیاد پر کم وبیش سبھی لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ معاشرہ کو حکومت کی ضرورت ہے اسی طرح اسلام بھی اس نظریہ کو قبول کرتا ہے، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے (نہج البلاغہ میں) فرمایا ہے: یہاں تک کہ اگر معاشرہ میں نیک لوگوں کی حکومت نہ ہوتو ایسے حالات میں ایک فاجر اور برے فرد کی حکومت (حکومت نہ ہونے سے) بہتر ہے

وَاِنَّه لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ يَعْمَلُ فِي إِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ وَيَسْتَمْتِعُ فِيهَا الْكَافِرُ.[1]

یعنی لوگوں کے ایک حاکم کی ضرورت ہوتی ہے چاہے وہ نیک ہو یا برا، تاکہ اس کی حکومت میں مومنین اپنا کام کرسکیں اور کافر اپنا فائدہ حاصل کرسکیں

کیونکہ اگر حکومت یا قوانین کو جاری کرنے والا ضامن موجود نہ ہوتو پھر معاشرہ کا نظام درہم وبرہم ہو جائے گا، جس کے نتیجہ میں عام لوگوں کے حقوق پامال اور معاشرہ کے مصالح وفوائد نابود ہو جائیں گے لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے "بے حکومتی" قابل قبول نہیں ہے، بلکہ مومنین کے اہم وواجب وظائف میں سے ایک یہ ہے کہ نیک افراد کی حکومت بنائیں تاکہ معاشرہ کے مصالح اور فوائد تامین اور پورے ہوں۔

2۔ قوۂ مجریہ کے اہداف کے سلسلہ میں مختلف نظریات

اب جب کہ حکومت اور قوہ مجریہ کی ضرورت ثابت ہوگئی تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکومت اور قوہ مجریہ کے اہداف ومقاصد کیا کیا ہیں؟ جبکہ اس بات کو تقریباً سبھی جانتے ہیں کہ قوہ مجریہ کا کام قوانین کو نافذ کرنا ہے، پس یہ طے ہوگیا کہ اس کا کام قوانین کو جاری کرنا ہے، لیکن اب یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ قوانین جن کو حکومت نافذ کرنا چاہتی ہے وہ کس طرح کے اور کس ماہیت کے ہونے چاہئیں؟ چنانچہ اس سوال کا جواب ایک دوسرے سوال پر متوقف ہے اور وہ یہ ہے کہ قانون کا ہدف اور مقصد کیا ہے؟ معاشرہ کو قانون کی کیا ضرورت ہے؟ اور وہ قانون لوگوں کے لئے کس چیز کو مدنظر رکھے؟ اس سوال کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ قانون کے اہداف ومقاصد کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

پہلی قسم: مادی اغراض ومقاصد۔

دوسری قسم: معنوی اغراض ومقاصد۔

کلی طور پر سیاسی فلسفہ کے بارے میں بحث کرنے والے دانشوروں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حکومت کو

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر 40

چاہئے کہ وہ لوگوں کے مادی مصالح و منافع کو تامین کرے، لیکن معنوی مصالح کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا قانون کو لوگوں کے معنوی مصالح کو بھی پورا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ کیا معنوی مصالح کا بھی قانون میں لحاظ کرنا ضروری ہے، اور اس طرح حکومت کو ایسے قوانین کا نافذ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

قدیم زمانہ سے بعض فلسفی مکاتب اس نظریہ کو مورد توجہ قرار دیتے تھے کہ حکومت کو لوگوں کے معنوی مصالح کو بھی تامین کرنا چاہئے، اور وہ قانون جس کی حکومت ذمہ دار ہوتی ہے اس قانون کو ایسا ہونا چاہئے جو انسانی فضائل کو مد نظر رکھے غیر دینی فلسفی مکاتمیں بھی یونانی قدیم فلاسفہ مثل "افلاطون" (انسانی) فضیلت پر توجہ دیتے تھے، اور حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ انسانی فضائل کے رشد و نمو کے لئے راستہ ہموار کرے، چنانچہ اسی لئے کہتے تھے:
"حکومت کرنے کا حق صرف انہیں افراد کو ہے جو حکیم (عالم و عاقل) ہوں، جو انسانی فضائل کے اعتبار سے دوسرے لوگوں سے بہتر ہوں، جیسا کہ افلاطون کا کہنا ہے: "حکیمان باید حاکم بشوند" (حکماء کو حاکم ہونا چاہئے) لہٰذا غیر مسلمان اور غیر الٰہی فلاسفہ (وہ لوگ جو آسمان ادیان کے کو نہیں مانتے تھے) کے نزدیک بھی انسانی فضائل اور اخلاق کی اہمیت تھی یہاں تک کہ وہ فلاسفہ جو کسی دین اور مذہب کو نہیں مانتے تھے وہ بھی یہی نظریہ رکھتے تھے کہ معاشرہ میں اخلاقی فضائل اور لوگوں کی اخلاقی رشد و نمو ہونا چاہئے۔

جس وقت یورپ میں عیسائیت پھیلی اور "کنسٹانٹین" روم کا بادشاہ ایک عیسائی ہوا، اس نے یورپ میں عیسائیت کو رائج کیا، عیسائیت یورپین ممالک کے تمدن کا قانونی مذہب بن گئی، دین اور حکومت ایک ساتھ مل گئے اور حکومت کے اہداف میں دینی اغراض و مقاصد کو بھی مد نظر رکھا گیا یعنی جو کچھ عیسائیت نے کہا اس کے قوانین کو جاری بھی کیا گیا۔

لیکن "رنسانس" کے بعد مغربی نظریات میں تبدیلی آئی، جس کی بنا پر انہوں نے اخلاقی مسائل کو حکومت کے دائرہ سے نکال دیا کیونکہ رنسانس اور نوزائی کے بعد یورپ میں تغیر و تبدیلی پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں مغربی جدید تمدن کا آغاز ہوا، جس کی سب سے بڑی خصوصیت دین کا حکومت سے جدا کرنا تھا اس دور میں فلاسفہ نے اس سلسلہ میں گفتگو کی، کتابیں لکھیں جس کی بنا پر مختلف فکری مکاتب وجود میں آئے، اور اخلاقی اور معنوی فضائل کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔

انہیں فلاسفہ میں سے "ھابز" نامی فلسفی بھی گذرا ہے جس کا نظریہ یہ تھا کہ حکومت کی ذمہ داری صرف ہرج و مرج (بدامنی) پھیلنے سے روکنا نہیں ہے کیونکہ اس کے نظریہ کے مطابق بعض بھیڑیا صفت لوگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی جان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو نابود کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے ایک ایسی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو ان بھیڑیا صفت انسان پر کنٹرول کرے اور ان کی درندگی اور ظلم و ستم کو روکے، لہٰذا حکومت کا صرف یہی مقصد ہوتا ہے۔

اس کے بعد" جان لوک"[1] نے حکومت کے اہداف کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کی ذمہ داری لوگوں کی؟ اور ان کی حفاظت کرنا ہے، اس کی نظر میں انسانوں کے پاس صرف ایک حکومت کی کمی ہوتی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو پھر معاشرہ کا نظام وجود میں نہیں آسکتا، افراتفری پھیل جائے گی، امن وامان ختم ہوجائے گا، انسان کی جان ومال خطرہ میں پڑ جائے گی جیسا کہ وہ کہتا ہے: "ہمیں اپنی ضرورت تحت حکومت چاہتے ہیں، ورنہ تو دوسری چیزوں کا حکومت سے کوئی مطلب وواسطہ نہیں ہے۔"

البتہ دین وحکومت اور اجتماعی مسائل کی جدائی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نظریہ کے ماننے والے اخلاقی فضائل اور معنوی اقدار کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں، بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان چیزوں کا حکومت سے کوئی ربط نہیں ہے بلکہ خود عوام الناس کو ان اخلاقی ومعنوی فضائل کی طرف قدم بڑھانا چاہئے: جو لوگ خدا کو مانتے ہیں ان کو چاہئے کہ خود مسجد یا گرجا گھر میں جائیں یا کسی دوسری جگہ پر جاکر خدا کی عبادت کریں، لیکن اس سلسلہ میں حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اسی طریقہ سے اخلاقی فضائل جیسے سچ بولنا، نیک کردار، دوسروں کا احترام واکرام کرنا، فقیر وفقراء کی مدد کرنا وغیرہ یہ فضائل قابل قدر ہیں لیکن یہ فردی (ذاتی) مسائل میں شمار ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں خود افراد کو تلاش وکوشش کرنا چاہئے تاکہ اپنے کو ان اخلاقی فضائل سے آراستہ کرلیں، لیکن ان کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پس اجتماعی قوانین، یعنی وہ قوانین جو حکومت کے ذریعہ جاری ہوتے ہیں ان کا ہدف اور مقصد معاشرہ کے امن وامان کو تامین اور ان کی حفاظت کرنا ہے تاکہ لوگوں کی جان ومال؛ ہر طرح کے خطرہ سے محفوظ رہے پس حکومت کی ذمہ داری لوگوں کی جان ومال کی حفاظت ہے، اور یہ بات کہ حکومت کا مقصد امن وامان قائم کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے مختلف تحریروں میں بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ "لاک" کی تحریروں میں جان ومال کی حفاظت کے علاوہ فردی آزادی کو بھی امنیت کا ایک حصہ شمار کیا ہے، یعنی اس نے امنیت میں جان ومال اور آزادی کو بھی داخل کیا ہے، لیکن اخلاقی اور معنوی مصالح کے بارے میں صرف اس بات کو قبول کرتا ہے کہ اجتماعی قانون کو اخلاق کے مخالف نہیں ہونا چاہئے، یا خدا پرستی سے نہ ٹکراتا ہو، لیکن اجتماعی اور حکومتی قوانین پر: اخلاقی اقدار، دینی اقدار کو حفظ کرنے اور معنوی رشد کرنے کی راہ ہموار کرنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ یہ تمام چیزیں حکومت سے متعلق نہیں ہیں۔

آج کل دنیا کے تقریباً سبھی فلسفی مکاتب میں اسی "لاک" کا نظریہ انجیل کا حکم اور بنیادی قانون ہوتا ہے اس کا اصلی نعرہ یہ ہے کہ حکومت کو امن وامان اور آزادی کو برقرار کرنے کے علاوہ دینی مسائل یا اخلاقی فضائل کے سلسلہ میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

قارئین کرام! مغربی نقطہ نظر اور اسلامی نقطہ نظر میں سب سے بڑا نقطہ اختلاف یہی ہے۔

---

[1] اسی شخص نے مغربی لیبرل "Liberal" (آزادی خواہ) نظریہ کی بنیاد رکھی جو آج کل کی سیاسی گفتگو اور یونیورسٹی وغیرہ میں بیان ہوتی ہے اور کم وبیش سبھی لوگ اس کو قبول کرتے ہیں

3۔ انبیاءؑ کی حکومت کے اغراض و مقاصد

انبیاء علیہم السلام اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نظریہ خاص طور پر یہ ہے کہ حکومت کی ذمہ داری، مادی مصالح اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ معنوی مصالح کو پورا کرنا بھی ہے یہاں تک کہ معنوی مصالح کا پورا کرنا مادی مصالح پر فوقیت رکھتا ہے اور ان پر مقدم ہے یعنی حکومت کو ایسے قوانین جاری کرنا چاہئے جن کا آخری ہدف معنوی، روحی، اخلاقی اور انسانی مصالح کو تامین (حفاظت) کرنا ہے وہی مسائل جن کو دین انسان کا آخری ہدف شمار کرتا ہے اور انسانی کمال کو ان سے متعلق گردانتا ہے، اس دنیا میں انسان کی خلقت اور اس کے لئے انتخاب اور آزادی کی طاقت کا ہونا؛ یہ تمام کی تمام چیزیں اسی وجہ سے ہیں کہ انسان اپنے نھائی اور آخری ہدف کو پہچان لے اور اسی پر قدم بڑھائے ان تمام مسائل کا محور "قربت خدا" ھے جیسا کہ الحمدللہ آج ہمارے اسلامی معاشرہ میں سب پر واضح ہے بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان یہ بات رائج تھی یہاں تک کہ جو لوگ اس کے صحیح معنی بھی نہیں جانتے لیکن پھر بھی اس لفظ سے مانوس ہیں کیونکہ جاہل اور کم پڑھے لکھے افراد بھی جملہ "قربۃ الی اللہ" کو زبان پر جاری کرتے ہیں۔

اب جبکہ یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان کا آخری ہدف خلقت، قربت خدا ہے تو پھر معاشرہ میں ایسے قوانین کا نافذ ہونا ضروری ہے جو اس ہدف تک پہنچانے میں مدد کریں اور انسان کی زندگی بھی اسی سمت آگے بڑھے، اور انسان کے دوسرے حیوانی پہلو کے دوسرے مسائل اسی صورت میں مہم ہوسکتے ہیں جب وہ مسائل انسان کو معنویات اور قربت خدا کی طرف رشد وترقی کی منزلوں کو طے کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔

اور جب یہ بات ثابت ہوچکی کہ اجتماعی قوانین کو بنانے کا ہدف مادی مصالح کو تامین کرنے کے علاوہ معنوی مصالح کو تامین کرنا بھی ہے تو پھر ظاہراً حکومت کا مقصد بھی مشخص اور معین ہوجاتا ہے اور حکومت کو بھی صرف لوگوں کی جان ومال کی حفاظت ہی کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھنا چاہئے؛ بلکہ ان کے علاوہ معنویات کے رشد کے لئے بھی راہ ہموار کرنا نیز اس راہ میں جو چیز مانع اور ضدیت رکھتی ہوں ان کو راستہ سے ھٹانا بھی حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے، حکومت کو صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرنا چاہئے کہ میں نے تو تمہاری روٹی کے اسباب فراہم کردیئے ہیں اور تمہاری جان کی امنیت برقرار کردی ہے، اور بس البتہ یہ ذمہ داری تو سبھی حکومتوں کی ہوتی ہے اور سبھی اس سلسلہ میں متفق بھی ہیں کہ ہر ایک معاشرہ میں؛ چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، لائیک ہو یا غیر لائیک اس میں جو بھی حکومت تشکیل پائے تو اس کے لئے امنیت برقرار کرنا ضروری ہے تاکہ لوگوں کی جان ومال محفوظ رہے، لیکن اسلامی نقطہ نظر سے حکومت اپنی ذمہ داری کو صرف اسی چیز میں محدود نہیں کرسکتی بلکہ اس کو اپنا سب سے پہلا وظیفہ یہ سمجھنا چاہئے کہ فضائل انسانی، معنوی والٰہی رشد کے لئے راستہ ہموار کرے، طبیعی طور پر اس مقصد تک پہنچنے کے لئے امن وامان اور لوگوں کی جان ومال کی حفاظت کے سلسلہ میں امنیت برقرار کرنا ضروری ہوتا ہے، البتہ اس امنیت کا برقرار کرنا ایک مقدمہ ہے نہ کہ اصل مقصد نہیں ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ جانی مالی امنیت برقرار کرنا متوسط اہداف میں ہیں نہ نھائی اور اصلی هدف، ایک دوسرے طریقہ سے یوں عرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ امنیت بلند وعالی ہدف تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے اور وہ بلند ہدف معنویات کا رشد ہے پس معاشرہ میں وہ قوانین نافذ ہوں جو نہ فقط دین سے ضدیت نہ رکھتے ہوں اور دین کے مخالف نہ ہوں بلکہ ان کو مکمل طریقہ سے دینی اصول ومبانی سے ہم آہنگ اور موافق ہونا چاہئے، اور انسان کے معنوی اور الٰہی رشد میں معاون ومددگار، ان کا دین کے مخالف نہ ہونا کافی نہیں ہے بلکہ دین کے اہداف میں مددگار ہونا ضروری ہے، یعنی اسلامی حکومت کا کردار نہ صرف یہ کہ ضد دین نہ ہو بلکہ بے دینی اور دینی ضدیت سے مقابلہ کرے اور دینی اہداف ومقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے حکومت یا قوہ مجریہ کا هدف، صرف جان ومال کی حفاظت کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مہم تر معنوی مسائل پر توجہ دینا نہایت ہی ضروری ہے، یہاں تک کہ ممکن ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں معنوی ضرورتوں کو پورا کرنے کی وجہ سے وقتی طور پر مادی ضرورتیں تامین نہ ہوں، اور اگر اسلامی احکام جاری ہوں تو پھر آئندہ میں لوگوں کی مادی ضرورتیں دیگر حکومتوں سے بہتر طریقہ پر پوری ہوں گی، لیکن اگر فرض کریں کچھ مدت تک لوگوں کی تمام مادی ضرورتوں کو پورا کرنے سے دین کے ضعیف ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر ایسے موقع پر ضروری ہے کہ لوگوں کی ان ضرورتوں کو پورا کیا جائے جن سے دین ضعیف نہ ہو، کیونکہ معنوی مصالح مقدم اور اہم ہیں لیکن اس سلسلہ میں مغربی ممالک کا نقطہ نظر ہمارے نظریہ سے الگ ہے کیونکہ وہ لوگ فقط مادی مسائل اور مادی اہداف پر توجہ کرتے ہیں اور ان کی حکومت معنوی مصالح کو تامین کرنے کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔

4۔ لیبرل ''Liberal'' (آزادی خواہ) نظام میں اجتماعی مشکلات کا اثر

کبھی کبھی بعض لوگ تحریری یا شفاہی طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مغربی ممالک میں بھی دینی مسائل پر توجہ دی جاتی ہے کہ وہ لوگ بھی ایثار وفداکاری کرتے ہیں اور اجتماعی مسائل پر توجہ کرتے ہیں، اگر چہ یہ مطلب صحیح ہے اور ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ تمام مغربی لوگ خود پسند نہیں ہیں اور لیبرل نظریہ کے رائج ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام مغربی لوگ اس نظریہ سے متاثر ہوں، بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ لیبرل نظریہ اکثر معاشروں پر غالب ہے اور وہ لوگ پیش آنے والے بعض مسائل کی بنا پر ایسے کام کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ اپنے فلسفہ کے خلاف عمل کرتے ہیں یعنی وہ تمام لوگ جو لیبرل نظریہ کو قبول رکھتے ہیں اور خود پسند ہوتے ہیں وہ بھی ضرورتوں کے تحت مجبور ہوتے ہیں تاکہ اجتماعی مسائل پر توجہ کریں اور شورش اور بلوے کے ڈر سے کہ کہیں اکثر لوگ قیام نہ کرلیں، لہٰذا محرومین کے حقوق کی رعایت کرتے ہیں عملی طور پر بہت سی سوسیالیسٹ "Socialiste" ڈیموکریٹک "Democratic" حکومتیں لوگوں سے حاصل کئے گئے ٹیکس وغیرہ کے کافی حصہ اجتماعی خدمات پر خرچ کرتے ہیں، جبکہ ان کا مادی فلسفہ اس چیز کی اجازت نہیں دیتا، لیکن اس کام کو اس وجہ سے کرتے ہیں تاکہ عوام الناس

اعتراض نہ کرے، اور امنیت محفوظ رہے اور لوگ قیام وشورش نہ کریں، ایک دوسرے کی جان کے پیچھے نہ پڑیں، پس یہ لوگ اپنی مجبوری کی بنا پر اس طرح کی سہولیات فراہم کرتے ہیں۔

لیبرل نظریہ کیا چاہتا ہے؟ اور اس کے طرفدار کیا کرتے ہیں؟ یہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں، اتفاقاً یہ اعتراض تو خود ان پر (بھی) ہوا ہے کہ تمہارے لیبرالی نظریہ کے تحت تم کو ان مسائل کی رعایت نہیں کرنا چاہئے، پس تم لوگ ایسے کام کیوں کرتے ہو جس سے محروم طبقے کا فائدہ ہوتا ہو جیسے عام لوگوں کے لئے بیمہ اسکیم، یا دوسری سہولیات کا فراہم کرنا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس لئے ہیں تاکہ سرمایہ داروں اور مالدار لوگوں کا سرمایہ اور پراپرٹی خطرہ میں نہ پڑ جائیں، اور کمیونسٹی اور مارکسسٹی انقلاب رونما نہ ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مارکسسٹی ممالک میں مارکسسٹی نظریہ آنے سے پہلے یہ نظریہ مغربی ممالک میں رائج ہو چکا تھا اور اپنا اثر دکھا چکا تھا "مارکس" نامی دانشمند جرمن کا تھا اور انگلینڈ میں رہتا تھا شروع میں اس کے نظریات اور اس کی کتابیں انگلینڈ میں نشر ہوئیں، چنانچہ انگلینڈ کے سیاست مداروں نے اس کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد مارکس کے بیان شدہ خطرات پر توجہ کی اور پہلے ہی سے ان کی روک تھام کا بندوبست کیا۔

حزب کارگر اور سوسیالسٹی طرز تفکر جو انگلینڈ میں وجود میں آئے اور انہوں نے جو محروم اور کم درآمد لوگوں کے لئے کچھ پروگرام رکھے ان سب کا مقصد مارکسسٹی طرز تفکر سے روک تھام تھا؛ کیونکہ پہلے ہی سے یہ پیشن گوئی کردی گئی تھی کہ سرمایہ داری کی پیشرفت اور ترقی، لوگوں کی اکثریت کو انقلاب اور شورش کرنے پر مجبور کرسکتی ہے لہٰذا انگلینڈ میں مارکسسٹی انقلاب کو روکنے کے لئے فقیر اور غریب لوگوں پر توجہ کی جانے لگی، اور ان کو اطمینان دلایا جانے لگا اگرچہ ان کا یہ رویہ "کاپیٹالسٹی" طرز تفکر سے سازگار اور ہم آہنگ نہ تھا، لیکن سرمایہ داروں اور مالداروں کے منافع کے حق میں تھا بہر حال لیبرل نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ حکومت کی معنوی امور کے سلسلہ میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص ہم پر یہ اعتراض کرے کہ مغربی ممالک میں حکومت گرجا گھروں کے لئے ٹیکس لیتی ہے، تو پھر ان پر دین اور معنویات سے بے توجہی کا الزام کیونکر لگایا جاسکتا ہے؟!

تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی لیبرالیزم کا مقصد نہیں ہے بلکہ یہ کام اس لئے کرتے ہیں تاکہ دیندار لوگوں کا دل جیت لیں، اور حکومت بناتے وقت گرجا گھر کی طاقت سے استفادہ کریں ہماری بحث تو صرف اس میں ہے کہ لیبرل طرز تفکر کا مقصد اور مطلب کیا ہے؟

چنانچہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ان کے نظریہ کے مطابق: دینی مصالح کی تامین اور ترویج کرنا حکومت کی ذمہ داری کے ذمہ نہیں ہے، اور اگر وہ حکومتیں بعض مذہبی مصالح پر توجہ کرتی ہیں تو وہ اپنے ذاتی فائدہ کے لئے ہوتا ہے، یہ صرف الیکشن میں کامیاب ہونے کے لئے ہوتا ہے اور وہ لوگ دینداروں کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دینداروں کے

دلوں کو جیت لیں تا کہ ان کو ووٹ مل جائیں، کبھی کبھی امریکہ میں ووٹنگ کے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض ممبران گرجا گھروں میں جاتے ہیں تا کہ ان لوگوں کو اپنے سے مانوس کرلیں، البتہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ دین کے طرفدار ہوتے ہیں۔

5۔ لیبرل نظام سے لوگوں کی انسیت کی دلیل

اسلامی نقطہ نظر سے معنوی مسائل کا تحفظ ہی، جو دین کے زیر سایہ امکان پذیر ہوتا ہے وہی اصل اور اولی اہداف میں سے ہیں اور یہی اسلامی اور دنیا میں رائج دوسرے نظریات میں مہم ترین نقطہ اختلاف ہے، اور ہم حکومت کے سلسلہ میں مغربی ممالک کے تابع نہیں ہو سکتے؛ کیونکہ ان کے اور ہمارے درمیان حکومت کے اہدف کے سلسلہ میں بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے اور اگر ہم (حکومت کے) ہدف ہی کو بھول جائیں تو حکومت کا ڈھانچہ، شرائط، ذمہ داریاں اور اختیارات عوض ہوجائیں گے۔

درحقیقت بعض لوگوں کے نظریات میں انحراف اور شک وشکوک کا ایجاد ہونا یہاں تک کہ جو لوگ خودغرضی کے بھی شکار نہ ہوں، جیسا کہ بعض انحرافات اور اعتراضات جو کتابوں اور اخباروں میں بیان ہوتے ہیں ان کی اصل وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اسلامی نظریہ کے تحت حکومت کے قوانین کے اہداف پر توجہ نہیں کی ہے اور نہ ہی اسلامی نظریہ اور دوسرے نظریات کے اختلاف پر توجہ کی ہے انہوں نے اصل اسلام کو تو قبول کرلیا ہے واقعاً ایسے لوگ خدا کو مانتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور دین کے منکر اور کافر نہیں ہیں؛ لیکن اجتماعی اور سیاسی عملی میدان میں سوفی صد مغربی ممالک کے تابع ہوجاتے ہیں اور پھر ان کو یہ کوئی فکر نہیں ہوتی کہ ان کا یہ طریقہ کار اسلامی نظریہ سے ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں؟ اور کہتے ہیں کہ آج کل دنیا میں یہی رویہ رائج ہے لہٰذا ہم بھی اسی رویہ کو اختیار کریں اور اس کی مخالفت (بھی) نہیں کرسکتے آج کی دنیا کا تمدن، مغربی تمدن ہے، اور لیبرل کلچر حاکم ہے، لہٰذا ہم اس کی مخالفت نہیں کرسکتے۔!!

لیکن سب سے پہلے ہمیں تھیوری اور نظری لحاظ سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام کیا کہتا ہے، کیا وہ سب کچھ جو مغربی ممالک میں ہوتا ہے، اسلام کی نظر میں آیا وہ قابل قبول ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ہم مقام عمل میں دیکھیں کہ اسلام کے دستور العمل کو رائج کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر بالفرض مقام عمل میں اسلامی قوانین کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے تو کم سے کم ہمیں یہ تو پتہ ہونا چاہئے کہ اسلام؛ لیبرل نظریہ کو قبول نہیں کرتا، لہٰذا ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ غیر اسلامی طریقہ کار کو اسلام کا نام نہ دیں ہم شاہ کے زمانہ میں بھی بعض اسلامی طریقہ کار پر عمل نہیں کرسکتے تھے لیکن یہ جانتے تھے کہ شاہ کی حکومت اسلامی نہیں ہے، اور اس کے بعض کام دین کے مخالف تھے پس اسلام کے احکام کا جاری نہ ہوسکنا اس بات کا سبب قرار نہیں پاسکتا کہ ہم یہ کہنے لگیں کہ اسلام بدل گیا ہے، ہم آج بھی بعض موارد میں اسلام کے قوانین کو جاری کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، لیکن ہمیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہی اسلام ہے جو ہم کرتے ہیں، اسلام کو تو اسی طرح پہنچائیں جیسا وہ ہے اور اگر کسی مقام پر اسلام پر عمل نہیں کرسکتے تو خداوند عالم سے عذر خواہی کریں کہ ہم سے فلاں مورد میں اسلام کے احکام پر عمل نہیں ہوا، اور اگر خدانخواستہ ہماری

غلطی ہے تو ہمیں ملت اسلامی سے عذر خواہی کرنا چاہئے کہ اسلامی قوانین کے نافذ کرنے میں ہم سے غلطی ہوئی پس ہمیں اسلام میں ردّ وبدل اور تغییر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے نیز ہمیں توجہ رکھنا چاہئے کہ اسلام وہی دین ہے جو 1400 سال پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔

6۔اسلامی حکومت کے ڈھانچہ کے سلسلہ میں ایک طریقہ

مذکورہ مطالب کے پیش نظر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی حکومت کا ھدف؛ معاشرہ میں اسلامی اور معنوی اقدار کو رواج دینا ہے اور اسی کے زیر سایہ مادی مصالح کو پورا کرنا ہے، نہ کہ بالعکس (مثلاً معنوی اقدار کے زیر سایہ مادی مصالح کو پورا کرنا)، تو اب ہم کو یہ دیکھنا ضروری کہ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہئے اور جو افراد حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں ان کے شرائط کیا کیا ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی حکومت میں قوہ مجریہ کی اصلی ذمہ داری قوانین کو نافذ کرنا ہے، اس مطلب پر سبھی اتفاق رکھتے ہیں؛ اور اسلامی حکومت یعنی وہ سسٹم جو اسلامی قوانین نافذ کرنے کا ضامن اور اسی قانون کے اہداف کو پورا کرنا ہے تو اب یہ دیکھنا ہے کہ کوئی بھی حکومت ہو، چاہے مشرقی اور مارکسسٹی حکومت ہو یا مغربی اور لیبرل حکومت یا دیگر حکومتیں، ان کے ذمہ دار افراد میں کیا کیا خصوصیات ہونا ضروری ہیں؟ اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ کسی بھی حکومت کے ذمہ دار افراد میں کم سے کم دو صفات کا ہونا ضروری ہے:

1۔قانون کی شناخت:

جو شخص نفوذ قوانین کا ضامن ہونا چاہتا ہے اگر اس کو قانون کا صحیح علم نہ ہو تو پھر وہ کس طرح قانون کو جاری کرسکتا ہے؟ قوانین سے آگاہ اور آشنا ہونا حکومتی افراد کی پہلی خصوصیت ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو صحیح طور سے نبھاسکے، کیونکہ حکومت قوانین کو جاری کرنے کی ضامن ہوتی ہے تو اگر اس کو قوانین اور دیگر پہلوؤں کا صحیح علم نہ ہو تو پھر عملی میدان میں غلطی کرسکتی ہے اس سلسلہ میں سب سے بہترین طریقہ کار یہی ہے کہ جو شخص حکومت میں سب سے بڑے درجہ پر فائز ہو وہ قوانین پر سب سے زیادہ علم رکھتا ہو اور ان کو اچھے طریقہ سے جانتا ہو، تاکہ اس کی غلطی کا احتمال سب سے کم ہو۔

2۔قوانین کو نافذ کرنے کی طاقت:

وہ حکومت جو قوانین کو نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اس کے پاس اتنی طاقت ہو جس کے ذریعہ مورد نظر قوانین کو نافذ کرسکے، اگر کوئی حکومت 60 ملین لوگوں پر بلکہ ایک ارب لوگوں پر (مثلاً چین اور ھندوستان) حکومت کرے اور ان پر احکام اور مقررات کو جاری کرنا چاہے تو اس کے لئے کافی مقدار میں قدرت وطاقت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ یہ مسئلہ اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ آج کی دنیا کے بہت سے فلسفی نظریات میں حکومت کو قدرت کے برابر جانتے ہیں اور اسی "قدرت وطاقت" کو

فلسفہ سیاست کے مہم ترین مفاہیم میں سے ایک مفہوم سمجھتے ہیں بہر حال اس بات پر توجہ رہے کہ حکومت کو صاحب قدرت وطاقت ہونا ضروری ہے۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "طاقت وقدرت" کیا ہے؟ تو مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ قدیم زمانہ سے انسانی معاشرہ میں تحویل وتحول کے ساتھ ساتھ قدرت وطاقت کے مختلف معنی کئے جاتے رہے ہیں، چنانچہ ابتدائی اور سادہ حکومت۔[1]

میں عام طور پر حاکم یا قبیلہ کے سردار میں جسمانی قدرت شامل ہوتی تھی، کیونکہ اس زمانہ میں جو شخص حاکم ہوتا تھا اس کی جسمانی قدرت دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوا کرتی تھی کیونکہ اگر کوئی شخص ایک ہزار افراد پر مشتمل خاندان ہے اور اس پر حکومت کرتا تھا، اور کوئی شخص حاکم کے قوانین کی مخالف کرتا تھا تو اس کو سزا دینے کے لئے حاکم اپنی جسمانی طاقت سے استفادہ کرتا تھا لہٰذا طے یہ ہوا کہ اس زمانہ میں طاقت سے مراد صرف ظاہری اور جسمانی طاقت مراد ہوتی تھی۔

لیکن جب سے انسانی معاشرہ کے مسائل پیچیدہ تر ہوتے گئے اور معاشرہ نے ترقی کی تو اس وقت ایک شخص کی طاقت نے ایک کمیٹی کی صورت اختیار کرلی؛ یعنی اگر خود حاکم میں جسمانی طاقت کافی مقدار میں موجود نہ ہو تو اس کے پاس ایسے افراد ہونا چاہئے جو جسمانی اعتبار سے بہت زیادہ طاقتور اور قوی ہوں اس حاکم کے پاس طاقتور لشکر ہونا ضروری تھا، لیکن اس کے بعد جب علم ودانش نے ترقی کی تو پھر قدرت اپنے ظاہری اور فیزیکی شکل سے نکل کر علمی اور ٹیکنالوجی شکل میں تبدیل ہوگئی یعنی گویا حاکم کے پاس ایسے اسلحے وآلات ہوں جن کے ذریعہ بدنی طاقت کا کام لیا جاسکے۔

اگر چہ ایک موقع پر حاکم کو معاشرہ کا ادارہ کرنے کے لئے اس کی جسمانی طاقت ہی کافی تھی لیکن جیسے جیسے معاشرہ نے علم وفن میں ترقی کی اور بہت سے فوجی اسلحہ بنائے تو پھر حکومت کے لئے بھی ضروری ہوگیا کہ وہ بھی فیزیکی، صنعتی اور ٹکنالوجی خصوصاً فوجی اسلحہ جات کافی مقدار میں رکھتی ہو، تاکہ خلاف ورزی کا سد باب کیا جاسکے، اور اگر کچھ لوگ شورش اور بغاوت کرنا چاہیں تو آسانی سے ان کا سر کچل دیا جائے، یا اگر کچھ لوگ دوسروں کی جان ومال کے لئے خطرہ بن رہے ہوں تو اپنی طاقت کے ذریعہ ان کو روک سکے۔

۷۔ عوام الناس میں حکومت کی مقبولیت ضروری ہے۔

جس طاقت وقدرت کے بارے میں ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا وہ جسمانی اور فیزیکی طاقت میں منحصر تھی، جو ابتدائی حکومتوں میں ہوتی تھی، اس کے بعد پیشرفتہ حکومتوں میں مورد توجہ ہوتی تھی یہاں تک کہ آج کل اسی معنی میں استعمال ہوتی ہے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتیں اپنی طاقتوں کو بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں، ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے اسلحہ خانہ کو جدید اور اہم اسلحوں سے بھرلیں تاکہ موقع پڑنے پر ان سے کام لیا جاسکے لیکن یہ توجہ رہے کہ حکومت کی طاقت اور اس کا اقتدار صرف اسی چیز میں منحصر نہیں ہے؛ بلکہ پیشرفتہ معاشرہ میں حکومت کی طاقت کو معاشرہ میں نفوذ اور لوگوں کی مقبولیت کو پہلا

---

[1] مثلاً ہزاروں سال قبل تقریباً دنیا بھر میں قبائلی حکومتیں ہوا کرتی تھیں۔

درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ حکومت اپنے تمام پروگراموں اور اپنی خواہشات کو قوت بازو کے زور پر معاشرہ میں نافذ نہیں کرسکتی؛ اصل یہ ہے کہ عوام الناس اپنی خوشی اور رغبت کے ساتھ مقررات اور قوانین کو قبول کریں اور قوانین کے سامنے گردن جھکائیں لہٰذا طے یہ ہوا کہ جو شخص بھی قوانین کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ٹھہرے یا سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو تو عوام الناس میں اس کی مقبولیت ضروری ہے، اور ظاہری طاقت اور قوت بازو کی بنا پر کبھی بھی ایک طولانی مدت کے لئے حکومت باقی نہیں رہ سکتی۔

پس طے یہ ہوا کہ قوانین کا جاری و نافذ کرنے والا طاقتور اور معاشرہ میں مقبولیت رکھتا ہو، یہی وجہ ہے کہ مدیریت میں بدنظمی سے روک تھام اور معاشرہ کے فوائد کو نابودی سے بچانے کے لئے حکومت کے ذمہ دار افراد میں خاص صفات کا ہونا ضروری ہے تاکہ حکومت اور قانون کے اہداف و مقاصد کو پورا کرسکیں؛ یعنی حقیقت میں حکومت کے ذمہ دار افراد اور قانون کے نافذ کرنے والے ضامن افراد کے لئے ایک خاص صلاحیت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ اس بات کو سیاست کے فلسفہ میں مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے جس کو معمولاً اجتمائی مشروعیت اور عام مقبولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی حکومت عقلائی طریقہ کار کو اپنائے اور قوانین کو نافذ کرنے میں صحیح طریقہ بروئے کار لائے، اور عوام الناس بھی اس کے لئے قانونی اعتبار کے قائل ہوں قوانین کو نافذ کرنے والے ذمہ دار افراد کے لئے صاحب اقتدار ہونے کے ساتھ ساتھ (تاکہ قوانین کی مخالفت سے روک تھام ہوسکے) عوام الناس بھی ان کے اعتبار کے قائل ہوں اور حکومت کو انہیں کا حق سمجھے۔

قارئین کرام! خلاصہ یہ ہوا کہ اقتدار کی تین قسمیں ہیں پہلی اور دوسری قسم دوسرے تمام ہی معاشروں میں جانی پہچانی ہیں، اگرچہ ان کو جاری کرنے کے سلسلہ میں مختلف قسم کے نظریات اور طریقہ کار پائے جاتے ہیں، لیکن ہماری نظر میں جس چیز کی زیادہ اہمیت ہے وہی تیسری قسم کا اقتدار (مقبولیت عام) ہے۔

پچیسویں نشست

حکومت کی عظیم منصوبہ بندی

(دوسرا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے اس سے قبل بھی یہ بات عرض کی تھی کہ مغربی ممالک کے منحرف اور الحادی نظریات کا ذہن اور اسلامی اعتقادات پر اثر انداز ہونا، اسی طرح مغربی ممالک کے پٹھوؤں، غلاموں وغیرہ کی اسلامی معاشرہ اور دینی اعتقادات میں شک وتردید ایجاد کرنے کے لئے بھر پور اور حساب شدہ کوششیں کرنا، نیز اسلام کی اصل ثقافت اور کلچر میں سیاسی اور ثقافتی مشکلات کا ایجاد کرنا، یہ تمام چیزیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ اسلام کے مفکرین اور اسلام کے محافظ افراد جو کہ اسلام کی گھری معلومات اور وسیع ثقافت سے واقف بھی ہوں ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور اس سلسلہ میں اساسی، بنیادی اور مفید گفتگو کا آغاز کریں منجملہ "اسلامی سیاسی نظریہ" وغیرہ کو سادہ اور روان الفاظ میں اسلامی معاشرہ کے سامنے پیش کریں، جو علی القاعدہ تخصصی، فنی اور اکیڈمیک طریقہ پر یونیورسٹیوں میں بیان ہوتی ہے۔

اس وقت ہمارے معاشرہ کو اسلام کی ہمیشگی ثقافت، کلچر اور عظیم میراث کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ دشمنان اسلام کے ثقافتی حملوں کا مقابلہ کیا جاسکے، اور ان چیزوں کو اپنی آئندہ نسل میں صحیح وسالم چھوڑ کر جائے، جو اسلامی اور انقلابی اہداف کے لئے بہت ہی زیادہ ضرورت مند ہیں لہٰذا اس ہدف تک پہنچنے کے لئے علمی اور باریک مسائل کو آسان زبان میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اکثر عوام الناس اس کو سمجھ کر ھضم بھی کرسکے، اور ان کو علمی اور مشکل اصطلاحات میں پھنسنے سے نجات بھی مل جائے۔

چنانچہ ہم نے مذکورہ ہدف کے پیش نظر یہ طے کیا کہ اس طرح کے مسائل "اسلامی سیاسی نظریہ" کے تحت دو حصوں میں بحث کریں جس کا پہلا حصہ مکمل ہو چکا ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا کہ انسانی معاشرہ کے لئے قانون کی ضرورت ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ اسلامی نقطہ نظر سے قانون کا بنانے والا صرف خدا یا وہ افراد جو خداوند عالم کی طرف سے اذن یافتہ اور قانون گذاری کی کافی ووافی صلاحیت رکھتے ہوں چنانچہ اس سلسلہ میں بحث ہو چکی ہے، ضمناً اس سلسلہ میں ہوئے عتراضات کے بھی نشستوں کے لحاظ سے جوابات دیئے گئے۔

اور ہماری بحث کا دوسرا حصہ حکومت بمعنی خاص کے سلسلہ میں ہے، درحقیقت پہلے حصے میں حکومت بمعنی عام (جس میں قوہ مقننہ (پارلیمنٹ) بھی شامل تھی) کے بارے میں گفتگو ہوئی جس کے تحت قانون اور قانون گذاری کے سلسلہ میں بحث ہوئی لیکن اس وقت ہماری بحث حکومت بمعنی خاص؛ یعنی قوہ مجریہ کے بارے میں ہے۔

2۔حکومت، انسانی معاشرہ کی دائمی اور ہمیشگی ضرورت ہے۔

حکومت کی مختلف شکل وصورت اور ڈھانچوں کو چھوڑتے ہوئے (کیونکہ اس کی بحث اپنی جگہ ہوگی) جیسا کہ ہم نے پہلے جلسہ میں بھی اشارہ کیا؛ تمام سیاسی صاحب نظر افراد، معاشرہ کے لئے حکومت پر اتفاق رائے رکھتے ہوئے اس کو ضروری مانتے ہیں صرف "آنارشیسٹ" "Anarchiste" (مفسدہ جویان) معاشرہ کے لئے حکومت کے قائل نہیں ہیں، یونانی قدیم فلسفہ کے زمانہ میں اس گروہ کے طرفدار پائے جاتے تھے، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر عوام الناس قوانین کو پہچانے اور اخلاقی عہد پر عمل کریں تو پھر ان کو حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تھیوری کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ عملی نہیں ہوئی جبکہ اس کے مقابلہ میں عملی طور پر تمام معاشروں میں حکومت کی ضرورت کا احساس ہوا، اور یہ احساس اسی طرح سے آج تک باقی ہے۔

ہم اپنے بھائیوں کے لئے حکومت کی ضرورت کے نظریہ کو مزید روشن کرنے اور ان کو بعض مغالطوں کے جال میں پھنسنے سے بچانے کے لئے عرض کرتے ہیں کہ مذکورہ نظریہ پر سب کا اتفاق ہے اور انسانی معاشرہ کی واقعیات کی شناخت پر مبنی ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مخلوقات، روحیات، معاشرہ کے نشیب وفراز اور واقعیت سے آنکھیں بند کر کے ایک بند کمرہ میں اس چیز پر تجزیہ وتحلیل کرے اور انسانوں کو بالکل فرشتوں جیسا تصور کرے جو خیر خواہی اور فضائل کے حصول میں لگے ہوئے ہیں اور پاک وپاکیزہ خصلت وعادت کے مالک ہیں اس کی نظر میں اگر تعلیم کا نظام اور صحیح تربیت عام ہوجائے اور عوام الناس تربیتی لحاظ سے مودب ہوجائیں کہ اپنے اخلاقی خواہشکے تحت قانون کے سلسلے میں عہد کریں اور اس پر عمل کریں اور (کبھی بھی) مخالفت نہ کریں، اسی طرح اگر صحیح قوانین اور معاشرہ یا شخص کے فوائد، نیز قانون شکنی کے مفاسد ونقصانات عوام الناس کے لئے بیان ہوجائیں، اور پھر صحیح راستہ کا انتخاب ان کے اوپر چھوڑ دیا جائے تو پھر کوئی بھی شخص قانون کی مخالفت نہیں کرے گا بلکہ قوانین کے مطابق عمل کرے گا بالکل اسی شخص کی طرح جس کو یہ معلوم ہو کہ اس کھانے میں زہر ملا ہوا ہے تو وہ اس کھانے کو نہیں کھائے گا، اسی طرح عوام الناس بھی ایسے کام کریں گے جو ان کے مفاد میں ہوں اور وہ کام جو ان کے یا معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہوں گے ان کو انجام نہیں دیں گے لہٰذا حکومت اور قوانین کو تحمیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔!!

قارئین کرام! مذکورہ نظریہ ایک خیالی پلاؤ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کیونکہ جو لوگ انسانی زندگی اور معاشرتی زندگی کی واقعیات سے باخبر ہیں یا وہ افراد جو تاریخ بشریت اور گذشتہ معاشروں کی تاریخ سے مطلع ہیں، ہرگز یہ احتمال نہیں دے سکتے کہ

کم سے کم آئندہ نزدیک میں اس طرح کا ماحول پیدا ہو جائے گا کہ لوگوں کے درمیان اخلاقی اقدار کے رائج اور پھیلنے کے بعد تمام لوگ آٹومیٹک طریقہ پر نیک کام کرتے ہوئے نظر آنے لگیں، اور ان کو برے کاموں کی ہوا تک نہ لگے، کوئی بھی جھوٹ نہ بولے، خیانت نہ کرے، لوگوں کے مال اور ناموس (عورتوں) کی طرف بری نظر نہ اٹھائے، لوگوں کے حقوق پر تجاوز اور ظلم نہ کرے اسی طرح بین الاقوامی مسائل کے سلسلہ میں کوئی ملک اپنے پڑوسی ملک پر ظلم نہ کرے!!

3۔ حکومت کی ضرورت پر اسلام اور قرآن کا نظریہ

اسلام نے بھی بغیر حکومت کے معاشرہ کو (کہ اس کی صحیح تربیت ہو جائے نیز مصالح و مفاسد اور قوانین کے آشنائی ہونا کافی ہے) ایک خیال خام اور حقیقت سے دور بیان کیا ہے، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت سے متعلق آیات میں، خلقت انسان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ انسان کے نقاط ضعف اور اس میں خطا و لغزش کا امکان ظاہر ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. [1]

"اے رسول! اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ کیا اسے بنائے گا جو زمین پر فساد برپا کرے اور خونریزی کرے جب کہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو" جس وقت فرشتوں نے انسان کے بارے میں اجتماعی فساد اور خونریزی کے بارے میں خبر دی تو خداوند عالم نے اس کا انکار نہیں کیا بلکہ ان کے جواب میں انسانی خلقت کی حکمت کی طرف اشارہ کیا جس سے فرشتہ باخبر نہیں تھے۔

اسی طرح دوسری آیات میں انسان کی بعض کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے، منجملہ یہ آیات:

1۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾. [2]

"بیشک انسان بڑا لالچی پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف چھو بھی گئی تو گھبرا گیا اور جب اسے ذرا فراخی حاصل ہوئی تو بخیل بن بیٹھا"

2۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ. [3]

"بے شک انسان بڑا ظالم اور انکار کرنے والا ہے۔"

واقعاً یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ مذکورہ آیت میں خداوند عالم نے انسان کو "ظلوم" کے نام سے پہچنوایا ہے جو مبالغہ کا

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۳۰

[2] سورۂ معارج آیات ۱۹ تا ۲۱

[3] سورۂ ابراہیم آیت ۳۴

صیغہ ہے اور بہت ظلم کرنے والے کے معنی میں ہے اور انسان کو اس نام سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر ظلم، سرکشی اور ناشکری اس قدر ہے کہ اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا اور ہمیشہ انسانی معاشرہ ظلم اور ناشکری سے بھرا ہوا ملے گا، تو پھر یہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے کہ تعلیم و تربیت اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا ہے جس میں تمام افراد کا اچھا اور پسندیدہ کردار ہو، اور کوئی ایک انسان بھی قوانین اور اخلاقی اقدار سے سرپیچی نہیں کرے گا، اور اس صورت میں حکومت اور طاقت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید بھی اس نظریہ کا مخالف ہے، جبکہ موجودہ حقائق نے بھی یہ بات واضح کردی کہ انسانی معاشرہ میں مختلف وجوہات کی بنا پر ہمیشہ جرائم اور مخالفت رہی ہے البتہ بعض افراد نے جرائم کے اسباب اور جرائم کی وجوہات کے بارے میں پتہ لگایا ہے اور جہل و نادانی اور وراثتی عوامل وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن اس وقت ہم اس کو بیان نہیں کرنا چاہتے، ہم تو یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان قانون کی مخالفت اور جرائم اور گناہ کا ارتکاب ہمیشہ رہا ہے جس کے پیش نظر آسانی کے ساتھ یہ پیشن گوئی بھی کی جاسکتی ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خداوند عالم کے لطف و کرم سے ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ہاتھوں ایک اسلامی نمونہ معاشرہ تشکیل پائے گا لیکن پھر بھی اس بات پر توجہ رہے کہ اس زمانہ میں بھی قوانین کی مخالفت اور گناہ انجام دیئے جائیں گے، اس کے علاوہ وہ معاشرہ بھی ہمیشہ نہیں رہے گا یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت ولی عصر امام زمانہؑ کی مخالفت میں قیام کیا جائے گا اور آپؑ کو شہید کردیا جائے گا۔

پس ہمیں اس چیز کی توقع نہیں رکھنا چاہئے کہ حضرت امام مہدی (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے زمانہ حکومت میں ایک نمونہ اور مطلوب معاشرہ تشکیل پائے گا جو گناہ اور نافرمانی سے بالکل پاک و پاکیزہ ہوگا البتہ امام علیہ السلام کی حکومت اور طاقت کا استعمال اس طریقہ سے ہوگا کہ اس میں کسی طرح کے ظلم و جور کو بغیر جواب دیئے نہیں چھوڑا جائے گا نیز اس زمانہ میں عدالت عام ہوجائے گی، اسی بنا پر معاشرہ میں جرائم و گناہ کم ہوجائیں گے، لیکن بالکل ہی ان کا خاتمہ نہیں ہوگا؛ کیونکہ انسان فرشتوں کی طرح نہیں بن سکتا، اور اس کی فطرت انسانی رہے گی، اس میں گناہ و عصیان اور جرائم کے امکانات پائے جائیں گے۔

لہٰذا طے یہ ہوگیا کہ ان تمام حقائق کے پیش نظر حکومت کا ہونا ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنے محدود ذہن میں اس طرح کے معاشرہ کا تصور کرے کہ اخلاقی اور تربیتی ترقی کے بعد ایک ایسا معاشرہ پیدا ہوجائے جس میں کسی بھی طرح کا کوئی ظلم و فساد نہ ہو تو یہ بات حقیقت جامعہ سے بہت دور ہے واقعاً عوام الناس کے درمیان جائے اور ان کے کاموں کا مشاہدہ کرے کہ کس طریقہ سے نیکیوں اور اچھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی گناہ و انحراف کا شکار ہوجاتے ہیں کیونکہ جو لوگ اخلاقی مسائل کو اہمیت نہیں دیتے ان کی بات تو الگ ہے جو افراد نیک اور اچھے ہوتے ہیں ان سے بھی کبھی کبھی گناہ اور مخالفت ہوجاتی ہے تو پھر یہ بات ظاہر ہے کہ جرائم اور تخلفات کی روک تھام کے لئے معاشرہ میں مناسب اور شائستہ

قوانین کا نفوذ ضروری ہے، کیونکہ جب معاشرہ میں قوانین نافذ ہونے کے لئے بنائے گئے ہیں تو پھر ان کو نافذ کرنے والے ضامن کی ضرورت ہے حکومت کے وجود کے لئے سب سے عمدہ اور بہترین دلیل؛ معاشرہ میں مختلف طریقوں سے قوانین کو نفوذ کرنے کی ضمانت ہے، اور اسی چیز کو ہم بیان کرنا چاہتے ہیں، انشاء اللہ ہم اپنی آئندہ بحث میں حکومت یا حکومتی شعبہ جات وغیرہ کی ذمہ داریوں اور اس کے اختیارات کی بحث کریں گے

4۔ طاقت وقدرت کی ضرورت

قارئین کرام! قانون بغیر متولی کے نہ رہے اور ان کی تعطیل نہ ہوجائے اور جرائم وخلاف کاریوں کی روک تھام کی جاسکے، اسی طرح معاشرہ کے امن وامان کو خطرہ میں ڈالنے کی سازشوں کا سد باب کیا جاسکے اور اسی طرح ملک اور اسلامی معاشرہ پر خارجی دشمنوں کے ہجوم کو روکا جاسکے تو ان تمام چیزوں کے لئے ایک طاقتور حکومت کا ہونا ضروری ہے، تاکہ قوانین کو جاری کرنے، دیگر امور کی تشریح، عقائد اور اقدار کی حفاظت کرنے اسی طرح معاشرہ کی اندورنی اور بیرونی امنیت کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری کو نبھا سکے اسی وجہ سے سیاسی فلسفہ میں "مفہوم قدرت" کو ایک بنیادی مفہوم قرار دیا گیا ہے یہاں تک ان لوگوں کے نزدیک بھی جنھوں نے "سیاست" کو "علم قدرت" سے تعبیر کیا ہے۔ اب جبکہ حکومت اور قوہ مجریہ کا وجود ثابت ہوگیا اور یہ بھی بیان ہوگیا کہ حکومت کا صاحب اقتدار اور صاحب طاقت ہونا ضروری ہے، یہ سوال پیش آتا ہے کہ قدرت کا سرچشمہ کیا ہے؟ اور کس بنیاد پر حکومت کے عہدہ دار قدرت اور اقتدار رکھتے ہوں تاکہ جرائم سے روک تھام اور قوانین کو نافذ کرنے کی ذمہ داری کو پورا کرسکیں؟ چنانچہ فلسفہ سیاست کے بارے میں بہت زیادہ فنی اور خاص بحثیں ہوئی ہیں لیکن ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو روان اور سادہ زبان میں عرض کرتے ہیں۔

انسانی معاشرہ میں ہمیشہ سے بعض افراد بعض وجوہات کی بنا پر مثل کم عقلی، (ادواری) جنون، بری تربیت یا اسی طرح کی دوسری چیزوں کی بنا پر جرائم کے مرتکب ہوتے رہے ہیں، مثلاً کسی جگہ آگ لگادیتے ہیں، چاقو یا روالور کے ذریعہ کسی بے گناہ انسان پر حملہ آور ہوجاتے ہیں اسی طرح دوسرے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں کہ الحمد للہ ہمارے ملک میں جرائم کی تعداد کم ہے لیکن آج کے ترقی یافتہ ممالک (یورپ اور امریکہ وغیرہ) میں جرائم کی تعداد کہیں زیادہ ہے؛ جیسا کہ بعض معتبر اخباروں کے ذریعہ یہ خبر ملی تھی کہ کسی ایک ملک کے پائے تخت میں ہر ایک منٹ میں کئی قتل ہوتے ہیں یا ایک دوسرے ملک کی پائے تخت میں ہر آدھے منٹ میں ایک قتل ہوتا ہے اور یہ رپورٹ ان ملکوں کے سرکاری اخباروں کے ذریعہ نشر ہوتی ہے، دراگر ہمارے 60 ملین افراد والے ملک میں کبھی کوئی قتل ہوجاتا ہے تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ کیوں ہمارے اسلامی ملک میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا!!

خلاصہ یہ کہ اس طرح کے جرائم اور خلاف ورزیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے حکومت ظاہری اور مادی طاقت رکھتی ہو جس وقت کسی بے گناہ انسان پر ظلم وستم ہو، یا کسی پر شدت سے تجاوز ہوتا ہے یا کسی جگہ پر چوری ہوتی ہے یا ڈاکا پڑتا ہے، تو

ایسے مقامات پر حکومت کے بعض افراد (پولیس) اپنی بھرپور طاقت کے ذریعہ ان جرائم کا مقابلہ کریں تاکہ قوانین کے نفاذ کی ضمانت ہو سکے۔

قارئین کرام! قوانین کو جاری کرنے اور ان کی ضمانت کے امکان کے لئے نیز مجرموں سے مقابلہ کرنے کے لئے پہلی شرط ظاہری، مادّی اور جسمانی طاقت کا ہونا ضروری ہے اگرچہ ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ اسلحہ وغیرہ میں بھی ترقی ہوئی ہے جن کی وجہ سے مجرموں کے ہاتھوں میں نئے نئے قسم کے اسلحے ہوتے ہیں، اسی طرح ادھر حکومت نے بھی مجرموں کو سزا دینے کے لئے الکٹرانک مشینیں ایجاد کرلی ہیں، لیکن پھر بھی ان قوانین کو جاری کرنے والے کے لئے جسمانی طاقت سے بہرہ مند ہونا ضروری ہے چنانچہ اسی ضرورت کے تحت تمام حکومتوں کے پاس چاہے چھوٹی ہوں یا بڑی، ترقی یافتہ ہوں یا غیر ترقی یافتہ؛ تمام کی تمام ان جرائم اور ظلم وستم سے مقابلہ نیز اندرونی امنیت کی برقراری کے لئے پولیس کا انتظام کرتی ہے اور ان کو اپنے حساب وکتاب سے اسلحہ وغیرہ دیتی ہے اور حکومت جتنی چھوٹی ہوگی اس کے پاس اسلحہ وغیرہ سادہ اور کمتر ہوگا اور اگر حکومت بڑی، ترقی یافتہ اور پیچیدہ تر ہوگی اسی حساب سے اس کی پولیس بھی جدید طریقہ اور ترقی یافتہ اسلحوں سے لیس ہوگی۔

اس بنا پر ہر ملک کی پولیس کا مختلف قسم کے تمام تر اسلحوں سے لیس ہونا ضروری ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت بغیر قدرت کے عملی طور پر قوانین کو نافذ نہیں کرسکتی لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہر معاشرہ میں قوہ قھریہ (پولیس) کا ہونا ضروری ہے تاکہ جرائم پیشہ لوگ اس سے ڈریں اور جرائم کے قریب نہ جائیں اور اگر جرائم کے مرتکب ہوگئے ہیں تو ان کو سزا مل سکے۔

5۔ مدیروں میں تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت ہونا ضروری ہے

قارئین کرام! اب تک کی باتوں سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ قوانین کو نافذ کرنے، امن وامان کو باقی رکھنے، جرائم اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز سے روک تھام کے لئے حکومت کے پاس سبھی طرح کی طاقت کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ بھی توجہ رکھنا ضروری ہے کہ اس عہدہ کی حفاظت اور قوانین کو نافذ کرنے اور اس کی ضمانت کے لئے صرف جسمانی اور اسلحہ کی طاقت اور مادّی مہارتیں کافی نہیں ہیں بلکہ وہ شخص جو قوانین جاری کرنے کے لئے منتخب ہو اور اس ہدف کی خاطر ضروری امکانات اور اسلحہ جات اس کے اختیار میں دیئے جائیں تو اس کو صاحب تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت کا مالک ہونا چاہئے، کیونکہ اگر کوئی صاحب تقویٰ نہ ہو تو جو طاقت اس کے اختیار میں دی گئی ہے نہ صرف یہ کہ فائدہ نہیں دے گی بلکہ اس سے معاشرہ کا نقصان ہوگا اور معاشرہ کے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں، کیونکہ وہ اس طاقت اور قدرت سے سوء استفادہ کرے گا اسلامی انقلاب کی کامیابی سے پہلے اور ملت ایران کے شاہ سے مقابلہ کے دوران حضرت امام خمینی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک بیان میں فرمایا جس کا مضمون یہ ہے کہ اسلحہ نیک اور شائستہ افراد کے ہاتھوں میں دیا جائے، تاکہ شاہ سے مقابلہ کے دوران، ان کا ہدف عوام الناس کے حقوق دلانا اور اسلام کی حاکمیت کو برقرار رکھنا ہو، نہ یہ کہ وہ صرف قدرت پر قبضہ کرنا چاہیں؛ لیکن اگر اسلحہ غیر شائستہ لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا، تو در حقیقت یہ قدرت؛ طاقتور شیطان کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے کہ جس کا

نتیجہ معاشرہ میں فتنہ وفساد اور تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ صرف ظاہری قدرت معاشرہ کے منافع ومصالح کی ضامن نہیں ہوسکتی، بلکہ جو شخص قوانین کو جاری کرے اور قدرت کو اپنے ہاتھوں میں لے تو اس میں مادّی اور ظاہری مہارت کے علاوہ تقویٰ اور اخلاقی شائستگی کا ہونا ضروری ہے پس اس صورت میں حکومت اپنے تمام تر امکانات اور طاقت وقدرت کے ساتھ، نیز ان امکانات سے صحیح طریقہ سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کے لئے صحیح رجحان کے تحت اپنی پوری طاقت صرف کردے، اور میدان عمل میں ہویٰ وہوس اور ذاتی مفاد کا شکار نہ ہولیکن اگر کوئی شخص تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت سے بہرہ مند نہ ہو، اور اس کے ہاتھ طاقت اور مادّی امکانات آجائیں تو اس کو غرور ہوجاتا ہے اور ہویٰ وہوس، شیطانی خواہشات اور جاہ طلبی وغیرہ کے لئے اس قدرت کو استعمال کرنے لگتا ہے، جس کے نتیجہ میں صحیح راستے سے منحرف ہوجاتا ہے اور معاشرہ میں تباہی وبربادی کے علاوہ کچھ اور نہیں کرپاتا اس صورت میں معاشرہ میں اس کا نقصان اور ضرر عام تباہ کار سے زیادہ ہوتا ہے؛ جیسا کہ فاسد بادشاہ جس ظلم وبربریت کے مرتکب ہوتے ہیں اس کا دوسرے جرائم سے مقائسہ اور مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

البتہ قانون کا جاری کرنے والا، قانون اور اس کے مختلف پہلوؤں کی بحد کافی شناخت رکھتا ہو؛ کیونکہ حکومت قانون کو جاری کرنے کے لئے ہوتی ہے اور حکومتی افراد جس عہدہ پر بھی ہوں؛ قانون کے مجری ہونے کے ناطے قانون سے بحد کافی آگاہی رکھتے ہوں ورنہ تو اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہے اور قانون پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہو، لیکن چونکہ قانون سے صحیح طریقہ سے آشنا نہیں ہے مقام عمل میں غلطی کا امکان پایا جاتا ہے، اسی طرح قانون کو اس کے مصداق پر تطبیق کرنے پر بھی قادر نہیں ہوسکتا، درحالیکہ ایسا شخص بری نیت بھی نہیں رکھتا اور اخلاقی صلاحیت سے بھی بہرہ مند ہوتا ہے لیکن چونکہ قانون کے بارے میں علم نہیں رکھتا اور قانون سے صحیح نتیجہ بھی نہیں نکال سکتا جس کے نتیجہ میں منحرف ہوجائے گا اور غلط راستہ پر چل پڑے گا اور عملی میدان میں معاشرہ کے منافع کو پامال کردے گا۔

بنابریں مجری قانون کو قانون سے آشنا ہونا چاہئے، وہ قانون جاری کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو اور تقویٰ واخلاقی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ البتہ متون دینی میں فقیہ کے لئے یہ تین شرطیں قانون جاری کرنے کی قدرت اور مدیریت بیان کی گئی ہیں، لیکن ان تینوں کلی شرطوں کے بہت سے اجزاء ہیں کہ ہم اس وقت ان کو بیان نہیں کررہے ہیں چونکہ ہم کلیات بیان کررہے ہیں جزئیات نہیں۔

6۔ فلسفہ سیاست میں حکومت کی مشروعیت

قارئین کرام! اس سلسلہ میں ایک بحث کا بیان کرنا مقصود ہے جیسا کہ گذشتہ جلسہ میں بھی اس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حکومت کی مشروعیت (حق حکومت) اور اس کے قانونی ہونے کا معیار وملاک کیا ہے؟ لہٰذا اس چیز کی تحقیق اور جائزہ لینا ضروری ہے کہ کن معیار کے تحت ایک ملت کی حکومت کو کسی شخص یا کسی پارٹی کے سپرد کی جاسکتی ہے تاکہ وہ

قدرت سے استفادہ کر سکے واقعاً یہ بحث فلسفہ سیاست کی ایک اصل اور بنیادی بحث ہے اور اس کو مختلف نظریات کی بنا پر مختلف طریقہ سے مورد بررسی وتحقیق قرار دیا گیا ہے اور اس کو بیان کرنے کے لئے بھی مختلف تعبیریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک تعبیر "قدرت اجتماعی" کے نام سے موجود ہے جسے عوام الناس تسلیم نہیں کرتی، یعنی حکومتی افراد کے اندر مادّی وجسمانی اور مدیریت کی قدرت کے علاوہ ایک دوسری قدرت بھی ہو جس کو "قدرت اجتماعی" کہا جاتا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ حکومت قدرت اجتماعی کی مشروعیت اور قانون کو جاری کرنے کا حق کہاں سے حاصل کرتی ہے؟ ایک چہ کروڑ افراد کی آبادی میں بہت اہم شخصیات، ماہر افراد اور شائستہ افراد ہوتے ہیں، ان میں سے کس طرح ایک شخص حکومت کی لگام کو ہاتھ میں لے سکتا ہے؟ کون اس قدرت کو اس کے حوالہ کرتا ہے؟ بنیادی طور پر حکومت اور اس کے ذمہ دار افراد کی مشروعیت (اور جواز حکومت) کہاں سے آتی ہے؟

اس سلسلہ میں مختلف صاحب نظروں نے مختلف جوابات دیئے ہیں، لیکن آج کی دنیا میں رائج اور متفق علیہ جواب یہ ہے کہ حکومت یا رئیس حکومت کو یہ طاقت عوام الناس دیتی ہے گویا یہ قدرت عوام الناس کے ارادہ ومرضی سے کسی کو دی جاتی ہے، اور اگر کوئی شخص اس قدرت پر کسی دوسرے راستہ سے قابض ہو جاتا ہے وہ قدرت مشروعیت نہیں رکھتی اس قدرت کو کسی شخص کے لئے اپنے آباء واجداد سے ارث میں لینا ممکن نہیں ہے؛ جیسا کہ (انقلاب سے پہلے) شاہ کی حکومت کا یہ نظریہ تھا کہ قدرت اور حکومت میراثی ہے مثلاً جب کوئی سلطان اس دنیا سے جائے تو اس کا بیٹا میراث کے عنوان سے اس پر قابض ہو جائے اور اس میں عوام الناس کا کوئی کردار نہ ہو اگر چہ حکومت کا یہ طریقہ آج بھی بعض ملکوں میں رائج ہے، لیکن آج کی دنیا میں موجود کلچر اس سسٹم کو قبول نہیں کرتا اور یہ تھیوری عام لوگوں کی نظر میں قابل قبول نہیں ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص عوام الناس پر حکومت کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے تو اس کا بیٹا بھی وہی صلاحیت اور شائستگی رکھتا ہو اس کے علاوہ عوام الناس اس طریقہ کار کو اچھا نہیں سمجھتی، بلکہ اس کے خلاف دیکھنے میں آیا ہے اور بہت سے ایسے موارد دیکھے گئے ہیں جن میں میراثی حاکم سے بہتر اور مناسب افراد موجود ہو جاتے ہیں۔

قارئین کرام!

چونکہ بادشاہت اور سلطنت کا سسٹم آج کے زمانہ میں قابل قبول نہیں ہے اور اس کی مخالفت بھی ہوتی رہی ہے، کیونکہ بعض بادشاہی نظام میں اس طرح کی کوشش کی گئی ہے کہ بادشاہت برائے نام باقی رہ گئی، اور بادشاہ سے قدرت چھن گئی ہے اور جو شخص عوام الناس کا منتخب شدہ ہوتا ہے مثلاً وزیر اعظم؛ یہ طاقت اس کے حوالہ ہو جاتی ہے در حقیقت ان ممالک میں صرف بادشاہت کا نام باقی ہے جب کہ واقعی قدرت اس سے چھن چکی ہے۔

پس عام عقیدہ اور آج کل کے زمانہ میں رائج ڈیموکریٹک "Democratic" نظام کے تحت جو شخص حکومت کرنے کی صلاحیت اور قوانین کو نافذ کرنے کی طاقت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے وہ عوام الناس کا منتخب شدہ ہو، اور صرف عوام الناس کے

ارادہ ومرضی کے ذریعہ حکومت مشروعیت پیدا کرتی ہے البتہ عوام الناس کا طریقہ انتخاب اوران کے نظریات مختلف ہوتے ہیں، اوراس سلسلہ میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، مثلاً بعض ممالک میں صدر حکومت کو عوام الناس اپنی اکثریت سے براہ راست انتخاب کرتی ہے، جبکہ بعض ملکوں میں حکومت کے رئیس کو پارٹیاں اور پارلیمنٹ کے ممبران انتخاب کرتے ہیں، در حقیقت ممبر آف پارلیمنٹ عوام الناس اور رئیس حکومت کے درمیان واسطہ کے کام کرتے ہیں بہر حال جو شخص براہ راست یا بالواسطہ عوام الناس کی اکثریت سے انتخاب ہوتا ہے اس کو حکومت اور قدرت مل جاتی ہے اوراس کے بعد وہ اجرائے قانون کی سب اہم شخصیت اور معاشرہ کی رہبری اور ہدایت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔

البتہ عوام الناس کی طرف حاکم کو حکومت دینا ایک ظاہری اور فیزیکی چیزوں میں سے نہیں ہے کہ مثلاً عوام الناس اپنے پاس سے کوئی چیز نکال کراس حاکم کو دیں یااس کے جسم میں کوئی خارق العادہ طاقت ایجاد کریں بلکہ یہ حکومت غیر مادّی ہے جو عوام الناس کی موافقت سے حاکم کے لئے وجود میں آتی ہے لہٰذا اسی قرارداد کے تحت یہ عہد کیا جاتا ہے کہ مثلاً دو سال، چار سال، سات سال یہاں تک کہ زندگی بھر کے لئے (ان قوانین کے تحت جو آج کے زمانہ میں مختلف ممالک میں رائج ہیں) ان کا حاکم مقرر ہو، اور عوام الناس اپنے منتخب شدہ حاکم کے فرمان کے تحت باقی رہیں۔

اس فرضیہ کے مطابق حکومت اور قوانین کا مجری، عوام الناس سے اپنی قدرت حاصل کرتا ہے، اور اگر عوام الناس کے موافق نہ ہو تو پھر وہ (صحیح) کام نہیں کرسکتا اس نظریہ اور تھیوری کے لئے مختلف دلائل پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض فلسفی ہیں، بعض انسانی معرفت کے پہلو رکھتے ہیں اور بعض صرف اعتباری ہوتے ہیں یا عینی اور خارجی تجربوں کی بنا پر قائم ہوتے ہیں؛ یعنی تجربہ اور مختلف حکومتوں کی شکلوں کے مشاہدہ کے بعد اس قسم کی حکومت کو بہترین اور مفید ترین طریقہ قرار دیا گیا ہے۔

قارئین کرام!

یہ بات قابل توجہ ہے کہ عوام الناس کی طرف منتخب شدہ شخص کو قدرت دینے کے طریقہ کار اوراس کی تحقیق و بررسی کے لئے ایک طولانی گفتگو درکار ہے کہ اگر خداوند عالم نے توفیق دی تو اس سلسلہ میں بعد میں بیان کریں گے (انشاء اللہ) لیکن یہاں پر صرف مختصر طور پر عرض کرتے ہیں کہ مشروع حکومت تشکیل ہونے کے بعد عوام الناس کا حکومت کے قوانین کو قبول کرنا ضروری ہے اوراس کی فرمانبرداری اور اطاعت پر موافقت کریں اس مطلب پر قبل اس کے دوسرے مکاتب اور مذاہب بیان کریں اسلام نے بیان کرتے ہوئے قبول کیا ہے عوام الناس کی شرکت اوران کی طرف سے عہدہ داران کا انتخاب کرنا اوراس موضوع پر عام موافقت، قدیم زمانہ سے اسلامی معاشرہ میں یہ تھیوری نہ صرف بیان ہوئی ہے بلکہ اس پر عمل بھی ہوا ہے کیونکہ اگر کوئی میراثی یا طاقت کے بل بوتے پر دوسروں پر حاکم بن جائے تو نہ صرف یہ کہ عملی میدان میں اس کی شکست ہے بلکہ اسلام کی نظر میں بھی یہ طریقہ کار محکوم (غیر مقبول) ہے لہٰذا دین اور اسلام نے اس پر صحیح کا نشان لگایا ہے کہ تمام لوگوں کی موافقت

اور عام مقبولیت ہونے ضروری ہے اس میں کوئی بحث نہیں ہے، لیکن یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا اسلام کی نظر صرف عوام الناس کا اس حکومت کو مشروعیت دینے میں قبول کرلینا کافی ہے، اور قانونی نقطہ نظر سے اسلامی حکومت میں جیسا کچھ ہوا ہے یا ہوگا صرف عوام الناس کی موافقت کا نتیجہ ہے؟

بعض اخباروں، کتابوں اور مقالات میں لکھا جاتا ہے کہ آج کی دنیا میں "مقبولیت" اور "مشروعیت" ایک ساتھ ہوتی ہیں، یعنی کسی حکومت کی مشروعیت کے لئے عوام الناس کی اکثریت کا ووٹ کافی ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ مشروعیت؛ مقبولیت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جب عوام الناس نے کسی کو قبول کرلیا اور اس کو ووٹ دیدیا تو اب منتخب شدہ شخص کی حکومت مشروع اور قانونی ہوجاتی ہے۔

قارئین کرام!

یہ وہی ڈیموکریٹک "Democratic" نظریہ ہے جو آج کل کی دنیا میں عام مقبولیت رکھتا ہے تو اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام بھی بالکل اسی نظریہ کو قبول کرتا ہے۔؟

7۔ حکومت کی مشروعیت کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ کا لیبرل معاشرہ سے فرق

اب جبکہ ہم نے یہ قبول کرلیا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے حاکم کے لئے ضروری ہے کہ عوام الناس اس کو قبول کرتی ہو اور عوام الناس کی شرکت اور تعاون کے بغیر اسلامی حکومت قوانین کو جاری کرنے پر قادر نہیں ہوسکتی، اور اسلامی احکام کو بھی جاری نہیں کرسکتی، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق حکومت کے مشروع ہونے میں صرف عوام الناس کا ووٹ کافی ہے، اور قانون کے جاری کرنے والے افراد کی مشروعیت عوام الناس کے ووٹوں کے ذریعہ مشروع ہوجاتی ہے، یا کوئی دوسری چیز بھی اس میں ضمیمہ ہونی چاہئے؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ عوام الناس کا قبول کرنا حکومت کے قانونی اور مشروع ہونے کے لئے شرط لازم وکافی ہے، یا اس کے عینی طور پر محقق ہونے کے لئے یہ شرط لازمی ہے۔

جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جو کچھ "ولایت فقیہ" کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے اور اسی وجہ سے یہ حکومت، دوسری مختلف ڈیموکریٹک حکومت سے صاحب امتیاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی حکومت کی مشروعیت اور اس کا قانونی ہونا اسلام کی نظر میں صرف عوام الناس کی رائے نہیں ہے بلکہ عوام الناس کی رائے گویا ایک بدن کی طرح ہے اور اس مشروعیت کی روح "اذن الٰہی" ہے، اور یہ مطلب ایک مسلمان کے عقیدہ میں راسخ ہے۔

وضاحت:

ایک مسلمان شخص عالم ہستی کو خدا کی ملکیت جانتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ تمام افراد؛ خداوند عالم کے بندہ اور غلام ہیں، نیز اس سلسلہ میں افراد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، خدا کی بندگی میں سب برابر ہیں؛ جیسا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

-اَلْمُؤمِنُوْنَ كَاَسْنَانِ الْمَشْطِ يَتَسَاوُوْنَ فِي الْحُقُوْقِ بَيْنَهُمْ -[1]

مومنین آپس میں کنگھے کے دانتوں کی طرح ہیں اور سب کے حقوق مساوی اور برابر ہیں۔

پس معلوم یہ ہوا کہ سب انسان خدا کے بندے ہیں اور سب برابر ہیں نیز اس سلسلہ میں کوئی صاحب امتیاز نہیں ہے، اسی طرح سب انسانیت میں مساوی ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی امتیاز نہیں ہے عورت مرد، کالے سفید اصل انسانیت میں مساوی ہیں تو پھر کس معیار اور کس بنیاد کی بنا پر ایک شخص دوسروں پر حکومت کرنے کا حق رکھتا ہے؟ ہم نے یہ بھی قبول کیا کہ قانون کو جاری کرنے والا ایک عظیم طاقت کا مالک ہو جس کو ضرورت کے موقع پر استعمال کیا جا سکے، اور ہم نے یہ عرض کیا کہ حکومت بغیر قوہ قھر یہ (پولیس یا فوج) کے بغیر اپنے اہداف تک نہیں پہنچ سکتی اور حکومت کا فلسفۂ وجودی وہی قوہ قھر یہ ہے جو عوام الناس کو قانون کی پیروی کرنے پر مجبور کرتا ہے اب اگر قوہ قھر یہ نہ ہو اور حکومت فقط وعظ ونصیحت کے ذریعہ عوام الناس کو قانون پر عمل کرانے پر قادر ہوتی تو پھر قوہ قھر یہ کی کوئی ضرورت نہ ہوتی، اور اس کام کے لئے علماء اور اخلاقی معلمین کافی ہوتے پس ثابت یہ ہوا کہ قوہ مجریہ کا فلسفہ وجودی یہ ہے کہ وقت ضرورت اپنی طاقت سے فائدہ اٹھائے اور بڑھتے ہوئے جرائم کی روک تھام کرے مثلاً اگر کوئی شخص لوگوں کے مال وناموس پر دست درازی کرے تو حکومت اس کو پکڑ کر زندان میں ڈال دے یا اس کو کسی دوسرے طریقہ سے سزا دے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج کل دنیا بھر میں سزا دینے کے مختلف طریقے پائے جاتے ہیں، اسی طرح اسلام نے مجرموں کو سزا دینے کے لئے طریقہ معین کئے ہیں جن میں سے سب سے زیادہ رائج مجرم کو جیل میں ڈال دینا ہے جس سے اس کی آزادی کا ایک حصہ سلب ہو جاتا ہے جس وقت کسی شخص کو کوئی طاقت ایک بند کمرہ میں مقید کر دیتی ہے اور اس پر دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، اور اس کی معمولی اور ابتدائی آزادی سلب کر دی جاتی ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی مجرم کی آزادی کو سلب کرنے کا کسی کو کیا حق ہے؟ بے شک مجریان قانون کی طرف سے کسی شخص کی آزادی کا سلب کرنا یا مجرموں کے حقوق کو سلب کرنا جائز اور حق ہو، یہ ٹھیک ہے کہ مجرم کو سزا ملنی چاہئے، لیکن کوئی خاص شخص ہی سزا دینے کا حق رکھتا ہے، دوسرا نہیں؟ (یہ کہاں سے؟) ایسے افراد کو معین کرنے کے لئے کوئی قاعدہ قانون اور خاص ملاک اور دلیل ہونی چاہئے کیونکہ ان کا کام گویا اس شخص میں مالک جیسا تصرف کرنا ہے، جو شخص کسی مجرم کو جیل میں ڈالتا ہے گویا وہ اس کے وجود میں تصرف کر رہا ہے نیز اس سے اختیار اور آزادی کو سلب کر رہا ہے، اور اس کو ایک بند کمرے میں مقید کر رہا ہے، اس کو اجازت نہیں دیتا کہ جہاں چاہے چلا جائے، جیسے ایک مالک اپنے غلام کی تنبیہ وتادیب کر رہا ہے۔

پس چونکہ مجرموں اور خطا کاروں سے اس طرح کا برتاؤ ان کی آزادی اور حقوق کا سلب کرنا ہے اور انسان میں مالک جیسا تصرف حساب ہوتا ہے اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کی مشروعیت کا معیار وملاک اکثریت کی رائے کے علاوہ

---

[1] بحار الانوار ج9 ص49

خداوند عالم کی اجازت ہے، کیونکہ تمام انسان خدا کے بندے ہیں لہٰذا خدا اپنے بندوں پر اگرچہ مجرم بندے ہی کیوں نہ ہوں؛ تصرف کا حق عنایت فرمائے؟ ہر ایک شخص (یہاں تک کہ مجرم بھی) آزادی رکھتے ہیں اور یہ آزادی خداداد نعمت ہے جو اس نے تمام انسانوں کو عطا کی ہے اور کسی کو اس کے بندوں کی آزادی سلب کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وہی انسان کی آزادی یہاں تک کے مجرم انسان کی آزادی کا حق رکھتا ہے جو ان کا مالک ہے اور تمام انسانوں کا مالک خداوند قدوس ہے۔

اس لحاظ سے اسلامی نقطہ نظر سے ان تمام چیزوں کے علاوہ جو دوسری حکومتوں میں حکومت کی تشکیل کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، ایک دوسرا معیار اور ملاک بھی ضروری ہے اور وہ اعتقادات اور معارف اسلامی میں سرچشمہ رکھتا ہے ہمارے عقیدہ کی بنیاد پر خداوند عالم، انسان اور تمام مخلوقات کا ربّ ہے اور ہمارا یہ عقیدہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خدا کی مخلوقات میں ذرا سا بھی دخل وتصرف؛ خدا کی اجازت اور مرضی سے ہونا چاہئے دوسری طرف وہ قوانین جو شہریوں کی رفتار، چال چلن اور کردار کو معین کرتا ہے اور ان کی آزادی کو محدود کرتا ہے، نیز وہ قوانین خود بخود جاری نہیں ہوتے بلکہ ان کو جاری کرنے کے لئے ایک سسٹم کی ضرورت ہے جو ان کو جاری کر سکے، اسی وجہ سے حکومت کے پاس ایک طاقت (پولیس) کی ضرورت ہے، اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حکومت اور قوہ مجریہ، خدا کی مخلوقات میں تصرف کرنے کے بغیر اور ان کی آزادی کو محدود کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ خدا کی مخلوقات میں تصرف کرنا یہاں تک مجرموں اور غنڈوں سے آزادی کا سلب کرنا، صرف اسی شخص کے لئے جائز ہے جس کو خداوند عالم نے اختیار دیا ہے، اور یہ اختیار صرف خداوند عالم کی طرف سے دوسروں کو عطا ہوتا ہے؛ کیونکہ وہی تمام انسانوں کا مالک اور ربّ ہے، اور حکومت کو اپنی مخلوقات میں تصرف کرنے کی اجازت دے سکتا ہے۔

حکومت کے سلسلہ میں فلسفہ سیاست میں نظریہ" ولایت فقیہ" کا دوسرے نظریات پر یہ امتیاز ہے کہ یہ نظریہ توحید اور اسلامی عقیدہ میں سرچشمہ رکھتا ہے اس نظریہ حکومت اور انسانوں میں تصرف کرنے کی نسبت خداوند عالم کی اجازت کی طرف ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ جو کہ قوانین کو جاری کرنے اور انسانوں کی آزادی میں تصرف کرنے میں خدا کی اجازت کو ضروری نہیں سمجھتا، یہ نظریہ ایک قسم کا" ربوبیت میں شرک" ہے یعنی اگر قوانین کو جاری کرنے والا فرد یہ عقیدہ رکھے کہ وہ خدا کے بندوں میں اس کی اجازت بغیر کے دخل وتصرف کا حق رکھتا ہے، حقیقت میں ایسا عقیدہ رکھنا اس ادّعا کے برابر ہے کہ جس طرح خداوند عالم اپنے بندوں میں تصرف کا حق رکھتا ہے میں بھی اسی طرح مستقل طور پر انسانوں میں دخل وتصرف کا حق رکھتا ہوں، اور یہ ایک قسم کا شرک ہے اگرچہ ایسا شرک نہیں جو مرتد ہونے کا سبب بنتا ہو بلکہ کمتر درجہ کا شرک ہے جو غلط فکر اور کج فکری کی وجہ سے وجود میں آتا ہے، جس کے نتیجہ میں عصیان اور لغزش وجود میں آتے ہیں اور یہ کوئی کم گناہ نہیں ہے کیسے کوئی شخص اپنے کو خدا کا ہم پلہ قرار دیتا ہے اور یہ دعوی کرتا ہے کہ جس طرح خدا اپنے بندوں میں تصرف کا حق رکھتا ہے میں بھی ان کی رائے اور انتخاب پر تکیہ کرتے ہوئے؛ ان پر تصرف کا حق رکھتا ہوں؟!! کیا عوام الناس اپنا اختیار رکھتی ہے جو دوسروں

کے حوالہ کر سکتی ہے؟ تمام انسان خدا کے بندے ہیں ان کا اختیار بھی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

قارئین کرام!

ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اگر ہم اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کی تحقیق و بررسی کریں تو اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اس نظریہ میں دوسرے ممالک کے حکومتی معیار کے علاوہ ایک دوسری چیز کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کے بندوں میں تصرف کرنے کے لئے خدا کی اجازت لہٰذا اسی نظریہ کی بنیاد پر حکومت کی مشروعیت خداوند عالم کی طرف سے ہے اور عوام الناس کی رائے اور ووٹس نیز عوام الناس میں اس کی مقبولیت؛ حکومت کے تحقق کے لئے ایک شرط ہے۔

چھبیسویں نشست

حکومت کے مخصوص کام اور عوام الناس کے ھاتھ بٹانے پر اسلام کا زور

1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ "اسلامی سیاسی نظریہ" کی گفتگو دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے جس کے پہلے حصے میں قانون اور قانون گذاری کے سلسلہ میں بحث ہو چکی ہے اس کا دوسرا حصہ حکومت اور نظام اسلامی میں قوانین کے نفاذ کی ضمانت سے مربوط ہے ہم نے گذشتہ گفتگو میں حکومت کی ضرورت کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں اسلامی حکومتی سسٹم کو ثابت کیا اور ہم نے حکومت کی ضرورت کے سلسلہ میں ایک دلیل یہ پیش کی کہ چونکہ قوانین کو جاری کرنے کے لئے ایک ضامن کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر قوانین کو جاری کرنے کی کوئی ضمانت نہ ہو تو پھر ان (قوانین) کا ہونا لغو اور بے ہودہ ہو جائے گا، اور چونکہ معاشرہ میں ہمیشہ جرائم اور قانون شکنی ہوتی رہتی ہے (اگر قوانین کی ضمانت اجرائی نہ ہو) تو پھر ان قانون کو بنانے کا مقصد ختم ہو جاتا ہے چنانچہ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر ہمیشہ تمام ہی ملتوں نے تجربہ کیا ہے اور اسلامی منابع وکتب کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی شک وتردید نہیں ہے۔

2۔حکومت کے عظیم اور مخصوص کام

قارئین کرام! جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے کہ حکومت کی ضرورت کے لئے: قوانین کی ضمانت اجرائی کے علاوہ بھی دیگر دلائل موجود ہیں کہ ان تمام دلائل کے پیش نظر حکومت کے وظائف کے مجموعہ کو بیان، اور ان کی منطقی توجیہ کرنا اسی طرح حکومت کے اختیارات کو بیان کرنا ممکن ہے کیونکہ اگر صرف حکومت کا کام قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت ہوتی تو پھر اس طرح کے پیچ وخم والے سسٹم کی ضرورت نہ ہوتی اور صرف محکمہ پولیس کے ذریعہ یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا، اور حکومت کی دوسرے اجتماعی کاموں میں کوئی دخالت نہ ہوتی کیونکہ اس صورت میں حکومت کی ذمہ داری صرف ملک میں قوانین کو جاری کرنا ہوتا جس کے لئے صرف پولیس ہی کافی تھی لیکن حکومتوں کی منجملہ اسلامی حکومت کی دوسری بھی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن میں سے اسلامی معاشرہ کی ان عام ضرورتوں کو پورا کرنا ہے جو انفرادی طور پر ممکن نہیں ہیں۔

ہم کبھی انسان کی زندگی کو شخصی اور انفرادی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اس کی ضرورتوں کی جستجو کرتے ہیں تو ظاہراً یہ ضرورتیں خود شخصی طریقہ سے پوری ہونا چاہئے مثلاً روٹی اور مکان کی ضرورت، اور یہ چیزیں خود انسان کی سعی وکوشش سے

پوری ہو جاتی ہیں البتہ انسان کی انفرادی سعی و کوشش کا ثمر بخش ہونے کے لئے قاعدہ و قانون کے ماتحت ہونا ضروری ہے۔

لیکن کچھ ضرورتیں انسان اور اہل خانہ سے متعلق نہیں ہوتیں بلکہ وہ پورے معاشرہ یا معاشرہ کے کسی خاص گروہ سے متعلق ہوتی ہیں مثلاً اندرونی اور بیرونی امنیت ایک عام ضرورت ہے، کیونکہ اندرونی دشمنی، قانون شکنی اور نا امنی سے مقابلہ کرنے کے لئے نیز اسلامی ملک کے عہدہ دار افراد کے جو بیرونی دشمن ہیں ان سے جنگ کے لئے فوج کی تشکیل دینا وغیرہ؛ یہ چیزیں معاشرہ کے بعض افراد سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ تمام ہی افراد سے متعلق ہیں اور چونکہ اس طرح کی ضرورت معاشرہ کے بعض افراد کے بس کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ کام معاشرہ کے تمام افراد کے ذریعہ پورا ہونا چاہئے، جن کو حکومت معاشرہ کی طرف سے قوانین کو مرتب کرنے اور ضروری طریقوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انجام دی سکتی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ جس وقت معاشرہ کے لئے سرحدی علاقے سے کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے اور عوام الناس اس خطرہ سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، تو ان کو صحیح طریقہ سے ٹریننگ دی جائے، یعنی درحقیقت جنگ اور دفاع میں شرکت کرنے والے تمام لوگوں کو ایک سسٹم کے ماتحت ہونا چاہئے کیونکہ یہاں پر ذاتی اور شخصی سلیقہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا لہٰذا ہر شخص اپنے سلیقہ سے دشمن کے حساب شدہ حملوں کو نہیں روک سکتا اسی وجہ سے فوجی افسروں کے تجربوں، دشمن کے اسلحوں اور اس کی طاقت کی شناخت کے ذریعہ بہترین پلان کے ساتھ میدان جنگ میں قدم رکھا جانا ضروری ہے لہٰذا اس اہم ضرورت کو صرف ایسا سسٹم ہی پورا کر سکتا ہے جو پورے معاشرہ پر حکومت کرتا ہو چنانچہ حکومت اپنے خاص پروگرام کے ذریعہ ہی لوگوں کو جنگ میں شرکت کرنے کے لئے تیار کر سکتی ہے تاکہ ملک سے دشمن کا خطرہ ٹل جائے اس کے علاوہ بیرونی دشمن کے مقابلہ کی تیاری کے پیش نظر لازمی اسلحہ کی فراہمی ضروری ہے، اور حکومت کو فوج کی ٹریننگ پر خاص دھیان رکھنا ضروری ہے تاکہ ملک میں سرحدوں کی حفاظت کرنے والی فوج کی تعداد کافی مقدار میں آمادہ رہے، اسی طرح اندرونی فتنہ و فساد سے روک تھام کے لئے پولیس کی ضرورت ہے لہٰذا اس طرح کے مسائل صرف حکومت ہی کر سکتی ہے، لہٰذا عوام الناس حکومت کی اطاعت کریں، اور اس کے احکام کو لازم الاجراء مانیں۔

جو مثال ہم نے حکومت کی ضرورت پر دلیل دوم (یعنی معاشرہ کی عام ضرورت) کے تحت پیش کی وہ ملک سے دفاع اور بیرونی دشمن سے مقابلہ کے سلسلہ میں ہے اور ہمارے ملک میں یہ خطرناک وظیفہ ارتش اور سپاہ (فوجوں کے نام) کے ذمہ ہوتا ہے، اسی طرح وہ مثال جس کو ہم نے دلیل اول (یعنی قوانین کی اجرائی ضمانت) کے سلسلہ میں ذکر کی وہ اندورنی امنیت کی حفاظت اور مجرموں کو قانون پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کے لئے طریقوں کے سلسلہ میں ہے، اور یہ ذمہ داری نیروئے انتظامی (پولیس) کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔

اِن ہی عام ضرورتوں میں سے جو عام افراد کے ذمہ داری سے باہر ہوتی ہیں اور انہیں بھی حکومت انجام دیتی ہے وہ معاشرہ کی صحت و سلامتی کا مسئلہ ہے کیونکہ ہمیشہ معاشرہ میں پھیلنے والی بیماریاں موجود رہی ہیں جن کی وجہ سے بہت بڑے

بڑے نقصانات معاشرہ کو اٹھانا پڑے ہیں، اور اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو معاشرہ کو کافی نقصان اٹھانا پڑے گا (اور بے شمار جانیں چلی جائیں گی) جیسا کہ گذشتہ زمانہ میں میڈیکل ترقی نہ ہونے اور عظیم پیمانہ پر منصوبہ بندی نہ ہونے کی بنا پر معاشرہ میں پھیلنے والی بیماریاں پائے جاتی تھیں مثلاً "وبا"، "طاعون" اور "چیچک" وغیرہ جن سے بہت سی جانیں جاتی تھیں لیکن آج کل حکومتی پروگرام وغیرہ کے تحت اور میڈیکل کے ترقی کی وجہ سے اس طرح کی بیماریوں پر کافی حد تک کنٹرول کیا گیا ہے اور حکومت کی مدد نیز تمام عوام الناس کے تعاون اور شرکت سے بعض مذکورہ بیماریوں کی جڑ ہی ختم کردی گئی ہے مثلاً گذشتہ زمانہ میں بچوں میں فالج کا اثر بہت زیادہ ہوتا تھا جس کی وجہ سے ہزاروں اور لاکھوں معصوم بچوں کی جانیں ضایع ہو چکی ہیں لیکن آج بہترین منصوبہ بندی اور میڈیکل وغیرہ کے پروگرامس کے تحت ہمارے ملک میں "واکسیناسین" "vaccinatin" کا پروگرام بہترین طریقہ سے جاری ہوا ہے جس کے نتائج بھی بہترین برآمد ہوئے ہیں لیکن یہ کام بغیر حکومتی منصوبہ بندی اور عوام الناس کی بھرپور شرکت کے بغیر ممکن نہیں ہے تو ایسے کاموں کے لئے عام افراد کی قدرت سے بالاتر ایک قدرت کا ہونا ضروری ہے، اور وہ حکومت ہے جو اپنے پروگرام کے تحت، ضروری وسائل کے ساتھ اور ضروری مقررات اور مخصوص قانون نامہ مرتب کرکے عملی میدان میں قدم آگے بڑھائے اور عوام الناس بھی حکومت کے قوانین پر عمل کرے، تاکہ معاشرہ کی میڈیکل ضرورت پوری ہو جائے اور معاشرہ سے خطرناک بیماری کی جڑیں ختم کی جاسکے۔

قارئین کرام! حکومت کے گذشتہ وظائف کی طرح منشیات کا دھندہ کرنے والے افراد کا بھی مقابلہ کرنا ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی بلا ہے جس سے بدن، روح اور معاشرہ کی امنیت کو بہت بڑے نقصانات پہنچے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت خاص منصوبہ بندی کے تحت اور اپنی پوری طاقت صرف کرکے ہی اس برائی کی جڑ کو اکھاڑ پھینک سکتی ہے اس میں محدود افراد کی کوشش کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔

پس معاشرہ کی عام ضرورتوں کو پورا کرنا حکومت کے وجود پر ایک دوسری دلیل ہے کیونکہ ان کا پورا ہونا معاشرہ کے لئے مفید اور ثمر بخش ہے، اور اگر ان کے پورا ہونے میں کوئی نقص اور خلل واقع ہو تو پھر اس کا نقصان بھی معاشرہ ہی کو بھگتنا پڑے گا، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ ضرورت انفرادی طور پر پوری نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ کام معاشرہ پر حکومت کرنے والے حاکم اور وزراء کا ہے، اسی وجہ سے ان تمام ضرورتوں کے پیش نظر یا ان ذمہ داریوں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے ہر ایک کے لئے سلسلہ میں ایک وزارتخانہ تشکیل دیا جاتا ہے۔

البتہ معاشرہ کی بعض ضرورتوں کو انفرادی طور پر پورا کیا جاسکتا ہے لیکن ان کو پورا کرنے کے لئے تمام افراد میں خواہش اور تمنا نہیں ہوتی یا اگر ہوتی بھی ہے تو وہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی، تو اگر اس صورت میں عوام الناس پر یہ کام چھوڑ دیئے جائیں تو پھر یہ ضرورتیں ناقص رہ جاتی ہیں، کم سے کم معاشرہ کے بعض گروہ ان ضرورتوں سے محروم رہ جائیں گے، اسی وجہ سے یہ ذمہ داریاں حکومت کی ہوتی ہیں تاکہ ان ضرورتوں میں کوئی نقص اور خلل واقع نہ ہو مثلاً پورے ملک میں عوام الناس خود ہی

مدرسہ، اسکول اور کالج بنا کر تعلیم وتربیت کا انتظام کر سکتے ہیں اور ان کا خرچ بھی خود ہی برداشت کر سکتے ہیں، (جیسا کہ گذشتہ زمانہ میں ایسا ہی ہوتا تھا اور آج کل بھی بعض ترقی یافتہ ممالک میں مدارس اور کالج وغیرہ کا انتظام عوام الناس کے ذمہ ہے) لیکن افسوس تعلیم وتربیت پر خرچ کرنے کے لئے کم ہی لوگ تیار ہوتے ہیں تا کہ خود ان کے بچوں اور دیگر بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو سکے اگر چہ ہم اس بات کے منکر نہیں ہیں کہ کوئی اس طرح کے امور میں خرچ نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ تاریخ میں ایسے مخیر افراد موجود رہے ہیں اور آج بھی بعض ایسے مخیر حضرات موجود ہیں جنھوں نے مدرسہ بنانے کے لئے بہت زیادہ مدد کی ہے، لیکن ان کی مدد محدود ہوتی ہے، معاشرہ کے تمام لوگوں تک ان کی خدمت نہیں پہنچ سکتی، اور اگر حکومت اس طرح کی ذمہ داریوں کو ایسے مخیر افراد کے اوپر چھوڑ دے تو پھر معاشرہ کی مصلحت پوری نہیں ہوگی۔

ایسے حالات میں جب عوام الناس مدارس و اسکول بنانے کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لیتی، تو پھر معاشرہ کی فلاح وبہبود کے لئے حکومت کو یہ ذمہ داریاں اپنے ذمہ لینا پڑتی ہیں، تو پھر اس چیز کی ضرورت ہے کہ ان تمام ضرورتوں کا خرچ یا عوام الناس ادا کرے اور حکومت مختلف قسم کے ٹیکس کے ذریعہ یہ مبلغ حاصل کرے، یا حکومت اپنی ملی درآمد کے ذریعہ اس خرچ کو پورا کرے؛ کیونکہ تعلیمی نصاب کا ایک حصہ تمام لوگوں تک مفت پہنچانے کی ضرورت ہے تا کہ معاشرہ فلاح وبہبود کی طرف آگے بڑھے اور اگر حالات بدلے اور تعلیمی اداروں کے اخراجات کو بعض مخیر حضرات برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں تو پھر واقعاً حکومت سے ایک بڑا بوجھ کم ہو جائے گا۔

3۔ حکومت کے دو طرفہ وظائف

قارئین کرام! گذشتہ باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض ایسی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو حکومت سے مخصوص نہیں ہوتی بلکہ حکومت خاص حالات میں ان کو قبول کرتی ہے اور ان کو پورا کرنے میں اپنی ہمت لگا دیتی ہے، جبکہ بعض حالات میں ان کو عوام الناس کے سپرد کیا جا سکتا ہے لیکن بعض ایسی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو صرف حکومت ہی سے مخصوص ہوتی ہیں اور کبھی بھی حکومت کے عہدہ سے باہر نہیں ہوتیں اور کسی بھی وقت حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کو عوام الناس کے کاندھوں پر ڈال دے، مثلاً دفاع اور جنگ کیونکہ انفرادی اور مختلف گروہ کے ذریعہ کبھی بھی جنگ اور دفاع ممکن نہیں ہے، لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ بہترین منصوبہ بندی کے تحت معاشرہ کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے البتہ جب حکومت دفاع اور جنگ کی ذمہ داری قبول کر لے، اور براہ راست اس سلسلہ میں منصوبہ بندی مکمل کر لے تو پھر عوام الناس اپنی مرضی سے فوجی اور بسیجی (عوامی رضا کار فوج) جنگ میں شرکت کر سکتی ہے اور اپنے اسلامی ملک اور اسلامی حکومت سے دفاع کر سکتی ہے۔

لہٰذا تمام اجتماعی کاموں کو انجام دینے کی ذمہ داری اپنے کاندھے پر لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ بہت سی ذمہ داریوں کو خود عوام الناس اپنے عہدہ پر لے سکتی ہے اور اپنی مرضی سے ان کے اخراجات کو برداشت کر سکتی ہے اور ان

کاموں کے انجام دینے کے لئے (بھی) وزارت خانہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عوام الناس خود اس ذمہ داری کو نبھا سکتی ہے لیکن ان عظیم منصوبوں کو منظم کرنے، بے نظمی سے بچنے اور ان میں عوام الناس کی شرکت کو بروئے کار لانے نیز ان کو اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے؛ حکومت کو چاہئے کہ اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرے، جیسا کہ بعض وزارت خانہ صرف نظارت کا کردار ادا کرتے ہیں جبکہ اصل کام عوام الناس کرتی ہے مثلاً محکمہ تجارت کا اصل کام تجارت نہیں ہے اندرونی اور بیرونی تجارت عوام الناس انجام دیتے ہیں؛ البتہ جیسا کہ شاہ کے زمانہ میں درباری لوگ ہی معاملات سے بڑے بڑے فائدہ اٹھاتے تھے اور عوام الناس ان فوائد سے محروم رہتی تھی، لہٰذا اس طرح کی تجارت سے روک تھام کے لئے یہ کام حکومت کے ذمہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ تجارتی امور عوام الناس سے متعلق ہیں حکومت سے نہیں جیسا کہ معروف ہے کہ "حکومت ایک مناسب تاجر نہیں ہوسکتی" اور اگر حکومت براہ راست تجارتی امور کو انجام دے نے (بھی) لگے، تو اس کو شکست اٹھانا پڑے گی کیونکہ تجارتی اور صنعتی امور بلکہ کلی طور پر اقتصادی امور میں افراد اور گروہ کی آپس میں رقابت (مقابلہ، کمپٹیشن) بہت ہی زیادہ مؤثر ہوتی ہے، اور اگر ان کو صحیح طریقہ پر راہنمائی ہوتی رہے اور ان کے درمیان مقصد معین رہے تو پھر تجارت اور صنعت میں ترقی ہوگی، لیکن اگر حکومت خود براہ راست تجارت کرے تو پھر اس کے اندر وہ مقصد نہیں ہوتا جس کے نتیجہ میں ترقی نہیں ہوگی۔

"ٹوٹالیٹر" "Totalitair" [1] حکومت یا متحد حکومتیں مثلاً سوسیالیسٹ "Socialiste" اور کمیونسٹ "communiste" حکومتیں جو "چین" اور "کوبا" پر حاکم تھی یا قدیم روس کی حکومتیں یا مشرقی ممالک کی وہ حکومتیں جن میں حکومت براہ راست تمام تر سیاست گذاری اور پروگراموں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے اور عوام الناس اقتصادی، تجارتی، صنعتی اور کاشتکاری وغیرہ میں صرف نوکروں کا کردار ادا کرتی ہے کیونکہ تمام کام حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں اور تمام عوام الناس یہاں تک کہ کاشتکار اور کارخانوں میں کام کرنے والے افراد حکومت کے نوکر اور مزدوروں کی طرح ہوتے ہیں لیکن اس طرز کی حکومت کے مقابلہ میں اسلامی حکومت کا نظریہ یہ ہے کہ جہاں تک عوام الناس مختلف مسائل کو خود اپنے آپ انجام دے سکتے ہیں اس پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کی مالکیت اور ان کے استقلال کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

4۔ کم درآمد لوگوں کو مدد پہنچانے والی کمیٹیوں کی ضرورت

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا معاشرہ میں عام طور پر فائدہ کے لئے کچھ مرکز ہونا چاہئیں تاکہ وہ غریب لوگ جو اپنی بعض ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتے ان مرکزوں سے استفادہ کرسکیں مثلاً ایسے ھاسپٹل بنائے جائیں جہاں پر ان کے لئے مفت علاج کیا جاسکے کیونکہ ان میں علاج کے اخراجات کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اسی وجہ سے بیمہ اجتماعی

[1] ٹوٹالیٹر، اس حکومت کو کہا جاتا ہے جو ایک گروہ کے نفع میں قوانین بنائے اور اپنے مخالفین کو خفیہ پولیس وغیرہ کے ذریعہ نابود کرنے کی درپے ہو۔

کے قوانین کے تحت ہاسپٹل بنائے جاتے ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں اس طرح کے ہاسپٹل کی تعداد کافی مقدار میں ہوتی ہے، جن میں مریضوں کو اپنے علاج کے لئے اخراجات ادا نہیں کرنے پڑتے، اور حکومت ٹیکس وغیرہ یا اپنی ملی درآمد کے ذریعہ ان ہاسپٹلوں کا خرچ حاصل کرتی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ جس وقت حکومت اپنی درآمد کے لئے ٹیکس مقرر کرتی ہے مثلاً عمومی بیمہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ٹیکس وصول کرتی ہے تو پھر عوام الناس کو یہ ٹیکس ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے، خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں حکومتیں ایسے طریقے اپناتی ہے جن سے عوام الناس ٹیکس ادا کرنے سے فرار نہیں کر سکتے، اگرچہ بعض فوائد ٹیکس دینے والے کے حق میں بھی ہوتے ہیں، لیکن معاشرہ کے کم درآمد والے افراد کے لئے یہ امکانات فراہم کئے جاتے ہیں، تاکہ ٹیکس سسٹم کے تحت مفت علاج اور دوسری خدمات حاصل کر سکیں۔

لیکن کیا یہ کام عوام الناس پر چھوڑ دینا بہتر ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے عام فائدوں کے لئے اس طرح کے کام انجام دیں اور اسپتال وغیرہ بنائیں تاکہ کم درآمد والے افراد ان میں جا کر اپنا مفت علاج کرا سکیں؟ یا حکومت لوگوں سے ٹیکس وغیرہ حاصل کر کے کم درآمد والے افراد کے لئے ہاسپٹل وغیرہ بنوائے تاکہ وہ لوگ مفت علاج کرا سکیں؟

جواب یہ ہے کہ بے شک پہلی صورت بہتر اور مناسب تر ہے کیونکہ احکام اسلامی فلسفہ میں اس چیز پر توجہ دی گئی ہے اور مقام تشریع احکام میں بھی مدنظر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اسلام نے اس بات پر تاکید کی ہے عوام الناس کو اپنے مال کے ایک حصہ کو عام فائدہ کاموں میں خرچ کرنا چاہئے اور اپنی مرضی اور شوق کے ساتھ دوسروں کو اپنے مال سے فائدہ پہنچائیں، کیونکہ اس صورت میں نیک عمل کو اختیار کرنے کی اہمیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے اور انسان، نفسانی کمال اور آخرت میں ثواب کا مستحق ہوتا ہے نیز اس طرح معاشرہ کی ضرورتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں لیکن اگر عوام الناس کو اپنے مال کے کچھ حصے کو خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس میں عمل کو اختیار کرنے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں ثواب بھی نہیں ہوتا۔

اِن ہی نیک کاموں میں سے ایک کام یہ ہے کہ ہمارے مخیر مسلمان برادران رضا کارانہ طور پر ہمیشہ بعض چیزیں وقف کرتے ہیں کہ جس سے معاشرہ میں فوائد رہے ہیں، یہاں تک کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں ایسا کوئی دیہات، بستی اور شہر نہ ہوگا جس سے عوام الناس کے لئے کوئی وقف نہ ہو لیکن اس عظیم اور خدا پسند کام میں آج کل رغبت کم ہوگئی ہے جس کی بنا پر وقف کا سلسلہ کم ہو گیا ہے اس کے علاوہ بہت سے ایسے وقف ہیں کہ یا تو وہ بھلا دیئے گئے ہیں یا ان سے صحیح طریقہ سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے جب کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوبارہ وقف کا سلسلہ شروع ہو جائے اور اس عظیم مسئلہ کی اہمیت عوام الناس پہچان لیں تو پھر حکومت بعض ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے گی اور عوام الناس بھی ثواب کی مستحق ہو گی جس وقت کوئی شخص اپنی مرضی اور رغبت سے کوئی کام انجام دے یا وہ کام جس مقدار میں اختیار اور آزادی کے ساتھ انجام دیا جائے تو اس کا ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ وہ امور جو حکومت سے مخصوص نہیں ہیں اور ان میں اصل یہ ہے کہ عوام الناس رضا کارانہ طور پر انجام دیں اور اپنی اجتماعی ضرورتوں کو پورا کریں، اور یہ کام عوام الناس کے سپرد کیا جائے، لیکن اگر عوام الناس اس کام کو انجام نہ دے اور اجتماعی ضرورتیں رضا کارانہ طور پر انجام نہ ہو پائیں تو اس وقت حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خاص قوانین بنا کر عوام الناس کو ٹیکس وغیرہ دینے پر مجبور کرے تا کہ معاشرہ کی ضرورتوں کا مکمل خرچ پورا ہو جائے۔

5۔ عوام الناس کی شرکت پر اسلام کی توجہ

یہ بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ عوام الناس پر بعض امور کی ذمہ داری کا رکھنا، اور مختلف قسم کے کاموں میں سبھی کی شرکت کا راستہ ہموار کرنا، مثلاً معاشرہ کی بہت سی ضرورتوں کو پورا کرنا، یہ تمام "جامعہ مدنی" (جیسا کہ ذیل میں وضاحت کی جائے گی) کے خصوصیات ہیں البتہ جامعہ مدنی اور مغرب سے آئی ہوئی بہت سی دیگر اصطلاحات کے مختلف معنی کئے جاتے ہیں، اسی وجہ سے ان اصطلاحات سے ناجائز استفادہ کیا جاتا ہے، لیکن ہم ان اصطلاحات کو اپنے اعتبار سے قبول کرتے ہیں، مثلاً جامعہ مدنی کے مختلف بلکہ بعض موقع پر ایک دوسرے کے مخالف معنی کئے جاتے ہیں، چنانچہ جامعہ مدنی کے ایک معنی یہ ہیں کہ حتی المقدور معاشرہ کے امور خود عوام الناس کے سپرد کئے جائیں، اور ان میں حکومت کی ذمہ داری نہ ہو حتی الامکان عوام الناس خود رضا کارانہ طور پر معاشرتی امور میں شرکت کریں اور اگر حکومت کسی موقع پر دخالت کر سکتی ہے البتہ معاشرہ کے اہم مسائل میں سیاست گذاری تمام ہی ممالک میں حکومت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے اور ان کے مختلف مراحل حتی الامکان عوام الناس کے ذمہ ہوتے ہیں۔

بے شک جامعہ مدنی کے مذکورہ معنی اسلامی مستحکم اصول کے مطابق ہے جس پر روز اول ہی سے "جامعہ اسلامی" یا "مدینۃ النبی" کا نام دیا گیا ہے کیونکہ شروع میں اسلامی حکومت تمام امور کی عہدہ دار نہیں ہوتی تھی بلکہ اکثر معاشرہ کے امور کو عوام الناس ہی انجام دیتے تھے، لیکن معاشرہ کی ترقی کے ساتھ اور طرح طرح کی جدید ضرورتوں کے پیش نظر آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ بعض ضرورتوں کو پورا کرنا عوام الناس کے بس کی بات نہ تھی تو اس صورت میں حکومت کا ان امور کو اپنے ذمہ لینا ضروری تھا مثلاً قدیم زمانہ میں شہر کی روشنی کے لئے عوام الناس کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے گلی کوچوں میں فانوس اور چراغ لگائے جاتے تھے اور یہ کام خود عوام الناس کے ذریعہ ہوتا تھا، لیکن آج کے زمانہ میں بجلی کے ذریعہ پورے شہر کے گلی کوچوں میں روشنی کرنا عوام الناس کا کام نہیں ہے اور اگر عوام الناس کرنا بھی چاہے تو اس میں نقص پایا جائے گا، لہٰذا معاشرہ کی اس ضرورت کو پورا کرنا اور ضروری اسباب فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

6۔ عوام الناس کی شرکت کو کم کرنے والے اسباب

کلی طور پر عوام الناس میں معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی شرکت کو کم کرنے والے دو اسباب کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے:

پہلا سبب: ضرورتوں کی بڑے پیمانہ پر وسعت کے ساتھ ساتھ ان ضرورتوں کا پیچیدہ اور خاص طریقہ پر ہونا، جس کی بنا پر عوام الناس ان ضرورتوں کو پورا کرنے سے محروم ہیں، جس کے نتیجہ میں ان کو پورا کرنے کے لئے حکومت کا بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے۔

دوسرا سبب: عوام الناس میں اخلاقی اور دینی اقدار کا کمزور ہوجانا اور مغربی ممالک کی طرح صرف ذاتی مفاد کی فکر رائج ہوجانا۔

ان دو اسباب کی وجہ سے عوام الناس معاشرہ اور دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے کتراتے ہیں کیونکہ مغربی کلچر اپنے ذاتی مفاد، خود پسندی اور ذمہ داری کو قبول نہ کرنے پر مبنی ہوتا ہے جو "رنسانس" کے زمانے سے مغربی ممالک میں رائج ہوتا چلا گیا ہے اور آہستہ آہستہ یہ نظریہ اسلامی ممالک میں بھی رواج پیدا کر چکا ہے، جس نے مسلمانوں کے معنوی اور اخلاقی رجحان کو کم رنگ کر دیا ہے ایک انسان کو دوسرے کے بارے میں نیز اس کی ضرورتوں میں مدد کرنے سے روک دیا ہے اور انسان کو دوسروں سے بے توجہ کر دیا ہے کیونکہ یہ خود پسند نظریہ معاشرہ کے امور میں حصہ لینے کی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا اور صرف اپنے ذاتی مفاد اور اپنی لذتوں کے بارے میں فکر کرتا ہے یہ کلچر بالکل اسلامی ثقافت کے مقابلہ میں ہے جو صدیوں سے اسلامی معاشرہ میں رائج تھا اور عوام الناس کو معاشرہ کے فوائد اور لوگوں کی خدمت پر تحریک کرتا ہے۔

آج کل کے زمانہ میں سنتوں اور اسلامی اقدار پر بے توجہی اور مغربی کلچر کا رواج اس بات کا باعث بنا ہے کہ وقف کی بہترین سنت پر کم عمل ہو رہا ہے اور وقف ہونے والی زمینوں اور عمارتوں کی نسبت پہلے سے بہت کم ہوتی جارہی ہے اسی طرح رضا کارانہ طور پر عام المنفعہ امور کم ہوتے جارہے ہیں، اور اسلامی معاشرہ میں "روح مدنیتی" (حقیقت جامعہ مدنی) کمزور ہورہی ہے جس کے نتیجہ میں اسلامی حکومت کی ذمہ داری روز بروز بڑھتی جارہی ہے اگر اسلامی انقلاب کی برکت سے معاشرہ میں انسانی اور اسلامی اقدار کی اہمیت دوبارہ زندہ ہوجائے اور عوام الناس اپنی دینی، اخلاقی اور معنوی ذمہ داریوں پر توجہ کریں اور عام المنفعہ امور میں حصہ لیں تو پھر حکومت کا بوجھ کم ہوجائے گا، حکومت کی ذمہ داریاں کم ہوجائیں گی اور حکومت بعض اپنی ذمہ داریوں کو عوام الناس کے حوالے کرسکتی ہے؛ اور یہ چیز ایک حساب سے "جامعہ مدنی" کی طرف دوبارہ پلٹ جانا ہے۔

7۔ اسلام میں جامعہ مدنی کی اہمیت

قارئین کرام! ہم دوبارہ اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ گذشتہ معنی میں جامعہ مدنی کا اسلام اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں سرچشمہ ملتا ہے اور ہم اسلام سے دور ہونے کی وجہ سے اس سے دور ہوئے ہیں اور وہ وقت آچکا ہے کہ ہم اسلام کی برکت سے اس کی طرف توجہ کریں پس مغربی ممالک کو ہم لوگوں پر احسان نہیں جتانا چاہئے کہ ہم نے "جامعہ مدنی" کے نقشے کو پیش کر کے تمام ملتوں پر احسان کیا ہے اور ہم اس وقت تمام افراد کو جامعہ مدنی کی تشکیل کی دعوت اور راہنمائی کرتے ہیں، بلکہ ہمیں

ان کے اوپر احسان جتانا چاہئے کہ جب اسلامی تمدن اپنے اوج پر تھا تو مغربی معاشرہ نیم وحشی تھا (یعنی آدمی حیوانیت پائی جاتی تھی) اور اسلامی تمدن نے ان کو آہستہ آہستہ صاحب تمدن کیا اور انہوں نے جامعہ مدنی کو اسلام سے حاصل کیا ہے لیکن اس وقت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مغربی کلچر کو اسلامی ملک میں رواج دینا چاہتے ہیں اور ہماری تربیت کرنا چاہتے ہیں تاکہ جامعہ مدنی کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔!

لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ صحیح معنی میں جامعہ مدنی اسلام اور اسلامی تمدن میں سرچشمہ رکھتا ہے اور اگر کوئی اسلام کی طرف رجوع کرے تو اس میں جامعہ مدنی مل جائے گا؛ لیکن جامعہ مدنی کے دوسرے معنی بھی کئے جاتے ہیں جو ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں کیونکہ آج کل مغربی کلچر میں جامعہ مدنی کے اسلامی معاشرہ کے مخالف معنی کئے جاتے ہیں، اور وہ معنی یہ ہیں کہ جامعہ مدنی یعنی جس میں دین کی سلطنت نہ ہو اور معاشرہ کے امور میں دینی کوئی منصوبہ نہ ہو ایسے غیر دینی جامعہ مدنی (جس کا آج کل بہت زیادہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے) میں حکومت کے تمام عہدوں کے سلسلہ میں تمام لوگ برابر ہونے چاہئیں، اور جیسا کہ کہتے ہیں کہ ایرانی معاشرہ جامعہ مدنی میں تبدیل ہونا چاہئے یعنی ایک یہودی بھی صدر مملکت ہو سکتا ہے کیونکہ تمام انسان، انسانیت میں برابر کے شریک ہیں، یعنی انسانوں میں پہلا درجہ یا دوسرا درجہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس نعرہ کے ذریعہ چاہتے ہیں کہ ایک الحادی اور منحرف مذہب جو صیہونیزم سے وابستہ ہے ان کو قانونی طور پر مان لیا جائے وہ لوگ اس بہانہ سے کہ انسان ایک درجہ کے ہیں اور ان میں چند درجہ نہیں ہیں؛ یہ چاہتے ہیں کہ امریکہ اور صیہونیزم سے وابستہ گروہوں کو اہم عہدے مثلاً صدر مملکت کے عہدے پر بیٹھا دیا جائے۔

اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم شہریوں کا اختلاف ایک حد تک قابل قبول ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بنیادی قوانین میں بعض عہدوں کے لئے خاص شرائط رکھے گئے ہیں جیسا کہ خداوند عالم بھی ارشاد فرماتا ہے:

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۔ [1]

"اور خدا کفار کے لئے صاحب ایمان کے خلاف کوئی راہ نہیں دے سکتا"

اس طرح کا نظریہ جامعہ مدنی سے کوئی مخالفت نہیں رکھتا، لیکن اسلامی نظریہ کے مطابق وہ جامعہ مدنی جس میں کافر اور مسلمان تمام حقوق اور مختلف عہدوں پر فائز ہونے میں سب برابر ہوں؛ قابل قبول نہیں ہے اور ہم صاف طور پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ اسلامی معاشرہ پر کوئی کافر مسلط ہو اور مسلمانوں پر حکومت کرے، اسی طرح یہ بھی اجازت نہیں ہے کہ ایک ایسی پارٹی یا ایک ایسا مذہب جو ملحد اور صیہونیزم سے وابستہ ہو، اس کو قانونی طور پر مان لیا جائے؛ اس صورت میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اس چیز پر انسانوں میں درجہ بندی کی تہمت لگائیں یا کوئی دوسرا نام رکھیں۔

8۔ اسلامی انتخاب کے معیار سے مخالفت کے نئے حیلے

---

[1] سورۂ نساء آیت ۱۴۱

قارئین کرام! آج کل استکبار سے وابستہ بعض افراد اندرون ملک، انسانوں کے ایک درجہ کا نعرہ لگاتے ہوئے مغربی ممالک کی لیبرلیزم اور ڈیموکریٹک کو رائج کرنا چاہتے ہیں وہ اس مطلب کو معاشرہ کے اندر رائج کرنا چاہتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا ان کے حقوق بھی برابر ہیں اور ملک کے قوانین بناتے وقت ان کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔

اگر چہ انسانوں کے درمیان دو درجہ نہ ہونے کو اسلام بھی قبول کرتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ.[1]

"اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے"

مذکورہ آیت میں ذاتی اور تکوینی خصوصیات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے بلکہ سب برابر ہیں اور اس لحاظ سے انسانوں میں کسی درجہ بندی کا تصور بھی ممکن نہیں ہے لیکن اسی آیت کے ذیل میں عَرَضی فرق کی طرف اشارہ موجود ہے؛ یعنی اگر چہ تکوینی (ذاتی) طور پر تمام انسان ایک ہی درجہ کے ہیں لیکن اکتسابی خصوصیات اور انسانی صفات کے صاحب امتیاز ہو سکتے ہیں، اسی وجہ سے باتقویٰ افراد خدا کے نزدیک ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خداوند عالم کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں اسی طرح صلاحیت اور شائستگی کے لحاظ سے چونکہ ایک دوسرے میں فرق پایا جاتا ہے لہٰذا معاشرہ میں ان کو عہدہ اور مقام دینے میں بھی برابر نہیں رکھا جا سکتا، کیونکہ ہر عہدہ کے لئے خاص شرائط رکھے گئے ہیں مثلاً پوری دنیا میں یہ کہیں نہیں ہوتا کہ ایک جاہل انسان کو صدر مملکت بنا دیا جائے؛ تو کیا اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صدر مملکت کے عہدہ کے لئے پڑھے لکھے ہونے کی شرط لگانا؛ انسان کے برابر ہونے کے خلاف ہے؟ اور کیا یہ وہی انسانوں کے دو درجہ ماننا نہیں ہے؟

دنیا بھر میں اہم عہدوں مثلاً صدر مملکت کے عہدہ کے لئے خاص شرائط مقرر کئے گئے ہیں، ہماری حکومت میں بھی اسلامی ہونے کی وجہ سے اس کے لئے خاص شرائط رکھے گئے ہیں اور جس دلیل کے تحت صدر مملکت کو پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، اسی دلیل کے تحت ایک اسلامی ملک کے صدر مملکت کا اسلام کا حامی اور طرفدار ہونا ضروری ہے، اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ایسا شخص جو اسلام کا دشمن ہو، اسلامی ملک میں کسی بڑے عہدہ پر فائز ہو سکے؛ اور یہ مطلب اسلامی اصول پر منطبق ہے۔

پس اگر ممبر آف پارلیمنٹ یا دوسرے کاموں کے لئے مسلمان ہونے کی شرط لگائی گئی ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسانوں میں دو درجہ ہیں اگر اسلامی معاشرہ کے اندر ان حقوق اور ذمہ داریوں کے مقابلہ میں جو مسلمان انجام دیتے ہیں

---

[1] سورۂ حجرات آیت ۱۳

اسی طرح مسلمان خمس وزکواۃ ادا کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں، دوسرے ادیان کی پیروکاروں کے لئے الگ طریقہ پر حقوق اور وظائف معین کئے جائیں تو اس کا مطلب انسانوں میں درجہ بندی کے نہیں ہیں؛ اگر چہ ایک لحاظ سے ان فرقوں کی وجہ سے انسان کے درجے میں فرق پایا جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "مقام رہبری"، "ریاست جمہوری" اور دوسرے اہم عہدے اس شخص کو دیئے جاسکتے ہیں جو اسلام اور اسلامی حکومت کا مخالف ہو نیز بنیادی قوانین کو قبول نہ کرتا ہو، تو ایسا کرنا اس شخص کی مانند ہے جو اپنا کامل اختیار اپنے دشمن کو دیدے!! مسلماً ایسا کام نہ ہی عاقلانہ ہے اور نہ ہی ہونے والا، اور اگر بعض لوگ ایسا کرنا بھی چاہیں تو اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا؛ کیونکہ خداوند عالم نے کافروں کو مسلمانوں سے بہتر قرار نہیں دیا ہے اور مسلمانوں پر ان کی حکومت کو قبول نہیں کرتا یہ ہمارا عقیدہ ہے، اور ہمیں اس بات کا بھی ڈر نہیں ہے کہ ہم پر شہریوں کی درجہ بندی کی تہمت لگائی جائے۔

9۔ اسلامی اصول اور اقدار کی حفاظت اور دشمن زمینہ سازی سے مقابلہ کی ضرورت

ہم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام انسان، انسانیت میں شریک ہیں، لیکن بعض لوگ مغالطہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ تمام انسان، انسانیت کے ایک ہی درجہ پر فائز ہیں پس معاشرہ میں بھی ان کے تمام حقوق برابر ہونا چاہئے لیکن انسانیت میں برابر ہونے کا مطلب، حقوق میں بھی برابر ہونا نہیں ہے، اگر چہ تمام انسان انسانیت میں برابر کے شریک ہوں لیکن انسانی تمام لوازمات اور انسانی فضائل برابر نہیں ہیں، اسی چیز کے پیش نظر اسلامی معاشرہ میں ایسے بہت سے عہدے ہیں جن کے لئے خاص صلاحیتوں اور شائستگی کا ہونا ضروری ہے جس طرح رہبر کے لئے فقیہ (مجتہد) ہونا ضروری ہے تا کہ اسلامی احکام کے جاری ہونے پر نظر رکھے، اور اگر وہ اسلام ہی کو نہ سمجھے تو پھر اس کی حفاظت بھی نہیں کرسکتا، اسی طرح صدر مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہے، ایک یہودی یا عیسائی ایک ایسے معاشرہ پر حکومت نہیں کرسکتا جس کی ۹۰ فی صد آبادی مسلمان ہو۔

ہمیں اس چیز کا ڈر نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اخبار یا وہ صاحبان قلم جو عالمی استکبار سے وابستہ ہیں وہ ہم پر اس بات کی تہمت لگائیں کہ یہ لوگ شہریوں میں دو درجہ کے قائل ہیں کیونکہ ان سے امید بھی اور کیا ہوسکتی ہے، کیونکہ وہ لوگ تو اسلامی ضروریات کے بھی منکر ہیں ہمیں ہر حال میں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ واقعی اسلام کو دنیا والوں کے سامنے پیش کریں، نہ کہ جس طرح سے دشمن چاہتے ہیں ہمیں اسلامی اقدار کو کم رنگ نہیں کرنا چاہئے تا کہ ہمارا دشمن ہم سے خوش رہے۔

اگر ہم نے کوئی بات کہی یا کچھ لکھا تو اس سے امریکہ سے وابستہ اخبار یا ذرائع ابلاغ کو خوشی ہو اور وہ ہماری تعریف کریں، اس صورت میں ہمیں خوش نہیں ہونا چاہئے بلکہ اگر ہمارے کام سے ہمارا دشمن راضی اور خوشحال ہو، تو ہمیں غمگین ہونا چاہئے۔

افلاطون کے بارے میں مشہور ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے آکر کہا کہ "فلاں شخص تمہاری بہت تعریف کرتا ہے" یہ سن کر افلاطون رونے لگا، جب لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ "مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے ایسا کونسا جاہلانہ کام ہوگیا ہے جس کی بنا پر اس جاہل شخص کو مجھ سے خوشی ہوئی"!

لہذا اگر ہم سے دشمن کے نفع میں کوئی کام ہوگیا ہے جس کی بنا پر وہ خوشحال ہوگیا اور اگر اسلام کو اس طرح پہنچوایا کہ دشمن کو اچھا لگا تو گویا ہم نے دشمن کی خدمت کی ہے اسلام کی نہیں! ہمیں اس اسلام کا دفاع کرنا چاہئے جس کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام نے ہم تک پہنچایا ہے، نہ اس اسلام کا جس کی تلقین اسلام دشمن طاقت کر رہی ہے۔

قارئین کرام! خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ہم جامعہ مدنی کے اس خاص معنی کو قبول کرتے ہیں جو اسلام سے اخذ شدہ ہو، اور اس سے دور ہونا حقیقت میں اسلام سے دور ہونے کی وجہ سے ہے، لہذا اسلامی جامعہ مدنی کی بنا پر اصل یہ ہے کہ معاشرہ کے امور عوام الناس کے ذمہ ہوں لیکن مغربی ممالک کے جامعہ مدنی کے لحاظ سے جس میں دین سے دوری اختیار کی جاتی ہے نیز اس جامعہ مدنی میں تمام انسان چاہے کافر ہوں یا مسلمان؛ تمام کے اجتماعی حقوق اور معاشرہ میں عہدہ داری مساوی ہو ہم اس جامعہ مدنی کو قبول نہیں کرتے اگر چہ بعض لوگوں کی کوشش یہ ہے کہ تمام لوگ معاشرہ کے اہم عہدوں پر فائز ہونے کے اعتبار سے مساوی ہیں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر اور چاہے بنیادی قوانین کو قبول کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، اور اسی کو وہ جامعہ مدنی مانتے ہیں!! ہم اس طرح کے جامعہ مدنی کو رد کرتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک مسلمان اور غیر مسلمان ملک کے اہم عہدوں پر فائز ہونے کے اعتبار سے مساوی نہیں ہیں تو اسلام؛ ہمیں جامعہ مدنی کے نام پر، عالمی صیہونیزم سے وابستہ پارٹی کو اس ملک کے قانونی مذہب میں شمار کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔

ستائیسویں نشست

اسلامی حکومت کی خاص پہچان

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے گذشتہ نشستوں میں عرض کیا کہ ہماری بحث "اسلام کے سیاسی نظریات" کا یہ حصہ مخصوص ہے حکومت کی ذمہ داریاں اور اس کے اختیارات کی تحقیق و بررسی سے اور جو مباحث اس موضوع سے مربوط ہیں بے شک حکومت کی ذمہ داریوں کی صحیح شناخت تب ہی ہوسکتی ہے جب ہم حکومت کے فلسفہ کو سمجھ لیں، اور کوئی بھی مجموعہ، کوئی بھی عضو یا کوئی بھی حصہ ایک خاص ضرورت اور ایک خاص ہدف کے لئے بنایا جاتا ہے؛ کیونکہ اگر وہ اس کے ماتحت نہ ہوں تو اس میں نقص اور خلل واقع ہوجائے گا، اور پھر معاشرہ کی ضرورتیں اور مصالح مکمل طور پر محقق نہیں ہو پائیں گی پس ہر عضو یا ہر مجموعہ کے وظائف اور ذمہ داریاں ان کی ضرورت کے تحت؛ ان کے وجود کا تقاضا کرتی ہے۔

حکومت کے سلسلہ میں قانون گذار طاقت کی ضرورت واضح ہوگئی، کیونکہ کوئی ایسی ہیئت یا کمیٹی ہو جو معاشرہ کے لئے ضروری قوانین بنائے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوہ مجریہ (حکومت) کی کیا ضرورت ہے؟ وجود حکومت کا فلسفہ کیا ہے، اور اگر حکومت نہ ہوتی تو پھر کیا حالات پیدا ہوتے؟ اور اگر عوام الناس کی اس طرح سے اخلاقی اور معنوی تربیت ہوجاتی کہ وہ کسی بھی حال میں قانون کی خلاف ورزی نہ کرتے تو کیا پھر حکومت کی ضرورت نہ تھی؟ اس صورت میں حکومت کی اصلی علت معاشرہ میں قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت ہوگی، اس بنیاد پر بعض لوگوں کا یہ تصور ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جاسکتی ہے کہ خود اپنی مرضی سے اپنی ذمہ داریوں پر عمل کریں اور پھر کسی ضامن یعنی حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن مسلم طور پر یہ نظریہ حقیقت سے کوسوں دور ہے، اور جیسا کہ ہم نے حکومت کی ضرورت پر دلائل کے سلسلہ میں پہلے بھی عرض کیا کہ حکومت کی ضرورت پر ضمانت اجرائی کے علاوہ دوسرے دلائل بھی موجود ہیں؛ منجملہ معاشرہ کی عظیم اور اہم ضرورتوں کا ہونا جو معاشرہ کے تمام افراد سے متعلق ہوتی ہیں، اور کوئی خاص شخص یا کوئی خاص گروہ ان کا عہدہ دار نہیں ہوسکتا، اور ان میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ایک ایسی ہم آہنگ کمیٹی ہو جو اپنی منصوبہ بندی کے تحت معاشرہ کی ان ضرورتوں کو پورا کرسکے ہم نے یہ (بھی) عرض کیا کہ معاشرہ کی عام ضرورتوں میں سے ملک پر حملہ کرنے والوں کے مقابلہ میں جنگ اور دفاع کا مسئلہ بھی ہے بے شک جب جنگ زوروں پر ہوتی ہے تو کوئی خاص فرد یا خاص گروہ دشمن کے حملہ کو روکنے پر قادر نہیں ہوسکتا

اور تنہا جنگ کو ادارہ نہیں کر سکتا، بلکہ معاشرہ میں ایک ہمہ گیر اور سسٹامیٹک قدرت کا ہونا ضروری ہے تاکہ جنگ میں کامیابی مل سکے اور اپنی منصوبہ بندی کے ذریعہ عوام الناس کو جنگ میں شرکت کی دعوت دے اور ان کو ٹرینڈ کر کے جنگی فنون میں ماہر بنا کر آمادہ جنگ کرے۔

ان کے علاوہ معاشرہ کی دوسری ضروریات بھی ہوتی ہیں کہ جن کو پورا کرنا حکومت کے زیر سایہ ہی ممکن ہے؛ مثلاً معاشرہ میں حفظ الصحت، تعلیم وتربیت اور ضروری دانش کو پورا کرنا؛ اسی طرح دوسری ضروریات بھی ہوتی ہیں جن کے لئے مخصوص وزارت خانے ہونے ضروری ہوتے ہیں اور ظاہری بات ہے کہ معاشرہ کے حالات بدلنے اور نئی نئی قسم کی ضرورتوں کا ایجاد ہونا؛ جن کے لئے الگ الگ وزارت خانے ہونے ضروری ہیں: مثلاً معاشرہ کی ضرورت کے لئے بعض حالات میں اگر صرف پانچ وزارت خانے کافی ہوں لیکن نئی نئی ضرورتون کے پیش نظر ان وزارت خانوں میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، اور یہ مناسب نہیں ہے کہ قانون میں مخصوص تعداد میں وزارت خانے معین کئے جائیں بلکہ ان کی تعداد زمان ومکان کے شرائط کے لحاظ سے ہونا چاہئے لہٰذا اسلامی سیاسی نظریہ کے لحاظ سے بھی یہ معین نہیں ہے کہ اسلامی ملک کا صدر کتنے وزیر رکھ سکتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کو آزاد رکھا گیا ہے تاکہ زمانہ کے پیش نظر اور مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے وزارت خانے تعیین کئے جائیں۔

2۔نظام اسلامی اور لائیک نظام میں حکومت کے سلسلہ میں بنیادی فرق

قارئین کرام! یہ بات طے ہوچکی ہے کہ حکومت کی ضرورت کا فلسفہ معاشرہ کی مختلف ضرورتیں ہیں جن کو صرف حکومت ہی انجام دے سکتی ہے خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ حکومت کی مخصوص ذمہ داری؛ معاشرہ کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنا اور قوانین کا نافذ کرنا ہے۔

ہم نے قانون گذاری کی بحث میں یہ عرض کیا کہ وسعت کے لحاظ سے اسلامی معاشرہ کے قوانین لائیک حکومتوں سے مختلف ہیں: کیونکہ لائیک حکومتوں میں قوانین کو صرف عوام الناس کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے، اور ان کی حکومت کی بنیاد ہی عوام الناس کی صرف مادّی اور دنیاوی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ بعض حکومتوں میں اس بات کی شرط کی جاتی ہے کہ دین کے بارے میں کوئی حمایت نہ ہو، اور کسی بھی حکومتی ادارہ میں دین کی کوئی طرفداری یا اس کی حمایت دکھائی نہ دے۔

لیکن اسلامی حکومت میں قوانین کو صرف مادی ضرورتوں کے لحاظ سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ معنوی ضرورتوں کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے، بلکہ معنوی مصالح کو مقدم رکھا جاتا ہے یہ مسئلہ بالکل قوہ مجریہ (حکومت) میں بھی بیان ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں حکومت ان قوانین کو جاری کرنے کی ضامن ہے جو دنیاوی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور معنوی (اور اخروی) زندگی سے بھی متعلق ہوتے ہیں جس دلیل کے تحت ہم نے قانون گذاری کے سلسلہ میں عرض کیا کہ قوانین کو ایسا ہونا ضروری ہیں جن سے معنوی ضروریات بھی پوری ہوں بلکہ ان کو مقدم رکھا جائے، اسی دلیل کے تحت اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری

ہوتی ہے کہ معنوی مصالح، حقوق الٰہی اور اسلامی شعار (رسومات) سے متعلق قوانین کو بھی نافذ کرے، اور اس سلسلہ میں ہونے والی خلاف ورزیوں کا سدّ باب کرے اور اگر کوئی اسلامی مقدسات کی اہانت کرنا چاہے تو اس کو بھی روکے: بے شک یہ مسئلہ حکومت کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

3۔مغربی کلچر کے عاشق افراد کی طرف سے سیکولر حکومت کی پیش کش

بعض اخباروں اور تقریروں میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت کی ذمہ داری، عوام الناس کی مادی ضرورتوں کا پوری کرنے، ملک میں امن وامان کو برقرار رکھنے اور ہرج ومرج (افراتفری) سے روک تھام کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور معنوی اور دینی مصالح کو پورا کرنا علماء اور دینی مدارس کی ذمہ داری ہے! یہ نظریہ مغربی کلچر اور سیکولر طرز تفکر سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بھی عرض کیا کہ مغربی ممالک کے کلچر کا سب سے واضح امتیاز "سیکولرازم" ہے یعنی دین کو سیاست سے جدا کرنا لائیک اور بے دین حکومتوں میں دنیاوی امور حکومت سے متعلق ہوتے ہیں لیکن معنوی امور حکومت سے متعلق نہیں ہوتے اگر کچھ لوگ دین اور معنوی امور میں مشغول ہونا چاہتے ہیں تو اپنے اس ہدف کے تحت ذاتی امکانات کو خرچ کریں اور اس سلسلہ میں سرکاری امکانات سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ دین کے سلسلہ میں حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اسلامی ثقافت کے بالکل برعکس جس کے اہم ترین وظائف میں سے: اسلام کو حفظ کرنا، معاشرہ میں اسلامی شعار کو رائج کرنا اور ان کو بھلا دیئے جانے سے روک تھام کرنا نیز بے توجہی اور خدانخواستہ اسلامی شعار اور مقدسات کی توہین کرنا؛ وغیرہ ہے۔

جو لوگ اسلامی ثقافت کو قبول نہیں کرتے بلکہ مغربی کلچر کے تابع ہیں؛ ان کی طرف سے اس نظریہ کا پیش ہونا کہ "حکومت کو دینی امور میں دخالت نہیں کرنا چاہئے" بعید نہیں ہے اور ہمارا ان سے یہ اختلاف جنائی ہے اور ہماری ان سے یہ بحث ہے کہ اسلام حق ہے یا نہیں؟ لیکن یہ نظریہ ان لوگوں کی طرف سے جو خود کو مسلمان اور اسلامی اصول کا معتقد سمجھتے ہیں ان کے لئے مناسب نہیں ہے، اور اس طرح کی گفتگو کرنا اس بات کی نشانی ہے کہ انہوں نے اسلامی ثقافت کو نہیں سمجھا ہے۔

4۔اسلامی شعار کا حفظ اور رائج کرنا، حکومت کی ایک ذمہ داری

پس جو ذمہ داری مشترک طور پر لائیک اور دینی حکومت کی ہوتی ہے؛ اس کے علاوہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اسلامی شعار کو قائم کرے البتہ عوام الناس اپنی مرضی سے بعض اسلامی رسومات کو انجام دے سکتے ہیں؛ مثلاً نماز جماعت کا برقرار کرنا، محفل اور عزاداری کرنا، دینی مدارس قائم کرنا، اسلامی پروگراموں کے منعقد کرنے کے لئے ملی اور مذہبی مرکز قائم کرنا ان میں سے حوزات علمیہ دینی اہم مرکزوں میں شمار ہوتے ہیں جو عوام الناس کی دی ہوئی رقوم شرعی سے چلتے ہیں اور اسلامی شعار کے حفظ، ان کی ترویج اور اسلامی ثقافت کی تبلیغ میں مشغول رہتے ہیں، ان کے لئے حکومت کوئی فنڈ معین نہیں کرتی لیکن عوام الناس کا ان شعار کو انجام دینا حکومت کی ذمہ داری کو سلب کرنے کے معنی میں نہیں ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ پھر

ان امور میں حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی کیونکہ اگر عوام الناس کا رضا کارانہ طور پر کام کرنا کافی نہ ہوا تو پھر ان امور کو انجام دینا حکومت کی ذمہ داری ہے مثال کے طور پر: حج ایک عبادی وظیفہ ہے اور جو شخص مستطیع ہو جائے تو اس کے لئے حج کرنا واجب ہو جاتا ہے، مجتہدین کرام؛ فقہی کتابوں اور روایات سے استفادہ کرتے ہوئے اس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں کہ اگر ایک ایسا موقع آجائے کہ اسلامی ملک کے پورے معاشرہ میں کسی پر حج واجب نہ ہو یا اگر کسی پر واجب تو ہو گیا ہے لیکن وہ حج پر جانے کے لئے تیار نہ ہو، بلکہ نافرمانی کرے اور اپنی مرضی سے کوئی حج پر نہ جائے اور خانہ کعبہ کے خالی رہ جانے کا اندیشہ ہو، تو اس موقع پر اسلامی حکومتوں پر مسلمانوں کے بیت المال سے ایک گروہ کو حج کے لئے بھیجنا واجب ہے؛ کیونکہ وہ اسلامی شعار جو تمام ہی مسلمانوں کے لئے حفظ مصالح کے باعث ہیں وہ تعطیل نہیں ہونے چاہئیں۔

پس جبکہ حج ایک عبادی مسئلہ ہے اور دنیاوی اور سیاسی امور میں شمار نہیں ہوتا اور خود عوام الناس انجام دیتے ہیں اور اپنے پاس سے خرچ کرتے ہیں، لیکن اگر عوام الناس نے نافرمانی کی یا حج بجالانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں تو پھر اسلامی حکومت پر اسلامی شعار کو قائم کرنے اور قوانین کو جاری کرنے کے ضامن کے عنوان سے؛ یہ ذمہ داری ہے کہ حج کو انجام دینے کے مقدمات فراہم کرے۔

اس بنا پر اسلامی اور لائیک حکومت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی حکومت ہر چیز سے پہلے اسلامی شعار اور اسلام کے اجتماعی احکام وقوانین کو جاری کرنے کی فکر میں رہے اور ان کو مقدم رکھے البتہ عملی میدان میں معنوی اور مادّی امور میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا لیکن بالفرض اگر ان میں ٹکراؤ ہو بھی جائے تو پھر معنوی امور کو مقدم کرے۔

لہٰذا اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کی سرفہرست درج ذیل چیزیں ہونا چاہئے: اسلامی شعار کو قائم کرنا، قوانین اور اسلامی ثقافت کی حفاظت کرنا اور ایسی چیزوں کی روک تھام کرنا جو معاشرہ میں اسلامی ثقافت کے کمزور ہونے کا باعث بنے نیز کفر کے رسومات سے روک تھام کرنا۔

5۔ حکومت اور اس کے کرداری پہلو

قارئین کرام! ہم نے اس سے پہلے بھی عرض کیا کہ حکومت پر لازم ہے کہ وہ معاشرہ کی بعض ضرورتوں کو پورا کرنے کی خود ذمہ داری قبول کرے، مثلاً دفاع اور جنگ کا مسئلہ، جس میں منصوبہ بندی، سیاست گذاری اور اس کے اجرائی امور تمام مسائل حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں لیکن حکومت کے مخصوص کاموں کے علاوہ یہ بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرہ کی بعض ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنا کردار ادا کرے جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

1۔ حکومت صرف منصوبہ بندی، سیاست گذاری اور ان کے اجراء پر نظارت رکھے اور براہ راست ان امور میں دخالت نہ کرے۔

2۔ منصوبہ بندی، سیاست گذاری اور نظارت کے علاوہ ان امور کو خود اپنے ذریعہ انجام دے۔

مزید وضاحت کے لئے عرض کرتے ہیں کہ معاشرہ کے کسی ایک پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لئے پہلے اس کے مقاصد کا روشن ہونا ضروری ہے تا کہ اسی بنا پر منصوبہ بندی کی جاسکے، اس کے بعد اس کو آگے بڑھانے کے لئے اس کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو منظم کیا جاتا ہے کیونکہ کسی ایک پروجیکٹ کے لئے مدت معلوم ہونی چاہئے شروع اور ختم ہونے کی مدت معلوم ہو اور اس کا خرچ بھی موجود ہو اس مرحلہ کے بعد جو کمپنی اس کام کو کرنا چاہے اس کو طے کیا جاتا ہے؛ یعنی یہ معین کیا جاتا ہے کہ کون لوگ اور کس شکل میں اس پروجیکٹ کو انجام دیں گے، اس کا مدیر، اس میں کام کرنے والے اور ان کے وظائف معین کئے جاتے ہیں مثلاً امام خمینی انٹرنیشنل ایرپورٹ پروجیکٹ کو لے لیجئے: پہلے یہ طے ہوتا ہے کہ کیا اس ایرپورٹ کی ضرورت ہے یا نہیں (اگر چہ یہ بات ملک کی اہم سیاست گذاری سے متعلق ہے) جس کی بنا پر یہ طے ہوتا ہے کہ اس پروجیکٹ پر کام ہونا چاہئے یا نہ؟ اور جب پروجیکٹ کو قبول کرلیا جاتا ہے تو پھر اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور یہ طے کیا جاتا ہے کہ یہ پروجیکٹ کتنی زمین میں اور کس طرح کے امکانات کے ساتھ انجام دیا جائے اور کس نقشہ کے تحت ہو اس کے بعد اس کا مدیر اور اس کے شروع ہونے کی تاریخ معین کی جاتی ہے، آخر میں اس پروجیکٹ کی بولی لگائی جاتی ہے تا کہ جو کمپنی کم خرچ میں اس پروجیکٹ کو مکمل کرنے پر آمادہ ہو تو اس کام کو اس کے حوالے کردیا جائے اس صورت میں ایک وقت حکومت سیاست گذاری اور منصوبہ بندی کے بعد اس پروجیکٹ کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے اور کوئی سرکاری شعبہ یا کوئی وزارتخانہ اس پروجیکٹ پر کام کرتا ہے اور اس پروجیکٹ کا خرچ سرکاری خزانہ سے اور سرکاری افراد کے ذریعہ تکمیل ہوتا ہے یا کسی پروجیکٹ کو معین کرنے کے بعد کسی کمپنی کے حوالے کیا جاتا ہے تا کہ اس پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنائے، بہرحال دونوں صورتوں میں حکومت اس پروجیکٹ کو عملی بنانے کا وعدہ کرتی ہے لیکن ممکن ہے کہ حکومت کسی پروجیکٹ کے لئے ؛سیاست گذاری اور منصوبہ بندی کے بعد اس کام کو خود اپنے ذمہ نہ لے، اور اس کے خرچ اور اس پر کام کرنے کے لئے دوسروں کے حوالہ کردے اور خود صرف نظارت کرتی رہے؛ یعنی حکومت اپنی طرف سے کچھ معائنہ کار افراد کو معین کرتی ہے تا کہ قوانین اور مقررات کی خلاف ورزی کی روک تھام کی جاسکے اور نقشہ کے مطابق عمل نہ کرنے سے روکا جاسکے نیز عوام الناس کے مال کو تلف اور برباد ہونے سے روک تھام کی جاسکے اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ پروجیکٹ اسی اصل نقشہ کے تحت عمومی مصالح کے قوانین کے مطابق عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

6۔"ٹوٹالیٹر" (Totalitair) اور "لیبرل" حکومت کا ماڈل

ان پروجیکٹ کے مقابلہ میں معاشرہ کی ضرورتیں مثلاً جنگ اور دفاع، تعلیم وتربیت، علاج معالجہ اور شہر کی صفائی وغیرہ کا انتظام قاعدتاً حکومت کے ذمہ ہوتا ہے، لیکن یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت کی ذمہ داری صرف ان ضرورتوں میں منصوبہ بندی اور حداکثر نظارت ہوتی ہے؟ یا منصوبہ بندی اور نظارت کے علاوہ ان کو جاری کرنے کی بھی ذمہ داری اسی کی ہوتی ہے، اور بنیادی طور پر اسلام کی نظر میں کونسا طریقہ صحیح ہے؟ کیا اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے بنانے کا

خرچ حکومت کے ذمہ ہے؟ یا اس کا کچھ حصہ حکومت کے ذمہ ہوتا ہے اور کچھ حصہ عوام الناس کے ذمہ ہوتا ہے؛ جیسا کہ اکثر ممالک میں منجملہ ہمارے ملک میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم سب کے لئے ضروری ہے اور اس کا خرچ بھی حکومت کے ذمہ ہے، لیکن یونیورسٹی کی تعلیم کا خرچ حکومت کے ذمہ نہیں ہے بلکہ حکومت یونیورسٹی میں فیس لے کر اعلیٰ تعلیم دیتی ہے، اگر چہ بعض ملکوں میں یونیورسٹی کی تعلیم بھی مفت ہوتی ہے۔

بعض حکومتوں میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ معاشرہ کے زیادہ سے زیادہ امور حکومت کے ذریعہ انجام پائیں، اور یہ طریقہ کار بڑے بڑے مالداروں کی ظالمانہ رفتار اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے معاشرہ کے فوائد کو خطرہ میں ڈالنے والے افراد کے مقابلہ میں ایک عکس العمل ہے کیونکہ یہ جامعہ گرا) معاشرہ کی فکر رکھنے والا) نظریہ اور سوسیالیسٹ "Socialiste"، کمیونسٹ "communiste" ملکوں کا وجود میں آنا؛ مالدار ملکوں میں عوام الناس پر ہونے والے ظلم وستم کا نتیجہ تھا کیونکہ مغربی ممالک میں غریبوں کے حق میں مالداروں نے اس قدر ظلم کیا جس کے نتیجہ میں یہ شدت پسند نظریہ وجود میں آیا کہ تمام کام حکومت کے ذمہ ہو، اور حکومت کو ہونے والے عام فائدوں کو تمام لوگوں کے درمیان برابر سے تقسیم کیا جائے تا کہ تمام لوگ اجتماعی زندگی کے امکانات سے بہرہ مند ہوسکیں، درحقیقت عام زندگی کے امکانات سے تمام لوگوں کا برابر ہونا اور عوام الناس سے ظلم کو دور کرنا؛ معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل میں یہ نظریہ سوسیالیسٹ کا ہے جو دس بیس سال پہلے سے کافی رنگ لایا ہے اور میٹریالیزم [1] "Materialism" نظریہ کے ساتھ نیز فقر وغربت کو دور کرنے اور تمام لوگوں میں مساوات ایجاد کرنے جیسے نعروں کے ذریعہ بڑے بڑے ملکوں میں (قدیم) روس اور چین وغیرہ میں حکومت کرنے لگا اور اس کے بعد سے مالدار ممالک بلوک "Bloc" [2] کا سخت رقیب مانا جانے لگا۔

چنانچہ اس نظریہ کی جذابیت اور اس کے نعرے ہمارے ملک میں بھی بعض لوگوں کو بہت اچھے لگے اور ایک مدت تک اس نظریہ کی حمایت ہوتی گئی، نیز بہت سے افراد اس کے طرفدار بن گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ زمانہ میں (انقلاب اسلامی سے پہلے) ہمارے ملک میں بھی سوسیالیستی اور کمیونستی پارٹیاں تشکیل پائیں لیکن انقلاب اسلامی کی وجہ سے اس کی جڑیں ھل گئیں، اور اس کا بوریا بستر لپٹ گیا، تاریخی تجربہ نے یہ ثابت کیا کہ وہ حکومت (جو مالداروں اور صاحب قدرت لوگوں کو سوء استفادہ کرنے سے روک تھام کے نعرہ سے برسر پیکار آتی ہے) اس کا سیاسی، اجتماعی اور معاشی معاملات میں تمام کاموں میں ذمہ داری لینا صحیح اور کارآمد نہیں ہے، اور جلد ہی ان کے خاتمہ کا باعث اور کمیونستی بلوک کے ممالک کا شیرازہ بکھرنے کا سبب ہے مخصوصاً ہمارے شمالی پڑوسی ملک کا حال سب نے دیکھا کہ کمیونستی نظریہ کی اجتماعی اور سیاسی بنیادیں کس طرح ھلیں اور روس جیسی عظیم طاقت کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور اس ملک کی شہنشاہیت کا جنازہ نکل گیا۔

---

[1] وہ مادی فلسفہ جو معنویات کا منکر ہے اور صرف مادہ کو پہچانتے ہیں نیز خلقت کائنات کو مادہ کے اجزاء کی حرکت سے جانتے ہیں۔

[2] وہ چند متحد ملک جن کی سیاسی روش ایک ہو۔

قارئین کرام! مذکورہ نظریہ بھی فلسفہ سیاست میں ایک نظریہ ہے جس کی بنا پر حکومت معاشرہ کے مختلف امور میں زیادہ سے زیادہ دخالت رکھتی ہے، تاکہ مالداروں اور صاحب قدرت لوگوں کو ناجائز فائدہ اٹھانے سے روکا جاسکے (لیکن ہم اس وقت مذکورہ نظریہ کی کمزرویاں نہیں بیان کرنا چاہتے) اس کے مقابلہ میں کیمونسٹ "communiste"، سوسیالیسٹ "Socialiste" اور لیبرل نظریات ہیں جن کی بنا پر معاشرہ کے تمام امور خود عوام الناس کے ذمہ ہوتے ہیں، اور اپنے کام میں آزاد ہوتے ہیں کہ جس طرح چاہیں عمل کریں اس نظریہ میں حکومت معاشرہ کے کاموں میں کم سے کم دخالت کرتی ہے نیز اس کی دخالت ضروری حد تک اور معاشرہ میں بدنظمی کو روکنے کے لئے ہوتی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ لیبرل نظریہ میں چونکہ عوام الناس اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی امور سے مکمل طور پر آزاد ہوتے ہیں اور جو افراد زیادہ امکانات اور قابلیت رکھتے ہیں تو وہ لوگ تمام ہی چیزوں سے خصوصاً معاشی امور میں بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں سے مقابلہ جیت جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں اقتصادی کاروباران کو بہت زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے، جبکہ ان کے مقابلہ میں کمزور اور غریب لوگ جن کے پاس کم امکانات ہوتے ہیں وہ مزید غریب اور کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

لوگوں کے درمیان یہ اختلاف اور معاشرہ کے بہت کم مالدار افراد کا عمومی اور ملی سرمایہ کا مالک بن جانا، نیز معاشرہ کے دوسرے طبقات میں فقر وغربت کا بڑھنا؛ یہ سب سبب بنتے ہیں کہ عوام الناس اعتراض کرے اور حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے لگیں اور پھر ان کو سیاست میں آنے نہیں دیا جاتا، اس کے بعد کیمونسٹ نظام کا تشکیل پانا جس میں معاشرہ کے غریب لوگوں کا زیادہ دھیان رکھا جاتا ہے لیکن لیبرل ملکوں میں بھی حکومت کے خلاف مظاہروں اور انقلاب سے روکنے کے لئے کم درآمد لوگوں کو کچھ سہولتیں دی جاتی ہیں۔

اس وقت یورپی ممالک جن کے بہت سے ملکوں میں لیبرل نظام کی حکومت ہوتی ہے ان میں بھی سوسیالیسٹ "Socialiste" پارٹیاں اپنی کارکردگی دکھاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض حکومتوں میں سوسیالیسٹ یا سوسیال ڈیموکریٹک پارٹیاں کامیاب ہوتی ہیں مثلاً انگلینڈ کے پارلیمنٹ کے انتخابات میں "کارگر پارٹی" کبھی کبھی اکثریت سے کامیاب ہوجاتی ہے صرف اسی وجہ سے کہ اس کا نظریہ سوسیالیسٹ ہے اور اس نظریہ میں غریب اور کم درآمد لوگوں کو خیال رکھا جاتا ہے اور یہ بھی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ کہیں معاشرہ کا غریب اور کم درآمد طبقہ حکومت کے خلاف انقلاب برپا نہ کردے؛ کیونکہ جب معاشرہ کے تقریباً سبھی طبقات کے لئے عام سہولتیں مہیا ہوں گی تو پھر غریب عوام الناس حکومت کے خلاف قدم نہیں اٹھائیں گے عوام الناس کی سھولیات میں جن چیزوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

1۔ اپاہج اور بے کار لوگوں کے لئے بیمہ۔

2۔ میڈیکل بیمہ۔

3۔ سرکار کی طرف سے کم درآمد لوگوں کے لئے مکان بنوانا اور ان کو کم سے کم کرایہ پر دینا۔

حکومتی سیاسی فلسفہ میں ایک دوسرے کے مخالف نظریات پائے جاتے ہیں:

پہلا نظریہ سوسیالیسٹی ہے جس میں معاشرہ کو اصل مانا جاتا ہے اور معاشرہ کے مفاد کو ذاتی مفاد پر مقدم کیا جاتا ہے، کیونکہ اس نظریہ میں معاشرہ پر توجہ کی جاتی ہے چنانچہ اس نظریہ کو عملی بنانے کے لئے حکومت کی ذمہ داریوں اور دخالت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور معاشرہ کے اجتماعی امور میں حکومت کی ذمہ درایوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے تاکہ عمومی سرمایہ کو غارت ہونے اور غریب و مستضعف لوگوں پر ظلم و ستم ہونے سے روک تھام کر سکے۔

دوسرا نظریہ لیبرل ہے جس میں خاص دلیلوں کے تحت اس چیز پر اعتقاد رکھا جاتا ہے کہ حکومت کو معاشرہ کے امور میں کم سے کم دخالت کرنی چاہئے۔

قارئین کرام! آج کل تقریروں، اخباروں، مقالوں اور کتابوں میں جو لکھا جاتا ہے کہ حکومت کو کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ دخالت کرنی چاہئے انہیں دو نظریات کی بنا پر ہے اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یورپی اور مغربی ممالک میں اکثر لیبرل نظریہ پایا جاتا ہے اور ایسی حکومتوں میں (وہ ادارے بھی جو ہمارے ملک میں سرکاری ہوتے ہیں) اکثر ادارے پرائیویٹ ہوتے ہیں، مثلاً مذکورہ ممالک میں محکمہ ڈاک یا محکمہ ٹیلی فون سرکاری نہیں ہوتے بلکہ پرائیویٹ ہوتے ہیں، اور ڈاک کا سارا کام، نیز مختلف شہروں میں فون وغیرہ کی خدمات پیش کرنا پرائیویٹ کمپنیاں کرتی ہیں، وہاں پر حکومت صرف منصوبہ بندی اور نظارت کرتی ہے اسی طرح بجلی، پانی اور معاشرہ کے دیگر ضروریات کو پرائیویٹ کمپنیاں کرتی ہیں لیکن ہمارے ملک میں یہ چیزیں حکومت کے ذمہ ہوتی ہیں۔

7۔ اسلامی نظریہ کے تحت حکومت کیسی ہونا چاہئے

قارئین کرام! یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ نظریات میں سے اسلام کس نظریہ کو مناسب سمجھتا ہے؟ کیا حکومت کی وسیع پیمانے پر دخالت کو پسند کرتا ہے یا حکومت کی کم سے کم دخالت اور معاشرہ کے امور کو عوام لناس کے سپرد کرنے کو پسند کرتا ہے؟ جیسا کہ ہم نے پہلے جلسے میں عرض کیا کہ عوام الناس کا وسیع پیمانے پر مختلف میدان میں شرکت کرنا حقیقت میں "جامعہ مدنی" کے ایک معنی میں سے ہے، اور اس معنی کے لحاظ سے اجتماعی کاموں کو خود عوام الناس پر چھوڑ دیا جانا چاہئے کیونکہ جب ہم اسلامی اصول کی بنیاد پر حکومت کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ کو دریافت کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں اسلام کا رویہ درمیانی ہے؛ جو آرزوں اور حقیقت دونوں میں شامل ہوتا ہے۔

وضاحت:

بہت سی وہ تھیوری جو یونیورسٹیوں، حوزات علمیہ یا دیگر نشستوں میں بیان ہوتی ہیں؛ بہت اچھی اور دلربا ہوتی ہیں، لیکن ایک لحاظ سے یہ فقط خیالی اور آرمانی ہوتی ہیں جن کا عملی

میدان میں کوئی وجود نہیں ہوتا مثلاً یہ مفروضہ کہ عوام الناس کا کردار اتنا بلند کرنے کے لئے کوشش کی جائے تاکہ پھر

وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرے اور پھر ان کو کسی روکنے والے قانون یا حکومت کی ضرورت نہیں ہے اس فرضیہ کا تصور بہت اچھا ہے؛ لیکن عملی میدان میں کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ اس کو مجری قانون (حکومت) کی کوئی ضرورت نہ ہو دوسری طرف اس وجہ سے کہ معاشرہ میں ہمیشہ قانون کی خلاف ورزی ہوتی رہی ہے یہ بات بھی قابل قبول نہیں ہے کہ حکومت کی طرف سے اتنی سختی کی جائے کہ پھر کوئی قانون شکنی کی ہمت نہ کر سکے جیسا کہ بعض مارکسسٹ "Marxist"، فاشیسٹ "Fascist" [1] اور پولیس کی حکومتوں میں ہوتا ہے کہ سرکاری قوانین پر شدت کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے، اور پولیس اور فوج اس طرح سے مجرموں کے ساتھ برتاؤ کرتی ہے کہ (اس کو دیکھ کر) پھر کوئی قانون شکنی کی ہمت نہیں کرتا جس کا نمونہ ہمارا پڑوسی ملک عراق ہے جس نے ہم کو 8 سال تک جنگ کرنے پر مجبور کیا کیونکہ اس ملک میں فوجی حکومت ہے جو ہر قسم کی مخالفت اور اعتراض کا گلا گھونٹ دیتی ہے یہاں تک کہ اگر کسی سے کوئی چھوٹی سی بھی حرکت خلاف قانون دیکھی گئی تو اس کو عدالت کے فیصلہ کے بغیر ہی گولی ماردی جاتی ہے یا کسی دوسرے طریقہ سے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

معاشرہ کے غریب اور کم درآمد لوگ جس وقت رشوت اور مہنگائی کا بازار گرم دیکھتے ہیں اور ان کے سامنے مشکلیں آتی ہیں تو یہ آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش ان رشوت خور اور گران فروش لوگوں سے شدت کے ساتھ برتاؤ کیا جائے اور ان میں سے چند لوگوں کو سزائے موت دیدی جائے تاکہ پھر کوئی رشوت خوری اور گرانفروشی کی جرأت نہ کرے!! اس طرح کے واقعیات سوسیالستی ممالک میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن ہمیں اس سلسلہ میں اسلامی نظریہ دیکھنا چاہئے کہ اسلام مجرموں اور خلاف ورزی کرنے والوں سے شدت کے ساتھ برتاؤ کو کیسا سمجھتا ہے؟ کیا اسلامی نظریہ کے تحت مجرموں سے اس قدر شدت کے ساتھ پیش آنا صحیح ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی خلاف ورزی کی جرأت نہ کرے؟ یا مجرموں کے ساتھ اس قدر شدت نہ کی جائے بلکہ ان کو حتی الامکان آزادی دی جائے حکومت کی دخالت اور قوانین کا لاگو کرنا صرف معاشرہ میں آشوب اور ظلم وستم سے روک تھام کے لئے ہو۔

قارئین کرام! قرآن کریم اور احادیث شریف سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اسلامی حکومت ایک درمیانی اور معتدل راستہ اختیار کرے۔

اسلام کے فوجداری قوانین؛ بعض جرائم، اور بعض عفت کے منافی اعمال پر بہت سخت سزائیں معین ہیں، لیکن اسلام ان جرائم کو ثابت کرنے کے لئے خاص شرائط اور بعض محدویت کا قائل ہے جن کی وجہ سے صرف کم ہی جرائم عملی میدان میں ثابت ہوسکیں، اور ان قوانین کے نتیجہ میں سخت سزائیں بہت کم ہی موارد (مثلاً سال میں ایک یا دو مورد) میں دی جاتی ہیں۔

مثلاً قرآن مجید میں چور کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] ظالمانہ طریقہ حکومت، جو پہلی عالمی جنگ کے بعد اٹلی میں رائج تھا لیکن آج کل ڈکٹیٹر شپ "Dictaorship" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا.[1]

"چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو کہ یہ ان کے لئے بدلہ ہے"

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ.[2]

"زنا کار عورت اور زنا کار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگائیں اور خبردار! دین خدا کے معاملہ میں کسی مروت کا شکار نہ ہو جانا اگر تمہارا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے اور اس سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے۔"

لیکن اس طرف سے اسلام نے زنا کے ثابت ہونے کے شرائط بہت سخت قرار دیئے ہیں کیونکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ زنا کرنے والے کو یہ سزا اس وقت دی جاسکتی ہے جبکہ چار شاہد (گواہ) عادل اپنی آنکھوں سے زنا ہوتے دیکھیں اور گواہی دیں، اور سب کے سب گواہی دینے کے لئے عدالت میں حاضر ہوں، اور اگر چاروں عادل گواہی دینے کے لئے عدالت میں حاضر نہ ہوئے تو نہ صرف جرم ثابت نہیں ہوگا بلکہ ان پر "حد قذف"[3] جاری ہوگی، کیونکہ ان کی گواہی قابل قبول نہیں ہے اور خود ان کو ایک مومن پر تہمت لگانے کے جرم میں کوڑے لگائے جائیں گے۔

اسی طرح اسلام اجتماعی مسائل میں، حکومت کو معاشرہ کی تمام ہی ضرورتوں کو پورا کرنے یہاں تک کہ غیر ضروری ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا اور نہ ہی حکومت کو مکمل طریقہ پر دخالت سے روکتا ہے؛ بلکہ حکومت کی دخالت زمان و مکان کے لحاظ سے ہوتی ہے اور معاشرہ کی بعض ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

کبھی کبھی اس طرح کے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ "جامعہ مدنی" کی شکل "مدینۃ النبی" کی شکل پر ہو جس کی بنیاد یہ ہے کہ جو کام عوام الناس خود انجام دے سکتے ہوں، تو اس میں خود اپنی مرضی سے شرکت کریں مثلاً تعلیم و تربیت، بجلی، پانی وغیرہ جیسی ضرورتوں کا خود انتظام کریں؛ مگر بعض خود غرض اور فرصت طلب افراد ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں اور ان کا لالچ اور دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے کی وجہ سے معاشرہ کے غریب طبقہ کو ان کے حقوق سے محرومی کا سبب ہوتا ہو تو اس صورت میں حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ خود غرض اور مالدار لوگوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اجتماعی میدان میں اترے، اور کمزور لوگوں کے حقوق کا دفاع کرے، یا دوسرے طریقوں سے اپنا کردار نبھائے:

مثلاً اگر پرائیویٹ کمپنی ٹیلیفون خدمات بہت مہنگی کردے تو پھر حکومت کو اپنی طرف سے جو سستے داموں میں ٹیلیفون خدمات پیش کرے یا خدمات کرنے والے محکموں کو کلی طور پر اپنے ذمہ لے لے۔

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۳۸

[2] سورہ نور آیت ۲

[3] "حد قذف" زنا کی تہمت لگانے والے پر ۸۰ کوڑے لگائے جاتے ہیں، جس کی صراحت سورہ نور کی آیت نمبر ۴ میں وارد ہوئی ہے۔

8۔ متمرکز حکومتوں کے نقائص

قارئین کرام! مذکورہ نظریہ کی بنا پر اسلامی نظریہ کی اصل یہ ہے کہ معاشرہ کی ضرورتیں خود عوام الناس کے ذریعہ پوری ہوں، لیکن اگر خود غرض، فائدہ پرست اور مال و دولت کے لالچی افراد یا اس طرح کے گروہ کی وجہ سے دوسروں کے حقوق ضائع ہورہے ہوں تو پھر حکومت کو عملی میدان میں اترنا چاہئے، اور مناسب طریقہ کار، زمان و مکان کے لحاظ سے مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے؛ خلاف ورزیوں سے روک تھام کے لئے ضروری قدم اٹھائے کیونکہ یہی راستہ درمیانی اور معتدل ہے، کیونکہ عملی طریقہ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ معاشرہ کی تمام فعالیتوں کو حکومت کے ذمہ قرار دینا؛ بہت سی دلیلوں کی بنا پر صحیح اور مفید نہیں ہے مثلاً اگر حکومت؛ معاشرہ کی تمام ہی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہے تو پھر اس کو بہت بڑے سسٹم کی ضرورت ہے اور تقریباً بیس فی صد لوگوں کو سرکاری نوکریاں دینی پڑینگی اور اس طرح کے طریقہ کار پر تین اشکال ہوتے ہیں:

پہلا اشکال: اگر تمام ہی کام سرکاری طریقہ سے انجام دیئے جائیں تو پھر حکومت کو ایک بہت بڑے خرچ کی ضرورت ہے نیز معاشرہ کے لئے بھی بہت سی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔

دوسرا اشکال: (یہ اہم اشکال ہے) جس وقت اس طرح کا بہت بڑا سسٹم بنے تو اس کے درمیان خلاف ورزی بھی زیادہ ہوگی، جس وقت کم، محدود اور بہترین افراد پر یہ سسٹم مشتمل ہو تو اس میں خلاف ورزی بھی کم اور بہت معمولی ہوگی، لیکن اگر ایک عظیم سسٹم بنایا گیا اور تمام امور میں دخالت کرنے کا حق اس کو ہوگیا تو پھر اس میں خلاف ورزی اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے امکانات بھی زیادہ ہوجائیں گے مثال کے طور پر اگر حکومت مہنگائی روکنے کے لئے کوئی ادارہ بنائے جو دکانوں پر جاکر اس سلسلہ میں رپورٹ تیار کرکے حکومت تک پہنچائے لیکن اگر ہر دکان کے لئے ایک معائنہ کرنے والا معین کرے تو پھر آپ اندازہ لگائیں کہ کتنے لوگوں کو نوکری دینی ہوگی، اس کے علاوہ ان کے درمیان بھی خلاف ورزی زیادہ ہوں گی، اور ان میں سے بہت سے لوگ دکانداروں سے رشوت لیں گے تاکہ ان کے خلاف رپورٹ نہ بھیجیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کو ان معائنہ کاروں پر ایک اور ادارہ بنانے کی ضرورت ہوگی۔

جبکہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اس طرح کی منصوبہ بندی کامیاب نہیں ہوئی ہے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوا ہے بلکہ خلاف ورزیوں اور رشوت خوری میں اضافہ ہوا ہے۔

تیسرا اشکال: یہ اشکال (بھی) اسلام کی نظر سے اہم ہے، کیونکہ اسلام اس لئے آیا ہے کہ عوام الناس اپنی مرضی اور اختیار سے خودسازی اور نیک کام میں رغبت حاصل کریں، طاقت کے بل بوتے پر نہیں کیونکہ انسان کا کام اس وقت با اہمیت ہوتا ہے جب وہ اپنی مرضی اور اختیار سے انجام دے، لیکن اگر کسی کام کو مجبوری میں انجام دیا ہے تو پھر اس کام پر وہ معنوی اثر نہیں ہوگا جو اسلام چاہتا ہے اور اصلی مقصد پورا نہیں ہوگا۔

اٹھائیسویں نشست

اسلامی حکومت اور جائز آزادی اور اقدار کی رعایت کرنا

1۔ حکومت کی ضرورت پر ایک اشارہ

گذشتہ نشستوں میں قوۂ مجریہ (حکومت) کے فلسفہ پر گفتگو ہوئی، تاکہ اس کے سمجھنے کے بعد یہ معلوم ہوجائے کہ حکومت کے وظائف اور کیا کیا شرائط ہیں، اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے کیا شرائط ہونے ضروری ہیں؟ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا حکومت کے فرائض میں سے ایک فریضہ قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت ہے، جو دنیا بھر کی تمام حکومتوں میں مقبول ہے، اسی طرح اسلامی حکومت میں بھی جس میں قوانین یا تو براہ راست شریعت مقدسہ سے لئے جاتے ہیں یا وہ قوانین ان افراد کے ذریعہ مرتب ہوتے ہیں جن کو شریعت کی طرف سے اجازت حاصل ہوتی ہے، لہٰذا قوانین کو جاری ہونا چاہئے پہلے درجہ میں خود عوام الناس کو قوانین پر عمل کرنا چاہئے اور ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت اور اپنے وظائف پر عمل کرنا چاہئے، نیز معاشرتی، گھریلو اور بین الاقوامی روابط؛ اسلامی قوانین کے تحت ہونے چاہئیں۔

اپنے وظائف کو انجام دینے اور اجتماعی قوانین پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک مصمم ارادہ ہونا چاہئے، کیونکہ عوام الناس پہلے اپنے ذاتی مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں اور اجتماعی امور کے بارے میں کم ہی فکر کرتے ہیں، خصوصاً اس وقت جبکہ اجتماعی امور انجام دینے میں ان کا کوئی خرچ یا نقصان ہو، اس صورت میں ان کے درمیان بہت کم رجحان پایا جاتا ہے، مگر وہ افراد جو بہترین تربیت یافتہ ہوں اور معاشرہ کے فوائد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتے ہوں اس بنا پر اجتماعی امور میں اکثر خلاف ورزی اسی بنیاد پر ہوتی ہے کہ عوام الناس میں اجتماعی ذمہ داریوں کا زیادہ احساس نہیں پایا جاتا، اسی وجہ سے کچھ لوگوں کا ان قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت اپنے ذمہ لینا ضروری ہے تاکہ عوام الناس کو اجتماعی قوانین پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کریں، اور مخالفت کرنے کی صورت میں ان کو سزا بھی دلائیں۔

لہٰذا ایسی حکومت کا ہونا ضروری ہے جو (ضرورت کے وقت) اپنی طاقت کے ذریعہ ان قوانین پر عمل کرائے، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ ہر معاشرہ میں شروع ہی سے اس کی ضرورت کے تحت قوانین بنائے جاتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص کسی کے مال کو غصب کرنا چاہے تو اس کی سزا معین کی جاتی ہے تو اگر کسی نے اس قانون پر عمل نہ کیا اور دوسرے کے مال پر ہاتھ بڑھایا تو قانون کے رکھوالے اس کو سزا دیتے ہیں بعض حالات میں بات واضح نہیں ہو پاتی جس کے نتیجہ میں اختلاف

اور کشمکش پیدا ہوتی ہے یہاں تک کہ بعض موقع پر ایسے حالات بن جاتے ہیں کہ طرفین میں سے کوئی ایک بھی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتا لیکن چونکہ حق (بات) ظاہر نہیں ہے لہٰذا اپنے وظیفہ کو معین کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں، ایسے ہی حالات کے لئے "قوۂ قضائیہ" (عدالت) کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے تاکہ وہ قوانین کو ان کے مصداق پر منطبق (ٹیلی) کرے اور یہ طے کرے کہ کون حق پر ہے؟ اور اگر عدالت کی طرف سے فیصلہ ہونے کے بعد طرفین میں پھر بھی اختلاف باقی رہا اور اس فیصلہ کو نہ مانا تو اس موقع پر پولیس کے ذریعہ اس فیصلہ کو منوایا جاتا ہے لہٰذا یہ (بھی) طے ہوگیا کہ عدالت کا ہونا بھی ضروری ہے، البتہ ہمارے بیان کے مطابق عدالت کو قوہ مجریہ کے تحت ہونا چاہئے، لیکن بہت سے سیاسی فلاسفہ کے نزدیک قوہ قضائیہ کو حکومت اور پارلیمنٹ سے مستقل ہونا چاہئے۔

اس تقسیم کے تحت پارلیمنٹ کا کام قوانین بنانا، افراد کے حقوق کو معین کرنا اور خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا معین کرنا ہے، مثال کے طور پر پارلیمنٹ کے ذریعہ قانون معین کیا جاتا ہے کہ فلاں خرید وفروخت صحیح ہے یا باطل ہے، اس کے بعد مقرر شدہ قوانین کے تحت معاملہ ہوتا ہے لیکن اگر اس قانون کے منطبق کرنے میں شک ہوجائے اور معلوم نہ ہوسکے کہ معاملہ صحیح ہے تاکہ لین دین ہوسکے، یا باطل ہے؛ المختصر یہ کہ طرفین کے درمیان اختلاف ہوجائے تو اس صورت میں عدالت جانا ہوگا اور چونکہ عدالت کی ذمہ داری کلی قوانین کو ان کے مصادیق پر منطبق کرنا ہے اور قاضی کے فیصلہ کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ مثلاً زید، خالد کو فلاں مقدار میں مال دے، تو اگر طرفین نے یہ فیصلہ مان لیا ہے اور قانون کے مطابق عمل کیا تو ان کے درمیان معاملہ ختم ہوجائے گا، ورنہ حکومت کو درمیان میں آنا ہوگا اور پولیس کے ذریعہ زید سے مال لے کر صاحب حق (خالد) کو دینا ہوگا۔

ہم نے عرض کیا کہ حکومت کے اصل وظائف میں سے ایک وظیفہ اجتماعی قوانین اور احکام کو جاری کرنے کی ضمانت ہے، لیکن اس بات پر بھی توجہ رہے کہ قوانین جاری کرنا فقط حکومت میں منحصر نہیں ہے بلکہ دوسروں (عوام الناس) کو بھی قوانین جاری کرنے چاہئیں، جس طرح سے حکومت کی ذمہ داری صرف قوانین کو جاری کرنا نہیں ہے بلکہ وہ بعض مواقع پر قوانین بھی بنا سکتی ہے جیسا کہ "تفکیک قواہ" (تینوں قدرتوں کا مستقل ہونا) کی بحث میں بیان کریں گے، کیونکہ قانون گذاری اور قوانین کو جاری کرنے میں جدائی ممکن نہیں ہے اور ان کے درمیان رابطہ دنیا کی تمام ہی حکومتوں میں مقبول ہے، یعنی درحالیکہ حکومت کا کام قوانین کا جاری کرنا ہے لیکن بعض مواقع پر قوانین اور مقررات بھی بنانے ہوتے ہیں دوسری طرف پارلیمنٹ بھی بعض اجرائی کاموں میں دخالت کرتا ہے اور بعض موارد میں بعض اجرائی امور پارلیمنٹ میں طے پاتے ہیں؛ مثال کے طور پر تیل وغیرہ کے سلسلے میں دوسری حکومتوں اور بیرونی کمپنیوں سے معاملہ کرنا جبکہ معاملہ کرنا ایک اجرائی کام ہے، لیکن بغیر پارلیمنٹ کے طے کرنا ممکن ہے لہٰذا ان قدرتوں کے درمیان کوئی سرخ خط (لائن) نہیں ہے، جس سے ایک دوسرے کے کاموں میں بالکل دخالت نہ کرسکے، نہ حکومت قوانین بنانے کی قدرت رکھتی ہو اور نہ پارلیمنٹ اجرائی امور میں دخالت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، بہرحال یہ قدرتیں اپنے مخصوص مختلف کام رکھتی ہیں۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مذکورہ تکونی تقسیم (قوہ مجریہ، قوہ قضائیہ اور پارلیمنٹ) دنیا کی تمام ہی حکومتوں میں مقبول ہے، لیکن اسلامی حکومت قانون گذاری کے سلسلہ میں دوسری حکومتوں سے مختلف ہے: لائیک حکومتوں میں قانون گذاری کا معیار لوگوں کے دنیاوی اور اجتماعی امور ہوتے ہیں، لہٰذا قانون کو طے کرنے کے علاوہ ان کو جاری کرنے کا سلیقہ بھی اسی لحاظ سے ہوتا ہے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے قانون گذاری میں دنیاوی امور کے علاوہ اُخروی اور معنوی مصالح کو بھی نظر میں رکھا جاتا ہے، بلکہ قوانین مرتب کرتے وقت معنوی مصالح کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اسلامی حکومت اور سیکولر اور لائیک حکومتوں میں یہی بنیادی اور اصل فرق ہے اور ظاہری بات ہے کہ ایسی (اسلامی) حکومت کی ذمہ داری بھی دوسری حکومتوں کے نسبت زیادہ ہوتی ہے؛ یعنی (اسلامی) حکومت لوگوں کو اجتماعی امور کی رعایت کرنے اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے سے روکنے نیز ہرج ومرج (بدامنی) سے روک تھام کے علاوہ اسلامی اقدار کی بھی رعایت کرے اور ان کو جامہ عمل پہنائے۔

2۔ انسانی کردار میں اصل اوّلی

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ انسان کی مہم اور برجستہ صفات میں سے انتخاب اور اختیار کی قوت ہے، اسی وجہ سے انسان؛ حیوانات اور فرشتوں سے فرق رکھتا ہے: کیونکہ حیوانات کے کام ان کی شہوت کے تحت ہوتے ہیں جن میں انتخاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی اور اگر اتفاقی طور پر انتخاب ہوتا بھی ہے تو وہ بھی شہوت کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی ان کا انتخاب عقل وفکر کی بنیاد پر نہیں ہوتا اگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی حیوان کی تربیت کے ذریعہ اس کو بعض چیزیں سکھادی جاتی ہیں اور وہ اپنے مالک (مربی) کے اشارہ کے مطابق کام کرتا ہے یا کسی گھوڑے کی ایسی تربیت کی جاتی ہے جس سے وہ مالک کے بتائے ہوئے راستہ پر ہی چلتا ہے؛ تو اگرچہ یہاں پر (حیوان کی طرف سے) انتخاب ہوتا ہے لیکن یہ انتخاب بھی غرائز اور شہوات کی بنا پر ہوتا ہے۔

لیکن فرشتوں میں ملکوتی اور آسمانی صفات ہوتے ہیں، ان میں گناہ ومعصیت اور حق کی خلاف ورزی کا مادہ نہیں پایا جاتا ان کا شمار مقدسین اور مقربین میں ہوتا ہے ان کا مقام؛ عالی اور پاک وپاکیزہ ہوتا ہے، لیکن ان میں بھی انتخاب کا مادہ نہیں ہوتا، حقیقت میں ان کے اندر عبادت اور خداوند عالم کی بے چون وچرا اطاعت کا مادہ پایا جاتا ہے لیکن یہ انسان، خلیفہ خدا اور امانت الٰہی کا حامل ایک الگ ہی مخلوق ہے اس کے سامنے ہمیشہ دو راستے اور دو جاذبے سامنے رہتے ہیں ایک خدا کی طرف اور دوسرا شیطان کی طرف ان میں سے ایک راستہ کو انتخاب کرنے کی صلاحیت اس میں ہونا چاہئے، ورنہ اگر اس سے انتخاب کی قدرت سلب کرلی جائے اور مجبوراً کسی ایک راستہ پر لگادیا جائے تو اس میں انسانی خصوصیات اور امتیازات ختم ہوجائیں گے۔

لہٰذا انسانی کردار اور اس کی تربیت میں چاہے وہ انفرادی مسائل میں ہو یا گھریلو مسائل میں اور چاہے اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل ہوں سبھی میں اس کے لئے انتخاب کی راہ ہموار ہونا چاہئے تاکہ اپنے انتخاب کے ذریعہ صحیح راستہ کو اپنائے؛ نہ یہ کہ اس پر کوئی راستہ تھونپ دیا جائے لیکن کبھی کبھی اجتماعی مسائل انسان پر سختی کا تقاضا کرتے ہیں درحقیقت قوہ مجریہ اور

حکومت ایک ثانوی مصالح کی بنا پر ہے نہ اصل اولی کی بنا پر، یعنی اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ کے لئے ایک حکومت کا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ قوانین کو نافذ کرے یہاں تک کہ بعض حالات میں حکومت اپنی قدرت کے بل بوتے پر مجرموں کو بھی قوانین کی رعایت کرنے پر مجبور کرے، یہ اصل اولی کے برخلاف ہے کیونکہ اصلی اولی یہ ہے کہ قانون عوام الناس کے اختیار میں ہو وہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے اس پر عمل کریں اور کوئی (بھی) اس کی مخالفت نہ کرے، کوئی شخص بھی ایک دوسرے پر ظلم نہ کرے، رشوت نہ لے، چوری نہ کرے اور لوگوں کی جان و مال پر ہاتھ نہ بڑھائے لیکن اگر دیکھنے میں یہ آئے کہ ہمیشہ معاشرہ میں اس طرح کی خلاف ورزی ہوتی رہی ہیں، تو اس صورت میں پولیس کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ قانون کی خلاف ورزی ہونے سے روک تھام کرے لیکن اگر ایسا نہ ہوتو پھر پوری دنیا میں تباہی اور فساد پھیل جائے گا اور جو افراد صحیح راستہ پر چلنا (بھی) چاہتے ہیں ان کے لئے راستہ بند ہو جائے گا۔

لہٰذا معاشرہ کی اکثریت کے لئے صحیح راستہ کے انتخاب کی راہ ہموار رہنے کے لئے جرائم پیشہ اور خلاف ورزی کرنے والوں کی روک تھام ضروری ہے اور ضرورت کے تحت ان کو سزا بھی دینا ہوگی تا کہ ترقی اور پیشرفت کا موقع فراہم رہے، ورنہ بعض جسمانی یا علمی قدرت اپنی شیطانی چالوں کی بنا پر معاشرہ کے مصالح کو خطرہ میں ڈال دیں گے جس سے انسان کو پیدا کرنے کا الٰہی مقصد پامال ہو جائے گا۔

یہ بات بجا ہے کہ انسان کو آزادی اور اختیار کی بنا پر صحیح راستہ کا انتخاب کرنا چاہئے لیکن یہ آزادی نامحدود نہیں ہے اور دوسروں کو اتنا اختیار نہیں دینا چاہئے تا کہ وہ دوسروں کے انتخاب کا راستہ ہی بند کر دیں، اور قرآنی اصطلاح کے مطابق دوسروں کو خدائی راستہ پر چلنے سے روک دیں۔

لہٰذا طے یہ ہوا کہ خلاف ورزی کرنے والوں کا سد باب کیا جائے تا کہ وہ مومنین کو خدا کے راستہ پر چلنے سے نہ روکیں، لیکن اس بات پر بھی توجہ رہے کہ خلاف ورزی کی روک تھام اور قوانین کو جاری کرنے کے لئے حکومت کے زور اور طاقت کا استعمال بھی خاص قوانین کے تحت اور بہت ہی ظرافت اور باریکی کے ساتھ ہونا چاہئے جن مواقع پر اسلام معاشرہ کے فوائد کے پیش نظر طاقت اور زور کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کا دھیان بھی رکھتا ہے کہ اس وقت بھی انتخاب کی راہ مسدود نہ ہونے پائے، خلاف ورزی کرنے والے کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رہے مگر جرم اتنا خطرناک ہو کہ معاشرہ کے مصالح و فوائد کی حفاظت کرنے اور معاشرہ میں فساد و تباہی سے روک تھام کی غرض سے مجرم کو سزائے موت دینا پڑے۔

3۔ سزا دینے کے سلسلہ میں اسلام کا تربیتی پہلو

اسلام نے بعض جرائم کے لئے بہت سخت سزا معین کی ہیں، لیکن ان کو ثابت کرنے کے بھی سخت طریقہ پیش کئے ہیں جن سے جرم کا ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے دوسری طرف اگر کوئی خطرناک جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے سزا بھی ایسی ہی سخت معین کی ہے تا کہ دوسروں کے لئے بھی عبرت ہو اور وہ اس کو دیکھ کر اس طرح کے جرائم کا ارتکاب نہ کریں کیونکہ

سزا کے فلسفہ میں ایک حکمت یہ ہے کہ لوگ اس سزا کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں جس کے نتیجہ میں جرائم کم سے کم ہوں لہٰذا اس مقصد تک پہنچنے کے لئے جرم کے لحاظ سے سزا بھی ہونا چاہئے اور خطرناک جرائم کے لئے سزا بھی سخت سے سخت ہونا چاہئے، مثال کے طور پر چوری کے لئے کم سزا معین کی جائے مثلاً ایک مقدار جرمانہ یا کم مدت کے لئے قید، اس طرح جو لوگ چوری کرتے ہیں ان کے لئے وہ سزا (ایک حد تک) آسان ہو، تو اس صورت میں معاشرہ میں ہونے والی چوریوں کو نہیں روکا جاسکتا، جس کے نتیجہ میں خداوند عالم نے سزا کی جو حکمت رکھی ہے وہ پوری نہیں ہوگی۔

لیکن اگر جرائم ثابت کرنا آسان ہو جائے اور لوگوں کو آسانی سے سزا ہو جایا کرے تو پھر معاشرہ میں سزا زیادہ ہو جائے گی کیونکہ بہت سے لوگ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں، جس کے نتیجہ میں بہت سے خاندان کی حیثیت اور آبرو خاک میں مل جائے گی، اسی وجہ سے اسلام نے جرم کو ثابت کرنے کے طریقوں کو سخت قرار دیا ہے مثلاً زنا کے سلسلہ میں اسلامی سزا سخت ہے یہاں تک کہ اسلام نے حکم دیا ہے کہ زنا کار مرد اور عورت کو عوام الناس کے سامنے سزا دی جائے اور انسانی احساسات اور ہمدردی "حدود الٰہی" (اسلامی سزا) کے آڑے نہ آئیں معاشرہ سے اخلاقی برائیوں کو دور کرنے کے لئے زنا کی سزا عوام الناس کے سامنے دی جائے، ایسا نہ ہو کہ کسی مسلمان کی عزت و آبرو کے خیال سے اس کو چھوڑ دیا جائے لیکن دوسری طرف سے جرم کو ثابت کرنے طریقے ایسے سخت قرار دیئے ہیں تا کہ کم ہی لوگوں کے جرم ثابت ہوں، اور کم ہی افراد سزائے اعمال تک پہنچ پائیں۔

زنا کے سلسلہ میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ چار عادل افراد گواہی دیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ان کو زنا کرتے دیکھا ہے، یہاں تک کہ اگر تین افراد گواہی دیں اور چوتھا آدمی گواہی کے لئے نہ ہو تو ملزم کو بری کر دیا جائے گا اور قاضی ان تینوں کو سزا دے گا اور ان پر "حد قذف" جاری ہوگی۔

اسلامی احکام میں اس طرح کی ظرافت، باریکی اور دقت خصوصاً سزا کے سلسلہ میں اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ اسلام کا مقصد بلند و عالی اہداف کو جامہ عمل پہنانا اور عالی ترین اقدار کی رعایت کرنا ہے نیز معاشرہ کی حقیقتوں کی رعایت کرنا بھی ہے، اور صرف خیالی اور تصوراتی چیزوں پر اکتفاء نہیں کرتا در حقیقت معاشرہ کی ترقی کے لئے اسلامی طریقہ کار وہی ہے جس کو اسلام نے معین کیا ہے اور وہ "آرمان گرائی" (خیالی اور تصوراتی دنیا) اور "واقع گرائی" (حقیقت) کا درمیان راستہ ہے جس میں دونوں چیز شامل ہیں اسلام بلند اقدار کی رعایت ضروری مانتا ہے اور اس معاشرے کے اقدار کو خطرہ میں پڑ جانے کی اجازت نہیں دیتا؛ جیسا غیر اسلامی معاشرہ میں کیا کیا فسادات نظر نہیں آتے جس سے بہت زیادہ فساد اور بہت سی رسوائی سامنے آتی ہیں لہٰذا اسلامی معاشرہ کو ان برائیوں سے دور رکھنے کے لئے مجرموں کے لئے سخت سزا مقرر کی گئیں ہیں، دوسری طرف اسلام واقع گرا ہے اور یہ جانتا ہے کہ معاشرہ میں بعض لوگوں سے جرائم ہوں گے اسی وجہ سے حتی الامکان ان جرائم کو ثابت نہ ہونے کے لئے سخت طریقہ کار مقرر کئے ہیں الغرض قانون جاری ہونا چاہئے اور ان کو جاری کرنے والا ضامن ہونا چاہئے تا کہ اگر کوئی اس

کی خلاف ورزی کرے تو طاقت کے ذریعہ اس کو جاری کیا جاسکے، اس کے علاوہ انسانی خلقت کے اغراض ومقاصد کی بھی رعایت ہونا چاہئے اور وہ یہ ہیں کہ انسان کا کردار اختیاری اور اپنی مرضی سے ہو، دوسری طرف معاشرہ کے امور پر توجہ ہونا چاہئے تاکہ بے لگام آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشرہ کے مصالح کو خطرہ میں نہ ڈال دیا جائے۔

4۔ حکومت کے مخصوص ثابت اور متغیر کام

جس وقت ہم قوانین کو دیکھتے ہیں تو ان میں، بہت سے قوانین عوام الناس سے متعلق ہوتے ہیں جن پر عمل کرنا عوام کی ذمہ داری ہوتی ہے اور ان میں حکومت کا کام صرف کنٹرول کرنا، لوگوں کے قوانین کا لحاظ رکھنے کے سلسلہ میں منصوبہ بندی تیار کرنا اور خلاف ورزی سے روک تھام کرنا ہوتا ہے لیکن بعض قوانین خود حکومت سے متعلق ہوتے ہیں، اور خود حکومت کو ان پر عمل کرنا ہوتا ہے بلکہ عوام الناس ان پر عمل کرتی ہے کیونکہ قوانین کا یہ حصہ شہریوں کی ضرورتوں اور اقتصادی، سرمایہ گذاری اور خدمات سے متعلق ہوتا ہے جس کو عوام الناس انجام نہیں دے سکتی، اور عوام الناس ان کو انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتے یا اگر قدرت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی رضا کارانہ طور پر کوئی ان کو انجام نہیں دیتا، جن کے انجام نہ پانے سے معاشرہ کو نقصان کا سامنا کرنا ہوتا ہے؛ لہٰذا اس بات ایک منظم تنظیم اور ہم آہنگ کمیٹی بنام حکومت کو اس کام کی ذمہ دارہ سنبھالنے کی ضرورت ہے مثال کے طور پر بیرونی دشمن کے مقابلہ میں ملک کا دفاع کرنا، جنگ کرنا اور اس سلسلہ میں اسلحہ وغیرہ فراہم کرنا، یا پھیلنے والی خطرناک بیماریوں جیسے فلج اطفال (بچوں کا فالج) کے لئے "واکسیناسین" "vaccinatin" لگانا جو پورے ملک میں ایک معین دن صرف حکومتی پیمانہ پر ہی ممکن ہوسکتا ہے، اسی طرح عام صفائی یا بیماروں کے لئے ہاسپٹل وغیرہ کا انتظام کرنا، یا افیون وغیرہ جیسی نشہ آور چیزوں سے مقابلہ اور ان کے آنے جانے کے راستوں کو بند کرنا، اگرچہ عوام الناس بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ تا حد امکان لوگوں کو اس کام سے روک سکتے ہے لیکن وسیع پیمانہ پر اس عظیم برائی کی روک تھام کرنا عوام الناس کے بس کی بات نہیں ہے، اسی طرح ان برائیوں کا مقابلہ جو معاشرہ میں کافی پھیل چکی ہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب کام حکومت ہی کرسکتی ہے۔

قوانین کی تیسری قسم (عوام الناس) کی ضرورتیں ہیں جن کو خود عوام الناس بھی اور حکومت بھی انجام دے سکتی ہے لیکن زمانہ کے لحاظ سے ان اجتماعی امور کو انجام دینے کا طریقہ کار مختلف ہوجاتا ہے کیونکہ معاشرہ کے بہت سے امور مختلف زمانوں میں محدود طریقہ پر خود عوام الناس کے ذریعہ انجام پاتے رہے ہیں، لیکن آج کل کے لحاظ سے ان کو انجام دینے کی قدرت عوام الناس میں نہیں ہے اور اگر یہ ذمہ داریاں عوام الناس کے سپرد کردی جائیں تو پھر وہ پوری نہیں ہو پائیں گی، جس کے نتیجہ میں معاشرہ کے مصالح پورے نہیں ہونگے؛ اسی وجہ سے حکومت کو اس سلسلہ میں قدم اٹھانا ضروری ہوتا ہے جیسے بچوں کا تعلیمی سلسلہ، اگرچہ بچوں کی تعلیم خود والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن آج کل کے حالات اس طرح کے ہیں کہ اگر ملک میں تعلیمی ادارے نہ ہوں تعلیم سے متعلق قوانین الزامی اور ضروری نہ ہوں اور مذکورہ ادارے اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری نہ

نبھائیں تو پھر تعلیمی ترقی رک جائے گی اور جہل ونادانی کا رواج بڑھتا چلا جائے گا۔

اسی طرح آج کل کے ترقی یافتہ دور میں عام صفائی اور عام روشنی کا مسئلہ ہے اور یہ بھی حکومت کی ذمہ داری ہے، جب کہ گذشتہ زمانے میں حکومتوں کی یہ ذمہ داری نہیں ہوتی تھی اور بہت سی چیزوں کا تو بالکل وجود ہی نہیں تھا جیسے محکمۂ ٹیلویزن، لہٰذا یہ بات مسلّم ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں حکومت کی بعض نئی ذمہ داریاں پیدا ہوگئی ہیں اور وہ ذمہ داریاں جن کو خود عوام الناس بھی انجام دی سکتی ہے لیکن چونکہ کوئی رضا کارانہ طور پر تیار نہیں ہوتا اور اگر حکومت بھی ان ذمہ داریوں کو انجام نہ دے تو پھر معاشرہ کا برا حال ہوجائے گا، جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ علم ،ٹکنالوجی اور صنعت میں پیچھے رہ جائے گا، اور اس کے علمی اور معنوی مصالح پورے نہیں ہو پائیں گے، کیونکہ معنوی ترقی اور کمال؛ علم ہی کے زیر سایہ ہوتا ہے، معاشرہ میں علم ہی نہ ہو تو اس میں معنوی ترقی نہیں ہوسکتی۔

قارئین کرام! ہماری بیان شدہ باتوں کے ذریعہ حکومت کی اہمیت، اس کا ثابت ڈھانچہ اور اس کے ارکان واضح ہوجاتے ہیں، حکومت کے مقومات اور اس کے عناصر کے نہ ہونے پر حکومت کھوکھلی ہوجاتی ہے، اور وہ عناصر درج ذیل ہیں:

1۔ قوانین مدنی (شہری قوانین) اور معاشرہ کے حقوقی قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت، تاکہ اگر کوئی مخالفت کرے تو حکومت اپنی طاقت کے ذریعہ عوام الناس کو ان پر عمل کرنے پر مجبور کرے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے۔

2۔ معاشرہ میں ہمیشہ ضروری ثابت مصالح کو پورا کرنا، جن مصالح میں زمان ومکان کے بدلنے سے تبدیلی نہیں آتی، اور ان کو وسیع پیمانے پر صرف حکومت ہی انجام دے سکتی ہے مثلاً معاشرہ میں امن وامان کا برقرار کرنا حکومت کی ہمیشگی ذمہ داری ہوتی ہے، چاہے اس ملک کے عوام کی تعداد لاکھوں، کروڑوں اور اربوں ہی کیوں نہ ہو؟۔

لیکن وہ متغیر مصالح جو ہمیشہ حکومت کے ذمہ نہیں ہوتے اور اگر حکومت ان کاموں کو انجام نہ دے تو خود عوام الناس ان کو انجام دے سکتے ہیں لیکن آج کل کے نئے حالات ان ذمہ داریوں کو حکومت کے کاندھے پر رکھ دیتے ہیں، نیز نئی پیش آنے والی ضرورتیں حکومت کے مقومات میں قرار نہیں پاتیں۔

5۔ قوانین جاری کرنے کے طریقہ کار میں اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں میں فرق

اب جبکہ حکومت کی اہمیت اور اس کے وظائف معلوم ہوگئے ہیں، تو اسلامی حکومت اور دوسری حکومتوں کا فرق مختصر طور پر بیان کرنا مناسب ہے: اسلامی حکومت قوانین کے سلسلہ میں سیکولر اور لائیک حکومت سے، بہت زیادہ فرق رکھتی ہے اور اسلامی حکومت کا دائرہ دوسری حکومتوں سے وسیع تر ہے؛ کیونکہ اسلامی حکومت میں معنوی اور روحانی مصالح کو بھی اہمیت دی جاتی ہے، اسی طرح قوانین جاری کرنے کا طریقہ کار بھی دوسری حکومتوں سے مختلف ہوتا ہے مثال کے طور پر دنیا کی تمام حکومتیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں درآمد کی محتاج ہوتی ہے جس کا ایک حصہ ٹیکس وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے اسلامی حکومت بھی ولی فقیہ کی اجازت سے لوگوں سے ٹیکس حاصل کرنے کے لئے قوانین مرتب کرتی ہے اور ان کو نافذ کرتی ہے

چنانچہ ٹیکس کے سلسلہ میں بھی اسلامی حکومت دوسری حکومتوں سے فرق رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام؛ مالیات اور ٹیکس وغیرہ کے سلسلہ میں بھی انسانی وجود کے فلسفہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔

یعنی اسلام اس بات پر زیادہ زور دیتا ہے کہ انسانی کام اور اس کی کارکردگی اپنے انتخاب اور مرضی سے ہوں جن کے سبب اس کی معنویات میں اضافہ ہو مالیات وصول کرنے میں حکومت اپنی قدرت بھی استعمال کرسکتی ہے اور لوگوں کو ٹیکس دینے پر مجبور کرسکتی ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں تاکہ لوگوں کے ذہن پر ٹیکس وغیرہ گراں نہ گذرے اس لئے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے اعتراضات وغیرہ کم ہوجاتے ہیں جن میں ایک طریقہ یہ ہے کہ روزانہ کا وہ سامان جو عوام الناس ہر روز خریدتی ہے اسی میں ٹیکس رکھا جاتا ہے، اور عوام الناس اشیاء کی قیمت کے علاوہ ایک مقدار ٹیکس بھی حکومت کو ادا کرتی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ (مذکورہ طریقہ پر) ٹیکس ادا کرنے سے کسی کو کوئی ثواب اور جزا نہیں ملتی؛ لیکن اسلام اس موقع پر بھی انسان کے معنوی کمال کو مدنظر رکھتا ہے اسی وجہ سے لوگوں کو مالیات دینے پر مجبور نہیں کیا ہے اور خمس جیسے اسلامی ٹیکس کو جمع کرنے کے لئے کسی نمائندہ کو نہیں بھیجتا (جیسا کہ شیعہ فقہ میں ذکر ہوا ہے کہ اسلامی حکومت خمس کو زبردستی نہیں لیتی خصوصاً "ارباح مکاسب" (تجارت وغیرہ کی آمدنی) کا، ان چیزوں میں اگرچہ خمس واجب ہوچکا ہے لیکن خود مومنین اپنی مرضی اور رغبت سے اپنے سال کا حساب کرکے خمس نکالیں) اسی طرح زکوٰۃ میں اگرچہ اسلامی حکومت زکوٰۃ کو جمع کرنے کے لئے اپنا نمائندہ بھیجتی ہے، لیکن اس میں بھی لوگوں کی آزادی کا خیال رکھا جاتا ہے اسی وجہ سے جب زکوٰۃ جمع کرنے والے افراد مومنین کے پاس پہنچتے ہیں تو زکوٰۃ کی مقدار کو خود معین نہیں کرتے بلکہ خود مومنین حاصل شدہ جنس کی مقدار بیان کرتے ہیں تاکہ اس کی زکوٰۃ کا حساب کرکے، اور اس کو جمع کیا جاسکے یہاں پر (بھی) حقیقت حال جاننے کے لئے زکوٰۃ دینے والے کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ زکوٰۃ دینے والا سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے، مگر جبکہ اس کا جھوٹ واضح ہورہا ہو اور اسلامی حکومت کا نقصان ہورہا ہو، یا ان افراد کے لئے جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے، چنانچہ ان مواقع پر اسلامی حکومت اپنے طریقوں سے زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

قارئین کرام! معلوم یہ ہوا کہ اسلامی حکومت کا دوسری حکومتوں پر ایک امتیاز یہ ہے کہ قوانین کو جاری کرنے کے طریقہ کار میں اسلامی اقدار کا لحاظ رکھا جائے، اور اس موقع پر عوام الناس کی آزادی، ان کے انتخاب اور انسانی اقدار و شرافت کے طرفدار افراد اس نکتہ پر توجہ کریں کہ اسلام نے عوام الناس کی معقول آزادی کو مکمل طور پر نظر میں رکھا ہے، اور اس بات کی کوشش ہے کہ مومنین اپنی مرضی سے اپنے وظائف پر عمل کریں، جس کی بنا پر معنوی ترقی اور کمال کے درجات پر فائز ہوں اور اگر بعض موارد میں اسلام شدت سے پیش آتا ہے اور بعض لوگوں کے مطابق تشدد (شدت پسندی) سے کام لیتا ہے، تو وہ اس وجہ سے ہے کہ دوسرے، افراد کے معنوی کمالات حاصل کرنے کی راہ مسدود نہ ہوجائے اور اگر بعض لوگوں کو سخت سزا دی

جانے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں، اور وہ اس طرح کے کام کرنے سے باز رہیں جس کے نتیجہ میں معاشرہ میں مادیات اور معنویات کی ترقی ہو بہر حال اسلامی نقطہ نظر سے انفرادی آزادی مطلق (نامحدود) نہیں ہے اور جب یہ آزادی معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہو تو پھر یہ آزادی محدود ہو جاتی ہے، اور ضرورت کے وقت یہ آزادی محدود کر دی جاتی ہیں اور ضرورت کے وقت تشدد سے بھی کام لیا جاتا ہے، بعض مجرموں کو کوڑے لگتے ہیں اور بعض کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور بعض حالات میں، بہت ہی کم تعداد میں مجرموں کو سزائے موت بھی دی جاتی ہے لیکن یہ تمام سزائیں اس وجہ سے ہیں کہ ان کو دیکھ کر مجرمین عبرت حاصل کریں اور قانون کے مطابق عمل کریں۔

ظاہری بات ہے کہ جب اسلام نے چوری کرنے اور عوام الناس کے چین وسکون اور امنیت کو ختم کرنے والے کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے، تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور چوریاں کم ہوں، اور اس رسوائی میں پھنسنے کے راستے کم ہوں لیکن اگر اسی چوری کے لئے آسان سے آسان سزا رکھی جاتی مثلاً چور کو کچھ مدت کے لئے قید کرنا یا ایک مقدار میں جرمانہ ادا کرنا تو پھر چوروں کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی، اور ممکن تھا جو لوگ کسی جرم کی بنا پر زندان میں ہوں تو چوروں کے ساتھ رہنے سے وہ بھی چوری کرنا سیکھ جاتے۔! قارئین کرام! ہم حقیقت کہنے سے نہیں ڈرتے اور واضح طور پر کہتے ہیں کہ اسلام میں شدت عمل اور (سخت) سزائیں اور غیروں کے مطابق تشدد ہے مجرموں اور فاسدوں کے لئے بھی تشدد روا ہے اور کفار اور اسلام کے دشمنوں کے لئے بھی؛ جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۚ [1]

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں۔

اسی طرح خداوند عالم لوگوں کو عبرت دینا اور مجرم کو ذلیل کرنا ضروری سمجھتا ہے:

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ. [2]

"اور اس سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے"

قارئین کرام! آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلام اور قرآن بعض موارد میں تشدد کے ساتھ عمل کرنے اور مجرم کو ذلیل کرنے کو ضروری سمجھتا ہے، اور ہم ان آیات کو قرآن سے نہیں مٹا سکتے اگر اس طرح کی سزا کو بعض لوگ انسانی شرافت کے خلاف سمجھتے ہیں تو ہم عرض کرتے ہیں کہ اجتماعی مصالح کی حفاظت کے لئے بعض مواقع پر مجرموں اور فاسدوں کے ساتھ انسانی شرافت کے خلاف کام واجب اور ضروری ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی سزا حقیقی خشونت نہیں ہیں بلکہ عوام الناس کی اجتماعی معقول آزادی سے بہرہ مند ہونے کی راہ ہموار کرنا اور اس کا ایک مقدمہ ہے۔

---

[1] سورہ فتح آیت ۲۹

[2] سورہ نور آیت ۲

انتیسویں نشست

اسلامی حکومت کی ذمہ داری کے بارے میں نظریات

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ ہم نے گذشتہ نشستوں میں عرض کیا کہ اسلامی سیاسی نظام میں حکومت کی اہمیت اور اس کے قوانین کو نافذ کرنے کی ذمہ داری کی معرفت اس بات پر مبنی ہے کہ حکومت کی تشکیل خصوصاً اس سلسلہ میں اسلامی آئیڈیل کی شناخت کی جائے اسی طرح ہم نے حکومت کے وظائف اور ذمہ داریوں کے بارے میں بیان کیا تھا جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

1۔ ان قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت جو براہ راست عوام الناس کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2۔ کیفری اور سزائی قوانین کا جاری کرنا جو براہ راست حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں؛ یعنی اگر بعض لوگوں نے قوانین اوّلی پر عمل نہ کیا اور ان کی خلاف ورزی کی تو ان لوگوں کو سزا دے نا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

3۔ معاشرہ کی ان ضرورتوں کو پورا کرنا جن کو صرف حکومت ہی انجام دے سکتی ہے اور وہ انفرادی یا گروہی شکل میں انجام نہیں دی جاسکتیں جس کی بہترین مثال بیرونی دشمن کے مقابلہ میں دفاع ہے، عوام الناس اور گروہوں کی قدرت سے بالاتر ایک قدرت (حکومت) ہو جو اس کام کو اپنے ذمہ لے، (اور بیرونی دشمن کو دندان شکن جواب دے سکے)۔

4۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنا جو پہلے مرحلہ میں حکومت کے ذمہ نہیں ہیں بلکہ خود عوام الناس بھی ان امور کو انجام دے سکتی ہے، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر وہ عملی جامہ نہیں پہن پاتی ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی خاص فرد ذمہ دار ہوتا ہے مثلاً عام صفائی اور دیگر خدمات وغیرہ جن کو خود عوام الناس بھی انجام دے سکتی ہے لیکن ان کاموں کو انجام دینے میں رغبت نہیں پائی جاتی، یا ان کے وسیع ہونے یا ان میں مشکلات ہونے کی وجہ سے ان کے لئے خاص طریقہ پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کام کو حکومت ہی انجام دے سکتی ہے۔

5۔ حکومت کی مہم ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری معاشرہ کے عام درآمدی منابع سے فائدہ اٹھانا ہے جس کو اسلامی ثقافت میں "انفال" کہا جاتا ہے، مثلاً جنگل، دریا، تیل اور گیس، یا سونے چاندی کی کانیں وغیرہ جن کا کوئی مخصوص مالک نہیں ہوتا اور کسی کو ان سے ذاتی طور پر فائدہ اٹھانے کا حق (بھی) نہیں ہوتا، تو انہیں چیزوں کے پیش نظر اس بات کی ضرورت ہے کہ ان چیزوں کی حفاظت کے لئے کوئی کمیٹی (یا حکومت) ہو تا کہ ان معدنوں سے صحیح فائدہ اٹھا کر معاشرہ کی ا

صلاح کے لئے خرچ کیا جاسکے۔

ظاہری بات ہے کہ حکومت کے وظائف اور اس کی مخصوص ذمہ داریوں کی شناخت کے بعد اس کے وجود کا فلسفہ بھی (آسانی) سے سمجھا جاسکتا ہے اسی طرح عام طور پر اس کی اہمیت بھی معلوم ہوجاتی ہے، لیکن اس نکتہ پر توجہ ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کا خاص امتیاز یہ ہے کہ وہ مادی امور جن کو عام حکومتیں بھی انجام دیتی ہیں ان کے علاوہ معاشرہ میں معنوی اور روحانی امور کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے، اسی لئے اسلامی شعار کی حفاظت کرنا، دینی عام معلومات کا فراہم کرنا اور اسلام و اسلامی مقاصد کو بہتر سے بہتر رواج دینا اسلامی حکومت کی مخصوص ذمہ داری ہے۔

2۔ اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کے شرائط

اب جبکہ معلوم ہوگیا کہ اسلامی حکومت کی عظیم ذمہ داریاں ہوتی ہیں تو پھر حکومت کے مختلف عہدہ داروں میں کن شرائط کا ہونا ضروری ہے کیونکہ عہدہ داروں کے شرائط بھی ان کے وظیفوں کے لحاظ سے ہونا ضروری ہیں، اور جس قدر وظائف عظیم اور مہم ہونگے اسی لحاظ سے اس کے عہدہ داروں کے شرائط بھی عظیم ہونا ضروری ہیں، اور چونکہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری دوسری حکومتوں سے زیادہ ہوتی ہے تو اس کے عہدہ داروں کے لئے بھی مہم شرائط ہونا ضروری ہیں ہر حکومت میں قوانین کو نافذ ہونا چاہئے، لیکن لائیک حکومتوں کی نسبت اسلامی حکومت کے قوانین کا دائرہ وسیع تر ہے جیسا کہ ہم نے قانون کے سلسلہ میں عرض کیا کہ غیر دینی حکومتوں میں قوانین کو صرف معاشرہ کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے، جیسا کہ سیاسی فلاسفہ کہتے ہیں کہ حکومت کی ذمہ داری صرف اجتماعی طور پر امن وامان قائم کرنا اور ہرج ومرج (بدامنی) سے روک تھام ہے، لہٰذا اس طرح کے اہداف آسان شرطوں کے ساتھ پورے ہوسکتے ہیں، لیکن اگر اس مقصد کے ساتھ ایک عظیم ہدف معنوی مصالح اور دینی و الٰہی اقدار کا اضافہ ہوجائے (جیسا کہ قانون اساسی (بنیادی قوانین) میں موجود ہے اور ان کو نافذ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے) تو اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کے شرائط دیگر حکومتوں کے عہدہ داروں سے سخت ہوجائیں گے۔

قارئین کرام! ہم اپنے اس مقدمہ کو بیان کرنے کے بعد مناسب سمجھتے ہیں کہ قوانین نافذ کرنے والے عہدہ داروں کے شرائط بیان کریں، (لہٰذا ہم عرض کرتے ہیں کہ) قوانین کے نافذ کرنے والے عہدہ داروں کے عام طور پر تین شرائط ہیں جن کے بارے میں تمام حکومتوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ وہ شرائط عہدہ داروں میں ہونے چاہئے، اور اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کے شرائط کے سلسلہ میں قرآن وحدیث میں بیان شدہ دلائل کے علاوہ ایسے عقلی (اور منطقی) دلائل ہیں جن میں انسان اعتراض نہیں کرسکتا:

الف۔ قانون کی پہچان

جو شخص قانون کو نافذ کرنے کا عہدہ سنبھالنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس سے آگاہی ضروری ہے نیز اس کے شرائط اور اس کو جاری کرنے کا طریقہ کار بھی جانتا ہو اگر کوئی شخص قانون نہ جانتا ہو تو اس کو نافذ بھی نہیں کرسکتا، جس کی بنا پر قانون کو

نافذ کرنے میں غلطی کر بیٹھے گا اور اپنی ذمہ داری کو ہی نقصان پہنچائے گا اور چونکہ اسلامی حکومت کے قوانین اسلامی اصول کے مطابق ہوتے ہیں تو ہر عہدہ دار اور مدیر کے لئے اپنے ماتحت انجام پانے والے امور کے بارے میں شرعی قوانین کا علم ہونا ضروری ہے کیونکہ ان قوانین کے تحت کام کرنا اس کی ذمہ داری ہے اور جو شخص کسی کام کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے تو اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا خاص اہمیت رکھتا ہے اور چونکہ جیسی ذمہ داری ہوتی ہے اسی لحاظ سے اس کی اہمیت ہوتی ہے مثال کے طور پر کسی انسان کو ایک چھوٹی سی ذمہ داری دی جاتی ہے تو اس کے قوانین اور مقررات بھی محدود ہوتے ہیں لیکن کبھی اس کی ذمہ داری اس سے بڑھ کر ہوتی ہے جیسے ڈپٹی کمشنر تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ماتحت مختلف اداروں، ان میں نافذ ہونے والے قوانین اور ان کی دیکھ بھال کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہو، اسی طرح ذمہ داریاں بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وزیر اور وزیر اعظم یا صدر مملکت جو ملک کا سب سے بڑا عہدہ ہوتا ہے اس کے لئے مختلف قانون کے بارے میں مزید معلومات کا ہونا ضروری ہے، لہٰذا اس عظیم عہدہ کے لئے وہی شخص لیاقت رکھتا ہے جو دوسروں سے زیادہ قوانین کے بارے میں علم رکھتا ہو۔

ب۔ اخلاقی صلاحیت

اسلامی حکومت کے عہدہ دار، مدیر اور کارگزاروں کو قوانین کے بارے میں معلومات رکھنے کے علاوہ ان میں اخلاقی شائستگی ہونا (بھی) ضروری ہے تاکہ اپنے عہدے اور موجود امکانات سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے، اور ان کو اپنی ذمہ داری کو صحیح طور پر نبھاتے ہوئے ان کو کام میں لائے، اور اس میں ذاتی مفاد یا کسی خاص گروپ کا فائدہ اس کو اپنے وظائف پر عمل کرنے سے نہ روکے ممکن ہے کوئی شخص قوانین کو خوب اچھی طرح جانتا ہو لیکن اگر اس قانون کو جاری کرنا اس کے نفع میں نہ ہو تو ہوسکتا ہے وہ اپنے فائدہ کے لئے قانون کو پامال کردے اس کی مثال دنیا کے مختلف ممالک میں دیکھنے کو ملتی ہے کہ ملک کے بڑے بڑے عہدہ داروں نے کتنا غبن کیا (کیسے کیسے گھوٹالے کئے) جن کی خبریں دنیا بھر کے اخباروں کی سرخی بنتی ہیں کہ مثلاً فلاں ملک کا صدر مملکت فلاں گھوٹالے کی وجہ سے جیل بھیج دیا گیا یا فلاں وزیر یا فلاں عہدہ دار کو فلاں سزا ہوگئی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ قوانین کو اپنے حق میں مانع دیکھتے ہیں، (لہٰذا ان کو پامال کرتے ہوئے اپنے منافع کو ترجیح دیتے ہیں)، ان میں تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ جس کی وجہ سے معاشرہ کو اپنی ذات پر ترجیح دیں اسی وجہ سے وہ قوانین کو پامال کردیتے ہیں۔

لہٰذا طے یہ ہوا کہ قانون کے رکھوالوں کے لئے اخلاقی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے اور اس قدر تقویٰ ہونا ضروری ہے کہ اپنی ہوا و ہوس اور ذاتی مفاد کا مقابلہ کریں اور (ہمیشہ) حق کو مقدم رکھیں۔

ج۔ مدیریتی مہارت اور تجربہ

قانون کے ذمہ دار افراد قانون کو صحیح طریقہ سے جاری کریں اور ان کو خاص اور جزئی موارد میں منطبق کرنے کے

4۔اخلاقی صفات کے بارے میں "کانٹ" کے نظریہ کی رد

جو لوگ اخلاقی فلسفہ سے آشنائی رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ جرمنی فیلسوف "کانٹ" کا ایک نظریہ ہے جس کے بہت زیادہ طرفدار (بھی) پائے جاتے ہیں، اس کا نظریہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی صفت اس وقت اہمیت پیدا کرتی ہے جب وہ بلند ترین درجے پر فائز ہو اور کسی دوسری چیز پر توجہ کئے بغیر اس کو اپنایا جائے، محبت، احساسات اور معاشرہ کی وجہ سے نہ ہو، یعنی اگر انسان کوئی نیک کام کرنا چاہے تو فقط اس کو اس کے نیک ہونے کی وجہ سے انجام دے، اس پر مرتب ہونے والے اثر (وثواب) کے لئے نہیں، اور نہ اپنی خواہش کو پورا کرنے یا محبت کی تسکین کے لئے، لہٰذا اگر کوئی ماں آدھی رات بچے کے رونے کی آواز سن کر اپنی میٹھی نیند سے بیدار ہو کر بچے کو اپنی گود میں لے اور اس کو دودھ پلائے، اگرچہ عوام الناس کی نظر میں یہ کام بااہمیت ہے، لیکن کانٹ کے نزدیک اس کام کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے کیونکہ ماں نے اپنی مامتا اور بچے سے شدید محبت کی وجہ سے اس کو دودھ پلایا ہے اور اگر وہ اس بچے کو دودھ نہ پلائے تو پریشان ہو جائے گی، درحقیقت ماں نے اس بچے کو دودھ پلا کر اپنی مامتا کو ٹھنڈا کیا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کام کو معاشرہ کی بھلائی کے لئے انجام دے یا عوام الناس کے اعتماد کو جلب کرنے کے لئے سچ بولے، تو ان کاموں کی کوئی ارزش و اہمیت نہیں ہے سچائی کی اہمیت اس وقت ہے جب صرف اس کی خوبی کو مدنظر رکھ کر سچ بولے۔

قارئین کرام! جیسا کہ آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ کانٹ نے اخلاقی اقدار کے لئے بہت سخت شرائط بیان کئے ہیں جس کے تحت بہت کم افراد ہی اس کے مصداق مل پائیں گے، اور بہت ہی کم افراد اخلاقی اقدار والے مل پائیں گے؛ کیونکہ یہ اخلاق کبھی تو مامتا کی وجہ سے یا اور کبھی اجتماعی فائدہ کی وجہ سے یا اُخروی ثواب کے لئے ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر اخلاقی صفات میں تمام صفات پائے جائیں تو وہ صحیح ہے لیکن اگر ان میں کچھ شرائط نہ پائے جائیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اسی طرح دوسری چیزوں میں بھی منجملہ سیاست اور حکومت کے بارے میں، کہ وہ حکومت برحق ہے جس کے تمام عہدہ دار اعلیٰ شرائط پر فائز ہوں اور اگر ایسے افراد موجود ہوں تب کہیں حق کی حکومت کی بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔

اسلامی انقلاب سے پہلے ہمارے معاشرہ میں بھی بعض دیندار افراد لیکن سخت دل اور کج فکر رکھنے والے اس طرح کا نظریہ رکھتے تھے اور کہتے تھے: اگر اسلامی حکومت بنانا چاہتے ہیں تو جب ہمارے معاشرہ میں سلمان فارسی جیسے افراد کی تعداد کافی مقدار میں موجود ہوں گی تاکہ ایسے ہی افراد کو شہر کا حاکم بنایا جائے، اور جب تک ہمارے پاس ایسے افراد نہ ہوں تو پھر ہمیں انقلاب لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ان تنگ نظر لوگوں کا نظریہ تھا کہ حضرت امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے ظہور تک اسلامی انقلاب کے لئے راستہ ہموار نہیں ہوگا، لہٰذا ہمیں انقلاب کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور ہمیں انتظار کرنا چاہئے یہاں تک کہ حضرت امام

مہدی (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) اپنے تین سو تیرہ ممتاز ساتھیوں کے ساتھ آکر انقلاب برپا کریں اور عدل وانصاف کی حکومت قائم کریں ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اس وقت تقویٰ اور اخلاقی صفات کے مالک افراد نہیں ہیں لہٰذا انقلاب برپا کرنا صحیح نہیں ہے متقی اور مخلص افراد کی تعداد اس قدر ہو کہ حکومت کے مہم عہدے ان کے سپرد کیے جاسکیں، تا کہ وہ معاشرہ کو صحیح طریقہ سے چلا سکیں اور معاشرہ میں کسی طرح کا نقص وعیب پیدا نہ ہوسکے۔

قارئین کرام! اس نظریہ پر چھوٹے سے چھوٹا اشکال یہ ہے کہ اس طرح کی نمونہ حکومت کسی بھی وقت نہیں بن سکتی، اور جب تک تقویٰ اور اخلاق سے مزین ایسے افراد کی تعداد حد نصاب تک نہ پہنچے اسلامی حکومت کی فکر کرنا ہی بے کار ہے؛ تو اس صورت میں معاشرہ میں فساد وتباہی پھیلتی چلی جائے گی، اور اجتماعی وسیاسی مثبت پہلو کی طرف ترقی ہونے کے بجائے ان کا راستہ بالکل محدود ہو کر رہ جائے گا۔

5۔ اقدار اور وظائف کے بارے میں اسلامی درجہ بندی نظریہ

مذکورہ ایک پہلو والے اقدار کے نظریہ کے برخلاف؛ بعض حکومتوں میں چاہے انفرادی کردار ہو یا اجتماعی اور سیاسی مختلف مراتب اور مختلف نمونے پیش کئے گئے ہیں: اول درجہ میں ایک آئیڈیل (نمونہ) پیش کیا جاتا ہے اس کے بعد دوسرے درجے والے نمونے اور کمترین شرائط والے نمونے، اس کے بعد مجبوری والے نمونے پیش کئے جاتے ہیں اسی طرح اسلام نے مختلف مواقع پر درجات والے نمونے بیان کئے ہیں مثال کے طور پر اسلام نے انسان پر تمام شرائط کے ساتھ نماز واجب کی ہے لیکن اگر انسان مجبوری کی حالت میں ہو تو پھر وہ کامل شرائط ضروری نہیں ہوتے، بلکہ وہ اس وقت سے مخصوص ہیں جب انسان ان شرائط اور اجزاء پر قدرت رکھتا ہو، لیکن مجبوری یا اضطراری حالت میں وہ شرائط کم ہوجاتے ہیں مثال کے طور پر جن مواقع پر انسان کے لئے غسل کرنا واجب ہوجاتا ہے لیکن اگر پانی موجود نہ ہو یا پانی اس کے بدن کے لئے نقصان دہ ہو، یا اگر اس کا وظیفہ وضو کرنا ہو لیکن ٹھنڈا پانی اس کے لئے نقصان دہ ہو اور وہ وضو نہ کرسکتا ہو، تو اسلام "یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں" کے نظریہ کو قبول نہیں کرتا اسلام یہ نہیں کہتا کہ نماز صرف اس صورت میں واجب ہے جب تمام شرائط موجود ہوں اور نماز کو تمام تر مقدمات اور شرائط کے ساتھ بجالائے اور اس کے علاوہ نماز نہیں ہوگی، بلکہ اسلام نے اس طرح کے مواقع پر اسی لحاظ سے وظیفہ معین کیا ہے، چنانچہ مذکورہ صورت کے بارے میں فرمایا کہ اگر انسان وضو اور غسل کے ذریعہ نماز نہیں پڑھ سکتا تو تیمم کے ساتھ نماز پڑھے، اور اگر کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھی جاسکتی تو بیٹھ کر پڑھے، اور اگر کوئی شخص بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتا تو لیٹ کر پڑھ لے، اور اگر ہاتھ پیر اور زبان کو حرکت نہیں دے سکتا لیکن ہوش میں ہو تو اس سے بھی نماز ساقط نہیں ہے تو اس نازک حالت میں بھی اسی حالت کے لحاظ سے نماز واجب ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اسلامی اقداری نظام میں کیفیت اور کمیت (تعداد) کے لحاظ سے سیاسی، اجتماعی اور شرعی وظائف کے درجات رکھے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک انسان کی حالت کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں، اول درجہ میں سب سے بلند

درجہ مدنظر ہے اس کے بعد دوسرا درجہ اور پھر تیسرا درجہ یہاں تک انسان کی مجبوری کے لحاظ سے جس مقدار بھی انجام دے سکتا ہے اسی کو کافی گردانتا ہے۔

6۔ عبادت کے بھی مختلف درجات ہیں

دوسری مثال جس سے کائنات کے نظریہ کا فرق واضح ہوجاتا ہے؛ یہ ہے کہ اسلام عبادت کے سلسلہ میں مراتب اور درجات کا قائل ہے؛ کیونکہ سب سے بہترین عبادت وہ عبادت ہے جو صرف اور صرف خدا کی محبت اور اس کی شکر گذاری کے لئے انجام دی جائے جیسی عبادت حضرت علی علیہ السلام انجام دیتے تھے، جیسا کہ آپ اپنی مناجات میں عبادت کی توصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اِلٰهِي مَا عَبَدْتُكَ خَوْفاً مِنْ عِقَابِكَ وَلاَ طَمَعاً فِي ثَوَابِكَ وَلٰكِنْ وَجَدْتُكَ اَهلاً لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُكَ۔" [1]

"پروردگارا! میں تیری عبادت تیرے عذاب کے ڈر سے یا تیرے ثواب کے لالچ میں نہیں کرتا بلکہ تجھے عبادت کا حقدار پاتا ہوں تو تیری عبادت کرتا ہوں۔"

"اِنَّ قَوماً عَبَدُوْا اللهَ رَغْبَةً فَتِلْكَ عِبَادَةُ التُّجَّارِ وَاِنَّ قَوماً عَبَدُوْا اللهَ رَهبَةً فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْعَبِيْدِ وَاِنَّ قَوماً عَبَدُوْا اللهَ شُكْراً فَتِلْكَ عِبَادَةُ الاَحْرَارِ۔" [2]

"بعض لوگ خدا کی عبادت؛ بخشش کی امید میں کرتے ہیں تو ایسی عبادت تاجروں کی عبادت ہے، اور بعض لوگ خدا کی عبادت اس کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں تو یہ غلاموں کی عبادت ہے، اور بعض لوگ خدا کی عبادت اس کے شکر کی وجہ سے کرتے ہیں اور یہی عبادت آزاد افراد کی عبادت ہے۔"

قارئین کرام! حضرت امیر المومنین علیہ السلام اپنے اس بیان میں سب سے بہترین عبادت اس عبادت کو قرار دیتے ہیں جو صرف اور صرف خدا کے شکر کے لئے بجالائی جائے، اور اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ تمام مومنین اسی طرح عبادت کریں، لیکن یہ بات واضح ہے کہ تمام مومنین اس طرح کی قابلیت اور ہمت نہیں رکھتے کہ اس طرح کی عبادت بجالاسکیں، کیونکہ اس طرح کی عبادت صرف خالص اولیاء اللہ ہی انجام دے سکتے ہیں جن کا مقام اتنا بلند ہوجاتا ہے کہ وہ جمال پروردگار میں محو ہوجاتے ہیں، اور اگر ان کو جہنم میں (بھی) لے جایا جائے تو وہ پھر بھی خدا کی عبادت اور اس سے مناجات کرنا ترک نہیں کریں گے یا اگر ان کو جنت سے محروم کردیا جائے تو وہ پھر بھی خدا کی عبادت کو ترک نہیں کریں گے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح کے افراد لاکھوں میں ایک دو ہی مل پائیں گے۔

---

[1] بحار الانوار ج 41 ص 14

[2] نہج البلاغہ، کلام 238

بہر حال اگر ہم کانٹ کے نظریہ "یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں" کو قبول کریں اور یہ مان لیں کہ اخلاقی نیکی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس عمل میں تمام شرائط اور قابلیت پائی جائے اور ذرہ برابر بھی اس کے شرائط میں کمی نہ ہو، تو پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ عبادت اس وقت مقبول ہے جب عالی ترین اور بلند ترین درجہ پر فائز ہو، اور صرف خدا کے شکر کے لئے بجالائی جائے؛ یعنی صرف خالص اولیاء اللہ کی عبادت مقبول ہوگی، اور جو لوگ جہنم کے خوف یا بھشت کے لالچ میں عبادت کریں تو اس کی عبادت قابل قبول نہیں ہے لیکن جیسا کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اس تنگ نظری کو قبول نہیں کرتا بلکہ مومنین کی سہولت، زحمتوں اور سختیوں کو دور کرنے کے لئے عبادت اور دیگر وظائف میں درجات رکھے ہیں، ایسے درجات جو کم سے کم شرائط سے شروع ہوتے ہیں اور بلند ترین درجات تک پہنچ جاتے ہیں جن میں تمام شرائط اور صلاحتیں پائی جاتی ہیں، اور اگر کوئی انسان ان بلند درجات تک پہنچ جائے تو انسانی اور الٰہی کمال پر پہنچ جاتا ہے جیسے حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے (خاص) شاگردوں کی عبادت؛ جس کی وجہ سے یہ حضرات معرفت کے بلند ترین مقام پر پہنچ گئے ہیں اور خدا کی بندگی کے عالی ترین مرتبہ پر فائز ہو چکے ہیں؛ لیکن جن کا درجہ ان سے کم ہے اور وہ لوگ جو ثواب کے شوق میں عبادت کرتے ہیں اس کی عبادت بھی خدا کے نزدیک مقبول ہے اسی طرح وہ لوگ جو اس درجہ سے بھی کم درجہ رکھتے ہیں اور جہنم کے خوف سے خدا کی عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت بھی مقبول ہے اور یہ بھی اہمیت وارزش کا ایک مرتبہ ہے۔

7۔ اسلامی حکومت کے درجہ بندی شدہ نمونے

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے: اسلام کا نظریہ "یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں" نہیں ہے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے ارزش اور اقدار کے مختلف مراتب ہیں، کم درجہ سے شروع ہو کر بلند ترین درجہ تک پہنچتے ہیں اسلامی سیاست میں بھی اسی طرح ہے: اسلام اول درجہ میں ایک نمونہ حکومت پیش کرتا ہے جو فقط خاص شرائط کے تحت اور ان افراد کے ذریعہ جن میں مکمل شرائط اور بہترین قابلیت پائی جاتی ہے جن تک عام افراد نہیں پہنچ پاتے، حقیقت میں ویسی حکومت صرف انہیں افراد کے ذریعہ ہو سکتی ہے جو مقام عصمت تک پہنچے ہوئے ہیں اور ان کے کردار میں ذرہ برابر بھی کوئی خطا و غلطی کا تصور نہیں پایا جاتا بلکہ ان کی فکر بھی پاک و پاکیزہ ہوتی ہے، یہ اسلامی حکومت کی بلند ترین اور بہترین شکل ہے وہ حکومت جس کا رئیس ایسا شخص ہو جو نہ صرف یہ کہ ہوا وہوس کے تحت معصیت نہ کرے بلکہ نا خواستہ میں بھی اس سے غلطی کا امکان نہ ہو، اور اس سے کوئی بھی خطا ولغزش نہ ہو، اور مکمل طور پر مصالح و منافع کی رعایت کرے، اور تمام اسلامی قوانین کے مجموعہ کو جانتا ہو، اور ان کو بہترین طریقہ سے جاری کرے اور یہ وہی نمونہ حکومت ہے جو انبیاء علیہم السلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کچھ مدت کے لئے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ذریعہ وجود میں آئی۔

البتہ اس نمونہ حکومت سے بھی بالاتر ایک اور حکومت کا تصور کیا جا سکتا ہے جو کبھی بھی نہیں ہو سکتی اور وہ یہ ہے کہ رئیس حکومت میں معصوم کے علاوہ تمام فرمانداراور ریاستی حاکم تمام کے تمام معصوم ہوں۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس طرح کی حکومت کبھی بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی بھی زمانہ میں معصوم کی تعداد اس قدر نہیں ہو سکتی جن میں سے حکومت کے تمام عہدوں کے لئے معصوم کا انتخاب کیا جا سکے صرف وہی نمونہ حکومت ہو سکتی ہے جس کا رئیس معصوم ہو اور یہ بھی صرف اسی وقت تصور کی جا سکتی ہے کہ جب معصوم موجود ہو، اور وہ بھی اس صورت میں جب تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں۔

لہٰذا اسلامی سیاست میں حکومت کے لئے مختلف مراتب اور درجات موجود ہیں کہ اگر حکومت کی بہترین قسم کا امکان نہ ہونے کی صورت میں اس سے ایک درجہ کم والی حکومت اس کے قائم مقام ہے، لہٰذا اگر بلند ترین حکومت جس میں ریاست معصوم کی ہو؛ نہ بن سکے تو ہم اسلامی حکومت کی تشکیل سے صرف نظر نہیں کر سکتے، بلکہ اگر معصوم حاضر نہ ہو تو ایسے شخص کی حکومت ہو جو علم، تقویٰ اور مدیریت کے لحاظ سے معصوم سے شباہت رکھتا ہو (اگر چہ علم وتقویٰ اور مدیریت کا سب سے بلند درجہ معصوم کی ذات ہی میں تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا علم اور اس کا کردار عصمت کے زیر سایہ ہوتا ہے)، اور اگر ایسا شخص بھی موجود نہ ہو تو پھر اس سے کم درجے والے کا انتخاب کیا جائے، اسی طرح کم سے کم درجہ والے کا انتخاب کیا جائے، یہاں تک کہ نصاب حکومت کے نچلے درجہ تک پہنچ جائے، اور اگر اس نصاب سے کم درجہ ہے تو پھر اس حکومت کے اہداف محقق نہیں ہو پائیں گے، لہٰذا اس شکل کی حکومت کو کسی بھی وقت میں انتخاب نہیں کیا جا سکتا۔

8۔ ولایت فقیہ کی حکومت پر عقلی دلیل

قارئین کرام! اگر ہماری بیان شدہ باتوں پر توجہ کی جائے تو ولایت فقیہ کی حکومت کی دلیل خود بخود واضح ہو جائے گی، اور وہ یہ ہے کہ: اگر ہم شرعی اور تعبدی دلائل سے صرف نظر کر لیں تو اسلامی بہترین حکومت کا نمونہ معصوم کی حکمرانی کی صورت میں تصور کیا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ اسلام میں اقتدار کے مراتب اور درجات ہیں لہٰذا بغیر شک وشبہ کے حکومت کے بھی درجات ہیں، جس وقت معصوم کے نہ ہوتے ہوئے اس کے بہترین نمونہ ممکن نہ ہو تو ایسے شخص کو حکمرانی کے لئے انتخاب کریں جو معصوم سے زیادہ شباہت رکھتا ہو، اور وہ جامع الشرائط فقیہ ہے جو صلاحیت، قابلیت، علم، عمل اور مدیریت میں معصوم سے زیادہ شباہت رکھتا ہے اور امام کا جانشین شمار ہوتا ہے۔

پس ولایت فقیہ نظام کی دلیل یہ ہے کہ جب امام معصوم تک رسائی ممکن نہ ہو تو اس صورت میں جامع الشرائط فقیہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالے کیونکہ وہ قوانین سے آشنائی، تقویٰ منجملہ سیاسی اور اجتماعی تقوے میں، عام عدالت کی رعایت میں، قوانین کو جاری کرنے میں، حسن تدبیر اور معاشرہ پر مدیریت میں، عملی میدان میں مہارت، قوانین کو جاری کرنے کے طریقہ کار کی شناخت میں، ہوائے نفس اور شیطان سے مقابلہ میں اور اسلام و مسلمین کے مصالح کو ذاتی اور گروہی منافع پر ترجیح دینے میں دوسروں پر فضیلت اور برتری رکھتا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی شخص یہ کہے کہ جب امام معصوم تک رسائی ممکن نہ ہو، تو پھر اسلامی حاکم کے لئے وہ شرائط ضروری نہیں

ہیں؛ نہ فقاہت اور علم کی شرط معتبر ہے اور نہ تقویٰ اور مدیریت کی قدرت، اور جو شخص بھی اپنے آپ کو مسلمانوں کی حکمرانی کے لئے ممبر کے طور پر پیش کرے اور وہ اکثریت سے جیت جائے تو اس کی حاکمیت اور حکومت معتبر اور نافذ ہے۔

حقیقت میں یہ فرضیہ اسی نظریہ ("یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں") پر مبنی ہے یعنی جب اعلیٰ قسم کے شرائط جو فقط معصومؑ میں ہو سکتے ہیں؛ والا شخص نہ ہو تو پھر کم تر درجہ والے شرائط کی ضرورت نہیں ہے، جب معصومؑ کا تقویٰ نہ ہو تو پھر حاکم کے لئے تقویٰ کی شرط نہیں ہے اور وہ فاسد انسان جو گناہ کبیرہ کا بھی مرتکب ہوتا ہے وہ بھی اسلامی حکومت کا صدر بن سکتا ہے یہاں تک کہ وہ شخص جس نے فقہ وفقاہت کی بو بھی نہ سونگھی ہو وہ بھی اسلامی حکومت کا صدر بن سکتا ہے لیکن اسلامی سیاست کے تحت یہ نظریہ بغیر دلیل کے ہے اور باطل ہے، اور صرف مغربی ممالک میں رائج ڈیموکریٹک کے لحاظ سے ہے۔

اسلامی ممالک اور مسلمانوں کے درمیان اسلام سے معمولی معلومات رکھنے والے اور اپنے کو روشن فکر کہنے والے اپنی اسلامی معلومات کو مغربی کلچر سے مخلوط کر کے مشکلات میں پھنس گئے ہیں، اور جب وہ ڈیموکریسی کو عملی طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نظریہ "یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں" کو قبول کر لیا ہے، یہ سادہ لوح مسلمان اس بات کو مانتے ہیں کہ اگر امام معصومؑ موجود ہوں تو پھر اسلامی معاشرہ میں انہیں کی حکومت ہونا چاہئے؛ لیکن اب جب کہ امام معصومؑ حاضر نہیں ہیں تو پھر معیار لوگوں کی اکثریت ہے اور عوام الناس کی مقبولیت کے علاوہ کوئی شرط ضروری نہیں ہے۔

قارئین کرام! مذکورہ نظریہ ذرہ برابر بھی اسلامی حقیقت سے سنخیت نہیں رکھتا اسلام خود اپنے سلسلہ میں مراتب کا قائل ہے اور ارزش واقدار کے سلسلہ میں مختلف مراتب پائے جاتے ہیں، اسی طرح ہم اجتماعی مسائل میں دیکھتے ہیں کہ بعض امور کے لئے خاص شرائط قرار دیئے گئے ہیں لیکن اگر تمام شرائط موجود نہ ہوں تو پھر اس سے کم درجہ کے شرائط معتبر سمجھے جاتے ہیں، ہم اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے اسلامی اجتماعی احکام میں سے "وقف" کے بارے میں اشارہ کرتے ہیں:

احکام "وقف" کے سلسلہ میں بیان ہوا کہ اگر کوئی چیز کسی خاص کام کے لئے وقف کی جائے تو اس کو اسی کام میں استعمال کیا جانا چاہئے لیکن اگر وہ کام بالکل ختم ہو جائے اور اس کا وجود خارجی نہ ہو تو پھر اس کام میں استعمال کیا جائے جو اس سے نزدیک ہو مثلاً قدیم زمانہ میں بعض چیزوں کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے زائرین کے سواروں (گھوڑے وغیرہ) کے لئے وقف کیا جاتا تھا اور اس کی درآمد سے حضرت سید الشہداءؑ کے زواروں کے ان حیوانوں پر جن پر سوار ہو کر کربلا جاتے تھے؛ ان کے لئے گھاس وغیرہ خریدی جاتی تھی لیکن آج کل اس طرح کا کوئی سلسلہ نہیں ہے اور آج کل کوئی گدھے گھوڑوں پر سوار ہو کر کربلا نہیں جاتا بلکہ آج کل تو ہوائی جہازوں اور گاڑیوں سے سفر کئے جاتے ہیں، تو کیا اس طرح کی وقف شدہ چیزوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا جائے اور "یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں" کے نظریہ کے تحت اس وقف شدہ شئے کو بالکل ہی استعمال نہ کیا جائے، یا جس طرح اسلام نظریہ پیش کرتا ہے کہ اگر اعلیٰ ترین مرتبہ نہ ہو تو اس سے کم مرتبہ والے کو اخذ کیا جائے جو گذشتہ استعمال سے زیادہ شباہت رکھتا ہے، اور یہ کہیں کہ اب جب جانوروں کو گھاس کھلانے کا موقع نہیں ہے تو اس کی درآمد کو ان گاڑیوں کے تیل وغیرہ میں خرچ

کیا جا سکتا ہے، جن کے ذریعہ کربلا جاتے ہیں؟ کیونکہ یہ کام گذشتہ استعمال سے زیادہ نزدیک ہے۔

اسی طرح اگر وقف کرنے والا اپنے بعد وصیت کرے کہ اس کے بعد اس کے لڑکوں میں سے ہی کوئی ایک اس کا متولی ہو لیکن متولی کے شرائط بیان کریں منجملہ یہ کہ متولی مجتہد ہو، تو اگر اس کی اولاد میں کوئی مجتہد نہ ہو لیکن ایسا لڑکا ہو جو اجتہاد کے قریب یا مجتہد متجزی ہو، تو کیا اس صورت میں وقف شدہ شئے بغیر متولی کے رہے گی کیونکہ اس کے لڑکوں میں کوئی مجتہد نہیں ہے؟ یا اگر پہلا درجہ ممکن نہ ہو تو دوسرے درجہ کو اختیار کیا جائے گا؛ اور مجتہد نہ ہونے کی صورت میں قریب الاجتہاد کو اس کا متولی بنایا جائے؟

بہر حال شرعی، اجتماعی اور سیاسی مسائل میں ایسے بہت سے نمونے موجود ہیں جن کو عقل اور شریعت صاحب مراتب سمجھتے ہیں اسی طرح اسلامی حکومت میں حاکم اور صدر کے لئے مراتب اور درجات رکھے گئے ہیں کہ اگر اول درجہ یعنی امام معصومؑ نہ ہونے کی صورت میں وہ شخص حاکم بنے جو امام معصومؑ کا جانشین ہو اور ہر لحاظ سے معصومؑ سے قریب ہو، اور وہ جامع الشرائط ولی فقیہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

تیسویں نشست

اسلامی حکومت سے ولایت مطلقہ فقیہ کی نسبت

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

قارئین کرام! ہماری یہ بحث "اسلامی سیاسی نظریہ" کے تحت ہے اور ہم نے اس بحث کو دو عام حصوں میں تقسیم کیا، جس کا پہلا حصہ قانون اور قانون گذاری کے سلسلے میں تھا اور دوسرا حصہ قانون جاری کرنے کا طریقہ کار اور معاشرہ کا نظام یا بالفاظ دیگر حکومت اور قوہ مجریہ کی اہمیت ہے دوسرے حصہ میں فلسفہ سیاست کے بارے میں لکھی گئی کتابوں میں مختلف نظریات اور مختلف طریقہ کار بیان کئے گئے ہیں، لیکن ہم نے اپنے لحاظ سے اس طریقہ کو اپنایا ہے کہ پہلے حکومت کی ضرورت کے بارے میں بحث کریں، تاکہ اس ضرورت کے تحت اس کے وظائف کی بھی پہچان ہو جائے اس کے بعد حکومت کی ذمہ داریوں کے پیش نظر اس کے اختیارات کے بارے میں بھی معلومات ہو جائے۔

آخری چند نشستوں میں ہماری بحث یہ تھی کہ حکومت کی مخصوص ذمہ داریوں میں سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا بھی ہے وہ ضرورتیں جن کو انفرادی یا گروہی صورت میں انجام نہیں دیا جا سکتا یا ان کو انجام دینے والا کوئی نہیں ہوتا، اور اگر حکومت اپنا قدم نہ بڑھائے تو پھر وہ ضرورتیں پوری نہیں ہو پاتیں انہیں ضرورتوں میں سے کچھ اس طرح ہیں: دفاعی طاقت کو بڑھانا، بیرونی دشمن کے مقابلہ میں دفاع کرنے کے لئے مکمل طور پر تیاریاں کرنا، اور جنگ کو صحیح اور بہتر طریقہ سے ادارہ کرنا، اندرونی ناخوشگوار حالت سے مقابلہ کرنا، اندورن ملک میں امن وامان قائم کرنا، اسلامی قوانین اور مقررات (وہ قوانین جو اصل ہیں یا جن کو پارلیمنٹ طے کرتا ہے) کو نافذ کرنا، عمومی مال پر نظارت کرنا اور ان سے صحیح طریقہ سے فائدہ اٹھانا مثلاً انفال (جیسے معادن (کان) ددیا اور جنگل وغیرہ) اور ان چیزوں کو استعمال کرنا جن کا کوئی خاص مالک نہیں ہے، اسی طرح معاشرہ کے ان لوگوں کی سرپرستی کرنا کم سن ہونے یا معلول (اپاہج) یا کم عقلی کی بنا پر سرپرستی کے نیازمند ہوتے ہیں جن کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا؛ نیز اسلامی حکومت کے سب سے اہم وظیفہ یعنی اسلامی شعار قائم کرنا، احکام اسلامی اور حدود اسلامی کو جاری کرنا نیز اسلامی قوانین کی خلاف ورزی سے روک تھام کرنا ہے، اس آخری وظیفہ کے علاوہ دیگر تمام ذمہ داریاں دنیا بھر کی حکومتوں کے بھی ہوتے ہیں، اور جو چیز اسلامی حکومت کو دوسری حکومتوں سے ممتاز بنا دیتی ہے یہی اہم اور عظیم وظیفہ ہے، در حقیقت اس کو اسلامی حکومت کے وظیفوں کی سرفہرست قرار دینا چاہئے۔

2۔اسلامی حکومت کے وظائف اور اختیارات کا برابر کا توسعہ

اسلامی حکومت کے وجودی فلسفہ اور اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کے بعد، حکومت کے وہ اختیارات جن کی بنا پر وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے، روشن ہو جاتی ہیں؛ کیونکہ اگر حکومت کے ذمہ کچھ وظائف معین کئے جائیں، لیکن ان وظائف پر عمل کرنے کے لئے ضروری اختیارات نہ دیئے جائیں تو وہ وظائف فائدہ مند نہیں ہو سکتے؛ چنانچہ روز مرہ کے مسائل میں یہ بات بالکل واضح و روشن دکھائی دیتی ہے مثال کے طور پر اگر کوئی شخص گھر میں کوئی کام اپنے بیٹے کے سپرد کرے لیکن اس کو انجام دینے کے لئے ضروری وسائل اس کو نہ دے یا کسی مزدور کو کسی کام کے لئے معین کیا جائے لیکن کام میں آنے والے وسائل فراہم نہ کرے یا اس کو وسائل کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دے؛ تو بیشک کے ایسا کام بے ہودہ اور لغو ہے اور ہر صاحب عقل ایسے شخص کی مذمت کرے گا۔

جس وقت کسی کو کوئی ذمہ داری دی جاتی ہے تو اس کام کے لئے ضروری اختیارات بھی دیئے جاتے ہیں تا کہ ان کے استعمال سے اپنے وظائف کو پورا کرے، اسی بنا پر ہم جس وقت دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں اسلامی حکومت کی مہم ذمہ داریوں کو ملاحظہ کرتے ہیں تو پھر اس حکومت کے اختیارات اور امکانات بھی دوسری حکومتوں سے زیادہ ہونے چاہئیں تا کہ بہترین طریقہ سے ان وظائف پر عمل پیرا ہو سکے اسلامی حکومت معاشرہ کی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے قانونی اور جائز وسائل اور امکانات کو اختیار کرے؛ ورنہ وہ اپنے وظائف پر عمل ہی نہیں کر سکتی اس بات کو مزید روشن کرنے کے لئے ایک مثال عرض کرتے ہیں:

جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ٹکنالوجی کی ہر روز ترقی ہو رہی ہے اور قدیم زمانے کے حالات بدل رہے ہیں اور انسانی معاشرہ کے لئے نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں تو پھر انسانی زندگی کے معاملات بھی مختلف طریقوں کے ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اب انسان نے آسمان اور ہوا پر قبضہ کر لیا ہے جب تک انسان نے گاڑی نہیں بنائی تھی تو اس وقت گلی کوچے اور سڑک وغیرہ باریک ہوتی تھی جہاں سے صرف گدھا اور خچر وغیرہ ہی گذر سکتے تھے، پرانے شہروں کے بعض محلوں میں اب بھی اس طرح کی گلیاں موجود ہیں، لیکن اب جب کہ گاڑیوں کا زمانہ آ گیا ہے اور اکثر لوگ گاڑیوں اور کاروں سے شہر میں آتے جاتے ہیں، تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ان گلی کوچوں کو چوڑا کیا جائے اور ان کی جگہ بڑی سڑک بنائی جائے تا کہ گاڑیاں آسانی سے رفت و آمد کر سکیں، نیز احتمالی خطروں کی بھی روک تھام کی جا سکے۔

جس وقت حکومت یا حکومت کے کارگزار گلی کوچوں اور سڑکوں کو چوڑا کرنا چاہیں تو ان کو عوام الناس کے مکانوں کو توڑنا پڑے گا، تو اگر حکومت کی ذمہ داری ہو تو سڑکوں کو وسیع بنائے تا کہ رفت و آمد میں کوئی مشکل نہ ہو، لیکن اس کو لوگوں کے مکانوں کو توڑنے کا حق نہ ہو، تو حکومت سے ایسے کام کی درخواست لغو و بے ہودہ اور نہ ہونے والا ہے پس معلوم یہ ہوا کہ حکومت کو اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے اس طرح کے اختیارات کا ہونا ضروری ہے اور اور اس ذمہ داری کو نبھانے

کے لئے ضروری وسائل فراہم ہونا ضروری ہے؛ البتہ حکومت کو چاہئے کہ لوگوں کے ہوئے نقصان کا جرمانہ ادا کرے اور ان کے لئے مزید سہولیات کا انتظام کرے تاکہ وہ لوگ دوبارہ اپنے مکان بنا کر زندگی بسر کریں۔

3۔حکومتی اختیارات سے ولایت مطلقہ فقیہ کی نسبت

قارئین کرام! حکومت اسلامی کے وظائف پر عمل کرنے کے لئے ضروری اور کافی اختیارات منجملہ عوام الناس کی ملکیت میں ضرورت کے موقع پر تصرف کرنے کا حق ہونے کو مطلق ولایت فقیہ کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم، احادیث معصومین علیہم السلام اور فقہاء کرام کے بیانات میں لفظ "حکومت" کی جگہ لفظ "ولایت" کا استعمال ہوا ہے، اور ان چیزوں میں اس کلمہ کے استعمال کی دلیل سے صرف نظر کرتے ہوئے لفظ "ولایت" لفظ "حکومت" سے زیادہ مناسب ہے (جیسا کہ مقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای دامت برکاتہ نے فرمایا ہے کہ لفظ "ولایت" کا بار لفظ "حکومت" سے زیادہ ہے کہ لفظ "حکومت" میں ایک طرح کی زور گوئی اور تحکم پایا جاتا ہے) کیونکہ لفظ "ولایت" میں محبت اور عاطفہ شامل ہے؛ شاید اسی وجہ سے لفظ "ولایت"، لفظ "حکومت" کی جگہ استعمال ہوا ہے بہر حال لفظ "ولایت" بالکل لفظ "حکومت" کی جگہ استعمال ہوا ہے اور جو شخص معاشرہ پر حکومت کو ضروری سمجھتا ہے شرعی لحاظ سے معاشرہ کے لئے ولایت کو ضروری سمجھتا ہے۔

چنانچہ اس مقدمہ کی بنا پر عرض کرتے ہیں کہ اگر یہ ولایت ان تمام اختیارات رکھتی ہو جن کے ذریعہ اپنے وظائف پر عمل کر سکے اور معاشرہ کی مختلف ضرورتوں کو جائز اور شرعی نقطہ نظر سے پوری کرے، تو اس ولایت کو "ولایت مطلقہ" کہا جاتا ہے لیکن اگر "ولی امر" کے لئے ضرورت کے وقت ولایت ہو یعنی صرف لوگوں کی جان و مال کے خطرہ کے وقت اس کو تصرف کرنے کا حق ہو اور اس کو گلی اور سڑکوں کی وسعت یا مختلف مقامات پر پارک بنانے یا شہر کو خوبصورت بنانے کی اجازت نہ ہو تو اس ولایت کو محدود اور غیر مطلق کہا جاتا ہے۔

4۔مخالفین کی طرف سے ولایت مطلقہ کے بارے میں شک وشبہات

قارئین کرام! جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ چیزیں مخالفین بدنیتی رکھنے والے عوام الناس (اور بالخصوص) جوانوں کے ذہنوں کو مخدوش کرنے کے لئے بیان کرتے ہیں اور "ولایت فقیہ" کی تصویر کو برعکس پیش کرکے درج ذیل مغالطہ انجام دیا:

پہلے تو انہوں نے لفظ "ولایت" کے بارے میں شبہ ایجاد کیا کہ لفظ "ولایت" بچوں اور دیوانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے "ولی" یعنی "سرپرست" اور جو بچے یا پاگل لوگ اپنی زندگی کو چلانے کے لئے کافی عقل وتدبیر نہیں رکھتے تو ان کو سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے قارئین کرام! یہ مغالطہ بالکل واضح اور روشن ہے، اور جیسا کہ اہل بیت علیہم السلام کی ولایت بھی سرپرستی کے معنی میں نہیں ہے، لہٰذا یہاں پر بھی لفظ "ولایت" بالکل حکومت کے معنی میں ہے اور اس کے معنی اجتماعی امور کی تدبیر اور معاشرہ کے عظیم مدیریت کے ہیں "ولایت فقیہ" کے معنی یہ ہیں کہ جو حضرات خداوند عالم کی طرف سے معاشرہ کے عظیم امور کو

چلانے کی اجازت رکھتے ہیں، نہ یہ کہ "ولایت فقیہ" کی حاکمیت اور حکومت کے تحت صرف بچے، دیوانے اور کم عقل لوگ ہیں۔

اس کے بعد لفظ "مطلق" میں شبہ ایجاد کیا اور اپنے بعض مقالوں میں یہاں تک کہہ دیا کہ "ولایت مطلق" کا اعتقاد رکھنا موجب شرک ہے، لہٰذا جو لوگ "ولایت مطلق" کے قائل ہیں درواقع وہ مشرک ہیں اور انہوں نے خداوند عالم کی ذات کے ساتھ شریک قرار دیا؛ کیونکہ خداوند عالم کے علاوہ کوئی مطلق نہیں ہے، اور انہوں نے "ولی امر" کو بھی مطلق قرار دیا ہے!!

قارئین کرام! واقعاً انسان اس طرح کی بچکانہ باتوں کا کیا جواب دے لیکن مختصر طور پر عرض کرتے ہیں کہ اولاً قرآن وروایات اور دوسری اسلامی تحریروں میں خدا کو "مطلق" نہیں کہا گیا ہے، اور عربی قواعد کے تحت بھی خداوند عالم کے لئے لفظ مطلق کہنا صحیح نہیں ہے لیکن اگر مسامحہ اور مطلق کے معنی میں دخل وتصرف کرتے ہوئے خدا کے لئے لفظ مطلق کو استعمال بھی کریں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ خدوند عالم نامحدود ہے اور کسی طرح کا کوئی نقص وعیب نہیں رکھتا؛ لیکن کوئی بھی شخص کسی کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ نہیں رکھتا ہمارا عقیدہ ہے کہ صرف خدائے واحد کمالِ مطلق رکھتا ہے اور ذرہ برابر بھی نقص وعیب نہیں رکھتا، اور اس کی ذات میں تمام صفات وجودی غیر متناہی طور پر پائے جاتے ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ اس طرح کے عقیدہ کا ملازمہ یہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت اپنے وظائف پر عمل کرنے کے لئے ضروری اختیارات بھی نہ رکھے، اور بنیادی طور پر ان دونوں (باتوں) میں کوئی ربط نہیں ہے۔ "ولایت مطلق" یعنی امت اسلامی کا حاکم اور رہبر، اسلامی معاشرہ کے مصالح کو جاری کرنے کے لئے ضروری اختیارات کا مالک ہوتا ہے، ولی فقیہ اسلامی معاشرہ کی بھلائی اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری دخل وتصرف کرسکتا ہے اس مطلب کو مزید واضح کرنے کے لئے ایک مقدار "اسلامی حکومت کی تھیوری" پر روشنی ڈالیں گویا اس سے پہلے بھی اس مطلب پر اشارہ کیا جاچکا ہے۔

5۔ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ

جس وقت اسلامی حکومت کے ڈھانچہ کی بات ہوتی ہے تو بعض لوگ فلسفہ سیاست کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس میں لکھی گئی قدیم زمانے سے آج تک کی حکومتوں کی قسمیں ملاحظہ کرتے ہیں مثلاً حکومت الیگارکی "Oligachy" [1]، اریسٹوکریسی، "Aristocracy" [2] شاہی، ڈیموکریسی وغیرہ، اور آج کل ڈیموکریسی بھی جمہوری اور مشروطہ سلطنت پر تقسیم ہوتی ہے اور جمہوری بھی یا پارلیمنٹی ہوتی ہے یا ریاستی، اس وقت یہ سوال کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت مذکورہ اقسام میں سے کونسی قسم ہے؟ یا ان کے مقابلہ میں اس حکومت کی کوئی خاص شکل ہے؟ اگر اسلامی حکومت وہی جمہوری حکومت ہے تو یہ تو وہی ڈیموکریسی اور عوام الناس پر عوام الناس کی حکومت ہے اور اس بنا پر اسلام کی نظر میں حکومت کی کوئی خصوصیت اور امتیاز نہیں ہے اور اگر اسلامی حکومت کو بادشاہی حکومت کہا جائے تو پھر ایران کی اسلامی حکومت کو "جمہوری

---

[1] الیگارکی اس نظام حکومت کو کہتے ہیں جس میں مقتدر لوگوں کی حاکمیت ہوتی ہے۔

[2] امراء اور بادشاہوں کی حکومت جو نسلاً بعد نسل چلتی رہتی ہے۔

اسلامی" کیوں کہا جاتا ہے؟ بہر حال حکومت کی شکل کے سلسلہ میں کوئی نظریہ نہیں ہے اور اس سلسلہ میں عوام الناس کو اختیار دیا ہے تا کہ وہ جس طرح بھی چاہیں حکومت تشکیل دیں؛ یا حکومت کے سلسلہ میں اسلام نے کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا ہے؟

اسلامی لحاظ سے حکومت کی شکل کے سلسلہ میں مختلف طریقوں سے بہت زیادہ بحثیں ہوئی ہیں اور اسلامی حکومت کی شکل کے لحاظ سے بہت سے سوالات کے جواب میں کہنے والوں نے کہا کہ اسلام نے حکومت کے سلسلہ میں کوئی خاص شکل بیان نہیں کی ہے اگرچہ یہ جواب کافی حد تک صحیح ہے لیکن اشکالات اور ابہام سے خالی نہیں ہے جس کی وضاحت کے لئے دو نکات کا بیان کرنا ضروری ہے:

الف۔ اسلامی قوانین کی وسعت اور ان کا نسخ نہ ہونا

پہلا نکتہ اسلام اور اسلامی قوانین کسی خاص زمانے اور کسی خاص جگہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام زمانوں اور تمام معاشروں کے لئے نازل ہوئے ہیں اسلام کے ثابت اور غیر قابل تبدیل احکام اس طرح وضع کئے گئے ہیں جو تمام ہی معاشروں میں قابل اجراء ہیں دوسری طرف، ممکن ہے حکومت کسی چھوٹے معاشرہ کی ہو یا کروڑوں یا اربوں والی آبادی کی ہو جیسے چین اور هندوستان کی حکومتیں جن کی آبادی ایک ارب سے بھی زیادہ ہے، بہر حال حکومت کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں: مثلاً ایک سو گھر والے معاشرہ میں بھی حکومت ہو سکتی ہے اور ایک ارب والے معاشرہ میں بھی حکومت ہو سکتی ہے یہاں تک کہ پوری دنیا پر بھی ایک عالمی حکومت ہو سکتی ہے، اور انہیں حکومتوں کی اقسام کی بنا پر ان کے لئے ایک ایسا نمونہ پیش کیا جائے تو تمام قسموں کو شامل؟ یا حکومت کی کوئی خاص شکل معین نہیں کرنا چاہئے، یا اگر کوئی خاص شکل معین کی گئی تو پھر مسلم طور پر آج کل کی بعض حکومتوں سے ہم آہنگ ہوگی، اور دوسرے معاشروں کے لحاظ سے نہیں ہوگی؟ مثال کے طور پر اگر کہیں کہ ظہور اسلام کے وقت اسلامی پیغام صرف بعض مقامات تک محدود تھا اور اس کے احکام صرف مدینہ منورہ کے چھوٹے معاشرہ کے لئے تھے، اور وہ حکومت جو رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ تشکیل پائی وہ اس زمانہ کے لئے مناسب تھی جس کی آبادی شاید ایک لاکھ سے زیادہ نہ ہو آیا اسلام کی پیش کردہ "اسلامی حکومت" کی شکل وصورت اسی طریقہ کی ہے جو صدر اسلام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھی، انہیں خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ جو اس محدود آبادی میں مخصوص اخلاق اور ثقافت کے ساتھ ہے؟ یا نہ صرف یہ کہ اسلام نے حکومت کی کوئی خاص شکل بیان نہیں کی ہے بلکہ حکومت کے سلسلہ میں کسی طرح کی کوئی قید وشرط پیش نہیں کی ہے؟

قارئین کرام! حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نہ پہلے گزینہ کو پسند کرتا ہے اور نہ دوسرے کو، بلکہ اسلام نے حکومت کی خاص شکل وصورت بیان کرنے سے بھی بالاتر غیر قابل تبدیل احکام کی بنا پر حکومت کی عام اور وسیع پیمانہ پر معرفی کی ہے، جن کے تحت تغیر اور تبدیلی کی بنا پر مختلف بہت سی شکلیں بن سکتی ہیں اسلام نے نہ عوام الناس کو بالکل ہی آزاد چھوڑا ہے کہ جو چاہیں کریں اور نا ہی حکومت کی کوئی خاص اور محدود شکل بیان کی ہے جس کو صرف کسی خاص زمان ومکان میں ہی نافذ کیا جا سکتا ہے

اسلام کے پیش کردہ قوانین اس طرح کے ہیں جن کے تحت حکومت کی صحیح اور عقلائی شکلیں آسکتیں ہیں البتہ حکومت کی وہ شکلیں اسلام کے عام اصول سے خارج نہ ہونے پائیں ہم اسلام کے معین کردہ قوانین اور حدود کو اسلامی حکومت کہتے ہیں ہوسکتا ہے ان قوانین کے تحت ایک وقت حکومت کی کوئی خاص شکل ہو اور کسی دوسرے زمانہ میں اس کی شکل وصورت دوسری ہو، لیکن یہ دونوں شکلیں حکومت اسلامی ہونے کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوتیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ اسلام نے حکومت کی کوئی خاص شکل وصورت بیان نہیں کی ہے لیکن اس حکومت کو اسلامی قوانین اور حدود سے باہر نہ ہونا چاہئے بلکہ اسلامی اصول کے ہم آہنگ اور مطابق ہو کیونکہ یہ مسئلہ علمی اور عقلی لحاظ سے دقیق اور ظریف ہے کہ اسلام کے ثابت اور غیر قابل تبدیل احکام روز قیامت تک کے لئے بنائے گئے ہیں جن میں کلّی اور عظیم ڈھانچہ موجود ہے، اور ان کے مقابلہ میں جزئی اور قابل تبدیل احکام زمان ومکان کے لحاظ سے وضع ہوئے ہیں، انہیں قابل تبدیل احکام میں سے حکومتی احکام ہیں جو ہر زمانہ میں ولی فقیہ کے ذریعہ یا اس کے دستخط کے ذریعہ وضع ہوتے ہیں جن کی اطاعت اور پیروی کرنا واجب ہے۔

ب۔ اسلام کی طرف سے حکومت کے درجہ وار نمونے

دوسرا نکتہ: جیسا کہ ہم نے پہلے جلسے میں بھی عرض کیا تھا کہ کبھی کوئی شخص کسی مقصد کو سامنے رکھتا ہے، اور اس مقصد تک پہنچنے کے لئے کچھ نمونے شرائط مدنظر رکھے جاتے ہیں لیکن وہ شرائط فراہم نہیں ہوتے تو پھر اس کے بدلے میں دوسرے (اور کمتر) شرائط رکھے جاتے ہیں، یعنی اگر وہ اول درجہ کے نمونہ شرائط حاصل نہ ہوں تو پھر اس کی جگہ دوسرے درجہ کے شرائط کو ہی انتخاب کیا جاتا ہے، اور اگر دوسرے درجے کے شرائط بھی نہ ہوں تو پھر بات تیسرے درجہ پر پہنچتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اقدار اور ارزشی نظام تمامیت (مکمل) خواہ نہیں ہے اور ارزش کو فقط اعلیٰ درجہ میں منحصر نہیں کرتا، کہ اگر اس اعلیٰ درجہ کے شرائط میں ذرا بھی نقص وارد ہوگیا تو پھر اس کی کوئی ارزش اور اہمیت نہیں رہے گی بلکہ اسلام کے ارزشی نظام میں ارزشوں اور اقدار کے مختلف درجات ہیں، جس میں تمام شرائط پائے جائیں گے وہ بالاتر اور نمونہ اقدار کا مالک ہے اس کے بعد کم درجے والے شرائط کی بھی ایک اہمیت ہوتی ہے ایسا نہیں ہے کہ اگر اعلیٰ درجہ کا مقصد حاصل نہ ہو تو بالکل ہی اس کو چھوڑ دیا جائے اور اس کے لئے کم درجہ والی حالت کو قائم مقام نہ بنایا جائے۔

مقصد یہ ہے کہ اسلام نے حکومت کی ایک نمونہ اور آئیڈیل شکل پیش کی ہے اور وہ نمونہ شکل اس صورت میں رونما ہو گی جب امام معصوم حاضر ہو اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں، جیسا کہ قرآن مجید میں اسی نمونہ کا انتخاب کر کے بیان کیا گیا ہے، ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ.[1]

---

[1] سورہ نساء آیت ۵۹

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں۔"

اور دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ [1]

"اور جو کچھ بھی رسول تمہیں دیدے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جاؤ"

اگر چہ اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ اول درجہ میں حکومت کی ریاست امام معصومؑ فرمائیں چونکہ معصوم صاحب عصمت ہوتا ہے لہٰذا وہ بہترین طریقہ پر حکومت کو چلا سکتا ہے لیکن نہ تو ہمیشہ معصومؑ حاضر ہیں تا کہ براہ راست حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لیں اور نہ ہمیشہ امام معصومؑ مبسوط الید (آزاد) ہیں تا کہ حکومت تشکیل دیں اور اپنی قدرت کا مظاہرہ کریں؛ جیسا کہ ہمارے ائمہ علیہم السلام میں صرف حضرت علی علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام نے حکومت تشکیل دی وہ بھی کم مدت کے لئے، اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد سے اس طرح کے حالات نہ تھے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام حکومت تشکیل دیں، یا عوام الناس یا عوام الناس کی اکثریت نے ائمہ علیہم السلام سے نہیں چاہا کہ حکومت تشکیل دیں یا معاشرہ کے اہم افراد ائمہؑ کی تشکیل حکومت میں مانع تھے، جن کی وجہ سے ائمہ علیہم السلام کو ہمیشہ حکومت سے کنارہ کشی کرنا پڑی۔

6۔ اسلامی نقطہ نظر سے "حکومت میں حکومت" کے نقشہ کی تاریخ

اگر حکومت کی باگ ڈور امام معصوم علیہ السلام یا عادل مومنین کے ہاتھوں میں نہ ہو بلکہ ظالم اور طاغوت کی حکومت ہو جائے، تو کیا اس صورت میں کوئی بھی حکومتی کام صحیح طریقہ پر انجام نہ دیا جائے اور تمام امور غاصب اور ظالم حاکم کے ہاتھوں میں چلے جائیں اور عوام الناس حکومت کے تمام امور کو چھوڑ دے؟ کیا نیک، صالح اور شائستہ افراد کسی بھی طرح کے حکومتی امور میں رسیدگی نہ کریں اور حتی الامکان معاشرہ کی رہبری نہ کریں؟ بے شک اسلام کا جواب نفی میں ہوگا، اور اس طرح کے حالات میں اضطراری اور مجبوری کا بدل رکھا ہے اور فرمایا ہے کہ: اگر امام معصوم علیہ السلام حاضر ہوں لیکن حکومت تشکیل دینے میں آزاد نہ ہوں یا امام معصومؑ حاضر نہ ہوں اور حکومت ان کے نیک اور صالح جانشینوں کے ہاتھوں میں نہ ہو، تو کیا اس صورت میں عوام الناس محدود موارد میں حکومتی امور کے سلسلہ میں کسی ایسے شخص کی طرف رجوع کریں جو معصوم سے زیادہ شباہت رکھتا ہو۔

بے شک معاشرہ میں ہمیشہ ذاتی، گھریلو اور اجتماعی مسائل میں اختلاف اور جھگڑا رہا ہے اور مال وثروت، معاملات اور خرید وفروخت نیز شرکتوں میں جھگڑے ہوتے رہے ہیں مثلاً دو شریک اپنے حصے کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں یا ورثا میراث کے سلسلہ میں اختلاف کرتے ہیں یا میاں بیوی کے درمیان اختلاف ہوتے ہیں، لامحالہ ان تمام اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے ایک حکومت کا ہونا ضروری ہے تا کہ ان مواقع پر اس کی طرف رجوع کریں اور اپنے اختلافات کو حل کریں اور وہ ان کے اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرے ظالم اور طاغوت کی حکومت کے ہوتے ہوئے عوام الناس کو یہ

---

[1] سورہ حشر آیت ۷

بہانہ نہیں کرنا چاہئے کہ چونکہ حق وانصاف کی حکومت نہیں ہے اور امام معصومؑ یا حاکم عادل کی ریاست نہیں ہے لہٰذا ظالم اور طاغوت کی حکومت پر راضی ہو جائیں اور حکومت کی مرضی پر راضی ہو جائیں اور اس سلسلہ میں کوئی تدبیر نہ کریں؛ بلکہ اگر خاص موارد میں کسی ایسے شخص کی طرف رجوع کرنا ممکن ہے جو اسلامی احکام کو صحیح طریقہ سے بیان کرے اور ان کو جاری کرے، تو اگر ایسا کوئی شخص ہے تو اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، اسی وجہ سے ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس طرح کے حالات کے لئے ایک نقشہ پیش کیا ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں "حکومت میں حکومت کی تشکیل" کہا جاتا ہے۔

جس وقت حکومت ظالموں اور نااہلوں کے ہاتھوں میں ہو اور وہ معاشرہ پر حکومت کر رہے ہوں اور عوام الناس اس حکومت کے خلاف قیام کرنے اور اس حکومت کا تختہ پلٹنے کے کافی امکانات نہ رکھتے ہوں تو جن حکومتی مسائل میں سرکاری اور قانونی دفاتر کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے؛ تو اس موقع پر ضروری ہے کہ فقہاء، علماء اور ایسے لوگوں کی طرف رجوع کریں جو معصوم تو نہ ہوں لیکن اہل بیت علیہم السلام کے مکتب کے تربیت شدہ ہوں اور علم وتقویٰ کے بلند ترین درجہ پر فائز ہوں اور ان کا علمی اور اخلاقی مقام دوسروں کی نسبت معصوم سے زیادہ نزدیک ہو حتی الامکان اپنے حکومتی مسائل میں ایسے فقیہ کی طرف رجوع کریں جو علمی لحاظ سے اتنی صلاحیت رکھتا ہو تاکہ اسلام کے احکام کا صحیح طریقہ سے استنباط کرے، اور قضاوت وفیصلوں کے لئے کافی مہارت رکھتا ہو؛ نیز تقویٰ کے بلند ترین درجات رکھتا ہو اور مورد اعتماد اور اطمینان ہو۔

"حکومت میں حکومت" کے نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ ظالم وجابر حکومتوں میں چھوٹی چھوٹی اور محدود حکومتیں تشکیل دی جائیں تاکہ عوام الناس اپنے حکومتی مسائل میں مشکلات کے وقت ان کی طرف رجوع کرسکیں، جس کو ہماری اسلامی ثقافت میں "ولایت مقیدہ" (محدود ولایت) کہا جاتا ہے جو معصومین علیہم السلام کے زمانہ میں بھی فقہاء کرام رکھتے تھے اور امام معصوم علیہ السلام کی اجازت سے خاص موارد میں قضاوت اور امر ونہی کیا کرتے تھے، اور غیبت کے زمانہ میں بھی اگرچہ فقہا مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتے تھے اور حکومت نہیں بنا سکتے تھے لیکن محدود مسائل میں اختلافات اور جھگڑوں نیز معاشرہ کے ضروری ترک شدہ امور جن کو ہماری فقہ میں "امور حسبیہ" کہا جاتا ہے؛ میں حکومت کیا کرتے تھے، اگرچہ "ولایت مقیدہ" ظاہری اور معنوی لحاظ سے "ولایت مطلقہ فقیہ" سے فرق رکھتی ہے۔

شیعہ تاریخ میں ہمیشہ فقہاء کی طرف سے "ولایت مقیدہ" جاری ہوتی رہی ہے، اور شیعہ افراد اطمینان اور مکمل رضایت کے ساتھ اجتماعی امور، اختلافات اور جھگڑوں میں فقہاء کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے ان کا حل طلب کرتے تھے اور شاید اس سلسلہ میں تاریخی پہلو اور ہمیشہ تاریخ میں اس کے موجود رہنے اور اس کی ضرورت کی وجہ سے کسی نے اس سلسلہ میں زیادہ اعتراضات اور شبہات وارد نہیں کئے ہیں، لیکن "ولایت مطلقہ فقیہ" کے سلسلہ میں چونکہ تاریخ کا حوالہ نہیں ملتا اور اس کی وجہ سے دشمنان اسلام کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی نیز اس نے ناجائز منافع میں رکاوٹ پیدا ہوگئی جس کی بنا پر انہوں نے اس سلسلہ میں بہت سے اعتراضات اور شبہات پیدا کردیئے۔

7۔ حضرت امام خمینیؒ کی طرف سے "ولایت مطلقہ فقیہ" کا نقشہ

حضرت امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی غیبت کے وقت سے انقلاب اسلامی ایران سے پہلے تک یہ احتمال دینا کہ ایک زمانہ میں جامع الشرائط فقیہ کے ذریعہ حق وحقیقت کی حکومت کا قائم ہونا صرف ایک خواب تھا، یہاں تک کہ اگر انقلاب سے تیس چالیس سال پہلے خود اسی ملک کی عوام الناس سے کہا جاتا کہ ایک روز وہ آنے والا ہے جب ایک روحانی فقیہ کے ذریعہ اس شہنشاہی حکومت کا تختہ پلٹ جائے اور وہ خود حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گا تو کسی کو یقین نہ آتا، اور اس طرح کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا جو فقط خواب کی طرح تھا یہ بالکل اس بات کی طرح تھا کہ اگر ہم کہیں کہ ایک زمانہ وہ آنے والا ہے جب انسان کسی چیز کا سہارا لئے بغیر آسمان میں پرواز کرنے لگے گا، کیونکہ اس طرح کا تصور فقط خواب میں کیا جاسکتا ہے اور ایسا کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔

اُس زمانہ میں یہ بات واقعاً ایک مذاق تھی کہ اگر کوئی کہے کہ ایک عالم دین اس طاغوت بادشاہ کی جگہ خود حکومت بنائے گا کیونکہ اس وقت لوگ یہی کہتے کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟!! کیا ایسا شخص جو اپنی زندگی کو مشکل سے چلاتا ہو اور اپنے گھر میں بھی امنیت نہ رکھتا ہو اور کسی بھی وقت (مخفی) پولیس ان کے گھر میں آکر گرفتار کرسکتی تھی، یا ان کو جلاوطن کردے یا جیل میں ڈال دے اور ان کو شکنجہ کرے تو کیا ایسا شخص حکومت تشکیل دینے کی قدرت حاصل کرسکتا ہے!!

اگرچہ گذشتہ زمانہ میں "ولایت فقیہ" کا ظاہری وجود نہیں تھا یہاں تک کہ عقلی طور پر اس کا احتمال بھی نہیں دیا جاتا تھا؛ لیکن اس کو علمی طور پر تصور کیا جاسکتا تھا جس میں کوئی اشکال بھی نہیں تھا، بہت سے فقہاء ومجتہدین نے "ولایت فقیہ" کی تھیوری کو بیان کیا ہے، اور اس سلسلہ میں تحقیق وبررسی کی ہے کہ اگر ایک زمانہ فقیہ کی حکومت کے لئے آجائے اور وہ فقیہ مسند حکومت پر تشریف فرما ہو، تو اس کی ولایت مطلق ہوگی یا مقید (اور محدود)؟۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے زمانہ کے برخلاف کہ جب ائمہ تقیہ میں ہوتے تھے اور مکمل طور پر آزادی نہیں ہوتی تھی، اور نہ ہی حکومتی مسائل میں کوئی دخالت کرسکتے تھے، مومنین صرف مخفی طور پر امام علیہ السلام سے ملاقات کرتے تھے اور اپنی بعض مشکلات منجملہ اختلافات وغیرہ کو بیان کرتے تھے تاکہ گواہ اور ثبوت کے بعد ائمہ علیہم السلام دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ فرماتے تھے، اسی طرح اس زمانہ کے برخلاف جس میں فقہاء حکومت سے دور رکھے جاتے تھے، اور حکومتی مسائل میں دخالت کا حق نہیں رکھتے تھے، تو اگر کسی زمانہ میں فقیہ ومجتہد کی حکومت بنانے کی راہ ہموار ہوجائے اور وہ حکومت تشکیل دینے کی قدرت رکھتا ہو، تو کیا اس کی ولایت صرف ضروری کاموں تک محدود رہے گی؟ جس کو اصطلاحاً "امور حسبیہ" کہا جاتا ہے، یا ظالم وستمگر کی حکومت کی تمام تر قید وبند اور محدودیت ختم ہوجائے گی؟ جبکہ اسلامی سیاست کے لحاظ سے ولی فقیہ کی قدرت کے بارے میں کوئی محدودیت نہیں ہے، وہ امام معصومؑ کی طرح مبسوط الید ہے جو حکومت تشکیل دے اور معاشرہ کے نظام کو چلانے میں امام معصومؑ کی طرح ہے لہٰذا دوسری قسم "ولایت مطلقہ فقیہ کی تھیوری" کے عنوان سے پیش ہوئی ہے۔

ہمارے بزرگوں میں "ولایت مطلقہ فقیہ کی تھیوری" کی وضاحت کے علاوہ اس کو عملی طور پر بھی محقق کرکے دکھانے والوں میں حضرت امام خمینیؒ تھے، جنھوں نے تقریباً چالیس سال پہلے اپنے درس میں اس سلسلہ میں بیان کیا کہ ایک فقیہ کسی خاص علاقہ میں حکومت تشکیل دے سکتا ہے اور وہ اس صورت میں تمام حاکم شرعی کے اختیارات رکھتا ہوگا، اور صرف ضروری اور امور حسبیہ میں منحصر نہیں ہوگا، وہ اسلامی معاشرہ کے تقاضوں کے تحت اسلامی قوانین کے تحت ولایت کو جاری کرسکتا ہے۔

جس وقت امام خمینیؒ نے اس نظریہ کو بیان کیا تو آپ کے شاگردوں نے حسن نیت اور آپ سے لگاؤ کی وجہ سے اس نظریہ کو قبول تو کرلیا لیکن ان کو دل سے یقین نہیں تھا کہ ایسا بھی زمانہ آئے گا یہاں تک کہ اس تحریک کا آغاز ہوا اور آہستہ آہستہ انقلاب آگیا، اور اسلامی حکومت کی تشکیل سے مذکورہ نظریہ عملی طور پر ظاہر ہوگیا۔

پس "ولایت مطلقہ فقیہ" یعنی وہ شخص جو اسلامی نظریہ کے مطابق حکومت کرنے کے شرائط رکھتا ہو، اور علم، تقویٰ اور معاشرہ کی رہبری کے سلسلہ میں امام معصومؑ سے زیادہ شباہت رکھتا ہو اور حکومت تشکیل دے، اور وہ معاشرہ کو ادارہ کرنے میں معصومؑ کے اختیارات رکھتا ہوگا اور جس وقت ولی فقیہ کے اس قدر وسیع اختیارات ہوں تو اس وقت ولی فقیہ کے تحت اسلامی حکومت کے تمام قوانین اور دستور العمل ولی فقیہ کی اجازت اور اس کے اذن سے مشروعیت (جواز) پیدا کرتے ہیں، اور ایک ایک کو براہ راست یا مستقل طور پر قانون گذاری کا حق نہیں ہوگا، اور نا ہی حکومتی قوانین کو جاری کرنے کا حق ہوگا، تمام حکومتی امور اسی کی اجازت سے قانونی ہونگے، اس کی حکومت میں قوانین کو جاری کرنے کا کوئی بھی عہدہ اسی کی طرف دیا جائے گا، یا اگر کسی خاص قانون کے ذریعہ اس کا انتخاب کیا جائے تو اس کو اسی وقت قانونیت ملے گی جب ولی فقیہ اس کی موافقت کردے، لہٰذا چاہے قانون گذاری کا مسئلہ ہو یا قانون کو جاری کرنے کا مسئلہ جب تک ولی فقیہ کی اجازت نہ ہو تو کوئی بھی کام جائز نہیں ہے۔

جیسا کہ امام خمینیؒ مکرر ارشاد فرماتے تھے: "اگر کوئی حکومت ولی فقیہ کی اجازت سے نہ ہو تو وہ طاغوت ہے۔"

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی صرف دو قسمیں ہیں ایک حق کی حکومت اور دوسری طاغوت کی حکومت حق کی حکومت وہ حکومت ہے جس کی باگ ڈور ولی فقیہ کے ہاتھوں میں ہے اور حکومت کے تمام مسائل اسی کے ماتحت ہوں اور اسی کی اجازت سے مشروعیت پیدا کرتے ہیں، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو وہ حکومت باطل اور حکومت طاغوت ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ۔[1]

"اور حق کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے"

8۔ مقبولہ (روایت) عمر بن حنظلہ سے ولایت فقیہ

قارئین کرام! مذکورہ بیان کے مطابق، ولی فقیہ کے وسیع اختیارات قوانین شرع مقدس میں منحصر ہیں اور ان سے

[1] سورہ یونس آیت ۳۲

متجاوز نہیں ہو نگے؛ کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "ولایت مطلقہ فقیہ" موجب شرک اور غیر خدا کو مطلق قرار دینا نہیں ہے؛ بلکہ اس کے برعکس ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل شدہ روایات کے مضمون کے لحاظ سے اگر کوئی شخص ولی فقیہ کے حکم اور فرمان کی نافرمانی کرے تو وہ مشرک ہے جیسا کہ عمر بن حنظلہ کی روایت میں موجود ہے:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دو شیعہ افراد (جن میں دینی مسائل یا دنیوی مسائل اور میراث کے سلسلہ میں اختلاف تھا) کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اپنے اختلافات کو دور کرنے اور اپنے فیصلہ کے لئے کس کی طرف رجوع کریں؟ تو امام علیہ السلام نے ان کو ظالم اور طاغوت حاکم کی طرف رجوع کرنے سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ راویان حدیث اور دینی مسائل کے ماہر اور اہل فن کی طرف رجوع کریں، چنانچہ آپ ایک حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ حَاكِماً. فَإِذَا حَكَمَ بِحُكْمِنَا فَلَمْ يَقْبَلْهُ مِنْهُ فَإِنَّمَا اسْتَخَفَّ بِحُكْمِ اللهِ وَعَلَيْنَا رَدَّ. وَالرَّادُّ عَلَيْنَا الرَّادُّ عَلَى اللهِ وَهُوَ عَلَى حَدِّ الشِّرْكِ بِاللهِ" [1]

میں اس (فقیہ اور دین میں ماہر شخص) کو تم پر حاکم قرار دیتا ہوں پس جس وقت وہ ہمارے حکم کے مطابق فیصلہ کرے اور کوئی اس کو قبول نہ کرے تو بے شک اس نے حکم خدا کو ہلکا قرار دیا ہے اور ہمارے حکم کو رد کیا ہے، ہمارے حکم کو رد کرنا خدا کے حکم کو رد کرنا ہے اور یہ خداوند عالم پر شرک کی حد ہے۔

چنانچہ مذکورہ روایت کے پیش نظر اگر کسی جامع الشرائط فقیہ نے حکومت تشکیل دی تو اگر کوئی شخص اس کی مخالفت کرے یا اس کے حکم کو رد کرے تو گویا اس نے ائمہ معصومین علیہم السلام کی مخالفت کی اور ان کی مخالفت خدا کے شرک کی حد تک ہے البتہ یہ شرک ربوبیت تکوینی میں شرک کی طرح نہیں ہے بلکہ ربوبیت تشریعی میں شرک ہے کیونکہ توحید کے اقسام و مراتب ہیں:

1۔ توحید در خالقیت؛ یعنی خداوند عالم کی وحدانیت اور اس کی یکتائی کا اقرار کرنا۔

2۔ توحید در الوہیت و عبودیت؛ یعنی خداوند عالم کے علاوہ ربّ اور مطلق قانون گذار نہ ہونے اور کسی کے لائق عبادت ہونے پر عقیدہ رکھنا۔

خود توحید ربوبی کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

1۔ توحید ربوبیت تکوینی۔

2۔ توحید ربوبیت تشریعی۔

"توحید در ربوبیت" یعنی دونوں جہان کی تدبیر کو خداوند عالم سے مخصوص ماننے اور اس بات پر عقیدہ رکھیں کہ گردش آفتاب و مہتاب، دن رات کا موجود ہونا، انسان و حیوانات کی موت و زندگی اور دیگر جاندار اشیاء کی حفاظت نیز دیگر حادثات خدا کی طرف سے ہوتے ہیں، وہی زمین و آسمان کی حفاظت کرتا ہے نیز اس وسیع و عرض دنیا میں جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے، رشد

[1] وسائل الشیعہ ج 1 ص 43

کرتی ہے، اپنے بچے پیدا کرتی ہے اور پھر مر جاتی ہے یا کسی بھی طرح کے جو آثار رونما ہوتے ہیں وہ تمام کے تمام خداوند عالم کی تدبیر اور اس کے ارادہ کے تحت ہوتے ہیں، اور کوئی بھی واقعہ خداوند عالم کے دائرہ ربوبیت سے باہر نہیں ہے۔

"ربوبیت تشریعی" صرف انسانوں کی اختیاری تدبیر سے متعلق ہوتی ہے برخلاف دوسری مخلوقات کے، کیونکہ انسان کی تمام حرکات وسکنات اور اس کی ترقی؛ اس کے اختیاری افعال کی بنا پر ہوتی ہے، کیونکہ خداوند عالم نے انسان کو راہ مستقیم کی ہدایت فرمائی ہے، اور اس کو خوب وبد کی پہچان کرادی ہے، اور وہی انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں قانون صادر فرماتا ہے۔

لہٰذا توحید اور اس کے اقسام کے بارے میں بیان شدہ مطالب کے پیش نظر اگر کوئی شخص توحید در خالقیت اور عبودیت نیز توحید ربوبیت تکوینی کو قبول کرلے لیکن اگر توحید ربوبیت تشریعی کو قبول نہ کرے تو وہ مشرک ہے، جس طرح سے حضرت شیطان بھی اسی شرک میں مبتلا ہوئے ہیں، کیونکہ شیطان خداوند عالم کی توحید در خالقیت کو قبول رکھتا تھا اسی طرح خداوند عالم کی توحید ربوبیت تکوینی کو بھی قبول رکھتا تھا، اسی وجہ سے اس نے کہا:

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔[1]

"اس نے کہا پروردگارا! جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں ان بندوں کے لئے زمین میں ساز وسامان آراستہ کروں گا اور ان سب کو اکھٹا کروں گا۔"

قارئین کرام! جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شیطان خداوند عالم کی تکوینی ربوبیت کا معتقد تھا، اور خداوند عالم کو اپنا پروردگار سمجھتا تھا، لیکن اس نے ربوبیت تشریعی کا انکار کیا اسی وجہ سے وہ مشرک ہوگیا جب خداوند عالم امام معصوم علیہ السلام کی اطاعت کو واجب قرار دیتا ہے تو اگر کوئی شخص اس کو نہ مانے اور اس (امام) کی اطاعت نہ کرے، تو اس نے خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کا انکار کیا ہے اور وہ تشریعی ربوبیت میں مشرک ہوگیا ہے اسی طرح اگر امام معصوم علیہ السلام کسی شخص کو اپنے طرف سے معین اور منصوب فرمائیں اور اس کی اطاعت دوسروں پر واجب قرار دیں تو اگر کوئی اس کو نہ مانے اور امام معصوم علیہ السلام کو تسلیم نہ کرے تو وہ بھی تشریعی ربوبیت میں شرک کا مرتکب ہوا ہے لہٰذا اگر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرمائیں: ولی فقیہ کی مخالفت "علی حد الشرک باللہ" (خدا پر حد شرک ہے)؛ تو امام نے کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے اور حقیقت کو بیان فرمایا ہے، لیکن خالقیت یا تکوینی ربوبیت میں شرک نہیں؛ بلکہ اس کا شرک شیطان کی طرح تشریعی ربوبیت میں ہے۔

مذکورہ باتوں کے پیش نظر اسلامی نظریہ کے مطابق اسلامی حکومت کے مختلف مراتب ہیں اس حکومت کا بلند ترین نمونہ اس وقت وجود میں آسکتا ہے جب اس حکومت کی باگ ڈور پیغمبر یا امام معصوم علیہ السلام کے ہاتھ میں ہو اس سے کم مرتبہ کی حکومت وہ حکومت ہے جو جامع الشرائط فقیہ کے ذریعہ تشکیل پاتی ہے، جو علم وعمل اور معاشرہ کی مدیریت کے لحاظ سے امام

---

[1] سورہ حجر آیت ۳۹

معصومؑ سے زیادہ شباھت رکھتا ہے اس سے کم مرتبہ والی حکومت کا بھی تصور پایا جاتا ہے (جیسا کہ فقہاء نے اپنی اپنی کتابوں میں اس بارے میں بھی بیان کیا ہے) اور وہ یہ ہے کہ اگر جامع الشرائط فقیہ موجود نہ ہو یا اگر موجود ہے لیکن معاشرہ کی رہبری کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس وقت ولایت وحکومت عادل مومنین کے حوالے کی جائے گی؛ کیونکہ معاشرہ کو اس کے حال پر نہیں چھوڑا جاسکتا، اور اس کے لئے حکومت تشکیل نہ دی جائے لہٰذا طے یہ ہوا کہ اگر امام معصوم علیہ السلام حاضر ہوں تو ان کی حکومت وولایت بہترین اور مطلوب حکومت ہے، لیکن اگر امام معصومؑ حاضر نہ ہوں تو پھر وہ جامع الشرائط فقیہ جو امام معصومؑ سے زیادہ شباھت رکھتا ہے اس کی حکومت ہونا چاہئے، لیکن اگر جامع الشرائط فقیہ بھی موجود نہ ہو تو پھر ایسے عادل مومن کی حکومت ہو جس کا تقویٰ اور عدالت اس حد تک ہو جس پر عوام الناس اعتماد کریں، اور اس کے احکام جاری کرنے پر راضی ہوں اگر چہ اس کا علم فقیہ کی حد تک نہ ہو۔

اگر چہ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ہمیشہ معاشرہ میں ایسے علماء، فقہاء اور بزرگان رہے ہیں جو معاشرہ کی رہبری اور مدیریت کی صلاحیت رکھتے ہیں، تاکہ معاشرہ کی رہبری کی عظیم ذمہ داری کا بار اپنے شانوں پر اٹھائیں، جیسا کہ خداوند عالم نے ہم پر احسان کیا کہ اس نے حضرت امام خمینیؒ جیسی عظیم نعمت سے سرفراز کیا، تاکہ معاشرہ کی بہترین طریقہ سے رہبری کریں، اور ان کے بعد ایسے شخص کا ذخیرہ کیا جو امام خمینیؒ کا خاص شاگرد اور ان کا خلف صالح ہے، جس میں زھد وتقویٰ، سیاسی فکر، مصالح مومنین کی رعایت، اسلامی معاشرہ کی رہبری اور مدیریت نیز دیگر مہم صفات میں امام خمینیؒ سے زیادہ مشابہ اور نزدیک ہے۔

9۔ اسلام کی نظر میں تفکیک قوا (قدرت کا جدا جدا ہونا) کا جائزہ

دوسری وہ چیز جس پر ہم نے زیادہ اشارہ کیا ہے اور کہ اس پر مزید روشنی ڈالنا مناسب ہے وہ تفکیک قوا (قدرت کا جدا جدا ہونا) اور حکومتی ذمہ داریوں کی تقسیم ہے جیسا کہ آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کی ایسی کوئی خاص شکل وصورت نہیں ہے جو مخصوص شرائط یا کسی خاص معاشرہ سے مخصوص ہو اسلام کے لحاظ سے حکومت ایسی بھی ہو سکتی ہے جس میں فقط چند خاندان شامل ہوں، یا بہت زیادہ آبادی والے ملک میں بھی حکومت ہوسکتی ہے، بلکہ عالمی معاشرہ کے لئے بھی حکومت ہوسکتی ہے ظاہر سی بات ہے کہ حکومت کی مخصوص ذمہ داریاں اور وظائف جن سے حکومت کا وجودی فلسفہ ظاہر ہوتا ہے (خصوصاً زیادہ آبادی والے ملک میں) تو یہ ذمہ داریاں ایک یا دو افراد کے بس کی بات نہیں ہیں۔

اندرونی امنیت، بیرونی دشمن سے مقابلہ، اقتصادی کارکردگی پر نظارت، بین الاقوامی امور پر نظارت، بین الاقوامی تعلقات کو طے کرنا نیز معاشرہ کی دوسری ضرورتیں اور ان سب میں مہم اسلامی شعار کو اقامہ کرنا، احکام اسلامی کے جاری ہونے پر نظارت اور ان کی حفاظت وغیرہ وغیرہ جیسی مہم ذمہ داریاں حکومت کے ذمہ ہوتی ہیں جن کے تحت ان کے لئے کام تقسیم ہونا چاہئے یہ تقسیم کار دو محور میں انجام پاتی ہے، ایک عمودی (طولی) اور دوسرا افقی (عرضی)؛ یعنی حکومتی کارکردگی کے یہ دونوں حصے ساق مثلث کے دو خطوں کو تشکیل دیتے ہیں، جو وسط سے ایک دوسرے کے راستہ کو نہیں کاٹتے، اور آخر میں "راس هرم"

(مرکزی نقطہ) پر پہنچ جاتے ہیں، سادہ الفاظ میں حکومت کو ہرم کے مانند سمجھیں، جیسا کہ سیاست دانوں نے اس شباہت کی بنا پر حکومت کو "ہرم قدرت" سے تعبیر کیا ہے، جس میں ایک مرکزی نقطہ ہوتا ہے اور اسی کے تحت ہرم ہوتی ہے، اسی طرح حکومت کی مرکزی قدرت ایک شخص کے پاس ہوتی ہے جس کے تحت تمام ادارے کام کرتے ہیں

جس وقت ہم حکومت کے عام معنی تصور کریں تو قدرت کا ہر ایک رخ حکومت کے وظائف کو تشکیل دیتا ہے "مانٹسکیو" کے زمانہ سے فلسفہ حقوق اور سیاست میں حکومتی قدرت کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: قوہ مقننہ (پارلیمنٹ) قوہ قضائیہ (قضاوت وعدالت) اور قوہ مجریہ (قوانین کو جاری کرنے والی طاقت جو حکومت کی شکل میں دکھائی دیتی ہے)، حکومت کا ایک رخ قانون گذاری ہوتی ہے دوسرا رخ قضاوت (عدالت) اور تیسرا رخ قوانین کو جاری کرنا ہوتا ہے حکومت کی کارکردگی کا ایک حصہ کلی اور جزئی قوانین ومقررات بنانا ہوتا ہے اور دوسرا حصہ عوام الناس کے اختلافات اور جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے اور تیسرا حصہ معاشرہ میں قوانین کو جاری کرتا ہے۔

10۔ طاقت کے ایک ساتھ ہونے کا سبب

اگرچہ حکومتی کارکردگی اور اس کی قدرت کی مذکورہ تقسیم مناسب اور بجا ہے، لیکن اس بات پر بھی توجہ رکھنا ضروری ہے کہ ان تینوں حصوں کے درمیان خط کھینچنا آسان کام نہیں ہے یعنی یہ بات عملی طور پر ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم عام طور پر قوانین ومقررات اور آئین ناموں اور ان کے جاری کرنے کو جدا جدا کریں اور قوہ مجریہ کو بالکل کسی بھی طرح کے قوانین نہ بنانے کی اجازت نہ دیں، آج کل ان تمام ہی ممالک میں جن میں ڈیموکریسی سسٹم ہوتا ہے قدرت کی تقسیم کو قبول کیا گیا ہے، اور ان میں خواہ نا خواہ بعض چیزوں میں قانون گذاری اور ان کو جاری کرنے کے سلسلہ میں اختلاط (مخلوط ہونا) پایا جاتا ہے، جس کی سب سے واضح مثال کا پارلیمنٹ نظام میں مشاہدہ کیا جاتا ہے، کیونکہ ڈیموکراٹک نظام پارلیمنٹ اور ریاستی نظام کی طرف تقسیم ہوتا ہے۔

1۔ پارلیمنٹری نظام

جو قدرت کے یکجا ہونے کی بنیاد پر ہوتا ہے، یعنی تمام تر قدرت پارلیمنٹ کے تحت ہوتی ہے جب عوام الناس کے ووٹوں سے مختلف پارٹیوں سے ممبران منتخب ہوتے ہیں تو ان کے ذریعہ پارلیمنٹ بنتا ہے، اور اسی میں سے مختلف وزیر اور وزیر اعظم بنائے جاتے ہیں، اور تمام بڑے بڑے عہدے اسی پارلیمنٹ کے ممبران میں سے ہوتے ہیں اس نظام میں پارلیمنٹ کی طرف سے مختلف وزراء کو مختلف اداروں کی ذمہ داری دی جاتی ہے، اور یہی پارلیمنٹ وزراء کو معزول بھی کرسکتا ہے۔

2۔ ریاستی نظام

جس میں قدرت جدا جدا تقسیم ہوتی ہے اس نظام میں صدر مملکت پارلیمنٹ کی طرف سے انتخاب نہیں ہوتا اور وزراء

صدر مملکت کی طرف سے منصوب ہوتے ہیں، اور پارلیمنٹ ان کو معزول نہیں کر سکتا، در مقابل پارلیمنٹ بھی قوہ مجریہ سے مستقل اور جدا ہوتا ہے اس سسٹم میں ممبر آف پارلیمنٹ اور وزراء کابینٹ "Cabinet" میں ذاتی اور مانعة الجمع اختلاف ہوتا ہے یعنی صدر مملکت ممبر آف پارلیمنٹ میں سے وزیر نہیں بنا سکتا مگر اس وزیر کو جس نے پارلیمنٹ کی ممبری شپ سے استعفاء دیدیا ہو۔

ریاستی حکومت میں صدر مملکت براہ راست عوام الناس کے ذریعہ انتخاب ہوتا ہے اور اس میں ایک طرح طاقت کے دخل کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور بعض قوانین ومقررات کو طے کرنا وزراء کابینٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے آج کل ہمارے ملک میں بہت سی اجتماعی اور اقتصادی کارکردگی کے لئے حکومت کے قوانین کافی ہوتے ہیں؛ یعنی حکومتی کابینٹ کا جلسہ ہوتا ہے اور صلاح مشورہ کے بعد قوانین تصویب کئے جاتے ہیں، اور خود ان کو جاری بھی کرتی ہے لہٰذا بعض قوانین بنانے میں حکومت کو اجازت ہوتی ہے۔

دوسری طرف اگر چہ پارلیمنٹ کا کام قوانین بنانا ہوتا ہے لیکن بعض اجرائی کاموں کو بھی انجام دیتی ہے: مثال کے طور پر بیرونی کمپنیوں سے معاہدہ (اگریمنٹ) کرنا ایک اجرائی کام ہے اور قاعدہ کے مطابق حکومت کو کرنا چاہئے لیکن چونکہ یہ مسئلہ بہت مہم اور بنیادی ہے لہٰذا اس سلسلہ میں تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے احتیاط کے ساتھ ضروری تحقیق و جائزہ کے بعد یہ قدم اٹھایا جاتا ہے تا کہ اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جا سکے، اور حکومت میں اس طرح کے معاہدہ کو بیان کرنے کے بعد ضروری تحقیق و بررسی کر کے پارلیمنٹ کے حوالے کیا جاتا ہے، اور جب پارلیمنٹ اس کی تائید کر دیتا ہے تو اس پر عمل درآمد ہوتا ہے۔

المختصر تفکیک قوا (قدرت کا جدا جدا ہونا) کا نظریہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے مستقل اور جدا ہوں، لیکن عملی میدان میں دنیا کے مختلف نظام میں بعض امور کے سلسلہ میں ان قوتوں میں اختلاط پایا جاتا ہے، البتہ یہ قدرتیں جس قدر بھی ایک دوسرے سے جدا جدا رہیں اور ہر قدرت ایک دوسرے سے مستقل ہوں تو پھر ایک دوسرے میں دخالت اور ناجائز فائدہ اٹھانے کا امکان کم پایا جاتا ہے۔

اکتیسویں نشست

تفکیک قوا (طاقتوں کی جدائی) کے نظریہ کی تحقیق اور اس پر نقد وتنقید

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ ہم نے گذشتہ جلسات میں عرض کیا کہ اسلامی حکومت کے بہت سے وظائف اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر اسلامی حکومت کا فلسفہ وجودی سمجھ میں آتا ہے وہ وظائف اور ذمہ داریاں جن کی اسلامی حکومت عہدہ دار ہوتی ہے ان کے لئے کچھ خاص اختیارات بھی ہونا ضروری ہیں جن کے تحت وہ اپنے وظائف اور ذمہ داریوں کو پورا کرسکتی ہے بہرحال تمام ہی حکومتوں بالخصوص اسلامی حکومت کی خاص ذمہ داریوں کی وجہ سے کاموں کی تقسیم بندی ہوتی ہے جو مہارت، لیاقت اور ذمہ داری کی قسم کی بنا پر عہدہ داران کو دی جاتی ہے بے شک یہ کاموں اور قدرتوں کی تقسیم ایک ضروری چیز ہے، کیونکہ اگر ایک محدود مقام جیسے کسی گاؤں وغیرہ کی حکومت کا مسئلہ ہوتا تو اس وقت کاموں کی تقسیم اتنی زیادہ ضروری نہ ہوتی لیکن چونکہ اسلامی حکومت ایک خاص علاقے سے مخصوص نہیں ہے لہٰذا اکثر موارد میں قدرتوں کی تقسیم نہایت ضروری ہے۔

اور چونکہ اسلامی حکومتی نظریہ پوری دنیا اور تمام زمانوں کے لئے ہے، لہٰذا اس کے لئے ایک ایسا نقشہ مرتب کیا گیا ھے جو عالمی اور دائمی ہے، اور کسی خاص علاقے اور خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے، اسی وجہ سے اس کے لئے ایسے قوانین کا انتخاب کیا گیا ہے جو مختلف زمانہ اور مختلف مقامات کے لئے جاری ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں؛ بے شک کاموں اور قدرت کی تقسیم انہیں قوانین کے تحت ہوتی ہے۔

2۔ تفکیک قوا (قدرتوں کی جدائی) کے نظریہ کی تاریخی حیثیت

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے گذشتہ جلسہ میں عرض کیا کہ حکومتی نظام کا ایک ھرم (وسیلہ اور طاقت) کی طرح تصور کیا جاسکتا ہے، جو مختلف شکلوں اور صورتوں سے تشکیل پاتا ہے، لیکن ان شکلوں کی تعداد تقریباً معاہدہ کے طور پر ہوتی ہیں چنانچہ حکومت کی یہ شکل قدیم زمانہ سے چلتی آرہی ہے، یونانی فلاسفہ منجملہ "ارسطو" کے زمانے سے حکومت کی یہی تین چھرے والی تصویر پیش کی گئی ہے ان میں سے ایک چھرہ ان لوگوں سے مخصوص ہوتا ہے جو معاشرہ کے صاحب عقل وخرد ہوتے ہیں، اور حکومت کے اس حصے کو (جسے آج کل "قانون گذاری پاور" (ممبر آف پارلیمنٹ) کا نام دیا جاتا ہے)؛ وہ لوگ تشکیل دیتے ہیں جو اپنی عقل وفکر کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرہ کے نظام کے لئے ضروری قوانین مرتب کرتے ہیں اسی طرح ارسطو کے

کلام میں دوسرے دو چہروں کا بھی تذکرہ ہے جو قوہ مجریہ (حکومت) اور قوہ قضائیہ (عدل) پر منطبق ہوتی ہیں، اور وہ درج ذیل ہیں:

1۔ معاشرہ کے حکام اور اس کو چلانے والے۔

2۔ عوام الناس کے فیصلے کرنے والے افراد۔

اسی طرح ان آخری صدیوں میں مغربی سیاست داں افراد نے بھی حکومت کے تین چہروں والا نظریہ پیش کیا ہے چنانچہ ان کے آخر میں "مونٹسکیو" نے بھی تفکیک قوا کے نظریہ کے تحت حکومت کو درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: قانون گذاری، عدلیہ، اور قوہ مجریہ، اور اسی وجہ سے اس نے "روح القوانین" نامی کتاب لکھی، جس میں ہر ایک قدرت کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے "مونٹسکیو" کی علمی اور نئے نظریات کے سلسلہ میں کی گئی کوشش کی وجہ سے تفکیک قوا کا مسئلہ اسی وقت سے مشہور ہوگیا یہاں تک کہ آج بعض لوگ اسی کو اس تھیوری کا مخترع کہتے ہیں۔

آج کل اکثر ممالک منجملہ ہمارے ملک میں بھی بنیادی قوانین اسی نظریہ کے تحت بنائے جاتے ہیں، اور تینوں طاقتوں کو استقلال اور ڈیموکریسی کے اصول میں شمار کرتے ہیں بین الملل (عالمی سطح) پر اسی ملک کو ڈیموکریٹک کہا جاتا ہے جس میں یہ تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے الگ الگ اور مستقل ہوں اور ایک دوسرے پر مسلط نہ ہوں۔

3۔ تفکیک قوا نظریہ کے دلائل پر ایک نظر

1۔ چونکہ حکومت کی مختلف اور پیچیدہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کے سبب ان کے بارے میں کافی معلومات اور خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا یہ سب کام ایک شخص سے نہیں ہوسکتا لہٰذا انہیں پیچیدگیوں کے پیش نظر کام اور قدرت کی تقسیم ضروری ہے اور چونکہ حکومت کی مختلف ذمہ داریاں ہوتی ہیں لہٰذا ان میں اختلاف اور ایک دوسرے کا مخالف ہونا بھی ممکن ہے تو اس صورت میں حکومت کے اسی خاص چہرے کے لحاظ سے عہدہ داروں کا بھی انتخاب ہوتا ہے اسی بنا پر حکومت کی تینوں طاقتیں تقسیم ہوتی ہیں اور انہیں کے تحت تمام حکومتی امور انجام پاتے ہیں، البتہ اس کی زیادہ تر فعالیت قوہ مجریہ کے تحت ہوتی ہیں: مثلاً جنگ اور دفاع سے متعلق مسائل، معاشرہ کے مستضعف اور کمزور لوگوں کی امداد کرنا، تعلیم و تربیت کا نظام اور علاج و معالجہ سسٹم وغیرہ یہ تمام محکمات قوہ مجریہ کے تحت ہوتے ہیں جبکہ عدلیہ کا کام صرف عوام الناس کے اختلافات اور جھگڑوں کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے، اور قانون گذار پاور (پارلیمنٹ) کا کام فقط قوانین بنانا ہوتا ہے، اس کے علاوہ دوسرے مخصوص کام نیز معاشرہ اور ملک کی دوسری ضرورتوں کا پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

قوہ مجریہ کی عظیم اور وسیع ذمہ داریوں کے پیش نظر ہوسکتا ہے اس کو عدلیہ اور پارلیمنٹ کے برابر رکھ دیا جائے اور اس کو ایک قدرت کا نام دیدیا جائے لیکن خود حکومت کا ایک پہلو نہیں ہوتا بلکہ مختلف ذمہ داریوں اور وظائف کی بنا پر اس کے ایک سے زیادہ پہلو ہوتے ہیں اور اس قدرت کی تقسیم کی بنا پر ہر ایک محکمہ پر ایک قدرت کا اطلاق ہوسکتا ہے، اس صورت میں اس

کے بہت سے پہلو دکھائی دے سکتے ہیں، اور اس کے تحت ہر وزارتخانہ اس کے ایک پہلو کو تشکیل دیتا ہے۔

بہر حال حکومتی نظام کی مختلف ذمہ داریوں کی بنا پر قدرت کی جو تین قسمیں کی گئی ہے، اور اس تقسیم کو آج کی دنیائے سیاست نے بھی قبول کیا ہے اور وہ ایک معاہدہ کے عنوان سے مشہور ہے، لہٰذا اس تقسیم میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

قارئین کرام! یہاں پر ایک سوال یہ باقی رہتا ہے کہ کیا حکومت کی مختلف ذمہ داریوں کا ہونا اس تقسیم اور استقلال کے لئے کافی ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ مختلف ذمہ داریوں کا ہونا صرف تفکیک قوا پر ایک توجیہ تو ہو سکتی ہے لیکن اس کو اس سلسلہ میں علت تامہ (مکمل طور پر علت) قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ جب ہم قوہ مجریہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی مختلف ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن میں آپس میں زیادہ تعلق بھی نہیں ہوتا؛ مثلاً جنگ اور دفاع کا مسئلہ، میڈیکل وغیرہ لیکن اس کے بعد بھی یہ تمام چیزیں قوہ مجریہ کے تحت ہوتی ہیں اور اگر ذمہ داریوں کے مختلف ہونے ہی کو قدرت کے زیادہ ہونے کا سبب قرار دیں تو پھر دسیوں مستقل قدرتیں ہونا چاہئیں تھیں۔

2۔ تفکیک قوا اور تکوینی تقسیم کی اہم ترین دلیل اور توجیہ وہی ہو جس کی بنا پر مونٹسکیو نے تفکیک قوا کا یہ نظریہ پیش کیا ہے:

چونکہ انسانی فطرت میں ایک دوسرے پر سلطنت اور ظلم کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے، اور اگر تینوں طاقتیں ایک شخص یا ایک گروہ کے تحت ہوتیں تو پھر اس (حکومت) سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے زیادہ امکانات پائے جاتے، کیونکہ اس صورت میں وہی گروہ قانون گذار بھی ہے اور فیصلے کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے اور قوانین کو جاری کرنے کا عہدہ بھی اسی کے پاس ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان اپنے مفاد میں قانون بناتا ہے اور پھر اپنے ہی حق میں فیصلے کرتا ہے، اس طرف سے قوانین کو جاری کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے لہٰذا ناجائز فائدہ اٹھانے کے بہت سے راستے ہموار ہو جاتے اسی بنا پر مونٹسکیو کا ماننا تھا کہ راہ اعتدال کو برقرار رکھنے اور ظلم و جور سے روک تھام اور ناجائز فائدہ اٹھانے سے روکنے کے لئے تینوں قدرتوں کا الگ الگ ہونا ضروری ہے۔

قارئین کرام! گذشتہ مطالب کے پیش نظر یہ بات معلوم ہو گئی کہ قدرتوں کا مستقل ہونا اس لئے ضروری ہے، کہ ناجائز فائدہ اٹھانے کا سد باب ہو جائے خصوصاً قوہ مجریہ کے لئے جو جب عدلیہ بالکل مستقل ہو تو پھر سب کے فیصلے قوانین کے تحت ہوں گے، اور کوئی بھی سزا سے نہیں بچ سکتا، اور تمام ہی افراد عدلیہ کے مقابلہ میں جواب دہ ہوں گے، کیونکہ اس صورت میں عدلیہ بڑے سے بڑے حکومتی عہدہ دار کو عدالت کے کٹھیرے میں کھڑا کر سکتی ہے، اور اگر انہوں نے قوانین کی خلاف ورزی کی ہے تو اس کو سزا دے سکتی ہے اسی طرح اگر قانون گذار طاقت (پارلیمنٹ) نے اسلامی قوانین کی مخالفت کی ہے تو اس صورت میں عدلیہ ان کے خلاف کاروائی کر سکتی ہے اسی طرح اگر قانون گذار طاقت مستقل ہو گی تو وہ (بھی) قانون گذاری کے سلسلہ میں کسی (عدلیہ اور حکومت) سے متاثر ہو کر قانون نہیں بنائے گی اور ممبر آف پارلیمنٹ قوانین بناتے وقت مکمل طور پر مستقل اور آزادی کے ساتھ قوانین بنائیں گے اور کسی بھی طاقت کے تحت تاثیر قرار نہیں پائیں گے، اور دوسرے

سے وابستہ ہونے کا احساس بھی نہیں کریں گے۔

4۔ تفکیک قوا کو بالکل محدود کرنا ناممکن

سیاست داں حضرات نے ڈیموکریسی کے لئے تینوں طاقتوں کو مستقل ہونا شرط قرار دیا ہے، البتہ یہ استقلال عملی طور پر حاصل ہونا چاہئے اور نظریہ کے لحاظ سے بھی، کیونکہ ہوسکتا ہے کوئی نظام تفکیک قوا کے نظریہ کے تحت ہو اور یہ تصور کیا جائے کہ تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں، اور کسی ایک طاقت سے بھی متاثر نہیں ہے لیکن عملی میدان میں ایک طاقت دوسری طاقت پر تجاوز کر جائے اور اپنے حکمرانی چلانے کی کوشش کرے۔

اگر ہم دنیا بھر کی ڈیموکرسی حکومتوں پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ بہت ہی کم ایسی حکومتیں ہیں جن میں تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے مکمل طور پر الگ الگ ہوں، مثلاً عدلیہ اور پارلیمنٹ؛ حکومت سے متاثر نہ ہوں اور یہ تو ظاہر سی بات ہے کہ جب عدلیہ کے تمام اخراجات حکومت کے ہاتھ میں ہوں اور انتخابات حکومت کے ذریعہ انجام پاتے ہوں تو پھر بہت ممکن ہے کہ حکومت چند پارٹیوں کے مقابلہ میں اسی طرح اپنی حکومت کو برقرار رکھے؛ اور جب حکومت اس کے ہاتھ میں ہوگی تو دوسری طاقتیں بھی اسی کے اختیار میں ہوں گی۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر کی مختلف حکومتوں میں حکومت کے عہدہ دار افراد کبھی علی الاعلان اور کبھی مخفی طور پر دوسری حکومتوں میں دخالت کرتے ہیں اور ان پر زور دیتے ہیں، خصوصاً وہ ممالک جن میں پارلیمنٹری نظام ہوتا ہے اور پارلیمنٹ کے ذریعہ ہی حکومتیں عہدہ داروں کا انتخاب کرتی ہیں، یعنی ممبر آف پارلیمنٹ براہ راست عوام الناس کے ذریعہ چنے جاتے ہیں اور پھر یہی ممبر اپنی اکثریت سے حکومت کے لئے عہدہ داروں کا انتخاب کرتے ہیں۔

اسی طرح ریاستی نظام جن میں صدر مملکت کا انتخاب خود عوام الناس کرتی ہے اور اجرائی قدرت صدر مملکت کے اختیار میں ہوتی ہے؛ ان میں حکومت پارلیمنٹ اور عدلیہ میں دخالت کرتی ہے، خصوصاً بہت سے وہ ممالک جن میں صدر مملکت کو وٹو "Veto" کا حق ہوتا ہے، اور وہ پارلیمنٹ کے قوانین کو بے اثر کرسکتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ بایدوشاید طور پر اپنے نظریہ کو حکومت پر لاگو نہیں کرسکتا، ممبر آف پارلیمنٹ قوانین بناتے ہیں، اپنی بحث وگفتگو کے بعد اکثریت سے کسی قانون کو پاس کرتے ہیں، لیکن چونکہ خود بنیادی قوانین نے صدر مملکت کو وٹو کا حق دیا ہے لہٰذا ان کے بنائے ہوئے قوانین بے اثر ہوجاتے ہیں۔

ہماری نظر میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس میں تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے مستقل ہوں، اور کسی ایک طاقت کے تحت تاثیر نہ ہوں اور ایک دوسرے میں کسی طرح کی کوئی دخالت نہ کرتی ہوں، خصوصاً قوہ مجریہ جو دوسری طاقتوں پر زیادہ نفوذ رکھتی ہے، فقط بنیادی قوانین میں استقلال کے نام سے موجود ہے جبکہ حقیقت میں تینوں طاقتیں مستقل اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے، بلکہ حکومت ان پر مسلط ہوتی ہے۔

اور چونکہ تینوں طاقتیں ایک دوسرے میں دخالت کرتی ہیں لہٰذا ان تینوں طاقتوں کے کام کے درمیان ایک ثابت حد بندی معین کرنا واقعاً مشکل ہے جیسے قانون گذاری والے مسائل ہوں یا قوانین جاری کرنے والے مسائل یا اس کے برعکس، یعنی اجرائی مسائل کو قانون گذاری کے حوالے سے جدا کرنا مشکل ہے ہم خود اپنے ملک میں اور دوسرے ممالک میں یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مسائل جو قانون گذاری کا پہلو رکھتے ہیں لیکن وہ (بھی) حکومت کے ذمہ ہیں مثال کے طور پر بنیادی قوانین کے تحت بعض قوانین حکومتی کابینٹ کے سپرد کئے جاتے ہیں جن کو طے کرکے جاری کیا جاتا ہے اگرچہ ان قوانین پر اسپیکر کے دستخط ہونا (بھی) ضروری ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی صرف ان قوانین کا پارلیمنٹ میں بھیج دینا ہی کافی ہوتا ہے بعض حکومتوں میں اسپیکر کے دستخط کرنا یا پارلیمنٹ میں بھیجنا ضروری بھی نہیں ہوتا، بلکہ خود حکومتی کابینٹ میں پاس ہونے سے وہ قانونی شکل اختیار کرلیتے ہیں، اور ان کو نافذ کردیا جاتا ہے لیکن وہ موارد میں جن میں اسپیکر کے دستخط اور اس کا تائید کرنا ضروری ہوتا ہے، ان میں (بھی) دستخط اور تائید کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی اور صرف دکھاوٹی پہلو ہوتا ہے کیونکہ حکومتی کابینٹ کوئی بھی قانون بنادے تو پھر اسپیکر کو اس پر دستخط کرنا ہی ہوتا ہے اور اگر یہ فرض کرلیں کہ اسپیکر کے دستخط دکھاوے کے طور پر نہیں ہیں تو کیا اسپیکر کے دستخط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس قانون کو ممبر آف پارلیمنٹ نے بنایا ہے؟!

بہرحال بعض ایسے مسائل جو قانون گذاری کے پہلو رکھتے ہیں اور ان پر بحث وگفتگو کے ذریعہ ان کو پاس کرنا پارلیمنٹ کے ذمہ ہوتا ہے، لیکن ان کی فوری طور پر ضرورت ہے اور اگر وہ فوراً تصویب نہ ہوئے تو معاشرہ میں خلل پیش آجائے گا تو اس صورت میں خود حکومتی کابینٹ کو اس طرح کے قوانین بنانے کا حق دیا جاتا ہے دوسری طرف بعض وہ مسائل جو اجرائی پہلو رکھتے ہیں لیکن ان کی اہمیت کے پیش نظر بنیادی قوانین ان کو جاری کرنے کے لئے پارلیمنٹ کو مصوب کرنے اور اس کی تائید کرنے کی شرط کرتا ہے مثلاً جنگ، اقتصاد اور تیل وغیرہ کے سلسلہ میں بیرونی کمپنیوں سے معاہدہ کرنا یہ سب کام اجرائی پہلو رکھتے ہیں لیکن بنیادی قوانین کے مطابق پارلیمنٹ کا پاس کرنا ضروری ہے قارئین کرام! ہمارا مقصد یہ ہے کہ تھیوری اور نظری لحاظ سے پارلیمنٹ اور قوہ مجریہ کے وظائف میں مکمل طور سے جدائی کرنا صحیح اور منطقی نہیں ہے۔

حکومتی نظام میں پارلیمنٹ اور قانون گذار مجلس کے علاوہ دوسری شوریٰ اور مجالس بھی ہوتی ہیں جن کا کام بھی ایک طرح سے قانون گذاری ہوتا ہے مثال کے طور پر ہمارے ملک میں "شوریٰ انقلاب فرہنگی" بھی بعض چیزوں کو تصویب کرتی ہے جن کو قانون کی جگہ سمجھا جاتا ہے، اور ان قوانین کی شکل ایسی ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ شوریٰ اسلامی مجلس اور ممبر آف پارلیمنٹ کے ذریعہ تصویب ہوجاتے ہیں، لیکن ہمارے ملکی نظام کے ثقافتی اہمیت کی خاطر اور ثقافتی سلسلہ میں سیاست اور طریقہ کار کو طے کرنے کی ذمہ داری ان افراد پر ہوتی ہے جو اس سلسلہ میں کافی تجربہ اور مہارت رکھتے ہوں اسی طرح بعض دوسرے مخصوص ادارے ہوتے ہیں جن کا شمار قوہ مجریہ میں ہوتا ہے، اور قانون کو جاری کرنے والوں کی طرح تصمیم گیری کرتے ہیں اور قانون گذاری پہلو نہیں رکھتے، مثلاً "شوریٰ عالی امنیت" اور "شوریٰ عالی اقتصاد" جو اس سلسلہ کے ماہرین افراد

پر مشتمل ہوتی ہیں، جن کی مہارت اور دقت عقلی دوسری کی نسبت زیادہ ہوتی ہے جو ملک کے اہم اور اسٹریٹیجک "Strate'gique" مسائل میں اپنی دقت اور ظرافت کے ساتھ عمل کرتی ہے۔

قارئین کرام! ہماری گذشتہ باتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تینوں طاقتوں کا مکمل طریقہ سے مستقل اور الگ الگ ہونا چاہے تھیوری "Theory" کے لحاظ ہو یا عملی (پریکٹیکل) "Practical" اعتبار سے ایک مشکل کام ہے، خصوصاً حکومت کے مخصوص کاموں کا پارلیمنٹ کی ذمہ داریوں سے الگ کرنا لیکن جیسا کہ دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ طاقتیں ایک دوسرے میں دخالت کرتی ہیں، خصوصاً بہت سے ملکوں میں حکومت؛ پارلیمنٹ اور عدلیہ میں دخالت کرتی ہے اسی وجہ سے اس طرح کی مداخلت سے روک تھام کے لئے ایک طریقہ سے معاھدہ کرنا ضروری ہے۔

5۔ تینوں طاقتوں پر ایک ناظر اور ہم آہنگ کرنے والی طاقت کی ضرورت

قارئین کرام! دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر درحقیقت تینوں طاقتوں میں مطلق اور مکمل طور جدائی ہوجائے اور ہم پارلیمنٹ کو مستقل طور پر دیکھنا چاہیں جو دوسری دونوں طاقتوں سے کوئی بھی عہدادار کا رابطہ نہ رکھتا ہو، اسی طرح قوہ مجریہ یا عدلیہ کو مستقل طور پر دیکھنا چاہیں اور اس تقسیم میں تھیوری اور پریکٹیکل طور پر کسی طرح کی کوئی مشکل پیش نہ آئے تو ملک کی ترقی کے سلسلہ میں پیش آنے والے اہم امور میں بہت بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے، اور وہ مشکل یہ ہوگی کہ حکومت میں ایک قسم کا شدید اختلاف پیدا ہوجائے گا؛ گویا ایک ہی ملک میں تین حکومتیں ہوں گی، جن میں سے ہر ایک اپنے لحاظ سے کارکردگی میں مشغول ہے جس کا ایک دوسرے سے بالکل کوئی واسطہ نہیں ہے۔

المختصر ایک طرف حکومت کی کارکردگی کا مختلف ہونا اور ان کا پیچیدہ اور وسیع ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ طاقتیں تقسیم ہونا چاہئیں، اور حکومت کے لئے مختلف پہلو مدنظر رکھے جائیں، اور ان تینوں طاقتوں کی ذمہ داری کی وجہ سے ایک حکومت کے لئے بہت سے چہرے تصور کئے جائیں جس کے نتیجہ میں ایک حکومت مثلث القاعدہ یا مخمس القاعدہ ہوجائے جس کی وجہ سے اس حکومت کے مختلف چہرہ دکھائی دیں دوسری طرف سے عوام الناس اور معاشرہ کے نظام کی وحدت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ حکومت میں ایک وحدت اور ان کا منسجم ہونا ضروری ہے تاکہ اسی کے زیر سایہ تمام نظام کی وحدت اور اتحاد نیز طاقتوں کے درمیان ایک ہم آہنگی برقرار رہے اسی طرح ان تینوں طاقتوں کی کارکردگی پر بھی نظارت ہوسکے۔

لہٰذا ہم اسلامی حکومت کے لئے دو قسم کی مصلحت اندیشی کے روبرو ہیں: ایک طرف سے ہمیں طاقتوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم کو قبول کرنا ہے کیونکہ حکومت کی مختلف کارکردگی کی الگ الگ قسمیں ہیں اور ایسے ماہر افراد جو اپنی مہارت اور تجربہ کے ذریعہ مختلف ذمہ داریوں کو نبھا سکیں، بہت ہی کم ہیں، اور شاید ایسے افراد کا وجود ہی نہ ہو، لہٰذا ان طاقتوں کا تقسیم کرنا ضروری ہے، اور ہر حصہ کی مخصوص ذمہ داریاں اسی فن میں ماہر افراد کے سپرد کی جائے دوسری طرف، چونکہ معاشرہ کو ایک اتحاد اور وحدت کی ضرورت ہے؛ کیونکہ اگر ان طاقتوں میں اختلاف اور ٹکراؤ ہونے کا امکان ہے، لہٰذا ان تینوں طاقتوں کو ہم

آہنگ کرنے سے ایک اہم طاقت کا ہونا ضروری ہے تاکہ اگر ان طاقتوں میں اختلاف ہوجائے تو وہ طاقت ان کے درمیان اس اختلاف کو دور کرسکے، اور ادھر معاشرہ میں اتحاد کے پیش نظر اپنا بنیادی کردار ادا کرے کیونکہ وہ معاشرہ جس پر تین طاقتیں مستقل طور پر اپنا اپنا حکم چلاتی ہیں؛ اس کو ایک متحد اور ہم آہنگ نہیں کہا جاسکتا اور خواہ نخواہ ایک طرح کا اختلاف اور ٹکراؤ پیدا ہوجائے گا۔

اس مشکل کو حل کرنے اور ان طاقتوں میں اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے، نیز اختلاف کو حل کرنے کے لئے سیاست دانوں نے بہت سی راہ حل بیان کی ہیں جن کا بیان کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے، اور ہم صرف اسلامی راہ حل پیش کرتے ہیں۔

6۔ ولایت فقیہ معاشرہ کے اتحاد کا مرکز

قارئین کرام! گذشتہ جلسات میں بیان شدہ مطالب کے پیش نظر جن میں اسلامی حکومت کی مختلف صورتیں اور اس کے اقداری درجات کے بارے میں عرض کیا کہ اسلامی حکومتوں کی بعض صورتیں نمونہ ہیں، اور ان میں سے بعض اس سے کم تر درجہ کی ہیں، کہ اگر بلند ترین اور نمونہ حکومت تشکیل نہ ہوسکے تو اس سے کم تر درجہ والی حکومت تشکیل پائے گی؛ یہاں پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اسلامی نظام میں اس مشکل کے بارے میں بہترین چارہ جوئی بیان کی گئی ہے کیونکہ نمونہ حکومت میں ایک معصوم ذات کو برسر اقتدار ہونا چاہئے، اور اسی کے ہاتھوں میں طاقت وقدرت ہونی چاہئے، اور یہ ظاہری بات ہے کہ جب (معصوم علیہ السلام) کے ہاتھوں میں قدرت ہوگی تو تو معاشرہ میں وحدت واتحاد اور قدرتوں میں ہم آہنگی پیدا ہوجائے گی، اور اپنی قدرت سے اختلافات اور قدرتوں کے درمیان ٹکراؤ کا خاتمہ فرمادیں گے اس کے علاوہ ہر قسم کی خود خواہی، ذاتی مفاد اور پارٹی بازی سے جدا رہیں گے؛ کیونکہ معصوم وہ ہے جس میں کسی طرح کا کوئی غیر الٰہی تصور نہیں پایا جاتا (البتہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ اسلامی حکومت کی نمونہ صورت (آئیڈیل شکل) صرف امام علیہ السلام کے حاضر ہونے کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

اسی طرح اسلامی حکومت کی دوسرے درجہ میں وہ حکومت ہے جس میں صاحب اقتدار وہ شخص ہو جو امام معصوم علیہ السلام سے زیادہ مشابہ اور نزدیک ہو، اور ضروری شرائط کے علاوہ امام معصوم کے بعد تقویٰ اور عدالت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو ایسی شخصیت کو ولی فقیہ کہا جاتا ہے؛ معاشرہ کی وحدت، قدرتوں کو ہم آہنگ کرنے والی اور عہدہ داران کی کارکردگی پر ناظر اور نگراں ہوتی ہے، نیز حکومت کے لئے اہم راہنمائیاں، رہبری اور اہم سیاست گذاری اسی ذات کے ذریعہ ہوتی ہے۔

قدرت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے "مونٹسکیو" نے قدرتوں کی جدائی کا نظریہ پیش کیا جس کو تقریباً سبھی لوگوں نے قبول کیا اور وہ ایک حد تک مفید بھی ہے؛ لیکن اس نظریہ سے اصل مشکل کا حل نہیں ہوتا کیونکہ اگر حکومت کے عہدہ داران (تینوں طاقتوں میں) اخلاقی صلاحیت اور تقویٰ الٰہی سے مزین نہ ہوں اور قدرت تقسیم ہوجائے اور تین حصوں میں بٹ جائے، تو اس صورت میں معاشرہ کی برائیاں اور خود حکومت بھی تین حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے اس صورت میں اگر ہم قوہ مجریہ کی برائیاں کم ہوتی دکھائی دیتی ہیں تو اس کی وجہ اس دائرہ کا محدود ہوجانا ہے اور صرف قدرت کا ایک حصہ اس کے پاس ہے

لہٰذا ہمیں اس چیز پر خوش نہیں ہونا چاہئے کہ قوہ مجریہ (حکومت) کے جرائم اور فساد کم ہو گئے ہیں کیونکہ بعض مفاسد عدلیہ کی طرف منتقل ہو گئے ہیں اور بعض پارلیمنٹ کی طرف جو غالبا قوہ مجریہ کے تحت تاثیر ہوتی ہے، اور ان سے خلاف ورزیاں اور مفاسد سرزد ہوتے ہیں۔

لہٰذا ان طاقتوں کے مفاسد اور ایک دوسرے میں دخالت کرنے سے روک تھام کا بہترین طریقہ عہدہ داروں کے لئے تقویٰ الٰہی اور اخلاقی صلاحیت کی سفارش کرنا ہے اور ہر عہدہ دار اپنے عہدہ کے لحاظ سے تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت کا مالک ہو، اگر عہدہ عظیم اور بڑا ہے تو اس کا تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت بھی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہو، اور اسی قانون کے تحت جو شخص اس اسلامی قدرت کی صدارت کر رہا ہو وہ سب عہدہ داروں میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو، نیز مدیریت اور قوانین کی معلومات بھی بہترین ہوں اسی وجہ سے اسلامی نظام میں قدرتوں کے درمیان اختلافات کو روکنے، مفاسد کو دور کرنے اور ٹکراؤ وغیرہ سے روک تھام، نیز معاشرہ کے اتحاد و وحدت کو برقرار رکھنے والے رہبر کے لئے دوسرے حکومتی عہدہ داروں سے زیادہ تقویٰ اور عدالت کی شرط رکھی گئی ہے تاکہ عوام الناس اس کی عدالت اور تقویٰ پر اطمینان رکھتے ہوئے اس کی اطاعت کریں اور اس کو اپنی مشکلات حل کرنے والا سمجھیں اس صورت میں اگر تینوں قدرتوں میں کچھ خامیاں اور مشکلات پیدا ہو جائیں تو اس عظیم الشان رہبری کے زیر سایہ برطرف ہو جائیں، اور معاشرہ کی مشکلات بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائیں جیسا کہ اس بیس سال کے زمانہ میں ہم مقام رہبری کا مشکل کشاء اور، سعادت بخش کردار دیکھتے آئے ہیں۔

بتّیسویں نشست

اسلامی نظام کے اعتقادی عظمت بیان ہونے کی ضرورت

1۔ اسلامی حکومت کی تھیسز "The'sis" کی پہچان کے مختلف طریقے

ہم نے گذشتہ نشستوں میں اسلامی حکومتی نظام کے مختلف ڈھانچوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ حکومتی نظام ایک چند پہلو طاقت کی طرح ہے جس کی صدارت اس شخص کے پاس ہو جو بالواسطہ یا بغیر واسطہ خداوند عالم کی طرف منصوب ہو اور یہ نقشہ سیاسی فلسفہ میں ایک تھیوری "Theory" کے نام سے بیان ہوتا ہے، لیکن اس کو ثابت کرنا کہ واقعاً یہ نقشہ اسلامی بہترین نظریہ ہے جس کو حکومت اور اسلامی معاشرہ کی عظیم مدیریت کے لئے پیش کیا جانا واقعاً مزید علمی اور دقیق مطالعہ کی ضرورت ہے؛ اسی وجہ سے اس سلسلہ میں بہت سے ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات کے لئے ماہرین اور فقہاء کرام کو بہترین علمی اور دقیق تحقیقات کے بعد جوابات پیش کرتے ہیں، البتہ ان سوالات کے جوابات کو تین مرحلوں میں جواب دیئے جاسکتے ہیں:

الف۔ مختصر شناخت:

کبھی کبھی انسان اپنے وظیفہ اور ذمہ داری کی پہچان کے لئے ماہرین کی طرف رجوع کرتا ہے، تاکہ وہ اپنے علمی قواعد کے تحت اس کا وظیفہ معین کریں، مثلاً عوام الناس کا مراجع تقلید کی طرف رجوع کرنا، اور ان سے استفتاء کرنا اور شرعی امور میں اپنے وظیفہ کو معین کرنے کی درخواست کرنا، اسی طرح ہر صنف کے ماہرین کی طرف رجوع کرنا؛ جیسے کسی مریض کا ماہر ڈاکٹر کے پاس جانا اور اس سے علاج کرنے کی درخواست کرنا، اسی طرح کسی بلڈنگ یا مکان کا نقشہ بنوانے کے لئے کسی بلڈر کی طرف رجوع کرنا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کو مختصر سا جواب دیا جاتا ہے اور اس میں علمی اصول کی تفصیل بیان نہیں کی جاتی، بلکہ درحقیقت اس علم کا ماحصل اور خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کے سلسلہ میں مختصر اور اجمالی شناخت ہمارے معاشرہ کے لئے واضح ہے اور جس وقت سے ہمارے ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے تو کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہوگا جس کو اسلامی حکومت کی حقیقت کے بارے میں معلومات نہ ہوگی شاید اسلامی انقلاب سے پہلے بہت کم ہی ایسے افراد ہوں گے جو اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کے بارے میں آگاہ نہ ہوں، اور ان کے لئے مختصر طور پر اس تھیوری کی معلومات فراہم کی جائے لیکن (الحمد للہ) آج کل کسی شخص کو اسلامی حکومت کے بارے میں مختصر اور اجمالی شناخت کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں ہے (بلکہ اس سلسلہ میں

عام شناخت اور معلومات رکھتے ہیں) البتہ ایسا بھی نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے بارے میں تفصیل اور مکمل وضاحت کی ضرورت نہ ہو، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ولایت فقیہ اور اسلامی حکومت کی اصل تھیوری عوام الناس کے لئے حل شدہ اور روشن ہے، یہاں تک کہ ہمارے مخالفین اور دشمن بھی اس سلسلہ میں معلومات رکھتے ہیں، جبکہ وہ اپنی تمام تر طاقت انقلاب اور اسلام کی مخالفت میں خرچ کرتے رہتے ہیں لیکن ادھر چونکہ ہماری عوام نے اپنے نظام کی حقانیت کو درک کرلیا ہے تو یہ بھی اپنے تمام وجود سے اس اسلامی انقلاب اور ولایت فقیہ کا دفاع کرتے ہیں اور اس انقلاب اور اسلامی نظام کی حفاظت کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں چنانچہ ہمارے افراد انقلاب اور نظام اسلامی کے دشمنوں کے مقابلہ میں "مرگ برضد ولایت فقیہ" (ولایت فقیہ کے دشمن مرجائیں) کے نعرہ کو ولایت فقیہ دشمنوں سے مخالفت کا ایک اعلان سمجھتے ہیں، اور ہمیشہ اس نعرہ کی حفاظت کرتے ہیں اور اسی پر قائم رہیں یہاں تک کہ سیاسی اور مذہبی محفلوں اور مساجد میں بھی اس کو دعا کے عنوان سے ہمیشہ پڑھتے رہتے ہیں۔

قارئین کرام! اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کے سلسلہ میں مختصر جواب کے علاوہ دوسرے دو جواب بھی موجود ہیں: ایک صاحب نظر اور ماہرین افراد کے لئے اجتھادی اور اکیڈمیک جواب، اور دوسرا اسٹوڈینٹس وغیرہ کے لئے متوسط قسم کا جواب ہے۔

ب۔ مخصوص اور علمی شناخت:

تفصیلی، علمی اور مخصوص نیز اکیڈمیک جواب ان افراد کے لئے ہوتا ہے جو بلند ترین علمی درجات پر فائز ہوتے ہیں اور اپنی تمام تر استعداد اور امکانات کو اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کے موضوع سے مخصوص کرتے ہیں جیسے وہ طالب علم جو "اسلامی حکومت" یا اس کے کسی ایک حصے میں ڈاکٹری کرنا چاہتا ہے اور اپنا پایان نامہ (علمی رسالہ) لکھنا چاہتا ہے جس کے بعد اس کو "D-H-P" کی سند ملتی ہے تو وہ اس موضوع پر تحقیقی نظر ڈالتا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے اور چند سال تک اس کی تحقیق و بررسی کرتا ہے، اور علمی و دقیق منابع و مآخذ کا مطالعہ کرتا ہے نیز اس فن کے ماہر اور زبدہ اساتید سے صلاح و مشورہ کرنے کے لئے اپنے استدلال و برہان بیان کرتا ہے تا کہ اس کی پی ایچ ڈی قبول ہوجائے۔

اسی طرح علمی اور دقیق کاوشیں حوزات علمیہ میں بھی انجام پاتی ہیں اور جو لوگ درس خارج میں مشغول اور قریب الاجتہاد ہوتے ہیں اور اپنے مورد نظر مسائل میں استنباط کرنا چاہتے ہیں تو کبھی کبھی ایک ظاہراً معمولی اور چھوٹے سے مسئلہ کی سالوں تحقیق اور مطالعہ کرتے ہیں، اور دسیوں کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور فقہاء و مجتہدین سے بحث و گفتگو کرتے ہیں تا کہ آخر میں اپنا مخصوص نظریہ پیش کرسکیں اس سلسلہ میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام نظری مسائل منجملہ عقائد، اخلاق، احکام فرعی، اجتماعی، سیاسی، حقوقی، اور بین الملل مسائل میں اس طرح کی دقیق اور علمی بحث کی ضرورت ہے تا کہ اس سلسلہ میں ماہرین علماء کے ذریعہ اسلامی فرہنگ و ثقافت کا وقار اپنی جگہ باقی ہے؛ لیکن یہ بات مخفی نہ رہے کہ اس طرح کے جوابات نہ تو عوام

الناس کے لئے ضروری ہیں اور نہ ہی مفید ہیں۔

ج۔ متوسط شناخت:

آخر میں "اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ" جیسے مسائل کے جواب کے لئے متوسط اور درمیانی قسم کی تحقیق و بررسی ہمارے سامنے ہے، جن کو عام نشستوں میں بیان کیا جاسکتا ہے، جبکہ ہمارا مقصد بھی ان جلسات میں اسی قسم کے جوابات پیش کرنا مقصود ہیں، ہم نہ تو اسلامی حکومت کے سلسلے میں مختصر جواب پیش کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ ایک مجتہد اور مفتی استفتاء کے جواب میں اپنے رسالہ علیہ میں لکھتا ہے اور نہ ہی اس کو مفصل اور تحقیقی طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں جن کا چند سال طولانی سلسلہ ہوسکتا ہے بلکہ ہمارا مقصد تو معاشرہ کے مختلف لوگوں کے لئے درمیانی (متوسط) قسم کی معلومات فراہم کرنا ہے تاکہ اسلامی نظام کے مخالف اور دشمنوں کے شبہات اور اعتراضات کا مقابلہ کرسکیں اور ان کی مختلف سازشوں کو ناکارہ بناسکیں معاشرہ کی اس وقت کی ثقافتی حالت ایک ایسے معاشرہ کی طرح ہے جس کا کسی خطرناک بیماری سے مقابلہ ہو اور کبھی کو اس سے خطرہ درپیش ہو اور اس بیماری سے مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک دفعہ ٹوک دینا کافی نہیں ہے یا صرف اس سلسلہ میں کارشناسی نظریہ اخبار یا دوسرے ذرائع ابلاغ میں اعلان کردینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس بارے میں مسلسل تذکر اور ضروری ھدایات دینا ضروری ہے تاکہ عوام الناس کی معلومات میں اضافہ ہو اور اس اجتماعی بیماری سے مقابلہ کرسکیں ایک مختصر تذکر اور یاددہانی کے علاوہ سمینار، کانفرنس اور تقریریں ہوں تاکہ اس سلسلہ میں عوام الناس کے لئے مسائل واضح اور روشن ہوجائیں اور اس سلسلہ میں موجودات خطروں کا پتہ لگالیں۔

اس وقت ہم "اسلامی حکومت" اور "ولایت فقیہ" کے سلسلہ میں متوسط قسم کی شناخت پیش کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہم یہ احساس کرتے ہیں کہ ہمارے آج کل کے نوجوان اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ اسلامی نظام کے رکن ؛ سے زیادہ معلومات نہیں رکھتے، اور بعض شیطان صفت لوگوں نے ان کو گمراہ کرنے کی ٹھان رکھی ہے لہٰذا چونکہ یہی ہمارے جوان جو ہماری امیدیں اور اس انقلاب کے وارث بھی ہیں ان کو اس سلسلہ میں معلومات حاصل کرنا چاہئے تاکہ ثقافتی آفتوں اور شیطانی مشکلات کا شکار نہ ہوں، لہٰذا ہم اپنی بحث کو متوسط قسم کے لحاظ سے بیان کرتے ہیں، تاکہ نظریہ ولایت فقیہ کے سلسلہ میں اجتماعی اور ثقافتی بصیرت و یقین میں اضافہ ہو، اور بعض التقاطی (چنیدہ) نظریات اور انحرافات وغیرہ سے مقابلہ کرسکیں اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ عوام الناس کو ولایت فقیہ کے نظریہ سے آگاہ کرنے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے علمی اور دقیق راستہ نہیں اپنانا چاہئے، جیسا کہ فقہاء و مجتہدین کسی ایک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آیات و روایات سے استدلال کے وقت سند و دلالت کے بارے میں بہت زیادہ تفصیل سے بحث کرتے ہیں کیونکہ یہ طریقہ کار تو حوزہ علمیہ میں مجتہدین یا سیاسی علوم میں ڈاکٹری وغیرہ سے متعلق ہوتا ہے۔

قارئین کرام! مذکورہ مطالب کے پیش نظر اس وقت ہم نظریہ "ولایت فقیہ" کو آسان الفاظ میں اپنے جوانوں کے

ذھنوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تا کہ اگر کوئی شخص ان سے اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کے بارے میں سوال کرے تو وہ جواب دے سکیں اور اپنے اعتقاد کا دفاع کر سکیں لیکن اگر ان کے سامنے دقیق تر سوالات بیان کئے جائیں جن میں تخصصی اور کارشناسی (معاملہ فہم) بررسی وتحقیق کی ضرورت ہو تو ان کو ماہرین کی طرف رجوع کرنا چاہئے لہٰذا ہم نے اسی مذکورہ ہدف کی خاطر اپنی بحث کے دو حصے کئے: 1۔ قانون گذاری۔ 2۔ اجرائے قانون (قوانین کا نافذ کرنا)۔

2۔ قانون کی ضرورت اور اس کے خصوصیات پر ایک نظر

گذشتہ پہلے حصے کا خلاصہ:

1۔ انسان اپنی اجتماعی زندگی کے لئے قانون کا محتاج ہے، کیونکہ بغیر قانون کے زندگی میں افراتفری، حیوانیت اور انسانی اقدار نیست و نابود ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ بات کسی بھی صاحب عقل پر پوشیدہ نہیں ہے۔

2۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی اجتماعی زندگی کے لئے ایسا قانون ضروری ہے جس سے مادی اور دنیاوی مصالح بھی پورے ہوتے ہوں اور معنوی اور اُخروی مصالح بھی پورے ہوتے ہوں۔

یہاں پر اس بات کی یاد دہانی کرا دینا ضروری ہے کہ اگر چہ کبھی کبھی بعض اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے نئے نئے شبہات اور اعتراضات ہوتے ہیں جن کے جوابات دینا ضروری ہیں اگر چہ مختصر ہی کیوں نہ ہوں، آج کل بعض مقالوں، تقریروں یہاں تک کے بعض ٹیلی ویزن پروگراموں میں یہ مسئلہ بیان ہوتا ہے کہ دنیاوی مسائل؛ اخروی مسائل سے جدا ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کوئی بھی قانون ایسا نہیں ہے جس سے دنیاوی اور اُخروی دونوں مصالح پورے ہوتے ہوں کسی بھی حکومت کو یا تو صرف دنیا پرست ہونا چاہئے اور دنیاوی اور مادی مسائل کو حل کرے یا آخرت پرست؛ جس میں دنیا سے کوئی مطلب نہ ہو۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا اعتراض "اسلامی سیاسی نظام" کے سلسلہ میں ہونے والے اعتراضات میں سب سے گھٹیا (پست) قسم کا اعتراض ہے، اور واقعاً افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض عہدہ دار افراد بھی اس سلسلہ میں بڑی آب وتاب اور شان وشوکت سے اس طرح کا اعتراض کرتے ہیں جن کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔

بے شک اسلامی نظریہ کی بنیاد اس بات پر قائم ہے کہ یہ دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے، اور جو کچھ بھی ہم اس دنیا میں اعمال انجام دیتے ہیں انہیں کی وجہ سے ہم آخرت میں سعادت مند یا شقاوت مند ہوں گے در حقیقت دین کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی اس طرح گذاری جائے تا کہ اس دنیاوی سہولتوں کے ساتھ ساتھ آخرت کی سعادت بھی حاصل ہو جائے، یعنی خداوند عالم کی طرف سے بھیجے ہوئے انبیاء کرام علیہم السلام نے بشریت کے لئے ایسا نظام پیش کیا ہے جس سے انسان کی دنیاوی زندگی کے ساتھ آخرت کی زندگی بھی کامیاب اور سعادتمند قرار پائے اور چونکہ یہ مسئلہ بالکل واضح اور روشن ہے واقعاً تعجب کا مقام ہے کہ بعض وہ لوگ جو قرآن کریم اور سنت نبوی سے کم وبیش آگاہی رکھتے ہیں اور

ان کو جاہل نہیں کہا جاسکتا وہ لوگ خود غرضی کی وجہ سے اپنی آنکھوں سے حقیقت کا نظارہ نہیں کرتے اور اپنی باتوں میں دنیاوی مسائل کو آخرت سے بالکل الگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں: آخرت سے مربوط مسائل عبادت گاھوں، گرجا گھروں اور مساجد میں ہونا چاہئے، اس کے مقابل دنیاوی اور اجتماعی مسائل انسانی تجربہ اور غور وخوض سے حل ہو سکتے ہیں، اور دین اس سلسلہ میں کوئی کردار نہیں کرسکتا!!

یہ ایک ایسا شیطانی اعتراض ہے جو ہر صاحب عقل مسلمان پر واضح ہے کہ یہ تمام ادیان بالخصوص اسلامی نظریہ کے مخالف ہیں۔

3۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اگر یہ مان بھی لیں کہ انسان نے ہمیشہ اپنے تجربات، علم اور غور وفکر سے کام لیتے ہوئے اپنے مادی اور دنیاوی ضرورتوں کو حاصل کرلے، (البتہ دنیاوی مصالح بھی اُخری مصالح پورے ہونے کی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں کیونکہ انسان احکام الٰہی سے فائدہ حاصل کئے بغیر دنیاوی مصالح کو بھی پورا نہیں کرسکتا) (تو پھر وہ) معنوی اور اُخروی مصالح کو پورا نہیں کرسکتا کیونکہ انسان خود بخود اُخروی مصالح کے بارے میں نہیں جانتا کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ کونسا عمل اس کی اُخروی زندگی کی سعادت کے لئے مفید ہے؛ کیونکہ اس نے اُخروی زندگی کو دیکھا (بھی) نہیں ہے بالفرض اگر انسان دوسروں کی دنیاوی زندگی سے تجربہ حاصل کرلے اور اسی تجربہ کی بنا پر اپنے لئے زندگی کا راستہ معین کرلے، لیکن اُخروی زندگی کے سلسلہ میں نہ خود کو کوئی تجربہ ہے اور نہ ہی دوسروں کے تجربات اس کے سامنے ہیں، لہٰذا اپنے لئے آخرت کی سعادت اور کامیابی کا راستہ معین نہیں کرسکتا۔!!

قارئین کرام! ہماری مذکورہ باتوں سے یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ دنیاوی اور اُخروی مصالح صرف انہیں افراد کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں جن کو خداوند عالم نے اپنی علوم سے نوازا ہے؛ اور معاشرہ پر ایسے قوانین حاکم ہوں جو خداوند عالم کی طرف سے آئے ہوں تاکہ اس کے زیر سایہ دنیاوی مصالح بھی اور اُخروی مصالح بھی پورے ہوسکیں۔

3۔ قوانین جاری کرنے والے کے صفات پر دوبارہ ایک نظر

ہم نے قوانین کو جاری کرنے والے کے لئے تین مہم شرائط کا ذکر کیا، اور جو شخص قوانین کو جاری کرنے والا ہو نیز دنیاوی اور اُخروی مصالح کو پورا کرنے والا ہو اور خدا کی طرف اس کی نسبت ہو؟ اس کے لئے مذکورہ شرائط کا مالک ہونا ضروری ہے۔

مذکورہ شرائط:

پہلی شرط یہ تھی کہ قانون جاری کرنے والے اور اسلامی حاکم کو قانون شناس ہونا چاہئے البتہ علم ومعرفت کے مختلف درجات ہوتے ہیں اسی وجہ سے تمام افراد ایک درجہ میں نہیں ہوتے معرفت اور شناخت کے ان درجات میں نمونہ درجہ وہ ہے جس میں الٰہی قوانین سے بالکل خطا نہ ہو، اور ایسی شان صرف معصوم علیہ السلام کی ہوتی ہے جو معرفت اور ادراک میں کبھی کوئی خطا

و غلطی نہیں کرتا، اور جو قانون خداوند عالم نے نازل کیا ہے اس کو کما حقہ پہچانتا ہے ظاہری بات ہے کہ اگر ایسی شخصیت یعنی معصوم علیہ السلام موجود ہو تو پھر معاشرہ کے لئے اس کی حکومت ضروری اور ترجیح رکھتی ہے لیکن اگر معصوم علیہ السلام غائب ہوں تو اس صورت میں یہ منصب ایسے شخص کا ہے جو دوسروں لوگوں سے زیادہ قوانین کی معرفت اور شناخت رکھتا ہو۔

دوسری شرط یہ تھی کہ قانون کا جاری کرنے والا شخص عملی میدان میں اپنے ذاتی مفاد یا کسی گروہ کے حق میں کام نہ کرے؛ یعنی اخلاقی صلاحیت رکھتا ہو اور یہ اخلاقی صلاحیت بھی علم کی طرح مختلف درجات رکھتی ہے جس کا نمونہ درجہ معصوم علیہ السلام کی شخصیت میں تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ معصوم علیہ السلام کی ذات کسی بھی وقت غیر الٰہی انگیزوں کے تحت تاثیر قرار نہیں پاتی اور نا ہی کسی کا خوف اور نا ہی کوئی لالچ ہوتا ہے، نیز اجتماعی منافع و مصالح کو اپنی ذاتی یا گھریلو یا گروہی مصالح پر قربان نہیں کرتا لیکن اگر معصوم علیہ السلام کی ذات موجود نہ ہو تو پھر ایسا شخص جو اس سلسلہ میں معصومؑ سے بہت زیادہ شباہت رکھتا ہو، وہی قوانین الٰہی کو جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تیسری شرط یہ تھی کہ قوانین کو جاری کرنے والا مدیریت اور کلی قوانین کو جزئی قوانین پر منطبق کرنے میں کافی مہارت رکھتا ہو، یعنی خداوند عالم کے عام قوانین سے آگاہی کے ساتھ ان کے مصادیق کو بھی جانتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ کس طرح ان قوانین کو جاری کیا جانا چاہئے تاکہ قوانین کا اصل ہدف محفوظ رہے البتہ قوانین کو جاری کرنے میں اس قدر مہارت اور مدیریت کے لئے خاص تجربات کا ہونا ضروری ہے جن کو انسان اپنی زندگی میں حاصل کرتا ہے، جس کا بہترین اور عالی ترین مرتبہ امام معصومؑ میں تصور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ معصوم علیہ السلام کی ذات جس طرح خداوند عالم کے قوانین کی شناخت میں غلطی نہیں کر سکتا اور مقام عمل میں بھی ہوائی نفس کے تحت تاثیر واقع نہیں ہو سکتا اور خداوند عالم کی خاص تائید اس کے شامل حال ہوتی ہے، اور معاشرہ کے مصالح کو معین کرنے، عام موارد کو خاص موارد میں منطبق کرنے میں (بھی) انحراف اور غلطی کا شکار نہیں ہوتا۔

4۔ اعتقادی اصول سے اسلامی حکومت کی تھیوری کا تعلق

بے شک اگر کوئی شخص مذکورہ مقدمات کو قبول کرے کہ واقعاً انسانی معاشرہ کے لئے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جن سے مادی اور دنیاوی مصالح پورے ہوتے ہوں اور معنوی اور اُخروی مصالح بھی، اور اسلامی حاکم اور اسلامی معاشرہ کے ذمہ دار افراد کے شرائط کو بھی قبول کرتا ہو تو پھر اس صورت میں اسلامی نظام کی حقانیت کو قبول کرنا آسان ہے البتہ خود مذکورہ مقدمات کو قبول کرنا بھی دوسری چیزوں پر موقوف ہے: کیونکہ پہلے درجہ میں انسان کو یہ ماننا پڑے گا کہ خدا ہے، اس کے بعد یہ قبول کرے کہ اس نے ایسے پیغمبر کو بھیجا جس نے اس کے احکام بندوں تک پہنچائے اسی طرح یہ بھی قبول کرے کہ اس دنیاوی زندگی کے بعد ایک اُخروی زندگی بھی ہے اور اس دنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی میں علت و معلول والا تعلق ہے یہ تمام مقدمات ہماری بحث کے مبنیٰ ہیں، جن کو اعتقادی، کلامی اور فلسفی مباحث میں تفصیلی طور پر ثابت کیا گیا ہے، اور عام اجتماعی،

حقوقی اور سیاسی جلسات میں ہر ایک پر الگ الگ بحث نہیں کی جاسکتی ورنہ تو نتیجہ تک پہنچنے کے لئے سالوں درکار ہوں گے۔

ہمارے مخاطب مسلمان اور وہ حضرات ہیں جو خدا، دین، وحی، نبوت، پیغمبر، عصمت اور قیامت کو قبول رکھتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اسلام حکومتی نظام پیش کرتا ہے یا نہیں؟ نہ وہ لوگ جو منکر خدا ہیں، اور نہ ہی وہ لوگ جو خود خدا کے خلاف جلوس نکالنے اور اس کے خلاف نعرے لگانے کے لئے تیار ہوں!! اور نہ ہی وہ لوگ جو دین اور احکام اسلام کو بالکل ہی نہیں مانتے، اور نہ وہ لوگ جو پیغمبر کے لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی دوسروں کی طرح وحی کو سمجھنے میں غلطی کرسکتا ہے اسی طرح جو افراد اصول میں ہمارے مخالف ہیں وہ اس وقت کی بحث میں ہمارے مخاطب نہیں ہیں اگر وہ لوگ بحث و گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو ان سے کسی دوسرے موقع پر بحث کی جاسکتی ہے اور ان کے سامنے اعتقادی اصول کو عقلی اور فلسفی برہان کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے اور ان کی ہدایت کی جاسکتی ہے اور ان کو یہ سمجھایا جاسکتا ہے کہ ہاں خدا بھی ہے اور قیامت بھی آئے گی، نیز خداوند عالم نے ہدایت بشر کے لئے انبیاء کرام کو بھیجا تاکہ وہ ان کو اس کے بندوں تک پہنچائے اسی طرح پیغمبر معصوم ہوتا ہے اور وحی کے سمجھنے میں کسی طرح کی کوئی غلطی واشتباہ نہیں کرتا اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ پیغمبر نہیں ہوسکتا۔

قارئین کرام! مذکورہ مقدمات کو قبول کرتے ہوئے کیا کوئی صاحب عقل اس بات کو قبول کرسکتا ہے کہ معصوم علیہ السلام کے ہوتے ہوئے؛ جو علم و رفتار میں معصوم ہو اور دوسروں کی نسبت معاشرہ کے مصالح کو بہتر درک کرتا ہو؛ کوئی دوسرا مسند قدرت پر بیٹھ جائے؟! کیونکہ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ اختیاری صورت میں مرجوح کو راجح پر اور بہتر کو غیر بہتر پر ترجیح دینا قبیح اور ناپسند ہے اور کوئی بھی صاحب عقل و شعور اس کو قبول نہیں کرتا ہماری گفتگو ان لوگوں سے ہے جو خود کو مسلمان کہلاتے ہیں، لیکن معصوم کے وجود کا اقرار نہیں کرتے، اور معتقد ہیں کہ نہ تو پیغمبر معصوم تھے اور نہ ہی ائمہ علیہم السلام معصوم تھے؛ ان لوگوں سے بھی ہمارا کوئی سروکار نہیں ہے ہمارا مفروضہ یہ ہے کہ تمام موضوعہ اصول کو قبول رکھتے ہوں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معصوم مانتے ہوں، اور شیعہ اعتقاد کے مطابق ائمہ علیہم السلام کو بھی معصوم مانتے ہوں۔

فرضیہ یا مفروضہ یہ ہے کہ اگر معاشرہ میں معصوم علیہ السلام موجود ہوں تو کیا اس صورت میں حکومت کسی غیر معصوم کے سپرد کی جاسکتی ہے؟ کیونکہ غیر معصوم کو حکومت سپرد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قانون کے سمجھنے میں غلطی اور اشتباہ کو جائز مانتے ہیں، اور اس چیز کو بھی جائز مانتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے ذاتی مفاد کو معاشرہ کے مفاد و مصالح کو جائز مانیں اور معاشرہ کے منافع و مصالح کو اپنی خواہشات پر قربان کردے، نیز اس بات کو بھی جائز ماننا ہے کہ کوئی معاشرہ پر حکومت کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوئے بھی معاشرہ کی حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لے!! جبکہ یہ تمام چیزیں عقلی لحاظ سے مردود اور قابل قبول نہیں ہیں اس بنا پر کوئی بھی صاحب عقل اس چیز میں شک نہیں کرتا کہ اگر امام معصومؑ معاشرہ میں حاضر ہو تو اسی کو حکومت سپرد کرنا اولی اور بہتر ہے، اور اگر اس کے بجائے کسی دوسرے کو حکومت کے لئے انتخاب کیا جائے تو یہ کام غیر عقلی اور بے ہودہ ہے اس صورت میں کسی کو شک نہیں ہے اور اسی بات پر تمام لوگوں کی عقل حکم کرتی ہے، نیز اس کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں احادیث سے

استدلال کرنے اور ان آیات کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے جن میں پیغمبر اکرم ﷺ اور ائمہ علیہم السلام کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا ہے، مثال کے طور پر:

(یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ [1]

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں۔"

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. [2]

"جو رسول کی اطاعت کرے گا اس نے اللہ کی اطاعت کی"

5۔ حکومت کے طولی (تحت) مراتب کی منطقی اور عقلی دلیل

قارئین کرام! اگر امام معصوم معاشرہ میں حاضر ہوں تو اسی کی حکومت اولویت رکھتی ہے اس سلسلہ میں ذکر شدہ مطالب ایک استدلال اور عقلی متوسط بیان ہے جو سبھی کے لئے قابل قبول اور قابل دفاع ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی حکومت (وولایت) کے سلسلہ میں قرآنی آیات سے بھی آگاہ نہ ہو، چنانچہ ہمارے ذکر شدہ مطالب کے پیش نظر اپنے اعتقاد کا دفاع کرسکتا ہے لیکن ہماری اصل بحث امام معصوم علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں اسلام کا نظریہ پہنچاننے کے بارے میں ہے کہ جب عوام الناس امام معصوم کے وجود سے محروم ہو، اور اس تک رسائی ممکن نہ ہو تا کہ اس کی حکومت سے بہرہ مند ہوسکیں اسی طرح امام معصوم علیہ السلام کے حضور کا وہ زمانہ، جس میں ظالم حکومت معصوم کی حکومت سے مسلمانوں کو محروم کردے، یا اجتماعی حالات ایسے نہ ہوں جس میں معصوم علیہ السلام قدرت کو اپنے ہاتھوں میں لے سکے۔

ان دونوں صورتوں میں ہم کسی علمی، فنی اور اکیڈمیک دلائل سے استدلال نہیں کرتے جس کا سمجھنا عام لوگوں کے لئے مشکل ہو، بلکہ ہم تو ایک عام عقلی قاعدہ سے استدلال کرتے ہیں جس طرح ہر عام انسان اپنی روزمرہ زندگی میں اسی عقلی قاعدہ سے استدلال کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی سلسلہ میں سو فی صد والا درجہ میسر نہ ہو تو پھر 99 فی صد والے درجہ کو انتخاب کرتا ہے اگر کسی چیز کا کامل درجہ حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو پھر کامل سے نزدیک والے درجہ کا انتخاب کرتا ہے چنانچہ اس قاعدہ سے مختلف مقامات پر استفادہ کیا جاسکتا ہے، مثلاً: کسی بھی عہدہ کے لئے کچھ خاص شرائط اور صفات رکھے جاتے ہیں، اور اگر کسی میں وہ تمام شرائط پائے جاتے ہیں تو اسی شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے، لیکن اگر ان تمام صفات کا حامل شخص نہ مل پائے تو پھر ایسے شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اس سے کم شرائط رکھتا ہو، لیکن دوسروں پر برتری اور فضیلت رکھتا ہو۔

دوسری مثال: اگر آپ کسی ایسے ڈاکٹر سے علاج کراسکتے ہیں جو تیس سال کا تجربہ رکھتا ہو اور وہ اپنی ڈاکٹری میں خاص مہارت اور روشن فکری رکھتا ہے، لیکن آپ اس کو چھوڑ کر کسی ایسے ڈاکٹر سے علاج کرائیں جس نے ابھی ڈاکٹری کی سند لی ہے اور

---

[1] سورہ نساء آیت ۵۹

[2] سورہ نساء آیت ۸۰

ابھی کلینک کھولی ہے اگر آپ اس سے علاج کرائیں اور وہ غلط علاج کرے تو آپ کی بیماری کا نہ صرف علاج ہوگا بلکہ اس میں شدت آجائے گی، تو کیا آپ عقل اور عقلاء کی نظر میں محکوم نہیں ہیں؟ اور کیا عقلاء آپ کی ملامت نہیں کریں گے کہ ایک ماہر (اسپیشلسٹ) ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے وہ بھی آپ کے مکان کے قریب، پھر آپ نے غیر ماہر ڈاکٹر کی طرف کیوں رجوع کیا؟!

اور آپ کا عذر صرف اسی صورت میں قابل قبول ہوسکتا ہے جب اس ماہر ڈاکٹر کی فیس بہت زیادہ ہو یا ماہر ڈاکٹر سے علاج کرانے کے لئے کسی دوسرے ملک میں جانے پڑتا ہو جس کا خرچ برداشت کرنا آپ کے بس کی بات نہ ہو، اسی وجہ سے آپ نے کسی غیر ماہر ڈاکٹر کا علاج کرایا ہے۔

لیکن ہمارا فرض اس صورت میں ہے جب آپ کسی ماہر ڈاکٹر سے علاج کرانے پر قادر ہوں اور اس کی فیس دوسرے غیر ماہر ڈاکٹر سے کم یا اس کے برابر ہے، تو اگر اس صورت میں اگر آپ نے کسی نئے ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا اور آپ کی بیماری میں شدت پیدا ہوگئی تو آپ عقل اور صاحبان عقل کی نظر میں معذور نہیں ہیں، اور سبھی اس سلسلہ میں آپ کی ملامت اور سرزنش کریں گے۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مذکورہ عقلی قاعدہ تمام اجتماعی امور میں جاری ہے، اور اس قاعدہ کو تمام ہی صاحبان عقل قبول کرتے ہیں چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اور اس کی نسبت حکم عقل کی طرف ہے، جس میں شرعی دلیل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ اسی مذکورہ قاعدہ کے تحت اگر اسلامی حکومت کی نمونہ شکل ممکن نہ ہو (جیسا کہ عقل بھی اسی کو بہترین حکومت مانتی ہے) اور معاشرہ میں علم وتقویٰ اور مدیریت کے لحاظ سے اعلیٰ ترین درجہ والا شخص نہ ملے جو صاحب عصمت بھی ہے تو اس صورت میں عقل کا حکم اور اس کا فیصلہ کیا ہوگا؟ کیا اس صورت میں ہماری عقل اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ ہم جو چاہیں کریں اور جس کو چاہے حاکم بنادیں؟ یا ہماری عقل اس چیز کا حکم کرتی ہے کہ اگر معاشرہ معصوم علیہ السلام کے وجود سے محروم ہو اور آئیڈیل شخص حکومت کے لئے ممکن نہ ہو تو ایسے شخص کا انتخاب کریں جو تقویٰ اور صلاحیت کے لحاظ سے معصوم علیہ السلام سے شبیہ اور زیادہ نزدیک ہو؟ اگر سوفی صد والا درجہ حاصل نہ ہوں تو پھر 99 والے درجہ کا انتخاب کریں اور اگر 99 والا درجہ نہ ہو تو پھر 98 والے درجہ کا انتخاب کریں، اسی طرح اگر اعلیٰ درجہ کا انتخاب ممکن نہ ہو تو پھر اس سے کم والے درجہ کا انتخاب کریں، اور پھر باری باری نیچے والے درجہ کا انتخاب کریں، ایسا نہیں ہے کہ اگر عالی ترین درجہ کا انتخاب ممکن نہ ہو تو پھر دوسرے تمام درجے مساوی اور برابر ہیں، اور 99 والا درجہ اور ایک والا درجہ سب برابر ہوجائیں، اسی بنا پر اگر ہمارے فرض کے مطابق نمونہ اور آئیڈیل مقصود حاصل نہ ہو تو پھر کوئی فرق نہیں چاہے کسی کا بھی انتخاب کریں!! بے شک اس کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔

لہٰذا عقل کے اس یقینی حکم کی بنا پر جو ہر انسان کی سمجھ میں آتا ہے اگر اسلامی حکومت کی نمونہ شکل ممکن نہ ہو اور معصوم علیہ السلام کی ذات تک رسائی نہ ہوتا کہ براہ راست عوام الناس پر حکومت کریں تو اس صورت میں اسلامی حکومت کے لئے

ایسا فرد جو صلاحیت رکھتا ہے جس میں تینوں بنیادی شرط (یعنی علم، تقویٰ اور مدیریت) دوسروں کی نسبت زیادہ اور معصوم علیہ السلام سے مشابہ ہو، یعنی وہ شخص جو دوسروں سے زیادہ قوانین کی معرفت اور شناخت رکھتا ہو اسی طرح اس کی عدالت اور تقویٰ دوسروں کی نسبت زیادہ ہو اور دوسروں سے زیادہ اپنی خواہشات پر کنٹرول رکھتا ہو نیز اس کی مدیریتی طاقت اور بصیرت دوسروں سے زیادہ ہو۔

قارئین کرام! یہ عقلی بیان ہر صاحب عقل کے لئے سمجھنا آسان ہے اور فقہ وکلام کے پیچیدہ دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

6۔ اسلامی حکومت کے سلسلہ میں چند سوالات

البتہ مسلمانوں پر حکومت کی صلاحیت رکھنے والے کے بارے میں سوالات کے علاوہ اسلامی حکومت کے سلسلہ میں دوسرے سوالات بھی بیان ہوتے ہیں جن کے جوابات (بھی) عرض کرنا ضروری ہیں مثلاً یہ سوال کہ کیا اسلام نے اسلامی حکومت کے عہدہ پر فائز ہونے والے کے لئے شرائط اور خصوصیات بھی بیان کئے ہیں اور حکومت کے لئے خاص شکل معین کی ہے یا نہیں؟ یعنی کیا صرف اسلام نے اسلامی حکومت کے صدر کے لئے بیان کیا ہے کہ کون صدر ہوسکتا ہے لیکن دوسرے حکومتی امور اور اس کا خاکہ عوام الناس کی مرضی پر چھوڑ دیا، یا اجتماعی حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کی شکل بھی بدل جائے گی؟۔ دوسرا سوال جو اس سے زیادہ علمی اور دقیق ہے اور جو لوگ فقہی اور حقوقی مسائل سے آشنائی رکھتے ہیں ان کے لئے قابل فہم ہے، اور وہ یہ ہے کہ آیا حکومت ایک "تاسیسی" مقولہ سے ہے یا "امضائی" مقولہ سے ہے؟

وضاحت: کیونکہ بعض اسلامی اور فقہی مسائل تاسیسی ہیں، جن کو شارع مقدس نے عوام الناس میں رائج ہونے سے پہلے بیان کیا ہے اور ان کی کیفیت اور طریقہ بھی بیان کیا ہے مثلاً نماز ایک تاسیسی عبادت ہے جس کا وجوب بھی خود شریعت نے بیان کیا ہے اور اس کا طریقہ بھی خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے بیان ہوا ہے، اور اس واجب اور اس کی کیفیت کو بیان کرنے سے پہلے عوام الناس اس سے آگاہ نہ تھی (نماز ہی نہیں بلکہ) عام طور پر تمام عبادتیں تاسیسی ہیں جن کو عوام الناس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھا ہے جیسے دوسرے واجبات: روزہ، حج اور دوسرے یا عبادتی احکام تاسیسی ہیں۔

ان تاسیسی احکام کے مقابلہ میں اسلام کے بعض دوسرے احکام امضائی ہیں یعنی عوام الناس اپنی اجتماعی امور میں کچھ معاملات، عقود اور معاھدات کو معین کئے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ اگر ان میں سے بعض تحریری شکل میں بھی نہ ہوں لیکن ان پر عمل ہوتا ہے، مثلاً عام طور پر خرید وفروخت، چنانچہ اس سلسلہ میں شریعت نے عوام الناس کو حکم نہیں دیا ہے کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس کو جا کر خرید لے اس مسئلہ کی ضرورت خود صاحبان عقل سمجھتے ہیں اور معاملات وغیرہ کے لئے طریقہ کار معین کرتے ہیں اس کے بعد شریعت مقدسہ ان معاملات کی تائید کر دیتی ہے اور اس کو شرعی حیثیت مل جاتی ہے، مثلاً: "وَاَحَلَّ اللّٰہُ

الْبَيْعَ..[1] (خدا نے خرید وفروخت کو حلال قرار دیا ہے) جو عوام الناس کے درمیان رائج ہے، اور خرید وفروخت کی یہ حلیت شرعی تائید کی وجہ سے ہے، اور گویا اس عقلاء کے طریقہ کار کو قبول کرنے کی طرح ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے خرید وفروخت انجام دیتے ہیں۔

اس مقام پر حکومت کے سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ خدا نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ الٰہی حکومت کی پیروی کرنے کا حکم دیا کیا عوام الناس کے درمیان خود کوئی حکومت کا طریقہ کار موجود تھا جس کی شریعت مقدسہ نے تائید کی اور اس پر دستخط فرمائے؟ یا نہ بلکہ حکومت کی شکل اور ڈھانچے کو بھی عوام الناس نے خداوند عالم کے حکم کے مطابق بنایا ہے؟ اور اگر انبیاء علیہم السلام خدا کی اجازت سے عوام الناس پر حکومت نہ کرتے تو وہ ان کی اطاعت کرنے کا وظیفہ نہ رکھتے، (یعنی) عوام الناس حکومت کی شکل وصورت سے آگاہ نہ تھے۔

المختصر جب ہم کہتے ہیں کہ اسلامی حکومتی نظام کو اسلام نے بیان کیا ہے اور اس کی دینی اور فقہی حیثیت ہے اور خود خداوند عالم نے اس کی اطاعت پر لوگوں کو موظف بنایا ہے، تو کیا یہ حکومت خداوند عالم کی طرف سے تشریع کی گئی ہے اور خدا اس حکومتی نظام کا مؤسس ہے؟ یا اس حکومت کی شکل وصورت خود عوام الناس کے ذریعہ بنائی گئی ہے اور اس کو اجتماعی معاهدات کی بنا پر بنایا گیا اور خداوند عالم نے اس کی تائید وامضا کر دیا ہے، اسی وجہ سے یہ حکومت اسلامی حکومت بن گئی ہے کہ جس کی خداوند عالم نے تائید کی ہے اور یہ حکومت امضائی حکم رکھتی ہے؟

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۷۵

تینتیسویں نشست

اسلام اور حکومت کے مختلف نقشے

1۔ اسلام کی طرف سے حکومتی سلسلہ میں کوئی طریقہ بیان نہیں کیا گیا (ایک اعتراض)

گذشتہ نشستوں میں حکومت کی شکل وصورت کے بارے میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ کیا اسلام نے حکومت کے لئے کوئی خاص نقشہ پیش کیا ہے، یا اس کا معین کرنا خود عوام الناس کے اوپر ہے؟ اور اگر اسلام نے حکومت کے لئے کوئی خاص نقشہ پیش کیا ہے تو کیا وہ کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہے یا نہ، بلکہ اس کا ایک خاص نقشہ ہے جو ہر زمانہ میں جاری نہیں ہوسکتا؛ اور انسانی معاشرہ کے حالات کی بنا پر اس کی شکل ونقشہ بدلرہتا ہے چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگرچہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اسلامی حکومت ایک خاص طرز پر ہوتی تھی، لیکن وہ طریقہ صرف اسی زمانہ سے مخصوص تھا، اور خداوند عالم نے اسی طریقہ کار کو صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے لئے معین فرمایا تھا اور اس کے بعد نئے نئے نقشے اس حکومت کے قائم مقام ہوسکتے ہیں یہاں تک کہ ممکن ہے کہ بعض اجتماعی حالات کی بنا پر اسلامی حکومت ڈیموکریسی لیبرل شکل اختیار کرلے، اور آپس میں کوئی تضاد یا ٹکراؤ نہ ہو جس طرح ہم نے مغربی ممالک کے بعض طریقوں کو انتخاب کیا ہے؛ مثلاً "پارلمانی نظام" کو قبول کرلیا ہے، اور اس کو اسلام کے مخالف نہیں پایا، اسی طرح "مشروطیت" [1] کو قبول کرلیا اور اس وقت "جمہوریت" کو قبول کرلیا ہے اور ہمارا ماننا ہے کہ یہ اسلام کے مخالف نہیں ہیں، ہوسکتا ہے ایک دن وہ بھی آئے جب ہم "ڈیموکریسی لیبرل" کو بھی قبول کرلیں اور اس کو بھی اسلام کے مخالف نہ پائیں!

آج کل ہمارے معاشرہ میں اس طرح کے سوالات اور جوابات پیش کئے جاتے ہیں اور اس سلسلہ میں بحث وغیرہ ہوتی رہتی ہیں، جبکہ ان بحثوں میں بعض اشکالات وابہامات لوگوں کے ذہن میں ڈالے جاتے ہیں جن کی بنا پر بعض لوگ دانستہ اور بعض لوگ نادانستہ طور پر اسلامی صحیح تفکر سے منحرف ہوجاتے ہیں۔

قارئین کرام! مذکورہ اعتراض کا جواب دینے سے پہلے بعض ان نکات کا بیان کرنا ضروری ہے جن کی وجہ سے مذکورہ اعتراض تشکیل پاتا ہے تاکہ ان کے روشن ہونے سے جواب کا راستہ صاف ہوجائے:

جیسا کہ ہم سبھی لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں انقلاب اسلامی کے عظیم الشان رہبر حضرت امام

---

[1] مشروطیت اس شاہی حکومت کو کہتے ہیں جس میں قوانین کے تحت کام کیا جائے

خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ اسلامی جمہوری نظام قائم ہوا، اور شروع انقلاب ہی میں اس کے اساسی اور بنیادی قوانین مرتب ہوئے جن کی خود امام خمینیؒ نے تائید کی ہے اسی طرح آپ ہی کی تائید کے مطابق حکومت کا نقشہ معین ہوا، اور زمانہ کے ساتھ ساتھ بعض چیزوں میں تبدیلی کرنا پڑی جن کو حضرت امام خمینیؒ نے قبول فرمایا جبکہ یہ بات واضح ہے کہ اسلامی حکومت کا یہ نقشہ نہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھا اور نہ ہی حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے زمانہ میں اس طرح کی حکومت تھی، اور ہماری یہ حکومت اسلامی حکومت کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔

قدرتوں میں جدائی نہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھی اور نہ ہی حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے زمانہ میں، لیکن ہمارے بنیادی قانون میں قدرتوں کے الگ ہونے کو قبول کیا گیا ہے، اور حکومتی نظام تین قدرتوں قوہ مقننہ (پارلیمنٹ)، قوہ قضائیہ (عدلیہ) اور قوہ مجریہ (حکومت) سے تشکیل پایا اس نظام میں سب سے بلند مقام جس کے ذریعہ ملکی عظیم سیاست معین کی جاتی ہے مقام معظم رہبری ہے، اس کے بعد صدر مملکت ملک کے دوسرے بڑے عہدہ پر فائز ہوتا ہے، اسی طرح رئیس قوہ قضائیہ اور رئیس مجلس شوریٰ اسلامی (اسپیکر) ملک کے عالی ترین عہدہ میں شمار ہوتا ہے یہاں تک کہ انقلاب اسلامی کے بیس سال کے بعد بھی بنیادی قوانین میں بعض تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مثال کے طور پر پہلے وزیر اعظم اجراء قوانین کا سب سے بڑا عہدہ ہوتا تھا، اور اسی کے ذریعہ کابینٹ کا انتخاب ہوتا تھا، اس کے بعد صدر مملکت اور مجلس شوریٰ اسلامی تائید کرتی تھی، لیکن غور وفکر کے بعد وزیر اعظم کا عہدہ حذف کر دیا گیا اور صدر مملکت ہی اجراء قوانین کا عہدہ دار ہوتا ہے۔

بے شک حکومت کا اس طرح کا نقشہ اسلام میں اس سے پہلے کبھی نہیں تھا نہ ہی اسلام نے اس سلسلہ میں کوئی حکم صادر فرمایا ہے، لہٰذا کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسلام نے صاف طور پر وضاحت کر دی ہے کہ عوام الناس ووٹ دے کر صدر مملکت کا انتخاب کریں اسی طرح دوسرے انتخاب میں حصہ لے کر اپنا کردار ادا کریں۔

قارئین کرام! ہمارے گذشتہ مطالب کے پیش نظر بعض لوگ اس کو دلیل مانتے ہیں کہ اسلام نے حکومت کے سلسلہ میں کوئی نقشہ پیش نہیں کیا ہے، لہٰذا اس بات کو ماننا پڑے گا کہ اسلام نے اس سلسلہ میں عوام الناس کو اختیار دیا ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے حکومت کا نقشہ بنائیں اور خود ہی قوانین کا انتخاب کریں؛ اسی طرح دوسرے حکومتی امور بھی خود عوام الناس سے متعلق ہیں۔

اسی بنا پر اس بات میں کہ حکومت کو خدا کی طرف سے معین ہونا چاہئے اور حکومت خود عوام الناس کے ذریعہ معین ہو؛ تضاد اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ حکومت خداوند عالم کی طرف سے معین کی جاتی ہے جبکہ جو چیز عملی طور پر دیکھی جاتی ہے ان دونوں میں تضاد اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے یہاں تک کہ خود "جمہوری اسلامی" کہنا بھی ایک قسم کا تضاد ہے، کیونکہ "جمہوریت" کے معنی حکومت کا عوام الناس کے ہاتھوں میں ہونا اور اس کا نقشہ وشکل عوام الناس کے ذریعہ معین ہونا ہیں، جبکہ اس جمہوری کے ساتھ "اسلامی" کا اضافہ کرنا اور کہنا کہ حکومت کی باگ ڈور ولی فقیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے خصوصاً جبکہ ہم

اس بات کو مانیں کہ ولایت فقیہ خداوند عالم اور امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے ذریعہ مشروعیت (جواز) پیدا کرتی ہے؛ اور اس حکومت کو حکومت الٰہی سمجھتے ہیں نہ عوامی اور مردمی، یعنی اس حکومت کی مشروعیت اوپر سے شروع ہوتی ہے، پہلے درجہ میں خدا مشروعیت عطا کرتا ہے اس کے بعد پیغمبر اور اس کے بعد امام معصومؑ، اور ولی فقیہ امام معصوم علیہ السلام کی طرف سے انتخاب ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کی مشروعیت ہوتی ہے اور جو ولی فقیہ کے تحت نظام ہوتا ہے وہ ولی فقیہ کی وجہ سے ہی مشروعیت پیدا کرتا ہے تو اگر حکومت جمہوری ہے تو پھر اس طرح کی باتیں نہیں ہونا چاہئے اور جس کو عوام الناس انتخاب کرلیں وہی حقیقت میں اسی کو صاحب اقتدار ہونا چاہئے۔

2۔ مذکورہ اعتراض کا جواب، اور حکومت کی شکل کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اعتراض کبھی وضاحت کے ساتھ اور کبھی اشاروں میں اخبار، میگزین اور کانفرنس میں بیان میں ہوتا ہے، اور بیرونی ریڈیو اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس پر بہت شور مچاتے ہیں، اور جو کچھ بھی ہمارے اخباروں اور مقالات میں بیان ہوتا ہے اس میں اسلامی حکومت کو تناقض آمیز (ضدّ و نقیض) اور دینی استبداد کے عنوان سے پہچنوایا جاتا ہے اسی وجہ سے ان مسائل کو صاف اور شفاف طریقہ سے بیان کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطہ نظر واضح ہوجائے۔

کیا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارا حکومتی نظام "جمہوری اسلامی" ہے تو اس نظام کا اسلامی ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس حکومت کا نقشہ اور اس کی شکل خداوند عالم کی طرف سے معین ہو، اور قرآن و روایات اور کم سے کم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کی سیرت میں بیان ہوا ہو؟ اور اگر اسلامی نظام ہونا اس بات میں مخصوص نہیں ہے کہ اس کی شکل وصورت خداوند عالم کی طرف سے معین ہو، (جیسا کہ دوسرے شواہد بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کی شکل وصورت خداوند عالم نے معین نہیں کی ہے) تو پھر نظام کے اسلامی ہونے کا معیار کیا ہے؟

چنانچہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ بحث و گفتگو ہوسکتی ہے اور جو کچھ ہم نے عرض کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس بحث کو اہمیت دی اور بعض لوگوں کی طرف سے اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے عوام الناس کو منحرف کرنا چاہا، لہٰذا ہم اس سلسلہ میں وضاحت کرنا مناسب سمجھتے ہیں، اور ہماری اس بحث میں دقت کرنے سے مطالب واضح اور روشن ہوجائیں گے، اور پھر دوسرے لوگوں کی باتیں اور شیطانی وسوسے اثر انداز نہیں ہو پائیں گے۔

کوئی شخص بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ اسلام نے حکومت کے لئے خاص نقشہ معین کیا ہے، نہ قرآن میں، نہ روایات میں اور نہ معصومین علیہم السلام کی عملی سیرت میں، اور نہ ہی حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ اور مقام معظم رہبری (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی) اور نہ ہی دوسرے علماء و رہبروں کے بیانات میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت وہ حکومت ہے جس کا نقشہ اور شکل خداوند عالم اور دینی رہبروں کے ذریعہ معین کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ اسلام نے حکم دیا ہو کہ ولی فقیہ

صاحب اقتدار اور مرکز قدرت ہو اور اس کے بعد دوسرا درجہ صدر مملکت کا ہے، اور یہ تینوں قدرتیں ایک دوسرے سے مستقل اور جدا ہونی چاہئیں تو جب اسلامی حکومت ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس کا نقشہ اور حکومتی امور نیز قدرتوں کا استقلال خدا کی طرف سے معین ہو تو پھر اسلامی حکومت ہونے کے معیار کو دوسری جگہوں پر تلاش کرنا چاہئے۔

3۔ حکومتی ثابت اور مسلم ڈھانچہ پیش کیا جانا ممکن نہیں

قارئین کرام! یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کی طرف سے حکومت کے لئے کوئی معین نقشہ اور خاص صورت بیان نہ ہونا اسلام کے ناقص ہونے کی دلیل نہیں ہے؟ کیا اسلام ایک کامل دین نہیں ہے اور کیا اسلام نے انسانی معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کو بیان نہیں کر دیا ہے؟ تو پھر کیوں حکومت کے سلسلہ میں کوئی خاص شکل بیان نہیں کی ہے؟

ہم جواب میں عرض کرتے ہیں: وہ اسلام جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے چھوٹے اور محدود معاشرہ کے نظام کو چلایا ہے اور اسلام؛ انسانی مختلف وسیع اور پیچیدہ معاشروں میں ایک عالمی حکومت کرنا چاہتا ہو، تو کیا اس کے لئے ایک ثابت اور مسلم نقشہ پیش کرنا ممکن نہیں ابتدائے اسلام میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ایسی حکومت تشکیل پائی جس کی مردم شماری شاید ایک لاکھ لوگوں تک بھی نہ ہو اور وہ سادہ قسم کی زندگی اور سادہ ثقافت والے لوگوں کی تعداد جن میں اکثریت بادیہ نشین اور مدینہ کے گرد و نواح کے دیہاتیوں کی تھی؛ یہ بات ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے اور اس تعداد کے لحاظ سے حکومت بھی سادہ تھی اس کے بعد آہستہ آہستہ اسلامی علاقوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور خلفاء کے زمانہ میں منجملہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے زمانہ میں کہ ابھی ظہور اسلام کو آدھی صدی ہی گذری تھی اسلامی حکومت ایران، مصر، عراق، سوریہ، حجاز اور یمن تک پہنچ گئی تھی اور اسلام کے تحت نفوذ اس ترقی و وسعت کے پیش نظر ایسا ممکن نہ تھا کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں ایک چھوٹی سی حکومت بنائیں تو اس کو اس طرح تشکیل دیں جس سے ہجرت کے وقت سے پچاس سال (بعد) کی حکومت کو بھی شامل ہو جائے، اور اگر اس زمانہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عظیم اسلامی علاقہ کے لئے حکومت کو بیان کرتے تو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ایک خواب کی طرح ہوتا، اور دوسری طرف چونکہ اس طرح کی حکومت کا راستہ ہموار نہیں تھا لہٰذا اس طرح کا نقشہ پیش کرنا ایک بے ہودہ کام تھا۔

اور چونکہ اس پچاس سال کے عرصے میں مسلمانوں کے حالات بہت بدل گئے تھے لہٰذا اس کے لئے مختلف طریقوں کی حکومت ہونا چاہئے تھی، اسی طرح اس کے بعد کا زمانہ جس میں مسلمانوں اور جہان اسلام کے حالات میں بھی کافی تبدیلی آنا تھی تو اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام حالات کے پیش نظر ہر زمانہ کے لئے ایک خاص قسم کی حکومت کو بیان فرماتے تو پھر فرضی حکومتوں کے سلسلہ میں ایک عظیم "دائرۃ المعارف" (انسائیکلو پیڈیا) بن جاتا جس میں ہر زمانہ کی حکومت کے لئے تفصیل بیان کی جاتیں لیکن چونکہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے والی کی تعداد ہی بہت کم تھی، اور اس سلسلہ میں عالم افراد اور

دانشوران کا ہونا تو دور کی بات ہے تا کہ وہ اس سلسلہ میں تفصیل دیں اور ایک دوسرے سے جدا کریں، نہ اس وقت اس موضوع کو بیان کرنے کے امکانات تھے، اور اگر بیان بھی ہو جاتے تو ان کو محفوظ رکھنا اور ان کو رائج کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

المختصر یہ کہ حکومت کا نقشہ اور اس کی شکل زمان و مکان کے لحاظ سے ہمیشہ متغیر ہے، اور انسانی معاشرہ میں ہمیشہ کے لئے ایک خاص حکومت کا نقشہ معین کرنا ممکن نہیں ہے جس کو ہر دور میں اور ہر جگہ قائم کیا جا سکے حکومت کا نقشہ اسلام کے متغیر اور ثانوی احکام میں سے ہے جو زمان و مکان کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں جن کو معین کرنا ولی امر مسلمین کے عہدہ پر ہوتا ہے، اور جب امام معصوم علیہ السلام حاضر ہوں تو وہی ولی امر مسلمین ہیں، اور وہ حاضر نہ ہوں تو پھر ان کی جگہ ان کا نائب (خاص) ولی امر مسلمین شمار ہوتا ہے (اسلام کے ان متغیر احکام کے مقابل میں اسلام کے ثابت اور مسلم احکام بھی ہیں جو ہمیشہ کے لئے ثابت ہیں جن کو کسی بھی زمانہ میں اور کسی جگہ پر جاری کیا جا سکتا ہے)۔

لہٰذا یہ تصور کرنا کہ اسلام کو ہر علاقے اور ہر زمانہ کے لحاظ سے حکومت کا ایک نقشہ پیش کرنا چاہئے تھا؛ یہ تصور صحیح نہیں ہے، چونکہ اس طرح کا کام عملی طور پر ممکن بھی نہ تھا لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ اسلام کی طرف سے حکومت کے لئے خاص نقشہ پیش نہ کرنا اسلام کا کوئی نقص نہیں ہے بلکہ اگر اسلام کی طرف سے حکومت کے سلسلہ میں کلی اور عام قواعد پیش نہ کئے جاتے تو اس وقت یہ کہا جا سکتا تھا کہ اسلام میں نقص ہے؛ کیونکہ اس صورت میں نہ تو اسلام نے زمان و مکان کے لحاظ سے حکومت کی کوئی شکل پیش کی ہے اور نہ ہی حکومت کے بارے میں کوئی راستہ بیان کیا ہے لیکن الحمد للہ اسلام نے حکومت کے نقشہ کے بارے میں راستہ تو بتا دیا ہے اور اس کے لئے متغیر احکام قرار دیئے ہیں اور جیسا کہ ہم نے قانون گذاری کے سلسلہ میں عرض کیا ہے کہ زمان و مکان کے لحاظ سے متغیر احکام کا معین کرنا ولی امر مسلمین کی ذمہ داری ہوتی ہے، جو اسلامی اصول کی بنا پر اور اس زمانہ کے متغیر مصالح کے پیش نظر اور اس سلسلہ میں ماہرین سے صلاح و مشورہ کے بعد ان کو بیان کرتا ہے، اور انہیں مسائل میں سے حکومت بھی ہے، (اور جب ولی امر مسلمین ان احکام کو بیان کردے تو پھر) عوام الناس کے لئے ان پر عمل کرنا ضروری ہے اسلام نے اس راہ حل کو پیش کر کے عوام الناس کو سرگردانی اور حیرت سے نجات عطا کر دی ہے، جس کی بنا پر اختلافات اور جھگڑوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

4۔ حکومت کا عرفی اور دنیاوی ہونا اور قوانین اسلام کا ہم عصری ہونا (ایک اعتراض)

قارئین کرام! اس سلسلہ میں ایک دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف سے حکومت کے لئے کوئی خاص نقشہ بیان نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ حکومتی مسائل عرفی اور دنیاوی ہیں جو خود عوام الناس سے متعلق ہیں اور اسلام نے اس سلسلہ میں کوئی اظہار نظر نہیں کیا ہے آج کل کے وہ لوگ جو مغربی کلچر خصوصاً "لیبر لیزم" سے متاثر ہیں اس اعتراض کو ہوا دیتے ہیں اور اپنے مقالات، تقریروں اور اپنی گفتگو میں اس اعتراض کی حمایت کرتے ہیں کہ حکومتی مسائل دنیاوی اور عرفی ہیں جن کا اسلام سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور اپنی بات پر شاھد اس چیز کو پیش کرتے ہیں کہ اسلام نے نہ تو جمہوری حکومت کے بارے

میں کچھ کہا ہے اور نہ بادشاہی حکومت کے سلسلہ میں کچھ کہا ہے، اور نہ ہی دوسری حکومتوں کے بارے میں کچھ بیان دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتی مسائل ایسے نہیں ہیں جن کے بارے میں ہمیں یہ امید نہیں رکھنی چاہئے کہ اس سلسلہ میں خدا اور پیغمبر کچھ بیان کریں، بلکہ یہ مسائل تو دنیا اور عوام الناس سے متعلق ہیں اور خود انہیں کو اس سلسلہ میں طے کرنا چاہئے۔

اور آہستہ آہستہ اس سے بھی آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں: نہ صرف یہ کہ حکومت کے نقشہ کو خود عوام الناس معین کرے بلکہ حکومت کے قوانین بھی خود عوام الناس کو بنانا چاہئے؛ چاہے وہ قوانین اسلامی اصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں!!

لیکن اس وقت ان کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اگر حکومتی مسائل دنیاوی اور عرفی ہیں اور عوام الناس سے متعلق ہیں یہاں تک کہ قوانین بھی انہیں کے ذریعہ بنائے جائیں، تو پھر قرآن اور متواتر روایات میں حکومت سے متعلق بہت سے احکام کیوں بیان ہوئے ہیں؟ مثلاً احکام قضا، احکام مالیات (ٹیکس) اور احکام جزائی وغیرہ، یہ وہ بند گلی ہے جس سے نکلنے کا راستہ نہیں ہے، اگرچہ انہوں نے اس بند گلی سے نکلنے کے لئے بہت سے راستے اختیار کئے ہیں لیکن ان سب کو اس وقت بیان نہیں کیا جاسکتا۔

ان میں سے بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ حکومتی احکام وقوانین جو قرآن وروایات میں وارد ہوئے ہیں، وہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص ہیں اور اسی زمانہ کی ضرورت کے مطابق تھے، اور اسلام نے صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں حکومتی مسائل میں دخالت کی ہے اور کچھ قوانین پیش کئے ہیں، کیونکہ اس وقت کے لوگ اپنی ضرورت کے مطابق قوانین بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، لہٰذا اسلام کو ان کی ضرورت کے مطابق کچھ قوانین پیش کرنا پڑے، اسی وجہ سے قرآن وروایات میں حکومت، سیاست اور قضاوت سے متعلق احکامات بیان ہوئے ہیں جو صرف اسی زمانہ میں کار آمد تھے، لیکن اس زمانہ میں جب انسان نے علم و دانش میں کافی ترقی کرلی ہے اور خود اپنی ضرورت کے مطابق قوانین بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور آج کل ماڈرن زمانہ ہے، لہٰذا وہ قوانین کار آمد نہیں ہیں اور ان کو ترک کردینا چاہئے!!

قارئین کرام! اس طرح کی باتیں بہت سے اسلام کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کی طرف سے بیان ہوتی ہیں اور کبھی کبھی تو صاف کہتے ہیں کہ احکام اسلام (منجملہ اسلام کے اجتماعی احکام) رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص تھے، اور آج ہمارے زمانہ میں کار آمد نہیں ہیں، بلکہ اصلاً اس زمانہ کے لئے نازل (بھی) نہیں ہوئے ہیں، اور کبھی کبھی اپنے مذکورہ نظریہ کو پشت پردہ بیان کرتے ہیں چونکہ اتنی ہمت نہیں کرتے کہ واضح طور پر اسلام کے تمام اجتماعی احکام پر اعتراضات نہیں کرسکتے، اور اسلام کے بعض سزائی احکام منجملہ "چور کے ہاتھ کاٹنے والے حکم" پر اعتراض کرتے ہیں۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ "چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم" چوری کرنے اور لوگوں کے مال میں خیانت کرنے سے روک تھام اور معاشرہ میں مالی امن وامان کو برقرار کرنے کے لئے تھا لیکن اب اگر ہمارے پاس اس طرح کے جرائم سے روک تھام کے لئے

اس سے بہتر طریقے موجود ہوں تو پھر انہیں کو کام میں لایا جائے، نہ یہ کہ ہر زمانہ میں چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں اسلامی قوانین کا مقصود معاشرہ میں امن برقرار رکھنا ہے اور اس زمانہ میں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ کار نہیں تھا کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں لیکن آج کل اس سے بہتر طریقے موجود ہیں تا کہ اس طرح کے جرائم سے روک تھام ہو سکے، جن میں تشدد اور شدت پسندی بھی نہیں ہے اور ان کی انسانی شرافت بھی داغدار نہیں ہوتی کیونکہ چور کے ہاتھ کاٹ دینا تشدد اور وحشیانہ عمل ہونے کے علاوہ انسانی شرافت سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے جس کو ترک کر دینا چاہیئے آج کل ہم اس زمانہ میں زندگی بسر کرتے ہیں جس کو ماڈرن زمانہ کہا جاتا ہے، آج اجتماعی مسائل بالکل بدل گئے ہیں، اور چونکہ آج کل کے جدید حالات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے زمانہ سے بالکل الگ ہیں لہٰذا اسلامی قوانین کو جاری نہیں کیا جا سکتا۔

قارئین کرام! آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ پہلے تو ان لوگوں نے یہ کہا کہ اسلام نے حکومت کے لئے کوئی نقشہ پیش نہیں کیا، اور اس سلسلہ میں خود عوام الناس کو اختیار ہے اور جب حکومتی مسائل عوام الناس پر چھوڑ دیئے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جن موارد میں اسلام کے مشخص اور معین قوانین نہیں ہیں تو ان قوانین کو معین کرنا خود عوام الناس کے عہدہ پر ہے اس کے بعد اس سے آگے قدم بڑھایا اور کہا: یہاں تک کہ جن موارد میں اسلامی قوانین موجود بھی ہیں تو ان اسلامی قوانین کو نسخ بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کو بدلا جا سکتا ہے! بے شک اس صورت میں تو اسلام کا جلد ہی فاتحہ دیا جائے گا۔

5۔ مذکورہ اعتراض کا جواب، اور اسلام کے متغیر اور ثابت احکام کی نسبت

ہم نے مختصر طور پر یہ عرض کیا کہ اسلام کے ثابت اور غیر قابل تبدیل احکام کے علاوہ متغیر احکام بھی ہیں کیونکہ اسلام کے احکام واقعی مصالح ومفاسد کے تحت ہیں، اور انسان کی زندگی بعض امور میں متغیر حالات کے تابع ہے، البتہ وہ متغیر حالات بھی واقعی مصالح ومفاسد کے لحاظ سے متغیر ہیں اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ حکومت بھی ثانوی اور متغیر احکام رکھتی ہے اور ہر زمانہ میں اس کی شکل وصورت کا معین کرنا نیز اس کے لئے مناسب قوانین بنانا ولی فقیہ کا کام ہے جو اسلامی اصول کے تحت اور اسلامی ارشادات کے مطابق اپنے وظیفہ پر عمل کرتا ہے۔

قارئین کرام! توجہ رہے کہ اسلام کے متغیر اور ثابت احکام میں امتیاز پیدا کرنا اور ان میں تمیز کرنا فقہاء اور مجتہدین کا کام ہے کیونکہ وہ اسلامی منابع وماخذ کی روح یعنی قرآن، سنت، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت کا علم رکھتے ہیں لہٰذا اسلام کے متغیر اور ثابت احکام میں تمیز کر سکتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے صفات کو معین کر سکتے ہیں۔

صرف یہ کہہ دینا کہ اسلام میں متغیر احکام پائے جاتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی اسلام کے تمام احکام کو متغیر کہہ دے کیونکہ اگر اسلام کے تمام قوانین متغیر ہوں تو پھر اسلام میں کیا باقی بچے گا؟ اور اس صورت میں ہم کس اسلام کا دفاع کرنا چاہتے ہیں؟ اگر تمام اسلامی قوانین اور احکام متغیر ہوں اور اسلام کا کوئی بھی قانون یا حکم ثابت اور مسلم نہ ہو تو پھر ہم نے کیوں انقلاب برپا کیا، اور اسلام کے احکام جاری ہونے کے خواہشمند ہیں، اس کی وجہ سے لاکھوں افراد شہید ہوئے خود

شاہ (محمد رضا) کے زمانہ میں ایک ریفارم "Rwforme" (اصلاح) اور تبدیلی کے ذریعہ عوام الناس کی مانگ کو پورا کیا جاسکتا تھا، تاکہ خود عوام الناس کے لئے قوانین بنانے کا راستہ ہموار ہو جاتا، اگر یہ وہی اسلام ہے جس کے قوانین عوام الناس کی رائے سے بدل جاتے ہیں تو پھر ہم نے بے فائدہ انقلاب برپا کیا، بہتر تھا کہ ہم "ملی گرا" کے تابع ہو جاتے، جس کی بنا پر معاشرہ کے منافع کو حاصل کرتے، اور پھر ہمارے یہ نقصانات نہ ہوتے!! جیسا کہ ملی گرا مشورہ دیتے اسی کو جاری کرتے اور لیبرل ڈیموکریسی کے تحت آرام کے ساتھ ووٹنگ کرتے اور پھر اپنے منتخب شدہ ممبران کو شاہ کے پارلیمنٹ میں بھیجتے، اور وہ عوام الناس کی خواہش کے مطابق غیر عوامی قوانین تبدیل کرتے!!

قارئین کرام! یہ ان لوگوں کی باتوں کا خلاصہ ہے، جو بیرونی "تموریسین" سے متاثر ہیں جو بعض ان اخباروں میں بیان ہوتے ہیں جو مسلمانوں کے بیت المال سے چلتے ہیں!!

اسی طرح کے بعض لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان جوانوں کو جنہوں نے ابھی تک اسلام کے اجتماعی مسائل کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور کافی مقدار میں علم نہیں رکھتے ان کو تحت تاثیر قرار دیتے ہیں، مثال کے طور پر کہتے ہیں: اسلامی حکومت صرف ایک ادعای ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کیونکہ اسلام نے نہ جمہوریت کے بارے میں کچھ کہا ہے اور نہ ہی قدرتوں میں جدائی کے بارے میں کچھ بیان دیا ہے۔

اور جب اسلام نے اس سلسلہ میں کچھ (بھی) بیان نہیں کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے حکومت کے سلسلہ میں کوئی نقشہ پیش نہیں کیا بلکہ حکومتی امور خود عوام الناس کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔

یہاں پر ہمارے مخاطب وہ لوگ ہیں جو خدا، اسلام اور قرآن پر اعتقاد رکھتے ہیں، احکام اسلامی کو کھیل سمجھنے والے افراد نہیں، کیونکہ ان کے سلسلہ میں گفتگو کرنا بے کار ہے، ہم ان لوگوں سے مخاطب ہیں جو خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا نے پیغمبر کو ہماری ہدایت کے لئے بھیجا ہے، نیز قرآن مجید اس کی طرف سے نازل ہوا ہے: (ہم ان سے یہ عرض کرتے ہیں کہ) قرآن مجید صاف طور پر ایسے احکام اور قوانین کا ذکر کرتا ہے جو ہمیشہ ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہیں اور قابل استثناء بھی نہیں ہیں، اس کے علاوہ قرآن مجید نے بار بار اس بات پر زور دیا ھے کہ ان احکام میں کسی طرح کا کوئی خدشہ وارد نہیں کرنا چاہئے ان ہی میں سے اسلام کے قضائی احکام ہیں اگرچہ بعض مسائل ضروری اور واجب ہیں لیکن ان کو عام معمولی طریقہ سے قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے، لیکن بعض مسائل منجملہ احکام قضاوت (اسلامی قوانین کے احکام وقوانین کے مطابق) ہیں جن کے بارے میں اس قدر تاکید کی گئی ہے اور ان کو اس شدید انداز میں بیان کیا گیا کہ اگر انسان ان کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو اس کا بدن لرز جاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ خدا کے حکم کے مطابق حکم فرمائیں:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ. [1]

"ہم نے آپ کی طرف یہ برحق کتاب نازل کی ہے کہ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں"

دوسری جگہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں کے سامنے تسلیم ہونے اور اس کی اطاعت کے بارے میں فرماتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا. [2]

"پس آپ کے پروردگار کی قسم کہ یہ ہرگز صاحب ایمان نہ بن سکیں گے جب تک آپ کو اپنے اختلافات میں حکم نہ بنائیں گے اور پھر جب آپ فیصلہ کر دیں تو اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی کا احساس نہ کریں اور آپ کے فیصلہ کے سامنے سراپا تسلیم ہو جائیں۔"

قارئین کرام! جیسا کہ آپ حضرات نے ملاحظہ کیا کہ خداوند عالم نے (فَلَا وَرَبِّكَ) سے قسم کھا کر (جو بہت بڑی قسم ہے) صرف ان لوگوں کو مومن شمار کیا ہے جو اپنے اختلافات اور جھگڑوں میں (جو معمولاً مالی امور میں اور کبھی جان و ناموس کے سلسلے میں ہوتے ہیں) صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کریں لیکن اگر اپنے اختلافات کو دور کرنے کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیصلہ کی درخواست نہ کی، یا اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے درمیان فیصلہ فرما دیا چاہے کسی کے نقصان میں ہو یا فائدہ میں، اور وہ دل و جان سے پیغمبر کے فیصلہ پر راضی نہ ہوئے اور ان کے دل رنجیدہ رہے، تو اس صورت میں وہ مومن نہ رہیں گے لہٰذا مومنین کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قضاوت اور فیصلوں کے لئے منتخب کرنا چاہئے اور جس وقت وہ فیصلہ فرما دیں تو چاہے ان کے فائدہ میں ہو یا نقصان میں، تو ان کو اپنے دل میں ناراضگی اور رنجیدگی کا احساس تک نہ ہونے پائے، اور مکمل طریقہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ پر راضی رہیں جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا رسول مانتے ہیں لیکن ان کے فیصلوں کو نہیں مانتے وہ لوگ جھوٹے اور منافق ہیں؛ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ رسول کی رسالت کا اقرار کرتے ہوں لیکن اس کے فیصلوں کو نہ مانیں؟!

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر چند مسلسل آیتوں میں خدا کے حکم کے علاوہ قضاوت کرنے والے لوگوں کو فاسق، کافر اور ظالم کہا گیا ہے:

ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ. [3]

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۰۵

[2] سورہ نساء آیت ۶۵

[3] سورہ مائدہ آیت ۴۴

"اور جو شخص بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا اس کا شمار کافروں میں ہوگا۔"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ.[1]

"اور جو شخص بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا اس کا شمار ظالموں میں ہوگا۔"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ.[2]

"اور جو شخص بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا اس کا شمار فاسقوں میں ہوگا۔"

کیا کوئی شخص قرآن مجید کی ان آیات کو اس انداز اور اس لحن میں ملاحظہ کرنے کے بعد (بھی) یہ احتمال دے سکتا ہے کہ اسلامی قضاوت کے احکام صرف رسول اکرم ﷺ کے زمانہ تک اور زیادہ سے زیادہ آپ کے بیس سال بعد تک کے لئے ہیں، اور جب اسلامی علاقوں میں ایران، مصر اور دوسرے علاقے شامل ہو گئے تو اسلام کے یہ قضائی احکام کار آمد نہیں رہے اور قضاوت کے احکام لوگوں پر چھوڑ دیئے گئے ہیں؟ کیا ہر وہ شخص جو ان آیات اور اسی طرح کی دوسری آیات کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہی نتیجہ اور فیصلہ کرے گا؟! یا نہ اس کا فیصلہ یہ ہوگا کہ کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں خداوند عالم کے احکام کو پاؤں سے روندھا نہیں جاسکتا؟

بے شک ہر وہ صاحب عقل اور انصاف پسند انسان جو خدا پر ایمان رکھتا ہو اور ان آیات کو خدا کا کلام سمجھے تو ان آیات کے لب و لہجے کو دیکھ کر یہ یقین نہیں کرسکتا کہ یہ مذکورہ آیات صرف رسول اکرم ﷺ کے زمانہ اور زیادہ سے زیادہ آنحضرت کے بیس سال بعد تک کے لئے ہیں؛ بلکہ (ان آیات کے لب و لہجے کو دیکھ کر) اس کو یقین ہوجائے گا کہ تا قیامت ان آیات کے مضمون پر عمل ہونا چاہئے، اور ہمیشہ احکام خدا کو اپنے اعمال کے لئے نمونہ عمل قرار دینا چاہئے، اور ان کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہئے:

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ.[3]

"اور جو حدود الٰہی سے تجاوز کرے گا اس کا شمار ظالمین میں سے ہوگا۔"

اس کے علاوہ اگر بعض آیات کا مضمون کسی قدر واضح اور روشن نہ ہوتا تو اس میں کچھ شبہ ہوسکتا تھا، علماء اور مجتہدین کا وظیفہ ہے کہ یہ معین کریں کہ یہ آیات کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہیں یا زمانہ کے لحاظ سے مطلق ہیں اور کیا کسی خاص قوم (جزیرۃ العرب کی عوام) سے مخصوص ہیں یا ان آیات میں دوسرے تمام لوگ بھی شامل ہیں؟

بہر حال دشمن؛ احکام اسلامی اور قوانین اسلامی کو برداشت کرنے سے شانے خالی کرتے ہیں اور اپنی خواہش

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۴۵

[2] سورہ مائدہ آیت ۴۷

[3] سورہ بقرہ آیت ۲۲۹

نفسانی نیز شیطانی ہوا و ہوس کے تحت نیز جوان نسل کو گمراہ اور منحرف کرنے کے لئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کے اجتماعی اور سیاسی احکام رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص ہیں اور اس کے بعد کار آمد نہیں ہیں، اگرچہ ہم نے اپنی حکومت کو "جمہوری اسلامی" کا عنوان دیا ہے لیکن اسلام کا نام صرف ایک دکھاوٹی پہلو ہے، اور عوام الناس جو قانون بھی بنانا چاہیں بنا سکتے ہیں، اور اس پر عمل کر سکتے ہیں؛ چاہے وہ قوانین سو فی صد خداوند عالم کے حکم کے مخالف ہوں!! افسوس کہ بعض لوگ اپنے مقالات اور تقریروں میں اسی طرح کا نظریہ پیش کرتے ہیں، جبکہ ان سے اس کے علاوہ کی امید بھی نہیں ہے۔

6۔ انسانی، تمام مسائل میں احکام الٰہی کی وسعت

قارئین کرام! یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام کی طرف حکومت کے لئے کوئی خاص نقشہ پیش نہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حکومت اور حکومتی قوانین: عدلیہ، قانون گذاری اور اجرائے احکام سے متعلق قوانین [1] خود عوام الناس کے سپرد کر دیئے جائیں اور خداوند عالم ان کے بارے میں کوئی نظریہ نہ رکھتا ہو؛ بلکہ خداوند عالم نے انسان کے ذاتی اور اجتماعی مسائل میں اسی طرح حکومت و سیاست کے بارے میں دستور العمل بیان کیا ہے، اور ہمیں کوئی ایک ایسا مورد نہیں ملے گا جس میں خداوند عالم کا حکم شامل نہ ہوتا ہو۔

وضاحت ہم جو کچھ بھی کام انجام دیتے ہیں اور جو احکام ہم پر لاگو ہوتے ہیں ان میں سے بعض احکام وجوبی اور الزامی ہوتے ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے ان کے مقابلہ میں بعض احکام حرام ہوتے ہیں جن کا ترک کرنا واجب ہوتا ہے، ان اوامر و نواہی والے الزامی احکام کے علاوہ دوسرے احکام جائز ہوتے ہیں اور ان پر غیر الزامی احکام جاری ہوتے ہیں، غیر الزامی احکام یہ ہیں: مستحب، مکروہ اور مباح پس ہمارے تمام کام انہیں پانچوں قسم میں سے ہوتے ہیں چاہے وہ واجب ہوں یا حرام، مستحب ہوں یا مکروہ اور مباح، اور یہ تمام خداوند عالم کے احکام ہیں۔

اس بنا پر اگر کسی مقام پر کوئی کام حرام یا واجب یا مستحب یا مکروہ نہ ہو تو وہ کام انسان کے لئے آزاد ہے جس کو روایات میں مطلق اور فقہاء و مجتہدین کی اصطلاح میں "مباح" کہا جاتا ہے؛ مباح بھی خداوند عالم کے احکام میں سے ایک حکم ہے لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر حکم خدا شامل نہ ہو، کیونکہ ہر مسئلہ یا ہر موضوع پر احکام خمسہ (واجب، حرام، مستحب، مکروہ اور مباح) میں سے کوئی نہ کوئی حکم ضرور شامل ہوگا البتہ حقوق اور سیاست کے لحاظ سے مستحب اور مکروہ صرف اخلاقی پہلو رکھتا ہے اور ان کا ذکر حقوقی مسائل میں بیان نہیں ہوتا اور مسائل حقوقی یا واجب ہیں جن کی رعایت ہونا چاہئے یا حرام جن کو ترک کیا جائے یا مباح ہیں (چاہے عمل کرے یا نہ کرے)۔

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم نے مان لیا کہ اسلام نے حکومت کے سلسلہ میں نظریہ پیش کیا ہے، اور وہ شخص جو اقتدار میں مرکزیت رکھتا ہے اس کے لئے خاص شرائط و صفات معین کئے ہیں، جس کے نتیجہ میں جو شخص ان صفات کا

---

[1] جن کو ہم فلسفہ سیاست کی تھیوریوں میں بیان کریں گے۔

حائل ہوگا وہی شریعت اسلام کی طرف سے معاشرہ کی رہبری کے لئے حکومت کے لئے منصوب ہوگا؛ تو کیا جن مسائل میں اسلام نے بیان نہیں دیا ہے وہ عوام الناس کے حوالے ہیں اور ان میں شریعت اسلام نے کوئی تصمیم گیری نہیں کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کو طے کرنے کے لئے عوام الناس کی سمجھ بوجھ اور ان کے درمیان موجود عرف کے مطابق عمل کیا جائے؟ یہاں پر، حتیٰ وہ افراد جو اسلامی اور فقہی بحثوں سے کسی حد تک آشنائی رکھتے ہیں کبھی کبھی ایسے گول مول الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے دوسرے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، مثال کے طور پر کہتے ہیں: ہم اپنی زندگی کے بعض مسائل کو دین اسلام سے اخذ کریں اور ان کے سلسلہ میں قرآن مجید، روایات اور زیادہ سے زیادہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی عملی سیرت کی طرف رجوع کریں؛ لیکن ان کے علاوہ اپنی عقل کے مطابق عمل کریں درحقیقت ہم اپنی صحیح زندگی کی راہ کو معین کرنے کے لئے دو منابع رکھتے ہیں: ایک قرآن مجید، دوسرے عقل اس طرح کے مسامحہ آمیز (ذو معنی) الفاظ وہ حضرات استعمال کرتے ہیں جو صاحب نظر اور واقعاً متدین ہیں، اور چونکہ اس طرح کی باتیں باعث لغزش و گمراہی ہوتی ہیں لہٰذا ان کو رد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اس نکتہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ حکم شرعی اور حکم الٰہی کے لئے کم سے کم دو اصطلاح موجود ہیں:

1۔ حکم شرعی کی پہلی اصطلاح: (یا حکم تعبدی اور الٰہی) وہ حکم ہے جو قرآن مجید اور سنت نبوی سے حاصل کیا جاتا ہے، وہ قرآن اور معتبر احادیث میں ذکر ہوئے ہیں اس اصطلاح کے مطابق وہ حکم جو دوسرے طریقہ سے حاصل ہو جیسے عقل کے ذریعہ تو اس کو شرعی حکم نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کو "حکم عقل" کہا جاتا ہے لہٰذا اگر کسی حکم کو عقل مستقل طور پر حاصل کرلے، اور اس سلسلہ میں شریعت مقدس کی طرف سے بھی حکم وارد ہوا ہو، تو اس (شرعی حکم) کو ارشادی کہا جاتا ہے جس میں حکم شرعی اور تعبدی نہیں ہوتا۔

وضاحت ہماری عقل دوسری چیزوں سے قطع نظر بعض چیزوں کو سمجھتی ہے مثلاً ہر صاحب عقل انسان اس بات کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے کہ عدالت اچھی چیز ہے اور ظلم بری چیز ہے؛ اور کوئی بھی صاحب عقل، عقل کے اس حکم میں شک نہیں کرتا اس وقت جب قرآن مجید کی آیت میں عدل کے بارے میں حکم ہوتا ہے تو فقہاء کی اصطلاح میں اس حکم کو "ارشادی" کہا جاتا ہے؛ یعنی یہ آیت صرف عقل کے اس حکم پر ہدایت کرتی ہے جو ہماری عقل نے الگ سے سمجھ لیا ہے۔

حکم شرعی میں اس اصطلاح کا فقہاء کے یہاں استعمال ہونا بعض لوگوں کے منحرف ہونے کا سبب بنا ہے اور خیال کیا جانے لگا کہ ہم اپنی زندگی کے تمام مسائل میں شرعی حکم کے محتاج نہیں ہیں بلکہ بعض مسائل میں ہمارے لئے حکم عقل کافی ہے اور پھر ان میں خداوند عالم کی کوئی حکومت نہیں ہوگی، کیونکہ خداوند عالم کی حاکمیت ان احکام میں ہوتی ہے جو قرآن مجید اور سنت پیغمبر میں نازل ہوئے ہیں، اور اگر کسی سلسلہ میں خدا کا کوئی حکم نہ ہو تو وہاں پھر خدا نے اپنی حاکمیت کو نہیں رکھا ہے بلکہ اس کو عقل کے سپرد کردیا ہے پس ہماری زندگی کے امور دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں: بعض میں خدائی سلطنت ہے اور

دوسرے حصہ میں ہماری عقل حاکم ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم تمام مقامات پر حکومت نہیں رکھتا ہمیں ہر جگہ خدا کے حکم کو تلاش نہیں کرنا چاہئے بلکہ جس جگہ خدا کا حکم نہ ہو اس کو ہمارے حوالے کر دیا ہے تا کہ ہم اپنی عقل کے ذریعہ اس کا حکم حاصل کر لیں۔

قارئین کرام! جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ فقہاء کے یہاں پہلی اصطلاح میں حکم شرعی میں مسامحہ آمیز تعبیر استعمال کی گئی ہے، (جس کی بنا پر حکم شرعی اس حکم تعبدی کو کہا جاتا ہے جو قرآن وسنت میں ذکر ہوا ہو، اس کے مقابلہ میں عقل کے قطعی اور یقینی حکم کو قرار دیتے ہیں جس کے سلسلہ میں شارع مقدس نے کوئی تعبد نہیں رکھا ہے، اور ہماری عقل اس حکم کو حاصل کرنے میں شریعت کی پابند نہیں ہے، اور شریعت نے صرف اس سلسلہ میں ارشادی حکم کو پیش کیا ہے) جس سے بعض لوگوں نے غلط نتیجہ نکالا ہے اور یہ اعتقاد کر لیا کہ ہماری زندگی کا ایک حصہ خداوند عالم کی حاکمیت اور سلطنت سے باہر ہے اور اس سلسلہ میں قوانین کو مرتب کرنا عقل کی ذمہ داری ہے۔

2۔ حکم شرعی کی دوسری اصطلاح: یہ ہے کہ وہ احکام جو خداوند عالم کے ارادہ تشریعی سے متعلق ہوں؛ یعنی ہر وہ کام جو خداوند عالم ہم سے چاہتا ہے چاہے الزامی صورت میں ہو یا مباح کی صورت میں ہو پس جو کچھ خداوند عالم ہم سے چاہے کہ ہم اسے انجام دیں تو وہ حکم خدا ہے؛ چاہے وہ قرآن وسنت اور تعبدی دلائل کے ذریعہ ثابت ہوں اور چاہے عقل کے ذریعہ ثابت ہوں اس بنا پر خود عقل بھی حکم خدا کی پہچان کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے لہٰذا ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ عقل خداوند عالم کے تشریعی ارادہ کی عکاسی کرتی ہے، لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ یہ حکم وہی چیز ہے جس کو خداوند عالم نے ہم سے چاہا ہے اگر فقہی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ قرآن مجید، سنت نبوی کے علاوہ بھی احکام شرعی کو ثابت کرنے کے لئے ایک دوسری چیز بھی ہے جس کو عقل کہا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل بھی خدا کے احکام کو پہچاننے والے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے، اور عقل بھی قرآن وسنت کی طرح حکم خدا کو کشف کر سکتی ہے اور حکم خدا صرف قرآن وسنت میں منحصر نہیں ہے بلکہ احکام خدا وہ ہیں جس پر خدا کا ارادہ تشریعی متعلق ہو جو قرآن سنت اور عقل کے ذریعہ کشف ہوتا ہے۔

قارئین کرام! اس اصطلاح اور معنی کے پیش نظر انسان کے تمام کام چاہے وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، چاہے حقوقی ہوں یا جزائی یا اندرونی ہو یا بیرونی اور بین الاقوامی تمام پر حکم شرعی اور حکم خدا شامل ہے؛ چاہے حکم خدا قرآن وسنت کے ذریعہ اثبات ہو یا عقلی طریقہ پر ثابت ہو البتہ توجہ رہے کہ عقلی حکم اس قدر واضح، روشن اور یقینی ہو کہ جس پر ہمیں اطمینان ہو جائے کہ جو کچھ عقلی دلیل کے ذریعہ ثابت ہوا ہے وہ خداوند عالم کے تشریعی ارادہ سے متعلق ہے۔

چوبیسویں نشست

اسلامی احکام کی عظمت اور اس کی دوسرے نظام پر برتری

1۔ حکومت اور متغیر احکام سے اسلامی ثابت احکام کی نسبت

جیسا کہ ہم گذشتہ جلسہ میں عرض کر چکے ہیں بعض دوسری فکر رکھنے والے لوگ اخباروں اور اپنی تقریروں میں یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ احکام اور قوانین جن کو معاشرہ کی ضرورت ہوتی ہے ان کو پارلیمنٹ میں طے ہونا چاہئے، اور اگر ہم صرف قرآن وسنت میں بیان شدہ قوانین پر اکتفاء کرنا چاہیں تو کسی بھی صورت میں معاشرہ کی ضرورت پوری نہیں ہوگی حالانکہ ہمارے جمہوری اسلامی نظام میں (جیسا کہ دوسرے ڈیموکریٹک ممالک میں ہوتا ہے) ممبر آف پارلیمنٹ کے ذریعہ قوانین بنائے جاتے ہیں، تو پھر ہمیں اپنی اس حکومت کو "اسلامی حکومت" کا نام دینے، اور پارلیمنٹ میں مصوب قوانین کو "اسلامی قوانین" کہنے کی کیا پڑی ہے؟ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر ملک میں عوام الناس کے ذریعہ منتخب ممبر آف پارلیمنٹ اسی ملک کی ثقافت کے لحاظ سے قوانین بناتے ہیں اور قوانین کو طے کرنے میں ہی اس معاشرہ کے اقدار کا احترام کرتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے ملک کے عوام الناس مسلمان ہیں اور اس میں خاص ثقافت کا رواج ہے، ممبر آف پارلیمنٹ اسلامی اور دینی ثقافت کا کم وبیش لحاظ کرتے ہیں لیکن بہر حال ہمارے ملک میں قانون گذاری کا وہی طریقہ ہے جو ڈیموکریٹک ممالک میں موجود ہے لہٰذا ہم کو اپنی حکومت کو اسلامی حکومت کہنے اور اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اسلامی احکام کی دو قسمیں ہیں:

1۔ ثابت احکام۔ 2۔ متغیر احکام، جو حالات کے متغیر ہونے سے بدل جاتے ہیں۔

لیکن انسانی معاشرہ کے حالات بدلنے سے اسلامی ثابت احکام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور ان کی شکل صورت میں کسی بھی وقت کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ ثابت رہتے ہیں، اور ہر زمانہ اور ہر حال میں ان پر عمل کرنا ضروری ہے اب اگر ملکی قوانین کو مصوب کرتے وقت اسلام ثابت احکام کی رعایت نہ کی جائے اور قوانین اسلام کے خلاف قوانین بنائے جائیں تو وہ قوانین غیر اسلامی ہوں گے؛ چاہے تمام ہی ممبر آف پارلیمنٹ متفق طور پر ان قوانین کو طے کریں، اور اسلام کے مخالف قوانین کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، بلکہ اس کو قانون ہی نہیں کہا جاسکتا جیسا کہ ہمارے ملکی بنیادی قانون میں موجود ہے کہ اسلامی ملک کے تمام قوانین؛ اسلامی اصول کے عین مطابق ہونا ضروری ہے یہاں تک کہ اگر کوئی قانون؛ شرعی ادلہ کے عموم اور

اطلاق کے خلاف ہوگا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی

اس بنا پر، وہ اسلامی ثابت احکام جو قرآن کریم اور روایات متواتر اور معتبر روایات میں ثابت احکام کے عنوان سے بیان کئے گئے ہیں ان کی رعایت کرنا ضروری ہے اور ان میں کسی بھی طرح کا کوئی نسخ اور تبدیلی نہ ہو اس کے مقابل میں بعض وہ متغیر احکام ہیں جو حالات اور علاقہ کے لحاظ سے قابل تبدیل ہیں البتہ ان کو معین کرنا علماء اور مجتہدین کا کام ہے۔

اگر چہ متغیر احکام کو آج کل کے زمانہ میں "قوانین موضوعہ" کے عنوان سے جانا جاتا ہے جو قانون گذاری اداروں میں تصویب ہوتے ہیں، لیکن اسلامی ثقافت میں اور فقہی اصطلاحات میں متغیر احکام وہی سلطنتی احکام ہیں جن کو معین کرنا ولی فقیہ کے دائرہ اختیار میں ہے اور ولی فقیہ ہی معاشرہ کے مختلف حالات کے لحاظ سے ان کو معین کرے اور ان کو نافذ کرے، اور کم سے کم مصوب شدہ قوانین کو جاری کرنے کے لئے ولی فقیہ کی تائید ضروری ہے البتہ کبھی ولی فقیہ بطور مستقیم قوانین اور مقررات کو معین اور مصوب کرتا ہے، اور کبھی اپنے ان مشاورین کے ذریعہ جو مدنظر مسائل میں کافی مہارت اور تجربہ رکھتے ہیں ان کے ذریعہ قوانین مصوب کرتا ہے، اور ضروری بحث وگفتگو کے بعد قوانین طے پاتے ہیں بہر حال موضوعہ قوانین ومقررات کا اعتبار ولی امر مسلمین کی اجازت اور اس کی موافقت پر ہوتا ہے، ورنہ تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

قارئین کرام! اس بات پر توجہ رہے کہ ولی امر مسلمین اور دوسرے قانون گذار اداروں کو اس بات کا ذرہ بھی حق نہیں ہے کہ وہ اسلامی اصول قواعد اور اسلامی اقدار کو مدنظر رکھے بغیر اپنی مرضی سے کوئی متغیر قانون بنائیں دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قوانین موضوعہ اور متغیر قوانین کو بھی اسلامی اصول اور اسلامی ثابت اور کلی احکام کے تحت ولی فقیہ اور فقہی مسائل کے ماہرین (جو اس سلسلہ میں کافی مہارت رکھتے ہوں اور ان قوانین کے مصداق کو بخوبی مشخص اور معین کر سکتے ہوں)؛ کے ذریعہ طے ہونا چاہئیں؛ نیز ان کو مصوب کرنے میں اسلامی اقدار کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے اسی وجہ سے قوانین کلی کی حدود کو معین کرنا اور ان کے مصادیق اور موضوعہ قوانین پر منطبق کرنا اسی طرح اسلامی اقدار کا موضوعہ قوانین پر تطبیق کرنا ایک مشکل کام ہے جس میں بہت زیادہ دقت اور فقہی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، جمھوری اسلامی ایران کے بنیادی قوانین میں موجود ہے کہ اسلامی پارلیمنٹ کے ذریعہ بنائے ہوئے قوانین کو "شوریٰ نگہبان" (جو برجستہ مجتہدین اور حقوق داں حضرات سے مل کر بنتی ہے)؛ کے ذریعہ تائید ہوں تا کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ خدانخواستہ یہ قوانین اسلامی اصول کے مخالف تو نہیں ہیں؟

2۔ احکام اولیہ اور احکام ثانویہ

احکام ثانویہ اسلام سے ٹکراتے ہیں (ایک اعتراض (بعض لوگ تصور کرتے ہیں کہ وہ احکام سلطنتی، وقتی اور وہ قوانین جو زمانہ اور حالات کے لحاظ سے وضع کئے جاتے ہیں بعض موارد میں اسلامی احکام کے مخالف ہوتے ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام الناس صرف اسلام کے احکام اولیہ کو اسلامی احکام جانتے ہیں اور وہ اس چیز سے غافل ہیں کہ اسلام نے مجبوری اور ضرورت کے وقت احکام ثانویہ بھی وضع کئے ہیں اور وہ بھی احکام شرعی شمار ہوتے ہیں۔

وضاحت: اسلام کے اولیہ احکام جو عام حالات کے لئے وضع کئے گئے ہیں ان کے علاوہ دوسرے احکام بھی اسلام نے وضع کئے ہیں جو مجبوری اور ضرورت کے وقت کے لئے ہوتے ہیں جن کو احکام ثانوی کہا جاتا ہے اور یہ احکام ثانوی کچھ تو قرآن مجید اور سنت نبوی میں ذکر ہوئے ہیں لیکن ان میں سے بعض دینی کتابوں میں ذکر نہیں ہوئے ہیں، ان کو وضع کرنا ولی امر مسلمین کے اختیار میں ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر نماز پڑھنے کے لئے وضو کرنا واجب ہے یا اگر ہم پر غسل واجب ہے تو نماز کے لئے غسل کرنا واجب ہے وضو اور غسل کا وجوب احکام اولیہ اور عام حالات سے متعلق ہیں کہ جب مثلاً ہمارا بدن سالم ہو اور پانی ہمارے لئے نقصان دہ نہ ہو اور پانی موجود بھی ہو لیکن اگر کوئی مجبوری پیش آجاتی ہے یا کسی بیماری کی وجہ سے وضو یا غسل کرنا ممکن نہ ہو، مثلاً پانی موجود نہ ہو یا اگر پانی موجود ہے تو وہ نقصان دہ ہے، تو اس صورت میں وضو یا غسل واجب ہونے کی جگہ وجوب تیمم جو حکم ثانوی ہے؛ اس کی جگہ آجاتا ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کے پاس پانی نہ ہو یا پانی بدن کے لئے نقصان دہ ہو تو وضو یا غسل کے بدلے تیمم کرنا ضروری ہے۔

جب احکام اولی اور احکام ثانوی جن کو احکام اضطراری بھی کہا جاتا ہے؛ قرآن مجید اور روایات میں ذکر ہوئے ہیں تو ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پاتے چونکہ حکم اولیہ (جیسے وضو یا غسل) کا موضوع اس وقت ہے جس وقت پانی ہمارے پاس موجود ہو اور وہ نقصان دہ بھی نہ ہو، اور احکام ثانوی یعنی تیمم اس شخص کے لئے ہے جب کسی شخص کے پاس پانی نہ ہو یا پانی اس کے بدن کے لئے نقصان دہ ہو؛ اسی وجہ سے بعض لوگوں کو وضو کرنے کا حکم ہے اور بعض لوگوں کو تیمم کرنے کا حکم ہے لیکن بعض مقامات پر احکام اولی کے مقابلہ میں جو مجبوری اور اضطراری وقت کے لئے ہوں خاص احکام شریعت میں ذکر نہیں ہوئے ہیں تو یہیں پر اسلام کے احکام اولی جاری کرنے کو کہا جاتا ہے، مگر یہ کہ باعث عسر وحرج ہوں؛ کیونکہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ بندگان خدا اپنے وظیفہ پر عمل کرنے میں غیر قابل تحمل مشقت اور حرج میں گرفتار ہوں، جیسا کہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِي الدِّينِ مِنۡ حَرَجٍ۔ [1]

"اور دین میں کوئی زحمت نہیں قرار دی ہے۔"

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ۔ [2]

"خدا تمہارے بارے میں آسانی چاہتا ہے، زحمت نہیں۔"

قارئین کرام! ہمارے گذشتہ مطالب کے پیش نظر فقہاء کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنے وظیفہ اور حکم شرعی پر عمل کرنے سے عسر وحرج میں مبتلا ہو تو خداوند عالم اس وظیفہ کو اٹھالیتا ہے قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ بعض مقامات پر احکام اولی کا بدل احکام

---

[1] سورہ حج آیت ۷۸

[2] سورہ بقرہ آیت ۱۸۵

ثانوی شریعت میں بیان ہوا ہے لیکن بعض موارد میں احکام ثانوی اور اضطراری شریعت میں بیان نہیں ہوئے ہیں، لیکن ولی فقیہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر احکام اولیہ پر عمل کرنا ممکن نہ ہو اور عوام الناس کے لئے باعث عسر و حرج ہو تو اس صورت میں عوام الناس کا وظیفہ معین کرے لہٰذا جو کچھ بھی ولی فقیہ اسلامی اصول و قوانین کے تحت حکم بیان کرے تو وہ احکام ثانوی اور اسلامی حکم ہوگا؛ کیونکہ اس نے اس (ولی فقیہ) کو جب عسر و حرج کی صورت میں تکلیف اولی اٹھالی جائے تو عوام الناس کے وظیفہ اور عمل کو معین کرنے کا حکم دیا ہے۔

لہٰذا چونکہ بعض لوگ صرف اسلام کے احکام اولی سے آشنائی رکھتے ہیں اسی وجہ سے یہ تصور کرتے ہیں کہ اسلامی احکام صرف یہی ہیں، اور اگر ولی امر مسلمین یا اسلامی حکومت کے دوسرے قانون گذار اداروں سے اسلام کے احکام اولی کے خلاف قانون بنا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ قانون اسلام کے مخالف ہے جبکہ وہ قانو احکام شرع اور اسلام کے مخالف نہیں ہے بلکہ اسلام کے اولیہ احکام کے مخالف احکام کو احکام ثانوی میں شمار کیا جاتا ہے اور بے شک احکام ثانوی (بھی) اسلامی احکام مانے جاتے ہیں جس طرح اسلام نے حکم دیا ہے کہ مسافر کو روزہ نہیں رکھنا چاہئے اور جو مسافر نہیں ہے (اگر دوسرے شرائط موجود ہیں) تو اس کو روزہ رکھنا چاہئے اور کوئی مسافر کے روزہ نہ رکھنے کو اسلامی احکام کا مخالف شمار نہیں کرتا، کیونکہ خود اسلام نے صاف طور پر ارشاد فرمادیا ہے کہ جو شخص مسافر یا مریض ہے اس پر روزہ واجب نہیں ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا.[1]

اسی طرح احکام اجتماعی، مدنی، جزائی، تجارتی اور دوسرے معاملات میں اگر احکام اولی کے مطابق عمل کرنا ممکن نہ ہو اور موجب عسر و حرج ہو تو وہ حکم ثابت نہیں رہے گا اور خاص قواعد اور مقررات کے تحت ولی امر مسلمین زمان و مکان کی حالات کی بنا پر نئے قوانین کو وضع کرتا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ قوانین اسلامی احکام کے مخالف نہیں ہوں گے، بلکہ (اگر ہوں گے بھی تو) اسلامی اولی احکام کے مخالف ہوں گے اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اسلام کے احکام "احکام اولی" اور "احکام ثانوی" دونوں کو شامل ہوتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں درپیش جدید تقاضوں کے تحت جو ہمیشہ اجتماعی حالات کے بنا پر رونما ہوتے ہیں (مثلاً ٹریفک کی سہولت کے لئے اور گاڑیوں کی بھیڑ سے بچنے کے لئے سڑکوں کو چوڑا کرنا یا میونسپلٹی "Municipality" کو صفائی یا شہر کو خوبصورت بنانے کے لئے پیش آنے والی ضرورتیں، یا محکمہ آب اور بجلی کی دیگر ضرورتیں جو قدیم زمانہ میں نہیں تھیں) یا آج کل کی ترقی کے پیش نظر معاشرہ کی وہ ضرورتیں جن کو خود عوام الناس پورا نہیں کرسکتے اور گذشتہ زمانہ کی ضرورتوں کی طرح نہیں

---

[1] (سورہ بقرہ آیت 185) "لہٰذا جو شخص اس ماہ میں حاضر رہے اس کا فرض ہے کہ روزہ رکھے (لیکن) جو مریض یا مسافر ہو وہ اتنے ہی دن دوسرے زمانہ میں روزہ رکھے خدا تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے زحمت نہیں چاہتا"۔

ہیں کہ جن کو خود عوام الناس انجام دیا کرتے تھے، تو ان تمام صورتوں میں متعلقہ محکمہ جات کا ضروری قوانین بنانا ضروری ہے ہماری گفتگو یہ ہے کہ یہ قوانین بغیر کسی اصل کے نہیں ہیں اور بے حساب و کتاب لوگوں کی اپنی مرضی سے نہیں بن جاتے؛ بلکہ یہ قوانین اور احکام ثانوی اسلامی عام قوانین کے تحت ہونے چاہئیں اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ احکام ثانوی اہم کو مہم پر ترجیح دینے کی طرح ہوں، یا ان قوانین کو زمان و مکان کے حالات کے پیش نظر بنایا جائے جیسا کہ ہمارے ملک میں یہ احکام ثانوی "مجلس شوریٰ اسلامی" میں اور ولی فقیہ کی اجازت سے بنائے جاتے ہیں اس صورت میں یہ احکام؛ اسلامی احکام سے باہر نہیں ہوتے (یعنی ان کو اسلامی احکام میں شمار کیا جاتا ہے) کیونکہ یہ تمام قوانین ولی امر مسلمین کے حکم سے بنائے جاتے ہیں، یا دوسرے خاص قوانین جیسے قاعدۂ "عسر و حرج" یا قاعدہ "لا ضرر" یا ان دوسرے قواعد کے تحت جو فقہی کتابوں میں وارد ہوئے ہیں؛ کے تحت یہ احکام ثانوی بنائے جاتے ہیں۔

قارئین کرام! یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلامی حکومت میں قوانین کو یا اسلامی منابع؛ جیسے قرآن کریم اور سنت نبوی سے لئے جاتے ہیں (اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ عقل بھی اسلامی منابع میں شمار ہوتی ہے اور "مستقلات عقلیہ" اور احکام قطعی عقل معتبر ہوتے ہیں اور فقہی اصطلاح میں حکم قطعی عقل کے ذریعہ خداوند عالم کے ارادہ تشریعی کو کشف کیا جا سکتا ہے کہ یہ حکم عقل بھی خداوند عالم کے ارادہ اور اس کی مرضی سے متعلق ہے اسی وجہ سے یہ حکم "اسلامی حکم" ہوگا) یا کسی بھی طریقہ سے قرآن و سنت میں بیان شدہ عام احکام کے تحت واقع ہونے چاہئیں اسی وجہ سے یہ بہانہ کرتے ہوئے کہ اسلامی حکومت کے بعض قوانین اور مقررات ناپائیدار اور تغیر پذیر؛ قرآن مجید اور سنت نبوی میں ذکر نہیں ہوئے ہیں، لہٰذا قرآن مجید اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور عوام الناس کی مرضی کے مطابق قوانین بنائے جائیں اسلام کے ثابت احکام پر ہمیشہ عمل ہونا چاہئے اور احکام متغیر ہمیشہ اسلامی اصول، احکام ثابت اور عام قوانین کے تحت ولی فقیہ یا اس کی طرف اذن یافتہ لوگوں کے ذریعہ بنائے جائیں۔

3۔ ڈیموکریٹک حکومتوں کے نقائص

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ حکومت کی مشکل ایک "مثلث القاعدہ" زاویہ کی طرح ہے جس کے تین پہلو ہوتے ہیں:

1۔ قوہ مقننہ (پارلیمنٹ)،

2۔ قوہ قضائیہ (عدلی)

3۔ قوہ مجریہ (حکومت)

اور حکومت کی یہ شکل "منٹسکیو" سے شروع ہوئی اور رائج ہوتی چلی گئی۔

بہر حال اگرچہ اس (ہماری) حکومت بھی تین قدرتوں سے تشکیل پائی ہے لیکن اس بات کی کوئی گارانٹی نہیں ہے کہ آئندہ بھی اسی طریقہ سے باقی رہے کیونکہ آئندہ زمانہ کی ترقی کے پیش نظر یا اجتماعی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے حکومت کی شکل

بدل سکتی ہے مثال کے طور پر حکومیت کی قدرتوں میں اضافہ ہو جیسا کہ "مربع القاعدۃ" ہو جائے یا مخمس القاعدۃ" ہو جائے لیکن توجہ رہے کہ اصل اور بنیادی قاعدہ یہ کہ حکومت کو تشکیل دینے والی تمام قدرتیں مرکز کی طرف منتھی ہوتی ہوں یعنی جب حکومتی صورت کو جو مختلف قدرتوں سے تشکیل پاتی ہے تو مثلث القاعدہ ھرم سے تشبیہ کرتے ہیں تو اگر اس ھرم کے اوپر سے نیچے کی طرف آئیں تو اس کا دائرہ زیادہ ہو جائے گا یہاں تک کہ اس قاعدہ ھرم اور اس کے نیچے حکومتی بہت سے ادارے دکھائی دیتے ہیں لیکن ھرم کے نیچے سے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جائیں تو پھر حکومتی قدرت اور حکومتی ادارے متمرکز اور جمع ہوتے ہوئی دکھائی دیں گی، یہاں تک کہ تمام قدرتیں اس ھرم کے سرے تک پہنچ جائیں گی، اور سب ایک نقطہ میں سما جائیں گی، اور وہ وسیع اور متفرق قدرت بسیط اور وحدت کی شکل میں دکھائی دے گی۔

ھرم قدرت میں اس کے علاوہ کے مثلث القاعدہ قدرتیں اس نقطہ کی طرف منتھی ہوتی ہیں جو اس کے مرکز میں ہوتا ہے اور وہی نقطہ تمام قدرتوں کا مرکز ہوتا ہے اور حکومتی تمام تر قدرت اور اختیارات بسیط ہو کر وہاں جمع ہو جاتے ہیں، اور چونکہ حکومتی قدرت اور اختیارات وہاں سے تقسیم ہو کر مختلف شکلوں: قانون گذاری، عدلیہ اور اجرائی شعبوں میں پھیل جاتی ہے اور ان میں سے ہر قدرت اپنے خاص مراتب سے سروکار رکھتی ہے۔

اس وقت دنیا بھر کے ممالک میں حکومت کی اسی شکل وصورت کو قبول کیا گیا ہے جس میں تین قدرتیں ہوتی ہیں: قانون گذاری، عدلیہ اور اجرائی پاور، لیکن ان تینوں قدرتوں کا ایک نقطہ میں جمع ہونا واضح طور پر نہیں دکھائی دیتا؛ یعنی ان حکومتوں میں اصل یہ ہے کہ حکومت مستقل تین حصوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک قدرت کا ایک حصہ قوہ مجریہ (حکومت) میں چلا جاتا ہے اور ایک حصہ قانون گذاری میں اور تیسرا حصہ عدلیہ کا ہوتا ہے؛ اور ان میں نہ قوہ مجریہ دوسری قدرتوں میں دخالت کرتی ہے اور نہ دوسری قدرتیں قوہ مجریہ میں دخالت کرتی ہیں اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ان قدرتوں میں عملی طور پر استقلال دکھائی نہیں دیتا، اور بہت سے وہ موارد جو اجرائی اور نفاذ کا حکم رکھتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو قوہ مجریہ کے تحت ہونا چاہئے لیکن ان کی اہمیت کے پیش نظر قانون گذار پاور کی دخالت کو معتبر سمجھا جاتا ہے مثال کے طور پر بین الاقوامی سطح نیز دو ملکوں کے درمیان ہونے والے مہم معاھدات، حالانکہ یہ چیزیں اجرائی پہلو رکھتی ہیں لیکن ان کے بارے میں پہلے پارلیمنٹ پاس کرے تب وہ معاھدات انجام پاتے ہیں، اور یہیں پر قوہ مجریہ میں پارلیمنٹ کی دخالت دکھائی دیتی ہے۔

دوسری طرف حکومتی کابینٹ "Cabinet" "بعض قوانین اور مقررات کو تصویب کرتی ہے، اور ان کو نافذ کرتی ہے اگرچہ ان پر قانون کے عنوان کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن قانونی ماہیت رکھتے ہیں اور ان کا طے کرنا پارلیمنٹ کے مخصوص کام میں سے ہے لیکن بنیادی قوانین میں موجود بعض وجوہات کی بنا پر اس کو طے کرنا حکومت کے عھدہ پر ہوتا ہے اسی وجہ سے قانون گذاری کا ایک حصہ حکومت کے سپرد کیا جاتا ہے لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ حکومت پارلیمنٹ میں دخالت کرتی ہے بہر حال مختلف ممالک میں کم و بیش قدرتیں ایک دوسرے میں دخالت کرتی ہیں، اور یہ محدود دخالت اس وجہ سے بھی ہے کہ چونکہ حکومتیں ایک دوسرے سے مل

کر ایک حکومت کو تشکیل دیتے ہیں، اور اگر یہ بالکل ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں تو گویا اس کا اتحاد ختم ہو جائے گا۔

4۔قدرتوں میں ہم آہنگ کرنے کے اسباب کا ہونا ضروری ہے

اگر چہ حکومت تین قدرتوں (قوہ مجریہ، قوہ عدلیہ اور قوہ مقننہ) سے تشکیل پاتی ہے لیکن ان تینوں قدرتوں میں ایک دوسرے سے رابطہ ضروری ہے، اور چونکہ انہیں ان تینوں قدرتوں سے مل کر ہی حکومت بنتی ہے تو ان قدرتوں کے لئے کچھ ایسے اسباب ہونا ضروری ہیں جن کے درمیان اتحاد اور وحدت قائم رہے لیکن دنیا بھر کے ممالک میں ان قدرتوں میں ہم آہنگ کرنے والی قدرت نہ ہونے کی بنا پر ان کے درمیان میں ناہماہنگی دکھائی دیتی ہے جس کی بنا پر ملک میں بحرانی حالات پیدا ہو جاتے ہیں اس طرح کے بحران سے بچنے کے لئے بعض حکومتوں میں بہت سی راہ حل پیش کی گئی ہیں جن میں سے صدر مملکت کے لئے "حق وٹو" "Veto" رکھا جاتا ہے: مثال کے طور پر اگر چہ پارلیمنٹ کو قوانین بنانے اور ان کو طے کرنے کا حق ہوتا ہے، اور پارلیمنٹ اسی ذمہ داری کے تحت ممبر آف پارلیمنٹ (کسی بھی قانون بنانے کے لئے) بہت بحث وگفتگو کے بعد قوانین بناتے ہیں، اس کے بعد وہ قوانین "مجلس سنا" "S'enat" کے ذریعہ تائید ہوتے ہیں لیکن چونکہ صدر مملکت کے لئے حق وٹو ہوتا ہے (تو اگر وہ قوانین ناقص ہوتے ہیں تو) صدر مملکت ان کو روک دیتا ہے چاہے کچھ ہی مدت کے لئے ہی کیوں نہ ہو اور ان کو نافذ نہیں ہونے دیتا اگر قوانین بنانا پارلیمنٹ کا حق ہے اور قوہ مجریہ (صدر مملکت) کو پارلیمنٹ میں دخالت کرنے کا حق نہیں ہے، تو پھر پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین کو قوہ مجریہ کسی طرح روک دیتا ہے اور ان کو نافذ نہیں ہونے دیتا؟ پس معلوم یہ ہوا کہ قدرتوں کا استقلال مکمل طور پر عملی نہیں ہوتا اور عملی طور پر پارلیمنٹ اور حکومت کے وظائف میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

اسی طرح ان قدرتوں میں ہم آہنگ کرنے والے اسباب کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے ممالک میں سیاسی، پارٹی اور گروہی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جس کی بنا پر قدرتوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور ممکن ہے کہ بعض مواقع پر حالات اس قدر بگڑ جائیں کہ ملک میں کوئی حکومت ہی نہ ہو اور عملی طور پر حکومت ختم ہو جائے مثال کے طور پر اگر کوئی حکومت بنے اور قدرت اپنے ہاتھ میں لے لے، لیکن ایک مدت کے بعد پارلیمنٹ میں اس کے لئے اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور حکومت ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے بعد (جلد) کوئی حکومت نہ بن سکے، کیونکہ جو شخص بھی وزیر اعظم بننا چاہتا ہے اور اس کے لئے وزراء کا بینٹ "Cabinet" بنانا چاہے تو اگر ممبر آف پارلیمنٹ کا اعتماد کا ووٹ حاصل نہ کر سکے؛ کیونکہ پارلیمنٹری حکومتوں میں صرف وہی پارٹی حکومت بنا سکتی ہے جس کے پارلیمنٹ میں ممبروں کی اکثریت ہو یا دوسری پارٹی کے ممبروں کو شامل کر کے اپنی اکثریت ثابت کر دے۔

اور جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ انہیں آخری چند سالوں میں ہمارے پڑوسی ملک میں کافی مدت تک حکومت نہ تھی؛ کیونکہ جو شخص بھی وزیر اعظم بننا چاہتا تھا اس کو اعتماد کا ووٹ ہی نہیں ملتا تھا البتہ کسی نہ کسی طریقہ بہت سے حکومتی امور انجام پاتے ہیں لیکن چونکہ جب وزیر یا معاون وقتی (عبوری) ہوں تو ان کو کاموں میں زیادہ دل چسپی نہیں ہوتی؛ اور مثال

کے طور پر اگر کسی ملک میں چھ ماہ تک بغیر دل چسپی کے کام کیا جائے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس ملک کا کتنا نقصان ہوگا۔

بعض ملکوں میں صدر مملکت کو یہ حق ہوتا ہے کہ چاہے وقتی طور پر ہی صحیح پارلیمنٹ کو مختل کردے، اور یہیں حکومت کا پارلیمنٹ میں دخالت کرنا ظاہر ہوتا ہے یہاں تک بعض مواقع پر تو پارلیمنٹ کو مختل کردیا جاتا ہے ظاہری بات ہے کہ اس طرح کی دخالتیں اختلاف، جھگڑوں اور بعض حالات میں شدید بحرانی حالات پیدا ہونے کا باعث ہو جاتا ہے، اس کی علت یہ ہے کہ یا تو ان حکومتوں میں ان بحرانی حالات سے نپٹنے کے لئے کوئی راہ حل پیش نہیں ہوتا یا اگر وہ راہ حل پیش بھی کیا گیا ہے تو وہ اتنا زیادہ کارآمد نہیں ہوتا: مثلاً بعض حکومت میں صدر مملکت کے ہاتھوں میں حکومتی نظام نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک تشریفاتی عہدہ ہوتا ہے (جیسا کہ خود ھندوستان میں ہوتا ہے) لیکن اگر ملک میں بحرانی حالات پیدا ہو جائیں تو پھر صدر ہی حکومتی امور کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے اور اس بحرانی کیفیت کو ختم کرتا ہے درحقیقت اپنا کردار بحرانی حالات میں نمایا کرتا ہے۔

5۔ولایت فقیہ حکومت کو ہم آہنگ کرنے والی طاقت

قارئین کرام! یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس وقت جبکہ بہت سے ممالک میں بحرانی حالات سے نپٹنے کے لئے بعض راہ حل پیش کئے گئے ہیں لیکن کوئی بھی ضروری طور پر کارآمد نہیں ہے، اور ان قدرتوں کے درمیان ایک دوسرے میں دخالت کرنے والی جیسی برائی باقی ہے لیکن نظام ولایت فقیہ میں (کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض خود غرض مؤلفین اور بے انصاف زرخرید اہل قلم (اس ولایتِ فقیہ کو بھی) ارتجاعی (قدیم زمانہ کی طرف لوٹانا) کے نام سے ینچواتے ہیں) اس طرح کے اسباب فراہم ہیں تاکہ ملک میں بحرانی حالات سے نجات دے، اور نظام کو ہر ممکن پریشانی سے نجات مل جائے اور ملک کو کوئی نقصان نہ پہنچے ہمارے ملک میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح قوہ مجریہ ہے جس میں صدر مملکت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اسی طرح پارلیمنٹ اور عدلیہ بھی ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور مستقل ہے، لیکن یہ تمام (قدرتیں) اس ایک نظام کی قدرتیں ہیں، اور ایک دوسرے سے ربط رکھتے ہیں جو ایک مرکزی نقطہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جو شخص اس نظام میں نقطہ مرکزی اور اصلی ہوتا ہے وہ قدرت کے بلندترین مقام پر ہوتا ہے وہ ولی فقیہ ہوتا ہے جو تمام قدرتوں میں اتحاد اور وحدت ایجاد کرتا ہے۔

برخلاف دوسری حکومتوں میں کوئی ایسا محور نہیں پایا جاتا جو ان قدرتوں میں ہم آہنگی اور وحدت ایجاد کرے اور اگر ان حکومتوں میں کوئی ایسا راہ حل بھی پیش کیا گیا ہے تو وہ بہت ضعیف اور کمزور ہے، نظام ولایت فقیہ میں مذکورہ تینوں قدرتیں ایک مرکزی نقطہ (ولی فقیہ) کے زیر سرپرستی ہوتی ہیں درحالیکہ وہ بنیادی قانون کا بھی حافظ ہوتا ہے اور اسلامی احکام، اقدار اور انقلابی اہداف کا بھی محافظ اور نگہبان ہوتا ہے؛ اسی طرح مذکورہ تینوں قدرتوں کو متحد اور ہم آہنگ رکھتا ہے اور سبھی کو وحدت، دوستی اور ہمدلی کی دعوت دیتا ہے اور اختلافات سے محافظت کرتا ہے اگر اتفاقی طور پر ملک میں کوئی بحرانی صورت حال پیدا ہو گئی ہے تو یہی اختلافات کو دور کرکے ملک کو بحرانی صورت حال سے نجات عطا کرتا ہے۔

انقلاب اسلامی کے بعد سے بیس سال کے عرصہ میں چاہے حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ ہو یا مقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کا زمانہ ہو؛ خواستہ یا نخواستہ معاشرہ میں اختلافات کی وجہ سے ملک میں متعدد بار بحرانی صورت حال پیدا ہونے والی تھی لیکن اگر (ولی فقیہ کی) حکیمانہ تدبیریں نہ ہوتیں تو واقعاً ملک کبھی کا بحران کی نذر ہو جاتا جیسا کہ آج کل ترکی، پاکستان، بنگلا دیش اور افغانستان میں بحرانی صورت حال ہے الحمد للہ اس عظیم اور خدا داد نعمت کی برکت سے اور اس لطف و مہربانی اور اس محبت کی وجہ سے جو ان کے اور عوام الناس کے درمیان موجود ہے اس طرح کے بحرانی صورت حال سے نجات ملتی رہتی ہے۔

6۔ دوسری حکومتوں پر ولایت فقیہ نظام کے امتیازات

قارئین کرام! یہاں پر ہمارا اپنی اس اسلامی حکومت کا دوسری ان ڈیموکریٹک حکومتوں سے مقائسہ (مقابلہ) کرنا مناسب ہے جو آج کل کی پیشرفتہ حکومتیں جانی جاتی ہیں؛ اس اسلامی حکومت کے دوسری حکومت کے مقابلہ میں امتیازات اور خصوصیات بیان کریں:

الف۔ اندورنی انسجام و یگانگت

ہماری حکومت کا سب سے پہلا امتیاز اور خصوصیت اندورنی انسجام و وحدت ہے جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ تمام ڈیموکریٹک حکومتوں میں ڈیموکریسی کی سب سے بڑی پہچان قدرتوں میں استقلال اور ایک دوسرے میں دخالت نہ کرنا مانا جاتا ہے ہم نے ان حکومتوں کے کچھ اندرونی تعارض اور ٹکراؤ کو بیان کیا اور کہا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ مذکورہ قدرتوں کو ایک دوسرے میں دخالت نہیں کرنا چاہئے لیکن عملی میدان میں کوئی ایک بھی ایسا ملک نہیں ہے جس میں مذکورہ قدرتیں ایک دوسرے سے مکمل طور پر مستقل ہوں اور ایک دوسرے میں دخالت نہ کرتی ہوں، اور قانونی طور پر قدرتوں کے لئے ایک دوسرے میں دخالت کا ذرا بھی اختیار نہ ہو، غیر قانونی دخالت، خلاف ورزیوں اور تحت فشار قرار دینے کے علاوہ؛ ہم عملی طور پر دیکھتے ہیں کہ (جب) قدرت ایک طاقت کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اپنی تمام تر طاقت کے بل بوتہ پر دوسری طاقت کو تحت فشار قرار دیتی ہے جب پولیس اور فوجی طاقت؛ اسی مالی، اقتصادی امکانات، پورے ملک کا خرچ حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو پھر دوسری قدرتیں اس سے متاثر ہوں گی اور صدر یا وزیر اعظم اگر اپنی قدرت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ دنیا بھر کی تمام ڈیموکریسی حکومتوں میں ایک قسم کی تفرقہ اور ناہماہنگی پائی جاتی ہے، لیکن ہماری حکومت میں درحالانکہ تینوں قدرتوں میں اتحاد اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اپنے اپنے اختیارات میں مستقل ہیں اور ان کے درمیان ناہماہنگی اور تفرقہ بھی نہیں پایا جاتا؛ کیونکہ ہماری حکومت میں ایک ایسا وحدت بخش سبب (ولایت فقیہ) پایا جاتا ہے جو تینوں قدرتوں کی سرپرستی کرتا ہے، ان میں انسجام اور وحدت برقرار رکھتا ہے، اور اس نظام اور حکومت کا اصلی محور ہونے کی وجہ

سے بحرانی صورت حال پیدا ہونے سے روکے رکھتا ہے یہاں تک کہ ہم نے متعدد بار دیکھا کہ کس طرح مقام معظم رہبری حضرت آیت العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی نے کس طریقہ سے مختلف عہدہ داروں کے درمیان ہونے والے اختلافات کا خاتمہ کیا ہے اور اگر کبھی بحرانی صورت حال پیدا ہونے کی راہ ہموار ہو بھی گئی ہے تو قانونی طور پر صدر جمہوری نے مقام معظم رہبری سے درخواست کی کہ اپنی قدرت کے ذریعہ اس بحران سے روک تھام فرمائیں، اور موصوف نے بہترین طریقہ سے بحرانی صورت حال پر کنٹرول فرمایا ہے ولی فقیہ اگر چہ براہ راست کسی بھی ایک قدرت کا عہدہ دار نہیں ہے لیکن تینوں قدرتوں کے عہدہ دار یا براہ راست اس کے ذریعہ نصب ہوتے ہیں یا بنیادی قانون کے مطابق یہی عوام الناس کی رائے کو نافذ کرتا ہے اور اسی کے نصب اور نافذ کرنے سے تینوں قدرتوں کے عہدہ داران مشروعیت پیدا کرتے ہیں۔

ب۔ روحی اور اندرونی نفاذ کی ضمانت

دوسری حکومتوں پر ہماری حکومت کا ایک امتیاز یہ ہے کہ عوام الناس کے درمیان روحی اور اندرونی نفاذ کی ضمانت ہے اور یہ چیز اسلامی حکومت کے قوانین اور مقررات کی اطاعت کرنے کی ذمہ داری کے احساس سے حاصل ہوتی ہے اس طرح کی ضمانت اور کنٹرول دوسری حکومتوں میں موجود نہیں ہے اور تقریباً تمام ہی حکومتوں میں طاقت کے زور پر قوانین کو نافذ کیا جاتا ہے اور جہاں پر عوام الناس میں آزادی کا احساس ہو جائے یا وہ کنٹرول وغیرہ کم ہو جائے تو پھر اس پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

آپ حضرات نے مکرر سنا ہوگا کہ یورپی ممالک میں قوانین کی رعایت بہت زیادہ کی جاتی ہے، مغربی اور یورپی ممالک میں عوام الناس آٹومیٹک طریقہ سے قوانین اور مقررات کی رعایت کرتے ہیں اور ٹیکس وغیرہ ادا کرتے ہیں اور اس طرح کا یہ ظاہری نظم و انضباط اس ترقی یافتہ حکومت کے کنٹرول کی وجہ سے ہوتا ہے کہ جس کی بنا پر عوام الناس قوانین کی رعایت کرتے ہیں اور مالیات اور ٹیکس وغیرہ ادا کرتے ہیں اور بہت ہی کم لوگ قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں پر ٹیکس وغیرہ حاصل کرنے کا سسٹم چند صدیوں سے چلا آرہا ہے خصوصاً اس نصف صدی میں خاصا تجربہ ہوا ہے اور کمپیوٹر وغیرہ کے ذریعہ بہترین سسٹم بنایا گیا ہے اور اسی بنا پر مختلف طریقوں سے ٹیکس وغیرہ حاصل کیا جاتا ہے اور عام طور پر عوام الناس آسانی سے ٹیکس ادا کرتے ہیں لیکن بڑی بڑی کمپنیاں جو حکومتی ملازمین سے ساز باز کئے رہتے ہیں وہ ٹیکس نہ ادا کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

قارئین کرام! ہم یہاں پر، جو لوگ مغربی کلچر کے عاشق ہیں اور وہاں کے نظم و مدنیت کا شور مچاتے ہیں، ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں: مغربی ممالک کی بہت سی مدح اور تعریفیں صرف ایک نعرہ سے ہوتی ہیں جن میں حقیقت اور واقعیت نہیں ہوا کرتی مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مغربی ممالک میں ڈرائیور قوانین کی بھرپور رعایت کرتے ہیں اور بہترین طور پر نظم و انضباط کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ جبکہ یہ صرف ایک دعویٰ ہے، ہم یہاں پر مذکورہ دعویٰ کو باطل کرنے کے لئے ایک نمونہ پیش کرتے ہیں: ہم امریکہ کی "فیلاڈلفیا یونیورسٹی" کی طرف سے ایک تقریر کے لئے مدعو ہوئے اور جب ہم

"نیویورک" سے "فیلاڈلفیا" کی طرف چلے تو راستہ میں مختلف شہروں کا دیدار کیا اسی راستے میں ہم نے دیکھا کہ گاڑی کا ڈرائیور اپنی گاڑی کے آگے کوئی چھوٹی سی مشین رکھتا ہے اور کچھ دیر بعد اس کو گاڑی کے داش بورڈ "Dash board" میں رکھ دیتا ہے اور کچھ دیر بعد پھر اسی طرح کرتا ہے، ہمارے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ اس سے معلوم کریں کہ یہ کس لئے ہے؟

تو اس نے بتایا کہ امریکہ میں 90 میل فی ساعت کی رفتار سے زیادہ گاڑی چلانا ممنوع ہے اور پولیس نے خلاف ورزی سے روک تھام کے لئے سڑک پر "راڈار" لگا دیئے ہیں جن کے ذریعہ سے جو لوگ غیر مجاز رفتار سے زیادہ گاڑی چلاتے ہیں ان کو پکڑ کر جرمانہ لگائے اس کے علاوہ خود بھی سڑک کے کنارے کمین لگائے بیٹھے رہتے ہیں تا کہ خلاف ورزی کرنے والوں پر جریمہ لگا سکے اور چونکہ گاڑیوں کی رفتار پولیس کے ذریعہ نصب شدہ راڈار کے ذریعہ کنٹرول ہوتی ہیں اسی وجہ سے بعض ماہرین نے ایسی مشین بنائی ہے جو اس راڈار کو اندھا کر دیتی ہیں اور اس وقت یہ مشین بازار میں آسانی کے ساتھ خرید و فروخت ہوتی ہے اسی وجہ سے راستہ میں پولیس لگی ہوئی ہوتی ہے تا کہ جو اس مشین کے ذریعہ ان کے راڈار کو اندھا کر کے بہت زیادہ رفتار سے گاڑی چلاتے ہیں ان کو روک کر جرمانہ لگا سکے، لہٰذا اس مشین کے لگانے کے بعد کسی بھی رفتار سے گاڑی چلا سکتے ہیں اور جب پولیس کے چک پوسٹ سے نزدیک ہوتے ہیں اس کو اتار کر چھپا دیتے ہیں اور پھر دوبارہ اس کو لگا دیتے ہیں!

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہ لوگ قوانین پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اور قوانین کے محافظ پولیس کے کنٹرول کو بے اثر کرنے کے لئے ایک مشین ایجاد کرتے ہیں تا کہ پولیس کے راڈار کو اندھا کر دیں اور اس مشین کو امریکی بازاروں میں کافی مقدار میں خرید و فروخت کرتے ہیں اس وقت ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ امریکہ میں ایسا ترقی یافتہ کلچر ہے جس کی بنا پر عوام الناس اپنی مرضی اور رغبت سے قوانین پر عمل کرتے ہیں اور وہاں بہترین نظم و انضباط برقرار ہے وارداتیں وہاں پر جو مختلف ہوتی رہتی ہیں اس کی خبر ہم تک پہنچتی رہتی ہیں جو خود ایک بڑا تفصیلی پہلو رکھتی ہے ہمارے ایک دوست جو چند سال امریکہ میں رہ کر ایران واپس آئے، انہوں نے ہم سے بیان کیا کہ امریکہ کا کوئی بھی کالج ایسا نہیں ہے جس میں پولیس نہ ہو اس کے بعد بھی ہر روز وہاں پر قتل و غارت ہوتا رہتا ہے، مثلاً ایک اسٹوڈینٹ اسلحہ کے ذریعہ اپنے استاد یا ہم کلاسیوں کی طرف گولی چلاتا ہے اور ان کو قتل کر دیتا ہے!! یہ ہے وہاں کا نظم اور انضباط!!

جی ہاں! مغربی ممالک میں قوانین پر اگر عمل ہوتا ہے تو وہ جرمانہ اور قید کے خوف کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر ان کو اس چیز کا خوف نہ ہو اور اس سے کسی بھی طریقہ سے محافظین کے کنٹرول کو بے اثر کر سکتے ہوں تو پھر قوانین کی خلاف ورزی کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔

لیکن ہماری اس اسلامی حکومت میں بیرونی کنٹرول کرنے والے اسباب جیسے جرمانہ اور جیل؛ کے علاوہ اندرونی اہم سبب بھی موجود ہے کہ اگر اس کو اور مزید تقویت پہنچائی جائے تو پھر معاشرہ کی بہت سی اجتماعی مشکلات حل ہو جائیں گی اور وہ سبب خود ان کے اندر قوانین پر عمل کرنے کا رجحان موجود ہے، اور اس کی وجہ ان کا اسلامی حکومت کے قوانین پر عمل کرنے کے

ایمان کی وجہ سے ہے، درحقیقت عوام الناس حکومتی قوانین پر عمل کرنا اپنا شرعی وظیفہ سمجھتے ہیں اور یہ ظاہری بات ہے کہ اگر ہمارے ملک میں اسلامی حکومت نہ ہوتی اور حضرت امام خمینیؒ جیسے رہبر اور مرجع تقلید نے نہ فرمایا ہوتا کہ اسلامی حکومت کے قوانین پر عمل کرنا شرعاً واجب ہے، تو پھر عوام الناس جرمانہ اور دوسری سزاؤں سے بچنے کے لئے قوانین پر عمل کیا کرتے۔

آج اسلامی انقلاب کے طرفدار اور متدین افراد ولی امر مسلمین کی اطاعت کی وجہ سے اسلامی حکومت کے قوانین پر عمل کرتے ہیں؛ اگرچہ بعض موارد میں وہ جانتے ہیں کہ یہ قوانین ہمارے نقصان میں ہیں لہٰذا یہ اندرونی اور معنوی سبب جو ان کے ایمان کی وجہ سے ہے؛ ایک بڑا سبب ہے تاکہ خود عوام الناس قوانین کے پابند رہیں، لہٰذا ایسا بہترین اور اہم سبب ہمارے معاشرہ میں موجود ہے لیکن ہم اس کی قدر نہیں کرتے اسی طرح عوام الناس کو حکومتی قوانین کا پابند بنانے میں دوسرا سبب یہ ہے کہ عوام الناس اسلامی حکومت کے قوانین کو خدا کی خوشنودی کا سبب جانے جس کی بنا پر وہ شرعی وظیفہ سمجھتے ہوئے ان پر عمل کریں اور ان سے خلاف ورزی کو خدائی عذاب سبب شمار کریں اگرچہ ہم اس چیز کا انکار نہیں کرتے کہ ہمارے معاشرہ میں قوانین کی خلاف ورزی ہوتی، لیکن یہ خلاف ورزی؛ قوانین پر عمل کرنے کے مقابلہ میں بہت کم ہیں: اور اگر قانون پر عمل ہونے کی نسبت؛ خلاف ورزیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو ہمارا یہ نظام کبھی کا ختم ہوگیا ہوتا۔

ج۔ مقام رہبری میں شائستگی اور تقویٰ کے عالی ترین درجات کا ہونا

دوسری حکومتوں پر ہماری حکومت کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ مقام معظم رہبری کو تقویٰ، اخلاقی شائستگی اور عظمت کے بلند ترین درجات پر فائز ہونا ضروری ہے؛ کیونکہ یہ ذات پیغمبر اور امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کا جانشین ہوتا ہے اور عوام الناس اس کو امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی تجلی اور ان کا ایک پرتو سمجھتے ہیں، اسی وجہ سے وہ محبت اور لگاؤ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) سے رکھتے ہیں اسی کے مشابہ (مقام معظم رہبری) سے بھی محبت اور لگاؤ رکھتے ہیں اگرچہ مقام معظم رہبری سب سے عظیم عہدہ پر فائز ہیں اور سب سے زیادہ قدرت بھی رکھتے ہیں، لیکن اگر (خدانخواستہ) ان سے کوئی خلاف ورزی یا ایسا گناہ جو باعث فسق اور عدالت کے خاتمہ کا باعث ہوجائے تو خود بخود ولایت مسلمین کے عہدہ سے معزول ہوجائیں گے اور کسی عدالت میں جانے یا جرم کو ثابت کرنے اور اس کو معزول کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی، العیاذ باللہ جرم کے مرتکب ہوتے ہی عدالت ساقط ہوجائے گی اور خود بخود اس عہدہ سے معزول ہوجائیں گے، اور "مجلس خبرگان" ان کی رہبری کی صلاحیت نہ ہونے کا اعلان کرے گی، ان کو معزول نہیں کرے گی؛ کیونکہ عدالت ختم ہوتے ہی عزل حاصل ہوجائے گا!۔

دنیا بھر کے کسی بھی ملک میں بڑے عہدوں پر فائز افراد اتنی اخلاقی صلاحیت اور شائستگی نہیں رکھتے جس قدر ہمارے مالک میں مقام معظم رہبری ہے، یہاں تک کہ بعض ممالک کے رہبروں کا حال یہ ہے کہ وہ سر سے پیر تک اخلاقی فساد میں آلودہ ہوتے ہیں: وہ امریکہ جس کو تمدن کا ترقی یافتہ نمونہ کہا جاتا ہے اس کے صدر پر اخلاقی اور جنسی تعلقات میں ملوث ہونے کا الزام

لگایا جاتا ہے اور اس کے خلاف، بہت سے گواہ بھی مل جاتے ہیں اور وہ خود بھی اس چیز کا اعتراف کرتا ہے لیکن جب اس کے خلاف پارلیمنٹ میں عدم اعتماد کا مسئلہ پیش آتا ہے تو اکثر ممبر آف پارلیمنٹ نے اس عدم اعتماد پر ووٹ نہیں دیئے اور وہ کما فی السابق صدارت کے عہدہ پر باقی رہ جاتا ہے اور اس کے لئے کوئی بھی مشکل پیش نہیں آتی تمام لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ وہ فاسد ہے لیکن سیاسی ہتھ کنڈوں کی وجہ سے عدم اعتماد کے ایک یا دو ووٹ کم رہ گئے اور وہ فاسد صدر اپنے عہدہ پر باقی رہا!! چنانچہ اسی طرح کی بہت سی دوسری مثالیں موجود ہیں اور خلاف ورزی کرنے والے افراد یہاں تک کہ ان کو عدلیہ نے محکوم بھی کیا ہے لیکن سیاسی حربوں کی بنا پر وہ اپنے عہدہ پر باقی رہتے ہیں اور ان کا دوسرے انتخابات میں کامیاب ہوجانے کا امکان ہوتا ہے۔

لہٰذا اسلامی نظریہ کے مطابق اگر مقام معظم رہبری میں بھی کوئی ایک ضروری شرط موجود نہ ہے یا کوئی جرم سرزد ہوجائے تو اپنے عہدہ سے خود بخود معزول ہوجائیں گے، کیونکہ صرف ایک گناہ کے مرتکب ہونے سے عدالت ختم ہوجاتی ہے اور وہ فاسق ہوجاتا ہے، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی رہبری کرنے کی صلاحیت بھی ختم ہوجاتی ہے؛ اس کے بعد اس کے جرم کو ثابت کرنے یا عدالت میں جانے یا خبرگان کی رائے کی ضرورت نہیں ہوتی پس معلوم یہ ہوا کہ دنیا بھر کے کسی بھی ملک میں ملکی عہدہ داروں خصوصاً بڑے عہدہ دار یعنی رہبری کے لئے اتنی سختی نہیں ہے۔

د۔ انسانی معنوی اور واقعی مصالح کی رعایت

آخر میں دوسری حکومتوں پر ہماری حکومت کا اہم امتیاز انسانیت کے معنوی مصالح کی رعایت کرنا ہے: ہم ایک مسلمان ہونے کے لحاظ سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خداوند عالم دوسروں سے زیادہ انسان کے مصالح اور منافع کو جانتا ہے اور ہم انہیں مصالح کو انسانی معاشرہ میں رائج کرنا چاہتے ہیں جن کو خداوند عالم نے بیان کیا ہے، اور یہ مقصد خداوند عالم کے بنائے دینی قوانین پر عمل کرنے کے علاوہ پورا نہیں ہوسکتا روئے زمین پر صرف ایک جمہوری اسلامی ایران ایک ایسا ملک ہے جس کے بنیادی قانون کے چوتھے بند میں یہ بیان ہے کہ ملک کے تمام قوانین اور مقررات کو اسلامی اصول وقواعد کے تحت طے کرکے نافذ کیا جانا چاہئے یہاں تک کہ اگر کوئی قانون دلیل شرعی کے عموم واطلاق کے برخلاف ہوگا تو اس کو معتبر نہیں سمجھا جائے گا اس بنا پر وہ ملک جس میں انسان کے واقعی مصالح ومنافع پورے ہوتے ہیں وہ ہمارا ہی ملک ہے۔

سب لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ یہ ہمارا نظام اور اس کے تمام نتائج؛ صرف عوام الناس کی قربانیوں اور شہداء کے خون کی برکتوں (منجملہ "شہداء ہفت تیر") سے وجود میں آئے ہیں اور انہوں نے اس انقلاب کی خاطر اپنی جان اور خون کی قربانی پیش کرکے ہمارے لئے عزت، سربلندی اور بلند ترین اقدار کا سامان فراہم کیا ہے لہٰذا ہمیں (ہر وقت) بیدار رہنا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان عظیم اقدار کو مفت میں بیچ ڈالیں آج کل بہت سی سازشیں چل رہی ہیں جن کی بنا پر اصل اسلام، ولایت فقیہ اور اسلامی حکومت کے قوانین پر اعتراضات کئے جاتے ہیں چونکہ یہ ارزشیں اور اقدار ان کی آنکھوں کا کانٹا بنا ہوا ہے جس کو صاف کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اپنی تمام خراب کاری کوششوں کو انہیں چند اصلی نقطوں پر صرف

کر دیتے ہیں تا کہ مختلف طریقوں اور مکاریوں سے ان پر حملہ کریں اور نقصان پہنچائیں۔

کبھی کبھی تقریروں، مقالوں اور بعض کثیر الانتشار اخباروں میں اصل اسلام اور اسلامی احکام پر اعتراض کیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ آج وہ زمانہ گذر چکا ہے جب لوگوں کو حلال اور حرام کی باتیں بتائی جائیں لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ خود تصمیم گیری کریں اور اپنی مرضی سے انتخاب کریں!! یا متعدد بار دیکھنے میں آیا ہے کہ ولایت فقیہ کی شان میں گستاخی، جسارت اور توہین کرتے ہیں کہ اگر ہمارے عہدہ داروں کے سینہ میں ثقافتی کشادہ دلی نہ ہوتو قانونی طور پر ان کو سزا ملنا چاہیے لیکن یہ حضرات اپنی بزرگی کا احساس نہیں کرتے اور ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا لیکن ہماری ایک انقلابی اور امام خمینیؒ اور مقام معظم رہبری (حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی) کے پیرو کار ہونے کے لحاظ سے یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس طرح کی جسارت کرنے والوں کو اس طرح کی گستاخیوں کا مزہ چکھادیں اور شریعت مقدس اسلام اور تشیع، اور اسلامی اقدار جن کی وجہ سے دنیا و آخرت کی کامیابی ہے جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتیں ان کو سیاسی مکاروں کے چور بازار میں کم سے کم قیمت میں بیچ ڈالیں جن کی بنا پر ذلت، خدا اور رسول اور فرشتوں، مومنین اور آئندہ آنے والی نسلوں کی لعنت کے مستحق قرار پائیں، خدا کرے کہ وہ وقت نہ آئے۔

پینتیسویں نشست

قوانین اور حکومت سے آزادی کی نسبت

1۔حاکم کا نصب کرنا آزادی اور ڈیموکریسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔(ایک اعتراض)

ہم نے گذشتہ نشستوں میں عرض کیا کہ قوانین کو براہ راست خداوند عالم بنائے یا اس کی اجازت اور اذن سے بنائے جائیں، اسی طرح قوانین کو جاری کرنے والا شخص بھی یا براہ راست خداوند عالم کی طرف سے معین ہو یا خداوند عالم کی طرف سے اذن یافتہ ہو؛ بہرحال نظام حکومتی (چاہے قوہ مجریہ ہو، یا قوہ قضائیہ ہو یا پارلیمنٹ) خدا کے اذن کی طرف مستند ہوں اس کے علاوہ دینی اور شرعی لحاظ سے اس کی مشروعیت نہیں ہوگی ہم نے گذشتہ بحثوں میں قانون گذاری اور قانون کو جاری کرنے کے سلسلہ میں بہت سے اعتراضات کو بیان کرکے ان کے جوابات پیش کئے قانون گذاری کے سلسلہ میں ایک اعتراض یہ تھا کہ عوام الناس کا خداوند عالم کے قوانین کا پابند ہونے کا مطلب انسانی آزادی اور انسان کے اپنے اختیار کے مخالف ہے؛ اور ہم اس کا جواب قانون گذاری کی بحث میں دے چکے ہیں اسی کے مثل بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت لہجہ سے قوانین کو جاری کرنے کے سلسلہ میں بھی ہوتا ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ قانون کا جاری کرنے والا خداوند عالم کی طرف سے معین ہونا چاہئے یا اس کی طرف سے اذن یافتہ ہو، تو اس صورت میں عوام الناس سے حق انتخاب کو چھین لیا ہے اور عوام الناس کو اس چیز کی اجازت نہیں ہے کہ خدا کے فرمان اور اس کے معین کردہ کے خلاف اپنی مرضی سے کسی کا انتخاب کریں؛ اور یہ بات درحقیقت ڈیموکریٹک کے خلاف ہے۔

قارئین کرام! اگرچہ گذشتہ بحثوں میں ہم اس اعتراض کا جواب عرض کرچکے ہیں لیکن چونکہ اسلامی نظام کے مخالف بلکہ درحقیقت اسلام کے مخالفین اس طرح کے اعتراض مسلسل کئے جارہے ہیں اور مختلف صورتوں میں اس طرح کے شبہات اور اعتراضات بیان کررہے ہیں، اس وجہ سے ہم اس سلسلہ میں مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں پہلے آزدای کے سلسلہ میں کچھ چیزیں بیان کریں گے اس کے بعد اسلامی حکومت کی تشکیل کا طریقہ کار اور قوانین اسلامی کو جاری کرنے کا طریقہ بیان کریں گے۔

2۔تکوینی آزادی اور نظریہ جبر کی تحقیق اور ردّ

ہمارے سامنے آزادی کا مسئلہ ہے جس کو اصطلاح میں تکوینی آزادی کہا جاتا ہے جس کے مقابلہ میں نظریہ جبر ہے

جس کو بعض دانشمندوں نے بیان کیا ہے قدیم زمانہ سے انسان کے سلسلہ میں یہ اختلاف چلا آرہا ہے کہ وہ مختار ہے یا مجبور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان مجبور ہے اور اپنی زندگی میں ذرا بھی اختیار نہیں رکھتا اور اگر کوئی انسان یہ تصور کرے کہ وہ اپنے ارادہ سے اپنے امور انجام دیتا ہے تو یہ اس کا خیال خام کے علاوہ کچھ نہیں ہے انسان در حقیقت مجبور ہے وہ جو بھی کام کرتا ہے مجبوراً اور فشار کے تحت انجام دیتا ہے؛ اگر چہ وہ خود اس چیز کا احساس نہ کرتا ہو۔

ہمیشہ اس نظریہ جبر کے طرفدار لوگ پائے گئے ہیں اور بعض اسلامی علماء نے بھی اس نظریہ کی طرفداری کی ہے اسلامی فرقوں میں "فرقہ اشاعرہ" (جو اہل سنت کا ایک کلامی فرقہ ہے) جبر کا اعتقاد رکھتا ہے؛ البتہ اتنی شدت اور غلظت سے نہیں جتنے دوسرے مانتے ہیں لیکن ہمارے اور اکثر مسلمانوں کے لحاظ سے یہ نظریہ باطل اور مردود ہے، چاہے انسان اپنے اعمال وافعال میں اپنے کو صاحب اختیار اور آزاد تصور کرے اور اگر صرف جبر انسان کے اوپر حاکم ہوتا تو پھر اخلاقی، تربیتی اور حکومتی نظام کی کوئی ضرورت باقی نہ بچتی۔

اخلاقی اور تربیتی سلسلہ میں اگر انسان نیک یا برے کام پر مجبور ہوتا اور اس کا کوئی اختیار ان چیزوں پر نہ ہوتا تو پھر اس کے نیک کاموں پر اس کی تعریف اور تمجید کوئی معنی نہیں رکھتی اور نہ ہی اس کے لئے کوئی جزا یا انعام کی ضرورت ہے، اسی طرح اگر انسان مجبور ہوتا تو برے کاموں پر اس کی مذمت اور سرزنش بھی نہیں ہونا چاہئے ، اگر کوئی بچہ اپنے کسی فعل میں مجبور ہو تو پھر اس کی تربیت لاحاصل ہے اور اس کے اخلاقی کردار کو سنوارنے کے لئے برنامہ ریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے جس وقت معلم اور مربی؛ بچے اور شاگرد سب ہی اپنے کردار میں مجبور ہوں تو پھر استاد بچے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں کام انجام دو یا فلاں کام نہ کرو اسی طرح حقوقی ، سیاسی اور اقتصادی مسائل میں جو نصیحتیں کی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال اور افعال میں مختار اور آزاد ہے۔

جب انسان اپنے افعال اور اعمال کے کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہو تو اسی وقت اس کو یہ کہنا درست ہے کہ اس کام کو انجام دے اور اس کام سے پرہیز کرے، لیکن اگر انسان مجبور ہو اور اپنے کاموں کو انتخاب کرنے کا اختیار نہ ہو تو اس کے یہ کہنے کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ اس کام کو کرے یا اس کام کو انجام نہ دے۔

یہ آزادی اور اختیار جس کو بھی سمجھتے ہیں یہ ایک "تکوینی امر" ہے اور "نظریہ جبر" کے مقابلہ میں ہے، اور یہ اختیار اور آزادی خداداد نعمت ہے جو انسان کی خصوصیات میں سے ہے اور اسی کی بنا پر انسان دوسری موجودات پر فضیلت اور برتری رکھتا ہے وہ تمام موجودات جن کا ہم علم رکھتے ہیں ان میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو مختلف نظریات بلکہ بعض اوقات متضاد (ایک دوسرے سے ٹکرانے والی) نظریات میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور وہ اپنے خواہشات کا جواب دینے میں مکمل طریقہ سے صاحب اختیار اور آزاد ہے چاہے وہ خواہشات "حیوانی خواہشات" ہوں یا وہ خواہشات "الٰہی اور معنوی" خواہشات ہوں بے شک خداوند عالم نے اس انسان کو اپنی اس نعمت سے نوازا ہے تا کہ وہ اپنے

اختیار اور انتخاب سے راہ حق یا راہ باطل کا انتخاب کرے، اور انسان کا یہی وہ امتیاز ہے جو دوسری تمام مخلوقات یہاں تک کہ فرشتوں پر رکھتا ہے یہی قدرت انتخاب ہے اگر اس نے اس قدرت کا صحیح استعمال کیا اور الٰہی احکام کا انتخاب کیا اور حیوانی خواہشات کو ترک کیا تو وہ کمال کے اس درجہ پر پہنچ جائے گا کہ اس کے سامنے فرشتے خضوع وخشوع کرتے ہوئے نظر آئیں۔

البتہ انسان کے پاس یہ آزادی کا ہونا ایک تکوینی مسئلہ ہے اور آج تقریباً کوئی ایسا نہیں ہے جو اس پر اعتقاد نہ رکھے اور اپنے کو سو فی صد مجبور سمجھے، اور اپنے لئے ذرا بھی آزادی نہ سمجھے، قرآن مجید نے اس مسئلہ کے واضح ہونے پر زور دیا ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ. [1]

"(اے رسول) تم کہہ دو کہ سچی آیات (کلمہ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہو چکی) ہے بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے"

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا. [2]

"اور اس کو راستہ بھی دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو یا ناشکرا"

سیکڑوں آیات بلکہ پورا قرآن انسان کے مختار ہونے پر تاکید کرتا ہے، کیونکہ قرآن مجید انسان کی ہدایت کے لئے ہے اور اگر انسان مجبور ہوتا اور اس کی ہدایت جبر کے تحت ہوتی اسی طرح اس کی گمراہی بھی جبر کے تحت ہوتی تو پھر انسان کے لئے ہدایت کو اختیار کرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا اور اس صورت میں قرآن کریم بے فائدہ اور بے اثر ہو جاتا۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ہماری گفتگو تکوینی آزادی کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ اس میں کسی کو بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور اس کی بحث کا مقام فلسفہ اور علم کلام ہے، حقوق اور سیاست میں یہ بحث نہیں کی جاتی۔

3۔ معنوی اور اندورنی اقدار کا آزادی سے کوئی ٹکراؤ نہیں

قارئین کرام! یہاں پر ایک ضروری گفتگو یہ ہے کہ ہر انسان کے پاس ایک اندرونی طاقت ہوتی ہے جو انسان کے اعمال اور کردار کے لئے دائرہ معین کرتی ہے، اور ایک اصطلاح کے مطابق انسان ایک ارزشی اور اقداری مشین رکھتا ہے جس کی بنا پر ہر انسان یہ طے کر سکتا ہے کہ اس کو اخلاقی طور پر کون سے کام انجام دینا چاہئے اور کن چیزوں کو ترک کرنا چاہئے، جن کے طے کرنے کے بعد مخصوص کاموں کو انجام دیتا ہے اور کچھ چیزوں کو ترک کرتا ہے ہمیں کسی ایسے معاشرہ کا علم نہیں ہے جس میں "باید ھا اور نباید ھا" (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) نہ ہوں، اور اچھے کاموں کو برا اور برے کاموں کو اچھا سمجھتا ہو۔

چنانچہ انسانی اسی اچھے اور برے کاموں کو سمجھنے والی اندرونی طاقت کو "عقل عملی" یا "وجدان" کہا جاتا ہے جو انسان کو عقلی اور اخلاقی رفتار و گفتار کی ہدایت کرتی ہے، اور یہی وہ طاقت ہے جو ہمیشہ سے تمام انسانوں کے پاس رہی ہے، جس کی بنا

---

[1] سورہ کہف آیت ۲۹

[2] سورہ دہر آیت ۳

پر انسانیت کے لئے ایک راہنما کا کام کرتی ہے ہر انسان کی "عقل عملی" یا "وجدان" اس بات کو سمجھتی ہے کہ عدل، امانت داری اور سچائی نیک کام ہیں، لہٰذا ان پر عمل کرنا چاہئے اسی طرح ہر انسان کی "عقل عملی" یا "وجدان" ظلم اور ستم کو برا سمجھتی ہے اور ظلم نہ کرنے کا حکم دیتی ہے، خصوصاً جبکہ اگر کسی ایسے شخص پر ظلم وستم کرے جو اپنے دفاع پر بھی قادر نہ ہو اسی طرح انسانی عقل جھوٹ اور خیانت کو بُرے کاموں میں سے شمار کرتی ہے اور اس سے دوری کرنے کا حکم دیتی ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ انسان کے پاس ایک اندرونی اور باطنی ایسی طاقت ہے جو انسان کے لئے ہر حال میں اقداری مشین کا کام کرتی ہے جس کی بنا پر اچھے اور برے کاموں کی شناخت ہو جاتی ہے، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ تمام ہی انسان عدالت اور صداقت کو نیک کام شمار کرتے ہیں اور کوئی بھی انسان صداقت کو بُرا نہیں سمجھتا اسی طرح تمام ہی انسان اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ ظلم اور جھوٹ برے کام ہیں اور آپ کو کوئی بھی ایسا شخص نہیں مل سکتا جو ان کو اچھا سمجھتا ہو بے شک انسانی اقدار کو معین کرنے والی یہ طاقت اپنے فیصلہ میں مستقل اور آزاد ہوتی ہے اور کسی باھری طاقت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، اور صرف اپنے نظریہ کے مطابق حکم کرتی ہے۔

انسانی عقل و وجدان کے ذریعہ بیان شدہ بایدھا و نبایدھا (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) یا امر و نہی کی ماہیت اور حقیقت کی تحقیق و جائزہ (کہ امر و نہی صرف اس کی تشخیص اور درک کی وجہ سے ہوتا ہے یا انسان کے اندر کوئی طاقت ایسی ہوتی ہے جو اس کو امر و نہی کرتی ہے) اخلاقی فلسفہ سے متعلق ہے جو ہمارا موضوع گفتگو نہیں ہے لیکن ہماری عقل کا یہ طے کرنا کہ کون سے کام نیک ہیں اور کون سے کام بُرے؟ یہ ایک طرح سے ہمارے لئے لازمی احکام صادر کرتی ہے جس کی بنا پر ہماری قدرتی آزادی محدود ہو جاتی ہے، یعنی خود ہماری عقل اور وجدان ہمیں حکم دیتی ہے کہ اپنی کچھ آزادی سے فائدہ نہ اٹھاؤ: (مثلاً) ہم دوسروں پر ظلم کر سکتے ہیں لیکن ہماری عقل کہتی ہے کہ کسی پر بھی ظلم نہ کرو، بلکہ عدالت کو برقرار رکھو، اسی طرح ہم جھوٹ بول سکتے ہیں لیکن ہماری عقل یہ حکم کرتی ہے کہ جھوٹ نہ بولو بلکہ صداقت سے کام لو ہماری عقل اس بات کا حکم کرتی ہے کہ اگرچہ تم امانت میں خیانت کر سکتے ہو لیکن (کسی بھی چیز میں) خیانت نہ کرو، لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ انسانی عقل عملی اور اس کا وجدان انسان کی خصوصیت میں اور ان اسباب میں سے ہے جو ہماری آزادی کو محدود کرتی ہے، اور اگر کسی شخص میں ایسی طاقت وقدرت موجود نہ ہو اور اپنے لئے اچھے اور برے کی پہچان نہ کر سکتا ہو تو گویا وہ عقل سے بے بہرہ ہے اور اس کو دیوانہ کہا جائے گا۔

اب جبکہ انسانی عقل اس اپنی رفتار و گفتار کو محدود بنا دیتی ہے اور انسان اس کام کو اپنے عقل اور وجدان کی طرف نسبت دیتا ہے لیکن کوئی بھی اس کو آزادی کا مخالف قرار نہیں دیتا یہ کوئی کہتا ہوا نظر نہیں آتا کہ ہماری عقل نے امر و نہی کے ذریعہ سے ہماری آزادی کو محدود کر دیا ہے جب حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی اس اندورنی طاقت کی پیروی کرتے ہوئے اپنی آزادی کو محدود کر لیتا ہے جو خود اسی کی عقل کے تحت ہوتی ہیں اور باہر سے کوئی چیز سبب بھی نہیں ہوتی کیونکہ انسانی عقل کے ذریعہ انسان کی رفتار و گفتار کا محدود ہونا بالکل اس ڈاکٹر کی طرح ہے جو ہم سے (مریض ہونے کی صورت میں) یہ کہتا ہے کہ فلاں چیز

نہ کھانا کیونکہ وہ تمہارے لئے نقصان دہ ہیں، اور فلاں دوائی استعمال کرو کیونکہ تم اس سے ٹھیک ہو جاؤ گے اس صورت میں نہ صرف یہ کہ انسان ڈاکٹر کے حکم اور پرہیز بتانے سے ناراحت نہیں ہوتا بلکہ اس کو خوشی بھی ہوتی ہے اور اس کے حکم کو اپنی صحت یابی کے لئے راہنمائی اور ہدایت سمجھتا ہے درحقیقت اس صورت میں بھی ہم اپنی آزادی اور اختیار سے استفادہ کرتے ہیں اور ہماری پیدائشی آزادی پر کوئی حرف نہیں آتا اور بعض اخلاقی نظریات کی بنا پر عقل صرف ہمیں ایک راستہ دکھاتی ہے اور ہماری اس راستہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے، جس کے بہترین فوائد ظاہر ہوتے ہیں نہ کہ اس میں ڈکٹیٹری "Dictaory" نہیں دکھائی دیتی، (بلکہ دوستانہ اور دلسوزی کی بنا پر ہوتی ہیں۔)

یہاں تک کہ اگر ہم اپنی عقل کے حکم کو ڈکٹیٹری کا نام بھی دیدیں جس کی بنا پر وہ حکم کرتی ہے، جیسا کہ کہا بھی جاتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی عقل و وجدان کی مخالفت کی تو اس عقل ہی اس کو مورد مذمت اور عذاب قرار دیتی ہے، اور عقل و وجدان کا عذاب ہماری ادبی کتابوں میں مشہور معروف ہے، لیکن ان تمام باتوں کے پیش نظر عقل و وجدان کا حکم آزادی کے مخالف نہیں ہے اور اس کی آزادی ختم نہیں ہوتی، اور جو شخص اپنی عقل اور وجدان کے مطابق عمل کرتا ہے اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ یہ مقید ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل اور وجدان خود انسان سے متعلق ہے اور یہ اندارونی طاقت کے عنوان سے ہمارے کاموں میں نظارت اور قضاوت کرتی ہے جس کے نتیجہ میں بعض چیزوں کا حکم دیتی ہے اور بعض چیزوں کے انجام دینے سے روکتی ہے پس جس وقت ہماری اندورنی طاقت ہمیں حکم دے تو ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی، اور اگر ہم اپنی اس عقل کے فرمان کے مطابق اپنی مرضی سے عمل کریں تو گویا ہم نے اپنی مرضی کے مطابق عمل کیا؛ ہماری آزادی اس وقت سلب ہوتی ہے جب کوئی بیرونی طاقت ہمیں کسی کام کی انجام دہی پر مجبور کرے یا کسی کام سے روکے۔

4۔ آزادی اور دینی وظائف کی نسبت

قارئین کرام! یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین (اسلام) کے احکام اور شرعی اوامر و نواہی جو خداوند عالم کی طرف سے ہوتے ہیں کیا انسان کی آزادی کو سلب کرتے ہیں؟ مثلاً اگر کوئی شخص صبح اٹھ کر نماز صبح نہ پڑھنا چاہے، لیکن خداوند عالم کا حکم ہے کہ صبح اٹھ کر نماز صبح پڑھو؛ اسی طرح دوسرے احکام جن کے بجالانے کو شریعت مقدس نے انسان کے لئے لازم اور ضروری قرار دیا ہے مثلاً روزہ کا حکم، زکوۃ و خمس اور دوسرے واجبات کا حکم، یا وہ چیزیں جو حرام ہیں ان کو ترک کرنے کا حکم جیسے (الکحل) والی مشروبات کے پینے سے روکنا (وغیرہ وغیرہ)۔

جواب: یہ احکام اور امر و نہی جب تک نفوذ ہونے کے بارے میں پشت پناہی نہ رکھتی ہوں تو گویا یہ بھی عقل اور وجدان کے حکم کی طرح ہیں اور ان کے ذریعہ سے انسان کی آزادی سلب نہیں ہوتی یعنی جس وقت خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ: نماز پڑھو، اگر ہم نے نماز نہ پڑھی، تو ہم سے کوئی مطلب نہ ہو اور ہمیں عذاب اور سزا میں مبتلا نہ کرے، اسی طرح معاشرہ بھی خداوند عالم کے احکام پر عمل نہ کرنے کی نتیجہ میں ہم سے خفا نہ ہو اور ہمیں ذلیل و حقیر نہ سمجھے تو اس صورت میں اگر شرعی امر

ونہی صرف نصیحتی پہلو رکھتے ہوں تو ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی کیونکہ ان نصیحت کو باھر سے جاری کرنے والا کوئی ضامن نہیں ہے، اور کوئی بیرونی طاقت ہم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالتی جس کی بنا پر ہم بعض کاموں کو انجام دیں اور بعض سے پرہیز کریں؛ اس صورت میں شرعی امر ونہی عقل اور وجدان کے حکم کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں جس کی وجہ سے آزادی سلب نہیں ہوتی مسامحہ آمیز (ذو معنی) تعبیر کے مطابق، جس طرح ہم ایک ایسی متصل عقل رکھتے ہیں جو ہمیں "باید ھا اور نباید ھا" (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) کے بارے میں نصیحت اور امر ونہی کرتی ہے لیکن عملی طور پر اس کے احکام پر عمل کرنا لازمی اور ضروری نہیں ہوتا، اسی طرح ہمارے پاس عقل منفصل (جدا) بھی ہے جو ہمارے وجود سے باہر ہے اور امر ونہی کرتی ہے، یعنی خداوند عالم "عقل کلّی" کے عنوان سے ہمارے لئے امر ونہی کرتا ہے اور وہ صرف نصیحت کی حد تک ہوتی ہے اور ارشادی (ونصیحتی) پہلو رکھتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شرعی امر ونہی عملی طور پر لازمی اور ضروری ہوتے ہیں اور ان میں صرف نصیحتی پہلو نہیں ہوتا بلکہ جس وقت خداوند عالم ہمیں حکم دیتا ہے کہ نماز پڑھو تو اگر ہم نماز نہ پڑھیں تو ہمیں جہنم میں ڈال کر عذاب میں مبتلا کرے گا یہاں تک کہ بعض برے کاموں پر اسی دنیا میں سزا اور تازیانے کی حد معین فرمائی ہے، اور اس سے بھی بالاتر گذشتہ امتوں کے لئے آسمانی عذاب نازل کیا ہے اور جب بھی کوئی پیغمبر مبعوث بر سالت ہوتا تھا تو عوام الناس کو خدا کے عذاب سے ڈراتا تھا، اور یہ کہتا تھا کہ اگر تم نے خداوند عالم کے احکام کی اطاعت نہ کی تو تم پر اسی دنیا میں بھی عذاب نازل ہو سکتا ہے قرآن مجید میں مکرر مسلمانوں کو اس بات سے ڈرایا گیا ہے اور ان کو یاددہانی کرائی گئی ہے کہ گذشتہ امتوں کے حالات پر نظر کرو کہ خدا کے احکام کی نافرمانی اور گناہ کے نتیجہ میں خداوند عالم نے ان پر عذاب نازل کیا لہٰذا تمھیں بھی دنیاوی یا اُخروی عذاب سے ڈرنا چاہئے انبیاء کرامؑ عذاب الٰہی سے اس قدر ڈراتے تھے جس کی بنا پر تمام انبیاؑ کا نام نذیر اور منذر (ڈرانے والا) معروف ہو گیا؛ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ.[1]

"ہم ہی نے تم کو یقینا قرآن کے ساتھ خوشخبری دینے والا وڈرانے والا (پیغمبر) بنا کر بھیجا اور کوئی امت (دنیا میں) ایسی نہیں گزری کہ اس کے پاس (ہمارا) ڈرانے والا (پیغمبر) نہ آیا ہو"

لہٰذا وہ شرعی امر ونہی جن پر ہمیشہ دنیاوی یا اُخروی عذاب سے ڈرایا گیا ہے؛ اخلاقی اور عقلی امر ونہی جن پر ہماری عقل اور وجدان کے حکم سے فرق پایا جاتا ہے اور اس سے انسانی آزادی محدود ہو جاتی اور انسان پر دباؤ ڈالتی ہے۔

اور اگر ہم نے اس بات کو مان لیا کہ تمام انسان مکمل طور پر آزاد ہیں، اور "حقوق بشر کے اعلانیہ" کے مطابق (جو بعض روشن فکر کے نزدیک وحی اور کتاب مقدس کا حکم رکھتا ہے) کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ کسی انسان کی آزادی کو محدود کرے، تو کیا خداوند عالم کو بھی انسانوں کی آزادی کو محدود کرنے کا حق نہیں ہے؟! اور ان کو عذاب اور سزا سے ڈرا کر تحت تاثیر قرار

[1] سورۂ فاطر آیت ۲۴

دے، اور زیادہ سے زیادہ خدا بھی عقل اور وجدان کی طرح انسان کو اپنے وظائف اور واجبات کو انجام دینے کے سلسلہ میں ارشاد اور نصیحت نہیں کر سکتا، مثال کے طور پر ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دے تو اگر ہم نماز نہ پڑھیں تو ہم نے گویا اپنی آزادی سے استفادہ کیا ہے! اور اگر ایسا ہے تو پھر خداوند عالم نے ہمیں کس لئے ڈرایا ہے اور کہتا ہے: اگر گناہ کرو گے تو تم کو آخرت میں جہنم میں ڈال دوں گا، اور مسلسل ہمیں اپنے عذاب سے ڈراتا رہتا ہے، چنانچہ اس نے اپنے انبیاءؑ کے وظائف میں سے ایک وظیفہ عوام الناس کو عذاب الٰہی سے ڈرانا قرار دیا ہے؟

بے شک مسلمانوں کو اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ خداوند عالم فرمان اور احکام صادر کر سکتا ہے اور ان کے جاری کرنے کا ضامن بھی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ امر و نہی کا پہنچانا اور عذاب الٰہی سے ڈرانا ہے، (کبھی کوئی مسلمان ان چیزوں میں شک نہیں کرتا) بلکہ وہ ان تمام چیزوں کو دل و جان سے قبول کرتا ہے تمام مسلمان خدا اور رسول کے احکام کے سامنے سر جھکاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اگرچہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ احکام ان کو محدود کرتے ہیں اور ان کی بعض آزادی کو سلب کرتے ہیں اور ایک طریقہ سے ان کو تحت تاثیر قرار دیتے ہیں کیونکہ جب خداوند عالم ہمیں کسی کام کو انجام دینے کا حکم دیتا ہے تو اگر ہم نے اس کام کو انجام نہ دیا تو پھر ہمارے لئے عذاب کا وعدہ کیا گیا (اور خدا کا وعدہ سچا ہے) تو ہم اس سے متاثر ہوتے ہیں پس معلوم یہ ہوا کہ خداوند عالم ہم کو بعض کاموں کے انجام دینے اور بعض کاموں سے پرہیز کرنے کا پابند کر سکتا ہے اس میں کوئی شک (بھی) نہیں ہے: لیکن خداوند عالم کی طرف سے امر و نہی آنے کی حکمت اور فلسفہ کیا ہے اور کیوں خداوند عالم ہم کو شرعی واجبات و محرمات کا پابند کیوں بناتا ہے تو اس سلسلہ میں علم کلام میں بحث ہوگی، لیکن خلاصہ کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ:

خداوند عالم اپنے تمام تر لطف و مہربانی اور فضل و کرم کی بنا پر انسان کو سعادت مند بنانا چاہتا ہے اسی وجہ سے سعادت مندی کے راستہ کی پہچان بتادی ہے جس کی بنا پر ہمارے لئے احکام اور فرمان معین فرما دیئے ہیں تاکہ ہم اپنے ان وظائف پر عمل کرتے ہوئے سعادت مندی کے راستہ پر گامزن رہیں اور جس کے زیر سایہ واقعی سعادت کے راستہ کو پہچان لیں ظاہری بات ہے کہ خداوند عالم کے ڈرانے اور دھمکانے سے ہم ہوشیار ہوجاتے ہیں جس سے سعادت کے راستہ سے منحرف نہیں ہوتے، اور اگر یہ احکام ہمارے لئے ضروری اور لازمی نہ ہوتے تو پھر ہم اپنے وظائف کو اچھے طریقے سے انجام نہ دیتے اور اپنے غلط کردار اور گناہوں کی وجہ سے راہ سعادت سے بھٹک جاتے لہٰذا خداوند عالم نے اپنے لطف و کرم کی بنا پر شرعی وظائف پر عمل کرنے کی وجہ سے ہم کو برائیوں اور برے کاموں سے روکا ہے جس کے نتیجہ میں خدا کی رحمت واسعہ ہمارے شامل حال ہوجائے۔

اس بنا پر حقیقت یہ ہے کہ دین انسان کو محدود کرتا ہے اور اس کی بعض آزادی سلب ہوجاتی ہیں انبیاء علیہم السلام عوام الناس کو ڈرانے کا وظیفہ رکھتے تھے اور دینی احکام کی مخالفت اور عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے بے شک اس سلسلہ میں ظاہری

اور روحانی دونوں طرح کا دباؤ ہوتا ہے ظاہری دباؤ اس شخص پر ہوتا ہے جس پر بعض گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے حد جاری ہوتی ہے اور روحانی دباؤ ان لوگوں پر ہوتا ہے جو کسی پر حد جاری ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ اس سزا سے ڈرتے ہیں، اور ان لوگوں پر بھی جو ہمیشہ آخرت کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ہم اس وقت جو مطلق آزادی کے طرفدار ہیں لوگوں سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا تم اس ظاہری اور روحانی دباؤ کو محکوم کرتے ہو؟ یعنی کیا تم یہ کہتے ہو کہ خداوند عالم کو اس طرح کی محدودیت اور مشکل میں قرار نہیں دینا چاہئے؟ اور اس کو دنیاوی اور اخروی عذاب سے ڈرانے کے لئے پیغمبر نہیں بھیجنا چاہئے؟ تو کیا ان چیزوں کا محکوم کرنا اسلام اور تمام آسمانی ادیان کے انکار کے برابر نہیں ہے؟ (لیکن کیا کسی کو دین کے انکار کرنے کا حق ہے یا نہیں یہ ایک الگ بحث ہے اس وقت ہم انبیاء علیہم السلام کی اتباع کی حقانیت کو ثابت نہیں کر رہے ہیں)

جو شخص کہتا ہے کہ انسان مکمل طور پر آزاد ہے اور اس پر کسی طرح کی محدودیت اور دباؤ نہیں ہونا چاہئے، تو کیا وہ محدودیت بھی جو خداوند عالم کی طرف سے اپنے بندوں پر ایجاد ہوتی ہے مثلاً گناہ کرنے پر جہنم میں جانا ہوگا یا بعض گناہوں کی اسی دنیا میں سزا ملے گی تو کیا ایسا شخص اس بات کو محکوم کرتا ہے؟ (اور اگر ایسا ہے) تو گویا اس نے دین اور بعثت انبیاءؑ اور الٰہی شریعتوں کا انکار کیا ہے اور اس وقت ہماری بحث ان سے نہیں ہے ہماری بحث تو ان لوگوں سے ہے جو دین کو قبول رکھتے ہیں اور دین اسلام کو حق جانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے اپنی حکمت اور لطف وکرم کی بنا پر ہدایت کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا ہے اور اسی وجہ سے اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

5۔ حدود اور سزاؤں میں آزادی کی نسبت

اب جبکہ ہم نے یہ قبول کرلیا ہے کہ نہ صرف خداوند عالم کو یہ حق ہے بلکہ اس کے لطف وکرم اور فضل کی بنا پر ہمیں جہنم سے ڈرائے تاکہ ہم صحیح راستہ پر چلیں اور برے راستے سے پرہیز کریں، یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے بعض گناہوں پر حد کس لئے اور کیوں قرار دی ہے اور حدود وتعزیرات کو اصلاً کس لئے رکھا ہے؟ خداوند عالم ہمیں عذاب آخرت سے ڈرنا صحیح ہے کیونکہ عذاب سے ڈرانا ہمارے فائدہ میں ہے جو ہمارے لئے جہنم کے عذاب سے ڈرتے ہوئے سعادت اور نیک بختی کے راستے کو اپنانے کا سبب بنتا ہے بلکہ ایک معنی کے لحاظ سے یہ ڈرانا ایک قسم کا ارشاد اور ہدایت ہے اور خداوند عالم ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ دیکھو تمہارے برے کاموں کا نتیجہ آخرت میں جہنم ہے، اور عذاب بھی وہ جو حقیقی ہے اور باہمی مفاھمت (ریزولیشن "Resolution") نہیں ہے بلکہ تمہارے دنیاوی برے اعمال کا مجسمہ ہے لیکن خدا نے کیوں فرمایا کہ اگر کوئی عظیم گناہ جیسے زنا کا مرتکب ہوا تو اس کو لوگوں کے سامنے کوڑے لگائیں جائیں تاکہ اس کی عزت وآبرو ختم ہوجائے؟

ارشاد ہوتا ہے:

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ.[1]

"زنا کار عورت اور زنا کار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگائیں اور خبردار! دین خدا کے معاملہ میں کسی مروت کا شکار نہ ہو جانا اگر تمہارا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے اور اس سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے۔"

یہ سوال صرف دین سے متعلق نہیں ہے بلکہ سزائی قوانین اور ہر ملک کے قوانین سے متعلق ہے دنیا بھر کی تمام حکومتوں میں حقوقی اور سزائی قوانین ہوتے ہیں حقوقی قوانین ان لوگوں کے بارے میں ہوتے ہیں جو دوسرے کے مال اور حقوق پر تجاوز اور دست درازی کرتا ہے مثلاً کسی کا مال کھا جاتا ہے یا کسی کے بدن کو زخمی کر دیتا ہے یا کسی کو قتل کر دیتا ہے تو اس صورت میں اگر کوئی مخصوص شکایت کرنے والا موجود ہے تو وہ مجرم کی شکایت کرتا ہے جس کے نتیجہ میں مجرم کو سزا ہوتی ہے یا جرمانہ دینا ہوتا ہے اور اگر کسی کے حق کو غصب کیا تھا تو اس کو واپس کرے اور اگر کسی ظلم اور جنایت کا مرتکب ہوا تو اس سے قصاص (بدلہ) لیا جاتا ہے یا اسی طرح کی دوسری سزائیں معین کی جاتی ہیں لیکن تمام سزائی قوانین میں مجرم کو سزا دینے کے لئے کسی خاص شکایت کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود عدالت اور مدعی العموم قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے اور ملکی مصالح کو پامال کرنے والے کے خلاف مقدمہ دائر کر سکتا ہے اور اگر ملزم کا جرم اثبات ہو جائے تو اس کو سزا ملتی ہے۔

جہاں تک ہم جانتے ہیں دنیا بھر میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جس میں حقوقی اور سزائی قوانین موجود نہ ہوں اور مجرموں کو سزا اور جریمہ نہ ہوتا ہو خلاصہ یہ ہے کہ یا مجرم کو جریمہ دینا پڑتا ہے یا اس کو جیل بھیج دیا جاتا ہے یا اس کے لئے دوسری سزائیں معین کی جاتی ہیں؛ چنانچہ اسلام بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے اور اسلام کے بھی حقوقی اور سزائی قوانین ہیں یہاں تک کہ بعض موارد میں تو سخت سے سخت سزائیں ہیں لہٰذا یہ سوال یہ ہے کہ تمام ہی حکومتوں کو مجرموں سزا دلانے کا حق ہے تو کیا یہ چیز انسان کی آزادی کے مخالف نہیں ہے تو یہ بات مسلم ہے کہ تمام ہی لوگ حکومت کو حقوقی اور سزائی قوانین بنانے کا حق دیتے ہیں اور مجرمین کے لئے خاص سزائی قوانین مترتب کر کے نافذ کرانا چاہتے ہیں اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ہمیں کسی ایسے ملک کے بارے میں اطلاع نہیں ہے جس میں مجرموں کے لئے حقوقی سزائی قوانین نہ ہوں یا ان کے لئے جرمانہ یا قید یا دوسری سزائیں نہ ہوں اور کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے البتہ بحث و گفتگو میں یہ بحث کی جا سکتی ہے اور یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس دنیا میں کسی شخص کو سزا دی جا سکتی ہے اور اس کی آزادی کو محدود کرنا یا اس کی آزادی کو سلب کرنے کا اختیار کسی کو ہے یا نہیں؟

6۔ حکومت اور قوانین کے زیر سایہ مطلق طور پر آزادی نہیں ہو سکتی

جو لوگ کہتے ہیں کہ کسی بھی حکومت کو عوام الناس کی آزادی کو محدود کرنے اور ان کے لئے سزا معین کرنے کا کوئی حق

---

[1] سورہ نور آیت ۲

نہیں ہے، (کیونکہ اس صورت میں عوام الناس سزا وغیرہ کے ڈر سے کسی خلاف ورزی کو انجام نہیں دیتے؛ لیکن اگر سزا وغیرہ نہ ہوتی تو پھر انسان اپنی مرضی سے جو بھی چاہتا انجام دیتا چاہے وہ کام اچھا ہوتا یا بُرا،) تو اگر ایسا شخص دنیا بھر کی حکومتوں پر اعتراض کر رہا ہے تو اس کا ایک دوسرے طریقہ سے جواب دیا جائے اور اگر صرف اسلام پر اعتراض کرتا ہے تو پھر اس کا جواب ایک دوسرا ہوگا لیکن چونکہ اس کا اعتراض دنیا بھر کی عام حکومتوں پر ہے اور تمام حکومتی نظام منجملہ اسلامی حکومت پر بھی اعتراض کرتا ہے کہ کیوں مجرموں کے لئے سزائیں اور محدودیت قرار دی ہیں ان پر دباؤ ڈالا گیا ہے؟ تو اس صورت میں ہمارا جواب بھی ایسا ہوگا جو سب کو شامل ہو جس میں تمام حکومتوں اور اسلامی حکومت کے حقوقی اور سزائی قوانین کے بارے میں جواب دیا جائے۔

جواب:

مذکورہ اعتراض "مطلق آزادی" کی بنیاد پر ہے اور ان کا یہ خود ساختہ نظریہ ہے جس کی بنا پر ان کا تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مکمل طور پر آزاد ہونا چاہئے اور کسی بھی طرح اس پر کوئی دباؤ نہیں ہونا چاہئے، اور کوئی بھی شخص اس کو کسی کام کے کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا اور نہ ہی کسی کام سے روک سکتا ہے۔

بے شک یہ اصل اور بنیاد غیر منطقی اور ہر صاحب عقل و شعور کے نزدیک باطل اور غلط ہے کوئی بھی انسان مطلق اور بغیر کسی حدود قید کی آزادی نہیں رکھتا کہ جو کچھ بھی کرنا چاہے کوئی بھی قانون اس کو نہ روکے (یہاں پر قوانین سے مراد اخلاقی قوانین اور مستقلات عقلیہ نہیں ہیں جن کی اجرائی ضمانت نہیں ہے بلکہ ہماری مراد عام معنی میں قوانین حقوقی مراد ہیں جن کو نافذ کرنے کی حکومت ذمہ دار ہوتی ہے) لہٰذا قوانین اور مقررات ہونا چاہئے اور عوام الناس کو ان پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے تاکہ عوام الناس کے حقوق کو ادا کریں ٹریفک قوانین ہونا چاہئے اور جو لوگ کبھی بھی بہت سے لوگوں کی جان جانے کے باعث بنتے ہیں ان کے لئے سزائیں اور جرمانہ ہونا چاہئے۔

اس کے علاوہ کہ ہمیشہ سے پوری تاریخ میں اور ہر جگہ پر عوام الناس موجودہ قوانین کو قبول کرتے آئے ہیں جس کی بنا پر کسی کو بھی مطلق آزادی کا حق نہیں ہے اور نا ہی کسی دوسرے پر کسی طرح کا کوئی دباؤ ڈالنے اور اس کی آزادی کا ایک حصہ ختم کرنے کا حق ہے؛ اور عملی طور پر کوئی شخص بھی ایسا عقیدہ نہیں رکھتا، کیونکہ مطلق آزادی کا مطلب مدنیت کا انکار کرنا اور وحشیانہ جنگل راج کو قبول کرنا ہے اگر انسان ایک اجتماع پسند موجود ہے تو اس کے لئے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے اور عوام الناس کو ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں قوانین ہونا ضروری ہیں نیز مجرموں کے لئے سزائی قوانین مد نظر رکھے جائیں، اور حکومت بھی ان کو نافذ کرنے کی ضامن ہو واقعاً مطلق آزادی (اور یہ کہ کسی شخص کو کسی دوسرے کو کسی کام پر مجبور کرنے یا کسی کام سے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے) کا نعرہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ پھر حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ انسان جو کچھ بھی کرنا چاہے کرسکے؛ کیونکہ حکومت بھی عوام الناس کی رائے سے بنتی ہے اور قوانین کا نافذ کرنا اس کی ذمہ

داری ہوتی ہے لہٰذا اس طرح کا نظریہ قانون مداری، جامعہ مدنی، تمدن اور قوانین کی اتباع کی ضرورت سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ انسانی معاشرہ اور تمدن بشریت کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں قوانین اور ان کو نافذ کرنے والی قدرت کا ہونا ضروری ہے، اور ظاہری بات ہے کہ حکومت قوانین کو نافذ کرنے کے لئے ان پر دباؤ ڈالے گی۔

حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ ضرورت کے وقت مجرموں کو قوانین پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کے لئے اپنی طاقت کا استعمال کرے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے، اور اگر صرف کہنے اور نصیحت کرنے پر کفایت کرے تو پھر وہ معلم اور مربی ہوگی حکومت نہیں ہوگی علماء اور واعظین کا وظیفہ عوام الناس کو اجتماعی اخلاق اور انسانی آداب کی رعایت کرنے کے لئے وعظ و نصیحت کرنا ہے، لیکن وہ ان وعظ و نصیحت کو نافذ کرنے کے لئے قدرت کا استعمال نہیں کر سکتے، اور قدرت کے زور پر لوگوں کو انسانی اخلاق کی رعایت پر مجبور کرنا بھی ان کی ذمہ داری نہیں ہے لیکن حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اگر ضرورت پڑے تو اپنے قدرت کے زور پر قوانین پر عمل کرائے اور اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو اس کو سزائے اعمال تک پہنچائے اور یا اس پر جرمانہ کرے یا اگر کوئی خلاف ورزی کر کے بھاگ نکلنا چاہے تو اس کا تعقب کرے اور اس کو پکڑ کر اس پر حدود اور سزا جاری کرے اس بنا پر حکومت اور قوہ مجریہ کا وجود خود اس بات پر دلیل ہے کہ انسان مکمل اور مطلق طور پر آزاد نہیں ہے اور مطلق آزادی کا نظریہ باطل اور مردود ہے نیز انسانی تمدن اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ چاہے حکومت شہری قوانین جو خود شہریوں کی خواہش کے مطابق مرتب ہوتے ہیں یا اسلامی حکومت الٰہی قوانین جاری کرے۔

7۔ حاکمیت کا خدا سے متصل ہونا

قارئین کرام! گذشتوں بحثوں میں ہم نے اس بات کو ثابت کیا کہ قوانین کو نافذ اور جاری کرنے والا یا خود خداوند عالم کی طرف سے منصوب ہو یا خدا کی طرف سے اذن یافتہ ہو، کیونکہ قوانین کو جاری کرنے سے عوام الناس پر دباؤ ڈالا جاتا ہے اور ان کی آزادی کو محدود کیا جاتا ہے اور عوام الناس خداوند عالم کے مملوک اور بندے ہیں لہٰذا صرف خدا ہی ان میں تصرف کر سکتا ہے، اور "ربوبیت تشریعی" اور حاکمیت الٰہی کی بنا پر کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کی اجازت اور مرضی کے بغیر اس کے بندوں پر فشار ڈالے اور ان میں تصرف کرے لہٰذا حکومت کو خدا کے بندوں میں تصرف کرنے یا ان پر دباؤ ڈالنے کے لئے ان مالک (خداوند عالم) سے اجازت لے نا چاہئے لیکن جو لوگ عوامی ڈیموکریٹک کے قائل ہیں اور معاشرہ کو ادارہ کرنے کے لئے قوانین مدنی کو کافی جانتے ہیں اور حکومت کو انہیں قوانین کو جاری اور نافذ کرنے کی ضامن مانتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں کہ قوانین کو نافذ کرنے والے کا خدا کی طرف سے اذن یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ عوام الناس سے ووٹ دیتے ہی وہ قوانین کو جاری کر سکتا ہے اور ضرورت کے وقت حکومت اپنی طاقت کو بروئے کار لا سکتی ہے، اور لوگوں پر دباؤ بھی ڈال سکتی ہے۔

یہ لوگ حکومت کے عوام الناس پر دباؤ ڈالنے کے سلسلہ میں کیا دلیل پیش کرتے ہیں؟ ڈیموکریٹک اصول کے تحت

اس طرح جواب دیا جاتا ہے کہ عوام الناس چونکہ حکومت کو ووٹ دیتی ہے چاہے وہ ممبر آف پارلیمنٹ کے انتخاب ہوں یا خود حکومت کے صدراتی انتخاب ہوں، اور یہ ووٹ دینا ہی گویا حکومت کے قوانین اور حکومت کی طرف سے ان کو نافذ کرنے کو قبول کرنا ہے؛ چاہے حکومت ان کو جاری اور نافذ کرنے کے سلسلہ میں اپنی طاقت کا استعمال ہی کیوں نہ کرے لہٰذا حکومت کی طرف قوانین کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں جو دباؤ دیا جاتا ہے وہ آزادی سے منافات نہیں رکھتا؛ کیونکہ اس حکومت اور نظام کو خود انہوں نے قبول کیا ہے، اور اس کے سامنے اپنا سر تسلیم کیا ہے اور یہ بالکل عقل اور وجدان کے اس حکم کی طرح ہے جو انسان کو بعض چیزوں کو انجام دینے اور بعض چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتی ہے اور وہ آزادی سے مخالفت نہیں رکھتا، اور اس سے آزادی سلب نہیں ہوتی، کیونکہ یہ احکام خود ان کی اندرونی طاقت کی بنا پر ہوتے ہیں اور خود انہیں سے متعلق ہے اور ان پر تھونپا نہیں گیا ہے۔

البتہ ڈیموکریسی حکومتی نقشے، ان کی کارکردگی اور اختیارات نیز اپنی حقانیت اور مشروعیت کے لئے جو دلیل پیش کرتے ہیں؛ ان تمام چیزوں پر بہت سے اشکالات ہوتے ہیں جو فلسفہ سیاست اور فلسفہ حقوق سے متعلق کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں ہم یہاں پر کچھ اعتراضات بیان کرتے ہیں جو اس وقت مناسب ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ: دنیا میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں پر قوانین کو اتفاقی طور پر قبول کیا جاتا ہے، یا متفق طور پر کسی کو وزیر اعظم یا صدر مملکت منتخب کیا جاتا ہو یہاں تک کہ خود جمہوری اسلامی (ایران) جو دنیا میں عوامی ملکوں میں بے نظیر ہے، جس میں 2/ 89 فی صد لوگوں نے اس اسلامی نظام کو ووٹ دیئے اور ۸ /1 فی صد لوگوں نے اس نظام کو ووٹ نہیں دیئے جو اس وقت کی مردم شماری کے لحاظ سے وہ تعداد تقریباً دس لاکھ سے بھی زیادہ ہے جس وقت دنیا بھر میں رائج ڈیموکریسی اور عوامی نظام میں دس لاکھ سے زیادہ افراد اس نظام کے حق میں ووٹ نہ دیں تو حکومت کو عوام الناس کو اپنے قوانین اور احکام پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کا کیا حق ہے؟ جبکہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس نظام حکومتی کو نہیں مانتے تو پھر صرف عوام الناس کے اکثریت کا ووٹ حاصل کرنے سے حقانیت اور مشروعیت حاصل کر کے کس طرح اپنے قوانین کو اپنے مخالفوں پر نافذ اور جاری کر سکتی ہے؟

ڈیموکریسی اور عوامی نظام کے طرفدار افراد اس طرح کے سوالات کا جواب دیتے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں گفتگو اور بحث نہ ہوئی ہو لیکن ان کے جوابات اطمینان بخش نہیں ہیں، اور بہت سے حل نہ ہونے والے اعتراض باقی رہتے ہیں، مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ وہ نظام حکومتی جو اکثریت کے ووٹوں سے وجود میں آیا ہے اور اس نظام کو اقلیت نے ووٹ نہیں دیا ہے ان کے بھی کچھ حقوق ہیں اور ان کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے اور وہ لوگ اپنے شخصی اور ذاتی احوال میں اپنی مرضی کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ کافی نہیں ہے کس دلیل کی بنا پر عام قوانین اور حکومت کے اجتماعی قوانین کو ان لوگوں پر تھونپا جا سکتا ہے؟ نیز اسے مختلف ٹیکس اور دوسرے اخراجات کس دلیل کی بنا پر لئے جاتے ہیں؟

ان میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آخر کار ہمیں معاشرہ کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہو گا اور ہمارے پاس معاشرہ کو چلانے کے لئے ڈیموکریسی حکومتی نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں ہے۔

لیکن مذکورہ اعتراض کا جواب اسلامی نقطہ نظر سے یہ ہے کہ قانون گذاری کا حق خداوند عالم سے متعلق ہے یا جو افراد خداوند عالم کی طرف سے اذن یافتہ ہوں وہ خداوند عالم کے مقرر کردہ قوانین کے تحت قوانین بنا سکتے ہیں اسی طرح عوام الناس پر حکومت کرنے اور ان کے لئے قوانین جاری کرنے کا حق اس شخص کو ہے جو خداوند عالم کی طرف سے منصوب ہو یا اس کی طرف سے اذن یافتہ ہو اس صورت میں وہ شخص خدا کے نمائندہ ہونے کے عنوان سے اور وہ شخص جو خداوند عالم کی طرف عوام الناس پر حکومت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس بات کا حق رکھتا ہے کہ قوانین کو معاشرہ میں نافذ کرے اگرچہ اس کو اپنی طاقت کا بھی استعمال کرنا پڑے اس کو حکومت کے مخالف لوگوں اور قانون توڑنے والوں کو بھی قوانین پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کا حق ہے بے شک جو شخص خدا اور دین کا اعتقاد رکھتا ہے یہ تھیوری قابل قبول، منطقی اور عقلی اشکالات سے خالی ہے جو ڈیموکریسی حکومت پر وارد ہوتے ہیں لیکن جو شخص دین اور خدا کو نہیں مانتا اور الٰہی حکومت سے روگرانی کرتا ہے وہ کبھی بھی اس جواب کو بھی قبول نہیں کرے گا لیکن وہ عوام الناس جو مسلمان ہیں اور خدا پر ایمان رکھتے ہیں، الٰہی حاکمیت ایک عظیم تمنا ہے جو ان کی منطق عقل، خواہش وجدان اور انسانی اصول سے ہم آہنگ ہے اسی وجہ سے وہ تناقض اور ٹکراؤ جو ڈیموکریسی اور عوامی نظام میں پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ (ڈیموکریسی) نظریہ باطل ہو جاتا ہے، لیکن (وہ تناقض اور ٹکراؤ) اسلامی حکومت میں نہیں پایا جاتا؛ اور اس تھیوری اور نظریہ میں مکمل طور پر معاشرہ کی وحدت اور نظم وضبط کا خیال رکھا جاتا ہے۔

اگر ہم اسلامی نظام حکومتی کا آج کل کی دنیا میں رائج ڈیموکریسی جو صرف عوام الناس کے ووٹوں کی بنیاد پر ہوتی ہے؛ مقابلہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی نظام حکومت جو ہمارے عقیدہ کی بنا پر خداوند عالم سے نسبت رکھتا ہے اور عوام الناس کی حمایت اور ان کے رائے کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے؛ اس میں مزید اعتبار پایا جاتا ہے؛ کیونکہ ہم عوام الناس کے ووٹوں سے انکار نہیں کرتے اور ان کا احترام کرتے ہیں اور جمہوری اسلامی ایران کے بہت سے ادارے، سازمان وغیرہ عوام الناس کے ووٹوں سے تشکیل پاتے ہیں؛ مثال کے طور پر صدر مملکت کا انتخاب، ممبر آف پارلیمنٹ کا انتخاب، خبرگان رہبری اور شوریٰ اسلامی شہر وروستا جو تمام عوام الناس کے ووٹوں سے بنائے جاتے ہیں اسی وجہ سے ہم عرض کرتے ہیں کہ ہمارا حکومتی نظام خدا کی اجازت کی وجہ سے ہوتا ہے اور عوام الناس کی حمایت بھی اس میں شامل ہوتی ہے، لیکن عوامی اور ڈیموکریسی نظام جو صرف عوام الناس کے ووٹوں پر استحکام پیدا کرتا ہے اگر ہمارے سامنے ڈیموکریسی تھیوری کو لایا جائے تو ان سے یہ کہیں گے کہ جو کچھ تمہاری حکومتوں میں ہے ہمارے یہاں بھی ہے اور ہم بھی عوام الناس کے ووٹوں کے معتقد ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں اس کے علاوہ منطقی اور عقلی لحاظ سے اسلامی حکومت کی تھیوری ڈیموکریسی تھیوری پر برتری اور فضیلت رکھتی ہے، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ڈیموکریسی نظام اندرونی اتحاد اور صحیح منطقی اور عقلی دلیل نہیں رکھتی، اور اس میں تناقض اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے، لیکن

ولایت فقیہ کی تھیوری عقلی اور منطقی لحاظ سے بھی مستحکم اور مضبوط ہے جس میں کسی بھی طرح کا کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ بعض روشن فکر اور غلط فکر رکھنے والے کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کیوں خداوند عالم نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کر کے، آسمانی کتابوں، اور آسمانی شریعتوں کو نازل کر کے نیز فوجداری قوانین جیسے ہاتھ کاٹنا، جرمانہ کرنا اور دوسری حدود و تعزیرات وغیرہ کو پیش کر کے عوام الناس کی آزادی کو سلب کر لیا ہے اور ان کو آزاد نہیں چھوڑا تا کہ جو کرنا چاہیں کر سکیں اور ان کو تحت فشار قرار دیا ہے؛ جبکہ اصل انسانیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ مکمل طریقہ سے آزاد ہو، کیونکہ آزادی انسانی کی اہم خصوصیات میں سے ہے؟

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مطلق آزادی؛ انسانی حقیقت اور اس کے اجتماعی ہونے سے ہم آہنگ نہیں ہے اگر ہم نے یہ مان لیا کہ انسان کی زندگی اجتماعی ہے تو پھر اس کی اجتماعی زندگی اس بات کی تقاضا کرتی ہے کہ عوام الناس کے نظم وضبط کے لئے لازم الاجراء قوانین اور مقررات کا ہونا ضروری ہے اور ان کو نافذ کرنے کے لئے ایک حکومت کا ہونا ضروری ہے۔

مذکورہ دلیل دنیا بھر کی تمام حکومتوں میں مقبول ہے اور اسلام بھی اس کو قبول کرتا ہے، اور ہمیشہ سے عوام الناس اس کا اعتقاد رکھتے تھے نیز اس پر کسی طرح کا کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا تھا لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ حکومت کی ضرورت، قوانین اور مقررات کا جاری کرنا، اور بعض حالات میں اپنی طاقت کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں ڈیموکریسی اور عوامی حکومت میں بحد کافی منطقی دلیل موجود نہیں ہے اور ان کی حکومتی تھیوری اندرونی اتحاد وانسجام نہیں رکھتی اور اس میں تناقض اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔

لیکن اسلامی حکومتی نظام میں دلیل جدلی بھی موجود ہے کیونکہ ہم بھی ڈیموکریسی اصول پر عمل کرتے ہیں اور عوام الناس کے ووٹوں کو اہمیت دیتے ہیں اور بہت سے حکومتی ادارے عوام الناس کے ووٹوں ہی سے چلتے ہیں، اسی طرح منطقی اور عقلی برہانی اصول پر مبنی ہوتی ہے؛ منجملہ یہ کہ اصل حاکمیت خدا کا حق ہے کیونکہ عوام الناس خدا کے بندے ہیں، دوسروں کی حکومت اس وقت صحیح اور حق ہو سکتی ہے جب خدا کی مرضی اور اس کی اجازت سے ہو یعنی صرف خدا کی اجازت سے خدا کے بندوں پر حکومت کی جا سکتی ہے، وہ حکومت جس میں الٰہی منشاء نہ ہو اور خداوند عالم کی طرف نسبت نہ ہو؛ تو ایسی حکومت باطل اور حق اور عقلی اصول کے برخلاف ہے۔

چھتیسویں نشست

اسلامی قوانین قطعی طور پر جاری ہونے چاہئیں

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

قارئین کرام! اس سے پہلے جلسہ میں ہم نے عرض کیا کہ انسانی عقل و وجدان "باید ھا اور نباید ھا" (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) انسان کے لئے معین کرتی ہے اور بہت کاموں کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا کام نہیں کرنا چاہئے اور کیا کام نہ کرنا چاہئے جس کے نتیجہ میں انسان کی آزادی محدود ہو کر رہ جاتی ہے؛ لیکن چونکہ آزادی کی محدودیت انسان کی اندرونی طاقت کے ذریعہ ہوتی ہے لہٰذا اس کی آزادی سلب ہونے کا سبب نہیں بنتا اور کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ انسانی عقل کی نصیحتوں سے اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے انسانی عقل اور وجدان کی۔ اندرونی نصیحتوں کی طرح مسلمانوں کے لئے خداوند عالم کے اوامر اور احکام ہوتے ہیں جو خدا اور رسول کے ذریعہ صادر ہوتے ہیں جس طرح ہماری عقل کسی کام کو انجام دینے کا حکم کرتی ہے اسی طرح خداوند عالم نے بھی ہمارے لئے کچھ وظائف قرار دیئے ہیں وہ وظائف جو واقعی مصالح (وفوائد) کی بنا پر صادر ہوتے ہیں چونکہ خداوند عالم ان کے بارے میں لامحدود علم رکھتا ہے اور ان کا سمجھنا ہماری عقل سے بالاتر ہے۔

گویا یہاں پر اندرونی عقل متصل کے علاوہ خداوند عالم عقل منفصل اور بے نہایت؛ انسان کے کامل مصالح اور اس کے خطرات سے مکمل طور سے معین کرتا ہے اسی وجہ سے ہم سے یہ چاہتا ہے کہ فلاں کام کو انجام دیں کیونکہ یہ کام ہمارے حق میں ہے اور فلاں کام کو انجام نہ دیں چونکہ ہمارے لئے باعث ضرر ہے۔

انسانی آزادی کی یہ محدودیت جو خدا اور بندے کے درمیان موجود رابطہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے سیاسی یا حقوقی فلسفہ سے متعلق نہیں ہے اور سیاسی لحاظ سے بھی مشکل ساز نہیں ہے کیونکہ خدا پر ایمان رکھنے والے افراد اپنے عقیدہ کی بنا پر اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ کچھ کاموں کو انجام دیا جائے اور کچھ کاموں سے پرہیز کیا جائے، اور یہ لازمی عقیدہ اور کارکردگی معاشرہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ انسان کے خدا سے رابطہ کی بنا پر ہے جیسا کہ انسان اپنی عقل سے رابطہ رکھتا ہے۔

2۔ حکومت کی ضرورت اور انسان کی اجتماعی زندگی کا عکس العمل

قارئین کرام! یہاں پر بحث یہ ہے کہ بہت سے کام خود انسان کے ذات اور اس کی دنیا و آخرت سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کے لئے بھی مؤثر ہوتے ہیں اور ان کا فائدہ یا نقصان عوام الناس اور معاشرہ تک بھی پہنچتا ہے چنانچہ اس

موقع پر دنیا بھر کے دانشور حضرات معتقد ہو جاتے ہیں کہ ایک ایسے نظام کا ہونا ضروری ہے جو معاشرہ کے لئے نقصان دہ چیزوں کی روک تھام کر سکے اور جو لوگ خلاف ورزی کریں ان کو سزائے اعمال تک پہنچائے۔

لہٰذا حکومت کی ضرورت اور یہ کہ ہمیں ایک طاقت کی ضرورت ہے جو معاشرہ کے نقصان کو روک سکے، سماج کا نقصان نہ ہو اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا مل سکے، اسی وجہ سے حکومت کی ضرورت ہوتی ہے اسی بنا پر "انارشیسٹ" "Anarchiste" (فسادطلب) کے علاوہ دنیا بھر کے تمام صاحب علم سیاست اور حقوق کے رکھوالے حکومت کو ضروری سمجھتے ہیں؛ لیکن اخلاقی اقدار اور وہ اچھائیاں اور برائیاں جن کو خود انسانی عقل اپنی ذاتی زندگی میں معین کرتی ہے ان کا سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہاں پر ایک دوسری بحث یہ ہوتی ہے کہ عقل انسانی انفرادی، ذاتی اور معنوی مسائل کے علاوہ آزادی کے ایک حصے کو محدود کرتی ہے تو کیا حکومت بھی انسان کی آزادی کو محدود کر سکتی ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے لحاظ سے حکومت کی خصوصیت اور اس کا تقاضا ہی آزادی کو محدود کرنا ہے، کیونکہ اگر کوئی حکومت کی ضرورت کو مانتا ہو لیکن آزادی کو محدود کرنے کو قبول نہ کرتا ہو تو اس کی بات تناقض گوئی پر مشتمل ہے حکومت قوانین اور مقررات مرتب کرتی ہے اور بعض کاموں کو جائز اور بعض کاموں کو ممنوع قرار دیتی ہے اور اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرے تو بعض کو مالی جرمانہ بعض کو زندان اور بعض کو دوسرے طریقوں سے سزائیں دیتی ہے۔

یہاں تک کہ بعض حکومتوں میں مثلاً اسلامی حکومت میں جسمانی سزائیں جیسے سزائے موت بھی قرار دی گئی ہے لہٰذا اس مقدمہ کو قبول کرنا ضروری ہے کہ بنیادی طور پر حکومت کا وجود اجتماعی آزادی کو محدود کرنے کے لئے ہی ہوتا ہے اور آزادی کے محدود نہ ہونے کا مطلب حکومت کا نہ ہونا ہے ہمیں یہ قبول کرنا چاہئے کہ اجتماعی زندگی کے لئے حکومت کی ضرورت ہے یعنی یہ قبول کریں کہ انسان کی سیاسی اور اجتماعی آزادی محدود ہو، یا یہ قبول کریں کہ انسانی اجتماعی زندگی کے لئے حکومت کی ضرورت نہیں ہے اور کسی کو دوسروں پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالنے کا بھی حق نہیں ہے؛ جس کے نتیجہ میں عوام الناس سیاسی اور اجتماعی مسائل میں مطلق آزادی سے بہرہ مند ہو سکیں۔

قارئین کرام! ہماری گذشتہ گفتگو کے پیش نظر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ جو لوگ یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ "آزادی حکومت اور قانون سے بالاتر ہے" صرف ایک مغالطہ ہے حکومت کو چاہئے کہ آزادی کو محدود کرے اور اگر کوئی اس بات کا قائل ہو جائے کہ کوئی بھی حکومت انسانوں کی سیاسی اور اجتماعی آزادی کو محدود نہیں کر سکتی۔؛ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور حکومت بے کار، نامشروع اور غیر قانونی اور طاقت کے بل بوتے پر ہے۔

3۔ حکومت کی مشروعیت کے منشاء کی طرف ایک اشارہ اور ڈیموکریسی پر اشکالات

قارئین کرام! اب جبکہ ہم نے یہ قبول کر لیا ہے کہ معاشرہ میں ایک قانونی اور مشروع حکومت کا وجود ضروری ہے

جس سے سیاسی اور اجتماعی آزادی محدود ہو جائے، اس کے بعد ایک اساسی اور بنیادی مسئلہ ہمارے سامنے ہے: اول یہ کہ حکومت کس وجہ سے قانونی اور مشروعیت پیدا کرتی ہے اور حکومت کس حق کی بنا پر آزادی کو محدود کرتی ہے؟ دوسرے یہ کہ حکومت کس حد تک آزادی کو محدود کرسکتی ہے؟

گذشتہ بحث میں یہ بات واضح اور روشن ہو چکی ہے کہ ہمارے عقیدہ کی بنا پر اسلامی سیاسی نظریہ کے علاوہ حکومت کے لئے کوئی قابل قبول اور عقل پسند دلیل نہیں ہے کیونکہ اگر ہم یہ کہیں کہ حکومت کے زیر سایہ عوام الناس خود اپنی آزادی کو محدود کرتے ہیں البتہ اس چیز سے قطع نظر کہ اگر کوئی چاہے تو اپنی آزادی پر کنٹرول کرسکتا ہے اور پھر اس صورت میں حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے تا کہ اس کی آزادی کنٹرول کی جاسکے، یہ نظریہ تناقض گوئی پر مشتمل ہے: کیونکہ جو شخص آزاد رہنا چاہتا ہے وہ کبھی بھی اپنی آزادی کو محدود کرنا نہیں چاہتا۔

سب سے آخری اور بہترین نظریہ جو دنیا بھر میں حکومت کی مشروعیت اور قانونی ہونے کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے اور دنیا بھر کے لوگ اس نظریہ کو قبول (بھی) کرتے ہیں یہ ہے کہ عوام الناس اپنے بعض حقوق حکومت کے حوالے کردیتے ہیں یعنی یہ انسان جو اپنی زندگی کا حاکم ہے اور اپنی زندگی کے لئے (مخصوص) قوانین بنا سکتا ہے اور اپنی آزادی کو محدود کرسکتا ہے، لیکن اپنے اس حق کو حکومت کے حوالے کردیتا ہے تا کہ اس کی اجتماعی زندگی کے لئے (بہترین) قوانین بنائے اور ان کو نافذ کرے یہ حکومت کو حاکمیت کا حق حوالے کرنا آج کل کی دنیا میں ڈیموکریسی کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

قارئین کرام! آج کل کی ڈیموکریسی تھیوری پر بہت سے اشکالات وارد ہوتے ہیں، ہم ان میں سے صرف تین اشکالات پر اکتفاء کرتے ہیں:

پہلا اشکال: کیا انسان کو اپنے اندر ہر طرح کا تصرف کرنے، اپنی آزادی کو محدود کرنے اور اپنے پر دباؤ ڈالنے کا حق ہے؟ یعنی کیا انسان کو حق ہے کہ خود اپنے کو سزا دے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا بھر میں آج کل کی تمام حکومتیں خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا معین کرتی ہیں اور بعض جرائم کے لئے قید با مشقت قرار دیتی ہے اور بعض جرائم کے لئے جسمانی سزا، شکنجہ اور سزائے موت قرار دیتی ہے تو کیا انسان کو خودکشی کا حق ہے کہ جس کے نتیجہ میں اپنے لئے سولی کا حکم حکومت کے حوالے کردے؟ اگر انسان خودکشی کا حق رکھتا ہو تو وہ دوسرے کو اس طرح کے قانون بنانے کا حق دے سکتا ہے کہ اگر اس نے بعض ایسے جرائم کو انجام دیا جن کی سزا سولی ہو اور حکومت اس کے حق میں جاری کرسکے بے شک انسان خودکشی کا حق نہیں رکھتا کیونکہ انسان کو اپنی جان کا اختیار نہیں ہے تا کہ جب بھی چاہے ختم کردے، انسان کی جان خداوند عالم کی طرف سے ہے، اور کسی کو اپنی جان کو نقصان پہنچانے کا حق حاصل نہیں ہے حد تو یہ ہے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق انسان اپنے بدن کو نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے بدن کو زخمی کرلے مثلاً اپنے ہاتھ یا انگلی کو کاٹ لے کیونکہ انسان کا بدن خدا سے متعلق ہے اور انسان اس کا مالک اور صاحب اختیار نہیں ہے اس صورت میں کس طرح انسان حکومت کو سزائی اور

فوجداری قوانین بنانے کا حق دے سکتا ہے اور حکومت کو مجرموں کو سزا دینے کی اجازت دے اور چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں اور بعض مجرموں کو سزائے موت دیدی جائے؟

دوسرا اشکال: فرض کرلیں کہ انسان اپنی جان اور بدن میں ہر طرح کا تصرف کرسکتا ہے اور اپنے بدن کو نقصان اور ضرر پہنچا سکتا ہے اور اپنی زندگی کو ختم کرسکتا ہے اور اس صورت میں اپنا یہ حق حکومت کے حوالے کردیتا ہے در حقیقت جو شخص پارلیمنٹ کو ووٹ دیتا ہے گویا قانون گذاری کے سلسلہ میں پارلیمنٹ کو اپنا وکیل بنادیتا ہے کہ اس کی اجتماعی زندگی کے لئے قوانین اور مقررات بنائے جن میں سے حقوقی اور سزائے قوانین (بھی) ہیں؛ اسی طرح حکومت کو بھی اپنا وکیل بناتا ہے کہ اس پر قوانین نافذ کرے لیکن اس صورت میں صرف حکومت کو اپنے اوپر تصرف کا حق دیتا ہے، لیکن یہ حق نہیں دیتا کہ حکومت دوسروں پر بھی تصرف کرے اور ان کے حقوق اور ان کی آزادی کو سلب کرے بالفرض اگر انسان اپنے کو سزا دینے کا حق رکھتا ہو اور یہ حق حکومت کو دیدے کہ اگر اس نے خلاف ورزی کی تو اس کو سزا دے، تو اس صورت میں (بھی) صرف اپنا وکیل بنا سکتا ہے کہ اس کی طرف سے تصمیم گیری کرے اور اس پر عمل کرے لیکن دوسروں کو سزا دینے کا حق (اسے نہیں ہے تا کہ یہ حق) حکومت کے حوالے کردے۔

ڈیموکریسی نظریہ کی رائج اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ عوام الناس حکومت کو وکالت دیتے ہیں اور اس کو اپنا وکیل اور نمائندہ قرار دیتی ہیں تا کہ وہ مختلف قوانین بنائے اور ان کو جاری کرے آج دنیا بھر میں رائج ڈیموکریسی حکومت اگر اکثریت سے جیت جائے یعنی 51٪ یا اس سے زیادہ ووٹ حاصل کرلے تو پھر اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ پورے معاشرہ کے لئے منجملہ ان لوگوں کے لئے (بھی) جنہوں نے حکومت کو ووٹ نہیں دیا ہے؛ قوانین بنائے اور ان کو لاگو کرے در حقیقت جب آدھے لوگوں نے نہ کہ سب نے حکومت کو ووٹ دیئے ہیں صرف وہی لوگ حکومتی قوانین کو قانونی مانیں گے اور معاشرہ کے وہی لوگ ان قوانین کے سامنے اپنا سر تسلیم کریں گے لیکن یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تقریباً آدھے لوگوں نے حکومت کو ووٹ ہی نہیں دیا اور حکومت کو اپنا وکیل ہی قرار نہیں دیا کہ ان کی طرف سے قوانین بنائے اور ان کو جاری کرے، تو پھر اس صورت میں حکومت کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ان کی اجتماعی زندگی کے لئے قوانین بنائے، اور کس وجہ سے وہ ان پر حکم چلائے؟ اور اگر انہوں نے خلاف ورزی کی ہو تو ان کو سزائے اعمال تک پہنچائے؟ لہٰذا طے یہ ہوا کہ حکومت کے لئے اپنے مخالفین اور جن لوگوں نے اس کو ووٹ نہیں دیا ہے؛ ان پر حکومت کرنے، اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے کوئی (بھی) عقل پسند راستہ موجود نہیں ہے۔

تیسرا اشکال: قارئین کرام! موکل کو اپنے وکیل کو معزول کرنے کا حق ہوتا ہے، یا اس کے بنائے ہوئے منصوبوں کو لغو اور بے اثر کرنے کا حق ہوتا ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ممبر آف پارلیمنٹ کو ووٹ دے کر انتخاب کرلے لیکن اس کے بعد اپنی رائے سے پلٹ جائے تو وہ اپنے نمائندہ کو اس مقام سے معزول کرسکتا ہے اس کے علاوہ وکیل کو صرف موکل کی مرضی

کے مطابق ووٹ دینے کا حق ہوتا ہے اور یہ حق نہیں ہوتا کہ اپنے موکلوں کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے اب اگر تمام عوام الناس یا ان میں آدھے افراد کسی قانون کے مخالف ہوں، تو حکومت اس قانون کو کس حق کے تحت جاری کر سکتی ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ ڈیموکریسی حکومت کی مشروعیت اور قانونی ہونے کے لئے کوئی عقل پسند راستہ موجود نہیں ہے! اور اس سلسلہ میں ڈیموکریسی نظریہ کے طرفدار لوگ یہ کہتے ہیں کہ ملک اور معاشرہ کو چلانے کے لئے ڈیموکریسی نظریہ سب سے بہترین نظریہ ہے کیونکہ اگر اقلیت کی مرضی کے مطابق حکومت بنے اور ان کی مرضی کے مطابق عمل کرے تو پھر اکثر عوام الناس کا حق ضایع ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام الناس کی اکثریت مظاہرہ کرنے لگیں گے اور اس صورت میں ان کی شورش اور انقلاب کو روکنا مشکل ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ حکومت عوام الناس کی اکثریت سے انتخاب ہو اور ان کی مرضی کے مطابق عمل کرے؛ نہ یہ کہ حکومت عقل پسند مشروعیت رکھتی ہے۔

4۔ اسلام میں حکومت کی مشروعیت اور اس کا قانونی ہونا

اسلامی نظریہ کے مطابق، وہ عقل جو انسان سے کہتی ہے کہ فلاں کام اچھا ہے اور فلاں کام بُرا ہے، وہی عقل جو انسان سے کہتی ہے کہ ماں باپ، استاد اور عوام الناس تم پر حق رکھتے ہیں لہٰذا ان کے حقوق کو ادا کرنا چاہئے، وہی عقل انسان سے کہتی ہے کہ وہ خدا جس نے تمام دنیا، تجھے اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے اس کے حقوق دوسروں سے بہت زیادہ اور عظیم ہیں اور انسان کو چاہئے کہ ان کو ادا کرنا چاہتے اب چونکہ خداوند عالم نے ہمیں پیدا کیا ہے اور ہمارے وجود بلکہ تمام کائنات کا مالک ہے اور تمام چیزیں اس کے ارادہ سے وجود میں آتی ہیں، اور اگر وہ ارادہ کرلے تو تمام چیزیں نابود ہو جائیں گی، اس نے اگر کسی کو قوانین نافذ کرنے کے لئے معین کیا ہے تو اس کا حکومت کرنا قانونی اور مشروعیت رکھتا ہے اور پھر عوام الناس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس وقت وہ خدا جو ہم پر سب سے زیادہ حقوق رکھتا ہے (بلکہ تمام ہی حقوق اسی کی طرف سے ہیں) اس نے حکومت اور ولایت کا حق پیغمبر، ائمہ معصومین علیہم السلام یا امام معصومؑ کے جانشین کو دیا ہے، اس کو حق ہے کہ معاشرہ میں خدائی احکام نافذ کرے، کیونکہ یہ شخص اس ذات کی طرف سے منصوب ہوا ہے کہ کل ہستی، تمام اچھائیاں اور تمام حقوق و خوبصورتی اسی کی طرف سے ہے۔

اس بنا پر اسلامی حکومتی نظریہ میں جس میں حاکم اسلامی خداوند عالم کی طرف سے قوانین اور احکام الٰہی جاری کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا وہی مجرموں اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے اعمال تک پہنچا سکتا ہے، اور اس میں کسی بھی طرح کا کوئی تعارض نہیں ہے اور یہ نظریہ عقلی اصول پر (بھی) منطبق ہے البتہ یہ نظریہ ان لوگوں کے نزدیک قابل قبول ہے جو خداوند عالم پر ایمان رکھتے ہیں ورنہ اگر کوئی شخص خدا کو قبول نہ رکھتا ہو تو پھر وہ شخص اس نظریہ کو بھی قبول نہیں کرے گا، اور ہم پہلے اس کے لئے خداوند عالم کے وجود کا اثبات کریں اور اگر وہ خدا پر ایمان لے آتا ہے تو پھر اس موقع پر اس سے بیٹھ کر حکومت کے سلسلے میں اسلامی سیاسی نظریہ کے بارے میں بحث کریں لہٰذا جو افراد جو خدا، رسول اور دین کو مانتے ہیں ان کے

لئے بہترین راہ حکومت کی مشروعیت اور قانونی ہونے کے لئے یہی ہے کہ کل کائنات کا مالک خدا؛ معاشرہ کے مصالح کی رعایت کے لئے حق حکومت اپنے کسی (خاص) بندے کو عنایت کرتا ہے (تا کہ انسان معاشرہ کی خیر و بھلائی کے ساتھ آخرت کی سعادت بھی حاصل ہو جائے)۔

اسلامی معرفت کے پیش نظر اسی طرح اسلامی سیاسی نظریہ کی شناخت کی بنا پر معلوم یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق سے بالاتر خداوند عالم حق ہے خداوند عالم کا، اس بنا پر اگر خداوند عالم اپنے کسی بندے کو کوئی کام کرنے کا حکم دے چاہے اس کے نقصان میں ہی کیوں نہ ہو تو اس کو انجام دینا چاہئے؛ البتہ خداوند عالم اپنے بے انتہا لطف و کرم اور مہربانی کی وجہ سے اپنی مخلوقات کے ضرر اور نقصان میں امر و نہی صادر نہیں کرتا، وہ کسی کا نقصان نہیں چاہتا اور اس کے اوامر و نواہی انسان کی دنیا و آخرت کی مصلحت اور اس کی بھلائی میں ہوتے ہیں اور اگر خداوند عالم کے احکام کی تعمیل کی بنا پر انسان کو اس دینا میں کچھ نقصان بھی ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر چند روزہ دنیا میں بعض لذتوں اور نعمتوں سے محروم رہتا ہے تو خداوند عالم اس کو آخرت میں جبران کردے گا اور دنیا میں ہوئے اس کے نقصان کے ہزاروں برابر اس کو ثواب اور اجر عنایت فرمائے گا۔

5۔ انبیاء علیہم السلام اور عوام الناس کی ہدایت کا طریقہ

خداوند عالم نے اپنی طرف سے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تا کہ عوام الناس کو دین اور دنیا کے خیر و بھلائی کی ہدایت کریں خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نبی پہلے تو حق (خدا) کی طرف دعوت دیتا ہے اور خدا کی آیات کو لوگوں کے سامنے تلاوت کرتا ہے اور جب ان کو خدا کی شناخت اور معرفت ہو جاتی ہے اور وظائف اور تکالیف قبول کرنے کا زمینہ فراہم کرتا ہے در حقیقت اس مرحلہ میں نبی یا پیغمبر عقل منفصل کا کردار ادا کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں کسی بھی طرح کا کوئی زور اور دباؤ نہیں دیا جاتا اور ان کی آزادی سلب کئے بغیر ان کی عقل و فہم کو بلند کرتا ہے تا کہ ان میں آزادانہ طور پر انتخاب کا زمینہ فراہم ہو جائے اور آزادانہ طور پر اسلام اور اس کے عظیم احکام کو قبول کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے۔

پیغمبر اس لئے مبعوث ہوتا ہے تا کہ لوگوں کو حق و باطل کی شناخت کرائے اور ان کو حق و باطل کے راستہ پر لا کر کھڑا کردے تا کہ اپنی مرضی اور آزادی سے یا راہ حق و حقیقت کا انتخاب کرلے یا باطل کا راستہ اپنا لے اس کے لئے وہ اپنی طاقت کے ذریعہ رسالت کو قبول نہیں کراتا یا دباؤ ڈال کر اپنے نظریات لوگوں سے قبول نہیں کراتا، (کیونکہ) یہ ارادہ الٰہی کے برخلاف ہے، خداوند عالم کا ارادہ یہ ہے کہ عوام الناس حق و باطل کے راستہ کو پہچان کر آزادانہ طور پر کسی ایک کا انتخاب کریں لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ خدا کا بھیجا نبی پہلے مرحلہ میں عوام الناس سے رابطہ برقرار کرتا ہے اور ان کو اپنے سے مانوس کرتا ہے ان سے گفتگو کرتا ہے نیز عقلی دلائل، معجزات اور آیات الٰہی کے ذریعہ اپنا پیغام ان تک پہنچاتا ہے، اور حق (حقیقت) کی پہچان کراتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام خداوند عالم، اس کی آیات اور الٰہی نظام کو مستقر ہونے کے سلسلہ میں عوام الناس پر کسی طرح کا کوئی سختی اور دباؤ نہیں ڈالتے تھے، ان کے اہداف میں لوگوں کی آزادی اور آگاہانہ انتخاب پر خاص توجہ رکھی جاتی تھی، در حقیقت عوام

الناس کی آزادی کا خیال دوسرے نظاموں سے زیادہ رکھا جاتا تھا، ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ عوام الناس دعوت خدا اور نظام کو قبول کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہوں اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ انسان کو خلق کرنے سے خداوند عالم کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود انتخاب کرنے والا ہو اور اپنے مکمل اختیار اور آزادانہ طریقہ سے راہ حق کا انتخاب کرے اور اسی کی ہدایت حاصل کرے، انبیاء علیہم السلام کا دعوت خدا اور نظام الٰہی کا قیام کے لئے اپنی طاقت اور زور کا استعمال کرنا؛ خداوند عالم کے ہدف اور مقصد سے ہم آہنگ نہیں ہے اگر طے یہ ہو کہ انسان کسی راستہ کو مجبوری کی حالت میں یا طاقت کے زور پر قبول کرے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس راستہ کی حقانیت کو نہ پہچانے، یہاں تک کہ شاید اس راستہ کے صحیح (بھی) نہ مانتا ہو؛ کسی بھی راستہ کی حقانیت اور اس کے صحیح ہونے کو معین کرنے کے لئے پہلے اس کے بارے میں شناخت اور معرفت ضروری ہے اور آزاد طور پر اس راستہ کو انتخاب کرنے کا زمینہ ہموار کیا جائے اور پھر خداوند عالم کے اس ہدف کے تحت کہ انسان علم و آگاہی کے ساتھ آزادانہ طور پر حق و حقیقت کا راستہ انتخاب کرے، خداوند عالم نے معجزہ کے ذریعہ راہ حق کو عوام الناس پر نہیں تھونپا ہے اور اس کی مرضی بھی یہ نہیں ہے کہ معجزہ کے ذریعہ لوگوں کو آزادانہ انتخاب سے روک دے اور ان کی مرضی میں تصرف کرے تا کہ غیر اختیاری طور پر راہ حق کو قبول کرلیں، اور اس کے مقابلہ میں سست پڑ جائے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾ [1]

"(اے رسول) شاید تم (اس فکر میں) اپنی جان ھلاک کر ڈالو گے کہ یہ (کفار) مومن کیوں نہیں ہو جاتے اگر ہم چاہیں تو ان لوگوں پر آسمان سے کوئی ایسا معجزہ نازل کریں کہ ان لوگوں کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں"

6۔ عوام الناس کی ہدایت میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ضرورت

قارئین کرام! اس بات پر توجہ رہے کہ خداوند عالم نے عوام الناس کی ہدایت کے لئے اپنی طرف سے انبیاء بھیجے تا کہ راہ حق و باطل میں شناخت کرائیں، تا کہ وہ صحیح راہ کی شناخت اور معرفت کے بعد آزادانہ طور پر اس صحیح راستہ کا انتخاب کریں؛ بعض مستکبر اور منفعت طلب لوگ جو لوگوں کی جھل و نادانی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بہت زیادہ مال و دولت اکھٹا کر لیتے ہیں وہ لوگ انبیاء علیہم السلام کی دعوت حق اور لوگوں کی ہدایت میں اپنے شیطانی اہداف کی بنا پر مانع ہوتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام سے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کو عوام الناس سے گفتگو بھی نہیں کرنے دیتے یا ان کو آیات الٰہی بھی نہیں سنانے دیتے تا کہ کہیں ایسا نہ ہوں کہ یہ لوگ ہدایت پا جائیں یہ لوگ اپنی طاقت کے بل بوتے پر عوام الناس کو بہت زیادہ آزار و اذیت پہنچاتے ہیں اور ان کے لئے بہت سی مشکلیں پیدا کر دیتے ہیں تا کہ عوام الناس ہدایت سے فیضیاب نہ ہو سکیں یہ لوگ جو عوام الناس کی ہدایت میں مانع ہوتے ہیں خداوند عالم نے ان کو قرآن مجید میں "ائمہ کفر" اور فتنہ و فساد کی جڑ

[1] سورۂ شعراء آیت ۳، ۴

کہا ہے، اور حکم دیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھی ان سے مقابلہ کریں اور ان کو اپنے راستہ سے ہٹادیں؛ کیونکہ ان کا وجود اور ان کی شیطانی اور باطل حرکتیں خدائی اہداف میں مانع ہوتی ہیں کیونکہ خداوند عالم تو یہ چاہتا ہے کہ تمام انسان ہدایت سے سرفراز ہو جائیں اور راہ حق و باطل کو پہچان لیں، لیکن یہ لوگ مانع ہوتے ہیں:

ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

فَقَاتِلُوٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ [1]

"تو تم کفر کے سر برآوردہ لوگوں سے خوب لڑائی کرو ان کی چار قسموں کا ہرگز کوئی اعتبار نہیں ہے تاکہ یہ لوگ اپنی شرارت سے باز آجائیں"

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سڑک پر گاڑی چلا رہا ہے اور اس کے راستہ میں ایک بڑا سا پتھر موجود ہو تو اس کو اپنا راستہ طے کرنے کے لئے اس پتھر کو سڑک سے اٹھا کر دور پھینکنا پڑے گا، اور اس سلسلہ میں اپنی تمام تر کوششوں کو اس میں لگادے گا تاکہ اس پتھر کو اپنے راستہ سے ہٹادے اصولی طور پر ہر صاحب عقل انسان اپنے راستہ میں آنے والی رکاوٹ کو دور کرتا ہے خداوند عالم بھی اپنے اس ہدف کے تحت کہ انسان ہدایت یافتہ ہو جائے؛ حکم دیا ہے کہ پیغمبر اور ان کے اصحاب، بلکہ دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ ہدایت کے سلسلہ میں موجود دنیا بھر کے استکبار، بادشاہ، ستمگر، دولت پرست اور تمام شیطانی قدرتوں کے ساتھ جنگ کریں اور ان کو نابود کردیں۔

خلاصہ یہ کہ: خداوند عالم کا فرمان یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت میں جو لوگ مانع ہوں (اہل کفر و باطل) ان کے ساتھ طاقت کے ذریعہ مقابلہ کیا جائے اور شدت پسندی کو ان کے حق جائز قرار دیا گیا ہے خداوند عالم نہیں فرماتا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر مسکرائیں اور خوش لہجہ، تبسم، التماس اور التجا کریں کہ آپ حضرات اجازت دیں تاکہ ہم عوام الناس کی ہدایت کریں! اگر وہ اس درخواست کو قبول کرنے والے ہوتے اور اپنی خوش لہجہ زبان سے اپنی برے چال چلن سے رکنے والے ہوتے تو پھر وہ مستکبر ہی کیوں ہوتے ان میں بنیادی طور پر استکبار، حیوانیت اور سرکشی ان کے اندر شامل ہے، وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں اور ان کا خون پی لینا چاہتے ہیں، وہ اس چیز کی اجازت نہیں دیتے کہ ان کے منافع خطرہ میں پڑ جائیں، اسی وجہ سے یہ لوگ نہیں چاہتے کہ عوام الناس ہدایت یافتہ ہو جائیں اور انبیاء علیہم السلام کے فرمانبردار بن جائیں مومنین اور ہدایت کے طلبگاروں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں ہے کہ ان لوگوں سے شدت اور تشدد کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، اسی وجہ سے خداوند عالم اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید میں حکم دیتا ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کریں اور تشدد اور غصہ کے ساتھ ان کا مقابلہ کریں وہی پیغمبر جس کی صفت خداوند عالم یوں بیان فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۱۲

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ.[1]

"(تو اے رسول یہ بھی) خدا کیا یک مہربانی ہے کہ تم (سا) نرم دل) سردار) ان کو ملا اور تم اگر بد مزاج اور سخت دل ہوتے تب تو یہ لوگ (خدا جانے کب کے) تمہارے گروہ سے تتر بتر ہو گئے ہوتے"

دوسری جگہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ کفار (مشرکین اور منافقین) سے شدت کے ساتھ مقابلہ کریں اور ان سے جنگ کریں، اور شدت پسندی کو ان کے حق میں جائز جانتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۹.[2]

"اے رسول کفار کے ساتھ (تلوار سے) اور منافقوں کے ساتھ (زبان سے) جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور ان کا ٹھکانا تو جہنم ہی ہے اور وہ (کیا) جگہ ہے"

ایک دوسری جگہ خداوند عالم اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کی جان اور مال کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں ان کے سات شدت پسندی سے برتاؤ کریں، اور جیسے وہ کریں ان کو ویسا ہی جواب دیں، اور بہت زیادہ شدت کے ساتھ جنگ کریں، ارشاد ہوتا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۱۹۰ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹۱.[3]

"اور جو لوگ تم سے لڑیں تم (بھی) خدا کی راہ میں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو (کیونکہ) خدا زیادتی کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ اور تم ان مشرکوں) کو جہاں پاؤ مار ہی ڈالو اور ان لوگوں نے جہاں (مکہ سے) سے تمہیں شہر بدر کیا ہے تم بھی انہیں باہر نکال دو۔ اور فتنہ پردازی (شرک) خونریزی سے بھی بڑھ کے ہے اور جب تک وہ لوگ (کفار) مسجد حرام (کعبہ) کے پاس تم سے نہ لڑیں تم بھی ان سے اس جگہ نہ لڑو پس اگر وہ تم سے لڑیں تو (بے کھٹک) تم بھی ان کو قتل کرو۔ کافروں کی یہی سزا ہے۔"

7۔ الٰہی اقدار کی حفاظت اور مغربی کلچر سے روک تھام ضروری ہے

[1] سورۂ آل عمران آیت ۱۵۹

[2] سورۂ تحریم آیت ۹

[3] سورۂ بقرہ آیات ۱۹۰، ۱۹۱

دشمنوں سے مقابلہ اور جہاد، شجاعت، غیرت، حمیت، دینی تعصب، دین سے رغبت، فدا کاری اور ایثار وغیرہ بہترین اور عظیم ترین اسلامی اقدار ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں میں دینی پہچان، حیات، استقلال اور آزادی وجود میں آتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں مغربی کلچر (والے) یہ چاہتے ہیں کہ کچھ جھوٹے اور خود ساختہ اقدار جیسے مطلق طور پر شدت پسندی کو منع کرنا (وغیرہ) کے ذریعہ ہماری سلامی اقدار کو ہم سے چھینا چاہتے ہیں؛ اسی وجہ یہ کہتے ہیں کہ شدت پسندی مطلق طور پر مذموم اور محکوم ہے!!

جی ہاں ہم بھی مانتے ہیں کہ ابتداء میں کسی کے ساتھ شدت پسندی مذموم اور محکوم ہے، لیکن کیا شدت پسندی کے مقابلہ میں شدت پسندی یا ظلم وستم، قتل وغارت، جان و مال اور ناموس پر تجاوز، اور ان سب سے مہم اسلام (جس کے لئے مسلمانوں کی جان بھی قربان ہے)؛ سے خیانت کرنے والوں کے مقابلہ میں بھی شدت پسندی بری اور محکوم ہے؟ مسلم طور پر اس طرح کی شدت پسندی نہ صرف یہ کہ مذموم اور محکوم نہیں ہے بلکہ ضروری اور ہر مسلمان کی خواہش ہے۔

تو پھر کیوں ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے دینی اقدار کو پامال ہوتے ہوئے دیکھیں جو کہ ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے ان کو تمہارے ہاتھوں برباد ہوتا ہوا دیکھیں اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیں اور کچھ نہ کریں اور ان کے ساتھ پیدا کر مسکرائیں؛ پس خداوند عالم نے انسان میں غضب کو کس لئے پیدا کیا ہے؟ کس لئے ہمارے اندر قہر وغضب کے احساس کو پیدا کیا؟ آیا کچھ شدت پسند، خائن اور زرخرید غلاموں کے مقابلہ میں کچھ بھی اقدام نہ کریں یہاں تک کہ اگر ہمارا دین بھی خطرہ میں پڑ جائے کچھ بھی نہ بولیں اور شدت پسندی کو نہ اپنائیں؛ بلکہ آرام سے بیٹھے ہوئے مسکراتے رہیں، پس یہ آیت کریمہ کس کے لئے ہے:

"وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ"

کس لئے خداوند عالم نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ. [1]

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں"

کہتے ہیں کہ اسلام تشدد اور شدت پسندی کا مخالف ہے، تو آپ حضرات کہیں کہ اسلام کس شدت پسندی کا مخالف ہے؟ بعض مبہم چیزوں کو مطلق اقدار کے عنوان سے پیش کرتے ہیں تاکہ حقیقت کو چھپا سکیں، تاکہ شہادت طلبی، ایثار اور شجاعت وغیرہ کو لوگوں سے چھین لیں، اور ان کی جگہ بے توجہی، دین سے لاابالی اور دینی اور ملی غیرت وغیرہ جیسے چیزوں کو عوام الناس میں رائج کریں۔

---

[1] سورۂ فتح آیت ۲۹

ہمیشہ تساہل (سستی) اور تسامح (ذو معنی باتیں کرنا) کی باتیں کرتے ہیں، کیا جو شخص ہماری جان کے لئے خطرہ ہو اس کے مقابلہ میں تساہل اور تسامح سے کام لیا جاسکتا ہے؟! کیا وہ شخص جو انسانی ناموس میں خیانت کرے اس کے ساتھ تساہل اور تسامح سے کام لیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ شخص جو ہمارے دین کو جو ہماری جان سے بھی زیادہ عزیز ہے؛ ہم سے چھین لینا چاہتا ہو اس کے مقابلہ میں تساہل اور تسامح سے کام لیا جاسکتا ہے؟!

اس بنا پر، اسلامی حکومت کی تشکیل سے پہلے عوام الناس کی ہدایت کرنا ضروری ہے، اور اس مرحلہ میں عوام الناس سے سخت لہجہ میں گفتگو نہیں ہونا چاہئے، اور سختی اور طاقت کے بل بوتے پر اسلامی حکومت کے تحقق کے لئے قدم نہ اٹھایا جائے اسی طرح اس مرحلہ میں لوگوں سے جھوٹے وعدے، فریب کاری اور گمراہ کنندہ وسائل کے ذریعہ عوام الناس کی صحیح ہدایت میں مانع ہونا صحیح نہیں ہے اس مرحلہ میں بھر پور سنجیدگی، بردباری، حوصلہ، صبر اور بھر پور وضاحت، صداقت اور منطق اور عقل کی بنیاد پر عوام الناس سے گفتگو کی جائے تا کہ وہ حقیقت تک پہنچ جائیں اور غفلت و جہالت سے نجات پیدا کرلیں البتہ اس سلسلہ میں پیش آنے والی تمام تر رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹایا جائے، اور جو لوگ عوام الناس کی ہدایت میں مانع ہوتے ہوں ان سے مقابلہ کیا جائے تا کہ عوام الناس کے لئے حق و حقیقت کے راستے کو انتخاب کرنے کا راستہ فراہم ہو جائے۔

جس وقت عوام الناس کا ایک گروہ حق کی طرف ہدایت پا جائے تو پھر اس حق کے پیروکاروں میں اضافہ کرنے کے لئے اور اسلامی اور الٰہی معاشرہ کی وسعت کے لئے عوام الناس میں ثقافتی کارکردگی اور راہنمائی صبر و تحمل کے ساتھ ہوتی رہیں؛ جیسا کہ خداوند عالم بھی اپنے پیغمبر کو قرآن کریم میں اپنی رسالت کے پہنچانے میں صبر و تحمل کی طرف دعوت دیتا ہے اور آپ سے یہ چاہتا ہے کہ سختیوں، بری بھلی باتوں، گالیوں، سخت برتاؤ اور اذیتوں کے مقابلہ میں صبر و تحمل سے کام لیں تا کہ عوام الناس ہدایت یافتہ ہو جائیں:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ.[1]

"اے رسول) پیغمبروں میں سے جس طرح اولوالعزم (عالی ہمت) صبر کرتے رہے تم بھی صبر کر۔

8۔ قوانین کو جاری کرنے اور دشمن نظام سے بھر پور مقابلہ

قارئین کرام! جس وقت خداوند عالم کی مرضی کے مطابق اسلامی حکومت تشکیل پائے، تو معاشرہ میں اسلامی احکام اور قوانین جاری ہوں اور دوسری حکومتوں کی طرح اس میں قوہ قہریہ (پولیس یا فوج) سے استفادہ کیا جائے، نیز حکومت کے پاس خلاف ورزی کرنے والوں سے مقابلہ کے لئے کافی اسباب و وسائل موجود ہوں، اور مجرموں اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے زندان، جرمانہ اور دوسری سزائیں معین کی جائیں، اور بیرونی دشمنوں نیز اندرونی فتنہ وفساد سے روک تھام کے لئے پولیس اور فوج کا انتظام کیا جائے؛ کیونکہ حکومت صرف اخلاقی طور پر وعظ و نصیحت سے اپنا کام نہیں چلاسکتی وہ حاکم جس

[1] سورۂ احقاف آیت ۳۵

کے پاس طاقت اور قدرت نہ ہو اور فقط وعظ ونصیحت اور تذکر پر اکتفاء کرے وہ اخلاقی معلم تو ہوسکتا ہے حاکم نہیں ہوسکتا!!

پس جس قوت اسلامی حکومت اور قانونی حکومت تشکیل ہو جائے اور عوام الناس اس حکومت کو قبول کرلیں اور اس کی بیعت کرلیں، نیز حکومت بھی اسلامی قوانین اور احکام کو جاری کرنے اور ملکی مسائل میں رسیدگی کرنے میں مشغول ہو جائے، تو اگر کوئی گروہ فتنہ وفساد اور آشوب برپا کرے تو اس سے مقابلہ ضروری ہے جیسا کہ ہماری اسلامی فقہی کتابوں میں وارد ہوا ہے کہ فتنہ وفساد اور آشوب برپا کرنے والوں (جن کو اصطلاحاً "اہل بغی" (بغاوت کرنے والے) کہا جاتا ہے) سے جہاد واجب ہے جس طرح حضرت علی علیہ السلام نے فتنہ وفساد پھیلانے والوں سے مقابلہ کیا ہے اور ان کو اپنی جگہ بٹھا دیا ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات غم ناک کے بعد عوام الناس حضرت علی علیہ السلام کی بیعت پر آمادہ نہیں ہوئی جس کے نتیجہ میں حکومت دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی، (اس وقت بھی) حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کی ہدایت فرمائی اور ان کی راہنمائی کی ہے، اور حضرت نے 25 سال سے اپنے اس وظیفہ کو انجام دیا اور حکومت (وقت) سے کنارہ کشی اختیار کرلی لیکن جس وقت اسلامی ممالک مثل مصر، عراق اور مدینہ منورہ کے ایک بڑے مجمع نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور آپ کی بیعت کی، اور آپ کو اپنا امام اور مقتدا تسلیم کرلیا، اس وقت حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اوپر حجت تمام دیکھی اور عوام الناس پر حکومت کرنے کا اپنا فریضہ سمجھا کیونکہ اس عظیم مجمع کی بیعت کے پیش نظر جس کا وجود تاریخ میں بے نظیر ہے؛ حکومت سے دور رہنے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہی، لہٰذا آپ حکومت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے؛ حالانکہ آپ کو حکومت سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی، اور صرف عوام الناس کی بیعت کے ذریعہ الٰہی وظیفہ کا احساس کرتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالی، جیسا کہ آپ نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اَمَا وَ الَّذِی فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَأَ النَّسَمَةَ لَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَ قِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ، وَمَا أَخَذَ اللهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَنْ لَا يُقَارُّوا عَلَى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا وَلَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَأْسِ أَوَّلِهَا وَلَأَلْفَيْتُمْ دُنْيَاكُمْ هٰذِهِ أَزْهَدَ عِنْدِي مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ۔ [1]

دیکھو! اس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں، اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی، اور خداوند عالم نے علماء سے یہ عہد و پیمان نہ لیتا کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون وقرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو پہلے والے کے کاسہ سے سیراب کرتا اور میری نظر میں تمہاری دنیا کی قیمت بکری کی ناک سے بہتے پانی کی طرح ہے۔

لیکن ابھی حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو صرف چند ہی دن گذرے تھے کہ دنیا پرست اور تبعیض اور بے عدالتی چاہنے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر 3

والوں نیز اپنے کو دوسروں سے بہتر جاننے والے حضرت علی علیہ السلام کی عدالت کو برداشت نہ کر سکے اسی طرح وہ لوگ جو حضرت علی علیہ السلام کی حکومت میں اپنی شیطانی تمناؤں اور غاصب اور غیر قانونی حکومت کو خطرہ میں دیکھ رہے تھے، اسی طرح وہ سادہ لوح مسلمان جو صحیح اسلامی نظریہ کو سمجھنے سے قاصر تھے نیز ان کی فکر پست اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کی عظیم حکمت عملی کو نہیں سمجھ رہے تھے، یہ تمام لوگ ایک کے بعد ایک فتنہ وفساد اور آشوب برپا کرنے لگے، چنانچہ جنگ جمل، جنگ صفین اور آخر کار جنگ نہروان رونما ہوئیں اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام ایک اسلامی حاکم کے عنوان سے؛ جب آپ نے الٰہی اور اسلامی قوانین واحکام کو خطرہ میں دیکھا تو آپ کا کیا وظیفہ تھا؟ کیا آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھے تماشا دیکھتے رہتے!! اور فتنہ وفساد اور آشوب کی روک تھام نہ کرتے؟! کیونکہ تشدد اور شدت پسندی محکوم اور مذموم ہے؟!!

لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اس وقت اسلامی حکومت اور اس کے ارکان کی حفاظت کے خاطر تلوار اٹھائی اور باغی اور سرکش لوگوں کے ساتھ جنگ کی، جنگ جمل میں بہت سے صحابی رسول یہاں تک کہ طلحہ وزبیر جو مدتوں تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل جہاد کرتے تھے؛ کو قتل کیا حالانکہ زبیر آپ کا پھوپھی زاد بھائی تھا اور اس کی جانفشانی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بزم میں اپنے صلاحیت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے دعا فرمائی ہے، لیکن حضرت علی علیہ السلام نے نہیں فرمایا: کہ اے زبیر! تو میرا پھوپھی زاد بھائی ہے اور دونوں دوستی کرلیں، اور میں تجھ سے نرم رویہ اختیار کروں گا اور تیری چاہتوں کو پورا کردوں گا بلکہ آپ نے اس عقیدہ کے ساتھ کہ چونکہ میری حکومت حق ہے لہٰذا جو لوگ اس کے مقابلہ میں سرکشی کریں گے ان کو پسپا کردیا جائے لہٰذا آپ نے پہلے ان کو وعظ اور نصیحت فرمائی لیکن جب انہوں نے نہ مانا تو پھر تلوار کا سہارا لیا اور ان کو پسپا کردیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کرڈالا کیونکہ آپ کی نظر میں خدا اور مسلمانوں کا حق ذاتی مفاد سے کہیں بالاتر تھا اور اسلامی نظام کو باقی رکھنے کے لئے تشدد اور شدت پسندی کو ضروری سمجھا؛ کیونکہ اسلامی نظام کی حفاظت کے لئے تشدد اور شدت عمل کو واجب سمجھتے تھے۔

۹۔ سازش کرنے والوں اور زرخرید غلاموں کے مقابلہ میں عوام الناس کی ہوشیاری

قارئین کرام! اسلامی انقلاب سے پہلے جب اسلامی حکومت تشکیل نہیں ہوئی تھی حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تقاریر اور مکاتبات کے ذریعہ عوام الناس کی ہدایت اور راہنمائی کرتے تھے اور حکومت کو نصیحت فرمایا کرتے تھے؛ لیکن جس وقت لوگوں نے امام خمینیؒ کی بیعت کی اور اسلام پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوگئے اور اسلام دشمن طاقتوں کو ملک سے باہر نکالنا چاہتے تھے اور اس ملک میں اسلامی والٰہی حکومت کے خواہاں تھے، اس وقت حضرت امام خمینیؒ نے حکومت کی ذمہ داری قبول کی اور فرمایا:

"میں اس ولایت کی مشروعیت کی بنا پر جس کو خداوند عالم نے مجھے عطا فرمائی ہے نیز آپ حضرات کی مدد اور کمک کے ذریعہ اس حکومت کا جنازہ نکال دونگا اور خود حکومت بناؤں گا۔"

یعنی امام خمینیؒ ولی فقیہ کے عنوان سے عوام الناس پر حکومت کا حق رکھتے تھے اور آپ کی ولایت الٰہی مشروعیت اور قانونیت رکھتی تھی، لیکن جب تک عوام الناس میدان میں نہ آئی اور آپ کی بیعت نہ کی، اس وقت تک اس ولایت نے عینی تحقق پیدا نہ کیا؛ لیکن عوام الناس کے میدان میں آنے اور انقلابی صفوں کم نظیر حاضر ہونے اور راہ اسلام و رہبری کی اتباع کرنے میں وفاداری اور جانفشانی کے اعلان کے بعد، وہ الٰہی ولایت عینی تحقق موجود ہوگئی اور اسلامی حکومت تشکیل ہوگئی۔

بے شک کہ اس اسلامی حکومت کو لاکھوں شہیدوں کا خون دینا پڑا ہے جس کی وجہ سے آج بھی باقی ہے اور بہت عظیم فدا کار اور انقلاب کے فدا کاروں کے ذریعہ اس ملک کی سرحد اور انقلابی اقدار کی حفاظت میں مشغول ہیں لہٰذا چند زرخرید غلاموں کے ذریعہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے ہمارے عوام الناس اس چیز کی کبھی اجازت نہیں دیں گے کہ چند خود فروش مزدوروں کے ذریعہ؛ اسلامی مصالح، لوگوں کی جان و مال اور ناموس خطرہ میں پڑ جائیں جو لوگ اس مرحلہ میں (18 تیر ماہ 1378 ہجری شمسی کے بعد سے [1] کچھ آشوب بپا کرنے والے مزدوروں اور دوسروں کی روٹیوں پر پلنے والے سڑکوں پر نکل کر آشوب بپا کرنے لگے اور لوگوں کے گھروں، دکانوں وغیرہ کو آگ لگائیں اور بہت زیادہ لوٹ مار کریں، لوگوں کی ناموس اور عزت کو پامال کریں، تو کیا ان تمام لوگوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ نہ کیا جائے؟!! اور کیا اسلام تشدد کی اجازت نہیں دیتا؟! یا یہ کہ ان لوگوں نے اسلام کو نہیں پہچانا، یا پھر وہ مسلمانوں کے ساتھ خیانت کرنا چاہتے ہیں!!

ہنسی اور لوریاں دے کر تو آشوب گری سے روک تھام نہیں کی جاسکتی، ان کے مقابلہ میں پولیس، تشدد اور شدت عمل کے ذریعہ برتاؤ کیا جائے اور طاقت کے بل بوتے پر ان کی روک تھام ہوسکتی ہے، جس کے بعد پھر کبھی ملک میں اس طرح کے دردناک حوادث رونما نہ ہونے پائیں کیونکہ ہمارے برادران ان لوگوں کے فریب میں نہیں آئیں گے جو کہتے ہیں کہ تشدد اور شدت پسندی ہمیشہ اور مطلقاً ممنوع ہے، ان کی باتوں کو نہیں مانیں گے اور اگر آج تک صبر کیا اور خون جگر پیا ہے تو وہ مقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ کی طاعت اور فرمانبرداری کی وجہ سے ہے، ورنہ تو جب ہمارے فدا کار لوگوں کو یہ احساس ہوجائے کہ مقام معظم رہبری فلاں کام پر دل سے راضی نہیں ہیں تو پھر ان کی مرضی کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتے ہیں چنانچہ پوری دنیا نے دیکھا کہ جب مقام معظم رہبری نے ساکت رہنے اور آرام سے رہنے کے لئے کہا تو سبھی لوگ آپ کی اطاعت اور عمومی مصالح کی بنا پر سب بیٹھے دیکھتے رہے اور خون جگر پیتے رہے اور جب تک آپ کا اشارہ نہ ہوا سڑکوں پر نہ آئے اور مظاہرے نہ کئے، لیکن جیسے ہی انقلاب سے وفاداری کے اعلان کا وقت آپہنچا تو دشمنوں کو دکھا دیا کہ ہم ہمیشہ اسلام اور انقلاب سے دفاع کرنے کے لئے حاضر ہیں، پورے ملک میں وہ عظیم مظاہرے ہوئے جن پر دنیا بھر کے لوگوں اور خود دشمنوں نے تعجب کیا۔

---

[1] یہ تہران یونیورسٹی میں ہونے والے حادثہ کی طرف اشارہ ہے جس کی آگ وہاں سے شروع ہوکر شہر کے مختلف مقامات تک پہنچی اور جس میں امریکہ غلاموں نے قتل وغارت اور بربریت کا وہ کھیل کھیلا جس سے انسانیت لرز اٹھی یہاں تک کہ عبادت گاہوں اور مساجد میں آگ لگادی گئی۔

سینتیسویں نشست

تشدد کے سلسلہ میں ایک تحقیق

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے عرض کیا کہ اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ معاشرہ میں اسلامی قوانین نافذ کرے اور امن و امان برقرار رکھے نیز ملک کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رکھے ظاہری بات ہے کہ اس سلسلہ میں پولیس، طاقت اور تشدد سے کام لیا جائے گا اور جو لوگ اسلامی ملک سے دشمنی اور عناد کی بنا پر جنگ و جدال کرتے ہیں؛ ان سے پیار و محبت اور نرمی کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، یا وہ لوگ جو اندرون ملک شیطانی حرکتوں کے تحت فساد کرتے ہیں؛ ان سے پیار و محبت کے ذریعہ ان سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ جس طرح سے اسلامی قوانین رحمت و محبت اور مہربانی پر مبنی ہوتے ہیں اور اسلام پیام دوستی و محبت دیتا ہے؛ اسی طرح خاص مواقع پر طاقت، سخت رویے اور خشونت (شدت پسندی) سے بھی کام لیا جاتا ہے، اور اسلام مجرموں اور فساد کرنے والوں کے ساتھ مقابلہ کرنے اور سزا دینے کا بھی حکم دیتا ہے لیکن چونکہ یہ بحث ایک فرعی تھی اور اس بحث کا شمار ہماری اصلی بحث میں نہیں ہوتا، لہٰذا مختصر طور پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن حق مطلب ادا نہیں ہوسکا لیکن اس سلسلہ میں اخباروں اور جرائد میں ہونے والے عکس العمل (ری ایکشن) سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبت اور تشدد کے سلسلہ میں مزید تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، لہٰذا اس جلسہ کے لحاظ سے اس موضوع پر بعض چیزیں بیان کرتے ہیں۔

2۔ دشمنوں کی طرف اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اور کارکردگی

ایک زمانہ سے اسلام کے دشمنوں نے دین اسلام کو تشدد اور شدت پسندی کا دین قرار دے رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، کیونکہ اسلام نے دشمنوں سے جہاد اور مقابلہ کو قابل ستائش قرار دیا ہے، چنانچہ قرآنی بہت سی آیات جہاد کے بارے میں موجود ہیں، اور جہاد کو فروع دین قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ بعض لوگ اس مسئلہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام، تشدد اور شدت پسندی کا دین ہے، اور اسلام پھیلانے کے لئے طاقت، اور تلوار کا استعمال کیا گیا ہے، یعنی لوگوں نے ڈر کر اسلام کو قبول کیا ہے ان کے مقابلہ میں بعض لوگوں نے اس نظریہ سے متاثر ہوتے ہوئے دفاعی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں تشدد نہیں ہے، اسلام ہمیشہ پیار و محبت کی دعوت دیتا ہے، اور جہاد یا شدت پسندی کے مسائل ایک خاص زمانہ اور خاص مقام سے مخصوص تھے، عصر حاضر

میں ان مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہے، اور ان کو (آج کل) بیان بھی نہیں کرنا چاہئے، آج کل صرف پیار محبت اور جھک کر باتیں کرنا چاہئے!

ہماری ملت جانتی ہے کہ دشمن کن اغراض ومقاصد کے تحت اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے لہٰذا ہماری ملت دشمن کے پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہوتی لیکن توجہ رہے کہ مسئلہ یہی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے آگے قدم رکھا جاتا ہے، اور جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ آج اسلامی دشمن طاقتیں نئے نئے طریقوں سے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی ہیں اور ہر روز مختلف طریقوں؛ جیسے ادبی، ھنری اور دیگر طریقوں سے اسلامی معارف میں شبہات واعتراضات وارد کر رہی ہیں، تاکہ ہماری ثقافت میں خطرناک برے آثار پھیلا دیں تاکہ عوام الناس دینی سلسلہ میں کمزور ہو جائیں یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں نفسیاتی اور ذاتی تجربات شہادت دیتے ہیں۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے اپنے اسلامی معاشرہ اور دوسرے اسلامی ملکوں کو دیکھا ہے کہ جس وقت اسلام دشمن طاقتیں اپنے مختلف طریقوں سے مسلسل پروپیگنڈا کرتی ہیں اور کسی ایک معاشرہ کو تحت تاثیر قرار دیتی ہیں، یہاں تک کہ آنے والی نسل (جو دشمن کے مدنظر ہوتی ہے) دشمن کی تبلیغ سے متاثر ہو جاتی ہے، اور جوان طبقہ دشمن کے پروپیگنڈے کی زد میں آکر اپنی دینی اور قومی حیثیت بھول جاتا ہے اور جیسا کہ دشمن چاہتا ہے اپنی اصلی حیثیت کو بھول کر دشمن کی پیش کردہ صورت اپنا لیتا ہے۔

اگر ہم عصرِ حاضر کی ثقافت خصوصاً روشن خیال رکھنے والوں کے یہاں رائج ثقافت کو دیکھیں تو دشمن کے پروپیگنڈے کے آثار واضح طور پر دکھائی دیں گے، اور ان چیزوں کا بھی مشاہدہ کرلیں گے جو دشمن نے ہماری یہاں رائج کی ہیں ہماری ثقافت میں دشمن کی رائج کردہ چیزوں میں سے آزادی اور ڈیموکریسی ہیں جس کو مطلق اقدار کی صورت میں ہمارے معاشرہ میں رائج کر دیا گیا ہے، اور ان چیزوں کے بارے میں اس قدر پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ گویا ایک بت ہے کہ کوئی اس ڈیموکریسی کے خلاف بولنے کی جرائت نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے نقائص کو بیان کرسکتا ہے حالانکہ خود مغربی دانشوروں نے ڈیموکریسی کے سلسلہ بہت زیادہ اور سخت تنقید کی ہے، اور آج بھی بہت سے سیاسی فلاسفہ اور سماج ماہرین مختلف مواقع پر ڈیموکریسی کے برخلاف گفتگو کیا کرتے ہیں نیز اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھی جاتی رہی ہیں، اور یہی نہیں بلکہ ان میں سے بعض (بہترین) کتابوں کا دنیا کی مختلف مشہور زبانوں میں ترجمہ ہوتا ہے منجملہ فارسی (وارد و)، ان کو عوام الناس پڑھتے ہیں؛ لیکن اس زمانہ میں دشمنوں کی طرف سے ڈیموکریسی کے اس طرح مقدس جلوہ دکھائے جاتے ہیں کہ جہان سوم میں کوئی اس کے خلاف بولنے کی جرائت نہیں کرتا اور اس سلسلہ میں تنقید نہیں کرسکتا، اگر کوئی مغربی مما لک میں رائج ڈیموکریسی اور آزادی کے بارے میں زبان کھولے تو اس کو بیک ورڈ اور ظلم واستبداد جیسی تہمتوں سے نوازا جاتا ہے۔

3۔ مغربی ممالک میں حقوق بشر کا جھوٹا دعویٰ

بے شک مغربی باشندے اپنے پروپیگنڈوں کے پیچھے ایک خاص مقصد چھپائے ہوئے ہیں، اور اپنے منافع کے خاطر نیز انقلابی ممالک کو اپنے تحت لانے کے لئے ہمیشہ ڈیموکریسی، آزادی اور حقوق بشر کا دم بھرتے ہیں، اور اگر کوئی ان کی مخالفت کرتا ہے تو اس پر ڈیموکریسی کی مخالفت اور حقوق بشر کی پامالی کی تہمت لگاتے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ظالم ترین اور ڈکٹیٹر "Dictaor" حکومتوں کے ظلم وستم کے مقابلہ میں کوئی عکس العمل (ری ایکشن) نہیں دکھایا جاتا، کیونکہ اس حکومت کے ذریعہ ان کے مقاصد پورے ہوتے ہیں بلکہ خود وہ حکومتیں انہیں کی پٹھو ہوتی ہیں۔

قارئین کرام! ان کے جھوٹے دعوں کا پول تو اس وقت کھلتا ہے جب کسی ملک میں ڈیموکریسی اصول وضوابط کے تحت انتخابات ہوتے ہیں لیکن اسلام پسند پارٹی اکثریت میں آجاتی ہے اور وہ پارٹی کامیاب ہوجاتی ہے تو اس وقت ان انتخابات کو باطل قرار دیدیا جاتا ہے؛ اور فوجی بغاوت کے ذریعہ فوجی حکومت قائم کردی جاتی ہے اور ہر روز ہزاروں بے گناہ لوگوں کا خون بھایا جاتا ہے، اور آزادی خواہ مسلمانوں کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے اور حقوق بشر کے یہ جھوٹے نعرے لگانے والے نہ صرف یہ کہ اس حکومت کو حقوق بشر پامال کرنے اور آزادی کی رعایت نہ کرنے کا الزام نہیں لگاتے بلکہ جلد ہی اس حکومت کو تسلیم بھی کرلیتے ہیں اور ان کے کارناموں کی تائید کرتے ہیں اور بہت ہی وسیع پیانے پر ان کی حمایت کرتے ہیں۔

یا جس وقت صیہونیزم "سرزمین فلسطین" پر قبضہ کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنے گھروں سے باہر نکال دیتے ہیں اور ہزاروں بے گناہ لوگوں کا خون بھاتے ہیں اور لاکھوں لوگوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیتے ہیں، اس وقت کوئی نہیں کہتا کہ ان کا یہ کام حقوق بشر کے خلاف ہے بلکہ طاقتور ممالک اور سوپر پاور ممالک اس غاصب اور قابض حکومت کو تسلیم کرلیتے ہیں، جبکہ یہ ظالم اور غاصب حکومت اس سرزمین کے اصلی مالکوں کا قتل عام کرتی ہے اور ان کے گھروں کو مسمار کررہی ہے، لیکن ان سب کو دیکھ حقوق بشر کا نعرہ لگانے والے کوئی اعتراض نہیں کرتے صرف کبھی کبھار اقوام متحدہ اپنی سیاست کے تحت کوئی بے معنی اور غیر موثر حکم صادر کرتی ہے اور عملی طور پر اس غاصب وظالم حکومت کو گرین لائٹ دکھاتی ہے کہ اگر اس حکم نامہ پر عمل نہ بھی کیا تو کوئی بات نہیں کوئی مشکل پیش آنے والی نہیں ہے اور کسی طرح کا کوئی ایکشن نہیں لیا جائے گا۔

جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دسیوں حکم نامہ اسرائیل غاصب کے خلاف دیئے جاچکے ہیں لیکن اس نے کسی پر بھی عمل نہیں کیا ہے اور ہمیشہ ان کی مخالفت کرتا رہا ہے، لیکن نہ یہ کہ کبھی اس کو سزا دی گئی بلکہ انعام کے طور پر اس کو کروڑوں ڈالر کی (بلاعوض) امداد کی جاتی ہے اور بڑے بڑے اسلحے، مہلک ہتھیار (آئیٹم بم) بنانے کی ٹکنالوجی دی جاتی ہے تو کیا کوئی حکومت اور حقوق بشر کا دفاع کرنے والوں نے اس غاصب اسرائیل کے بارے میں جو انسانوں کے روزمرہ کے حقوق بھی پامال کررہا ہے اور اقوام متحدہ کے حکم ناموں کو بھی نہیں مانتا اور ہمیشہ ان کی مخالفت کرتا ہے، کیا اس کو کبھی کسی نے ڈیموکریسی اور حقوق بشر کا

مخالف قرار دیا؟؟!!

4۔ اسلامی نظام پر تشدد طلب ہونے کا الزام اور اس کے خلاف سازشیں

ہمارے ملک میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد (اسلام دشمن طاقتوں نے) تشدد کے سلسلہ میں بہت زیادہ پروپیگنڈا کیا ہے، سب سے پہلے یہ کہا کہ شاہ پہلوی کی قانونی حکومت کے سامنے قیام کرنا تشدد ہے اور انقلاب کی کامیابی کے بعد، جب منافقین گروہوں نے عوام الناس کو اپنے غیر اسلامی اہداف سے ہم آہنگ نہ پایا تو انہوں نے انقلاب اور عوام الناس سے مقابلہ شروع کر دیا اور دینی اور سیاسی مہم شخصیتوں کو قتل کرنے لگے یہاں تک کہ بے گناہ لوگوں پر بھی رحم نہ کیا، جس کے بعد عوام الناس نے بھی ان سے مقابلہ شروع کر دیا اور ان کو ملک سے بھگا دیا؛ اس روز سے آج سے مغربی ممالک ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ منافقین سے ایسا برتاؤ کرنا تشدد ہے! کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ ان منافقین کے گروہوں نے کس قدر ہمارے ملک کو نقصانات پہنچائے ہیں کوئی مہم شخصیتوں کے قتل کی مذمت نہیں کرتا ہے، لیکن جس وقت ایک ملت اپنے دین اور ملک سے دفاع کرنے کے لئے قیام کرتی ہے اور ٹروروسٹوں "Terroristes" کو پسپا کرتی ہے اور ان میں سے بعض لوگوں کو سزائے اعمال تک پہنچاتی ہے اور بعض کو ملک بدر کرتی ہے تو اس وقت شور و غل مچاتے ہیں کہ یہ سب کچھ حقوق بشر کے خلاف ہے!!

اسی طرح جب 18 تیر ماہ 1378ھ شمسی کے بعد بعض فتنہ و فساد برپا کرنے والے بیت المال، عوامی مال دولت، بینک، ذاتی اور سرکاری گاڑیوں یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی آگ لگا دیتے ہیں اور عورتوں کو بے آبرو کرتے ہیں عورتوں کے سروں سے چادر چھین لیتے ہیں؛ اس وقت کوئی نہیں کہتا کہ یہ کام حقوق بشر کے خلاف ہے، بلکہ ان لوگوں کو اصلاح طلب اور ڈیموکریسی و آزادی کا طرف دار کہا جاتا ہے! لیکن اگر اسلامی جمہوری ایران اور فداکار بسیجی (عوامی رضا کار فوج) بے خوف و خطر ان سے مقابلہ کرتی ہے اور دین و شرف اور اپنے محبوب نظام سے دفاع کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کا قلع و قمع کرتی ہے تو اس موقع پر یہ لوگ فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں کہ ایران میں آزادی نہیں ہے، اور ایرانی نظام حکومت ڈکٹیٹر شپ "Dictaorship" ہے!!

مغربی ممالک اپنے دعوی کے باطل ہونے کو جانتے ہیں لہٰذا انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد سے اسلامی نظام کو درہم و برہم کرنے کے لئے اس طرح کے پروپیگنڈے کیا کرتے ہیں اگر چہ ہم ان کے نحس مقاصد اور ارادوں سے بے خبر نہیں ہیں، لیکن وہ اپنے تجربات کی بنا پر اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس طرح ایک نظام کو سرنگوں کیا جاتا ہے چاہے پچاس سال کے بعد ہی کیوں نہ ہو، (اگر چہ ان کا یہ خیال باطل اور بے ہودہ ہے) لہٰذا وہ ابھی سے اس سلسلہ میں مختلف طریقوں سے بہت زیادہ کارکردگی کر رہے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ انقلاب کی ایک دو نسل گذرنے کے بعد جنہوں نے انقلاب کو نہیں سمجھا ہے اور انقلاب سے پہلے مفاسد اور شاہ پہلوی کے ظلم و جور کو نہیں دیکھا ہے اور اسلامی نتائج سے آگاہی نہیں رکھتے نیز حضرت امام خمینیؒ

اور ان کے ساتھیوں کے تربیت یافتہ نہیں ہے، یہ سب ان کے پروپیگنڈوں سے متاثر ہو جائیں گے؛ تا کہ اسلامی حکومت کو سرنگون کر کے اپنی مرضی کی حکومت تشکیل دیں جس کو آج کی اصطلاح میں ڈیموکراٹک "Democratic" کہا جاتا ہے۔

5۔لوگوں میں انتخابات سے بائیکاٹ کا راستہ ہموار کرنا

یہ لوگ اپنے نحس مقاصد تک پہنچنے کے لئے حساب شدہ منصوبہ بندی کرتے ہیں اور ثقافتی بنیادی فعالیت انجام دیتے ہیں اور موثر و کارگر وسائل کو بروئے کار لاتے ہیں انقلاب کی کامیابی کے بعد سے (خصوصاً آخری چند سالوں سے) جن الفاظ سے استفادہ کرتے ہیں، ان میں سے تساہل (سستی) تسامح (لاپرواہی) اور مدارا (تال میل) ہیں جن کو مطلق اقدار کے عنوان سے پیش کرتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں قاطعیت اور تشدد کی مطلق طور پر مذمت کرتے ہیں۔

اس نظریہ کی دلیل یہ ہے کہ انہوں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ جو چیز نظام اسلامی کے بقاء کی ضامن ہے وہ ہے عوام الناس خصوصاً جوانوں اور بسیجیوں کا اسلام اور رہبری سے لگاؤ اور محبت ہے؛ یہاں تک کہ ان اقدار کی حفاظت (جو کہ لاکھوں شہیدوں کے خون کی برکت سے حاصل ہوا ہے)؛ کے لئے اپنی جان سے کھیلنے کے لئے حاضر ہیں یہ لوگ علم و ادب اور ثقافتی پروپیگنڈوں سے عوام الناس کی شجاعت، ایثار، بہادری، معنوی طاقت اور دینی غیرت کو چھین لینا چاہتے ہیں اسی وجہ سے منفی، غیر انسانی اور ظالمانہ تشدد جو دنیا بھر میں ہوتی رہتی ہے، اور جس کے تباہ کن نتائج ہر روز دیکھنے میں آتے رہتے ہیں؛ اس کو ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں تا کہ یہ سمجھائیں کہ تشدد کے یہ برے نتائج ہوتے ہیں؛ لہٰذا کسی بھی طرح کی کوئی تشدد صحیح نہیں ہے بلکہ مذموم ہے یہاں تک کہ اگر کوئی غیظ وغضب میں کچھ کہے، یا "امریکہ مردہ باد" کے نعرہ لگائے یا فساد پھیلانے والوں سے مقابلہ کرے اور ان کو کچل دے، تو ان کا یہ کام تشدد، شدت پسندی اور محکوم و مذموم ہے۔

ان لوگوں مقصد یہ ہے کہ اس طرح انقلابی اقدار کا دفاع کرنے والوں کو شدت پسندی کا نام دے کر عوام الناس کو سست کر دیں تا کہ کوئی ان کی خطرناک سازشوں سے مقابلہ کے لئے کھڑا نہ ہو، اور اپنے خیال ناقص میں 28 مرداد 1332 ہجری شمسی کی بغاوت کی طرح ایک دوسری بغاوت کرا دیں اور جیسا کہ ان لوگوں کا کام ہے 28 مرداد میں مٹھی بھر بد معاش، لچے لفنگے لوگوں کے ذریعہ بغاوت کرادی اور انہوں نے لوگوں کی جان و مال اور ناموس پر حملہ کیا اور دشمن کے نقشہ کو عملی جامہ پہنا دیا؛ اسی طرح 18 تیر ماہ 1378ھ شمسی کو بھی اپنے ناپاک منصوبہ کے لئے مناسب پایا اور ملک میں بغاوت پھیلا دی چنانچہ ان لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ مطالعہ اور تحقیق، بہت زیادہ خرچ کر کے سادہ لوح افراد کو فریب دینے کے لئے اس کام کے مقدمات پہلے سے تیار کر رکھے تھے جیسا کہ اس حادثہ میں ملوث افراد نے خود اپنے انٹرویو میں اس بات کا اقرار کیا کہ انہوں نے امریکہ سے پیسہ اور فکری امداد حاصل کی تھی، یہ سب اسی حقیقت کی عکاسی ہے تا کہ جب موقع پائیں تو بد معاش اور لچے لفنگے لوگوں کو میدان میں اتار دیں تا کہ یہ لوگ اندرونی اور بیرونی میڈیا کی امداد اور مختلف طریقوں سے کمک کے ذریعہ بدامنی پھیلائیں اور دکانوں، گھروں اور دفتروں کو آگ لگائیں خلاصہ بغاوت کے نقشہ کو عملی جامہ پہنا دیں۔

جی ہاں، یہ لوگ شدت پسندی کو برا اور مذموم کہہ کہ کر عوام الناس میں مقابلہ کے حوصلوں کمزور کرنا چاہتے تھے نیز انقلاب سے دفاع کے سلسلہ میں ان کے حوصلے پست کرنا مقصود ہے، تا کہ جب ضد انسانی اور ضد انقلابی کارناموں کا نظارہ کریں اور عوام الناس کے مال و دولت کو غارت ہوتے دیکھیں نیز سرکاری ملکیت کو نابود ہوتا ملاحظہ کریں اور خود فروش لوگوں کے ذریعہ بلوا ہوتے دیکھیں تو سب کے سب خاموش بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں اور فتنہ وفساد پھیلانے والوں کو کچلنے کی فکر نہ کریں بلکہ صرف تباہی پھیلانے والوں سے آرام کے ساتھ گفتگو کرنے کی دعوت دیں اور ان کے مطالبات کو سنیں اور ان سے کہیں کہ ہاں تمہیں اعتراض کرنے کا حق ہے، تم واقعاً پریشان ہو، لہٰذا تم اپنی طرف سے کسی کو نمائندہ بنا کر بھیجو تا کہ آپس میں بیٹھ کر آرام کے ساتھ گفتگو کریں، تمہارے مطالبات کو پورا کیا جائے گا، آؤ اور آپس میں سمجھوتہ کرلیں کچھ تم لوگ اپنے مطالبات کم کرو اور کچھ ہم اپنی سیاست سے پیچھے ہٹیں۔

جب کہ یہ بات ظاہر ہے کہ ان کے مطالبات قوانین اسلامی کو ختم کرنے، اسلامی شعار کو حذف کرنے، اور اسلام کا دفاع نہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں گے، اور ان سب مطالبات کو مان لینے کے بعد ملکی پیمانہ پر ایک بہت بڑی بغاوت رونما ہوجائے گا جس کے نتیجہ میں اسلامی اقدار کا خاتمہ ہوجائے گا، اور اگر دوسرے ممالک کی امداد کی ضرورت ہوگی (جیسا کہ پہلے سے طے ہو چکا تھا) مشرقی اور مغربی سرحد پار سے ملک پر حملہ کرکے اس نظام کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور پھر اپنی مرضی کے مطابق کسی کو حاکم بنا دیا جائے گا۔

6۔ اسلامی مقدسات کی توہین کرنے والوں اور ثقافتی سازشوں سے مقابلہ کی ضرورت

المختصر: ان آخری چند سال سے تشدد اور شدت پسندی کے مسئلہ کو مطلق طور پر اقدار کے مخالف قرار دیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں سستی، لاپرواہی اور تال میل کو مطلق اقدر کے عنوان سے بیان کرتے ہیں، اور مختلف میڈیا کے ذریعہ یہ پروپیگنڈے اس قدر وسیع پیمانے پر حساب شدہ ہوتے ہیں کہ بعض اوقات تو بعض خواص (خاص الخاص افراد) بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں، اور دشمن کے جال میں پھنس جاتے ہیں جب کہ ان لوگوں کا ہدف مسلمانوں سے دینی غیرت کو چھین لینے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، تا کہ ضرورت کے وقت اسلام کے دفاع کے لئے کھڑے نہ ہونے پائیں اس بات پر گواہ ابھی کے تازہ ہونے والے واقعات ہیں اور بہت سی سازشیں تو ابھی تک فاش نہیں ہوئی ہیں اور (انشاءاللہ) آہستہ آہستہ معلوم ہوجائیں گی۔

اسی وجہ سے حقیر نے اپنی تشخیص کے مطابق یہ احساس کیا کہ نظام اسلامی کو درہم و برہم کرنے کے لئے ایک بہت بڑی سازش ثقافتی خطرہ درپیش ہے، لہٰذا یہ طے کیا کہ دشمنوں کی طرف سے ہوئے اعتراضات اور شبہات کا جواب دے اور ان کی ثقافتی سازشوں کو فاش کیا جائے، اور اپنے برادران کو ہوشیار کروں نیز جو لوگ دشمن کے پروپیگنڈوں کی زد میں آکر خواب غفلت میں سوئے ہوئے ہیں ان کو بیدار کروں، اور کم سے کم دشمن کی طرف سے ہوئے پروپیگنڈوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے جھوٹے عقائد اور نظریات میں شک وتردید پیدا کریں، اور دینی اور ثقافتی عہدہ داروں کو درپیش عظیم خطرات سے

آگاہ کروں اور اپنے سوالات کو پیش کر کے معاشرہ کو متوجہ کروں تا کہ دشمن کے غلط پروپیگنڈوں کا اثر کم سے کم ہو۔

حقیر نے اپنا وظیفہ سمجھتے ہوئے یہ طے کیا کہ "مطلق تشدد کے نفی" کے بت کو توڑ ڈالوں، اور ہر تشدد کو برا نیز ہر نرمی اور پیار محبت کو اچھا کہنے والے تصور کی نفی کروں اسی وجہ سے ہم نے اس سے پہلے بھی جلسہ میں عرض کیا تھا کہ ہر مطلق تشدد اور شدت پسندی محکوم اور مذموم نہیں ہے اور ہر نرمی اور پیار و محبت اچھا نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کے لئے مخصوص موقع و محل ہوتا ہے جیسا کہ یہی گفتگو آزادی کے سلسلہ میں بھی کی اور عرض کیا کہ مطلق آزادی اچھی نہیں ہے بلکہ مطلق آزادی باطل اور مردود ہے، ہم اس آزادی کی قدر کرتے ہیں جو قوانین اسلامی اور دینی اقدار کے تحت ہو حالانکہ ہماری یہ باتیں سن کر بعض لوگ غضب ناک ہو گئے کہ فلاں صاحب آزادی کے خلاف گفتگو کر رہے ہیں لیکن جب ان کو آزادی کے نعرے لگانے والوں کی سازشوں کا پتہ چل گیا تو ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ بعض لوگ اس آزادی کا پرچم بلند کر کے دین اور اسلامی اقدار اور مقدسات کی نابودی چاہتے ہیں؛ یہاں تک ہماری حکومت کے ایک بڑے عہدہ دار جو کہ ایک سیاسی شخصیت مانی جاتی ہے اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

"ہماری عوام الناس آزاد ہے یہاں تک خدا کے خلاف بھی مظاہرہ کر سکتے ہیں"!!

چنانچہ (بعض) دوستوں نے واضح طور پر کہا کہ وہ آزادی مطلوب اور مقصود ہے جو اسلامی قوانین اور دینی اقدار کے تحت ہو اور اگر اس طرح کی باتیں بیان نہ کی جاتی تو معاشرہ کو وہ جھٹکا نہ لگتا اور شاید حکومتی عہداران بھی یہ احساس نہ کرتے کہ ہم "اسلامی قوانین اور دینی اقدار کے تحت آزادی" کی طرف داری کریں نہ کہ مطلق آزادی کی۔

اور آج اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ تشدد مطلقاً مذموم نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ مطلق تشدد کے نفی کے پرچم کے نیچے اسلام اور اسلامی اقدار کے دفاع میں ہر اٹھنے والے قدم کو تشدد کا نام دیتے ہوئے اس کی مذمت کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے نہ صرف یہ کہ ہمارے ذہن کی ایک پیداوار، تا کہ بعض لوگ یہ کہیں کہ فلاں کی باتیں تو خیال خام اور ہوائی گولیاں ہوتی ہیں اتفاق سے ہمارے پاس اس بات پر بہت سے شواہد بھی ہیں، اگر چہ سب کو بیان کرنے کی فرصت نہیں ہے، صرف ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ایک موقع پر بعض لوگوں نے جہاد کے سلسلہ میں اعتراض کیا اور اس کو تشدد اور شدت پسندی کا نام دیدیا، جن میں سے ایک صاحب نے تہران یونیورسٹی میں محرم کے پہلے عشرہ میں اپنے تقریر کے دوران کہا: حضرت امام حسین علیہ السلام کا میدان کربلا میں قتل ہونا: جنگ بدر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تشدد کا ایک عکس العمل تھا!

یعنی یہ شخص حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اسلامی جنگوں اور غزوات کو بھی محکوم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مشرکین کو قتل کیا تو ان کی آل و اولاد پیغمبر کی آل و اولاد کو قتل کرتی، اور اگر پیغمبر ان کو قتل نہ کرتے تو ان کی اولاد بھی قتل نہ کی جاتی!! در حقیقت وہ یزیدوں کو بری الذمہ اور اسلام و پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو محکوم کرتا ہے اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان باتوں کو سن کر جو کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی توہین ہے اور امام حسین علیہ السلام کی شخصیت نیز واقعہ کربلا میں تحریف ہے اور

ضروریات دین کا انکار ہے، نہ صرف یہ کہ کوئی کچھ نہیں کہتا بلکہ بعض اخباروں اور جرائد میں اس شخص کی پوری تقریر چھپتی ہے اور وہ بھی صفحہ اول پر!! افسوس کہ ہمارے حکومتی عہدہ داران اس سلسلہ میں کوئی حساسیت نہیں دکھاتے حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام پر انقلاب برپا ہونے والے اور امام حسینؑ کے نام سے باقی رہنے والے اسی ملک میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے قیام کو تحریف کر کے پیش کیا جاتا ہے اور یہ نتیجہ لیا جاتا ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات دوبارہ پیش نہ آئیں اور ہمارے زمانہ کے حسین قتل نہ ہوں تو ہمیں بھی تشدد آمیز برتاؤ اور شدت پسندی کو ترک کرنا ہوگا!!

اور اب ہم اس مقالہ نگار سے مخاطب ہے جس کا مقالہ ایک کثیر الانتشار اخبار میں چھپ چکا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ فلاں صاحب موضوع سے الگ اور ہوا میں باتیں کرتے ہیں اور ہم سے خطاب کیا ہے کہ اپنی گفتگو پر تجدید نظر کریں کیا ہم ہوا میں باتیں کرتے ہیں یا عصرِ حاضر کے اپنے معاشرہ و سماج کی؟ کیا ہماری باتیں اسی موضوع سے متعلق نہیں ہیں جو ہمارے ملک میں رائج ہے، اور کیا ہماری باتیں اسی حقیقت سے متعلق نہیں ہے جو ہر روز ہمارے ملک میں رونما ہوتی جارہی ہے؟ آیا ہم اپنی باتوں میں تجدید نظر کریں یا آپ کہ ایک وقت آپ "بین الاقوامی اسلامی" پارٹی کے عضو تھے اور فدائیان اسلام کی حمایت کو ایک افتخار سمجھتے تھے؟

قارئین کرام! یہاں پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا نورانی اور مشکل کشا کلام کی طرف اشارہ کریں جس میں موصوف نے آزادی کے پرچم کے نیچے پوشیدہ کن کن ثقافتی خطرات کو بیان کیا ہے:

"اب میری وصیت ہے حال حاضر اور آئندہ کی مجلس شورای اسلامی (پارلیمنٹ) اور اس وقت کے رئیس جمہور (صدر مملکت) اور ان کے بعد والے صدر، شورای نگہبان، شورای قضائی اور ہر زمانہ کی حکومت؛ سب کو چاہئے کہ میڈیا، جرائد اور مجلّات کو اسلام اور ملکی مصالح سے منحرف نہ ہونے دیں، اور سب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مغربی ممالک کی طرح کی آزادی جوانوں، لڑکوں اور لڑکیوں کو تباہ و برباد کردے گی اسلام، ملکی مصالح اور عمومی عفت کے برخلاف تبلیغات، مقالات، تقاریر، کتابیں اور جرائد کا وجود حرام ہے ہم سب پر اور تمام مسلمانوں پر ان کی روک تھام کرنا واجب ہے اور فساد برپا کرنے والی آزادی کی روک تھام کرنا ضروری ہے، اور جو چیزیں شرعی طور پر حرام ہیں یا وہ چیزیں جو ملت و اسلامی ملک کے برخلاف ہیں، یا جمہوری اسلامی کی حیثیت کے مخالف ہے، لہٰذا اگر ان کے خلاف سخت کاروائی نہ کی جائے تو تمام کے تمام لوگ ذمہ دار ہیں اور ہمارے عوام الناس اور حزب اللّٰہی جوان اگر ان چیزوں کو دیکھیں تو متعلق اداروں کو مطلع کردیں، اور اگر وہ اس سلسلہ میں کوتاہی کریں تو وہ خود روک تھام کی ذمہ داری پر عمل کریں۔" [1]

۷۔ خداوند عالم کی رحمت اور غضب کے بارے میں اسلامی تصویر کشی

اسلام اور قرآن کے سلسلہ میں مغربی افراد کے شبہات اور اعتراض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا خدا جیسا

---

[1] وصیت نامہ سیاسی الٰہی امام خمینیؒ، بند دوم

کہ قرآن میں بیان ہوا ہے، بدخُلق، غصہ والا، اہل غضب اور انتقام لینے والا ہے، جبکہ خدائے انجیل بخشنے والا، مہربان، سعہ صدر (کشادہ دل) والا، تحمل کرنے والا اور بہت زیادہ مہربان اور لوگوں سے اس قدر دلسوزی کرنے والا ہے کہ نعوذ باللہ اس نے اپنے بیٹے (عیسیٰ) کو قربانی کے لئے بھیج دیا تاکہ تمام لوگوں کی بخشش ہوسکے اور اس کا خون تمام لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے!! تو کیا قرآن مجید میں بیان شدہ خدا غصہ ور اور بدخلق ہے یا رحیم اور رؤف ہے؟

قارئین کرام! گذشتہ اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہمارا خدا صفت رحمت بھی رکھتا ہے اور صفت غضب بھی، وہ "ارحم الراحمین" (بہت زیادہ رحم کرنے والا) بھی ہے اور "اشد المعاقبین" (سخت عذاب دینے والا) بھی، قرآن مجید کے 114 سوروں میں سے 113 سورے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے شروع ہوتے ہیں جس میں خداوند عالم کی دو صفات یعنی "رحمن" اور "رحیم" کا ذکر ہوتا ہے اور صرف ایک سورہ کی شروعات "بسم اللہ" سے نہیں ہوئی ہے، جبکہ سورہ نمل میں شروع کے علاوہ خود سورہ کے اندر بھی بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ تکرار ہوئی ہے؛ جب ملکہ سبا (بلقیس) حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کو اپنی قوم کے سامنے پڑھتی ہے تو اس کا آغاز بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے ہوتا ہے، بہر حال پورے قرآن مجید میں 114 بار بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی تکرار ہوئی ہے جس میں خداوند عالم کی دو رحمتی صفات کا ذکر ہے لیکن قرآن مجید میں خداوند عالم کی اسی رحمت واسعہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ خدا کے خشم (غصہ) اور غضب بھی ذکر ہوا ہے؛ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُوانۡتِقَامٍ۔ [1]

"اور خدا سخت انتقام لینے والا ہے"

اِنَّا مِنَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ مُنۡتَقِمُوۡنَ۔ [2]

"ہم یقیناً مجرمین سے انتقام لینے والے ہیں"

فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ ؕ وَلِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ۔ [3]

"اب یہ غضب بالائے غضب کے حقدار ہیں اور ان کے لئے رسوا کن عذاب بھی ہے"

اگر یورپی لوگ (اپنے الفاظ میں) اپنے خدا کو صرف مہربان اور رحیم بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا خدا غصہ وغضب والا نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآن نے خدا کی توصیف کی ہے، ان لوگوں نے اس کو صحیح طریقہ سے بیان نہیں کیا ہے؛ کیونکہ جس خدا پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں وہ صرف اہل غضب ہی نہیں ہے بلکہ صاحب رحمت اور مہربان بھی ہے اور صاحب قہر وغضب بھی، لیکن اس کی رحمت اس کے غضب پر چھائی ہوئی ہے، اسی وجہ سے ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۹۵

[2] سورۂ سجدہ آیت ۲۲

[3] سورۂ بقرہ آیت ۹۰

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ.[1]

"اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دے لیا ہے"

اور یہ معنی سنی شیعہ متواتر روایات میں بیان ہوئے ہیں، جیسا کہ ہماری دعاؤں میں وارد ہوا ہے یامَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ اے وہ جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے۔

یعنی خدا کی رحمت اس کے غضب کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے اور جہاں تک اس کا لطف وکرم اور اس کی حکمت تقاضا کرے وہاں تک بندوں پر اپنے لطف وکرم اور رحمت کی بارش کرتا ہے اور اپنے غضب کا مظاہرہ نہیں کرتا؛ مگر یہ کہ اس کی ضرورت ہو اور خداوند عالم کچھ لوگوں کو قہر وغضب میں گرفتار کرے اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں خداوند عالم نے بعض گذشتہ اقوام جیسے قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود پر اپنا غضب نازل کیا ہے اور اپنا عذاب بھیج کر ان کو نیست ونابود کردیا ہے (جیسا کہ ان اقوام کے مفصل واقعات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں) لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قوم میں بھیجے گئے انبیاءؑ ہمیشہ ان کو راہ ہدایت کی دعوت دیتے تھے اور راہ ہدایت کو واضح اور روشن کرنے کے لئے معجزات اور الٰہی نشانیاں دکھاتے رہتے تھے؛ لیکن ان لوگوں نے ان تمام چیزوں کے باوجود بھی کفر وضلالت کا راستہ اختیار کیا اور ان کی رفتار وگفتار میں ذرا بھی تبدیلی واقع نہ ہوئی، اور یہی نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ فتنہ وفساد، گناہ عصیان اور احکام الٰہی کی مخالفت میں جری ہوتے چلے گئے تو اس موقع پر خداوند عالم کی حکمت اور اس کی مشیت کا تقاضا تھا کہ ان کو اپنے غیظ وغضب اور عذاب میں گرفتار کرے تا کہ فتنہ وفساد پھیلانے والوں، لجاجت کرنے والوں، خدا سے دشمنی کرنے والوں، اور متکبرین کے لئے بہترین عبرت حاصل ہوجائے۔

لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ قرآن کریم میں ذکر شدہ خدا غیظ وغضب والا نہیں ہے بلکہ خدائے رحمت ولطف وکرم ہے، اور صرف بعض مقامات پر جب اس کی حکمت اور مشیت کا تقاضا ہوتا ہے، اپنے غیظ وغضب کا اظہار کرتا ہے۔

لہٰذا اس سوال (کہ کیا اسلام میں رحمت ومہربانی پائی جاتی ہے یا غیظ وغضب اور شدت پسندی؟)؛ کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں: اسلام میں رحمت اصل چیز ہے اور اس کی بنا یہی ہے کہ معاشرہ میں رحمت ومحبت کا رواج ہو، لیکن خاص موارد میں (جیسا کہ قرآن مجید نے بھی اشارہ کیا ہے) پیار محبت اور مہربانی سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ وہاں پر غیظ وغضب، تشدد اور شدت پسندی کا مظاہرہ ہونا چاہئے خداوند عالم صفت رحمت بھی رکھتا ہے، اور صفت غیظ وغضب اور انتقام بھی۔

8۔ ہدایت کے موانع کو برطرف کرنے، دشمنوں اور منافقین سے مقابلہ کی ضرورت

اسلام، اس کی نشر واشاعت اور اس کے دفاع سے متعلق عرض کرتے ہیں کہ اسلام پہلے مرحلہ میں انسانوں کو ہدایت کی دعوت دیتا ہے، لیکن اگر کوئی دعوت انبیاءؑ کی نشر واشاعت میں رخنہ ڈالنا چاہے تو پھر قرآن حکم دیتا ہے کہ ان سے جنگ کی

[1] سورۂ انعام آیت ۱۲

جائے، اور ہدایت کے راستے میں بچھے کانٹوں کو ہٹا پھینک دیا جائے اسی وجہ سے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور معصومین علیہم السلام کے زمانہ میں "جہاد ابتدائی" (یعنی اپنی طرف سے جہاد کی شروعات کرنا) واجب تھا، تا کہ لوگوں کی ہدایت کے موانع برطرف کئے جاسکیں اسی بنیاد پر جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے، بات یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم روم اور ایران جیسے ملکوں کے داخلی امور میں دخالت کرنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم روئے زمین کے تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، لہٰذا اگر کوئی یہاں تک کہ بادشاہ ایران اور قیصر روم بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت اسلام کی مخالفت کریں تو اس صورت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا وظیفہ بنتا ہے کہ وہ ان سے جنگ کریں اسی وجہ سے آنحضرتؐ نے (مختلف) ملکوں کے بادشاہوں کو خطوط لکھے اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور ان سے یہ چاہا کہ اپنے اپنے ملکوں کی عوام الناس کے لئے رسول خدا اور انؐ کے نمائندوں کے ذریعہ ہدایت کا راستہ ہموار کریں؛ ورنہ جنگ کے لئے تیار ہوجائیں۔

اور چونکہ جہاد؛ اسلام کے مسلم اصول میں سے ہے اور تمام شیعہ سنی فرقے اس سلسلہ میں متفق ہیں اور کسی نے کوئی مخالفت نہیں کی ہے، (اور کفر و شرک کے سرداروں سے جہاد اس وجہ سے واجب تھا کہ وہ اپنے تحت لوگوں کی ہدایت و ارشاد اور پیغمبروں کی دعوت کی تبلیغ میں مانع ہوتے تھے، اسی وجہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ وظیفہ تھا کہ ان لوگوں کو ہدایت کے راستہ سے ہٹانے اور عوام الناس کی ہدایت کے راستہ صاف کرنے کے لئے ان سے جنگ کریں) ان تمام چیزوں کے پیش نظر یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ اسلام مطلقاً جہاد اور جنگ کو لازم اور جائز نہیں جانتا ہے؟ کیا ہم ان آیات قرآن جو کفار و مشرکین اور منافقین نیز دشمنان اسلام سے جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ان کو نظر انداز کردیں اور ان کو چھپادیں؟

قارئین کرام! ہم (یہ بات علی الاعلان) کہتے ہیں کہ دشمنان خدا سے مقابلہ کرنا اسلامی اصول کے تحت ہے اور اسلام نے احکام جہاد کے سلسلہ میں انسانی بہترین اصول کو مدنظر رکھا ہے، اور ان کی رعایت کرنے پر زور دیا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی زور دیا ہے کہ جب دشمنان (اسلام) اور وہ لوگ جو دانستہ طور پر حق و حقیقت کے خلاف کھڑے ہوجائے اور دین خدا سے مقابلہ کرنے لگے اور اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالیں؛ تو ان سے جنگ کرو:

وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ [1]

"اگر یہ عہد کے بعد بھی اپنی قسموں کو توڑ دیں اور دین میں طعنہ زنی کریں، تو کفر کے سربراہوں سے کھل کو جہاد کرو کہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے شاید اسی طرح اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔"

اسی طرح خداوند عالم سورہ تحریم اور سورہ توبہ میں فرمان دیتا ہے کہ پیغمبر اور مسلمان؛ کفار و منافقین سے جنگ کریں

[1] سورۂ توبہ آیت ۱۲

اوران کے ساتھ غیظ وغضب اور شدت پسندی کا برتاؤ کرو:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ.[1]

"اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے کہ ان کا انجام جہنم ہے جو بدترین ٹھکانہ ہے۔"

(وہ مذکورہ مقالہ نگار جس نے لکھا تھا کہ جہاد سے متعلق قرآنی آیات کفار سے مخصوص ہیں، اس نے اس آیت پر غور فکر نہیں کیا کہ اس آیۂ مبارکہ میں خداوند عالم نے کفار سے جہاد کے علاوہ داخلی منافقوں سے بھی جہاد اور مقابلہ کا حکم دیا ہے۔)

اسی طرح سورہ توبہ میں ایک دوسری جگہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ.[2]

"اے ایمان لانے والو! اپنے آس پاس کفار سے جہاد کرو تا کہ وہ تم میں سختی اور طاقت کا احساس کریں اور یاد رکھو کہ اللہ صرف پرہیزگار افراد کے ساتھ ہے۔

مذکورہ آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کفار جو تمہارے نزدیک زندگی گذارتے ہیں؛ ان سے جنگ کرو اور ان سے غافل نہ ہو جانا اور اپنے غیظ وغضب کا مزہ اپنے پڑوسی کفار کو چکھا دو تا کہ وہ (مسلمانوں سے) ڈریں اور ان کے خلاف کوئی خیانت اور سازش نہ کریں۔

اسی طرح خداوند عالم فرماتا ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ ۖ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ۖ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ.[3]

"اور تم سب ان کے مقابلہ کے لئے امکانی قوت اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کرو جس سے اللہ کے دشمن، اپنے دشمن اور ان کے علاوہ جن کو تم نہیں جانتے ہو اور اللہ جانتا ہے سب کو خوفزدہ کر دو، اور جو کچھ بھی راہ خدا میں خرچ کرو گے سب پورا پورا ملے گا اور تم پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

وہ حضرات جو عربی ادبیات (زبان) جانتے ہیں؛ ہم ان کو اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ وہ لفظ "ارھاب" کے اہم

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۷۳

[2] سورۂ توبہ آیت ۱۲۳

[3] سورۂ انفال آیت ۶۰

معنی لفظ دوسری زبانوں میں تلاش کریں؛ اور اگر ہم عرض کردیں تو کل ہی اخباروں کی سرخی بن جائے گی کہ فلاں صاحب تو ٹروریزم "Terrorisme" کے طرفدار ہیں۔

بہرحال قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ جن لوگوں سے منطق اور اصول کے ساتھ گفتگو نہیں کی جاسکتی اور انہوں نے جرأت اور دلیری کے ساتھ راہ ہدایت کو بند کردیا ہے اور بغض وعناد اور دشمنی کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، ان کے ساتھ تو تشدد اور غیظ وغضب سے مقابلہ کرنا چاہئے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کے درمیان رعب ودھشت ایجاد کردیں تا کہ ان کے اندر مسلمانوں کے ساتھ خیانت کرنے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی پیدا نہ ہو ان سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ: "تم اپنے دین پر ہم اپنے دین پر، آؤ مل جل کر ایک ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کریں۔"

9۔ اسلامی سزا کے احکام کی مخالفت

بعض مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات میں ہم پر یہ اعتراض کیا کہ اسلام نے کفار ومشرکین کے سلسلہ میں تشدد اور شدت پسندی کے برتاؤ کا حکم دیا ہے، اور ان کو اپنا ہمشہری ماننے سے انکار کیا ہے، حالانکہ یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ اسلام نے بعض جرائم پر خود مسلمانوں کے لئے سخت سے سخت سزا معین کی ہے، اور اپنے قوانین میں ایسے لوگوں کے لئے کڑی سزا مقرر کی ہے مثال کے طور پر چوری کے مسئلہ میں اسلام کا حکم ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں یا زنا، عفت اور عزت کے دوسرے مسائل میں مجرموں کے لئے حد اور سزا معین کی ہے مثلاً زنا کرنے والے کو سو تازیانے لگانے کی سزا معین کی گئی ہے، اور بعض عفت کے منافی جرائم کے سلسلہ میں سزائے موت بھی رکھی گئی ہے درحقیقت اس طرح کے مجرموں کے لئے اسلامی سزا بہت سخت اور ناقابل برداشت ہیں لیکن اس چیز پر توجہ رکھی جائے کہ اسلام نے بعض عفت کے منافی جرائم جیسے زنا؛ کو ثابت کرنے کے لئے سخت شرائط معین کئے ہیں جس کی بنا پر بہت ہی کم یہ جرم ثابت ہو پاتے ہیں تا کہ ان پر حد جاری ہوسکے۔

بعض شرعی اور اسلامی حدود اور سزا کی بنا پر اسلام دشمن افراد کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا ایک بہانہ مل گیا ہے جس کی بنا پر یہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام میں حقوق بشر کی رعایت نہیں کی جاتی، اور اسلام کی سزا میں تشدد پائی جاتی ہے نیز انسانی شرافت کو نظر انداز کیا جاتا ہے جی ہاں! دشمن اور حقوق بشر کے جھوٹے مدعی کہتے ہیں: "ایک مسلمان چور کے ہاتھوں کو کاٹنا غیر انسانی عمل اور تشدد آمیز ہے اور انسانی شرافت کے مخالف ہے؛ کیونکہ جس شخص کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں تو وہ انسان پوری زندگی کے لئے اس مفید عضو سے محروم ہوجاتا ہے اور ہمیشہ معاشرہ میں ایک چور کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے"۔

جبکہ اس کے مقابلہ میں بعض اسلام کا دعویٰ کرنے والوں نے اسلام کا دفاع کرتے ہوئے اس طرح کا نظریہ پیش کرتے ہیں: اسلام کے یہ سزا کے احکام گذشتہ زمانہ سے متعلق تھے اور ایک خاص زمانہ سے مخصوص تھے، آج کل تو امنیت کے تحفظ اور چوری سے روک تھام کے لئے نئے نئے طریقے موجود ہیں لہٰذا کسی چور کے ہاتھ کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے اگر

امنیت کے تحفظ اور دوسرے جرائم سے روک تھام کے لئے بہتر طریقے موجود ہوں تو پھر امریکہ؛ جس میں جرائم سے روک تھام کے لئے نئے نئے طریقے نافذ کئے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی روزانہ ہزاروں جرائم ہوتے ہیں، اور وہاں کے کالجوں میں مسلح پولیس کا رہنا ضروری ہے۔

جو لوگ جو نہایت بے شرمی کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ اسلامی سزائیں ناقابل قبول ہیں اور ان کو تشدد اور شدت پسندی کا عنوان دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ سزائیں چودہ سو سال پہلے سے متعلق تھیں عصر حاضر میں کوئی ان کو قبول نہیں کر سکتا، کیا وہ لوگ یہ بھول گئے کہ جن لوگوں نے قصاص (بدلا) کے قوانین کو غیر انسانی کہہ کر اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے تھے، اس موقع پر حضرت امام خمینیؒ نے ان کو مرتد قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان کا خون مباح اور ان کی بیویاں ان لوگوں پر حرام ہیں اور ان کا مال ان کے مسلمان ورثہ میں تقسیم کر دیا جائے۔

جی ہاں امریکن حقوق بشر کے طرفداروں نے اسلامی سزاؤں کو غیر انسانی اور تشدد آمیز کا عنوان دے کر ان کو محکوم و مذموم قرار دیا ہے لیکن ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ اگر اسلامی سزائیں تشدد آمیز ہیں، مان لیتے ہیں کہ بعض مواقع پر اسلامی حدود اور سزائیں تشدد آمیز ہیں، لیکن ہم اسلامی قوانین کا دفاع کرنے والے ہیں اور اس کے خلاف ہر طرح کی سازش کا مقابلہ کرنے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہیں، ہم یہ نہیں مانتے کہ احکام منسوخ ہو گئے ہیں، بلکہ ہمارا تو عقیدہ یہ ہے کہ:

"حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلَی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلَی یَوْمِ الْقِیَامَةِ"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حلال کردہ چیزیں قیامت تک حلال اور آپ کی حرام کردہ چیزیں قیامت تک حرام ہیں۔

ہم نے انقلاب اسی وجہ سے برپا کیا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں اسلامی احکام نافذ ہوں، ورنہ تو شاہ پہلوی بھی کہتا تھا: "جو کچھ میں کہتا ہوں وہ اسلام کے مطابق ہے، اور علماء غلطی پر ہیں، اور یہ لوگ بیک ورڈ ہیں"!

ہمارے معاشرہ میں قرآن مجید کے اندر بیان شدہ اسلامی مسائل اور احکام کو نافذ ہونا چاہئیں یہ وہی اسلام ہے جس کی سرفرازی اور بلندی نیز اسلامی حکومت کے لئے ہم نے اپنے رشتہ داروں کی قربانی پیش کی ہے اور اب بھی جانفشانی کرنے کے لئے تیار ہیں، اسی اسلام کی پہچان مقام معظم رہبری (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی) نے فرماتے ہوئے کہا ہے: "اسلام ناب وہی اسلام ہے جو قرآن اور سنت میں بیان ہوا ہے، جس کے احکام اور قوانین مناسب اور اجتھادی طریقہ سے انہیں دو عظیم الٰہی منبع و مرکز (قرآن و سنت) سے استنباط (حاصل) کئے جاتے ہیں اور جو لوگ اس اسلام کو نہیں مانتے، انہوں نے گویا بنیادی طور پر اسلام کو قبول ہی نہیں کیا ہے، کیونکہ اسلام (صرف ایک ہی ہے) دو نہیں ہیں۔"

10۔ تشدد، اسلامی سزائی قوانین میں محدود نہیں ہے

ایک مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں یہ بیان کیا کہ "اسلام نے جن قوانین میں تشدد کو جائز قرار دیا ہے وہ جزائی اور سزائی قوانین ہیں اور ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ اسلام نے فتنہ گروں اور تباہ کاروں کے لئے جو سزائیں معین کی ہیں ان

میں کم وبیش تشدد پائی جاتی ہے لیکن جس تشدد کے بارے میں ہماری بحث ہے اور ہم جس کو محکوم کرتے ہیں، وہ اسلام کے سزائی قوانین سے متعلق نہیں ہے اور اصولی طور پر سزائی قوانین ہماری تشدد کی بحث سے متعلق نہیں ہیں۔"

اور یہ لکھا کہ میں موضوع سے ہٹ کر گفتگو کرتا ہوں اور اسی بات کو کئی اخباروں نے سرخی بنایا کہ کیوں فلاں صاحب موضوع سے ہٹ کر گفتگو کرتے ہیں! لہٰذا ہم عرض کرتے ہیں کہ ہمارا موضوع معاشرہ میں ہونے والے ثقافتی کج روی ہے، جیسا کہ اخباروں نے لکھا تھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا قتل ہونا؛ آپ کے جد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جنگ بدر میں تشدد کا عکس العمل تھا!!

ہم اس مقالہ نگار کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اے قاضی اور حقو قدان آپ ہمارے بارے میں لکھتے ہیں کہ فلاں صاحب موضوع سے ہٹ کر گفتگو کرتے ہیں، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ جو بات حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بارے میں کہی گئی ہے اس میں کس تشدد کی بات ہے اور کس طرح کی تشدد کی نفی کی گئی ہے؟ ہم تو معاشرہ میں پیدا ہونے والی انہیں چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ہم تشدد، آزادی اور میل جول جیسے الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، یہاں تک یہ بھی کہہ دیا گیا کہ "جنگ بدر ایک تشدد تھی" لہٰذا اسلام تشدد کا دین ہے! لہٰذا ہم اپنے موضوع سے خارج نہیں ہوئے ہیں۔

ہوسکتا ہے کوئی شخص یہ کہے: "ہم اس طرح کے ناجائز فائدہ اٹھانے والی فکر کو رد کرتے ہیں اور اسلام کو تشدد کا دین نہیں مانتے۔" ہمارا اس سے کہنا یہ ہے کہ حکومتی قوانین، سزائی قوانین اور وہ عدالت جس میں سزائی احکام بنائے جاتے ہیں ان تمام چیزوں سے صرف نظر کرتے ہوئے؛ کیا عوام الناس بھی تشدد کا برتاؤ کرسکتے ہیں، اور وارد میدان ہوسکتے ہیں اور کیا حکومتی اداروں سے ہٹ کر خود عوام الناس تشدد سے کام لے سکتی ہے؟ ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ تم لوگ اسلامی انقلاب کو تشدد سمجھتے ہو یا نہیں؟ جن لوگوں کو 17 شہریور 1357ء شمسی اور اس کے بعد کے حادثات یاد ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارے غیرت مند جوانوں اور بہادر قوم نے شاہ پہلوی کے خلاف کیا کیا اقدامات کئے تو کیا شاہ پہلوی کے خلاف مظاہرے اور اقدامات تشدد تھا، یا نہیں؟ کیا یہ کام صحیح تھے یا نہیں؟ اور کیا اسلام اس طرح کے اقدامات پر راضی ہے یا نہیں؟ اگر اسلام نے اس طرح کے اقدامات کو جائز قرار نہیں دیا ہے تو آپ کا یہ انقلاب غیر قانونی ہے، کیونکہ (آپ کے نظریہ کے مطابق تو) اسلام میں تشدد نہیں پائی جاتی اور اسلام تشدد آمیز اقدامات کو جائز ہی نہیں مانتا! اسی طرح وہ مقدس کارنامے جو مرحوم نواب صفوی اور فدائیان اسلام نے شاہ کی حکومت کے خلاف کئے، (جن کے مہم کارناموں کی بنا پر ان کا نام ہمیشہ ہمارے ملک میں زندہ رہے گا، اور ہم ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور آج کل تہران اور دوسرے شہروں کی بہت سی سڑکوں کا نام انہیں حضرات کے ناموں پر ہے) تو کیا ان کے یہ اقدامات صحیح تھے یا نہیں؟ اسی طرح "ہیئت موتلفہ اسلامی" کے اعضاء؛ یعنی شہید محمد بخارائی اور ان کے ساتھی جنہوں نے شاہ پہلوی کے جلاد وزیر اعظم کو واصل جہنم کیا۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ واقعاً اس طرح کے تشدد والے اقدامات نہیں کرنا چاہئے تھے، بلکہ قانونی طور پر صلح وصفائی کی ایک پارٹی بنانا چاہئے تھی جس کے ذریعہ شاہ پہلوی کے سامنے اپنے مطالبات کو رکھا جاتا اور اس سے گفتگو کی جاتی" لیکن کیا ان کی باتوں کو سنا جاتا اور وہ حساب شدہ باتوں کو سنتے تو یہ لوگ اس طرح کے غیظ وغضب کے ساتھ قدم نہ اٹھاتے، جب انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کی جائز باتیں اس طرح گفتگو کے ذریعہ نہیں سنی جاتی تب جاکے انہوں نے اس طرح کے اقدامات شروع کئے۔

ممکن ہے وہ قاضی صاحب فرمائیں: ہماری نظر میں وہ اقدامات محکوم اور مذموم ہیں، ان کو چاہئے تھا کہ آرام وسکون اور مکمل حوصلہ کے ساتھ برتاؤ کرتے، اور اپنی مشکلات کو حل کرنے نیز اپنے مطالبات کو پورا کرانے کے سلسلہ میں کوشش کرتے!

ہم ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ:

جب 18 تیر ماہ 1378ھ شمسی اور اس کے بعد بعض فسادی اور بد معاش لوگوں نے بیت المال، عمومی اموال، بینک، ذاتی اور سرکاری گاڑیوں یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی آگ لگادی اور عورتوں کو بے آبرو کے اعورتوں کے سروں سے چادر چھین لیں اور اسلام کے خلاف نعرہ لگائے، تو کیا آپ نے ان لوگوں کے ساتھ پیار ومحبت اور دلی خوشی سے اپنی آغوش میں بٹھا کران کو خاموش کردیا، یا یہ کام ہمارے ان بسیجیوں نے انجام دیا جو اپنے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے اور تمام تر خطرات سے نپٹنے کے لئے میدان عمل میں وارد ہوئے اور ان کو کچل دیا، (بہت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ ان مظلوم بسیجیوں کے حق کو آج تک نہیں پہنچانا گیا اور اس کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا؛ جبکہ یہ جوان انقلاب اور اسلام کے دفاع کے لئے قربۃ الی اللہ حاضر ہوئے تھے اور خدا ہی ان کو بہترین اجر وثواب عنایت کرے گا۔)

ممکن ہے وہ جناب کہیں: کہ ہم فتنہ وفساد پھیلانے والوں کے سلسلہ میں بسیجیوں کے اقدامات کو محکوم کرتے ہیں، اور ان کو اس طرح کا اقدام نہیں کرنا چاہئے تھا، کیونکہ ان کو لوگوں کو بھی یہ حق تھا کہ وہ اپنی بات کہیں اور اعتراض کریں وہ بھی آزاد ہیں جیسا کہ امریکائیوں کا کہنا ہے: جن لوگوں نے قیام کیا اور مظاہرے کئے اور مساجد میں آگ لگائی یہ آزادی خواہ تھے لہٰذا ان لوگوں کو یہ کہنے کا حق تھا کہ ہم آزادی چاہتے ہیں، اور دین نہیں چاہتے! (جیسا کہ ایک صاحب اپنی تقریر میں کہتے ہیں کہ لوگوں کو خدا کے خلاف مظاہرے کرنے کا بھی حق ہے)۔

لیکن اگر وہ یہ کہیں: جب ان لوگوں نے دیکھ لیا کہ اگر خوش رفتاری سے اپنی بات کو علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہمیں دین واسلام نہیں چاہئے تو حکومت ان کی بات کو نہ مانتی؛ اسی وجہ سے یہ لوگ مجبور ہوگئے کہ ذاتی اور سرکاری عمارتوں اور مساجد میں آگ لگادیں اور اسلام کے خلاف نعرے لگائیں، تا کہ وہ کسی نتیجہ پر پہنچ پائیں؛ اور یہ لوگ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے، نہ کہ ان لوگوں کو کچلنے والے۔

ہم اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کرتے ہیں: آخر کار تم لوگ بھی تشدد اور شدت پسندی کو مانتے ہو کیونکہ اس حادثہ کے سلسلہ میں دو باتوں میں سے کسی ایک کو تو ضرور قبول کرو گے، یا فتنہ فساد برپا کرنے والوں اور مساجد میں آگ لگانے والوں کا اقدام صحیح تھا: اس صورت میں تم خود تشدد کی تائید کر رہے ہو، چونکہ ان کا اقدام تشدد پر مبنی تھا، یا تم یہ کہو کہ بسیجی، عوام الناس اور پولیس کا رویہ صحیح تھا: تو اس صورت میں بھی تم نے تشدد کی تائید کی، لہٰذا آپ بتائیں کہ کس تشدد کو جائز قرار دیتے ہو؟

ہم اس طرح کے لوگوں کی باتوں کو نہیں مانتے بلکہ ہمارے لئے معیار بانی انقلاب حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ہے ہم انہیں کے تابع ہیں ہم نے حکومتی اور ولایتی احکام انہیں سے سیکھے ہیں چنانچہ موصوف نے فرمایا:

"اگر ہمارے جوان اور حزب اللّٰہی عوام الناس نے اس چیز کا مشاہدہ کیا کہ بعض تبلیغات، مقالات، تقاریر، کتابوں اور جرائد میں اسلام اور حکومتی مصالح کے خلاف قدم اٹھایا جا رہا ہے، تو ان کا وظیفہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں متعلقہ اداروں کو رپورٹ دیں اور ان اداروں کی ذمہ داری ہے کہ اس سلسلہ میں قدم اٹھائیں لیکن اگر متعلقہ اداروں نے کوتاہی کی اور قانونی طریقہ سے اس طرح کے انحرافات اور فاسد تبلیغات کا سد باب نہ کیا تو اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہمارے دیندار جوان میدان عمل میں کود پڑیں اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس سلسلہ میں اپنا قدم آگے بڑھائے۔"[1]

تمام لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ جس مرتد سلمان رشدی نے "شیطانی آیات" نامی کتاب لکھی جس میں قرآن کریم اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کی گئی، تو حضرت امام خمینیؒ نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر کردیا،" اور ہر مسلمان پر واجب قرار دیدیا کہ اگر کوئی سلمان رشدی کو قتل کرسکتا ہے تو اس پر قتل کرنا واجب ہے" اور یہ فتویٰ صرف امام خمینیؒ ہی کا نہیں تھا بلکہ تمام اسلامی فقہاء نے اسی طرح کا فتویٰ دیا اور تمام اسلامی ملکوں نے اس فتویٰ کی تائید کی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام خمینیؒ کا یہ فتویٰ تشدد پر مبنی نہیں تھا؟ (کیوں نہیں) لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ حضرت امام خمینیؒ نے بھی اس شخص کے بارے میں تشدد کا رویہ اختیار کیا جس نے ضروریات دین اور اسلامی مسلم اصول کی توہین کی اور اسلامی مقدسات کو حرمت کو پامال کرنا چاہا، امام خمینیؒ نے اس طرح کی تشدد کو جائز قرار دیا بلکہ ضروری سمجھا اور ایسے شخص کو مرتد اور واجب القتل قرار دیا۔

11۔ ہر موقع پر علمی شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا جائے (اسلامی نظریہ)

لیکن اگر کوئی شخص سازش یا کسی نقصان پہنچانے کا قصد نہ رکھتا ہو اور دین، ضروریات دین اور احکام اسلام کے بارے میں کوئی شبہ یا اعتراض اس کے ذہن میں ہو تو وہ اس کو بیان کرسکتا ہے، بھرپور ادب و احترام کے ساتھ اس کی باتوں کو سنا جائے گا اور منطق و استدلال کے ساتھ اس کو جواب دیا جائے گا، کیونکہ دین اسلام دین منطق ہے، اس کی بنیاد استدلال اور برہان پر قائم ہے، اور جب مسلمانوں اور علماء اسلام سے جب بھی کسی نے کسی اعتراض کا جواب طلب کیا ہے تو انہوں صبرو

[1] وصیت نامہ حضرت امام خمینیؒ، بند دوم

بردباری اور کشادہ دلی کے ساتھ بہترین دلائل پر مبنی عقلی اور شرعی جوابات پیش کئے ہیں اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا ہے اسی وجہ سے قرآن مجید کا حکم ہے کہ اگر کوئی شخص اگرچہ میدان جنگ میں دشمن کا سپاہی کیوں نہ ہو! سفید پرچم کو اٹھائے ہوئے اسلام کی حقانیت کے بارے میں تحقیق وجستجو کرنے کے لئے مسلمانوں کے پاس آئے اور اپنے سوالات کا جواب تلاش کرے، تو اس وقت مسلمانوں کو چاہئے کی اس کو تحفظ دیں حفاظت کریں اور اس کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچائیں، آرام وسکون اور پیار محبت سے اس کی باتوں کو سنیں، اور اسلام کی حقانیت اور برحق ہونے کو دلیل اور برہان کے ذریعہ ثابت کریں؛ اس کے بعد اس کو تمام تر حفاظت کے ساتھ دشمن کے لشکر میں واپس کردیں۔

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ. [1]

"اور اگر مشرکین میں کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو تاکہ وہ کتاب خدا سنے اس کے بعد اسے آزاد کرکے جہاں اس کی پناہ گاہ ہو وہاں تک پہنچادو اور یہ مراعات اس لئے ہے کہ یہ جاہل قوم حقائق سے آشنا نہیں ہے۔"

قرآن کا حکم ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کی حقانیت کے بارے میں سوال اور تحقیق کے لئے آتا ہے، لیکن تحقیق کے بعد بھی مسلمان نہ ہو تو اس کو مکمل حفاظت کے ساتھ اس امن کی جگہ پہنچادو اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کو کسی طرح کا کوئی گزند پہنچائے؛ کیونکہ وہ اپنے سوالات کا جواب لینے کے لئے آیا تھا لہٰذا اس کی حفاظت ضروری ہے، اس کے سوالات کا جواب دیدیا گیا ہے۔

قارئین کرام! اب ہم سوال کرتے ہیں کہ دنیا کے کس گوشہ اور کس مذہب میں اسلام کی طرح اس بلندترین برتاؤ پر زور دیا گیا ہے؟

لیکن اگر کوئی شخص عناد ودشمنی اور سازش کے تحت، نظام اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی شبہ یا اعتراض کرتا ہے اور مسلمانوں کے عقائد، اصول اور اسلامی اقدار میں شک وتردید ایجاد کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور اس شخص کا مسئلہ اس مسئلہ سے الگ ہے جو اپنے سوالات کا جواب چاہتا ہو اور اس کے دل میں اسلام کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں ہو۔

12۔ دشمن کی سازشوں سے مقابلہ کی ضرورت

ہمیں ثقافتی امور میں وسیع پیمانے پر اسلامی اصول اور عقائد کے خلاف سازشیں کرنے والوں کے مقابلہ میں خاموش نہیں رہنا چاہئے، اور اسی طرح ان لوگوں کے سامنے جو اندرون ملک زرخرید قلم کے ذریعہ اسلام کو نقصان پہنچانے

---

[1] سورۂ توبہ آیت ٦

سکے درپے ہیں؛ خاموش بیٹھے تماشا نہیں دیکھنا چاہئے واقعاً ان لوگوں نے سازش کا پروگرام بنا رکھا ہے جبکہ بعض لوگ اس کو ثقافتی ردّ و بدل کا عنوان دیتے ہیں، اور اخباروں میں لکھتے ہیں کہ کسی طرح کی کوئی سازش نہیں ہے، اور سازشوں کے دعویٰ کو خیال خام قرار دیتے ہیں، لیکن کچھ مدت پہلے ہوئے حادثہ نے ان سازشوں سے پردہ اٹھا دیا۔

وہ سب اسلامی نظام کے خلاف مظاہرے اور عمومی اور سرکاری اموال پر حملہ اور فتنہ و فساد؛ یہ سب اسی بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ واقعاً اسلامی نظام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش تھی، جیسا کہ مقام معظم رہبری (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی) نے بھی بیان فرمایا کہ اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے اسلامی نظام کے خلاف سازش تھی اور اسی حقیقت کے پیش نظر جب فتنہ گروں کو اپنے جگہ بٹھا دیا گیا اور فتنہ کی لگائی ہوئی اس آگ کو فداکار بسیجیوں نے بجھا دیا تو اس وقت ان کی حمایت اور اسلامی نظام کی محکومیت میں دنیا میں شور ہونے لگا یہاں تک کہ خود امریکہ کے ممبر آف پارلیمنٹ نے یہ نعرہ لگایا کہ اسلامی جمہوری ایران کو محکوم ہونا چاہئے اور اس کے خلاف قوانین بنائیں جائیں؛ کیونکہ اسلامی حکومت نے بیرونی زرخرید نوکروں کو فتنہ و فساد پھیلانے کی اجازت نہیں دی!!

دنیا بھر میں ہر روز ہڑتال، مظاہرے اور توڑ پھوڑ ہوتی رہتی ہے اور بہت سے لوگ قتل اور زخمی ہوتے رہتے ہیں ہم ہر روز یہ دیکھتے ہیں کہ صیہونیزم بے گناہ فلسطینی مسلمانوں کا خون بہاتے ہیں جو صرف اپنے پامال شدہ حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں، یہاں تک کہ امریکہ سے وابستہ حکومتوں کے ذریعہ سینکڑوں لوگوں کا قتل ہوتا ہے لیکن کوئی کچھ نہیں کہتا، کہیں سے یہ آواز نہیں اٹھتی کہ یہ حقوق بشر کی پامالی ہے، یا ان لوگوں کا کچلنا آزادی کے خلاف ہے بلکہ اس حکومت کی حمایت کی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ یہ قانونی حکومت کے خلاف قیام تھا اور حکومت کو بھی اپنے دفاع کا حق ہے لیکن جب ایران کی کسی یونیورسٹی میں مشکوک طریقہ سے کسی کا قتل ہو جاتا ہے جس کا قاتل بھی ابھی تک پتہ نہ چل سکا (اگرچہ یہ بھی دشمن کے زرخرید نوکروں اور فساد پھیلانے والوں کا کام ہے) یا کسی شخص کی کسی حادثہ میں موت ہو جاتی ہے، اسی طرح جب فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے ذریعہ مساجد میں آگ لگائی جاتی ہے، ناموس پر حملہ کیا جاتا ہے، اور بسیجی ان کا مقابلہ کرتے ہیں؛ تو اس وقت مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں ہمارے ملک کے خلاف ھنگامہ ہوتا ہے، اور ہماری حکومت کو محکوم کیا جاتا ہے، اور ہمارے ملک کو آزادی اور ڈیموکریسی کا مخالف قرار دیا جاتا ہے دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ مظاہرہ کرنے والے اپنے حقوق اور آزادی کے خواہاں تھے، لیکن ایرانی حکومت نے ان کو کچل دیا، جس کے نتیجے میں ایرانی حکومت کو محکوم کرنے کے علاوہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسلامی جمہوری ایران سے مقابلہ کے لئے قوانین بنائے جائیں!

13۔ دشمنان اسلام سے مقابلہ اور اعلان برائت ضروری ہے

قارئین کرام! نتیجہ یہ ہوا کہ جس خدا کی پہچان قرآن کریم نے فرمائی ہے وہ خدا صاحب رحمت بھی ہے اور صاحب غضب بھی، اگرچہ اس کی رحمت اس کے غضب سے کہیں زیادہ ہے، اور اس کے غضب سے آگے آگے رہتی ہے، اور یہ کہ خدا

کی رحمت اس کے غضب کی نفی نہیں کرتی، جیسا کہ خداوند عالم نے گناہوں پر اصرار کرنے والی بعض گذشتہ اقوام پر اپنا غیظ وغضب کا مظاہرہ کیا، اوران پر اپنا عذاب نازل کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلام نے؛ اپنے سے دشمنی اور عداوت رکھنے والوں کے لئے سخت سے سخت قوانین مرتب کئے ہیں اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اسلام دشمن افراد سے واضح طور پر برائت اور نفرت کا اعلان کریں۔

اس سلسلہ میں آپ حضرات سورہ ممتحنہ کی تلاوت کریں جس میں کفار اور مشرکین سے مسلمانوں کے طور طریقہ کو بیان کیا گیا ہے اور جولوگ دشمنان خدا سے دوستی کا نقشہ پیش کرتے ہیں ان کی سخت مذمت کی گئی ہے، نیز خداوند عالم دشمنان اسلام سے مخفی طور پر دوستی کرنے سے ڈراتا ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں خداوند عالم مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اوران کے اصحاب سے پند حاصل کریں اور دشمنان خدا کے مقابلہ میں ان کے رویہ کو اپنے لئے نمونہ عمل قرار دیں، نہ یہ کہ جو لوگ اسلام اور مسلمین کی نابودی کے لئے ظاہری اور مخفی طریقہ سے فعالیت کرتے ہیں؛ ان کے سامنے بیٹھے مسکراتے رہیں!

چنانچہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ. [1]

"ایمان والوں خبردار! میرے اوراپنے دشمنوں کو دوست مت بنانا کہ تم ان کی طرف دوستی کی پیش کش کرو جب کہ انہوں نے اس حق کا انکار کردیا ہے جو تمہارے پاس آچکا ہے اور وہ رسول کو اور تم کو صرف اس بات پر نکال رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار (اللہ) پر ایمان رکھتے ہو، اگر واقعاً ہماری راہ میں جہاد اور ہماری مرضی کی تلاش میں گھر سے نکلے ہو تو ان سے خفیہ دوستی کس طرح کررہے ہو؟ جب کہ میں تمہارے ظاہر و باطن سب کو جانتا ہوں، اور جو بھی تم میں سے ایسا اقدام کرے گا وہ یقیناً سیدھے راستہ سے بھٹک گیا ہے۔"

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ. [2]

"تمہارے لئے بہترین نمونہ عمل ابراہیم اوران کے ساتھی ہے جب انہوں نے اپنے قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے

---

[1] سورۂ ممتحنہ آیت ا

[2] سورۂ ممتحنہ آیت ۴

اور تمہارے معبودوں سے بے زار ہیں ہم نے تمہارا انکار کر دیا ہے اور ہمارے تمہارے درمیان بغض اور عداوت بالکل واضح ہے یہاں تک کہ تم خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لے آؤ"

ہم سے کہا جاتا ہے کہ زندگی کی باتیں کیجئے اور "امریکہ مردہ باد" کے نعروں کو چھوڑ دیئے، جی نہیں، "امریکہ مردہ باد" کے نعرے پورے زور و شور سے لگائے جائیں گے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان سے یہ بات واضح طور پر کہہ دی جائے کہ جب تک حق کے سامنے سر تسلیم نہ کرو گے، خدا کے سامنے اپنا سر نہ جھکائیں اور دوسروں پر اپنی حکومت جتانا نہیں چھوڑتے اور استکبار کی حالت سے اپنے کو نہیں نکالتے اور اپنے اپنائے ہوئے راستہ کو نہیں بدلتے، دنیا بھر کے لوگوں کے منافع کو پامال کرنا نہیں چھوڑتے اور آزاد ملتوں پر ستم کرنا ترک نہیں کرتے، ہم تمہارے دشمن ہیں۔

حالانکہ ان لوگوں نے ہمارے اور دوسرے اسلامی ملکوں کے منافع کو غارت کیا اور بہت زیادہ نقصانات پہنچائے، ہماری عزت و آبرو کو پامال کیا اور ہمارے بہت سے رشتہ داروں کا خون بہایا، ہم بھلا کس طرح ان سے دوستی اور محبت کا مظاہرہ کریں؟ کیا دنیا بھر میں سیکڑوں بار کا تجربہ ہمارے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ ان کے اندر مفاد پرستی اور استکبار کے علاوہ کچھ نہیں ہے، ہم پھر ان کے مکر و فریب کے جال میں پھنس جائیں؟!

قارئین کرام! قرآن مجید نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ خدا اور رسول اور اسلام کے دشمنوں کے سامنے واضح طور پر برائت اور دشمنی کا اظہار کریں اور اگر ہم اسی اسلام اور قرآن کے ماننے والے ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں ہر مسلمان کے پاس موجود ہے اور دشمنان خدا سے برائت پر زور دیتا ہے، اور یہ برائت اور دشمنی کا اعلان صرف جزائی (سزائی) قوانین کے تحت نہیں ہے بلکہ اس سے بھی آگے ہے؛ تو پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سب کے سامنے بیٹھے مسکراتے رہیں اور سب کے ساتھ مہربان رہیں؟

اڑتیسویں نشست

اسلامی قوانین کے ساتھ مغربی نظریات کا ٹکراؤ

۱۔تحریک مشروطیت اور مغربی کلچر کا رواج

قارئین کرام! ہم نے "اسلامی سیاسی نظریات" کی بحث کے دوران بعض ان مشکلات کی طرف اشارہ کیا جو مغربی ثقافت کے نفوذ کی وجہ سے ہمارے ملک میں پیدا ہوگئی ہیں، اور ہم نے ان اسباب کی طرف بھی اشارہ کیا جن کی وجہ سے یہ مشکلات پیدا ہوئی ہیں تا کہ ہمارے برادران خصوصاً جوانانِ عزیز اور آئندہ انقلاب کے وارث ان مشکلات میں گرفتار نہ ہوں منجملہ ان مشکلات کے جس کو گذشتہ بحث میں بیان کیا آزادی اور ڈیموکریسی کی بحث تھی۔

"تحریک مشروطیت"[1] کے آغاز سے اس وقت تک ہمارے رابطہ مغربی کلچر سے زیادہ ہوتا گیا ہے، فراماسون "Francmaconne"[2] اور مغرب پرست (مغربی کلچر سے متاثر افراد) نے مغربی ممالک میں رائج مختلف کلچر کو اپناتے ہوئے ان کو اسلامی معاشرہ میں رائج کرنا شروع کردیا اگرچہ مختلف وجوہات کی بنا پر بعض چیزوں (جیسے آزادی اور ڈیموکریسی) کے رائج ہونے کا راستہ فراہم تھا، کیونکہ شاہ کے ظلم وستم سے ہمارا معاشرہ پریشان ہوچکا تھا، لہٰذا آزادی کی آواز پر فوراً لبیک کہا اور جب بھی کسی نے آزادی کا نعرہ لگایا اس کا بہت زیادہ استقبال ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کے نعرے سب کی زبان پر آنے لگے، اور آزادی اور آزادی خواہی کے بہت زیادہ طرفدار بن گئے البتہ اسلامی اقدار کے مخالف ان قید و بند اور ظلم وستم سے عوام الناس آزادی چاہتے تھے لیکن مغربی تمدن سے متاثر حضرات نے آزادی کا دوسرا رخ پیش کیا یعنی اسلام سے آزادی در حقیقت وہ اس نعرے کے ذریعہ عوام الناس کو اسلام سے دور کرنا چاہتے تھے تا کہ وہ اسلامی قوانین اور اسلامی اقدار کی پابندی نہ کرپائیں۔

اسی طرح وہ عوام الناس جو خان، راجہ اور فیوڈل (اشرافی حکومت، یا جاگیرداری) کی ظالم حکومت سے پریشان تھے، لہٰذا ان کو ڈیموکریسی کا نعرہ اچھا لگا اور ڈیموکریسی حکومت بنانے کی کوشش کرنے لگے، نہ یہ کہ اس طرح کے ظالم وجابر افراد ان کی سرنوشت اور زندگی کے بارے میں منصوبہ بندی بنائیں اسی وجہ سے یہ نظریہ عوام الناس میں قابل قبول تھا لیکن جن

---

[1] مشروطیت اس شاہی حکومت کو کہتے ہیں جس میں قوانین کے تحت کام کیا جائے۔

[2] طرفداران انسانیت، تھذیب، اخلاق اور انسانی فکری رشد اور مذہبی اختلافات کو دور کرنے والوں کو فراماسون کہا جاتا ہے۔

لوگوں نے اس معنی کو عام طور پر رواج دیا اور اس مغربی تحفہ کی عبادت و پرستش کرتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی پرستش کی دعوت دی، تو ان کا مقصد ڈیموکریسی کے اس نعرہ سے اسلامی اقدار کو بالائے طاق رکھ دینا تھا اور دین کو معاشرہ کی سیاسی زندگی سے ہٹانا تھا، نیز عوام الناس کے نظریات اور ان کی مرضی کو اسلامی اور مذہبی اقدار کی جگہ قرار دینا ان کا مقصد تھا لیکن جو لوگ مغرب پرستوں کے ان ناجائز اہداف سے واقف نہ تھے وہ اس طرح کے مطلق شعار کو قبول کر لیتے تھے؛ لیکن جو لوگ دور اندیش اور ہوشیار تھے انہوں نے اس کے خلاف عکس العمل دکھایا، اور عوام الناس پر اس حقیقت کو واضح کرنے اور دشمن کی سازش کو برملا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی جان تک کی بازی لگادی، اور اپنے تمام تر وجود کے ساتھ یہ اعلان کر دیا گیا کہ وہ مطلق آزادی اور ڈیموکریسی جو اسلام اور اسلامی قوانین کے مخالف ہو؛ وہ اسلامی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہے۔

شہید بزرگوار شیخ فضل اللہ نوری رحمۃ اللہ علیہ کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ڈیموکریسی اور مشروطۂ غربی کی مخالفت کی جو کہ اسلامی اور الٰہی اقدار کے مخالف تھی، اور موصوف نے "مشروطۂ مطلقہ" کے مقابلہ میں "مشروطہ مشروعہ"(۱) پیش کی چنانچہ موصوف فرماتے تھے: ہم مشروطۂ کو مطلق طور پر قبول نہیں کرتے، بلکہ ہم اس مشروطہ کو قبول کریں گے جو اسلام اور قوانین اسلامی کے موافق ہو، لیکن دوسرے لوگ مشروطہ مطلقہ کا نعرہ لگاتے تھے، کیونکہ ان کی نظر میں اس کا موافق شریعت ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا؛ لہٰذا اپنے ناپاک اہداف کے تحت اس عالی قدر عالم روحانی کو ظلم و استبداد کی طرف داری اور مشروطہ مطلقہ کی مخالفت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا اور ان کو شہید کر دیا اگرچہ ایک طرف سے "اصول گرایان" اور "اسلام خواہان" کے درمیان اور دوسری طرف دگر اندیشان اور مغرب پرستوں میں یہ جنگ و جدال اور کشمکش ابھی تک جاری و ساری ہے۔

۲۔ اسلام میں مطلوب اور مقصود آزادی کے نقشہ پر بعض مؤلفین کی نارضامندی

قارئین کرام! ہم نے گذشتہ سال آزادی اور ڈیموکریسی کے سلسلہ میں بحث و گفتگو کی جس میں ہم نے بیان کیا کہ ہمارے معاشرہ میں مطلق آزادی قابل قبول نہیں ہے، اور جیسا کہ اسلامی تمدن اور بنیادی قوانین میں مشروط آزادی مقبول ہے بنیادی قوانین کی اصل نمبر ۴ کی بنا پر: بنیادی قوانین کے اصول، قوانین موضوعہ، پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین، یا دوسرے اداروں کے ذریعہ بنائے جانے والے قوانین اس وقت معتبر ہیں جب وہ دلیل شرعی کے عموم اور اطلاق سے کسی طرح کی کوئی مخالفت اور مغایرت نہ رکھتے ہوں لہٰذا اگر بنیادی قوانین کی ایک اصل بھی آیات و روایات کے عموم اور اطلاق سے مخالفت رکھتے ہوں تو وہ غیر معتبر ہے! ہماری ملت نے اسی بنیادی قوانین کو ووٹ دیا ہے جو اس قدر اسلامی مضبوط پشت پناہی رکھتا ہے لہٰذا اسلام کے احیاء اور زندگی کے لئے انقلاب برپا کرنے والے ہماری ملت بنیادی قوانین میں اسلامی احکام اور اسلامی منزلت کے تحفظ کے طلب گار ہیں، تو پھر وہ غیر اسلامی تمدن کو کیسے قبول کر سکتی ہے؛ لہٰذا ہماری ملت کے نزدیک (جو اسلامی نظریہ ہے)؛ وہ آزادی قابل قبول ہے جو اسلامی احکام اور اقدار کے تحت ہو۔

لیکن ہماری اس بحث کے بعد بہت سے اخباروں کے مالکان نے ہماری مخالفت شروع کر دی، اور بہت سے

مقالات، ہماری مخالفت میں چھپنے لگے، اور ہم کو آزادی اور ڈیموکریسی کا مخالف اور ظلم وستم کا طرف دار بتایا جانے لگا، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے تو یہ بھی کہہ ڈالا کہ فلاں صاحب تو ایران کو پیچھے کی طرف لے جار ہے ہیں! اور آخر کار ایک مسلمان اور انصاف پسند مقالہ نگار نے ہماری باتوں کا اعتراف کیا اور کہا: ہمارا معاشرہ اس آزادی کا دفاع کرسکتا ہے جو اسلامی احکام اور قوانین شریعت کے دائرہ میں ہو؛ جبکہ ہمارے حکومتی عہدہ داران نے بھی بارہا اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ مفسد فی الارض کے بارے میں اسلامی حکم

ہم نے گذشتہ بحث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ عدلیہ کو طاقتور ہونا ضروری ہے تا کہ خلاف ورزی کرنے والوں کو ان کی سزائے اعمال تک پہنچایا جاسکے، اور مجرموں کو سزا مل سکے، اور اس کام کے لئے پولیس اور قدرت کا استعمال کرنا ضروری ہے اور اگر اس طرح کی طاقت اسلامی حکومت میں نہ ہو تو پھر وہ معاشرہ میں اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کی ضامن نہیں ہوسکتی اس چیز کو دنیا بھر کی حکومتوں میں قبول کیا جاتا ہے سوائے "آنارشیسٹوں" "Anarchistes" (فسادطلب) اور حکومت کا انکار کرنے والوں کے، اور سبھی افراد حکومتوں کے لئے طاقت اور پولیس کو لازمی اور ضروری جانتے ہیں لہٰذا اسلامی حکومت کے لئے امن وامان قائم کرنے، معاشرہ میں نظم وضبط برقرار رکھنے، الٰہی احکام اور حدود نیز اسلام کے سزائی قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قدرت اور طاقت کا استعمال ضروری ہے اسی طرح اگر کچھ لوگ اسلامی نظام کے خلاف مظاہرہ کرنے لگیں اور معاشرہ میں بد امنی پھیلانے لگیں تو اس وقت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قدرت اور پولیس کے ذریعہ ان کو اپنی جگہ بٹھادے۔

قارئین کرام! ہم نے عرض کیا کہ بغیر کسی حد اور قید کے مطلق آزادی کو ایک نا قابل انکار ارزش اور اقدار کے عنوان سے بیان کرنے والے اور اس کے مقابلہ میں تشدد اور شدت پسندی کو مطلق طور پر ضدّ اقدار قلمبند کرنے والے افراد کہتے ہیں: "یہاں تک کہ نظام اسلامی کے مقابلہ میں قیام کرنے والوں اور تشدد اور شدت پسندوں کے مقابلہ میں؛ تشدد اور شدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے، بلکہ پیار ومحبت اور الٰہی واسلامی رحمت کے ساتھ برتاؤ کیا جانا چاہئے۔"

بے شک ان لوگوں کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر مجرموں اور خلاف ورزی کرنے والوں کے مقابلہ میں سخت رویہ نہ اپنایا جائے اور ضروری مواقع پر تشدد اور پولیس کا سہارا نہ لیا جائے تو اس طرح کے فتنہ وفساد دوبارہ بھی ہوسکتا ہے یہاں تک کہ ممکن ہے اس طرح کے برتاؤ سے دوسرے بھی ناجائز فائدہ اٹھائیں، کیونکہ اگر اس طرح کا فتنہ وفساد بپا کرنے والوں، مساجد میں آگ لگانے والوں، عورتوں کے سروں سے چادر چھینے والوں اور مختلف مقامات پر آگ لگانے والوں نیز دہشت گردی پھیلانے والوں کے مقابلہ میں اگر بیٹھے مسکراتے رہیں اور نرمی کے ساتھ برتاؤ کرتے رہیں تو گویا یہ فتنہ وفساد پھیلانے والوں کے لئے ایک سبز چراغ ہوگا اور وہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس طرح کا کام دوبارہ بھی کیا جاسکتا ہے!! لہٰذا یہ نظریہ بالکل نا درست اور اسلام کے مخالف ہے کیونکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ محارب (لڑائی جھگڑا کرنے والا) اور مفسد فی الارض کے لئے سخت

سے سخت سزائیں دی جائیں۔

عام طور پر حکومتی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور تشدد کا استعمال کرنا دو طریقہ پر ہو سکتا ہے: کبھی تو انفرادی طور پر ہوتا ہے اور کبھی اجتماعی طور پر اجتماعی طور پر اس طرح سے کہ ایک گروہ منصوبہ بندی کے ساتھ حکومت کے خلاف مسلحانہ حملہ کرتا ہے اسلامی فقہ میں اس گروہ کو "بُغاۃ" اور "اہل بغی" (بغاوت کرنے والا) کہا جاتا ہے اسلامی جہاد کی ایک قسم اسی طرح کے لوگوں سے جہاد کرنا ہے اگر کچھ لوگ کسی گروہ کے تحت اسلامی حکومت کے خلاف مسلحانہ قیام کریں تو ان سے جنگ کرنا ضروری ہے، یہاں تک کہ اسلامی حکومت کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور ان سے کسی طرح کی کوئی سازش نہیں کرنا چاہئے لیکن کبھی حکومت کے خلاف اس طرح کا قیام کسی خاص گروہ کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ایک یا دو آدمی مسلحانہ حملوں کے ذریعہ معاشرہ میں بدامنی پھیلاتے ہیں اور عوام الناس کی جان و مال اور ناموس پر حملہ ور ہوتے ہیں اور دھشت گردی پھیلاتے ہیں شریعت اسلام میں ایسے افراد کو "محارب" کہا گیا ہے ایسے افراد کے مقابلہ میں لشکر کشی کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ان لوگوں کو اسلامی عدالت کے حوالہ کیا جاتا ہے تا کہ قاضی شرع ان کے بارے میں فیصلہ کرے اور قاضی شرع بھی محارب اور مفسد فی الارض کے سلسلہ میں چار احکام میں سے کوئی ایک حکم لگا سکتا ہے، اور وہ چار حکم درج ذیل ہیں:

۱۔ پھانسی دینا۔

۲۔ تلوار یا بندوق کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتار دینا۔

۳۔ مختلف سمت سے ہاتھ پیر کاٹ دینا، (یعنی داہنا ہاتھ اور بایاں پیر، یا بایاں ہاتھ اور داہنا پیر)۔

۴۔ اسلامی ملک سے نکال دینا۔

چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ. [1]

"بس خدا اور رسول سے جنگ کرنے والے اور زمین میں فساد کرنے والوں کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پیر مختلف سمت سے قطع کر دیئے جائیں یا انہیں ارض وطن سے نکال باہر کیا جائے، یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں عذاب عظیم ہے۔"

لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ جو لوگ اسلامی حکومت اور نظام اسلام کے خلاف فتنہ و فساد برپا کریں وہ محارب اور مفسد فی الارض ہیں اور ان کو اسلام کے مطابق سزا دی جائے، کسی بھی صورت میں اسلامی سزا اٹھائی نہیں گئی ہیں اسلامی تمدن کے

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۳۳

مخالف افراد کہا کرتے ہیں کہ اسلامی سزائیں اور اسلام کے احکام تشدد آمیز ہیں اور عام طور پر کسی بھی طرح کی تشدد مذموم ہے اور جیسا کہ ہم نے تشدد کی بحث میں بیان کیا کہ جس طرح مطلق آزادی صحیح نہیں ہے اسی طرح مطلق تشدد بھی محکوم اور مذموم نہیں ہے بلکہ بعض موقع پر تشدد اور غیظ وغضب کا مظاہرہ کرنا جائز اور لازم ہے، اور جو لوگ تشدد اور غیظ وغضب کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں ان کے ساتھ میں ویسے ہی تشدد اور قہر وغضب کے ساتھ جواب دیا جائے، ورنہ اگر ان کے ساتھ پیار ومحبت کا برتاؤ کیا جائے تو واقعاً یہ ان کے لئے ایک سبز چراغ دکھانے کی طرح ہوگا اور وہ پھر دوبارہ بھی اس طرح کا آشوب برپا کر سکتے ہیں، اور اس طرح دوبارہ فساد پھیلانے کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔

۴۔سخت رویہ نہ اپنانے کا نتیجہ

گذشتہ سال ملک کے بعض مقامات پر مختصر طور پر بدامنی پھیلی، اور بعض دلائل کی بنا پر حکومتی عہدہ داروں نے یہ مصلحت دیکھی کہ بدامنی پھیلانے والوں کے ساتھ تھوڑی نرمی کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، اور سخت رویہ نہ اپنایا جائے؛ چنانچہ آپ حضرات نے دیکھا کہ اسی نرم رویہ اپنانے کا نتیجہ تھا کہ ایک بار پھر بدامنی پھیل گئی، جس کے دردناک نتائج ناقابل برداشت تھے لہٰذا اگر بدامنی پھیلانے والوں اور مفسد فی الارض کے ساتھ سخت برتاؤ نہ کیا جائے اور اسلامی سزائیں ان کے حق میں جاری نہ کی جائیں تو پھر دوبارہ بدامنی نہ پھیلنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے اور یہ بھی ضمانت نہیں ہے کہ ایک بار پھر یونیورسٹی کے ماحول سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے گا بے شک ہمارے یونیورسٹی کے طلباء مسلمان، ہوشیار اور موقع شناس ہیں اور بدامنی اور آشوب پھیلانے سے بری ہیں لیکن بعض افراد ایسے بھی موجود ہیں جو انہیں طلباء کے پاکیزہ احساسات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر پھر دوبارہ بدامنی پھیلانا چاہتے ہیں۔

لہٰذا اگر بدامنی پھیلانے والوں کے ساتھ سخت رویہ نہ اپنایا جائے اور بعض لوگوں کے مطابق: ان کے ساتھ تشدد اور شدت پسندی کا برتاؤ نہ کیا جائے تو پھر دوبارہ اس طرح کی بدامنی نہ پھیلانے کی کیا ضمانت ہے؟ لہٰذا توجہ رہے کہ اگر اسلامی سزائیں سخت ہیں جیسا کہ چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے یا دوسرے جرائم؛ خصوصاً محارب اور مفسد فی الارض کے لئے سخت سے سخت سزائیں معین کی ہیں، تو وہ اس وجہ سے ہیں تاکہ پھر کوئی بدامنی پھیلانے کی جرائت نہ کرسکے، اور اس طرح کے مجرم سخت سزا سے خوف زدہ رہیں کیونکہ دشمن اور مجرم کو ڈرانے کا مسئلہ اسلام کی ایک بہت بڑی حکمت ہے جس کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے، مسلمانوں اور سیاسی مسلمانوں کو اس آیت پر توجہ کرنا چاہئے، ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۝۶۰.[1]

---

[1] سورہ انفال آیت ۶۰

"اور تم سب ان کے مقابلہ کے لئے امکانی قوت اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کرو جس سے اللہ کے دشمن، اپنے دشمن اور ان کے علاوہ جن کو تم نہیں جانتے ہو اور اللہ جانتا ہے سب کو خوفزدہ کردو، اور جو کچھ بھی راہ خدا میں خرچ کروگے سب پورا پورا ملے گا اور تم پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

جن مواقع پر عوام الناس کی طرف سے تشدد جائز ہے وہ اس وقت ہے جب عوام الناس کو یہ احساس ہوجائے کہ اسلامی عہدہ داران خطرہ میں ہیں اور اسلامی نظام کے خلاف سازش ہورہی ہے اور صرف اسلامی حکومت اسلامی نظام کا دفاع کرنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ جب اسلامی حکومت کو نظام کے سلسلہ میں کسی سازش کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ خود اپنی ذمہ داری پر عمل کرتی ہے، لیکن اگر اسلامی حکومت تنہا کافی نہ ہو تو عوام الناس کا وظیفہ بنتا ہے کہ اسلامی حکومت کی مدد کریں اور اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کا دفاع کریں جیسا کہ آپ حضرات نے دیکھا کہ اس سال (تیر ماہ ۱۳۷۸ھ شمسی) کے دردناک حادثہ میں کس طرح کا ماحول پیدا ہوگیا، اس وقت واقعاً اسلامی نظام خطرہ میں تھا، اس وقت حکومتی قدرت اس فساد کی آگ کو بجھانے کے لئے کافی نہ تھی، لہٰذا عوام الناس اور بسیجی (عوامی رضا کار فوج) اس آگ کو بجھانے کے لئے آگے بڑھے اور اس کو خاموش کردیا؛ جیسا کہ بعض حکومتی بڑے عہدہ داروں نے بھی اس بات کی وضاحت کی کہ اس شعلہ ور آگ کو ہمارے بسیجیوں نے بجھایا ہے۔

لہٰذا اگر اسلامی نظام کے خلاف کوئی سازش ہو (جبکہ بعض لوگ اس سازش سے بے خبر رہتے ہیں) اور ہم واضح اور قطعی طور پر اس سازش کا احساس کرلیں اور اس سازش کو ختم کرنے کے لئے تشدد کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ ہو، تو اس صورت میں تشدد اور شدت پسندی کا اظہار کرنا واجب اور ضروری ہے جیسا کہ حضرت امام خمینیؒ نے فرمایا کہ "اس موقع پر تقیہ کرنا حرام ہے، اور قیام کرنا چاہئے، ہرچہ بادا باد" (چاہے کچھ بھی ہو) جس وقت خود اسلام خطرہ میں ہو اس موقع پر کسی طرح کا کوئی تقیہ جائز نہیں ہے، اور اسلام کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے، یہاں تک کہ اگر ہزاروں لوگ بھی قتل ہوجائیں، اگرچہ دوسرے افراد کسی وجہ سے اس خطرہ کی طرف متوجہ نہ ہوں یا وہ اس کام میں مصلحت نہ سمجھتے ہوں، لیکن جب یقینی دلائل کے ساتھ واضح ہوجائے کہ واقعاً اسلامی نظام اور اسلامی عہدہ داروں کے لئے خطرہ ہے تو پھر عوام الناس کو ان کا دفاع کرنا واجب ہے؛ لہٰذا یہاں پر تشدد اور غیظ و غضب کا ظاہر کرنا واجب ہے۔

ہماری باتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر موقع پر تشدد سے کام لیا جائے، ہم تشدد کے طرفدار نہیں ہیں بلکہ ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ پیار و محبت اور مہربانی اصل ہے، اور صرف ضروری مواقع پر تشدد سے کام لیا جائے ہماری عرض تو اتنی ہے کہ جب اسلامی حکومت موجود ہو تو پھر حکومتی متعلق اداروں اور عدلیہ کے فیصلہ کے مطابق کام ہو؛ لیکن اگر کوئی مسئلہ حکومت کے ہاتھوں سے نکل جائے اور اسلام اور اسلامی نظام کی حفاظت کے لئے تشدد کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ بچے تو اس وقت تشدد کا مظاہرہ کرنا واجب ہے۔

۵۔ تشدد کی بحث کے مقابلہ میں غیر ذمہ دارانہ رویہ

گذشتہ جلسہ میں تشدد کے سلسلہ میں مطالب بیان کرنے کے بعد بعض مغرب پرست اخباروں نے ہمارے اوپر اعتراضات کئے اور بہت سے مقالات اخباروں میں چھپے حقیر اس سلسلہ میں ان تمام افراد کا شکر گذار ہے جنہوں نے ہماری موافقت یا مخالفت میں گفتگو کی یا مقالہ لکھا کیونکہ ہمارا تو یہ نظریہ ہے کہ اخباروں میں اس طرح کی باتوں پر نقد وتنقید کوئی نقصان دہ نہیں ہوتی؛ بلکہ اس طرح سے بات بالکل صاف ہوجاتی ہے تا کہ عوام الناس اپنے عقائد کو راسخ تر کرلیں، اور اپنے وظیفہ کو بہتر طور پر سمجھ لیں لیکن شرط یہ ہے کہ ایک طرف کی بات سن کر فیصلہ نہ کیا جائے اور دونوں طرف کی مکمل باتوں کو پیش کیا جائے لیکن افسوس کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ بعض لوگوں نے ہماری باتوں کو کاٹ چھانٹ کر بعض عہدہ داروں تک پہنچائی جن کی وجہ سے وہ پریشان ہوگئے اور جلد بازی میں ہمارے خلاف فیصلہ کرنے لگے۔

ہمیں دوسروں سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ ہماری باتوں کی تائید کریں اسی طرح ان سے کسی طرح کا کوئی خوف بھی نہیں ہے ہم اپنی شرعی اور الٰہی ذمہ داری پر عمل کرتے ہیں، اگر کسی کو اچھا لگے تو بہتر، ورنہ ہم نے اپنی ذمہ داری پر عمل کردیا ہے اور خدا پر بھروسہ کیا ہے، ہمیں کسی کی توہین یا دھمکی کا کوئی خوف نہیں ہے لیکن جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ سب کی باتوں کو کشادہ دلی کے ساتھ سننا چاہئے؛ ان سے یہ امید تھی کہ ہماری باتوں کو سنتے اور شاید ہماری پوری بات کو سننے کے بعد ان کو مان بھی لیتے اور اگر ہماری بات کو قبول بھی نہ کرتے تو اس کا جواب دلیل و منطق اور اصول کے تحت دیتے، نہ یہ کہ نامناسب الفاظ سے ہمیں نوازا جاتا۔

افسوس کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم ان تمام لوگوں کو تحریری جواب دیں جنہوں نے تقریروں، اخباروں اور مقالوں میں اظہار محبت کی اور ہمارے نفع یا ہمارے نقصان میں کچھ بیان کیا اور ان دو ہفتوں میں سیکڑوں مقالے لکھے، اسی طرح ان سب کو الگ الگ زبانی جواب دینے کی بھی فرصت نہیں ہے لہٰذا ان کو جواب نہیں دیتے، ہمیں امید ہے کہ ان سب کا یہ کام خوشنودی خدا کے لئے ہوگا۔

ہم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کے لئے ضروری چیزوں کو دلائل اور برہان کے ساتھ بیان کریں، لیکن اگر کسی کو اچھا نہ لگے تو وہ منطق اور دلیل کے ساتھ اس کا جواب دے۔

۶۔ قرآن مجید میں لفظ "تشدد" کے ہم معنی لفظ کی تحقیق

قارئین کرام! ہم یہاں پر ضروری سمجھتے ہیں کہ تشدد کے سلسلہ بیان شدہ باتوں کا خلاصہ کریں: "تشدد" عربی لفظ ہے اور فارسی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی سختی سے پیش آنے کے ہیں، اس کے مقابلہ میں لفظ "تلیّن" ہے جس کے معنی "نرمی" کے ہیں قرآن مجید میں لفظ "تلیّن" کے مقابلہ میں لفظ "تشدد" کا استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ لفظ "غلظت" استعمال ہوا ہے؛ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں (تشدد اور غلظت) مترادف (ہم معنی) الفاظ ہیں جیسا کہ فارسی (یا کسی دوسری

زبان) میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں، اسی طرح عربی زبان میں بھی بہت سے مترادف الفاظ ہوتے ہیں، قرآن مجید میں کبھی ان دو مترادف الفاظ میں سے ایک لفظ استعمال ہوا ہے اور کبھی کبھی دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور کبھی دو الفاظ میں سے ایک خاص معنی میں استعمال ہوا ہے، مثال کے طور پر لفظ "قلب" سے ایک معنی مراد ہوتے ہیں اور لفظ "فؤاد" سے دوسرے معنی، (جبکہ دونوں کے معنی "دل" کے ہیں) اور کبھی کبھی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ استعمال ہوا ہے قرآن مجید میں لفظ "لِنتَ" (نرمی) کے مقابلہ میں لفظ "غلظت" استعمال ہوا ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ.[1]

"پیغمبر یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم رہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے"

فارسی میں لفظ "غلظت" سختی کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ ہماری زبان میں اس لفظ کو "بہنے والی" چیزوں میں استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ خرے کارس "غلیظ" ہے، یعنی سخت ہے، اور لفظ "غلظت" جس کے مقابلہ میں لفظ "لِنتَ" ہے؛ اس کے ہم معنی لفظ "تشدد" ہے جس کے سلسلہ میں ہم نے بحث کی ہے، اور کہا کہ تشدد مطلق طور پر مذموم نہیں ہے، بلکہ بعض مواقع پر نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں ہے بلکہ ضروری اور واجب بھی ہے۔

۷۔ مغربی اور اسلامی نظر میں تحمل اور ٹولرانس کے معنی

قارئین کرام! ہم نے آزادی کے سلسلہ میں عرض کیا کہ ہمارے سیاسی اور ادبی معاشرہ میں کئے جانے والے آزادی کے معنی لفظ لبرلیزم "Liberalism" کا ترجمہ ہے جس کا رواج مغربی ممالک میں بہت زیادہ ہے اسی طرح لفظ "تحمل" (کسی کی بات کو برداشت کرنا) جو لفظ "تشدد" کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے یہ انگلش لفظ ٹولرانس "Toleranec" کے ہم معنی ہیں جس کے معنی تحمل اور برداشت کرنا ہیں بہرحال چونکہ یہ دونوں الفاظ مغربی ممالک میں بہت زیادہ رائج ہیں البتہ اس چیز میں کوئی ممانعت بھی نہیں ہے کہ اگر کسی دوسری زبان کا لفظ واضح اور شفاف معنی رکھتا ہو تو اس کو "ہوبہو" یا اس کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ اپنی ادبیات میں شامل کرلیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں البتہ اس نکتہ پر توجہ رہے کہ کبھی کبھی دوسری زبان کے یہ الفاظ بہت سی حدود وقیود رکھتے ہیں اور خاص الخاص معنی رکھتے ہیں نیز اسی زبان کے ماحول سے اس کے معنی کئے جاتے ہیں یعنی جب کسی زبان میں کوئی لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کے مثبت یا منفی معنی ہوتے ہیں لیکن اگر اسی کو کسی دوسری زبان میں لے جاکر معنی کئے جائیں تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں یا اس کے معنی بالکل برعکس ہوجاتے ہیں، مثال کے طور پر:

یہی لفظ "آزادی" جو مغربی تمدن سے ہماری زبان میں وارد ہوا ہے؛ مغربی ممالک میں اس کے بہت زیادہ وسیع معنی ہیں اور جنسی مسئلہ میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جب کہ ہمارے معاشرہ میں ایسا

[1] سورہ آل عمران آیت ۱۵۹

نہیں ہے، اور یہ معنی ہمارے معاشرہ بلکہ دوسرے اسلامی معاشرہ میں بھی قابل قبول نہیں ہیں، لہٰذا ہم اسلامی اور قومی اقدار کی بنا پر مجبور تھے کہ اس آزادی میں کچھ قید و شرط کا اضافہ کریں اور جائز آزادی نیز اسلامی قوانین کے مطابق آزادی کو قبول کر لیں، لہٰذا واضح طور پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم "مطلق آزادی" کو نہیں مانتے اسی طرح "تشدد" کے وہ معنی جو ہماری زبان میں وارد ہو گئے ہیں اور مغربی ممالک میں اس کو مطلقاً قابل مذمت گردانتے ہیں؛ جب کہ ہم اس کو بطور مطلق ضد اقدار نہیں سمجھتے، جس طرح سے مطلق آزادی کو نہیں مانتے بلکہ ہم منطق اور اصول سے خالی تشدد جو انسانی اخلاق کے مخالف ہو؛ اس کو مذموم مانتے ہیں، اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر تشدد؛ عقل کا تقاضا اور معاشرہ کے منافع کو پورا کرنے والی ہے، لہٰذا اس وقت اس میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔

لہٰذا جب لفظ ٹولرانس "Toleranec" انگلش سے نکل کر ہماری زبان میں داخل ہوا، تو اس کو مطلق طور پر قبول کرنے سے پہلے اس کے صحیح معنی پر توجہ کریں اور یہ دیکھیں کہ مغربی ممالک میں اس کے کیا کیا مثبت یا منفی پہلو ہیں، اور اس کے پشت پردہ کیا راز پوشیدہ ہے اور کس مقصد کے تحت ہماری سیاسی ادبیات میں داخل ہوا ہے؟ نیز یہ دیکھیں کہ اس کے منتقل ہونے کے بعد اس کے معنی میں کیا کچھ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں؟

لفظ ٹولرانس کا مفہوم مغربی ماڈرن تمدن کا ایک تحفہ ہے جو "رنسانس" کے زمانہ بعد سے آہستہ آہستہ رائج ہوتا چلا گیا ہے اور آج کل مغربی ممالک میں بے دینی تمدن کی ایک واضح پہچان ہے (توجہ رہے کہ ہم نے اس سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ جب ہم مغربی تمدن کا نام لیتے ہیں تو اس سے مراد ان ممالک میں رہنے والے تمام لوگوں کا تمدن نہیں ہے؛ کیونکہ وہاں پر بہت سے دیندار مسلمان بھی موجود ہیں، بلکہ ہماری مراد مغربی ممالک میں حکمراں تمدن ہے جس کے مخالف بھی خود انہیں ممالک میں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔)

اس لفظ ٹولرانس "Toleranec" کی تحقیق کے سلسلہ میں مزید عرض کرتے ہیں:

اولاً: مغربی ممالک میں حکمراں تمدن میں تمام اقدار (چاہے وہ اخلاقی اقدار ہوں یا اجتماعی اقدار یا حقوقی اور سیاسی) اعتباری امور ہیں اور ان کی کوئی عقلائی اور واقعی حقیقت نہیں ہے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ اقدار کا تعلق عوام الناس کی مرضی اور ان کے سلیقہ پر ہوتا ہے کیونکہ کسی چیز پر اعتقاد رکھنا سب کے لئے اور سب جگہ پر اقدار نہیں کہلاتا بلکہ مغربی ممالک کی نظر میں اقدار اس وقت اقدار ہے جب معاشرہ اس کو قبول کرے، لیکن اگر ایک زمانہ میں عوام الناس کا سلیقہ بدل جائے تو یہی اقدار ضد اقدار میں بدل جائے گا۔

ثانیاً: یہ لوگ اسلامی اعتقاد کو اسی اعتباری اقدار کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں، اور انسان کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ چاہے وہ ان کو قبول کرے یا ترک کر دے، گویا دینی عقائد کو بھی ایک سلیقہ کی طرح قرار دیتے ہیں:

جس طرح انسان اپنے سلیقہ کی بنا پر اپنے لباس کا رنگ اختیار کرتا ہے مثلاً کوئی نیلا رنگ پہننا چاہتا ہے اور کوئی کالا

رنگ، جبکہ کسی کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم اس رنگ کو کیوں انتخاب کرتے ہو؟! اور نہ ہی اس کے اس کام پر مذمت کی جاسکتی ہے کیونکہ ہر شخص اپنے سلیقہ میں مختار اور آزاد ہے، اسی طرح یہ لوگ دین کو بھی اپنے سلیقہ کی بنا پر اختیار کرتے ہیں، اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تو نے اس دین کو کیوں انتخاب کیا اور اس دین کو کیوں انتخاب نہیں کیا، اور کیوں فلاں دینی عقیدہ کی توہین کرتے ہو اور اس کو نفی کرنے کی کوشش کرتے ہو اور اس سے بھی بالاتر اگر کسی نے اپنے دینی اعتقادات کو بالائے طاق رکھ دیا اور کسی دوسرے مذہب میں داخل ہو گیا تو اس کی بھی مذمت نہیں کی جاسکتی، کیونکہ عقیدہ بدلنا بھی ایک سلیقہ کی طرح ہے جو کسی بھی وقت بدلا جاسکتا ہے!

لیکن اسلامی نقطہ نظر سے دینی مقدسات اور اسلامی اقدار؛ جان و مال اور ناموس سے بھی زیادہ مہم ہے وہ اسلام جو ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ مال کی حفاظت کے لئے جان کی حد تک دفاع کر سکتے ہیں (یعنی جب تک جان جانے کا خطرہ نہ ہو اس وقت تک اس کی حفاظت ضروری ہے، لیکن اگر مال کی خاطر جان جانے کا خطرہ ہو تو اس وقت اس مال کو جان پر قربان کر دیا جائے) کیا وہ اسلام دینی مقدسات کے دفاع کی اجازت نہ دے گا؟ (اگرچہ شورائی شہر تہران کے ایک نمائندہ نے اس بات کی بھی اجازت دیدی ہے کہ خدا کے خلاف بھی مظاہرہ کیا جاسکتا ہے) لیکن تمام مراجع تقلید کے فتوائی کی بنا پر اور شیعہ و سنی اجماع کی بنا پر تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک جنگل اور بیابان میں کہ جہاں پر کوئی موجود نہ ہو ؛خدا، رسول، مقدسات اسلامی اور دین اسلام کی ضروریات کی توہین کرے، اور اس کو پولیس یا عدلیہ کے حوالہ کرنے کا کوئی امکان نہ ہو تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس کو اسلامی مقدسات کی توہین کی بنا پر قتل کر دے اور اسی اسلامی نظریہ کی بنا پر حضرت امام خمینیؒ نے مرتد سلمان رشدی کے قتل کا فتوی صادر فرمایا جس کی تمام شیعہ سنی علماء نے تائید کی مغربی تمدن سے ہمارا نقطہ اختلاف یہی ہے جس کو اسلام قبول کرتا ہے لیکن مغربی کلچر نہیں مانتا۔

ہمارا دینی وظیفہ اور دینی غیرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسلامی مقدسات کی توہین ہوتے ہوئے خاموش بیٹھے دیکھتے رہیں، اسلام نے دینی مقدسات کی توہین کے مقابلہ کے لئے تشدد کو جائز قرار دیا ہے جب اسلام ہمارے نزدیک اپنی جان و مال اور اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے تو ہم اس کی حفاظت اور دفاع کے لئے اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈال سکتے ہیں لہٰذا اگر کوئی اسلامی مقدسات کی توہین کرے تو ہر انسان اس کو سزا دے سکتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کو یہ بھی احتمال ہو کہ کل اسے (اسی قتل کی بنا پر) گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کے خلاف کاروائی کی جاسکتی ہے کہ تجھے اس قتل کا کوئی حق نہیں تھا، اور وہ مقتول کے "مھدور الدم" (یعنی قتل جائز) ہونے کو ثابت نہ کر سکتا ہو جس کے نتیجہ میں اس پر قصاص یا سزائے موت کا فیصلہ دیا جائے، تو اس صورت میں بھی وہ اپنے دینی وظیفہ پر عمل کر سکتا ہے اور اسلام کی توہین کرنے والے کو سزائے اعمال تک پہنچا سکتا ہے، مگر یہ کہ اس کے قتل کرنے سے مزید فساد پھیلنے کا خطرہ ہو۔

اڑتالیسویں نشست

دینی عقائد واقدار کے نسبی ہونے کے نظریہ کی تحقیق وبررسی

ا۔ دینی مسائل کو مطلق یا نسبی قرار دینا

قارئین کرام! ہم نے گذشتہ دو سال میں "اسلامی سیاسی نظریات" کے بارے میں گفتگو کی گذشتہ سال اسلامی نقطہ نظر سے "قانون اور قانون گذاری" کے سلسلہ میں بحث کی اور اس سال میں "کشورداری" (حکومت اور اس کی ذمہ داریوں) کے بارے میں بحث کرر ہے ہیں اور ہم نے اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ بعض چیزوں کے لئے عقلی دلائل کا ہونا ضروری ہیں اور اکثر چیزیں آیات وروایات کی طرف مستند ہونا چاہئیں اسی وجہ سے ہماری بحث ایک "تلفیقی" بحث ہیں یعنی ہماری بحث میں نہ صرف عقلی دلائل ہیں اور نہ صرف شرعی اور تعبدی، بلکہ قارئین کرام کے لحاظ سے جو طریقہ بھی مناسب ہوتا ہے جس سے بات کو آسان طریقہ سے سمجھایا جاسکتا ہے؛ اسی لحاظ سے بیان کرتے ہیں، چاہے وہ عقلی دلائل ہوں یا شرعی۔

چاہے ہم عقلی دلائل کے ذریعہ کسی چیز کو ثابت کریں اور چاہے شرعی دلائل کے ذریعہ کسی چیز کے بارے میں بحث کریں، دونوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو ہم اپنی بحث میں ثابت کرتے ہیں کیا وہ سب کے نزدیک معتبر اور حجت ہیں؟ یعنی مطلق طور پر اعتبار رکھتے ہیں، یا مطالب اور اقدار نسبی ہوتے ہیں اور صرف کہنے والے کے نظریہ کو بیان کرتے ہیں، اور ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں دوسروں کا ایک الگ نظریہ ہو جو اس کے مطابق نہ ہو؟ دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ ایک مسلمان، یا شیعہ اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کا تابع شخص ہمارے دلائل کے ساتھ بیان پیش کردہ مطالب کو قبول کرتے ہیں اور ان کو مطلق طور پر مانتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ یہ صرف ایک خاص نظریہ کو بیان کرنے والے ہیں جس کے مقابلہ میں دوسرے بھی نظریات پائے جاتے ہیں جو اعتبار کے لحاظ سے ان کے برابر یا اس سے بالاتر ہوسکتے ہیں؟

بعض اخباروں اور تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ ان مطالب اور نتائج کو مطلق طور پر بیان نہیں کرنا چاہئے اور یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ ان مطالب کی نسبت اسلام کی طرف نہیں دینا چاہئے؛ اور صرف کہنے والے کا نظریہ ماننا چاہئے یعنی کہنے والا کہتا ہے کہ اسلام سے میرا حاصل کردہ نتیجہ یہ ہے، نہ یہ کہ اپنے حاصل کردہ نظریہ کو اسلامی نظریہ کے عنوان سے بیان کریں اس طرح کی گفتگو خصوصاً گذشتہ ہفتہ میں آپ حضرات نے بہت سنی ہوگی کہ: کسی بھی شخص کو اپنی سمجھ کو مطلق قرار نہیں دینا چاہئے، کیونکہ بعض افراد ایسے بھی ہیں جو اس کے علاوہ بھی فہم اور نتیجہ رکھتے ہیں اور ان کا ایک الگ اعتبار اور اہمیت ہے۔

2۔ معرفت کے نسبی ہونے کے سلسلہ میں تین نظریات

یہاں پر چند اہم سوال پیدا ہوتے ہیں کہ "مطلق" اور "نسبی" الفاظ کے معنی کیا ہیں؟ مثلاً "فلاں مطلب اعتبار مطلق نہیں رکھتا" یعنی چہ؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی معرفت اعتبار مطلق نہیں رکھتی؟ اور اس صورت میں مطلق اور نسبی معرفت میں کیا فرق ہے؟ اور کیا معرفت کا نسبی ہونا یا اعتبار معرفت کا نسبی ہونا صرف دینی مسائل سے متعلق ہے؟ یا کسی بھی علم کا کوئی بھی مطلب اور واقعہ نسبی ہوتا ہے؟

الف: معرفت کے نسبی ہونے پر پہلا نظریہ

معرفت کے مطلق یا نسبی ہونے کی تحقیق ایک فلسفی مسئلہ ہے جس کو اپیسٹمولوجی "Epistemology" (معرفت شناسی) کہا جاتا ہے قدیم زمانہ سے تقریباً ۲۵ صدی پہلے دانشوروں کے درمیان یہ اختلاف تھا کہ انسانی معرفت، اس کے اعتقادات اور اس کی قضاوت (فیصلے) کیا "اعتبار مطلق" رکھتے ہیں یا "اعتبار مطلق" نہیں رکھتے یہ سوفسطائی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے یونان میں زندگی بسر کرتے تھے اور لفظ "سفسطہ" (یعنی مغالطہ) انہیں کے نام سے لیا گیا ہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کو کسی بھی بات پر کوئی جزم و یقین حاصل ہو ہی نہیں سکتا، اور ہر چیز قابل شک و تردید ہے لہٰذا ان کے بعد سے تمام شکاک فرقے اور آگنوسٹیسٹ "Agnostist" نسبی گرایان اور رلٹویسٹس "Relatists" اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں المختصر: معرفت کے نسبی ہونے کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے، بلکہ قدیم زمانہ سے فلسفہ کی تاریخ میں موجود ہے اگرچہ آج کل جہان اسلام میں بہت ہی کم شکاک افراد ہوں گے، لیکن امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں شکاک اور نسبت گرا لوگوں کی بھرمار ہے بلکہ وہاں پر شکاک ہونا انسانی افتخار میں سمجھا جاتا ہے!

اور اگر ہم معرفت کے نسبی ہونے (یعنی انسان کو کسی بھی چیز کے بارے میں یقین حاصل نہیں ہوسکتا) اور شکاکیت کے بارے میں اکیڈمیک طریقہ پر تحقیق کریں تو اس وسیع بحث کی تحقیق کے لئے ایک طولانی زمانہ درکار ہے لیکن ہم یہاں پر مختصر طور پر ایک اشارہ کرتے ہیں۔

جو لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ آپ اپنی سمجھ اور نظریہ کو مطلق تصور نہ کریں، تو کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی چیز کے بارے میں یقینی طور پر اعتقاد پیدا نہیں ہوسکتا، اور حقیقت میں انسان کے لئے معرفت حاصل کرنے کا دروازہ بند ہے، اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ منطقی اور اصولی طور پر اس پر یقین حاصل ہوسکے، یا ان کا مطلب یہ ہے کہ بعض عقائد اور بعض چیزوں کی یقینی طور پر معرفت حاصل کرسکتے ہیں؟ "منطقی" کی قید لگانے کی وجہ یہ ہے کہ کبھی انسان کسی چیز کے بارے میں یقین رکھتا ہے اور کسی طرح کا کوئی شک اس کے ذہن میں نہیں ہوتا، لیکن ایک مدت کے بعد متوجہ ہوتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے؛ ایسا یقین جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی "نفسیاتی یقین" کہا جاتا ہے یعنی انسان یونہی کسی چیز پر یقین کرلیتا ہے اور اس میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں ہوتا، اگرچہ اس کا یقین غلط ہو اور جہل مرکب (نہ جاننے کے بارے میں نہ جاننا) کا شکار ہو، جس

کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا اعتقاد و یقین باطل ختم ہو جاتا ہے مثال کے طور پر دو اور دو کا چار ہونا ایک صحیح منطق ہے کیونکہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں دو اور دو پانچ یا چھ نہیں ہوتے پس اس حساب کا اعتبار مطلق ہے اور منطقی طور پر صحیح ہے، یہ ایک ذاتی نظریہ نہیں ہے، بلکہ سبھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

اگر ان لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو کسی بھی چیز اور واقعہ میں یقینی اعتقاد حاصل نہیں ہو سکتا، اگر چہ اس فلسفی بحث میں بہت زیادہ نظریات پائے جاتے ہیں اور اس جلسہ کی وسعت سے باہر ہیں، بس مختصر طور پر عرض کرتے ہیں کہ ان کا نظریہ نہ صرف یہ کہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہے اور نہ ہی دنیا کے کسی بھی مذہب میں اس کو قبول کیا جاتا ہے اصولی طور پر یہ بات قابل یقین نہیں ہے کہ دنیا بھر میں کوئی عاقل انسان کہے: میں نہیں جانتا کہ کرۂ زمین موجود ہے یا نہیں؟ شاید اس کے بارے میں صرف خیال کے علاوہ کچھ نہ ہو! یا کہے کہ میں نہیں جانتا کہ کرہ زمین پر کوئی انسان زندگی بسر کرتا ہے یا نہیں؟ یا مجھے شک ہے کہ یورپ میں کوئی ملک فرانس بھی ہے یا نہیں، اور آیا میرا بھی کوئی وجود ہے یا نہیں، اور یہ تمام چیزیں کسی بھی طریقہ سے قابل اثبات نہیں ہیں! اور اگر ہماری ملاقات اس طرح کے آدمی سے ہو تو ہم اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟ یقیناً اس سے کہیں گے کہ کسی نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جاؤ، کیونکہ ایسا شخص عقلی لحاظ سے صحیح وسالم دکھائی نہیں دیتا پس اگر ان لوگوں کا مطلب یہ ہے (جو کہتے ہیں: اپنی سمجھ اور اپنے نظریہ کو مطلق نہ سمجھیں) کہ کسی بھی عقیدہ اور یقین کو مطلق نہیں سمجھنا چاہئے اور کسی بھی واقعہ کے بارے میں دقیق قضاوت اور مطلق نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا تو ان کا مختصر جواب یہ ہے کہ ان کا اس طرح کا دعویٰ کرنا عقل اور تمام ادیان کے بالکل خلاف ہے اور ہمارے گمان کے مطابق ہمارے قارئین میں اندرون ملک یا بیرون ملک کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو اس طرح کا احتمال دے؛ لہٰذا اس سلسلہ میں بحث و گفتگو کرنا بے کار اور بے فائدہ ہے۔

ب۔ معرفت کے نسبی ہونے پر دوسرا نظریہ

البتہ معرفت کے نسبی ہونے کے سلسلہ میں دوسرے نظریات بھی پائے جاتے ہیں جو مذکورہ بالا نظریہ کی طرح مضحکہ خیز نہیں ہے، انہی نظریات میں سے ایک نظریہ یہ ہے: جو افراد اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ کسی بھی علم میں یقینی اور مطلق چیزیں موجود نہیں ہیں؛ بلکہ ان کے عقیدہ کے لحاظ سے علوم تجربی، علوم عقلی اور ریاضیات میں ایک حد تک یقینی، قطعی اور مطلق چیزیں موجود ہیں، اور صرف علوم عملی (یعنی اقداری علوم، احکامات اور وظائف) نسبی ہیں یعنی جہاں پر خوب و بد اور "باید ھا و نباید ھا" (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) بیان ہوتے ہیں، تو یہ چیزیں نسبی ہوتی ہیں چنانچہ اقدار اور وظائف کو نسبی قرار دینے والوں نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے دل فریب اور گمراہ کن چیزیں بیان کیں ہیں مثال کے طور پر کہتے ہیں: ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ایک ملک میں کسی کام کو اچھا سمجھا جاتا ہے جبکہ دوسرے ملک میں اسی کام کو ناپسند اور برا سمجھا جاتا ہے دنیا بھر کے ممالک میں کسی ایک ملک کے آداب و رسوم کو اسی ملک میں اچھا سمجھا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے دوسرے ملک میں انہیں ناپسند اور برا سمجھا جائے، اور ان سے عوام الناس نفرت کرتے ہوں۔

کسی کے احترام واکرام کے بارے میں (جیسا کہ ہم نے سنا ہے کہ) مشرقی ایشیاء کے بعض ممالک میں جب کسی کا بہت زیادہ احترام واکرام کرتے ہیں تو ایک دوسرے کو بُو کرتے ہیں، جبکہ یہی کام دوسرے ملکوں میں ناپسند اور برا سمجھا جاتا ہے، اسی طرح مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں جب کسی کی تقریر یا باتیں سننے کے بعد اس کا احترام کرتے ہیں تو اس کے چہرے کے بوسے لئے جاتے ہیں اور اس میں فرق نہیں ہے کہ چاہے وہ عورت ہو یا مرد جبکہ ہمارے اسلامی معاشرہ میں کسی نامحرم عورت کے بوسے لینا بہت بُرا سمجھا جاتا ہے پس ممکن ہے کہ بعض معاشرہ میں کسی ایک کام کو اچھا سمجھا جاتا ہو لیکن دوسرے معاشرہ میں اسی کام کو ناپسند اور بُرا سمجھا جاتا ہو، یہاں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خوب وبد اور باید ھا و نباید ھا نسبی ہیں، اور ان کے بارے میں مختلف ممالک اور معاشروں میں الگ الگ حکم لگایا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی معاشرہ میں بعض چیزیں ایک زمانہ میں اچھی مانی جاتی ہوں اور ایک زمانہ میں ناپسند اور بُری سمجھی جاتی ہوں۔

بعض مغربی ممالک میں ثقافتی اور اخلاقی برائیاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں، حالانکہ تقریباً تیس یا چالیس سال پہلے اگر کوئی شخص ٹی شرٹ میں باہر نکلتا تھا تو پولیس اس کو روکتی تھی ہم سے ایک صاحب نے نقل کیا کہ کناڈا کے ایک شہر میں تقریباً ۴۰ سال پہلے ایک شخص گرمی کی وجہ سے اپنا کوٹ اتار کر ٹی شرٹ میں چہل قدمی کرنے لگا، تو فوراً گھوڑ سوار پولیس نے اس پر اعتراض کیا کہ تم اپنا کوٹ اتار کر کیوں گھوم رہے ہو، عام مقامات پر ٹی شرٹ میں آنا "شرم وحیا" کے خلاف ہے! لیکن آج اسی کناڈا میں اگر عورت مرد نیم عریاں بھی سڑکوں پر دکھائی دینے لگیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا اور اس کام کو برا نہیں سمجھا جاتا لہٰذا خوب و بد اور اچھائی برائی؛ زمانہ کے لحاظ سے بھی مختلف اور نسبی ہیں لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ علوم جن میں خوب وبد اور باید ھا اور نباید ھا کو بیان کیا جاتا ہے؛ جیسے علم اخلاق، علم حقوق یا اجتماعی اور انفرادی زندگی سے متعلق دوسرے علوم سب نسبی ہیں اور ان کے درمیان کوئی مطلق معیار موجود نہیں ہے، اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں چیز ہر جگہ مطلقاً اچھی ہے یا فلاں چیز ہر موقع پر مطلقاً بُری ہے۔

قارئین کرام! ان لوگوں کی پیش کی جانی والی دلیل یہی ہے جس کو ہم نے بیان کیا، البتہ بعض دوسری دلیلیں بھی بیان کرتے ہیں جن کو یہاں پر بیان کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

۳۔ بعض اقدار کا مطلق اور ثابت ہونا

مطلب کی وضاحت کے لئے عرض کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ ہر اقداری مفہوم، حلال وحرام اور بدی اور خوبی مطلق ہے، تو اس کے دعویٰ کو باطل کرنے کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ایک معاشرہ میں اچھی ہو اور وہی چیز دوسرے معاشرہ میں بری ہو ایک جگہ اس کو اقدار میں شمار کیا جاتا ہو اور دوسری جگہ ضد اقدار حساب کیا جاتا ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ وہ گذشتہ دعویٰ جس کو "موجبہ کلیہ" کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے یعنی تمام اچھائیاں اور برائیاں؛ مطلق اور کلی ہیں، اسی چیز کو "سالبہ جزئیہ" کے عنوان سے بھی پیش کیا جاسکتا ہے، جس کی بنا پر وہ دعویٰ اور "حکم کلی"

نقض ہو جاتا ہے یعنی جب ہم نے ان اقداری چیزوں کو دیکھ لیا جو مطلق نہ تھے، اور بعض معاشرہ میں وہ اچھی اور بعض دوسرے معاشرہ میں ناپسند اور بری بھی جاتی ہوں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے تمام اقدار اور قضایا مطلق ہوں، بلکہ بعض اقداری قضایا نسبی ہیں بے شک یہ فیصلہ صحیح اور درست ہے، اور ہم بھی یہ نہیں کہتے کہ تمام اقداری مسائل اور تمام بایدھا اور نبایدھا مطلق اور کلی ہیں اور ہر معاشرہ کے لئے ہمیشہ ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہیں ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ بعض احکام متغیر اور موقع و محل کے لحاظ سے ہیں؛ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی بھی اقدار مطلق نہیں ہے یعنی اقداری نسبیت کا اثبات "سالبہ جزئیہ" ہے نہ کہ "سالبہ کلیہ" لہٰذا اس بنیاد کی بنا پر ہم کم ہی اقداری مسائل کے بارے میں مطلق یا نسبی ہونے کو ثابت کر سکتے ہیں۔

ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس مطلق اقداری چیزیں موجود ہیں اور بہت سے اقداری مسائل پر مطلق اعتقاد رکھ سکتے ہیں اور اگر یہ نظریہ ثابت ہو جائے، تو پھر ہم اس کی سینکڑوں مثال پیش کر سکتے ہیں، چونکہ عقلی بحث اور عقلی نظریات کا دارو مدار عدد اور گنتی پر نہیں ہوتا کیا آپ حضرات کو کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے جو یہ کہے کہ عدالت ایک معاشرہ میں پسندیدہ اور دوسرے معاشرہ میں ناپسند اور بری ہے؟ اور کیا کوئی ایسا عاقل انسان مل سکتا ہے جو کہے کہ ظلم بعض مقامات پر صحیح اور پسندیدہ ہے؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ظلم اور عدل کے مصداق میں غلطی ہو جائے اور الفاظ کا غلط استعمال کریں مثال کے طور پر کوئی یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو مارنا ظلم ہے، جبکہ بعض لوگوں کو سزا کے عنوان سے مارا جاتا ہے اور اس کو قصاص کی بنا پر مارنا برا نہیں ہوتا، بلکہ حق و عدل کے عین مطابق ہے نکتہ یہ ہے کہ اگر واقعاً کوئی کام ظلم ہو، تو پھر وہ دوسرے مقام پر اچھا نہیں کہلایا جا سکتا، یا اگر کوئی کام واقعاً عدل کے مطابق ہو تو وہ بعض مقامات پر برا نہیں ہو سکتا اور بعض مقامات پر عدل کو برا نہیں سمجھا جا سکتا اور یہ مسئلہ اس قدر واضح اور سبھی کو معلوم ہے کیونکہ جب قرآن مجید عوام الناس کو شرک سے پرہیز کرنے کے لئے کہتا ہے تو آواز دیتا ہے:

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ [1]

"بے شک کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

یعنی اس کبریٰ (کہ "ہر وہ چیز جو ظلم ہے اس سے دوری اور اجتناب کیا جائے")؛ میں کوئی شک و تردید نہیں ہے، اور یہ قضیہ؛ مطلق، کلی، ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہے، کیونکہ شرک ظلم کا ایک مصداق ہے، جو ہمیشہ برا ہے اور اس سے پرہیز کیا جائے۔

ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ تمام اقداری مسائل بطور مطلق ہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ بعض اقدار مطلق ہیں اسی طرح معرفت کے باب میں؛ ہم ہر معرفت کو مطلق نہیں مانتے، اور یہ بھی نہیں مانتے کہ ہر شخص کو حاصل ہونے والی معرفت اور شناخت صحیح اور مطلق ہے کیونکہ بعض لوگوں کو حاصل ہونے والی شناخت اور معرفت نادرست ہے پس معلوم یہ ہوا کہ بعض

---

[1] سورۂ لقمان آیت ۱۳

معرفت اور شناخت نسبی ہیں اور بعض چیزوں میں نسبیت پائی جاتی ہے: مثال کے طور پر آپ سے یہ سوال کیا جائے کہ تہران یونیورسٹی بڑی ہے یا چھوٹی؟ تو چونکہ اگر آپ اس کو اپنے گھر سے مقابلہ کریں گے تو آپ کا جواب "بڑی" ہوگا اور کہیں گے کہ تہران یونیورسٹی بہت بڑی ہے لیکن اگر اسی یونیورسٹی کو کرہ زمین سے مقابلہ کریں گے تو اس وقت آپ کا جواب یہ ہوگا کہ تہران یونیورسٹی بہت چھوٹی ہے؛ یہاں تک کہ دریا کے ایک قطرہ کی مانند شمار کی جائے گی۔

پس معلوم یہ ہوا کہ چھوٹا یا بڑا ہونا نسبی چیزوں میں سے ہے اور اسی طرح کے معنی و مفاہیم پر نسبی اطلاق کیا جائے گا لیکن کسی چیز کے چھوٹے یا بڑے ہونے سے یہ نتیجہ نہیں لیا جاسکتا ہے کہ تمام چیزیں نسبی ہیں، یہاں تک کہ خدا بھی نسبی ہے انسانی وجود، کرہ زمین اور عالم ہستی بھی نسبی ہیں چھوٹائی اور بڑائی؛ نسبی اور اضافی ہوتی ہیں اور "مقولہ اضافہ" سے تعلق رکھتی ہیں؛ لیکن بعض ایسے معنی اور مفاہیم ہیں جو نسبی نہیں ہیں اور ان کے ذریعہ تشکیل پانے والے قضایا مطلق ہوسکتے ہیں۔

اس بنا پر ہمارا کہنا یہ نہیں ہے کہ ہر اقدار چاہے کسی بھی جگہ ہو یا کسی بھی زمانہ میں ہو اس پر اعتقاد رکھنا مطلق ہے بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ "موجبہ جزئیہ" کے حد تک ہمارے پاس "مطلق اقدار" موجود ہیں، یعنی ہمارے پاس ایسے چیزیں موجود ہیں جو مطلق اقدار کہی جاسکتی ہیں اور موقع و محل اور زمان و مکان کے لحاظ سے تبدیل نہیں ہوتی، اور نہ ہی ان چیزوں میں کسی استثناء کا قائل ہوا جاسکتا بے شک ہمارے سامنے دو طرح کے اقدار موجود ہیں ایک مطلق ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو مطلق نہیں ہوتے ہمارے عقیدہ کے لحاظ سے ظلم ہمیشہ اور ہر جگہ اور ہر ایک کے لئے برا ہے اور عدل ہمیشہ اور ہر جگہ اور ایک کے لئے حسن، اچھا اور پسندیدہ ہے ہمارے پاس واقعی قضایا اور علوم توصیفی سے متعلق قضایا مطلق اور یقینی ہیں مثال کے طور پر ہم یقین اور جزم کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آسمان و زمین اور انسان موجود ہیں، خداوند عالم موجود ہے، وحی اور قیامت کا وجود ہے؛ بے شک یہ تمام چیزیں مطلق ہیں، نسبی نہیں۔

بعض اقدار کے مطلق ہونے کا معیار

قارئین کرام! یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ چیز مطلق ہے یا نسبی؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہر وہ واضح اور روشن قضیہ یا وہ قضیہ جو صحیح طور پر واضح چیزوں سے حاصل ہو وہ مطلق ہے لیکن وہ قضایا جو واضح نہیں ہیں یا صحیح طریقہ پر واضح و روشن چیزوں سے حاصل نہ ہو وہ نسبی ہے، جس کا نتیجہ بھی واضح اور روشن نہیں ہوگا اور بالکل یہی تقسیم اقدار کے سلسلہ میں بھی ہے: احساسات، محبت، خیالات اور عادات کی بنیاد پر حاصل شدہ اقدار، نسبی ہیں؛ لیکن جن اقدار کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے اور جن پر عقلی دلائل قائم کئے جاسکتے ہیں اور ان کے اقداری ہونے پر دلیل پیش کی جاسکتی ہے؛ وہ مطلق ہیں مثال کے طور پر ہم عبادت خدا کو ایک اقدار کے عنوان سے مانتے ہیں جو ہمیشہ بطور مطلق مقصود اور پسندیدہ ہے، اور کبھی بھی اس میں استثناء نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کے لئے واقعی اور حقیقی راہ تکامل (ترقی) عبادت خدا ہے اسی طرح اجتماعی اقدار میں عدالت ہمیشہ اچھی ہے، جس کے بارے میں کبھی بھی کوئی استثناء نہیں کیا جاسکتا، اس کے

مقابلہ میں ظلم ہمیشہ اور ہر جگہ ناپسند اور برا ہے لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ مطلق اقدار بھی موجود ہیں۔

۴۔ مغربی تمدن میں تمام دینی عقائد نسبی ہیں

آج کل مغربی ممالک میں بہت سے فلسفی مکاتب پیدا ہو گئے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ اقدار کے سلسلہ میں عقلی اور واقعی پشت پناہی نہیں ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ تمام اقداری مسائل نسبی اور قرار دادی (باہمی مفاہمت) ہیں، یعنی جس کو عوام الناس اچھا کہیں وہ اچھا ہے اور جس کو برا طے کرلیں وہ برا ہے انہیں فلسفی مکاتب میں سے ایک مہم اخلاقی مکتب بنام "پوزیٹیزم" "Positivism" ہے، جس میں معاشرہ کی پسند کو اقدار کا ملاک قرار دیا جاتا ہے اسی بنا پر اس مکتب کے ماننے والے کہتے ہیں کہ خوب و بد اور اقدار و ضد اقدار طے کئے جانے والے معاملات میں سے ہیں اگر آج عوام الناس کسی چیز کو اقدار اور اچھی مانتے ہیں تو وہ اچھی اور قابل قدر دانی ہے، لیکن اگر لوگوں کا نظریہ بدل جائے تو پھر وہی چیز جس کو اچھا سمجھا جارہا ہے اس کو برا کہا جانے لگے گا، اور وہ ضد اقدار شمار ہونے لگی گی۔

لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ تمام اقداری مسائل نسبی نہیں ہے اور تمام اقداری مسائل قرار داد کے تحت نہیں ہیں ٹھیک ہے کہ کسی بھی معاشرہ کے آداب و رسوم قرار دادی اور موقع و محل کے لحاظ سے قابل تبدیلی ہوتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے اقدار ہیں جو انسان کی فطرت میں پائے جاتے ہیں، وہ فطرت جو ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہے:

جیسا کہ قرآن مجید میں خداوند عالم کا ارشاد ہوتا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ [1]

"آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی"۔

چونکہ فطرت الٰہی میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، لہٰذا وہ اقدار جو فطرت پر مبنی ہوں گے وہ بھی غیر قابل تبدیلی ہوں گے لہٰذا ہمارے پاس مطلق اقدار ہوسکتے ہیں جو لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ آپ اپنے نظریہ کو مطلق نہ سمجھے، اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اقداری افکار کو مطلق نہ کہیں کیونکہ ہم ایسے عقائد اور اقدار پر یقین رکھتے ہیں جن پر دوسرے لوگ اعتقاد نہیں رکھتے، اور ہمارے مقابلہ میں دوسری چیزوں کا اعتقاد رکھتے ہیں؛ لہٰذا ہمیں اپنے عقائد ان لوگوں پر تحمیل نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ہمارا اقداری نظریہ ہمارے سلیقہ کے تحت ہے اور دوسروں کی اقداری نظر ان کے اپنے سلیقوں کے تحت ہے، اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے سلیقے کو غلط کہے بے شک اگر کوئی شخص اس طرح کا نتیجہ پیش کرتا ہے تو یہ اسی اخلاقی مکتب "پوزیٹیزم" "Positivism" کی بنیاد پر ہے جس کی بنیاد عوام الناس کا سلیقہ اور ان کی مرضی ہے، جبکہ یہ نظریہ فاسد اور باطل ہے، اور اسلام اور فلسفہ اخلاق کے صحیح مکتب سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

---

[1] سورۂ روم آیت ۳۰

اسی پوزیٹیوزم اخلاقی مکتب کے طرفدار ہم سے کہتے ہیں کہ "اپنے نظریات کو مطلق قرار نہ دیں" تو وہ لوگ واقعاً بہت بڑے دھوکے میں ہیں ہم مطلق اقدار کی حفاظت کی خاطر اپنی جگہ پر اٹل ہیں اور کوشش کرتے رہیں گے تاکہ اسلامی ثابت اقدار معاشرہ میں زندہ رہیں اور ان کی تبلیغ ہوتی رہے، اور ان کے بارے میں کسی طرح کا کوئی اشکال اور اعتراض باقی نہ رہے۔

مغربی افراد "رنسانس" کے زمانہ کے بعد سے دینی معنی و مفاہیم کو اقدار کے دائرہ میں قرار دیتے ہیں خصوصاً وہ دینی مسائل جو دینی مناسک اور احکام سے متعلق ہیں اور چونکہ دوسری طرف سے یہ لوگ اقدار کو نسبی قرار دیتے ہیں، اسی وجہ سے دینی اقدار کو بھی نسبی شمار کرتے ہیں، اور ان کے لئے مطلق اقدار کے قائل نہیں ہیں چنانچہ اسی بنیاد پر کہتے ہیں کہ تمام ادیان اور مذاہب اچھے اور برحق ہو سکتے ہیں: اور یہ دین اپنے ماننے والوں کے لئے اچھا اور برحق، اور وہ دین اس کے ماننے والوں کے لئے اچھا اور برحق ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے دینی نظریہ کو مطلق قرار دے، اسی طرح یہ بھی کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف اور صرف دین اسلام صحیح اور برحق ہے اور دوسرے ادیان عالم باطل اور بے بنیاد ہیں چاہے دین اسلام ایک طرح کے اقداری احکام سے تشکیل ہوا ہے مثلاً دینی حلال وحرام چیزیں جیسے نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، یا جھوٹ نہ بولیں، یا نامحرم کو نہ دیکھیں اور لوگوں کے مال اور ناموس پر تجاوز نہ کریں جب کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر اقدار مسائل نسبی اور قراردادی (باہمی مفاہمت) ہوں تو دینی مسائل بھی نسبی ہوں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین اسلام اعتبارات اور قرارداد کا دین بن جائے گا۔

اس پوزیٹیزم نظریہ اور دینی مسائل کو اقدار کے دائرہ میں قرار دینے کی بنا پر بعض لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے دین کو دوسروں پر تحمیل کریں، اور ان کو مسلمان کرنا چاہیں دین اسلام تمام مسلمان کے لئے محبوب اور پسندیدہ ہے، اسی طرح دین یہودیت یہودیوں کے لئے پسندیدہ ہے، چونکہ یہ ادیان نسبی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مطلق نہیں ہے اور چونکہ یہ ادیان اور اقدار نسبی اور قراردی ہیں اسی لحاظ سے مختلف معاشروں میں ان کا حکم بھی مختلف ہے: چودہ سو سال پہلے اسلام؛ سعودی عرب کے لئے مناسب اور اچھا تھا لیکن عصر حاضر میں ماڈرن دنیا کے لئے ایک دوسرا دین مناسب اور مطلوب ہے! لہٰذا اسلام کو مطلق قرار نہیں دینا چاہئے اور مسلمانوں کو بھی اپنے دینی نظریات کو دوسروں پر نہیں تھوپنا چاہئے اسلام ان لوگوں کے اچھا ہے جن کے سلیقے ان سے میل کھاتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے یہ دین اچھا نہیں ہے کیونکہ وہ اس دین کو پسند نہیں کرتے اور اپنے سلیقہ کے لحاظ سے دوسرا دین اختیار کئے ہوئے ہیں لہٰذا ہمیں اپنے اسلامی سلیقہ کو دوسروں پر تحمیل نہیں کرنا چاہئے اور دوسروں کے سلیقوں کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔

قارئین کرام! گذشتہ نظریہ کا جواب یہ ہے کہ ہم مان لیتے ہیں کہ اسلام کے بعض احکام (جیسے احکام ثانوی) نسبی اور متغیر ہیں اور بعض احکام موقع ومحل کے لحاظ سے ہوتے ہیں، لیکن اسلامی تمام احکام متغیر نہیں ہیں؛ بلکہ بہت سے اسلامی

احکام ثابت، مطلق اور غیر قابل تبدیلی ہیں اس کے علاوہ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اسلام کا کوئی بھی حکم عوام الناس کے سلیقہ کے تابع نہیں ہے، اور متغیر احکام کے لئے بھی خاص دلائل ہوتے ہیں پس اولاً: ہم اس نظریہ کو نہیں مانتے کہ تمام اقدار عوام الناس کے سلیقہ اور ان کی پسند کے تابع ہیں بلکہ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ بعض اقدار اور بعض ضد اقدار مطلق چیزیں؛ مصالح ومفاسد کے تابع اور نفس الامری ہیں، لہٰذا وہ ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہیں دوسرے: اسلام کے ثابت اقدار اسی قسم کے ہیں (یعنی مصالح ومفاسد کے تابع اور نفس الامری ہیں) لہٰذا وہ مطلق ہیں اور ہم ان کو ہمیشہ اور ہر جگہ کے لئے معتبر جانتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمارے اسلامی نظریات مطلق ہیں، اور صرف یہی اسلامی نظریات مطلق، صحیح اور برحق ہیں پس نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی ممالک میں نسبی گرائی نظریہ اسلامی نظریات کے مطابق نہیں ہے۔

ج۔ معرفت کے نسبی ہونے پر تیسرا نظریہ (معرفت دینی میں نسبیت کا وجود)

نسبی نظریات میں سے "معرفت دینی میں نسبیت" کا نظریہ بھی ہے، چنانچہ اسی نظریہ کے تحت بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بھی یہ مانتے ہیں کہ دین ثابت اور مطلق ہے، اور دینی اقدار بھی مصالح ومفاسد کے تابع، واقعی اور نفس الامری ہیں، ہم بھی حقیقت دین کو مطلق اور ثابت مانتے ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی واقعی اور مطلق دین نہیں ہے، جس سے ہم رابطہ برقرار کریں صرف ہمارے اختیار میں دین کی معرفت اور اس کی شناخت ہے اور جو کچھ بھی ہم دوسروں کو دین کے عنوان سے بتاتے ہیں، درحقیقت وہ دین سے حاصل کردہ ہمارا ایک نتیجہ اور شناخت ہوتی ہے جبکہ دوسرے افراد دین سے ایک دوسرا نتیجہ حاصل کرتے ہیں اگرچہ ہم اصلِ دین کو ثابت اور مطلق مانتے ہیں لیکن دینی معرفت اور دینی شناخت کو قابل تغیر اور نسبی مانتے ہیں، ہمارے نظریہ کے مطابق کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے نتیجہ اور شناخت کو مطلق مانے، اور اپنے اس نظریہ کو دوسروں پر تھوپے۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہماری بعض دینی شناخت مطلق ہو، اور سبھی لوگ دین سے یہی نتیجہ اخذ کریں اور سبھی اسی کو قبول کریں یا نہ، دینی کوئی بھی معرفت مطلق نہیں ہے بلکہ دینی ہر موضوع کی ہر شناخت نسبی ہے؟ جس کے نتیجہ میں دو دینی شناختوں میں سو فی صد اختلاف ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہو؛ یعنی کوئی شخص کسی چیز کو دینی مسائل میں شمار کرے جبکہ کوئی دوسرا شخص اس کا انکار کرے، حالانکہ دین سے حاصل کردہ دونوں شناخت مقبول اور معتبر ہوں؟!

قارئین کرام! نسبیت کے سلسلہ میں یہ تیسرا نظریہ جو "معرفت دینی میں نسبیت" کے نام سے شہرت پیدا کرتا جارہا ہے اور اس نظریہ کے طرفدار اس کو "قبض و بسط شریعت" (شرعی مسائل میں کمی وزیادتی) کے عنوان مانتے ہیں، اور یہ نظریہ تقریباً بیس سال سے رائج ہوتا جارہا ہے اور ہر روز مزید پھیلتا جارہا ہے نیز اخباروں اور جرائد میں بیان ہوتا ہے، اس کی بنا پر ایسا ظاہر کیا جاتا ہے کہ دین کے متعلق تمام لوگوں کی شناخت برابر نہیں ہے: ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے اعتقاد کی بنا پر کہے کہ نماز صبح دو رکعت ہے، لیکن کوئی اپنے نظریہ کی بنا پر یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ نماز صبح تین رکعت ہے؛ حالانکہ دونوں نظریات معتبر اور

آنے والی تمام تر سختیوں کو برداشت کیا ہے نیز اپنی رفتار، فہم، تحقیق اور استنباط میں تقویٰ الٰہی سے مزین ہوں، نیز ہوا پرستی کا شکار نہ ہوں دینی معاملات میں مغربی تمدن سے متاثر چند بول پڑھنے والے (خود کو دینی ماہر کہلانے والے)؛ کی نظر معتبر نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف نظر اور مختلف قرائت صرف دین کے ظنی اور متشابہ مسائل میں قابل قبول ہے، اور اسلام کے قطعی مسائل، محکمات، ضروریات اور بینات میں صرف ایک ہی قرائت موجود ہے اور وہ بھی خدا و پیغمبر کی قرائت ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں کسی طرح کے اختلاف نظر، شک و تردید اور مختلف قرائت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جیسا کہ اسلام کو ۱۴۰۰ سال گذر چکے ہیں ان کے بارے میں کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے ہم نے دیکھا کہ حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتد سلمان رشدی کے قتل کا فتویٰ صادر کیا تو اس وقت تمام علماء اسلام نے تائید کی اور اس حکم کے بارے میں کسی طرح کی کوئی مخالفت سنائی نہ دی، اور سب نے یہ اتفاقی طور پر کہا کہ حضرت امام خمینیؒ کا بیان کردہ فتویٰ حکم اسلام ہے اگر چہ بعض مغرب پرست نو وارد جنہوں نے اسلام کی بو بھی نہیں سونگھی ہے اس فتویٰ کی مخالفت کی اور کہا: اسلام سے ہماری قرائت یہ نہیں ہے لیکن یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دنیا بھر کے صاحب عقل صرف اسی شخص کے نظریہ کو اہمیت دیتے ہیں اور صرف اسی کے نظریہ کو معتبر جانتے ہیں جو متعلق علم میں صاحب نظر اور محقق ہو اور صحیح طریقہ اور اس علم سے مناسب تحقیق کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرے۔

ا۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

"اسلامی سیاسی نظریات کی وضاحت" کے سلسلہ میں ہماری بحث یہاں تک پہنچی تھی کہ اگر اسلامی منابع کے لحاظ سے قوانین اور ضوابط بنانا چاہیں اور ان کو اسلامی اقدار کے مطابق نافذ کرنا چاہیں، تو اس کے لئے ہمارے پاس قرآن وسنت (جو ہمارے اصلی منابع ہیں)؛ کی گہری شناخت اور قابل اعتماد پہچان ہونا ضروری ہے، تا کہ قانون گذاری کے وقت اسلامی نظریہ کو مدنظر رکھیں، اور وہ قوانین وضوابط اسلام کے کلی قوانین کے تحت قرار پائیں، اور اسی طرح قرآن وسنت سے الہام لیتے ہوئے ان کو نافذ کرنے کا طریقہ اپنائیں اس سلسلہ میں کبھی کبھی آیات وروایات سے ہونے والا نتیجہ مختلف ہو جاتا ہے اور بعض آیات وروایات کی مختلف تفسیر ومعنی کئے جاتے ہیں نیز بعض روایات سے مختلف استنباط ہوتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں بعض لوگ اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہیں اختلاف کے پیش نظر یہ کہتے ہیں کہ تمام دینی مسائل میں اختلاف جائز ہے، اور کہتے ہیں کہ ہر شخص اسلام سے مخصوص قرائت اور مخصوص نتیجہ حاصل کر سکتا ہے، اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نظریہ کو دوسروں پر تحمیل کرے جیسا کہ اخباروں اور جرائد میں مکرر یہ شعار دیا جاتا ہے کہ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ دین سے اپنے حاصل کردہ نتیجہ کو مطلق گردانے، بلکہ توجہ رہے کہ دوسرے افراد بھی آراء اور نظریات رکھتے ہیں، اور یہ کہ اسلام کی صرف ایک قرائت نہیں ہے، نیز اسلام کے بارے میں مختلف قرائت کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ دین کی ہر

ایک قرائت معتبر اور محترم ہے۔

۲۔ واقع نما اور غیر واقع نما زبانوں کی اہمیت

قارئین کرام! ہم نے گذشتہ جلسہ میں دینی سلسلہ میں مختلف نظریات کے مطلق نہ ہونے نیز دین کی مختلف قرائت نہ ہونے کے بارے میں بحث کی، اور نظریات کے نسبی ہونے نیز مختلف قرائت کا سرچشمہ تلاش کرتے ہوئے "نسبیت معرفت" کے مسئلہ کو بیان کیا اور عرض کیا کہ "نسبیت معرفت" کے سلسلہ میں تین نظریات پائے جاتے ہیں اس جلسہ میں دینی نظریات کے مطلق نہ ہونے کے شعار اور دین کی مختلف ہونے کے بارے میں دوسرے دو نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور وہ دو نظریہ یہ ہیں: "دین کی زبان" اور "ھرمنوٹیک" "Hermeneutics" کی بحث اور علم تفسیر متون (تحریر کی شرح و تفسیر کرنا) جو کہ عصر حاضر میں معرفت کا ایک مہم باب کھلاتا ہے، اور دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں مخصوص ڈیپارٹمینٹ اور مخصوص علمی گروہ اس میں مشغول ہیں لہٰذا ہم اس جلسہ میں انہیں دو چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

دین کی زبان کے سلسلہ میں بحث، اور دینی معرفت مطلق نہ ہونے والے مسئلہ کا سرچشمہ یہ ہے کہ ان آخری چند صدیوں کے دوران یورپی ممالک میں "فلسفہ دین اور کلام جدید" کے سلسلہ میں ایک نئی بحث یہ کی گئی ہے کہ کیا دین کی زبان واقع نما ہے یا دین کی زبان سمبلیک "Symbilec" (رمزی) اور قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے اس سلسلہ وضاحت کے طور پر یوں عرض کیا جائے کہ انسان اپنی بات کو سمجھانے کے لئے زبانی اور عرفی محاورات یا علمی اور فلسفی اصطلاحات، نیز الفاظ اور ان کی ترکیبات کا استعمال کرتا ہے تا کہ دوسروں کو خارجی یا عینی چیزوں کی واقعیت کی طرف متوجہ کر سکے اور کبھی انسان ان الفاظ کے ذریعہ خارجی اور عینی واقعیات کے طرف متوجہ کرتا ہے اور کبھی ان الفاظ کے ذریعہ منطق اور فلسفہ جیسے علم میں ذہنی اور تصوری حقائق کی طرف متوجہ کرتا ہے، مثال کے طور پر کوئی شخص یہ کہے کہ "فضا روشن ہے" اس جملہ سے کہنے والے کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سننے والے کو اس بات کی خبر دے کہ فضا روشن ہے، اور چراغ کے ذریعہ روشنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے بے شک یہ زبان واقع نما ہے اور ایک بیرونی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے اور اسی طرح کی زبان ریاضیات، منطق اور فلسفہ میں بھی استعمال کی جاتی ہے، البتہ یہ زبان علوم دقیقہ (منطق و فلسفہ) اور تجربی علوم میں تھوڑے دخل و تصرف کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ زبان علم اور زبان فلسفہ واقع نما ہوتے ہیں اور بیرونی حقیقت یا ذہنی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔

لیکن کبھی کبھی کسی بھی زبان کے الفاظ بیرونی یا ذہنی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے استعمال نہیں کئے جاتے اگر چہ الفاظ کی ترتیب وہی ہوتی ہے جس کو علوم میں حقیقت نما طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے، لیکن کہنے والے یا لکھنے والے کا مقصد حقیقت سے باخبر کرنا نہیں ہوتا، مثال کے طور پر افسانہ اور قصہ کی زبان، جس میں کسی بھی طرح کی کوئی واقعیت کا پتہ نہیں دیا جاتا، لہٰذا اس طرح کی زبان واقع نما نہیں ہے جس وقت قصہ اور کہانیوں کی کتابوں میں "کلیلہ و دمنہ" کی داستان بیان کی جاتی

ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان قصوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کسی طرح کی حقیقت کی حکایت نہیں کرتے اگر ان میں جنگلی حیوانات مثلاً شیر، بھیڑیا اور لومڑی وغیرہ کا کے بارے میں باتیں بتائی جاتی ہیں تو مؤلف کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جنگلی حیوانات میں اس طرح کی گفتگو ہوتی ہے؛ بلکہ مؤلف اس داستان کے ذریعہ حیوانات کی زبان میں غیر مستقیم طور پر بعض مہم باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے لہذا افسانہ اور قصہ کی زبان غیر واقع نما زبانوں کا ایک حصہ ہے۔

انہی غیر واقع نما زبانوں میں سے: زبان سمبلیک "Symbilec" (رمزی) ہے جو بہت سے علوم میں استعمال کی جاتی ہے، اسی طرح انسانی معارف کی بہت سی قسموں میں حکایت اور حقائق کے بیان کرنے کے لئے اس زبان سے استفادہ کیا جاتا ہے، جس کا واضح نمونہ؛ علم ھندسہ اور ریاضی کی مثالیں اور فارمولے نیز اختصار کی علامتیں ہوتی ہیں جیسے "y"،"x"، کیونکہ یہ مثالیں اور فارمولے کسی حقیقت کی حکایت نہیں کرتے، بلکہ بعض علمی حقائق کے لئے صرف ایک علامت ہوتی ہیں، اسی طرح شاعروں کی زبان بھی غیر واقع نما ہوتی ہیں جب شاعر؛ مے، ساغر اور ساقی جیسے الفاظ کو اپنے شعر میں استعمال کرتا ہے تو حقیقت میں اس کی مراد واقعی ساقی اور شراب نہیں ہوتی بلکہ ان الفاظ کو کنایۃً استعمال کرتا ہے جب کہ اس کے ذہن میں حقیقی مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔

۳۔ دین کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کا سبب

چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین بھی اپنی خاص زبان رکھتا ہے، اور دین کی زبان غیر واقع نما زبانون میں سے ہے پہلے تو دین کی زبان کا مسئلہ یورپ میں یہودیت اور عیسائیت کے عقائد کے بارے میں بیان ہوا، اسی وجہ سے دانشوروں اور متفکروں نے اپنے نظریہ کی تائید میں یہودیوں اور عیسائیوں کی کتاب مقدس سے مثالیں پیش کیں، اور یہ کہا کہ جب ہم کتاب مقدس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے اندر بعض چیزوں کے بارے میں دیکھتے ہیں، تو ہمارا تصور یہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ مقدس کتاب ہم کو علمی (اور سائنسی) کتابوں کی طرح بیرونی حقائق سے آشنا کر رہی ہے، بلکہ دین نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ایک افسانہ کی زبان اور سمبلیک "Symbilec" زبان ہے، (واقع نما نہیں۔)

عام طور پر زبان کی دو قسم بیان کی جاتی ہے: ایک واقع نما زبان اور دوسری غیر واقع نما زبان، اور بعض لوگ دین کی زبان کو غیر واقع نما زبانوں میں قرار دیتے ہیں، یعنی دین کی زبان حقائق اور واقعیت پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ افسانہ، قصہ و کہانیوں کی طرح ہوتی ہے لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دین کی زبان کو زبان افسانہ قرار دینے کی علت اور وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب یورپ میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے پیش نظر ہر روز نئی نئی چیزیں کشف ہوئی، اور زمین، سورج اور دیگر ستاروں کے بارے میں مغربی دانشوروں جیسے "کلپر "، "کپر نیک"، "گالیلہ"؛ نے نئے نئے فرضیہ قائم کئے جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتاب (توریت اور انجیل) سے ہم آہنگ نہ تھے، جس کی وجہ سے انہوں نے یہ اندازہ لگالیا کہ عصر حاضر میں سائنس کی نئی تصویری اور نظریات؛ کتاب مقدس میں بیان شدہ بعض عقائد کو جھوٹا ثابت کرتے

ہیں، جس کی بنا پر یہودیت اور عیسائیت کا چراغ گل ہوجائے گا، کیونکہ جب توریت اور انجیل میں بیان شدہ چیزیں نادرست، بے بنیاد اور جھوٹی ثابت ہوجائیں گی تو پھر یہ دین کیسے باقی رہ سکتا ہے خصوصاً عیسائیت جس کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

خصوصاً "رنسانس" کے زمانہ کے بعد سے؛ کتاب مقدس کی اہمیت کو بچانے اور یہودیت وعیسائیت کی دیواریں ہلنے سے روکنے کے لئے راہ حل تلاش کرنے کی فکر ہوئی، (اور کافی مدت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ) توریت اور انجیل میں بیان شدہ عقائد اور دوسری چیزیں؛ سائنس کے جدید نظریات اور ٹکنالوجی سے اس وقت ہم آہنگ نہ ہوں گی جب ہم دین کی زبان کو واقع نما اور حقائق کی عکاسی کرنے والی زبان کہیں لیکن اگر دین کی زبان کو غیر واقع نما زبان قرار دیدیں اور یہ کہیں کہ دین کی زبان؛ شعر اور افسانہ کی زبان ہے جو حقائق اور واقعیت کی عکاسی نہیں کرتی اور توریت وانجیل میں بیان شدہ چیزیں گویا افسانہ اور قصہ کہانیوں کی طرح ہیں اور خاص اغراض ومقاصد کے تحت تنظیم ہوئی ہیں، تو اس صورت میں سائنس اور دینی باتوں میں کسی طرح کا کوئی اختلاف پیش نہیں آئے گا؛ کیونکہ بنیادی طور پر دونوں زبانوں کا مقصد مختلف ہے اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ توریت اور انجیل میں خدا، وحی، قیامت اور جنت وجہنم کے بارے میں ذکر شدہ مطالب صرف عوام الناس کو اچھائیوں اور برائیوں کے سمجھنے کے لئے بیان ہوئے ہیں، تاکہ دیندار افراد نیک کام کرنے اور برے کاموں سے پرہیز کرنے کی کوشش کریں جھوٹ نہ بولیں، غیبت نہ کریں اور دوسرے پر ظلم وستم کو جائز نہ مانیں مثلاً اگر ان میں کہا جاتا ہے کہ جو شخص کسی پر ظلم کرے گا تو آخرت میں اس پر عذاب ہوگا، تو درحقیقت اس قول سے ظلم کی بُرائی کو مزید مجسم کیا گیا ھے، ایسا نہیں ہے کہ واقعاً آخرت میں کوئی جنت وجہنم موجود ہے، لہٰذا ہمیں دینی مسائل سے اس طرح کا کوئی تصور اور نتیجہ حاصل نہیں کرنا چاہئے۔

کتاب مقدس (توریت اور انجیل) سے عام فہم عوام الناس یہی نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں ذکر شدہ دینی مسائل حقائق پر مبنی ہیں اور بیرونی حقائق کی عکاسی کرتی ہیں، لیکن روشن خیال رکھنے والوں اور دانشوروں کے نزدیک توریت وانجیل میں بیان شدہ مطالب صرف عوام الناس کے لئے تربیتی پہلو رکھتے ہیں یعنی ان کے پیش نظر عوام الناس میں نیک کام کرنے اور بُرے کاموں سے پرہیز کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؛ اس کے علاوہ ان مقدس کتابوں میں بیان شدہ مطالب میں کوئی پیغام نہیں ہے یہاں تک کہ دین کی افسانوی زبان میں خدا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، چنانچہ اگر توریت اور انجیل میں خدا کا ذکر ہے یا انبیاء علیہم السلام اور وحی کے بارے میں بیان ہوا ہے، تو اس افسانوی زبان میں یہ صرف خدا کا ایک عکس ہے ورنہ (نعوذ باللہ) نہ تو خدا ہے اور نہ جنت وجہنم اور وحی اور اس عکس کو اس افسانوی زبان میں اس قدر بہترین سلیقہ سے بیان کیا گیا ہے تاکہ عوام الناس میں نیک کام کرنے اور بُرے کام سے پرہیز کرنے کا شوق پیدا ہو، اور انسانی اقدار کا پاس ولحاظ رکھا جائے ان کی یہ کوشش رہے کہ اسی دنیا میں بہترین زندگی گذاریں اور دوسرے کو آزار واذیت نہ دیں؛ ورنہ تو توریت وانجیل کی "کلیلہ ودمنہ" داستان سے زیادہ اہمیت نہیں ہے جس طرح سے یونانی قدیم تمدن اور دوسرے قدیمی معاشروں میں افسانوی

خدا ہوتے تھے، یہاں تک کہ ان کی بعض داستانوں میں یہاں تک بیان ہوا ہے کہ وہ خدا ایک دوسرے سے شادی کیا کرتے ہیں، اور کبھی تال میل کرتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں، اسی طرح دوسرے ادیان کی کتابوں منجملہ توریت اور انجیل میں بھی صرف خیالی اور افسانوی عکس ہوتا ہے جس میں کسی بھی طرح کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہودیت اور عیسائیت کو نابودی سے بچانے کے لئے توریت اور انجیل میں بیان شدہ دینی مسائل کے بارے میں یہ تھیوری اور نظریہ پیش کیا گیا ہے اور یہ نظریہ آہستہ آہستہ مغربی ممالک کے دیندار لوگوں میں بھی رائج ہوتا چلا گیا، اور کتاب مقدس کی توجیہ (اور دلیل) کے عنوان سے اس نظریہ کو بہترین راہ حل مانا جانے لگا لیکن "رنسانس" کے زمانہ سے پہلے یہودی اور عیسائی متدین لوگ دینی عقائد اور مسائل کو صادق، حق اور واقع کے مطابق مانتے تھے، اور انہوں نے جب نئی نئی کشفیات اور سائنس کے نظریات کو اپنی کتاب مقدس کے برخلاف پایا تو کتاب مقدس کے دفاع کرتے ہوئے بعض دانشوروں کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بعض دینی مسائل کے مخالف دانشوروں کو پھانسی دے دی گئی اور بعض کو زندہ آگ میں جلا دیا گیا اسی طرح بعض بہت سے دانشوروں کو منجملہ "گلیلہ" کو توبہ پر مجبور کیا جس کی بنا پر اس نے اپنے نظریات واپس لے لئے۔

۴۔ مغربی نسبی گرائی نظریہ کی ترویج (وتبلیغ) کرنے والے مغرب پرست روشن خیال

قارئین کرام! مغربی ممالک میں پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ دین کی زبان؛ سائنس کی زبان سے مختلف ہے اور دین کی زبان کسی بھی طرح کے حقائق پر مبنی نہیں ہے، بلکہ دین کی زبان قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے، لیکن مشرقی ممالک سے مغربی ممالک کے تعلقات اور علمی تبادلہ خیالات اور مغربی ممالک میں اسٹوڈینٹ کا تعلیم حاصل کرنے وغیرہ جیسے امور کی وجہ سے یہ نظریہ مشرقی ممالک میں بھی آ گیا مغرب پرست اور مغربی کلچر کے عاشق اور دلدادہ نیز مغربی ممالک میں تعلیم یافتہ اسٹوڈینٹ وغیرہ مغربی تمدن کے شیدائی بن گئے، اور وہاں کی تعلیم اور وہاں کی زبان سے آشنائی کو اپنے اہم افتخارات میں شمار کرنے لگے، اور اس الحادی تھیوری اور نظریہ کے حصول کو اپنے لئے باعث سرفرازی سمجھنے لگے، نیز اس نظریہ کو کارگر اور بہترین تحفہ کے عنوان سے عالم اسلام میں داخل کر دیا، اور کہا کہ جس طرح مغربی ممالک میں توریت اور انجیل کے ماننے والے اپنے دین کی زبان کو غیر واقع نما زبان قرار دیتے ہیں اور اس کو صرف قصہ کہانی کی زبان مانتے ہیں جو کسی بھی طرح کے حقائق کو بیان نہیں کرتی، اسی طرح قرآن کریم کی زبان بھی قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے جس میں حقائق سے کوئی سروکار نہیں ہے۔!!

عالم اسلام میں بعض عربی ممالک جو اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم سے آشنائی نہیں رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے اس تھیوری اور نظریہ کو قبول کر لیا اور بعض عربی اہل قلم نے اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھ ڈالیں اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے شواہد یا "مستندات قرآن" کا بھی ذکر کیا اور جب انہوں نے قرآن مجید کی متشابہ آیات کو دیکھا جن کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کے حقیقی معنی کو درک نہ کر سکے، اور ان کے ظاہری معنی کو علم اور سائنس سے ہم آہنگ نہ پایا تو توریت وانجیل کے ماننے والوں کی

طرح اپنے دینی عقائد کی افسانوی تفسیر و توضیح کرنے لگے، اور قرآن مجید کی بھی افسانوی اور سمبلیک "Symbilec" (رمزی) تفسیر کرنا شروع کردی تاکہ اپنے خیال ناقص میں سائنس کے نظریات کے، دینی عقائد اور دینی مسائل سے ٹکراؤ کا راہ حل پیش کرسکیں تقریباً تیس سال سے خصوصاً ان آخری چند سالوں میں یورپ اور امریکہ میں تعلیم یافتہ لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ فعالیت اور کارکردگی کی تاکہ مغربی تمدن کے اس نظریہ کو ہمارے معاشرہ میں رواج دیں اور قرآن کی زبان کو قصہ کہانی اور افسانوی زبان کہہ ڈالا، اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے قرآن مجید کی بعض رمزی اور سمبلیک تفسیر کے چند نمونہ پیش کئے:

۵۔ ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے انحرافی نتیجہ

تیس سال پہلے انحرافی اور مارکسسٹ "Marxist" نظریہ رکھنے والے ایک صاحب نے اپنی ایک تقریر میں ہابیل و قابیل کے واقعہ سے سمبلیک "Symbilec" تفسیر کی۔

جب کہ قرآن مجید میں اصل واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

(وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ.)[1]

"اور اے پیغمبر! آپ ان کو آدم کے دونوں فرزندوں کا سچا قصہ پڑھ کر سنایئے کہ جب دونوں نے قربانی دی اور ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی نہ ہوئی تو اس نے کہا کہ میں تجھے قتل کردوں گا تو دوسرے نے جواب دیا کہ میرا کیا قصور ہے خدا صرف صاحبان تقویٰ کے اعمال قبول کرتا ہے"

اسلامی کتب میں واردہ شدہ روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جناب آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہابیل و قابیل کو خدا کی بارگاہ میں قربانی کرنا تھی چنانچہ قابیل نے ایک گوسفند کی قربانی کی، اور جناب ہابیل نے ایک مقدار گیہوں راہ خدا میں ھدیہ دیئے، جناب ہابیل کی قربانی بارگاہ رب العزت میں قبول ہوگئی لیکن قابیل کی قربانی قبول نہ ہوئی، جس کے بنا پر قابیل کو جناب ہابیل سے حسد ہونے لگا یہاں تک کہ جناب ہابیل کو قتل کردیا! لیکن اپنے کئے پر پشیمان ہوا اس کے بعد اپنے بھائی کے جنازہ کے بارے میں فکر ہوئی کہ اس کو کیا کرے تو خداوند عالم نے ایک کوے کو بھیجا جس نے قابیل کو دفن کرنے کا طریقہ سکھادیا۔

(فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِي سَوْءَةَ أَخِيهِ قَالَ يَا وَيْلَتَا أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِي فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ.)[2]

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۲۷

[2] سورہ مائدہ آیت ۳۱

" پھر خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کھود رہا تھا کہ اسے دکھلائے کہ بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے گا تو اس نے کہا کہ افسوس میں اس کوے کے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو زمین میں چھپا دیتا اور اس طرح وہ نادمین اور پشیمان لوگوں میں شامل ہو گیا۔"

کوے نے اپنی غذا کو چھپانے کے لئے زمین میں ایک گڑھا کھودا اور اپنی غذا وہاں چھپادی؛ جب خداوند عالم کے حکم سے کوے نے زمین میں اپنی غذا کو دفن کیا تو کیونکہ قابیل کو نہیں معلوم تھا کہ زمین میں مردہ کس طرح دفن کیا جاتا ہے، لیکن کوے کے کام سے اپنے مردہ بھائی کے دفن کا طریقہ سیکھ لیا۔

وہ مقرر اور مؤلف اس واقعہ کے بارے میں اپنی سمبلک تفسیر میں کہتا ہے:

اس واقعہ میں جناب ہابیل زحمت کش اور کاشتکاری کا ایک نمونہ ہے جو بہت زیادہ زحمت کے بعد بہت کم نتیجہ حاصل کرتا ہے اور چونکہ خداوند عالم اس طبقہ کا طرفدار ہے لہٰذا خداوند عالم نے اس کا ناچیز ہدیہ قبول کر لیا اور قابیل مالداری کا نمونہ ہے اور جب ایک مالدار نے گوسفند کی قربانی کی تو خدا نے اس کو قبول نہیں کیا؛ کیونکہ خداوند عالم مالداری کا دشمن ہے چنانچہ اس مقرر نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہابیل و قابیل اور گندم اور گوسفند کی قربانی کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور صرف سمبلیک "Symbilec" (رمزی) پہلو رکھتا ہے، اور یہ واقعہ مزدور اور مالدار طبقوں کے درمیان اختلاف اور جنگ و کشمکش کی حکایت کرتا ہے (لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جناب آدم وحوا اور ان کے دونوں فرزند ہابیل و قابیل کے علاوہ کوئی تھا ہی نہیں کس طرح غریب، مزدور اور مالدار طبقہ کا تصور کیا جا سکتا ہے، اور اس طرح کی طبقاتی تقسیم اس زمانہ کے لئے معنی نہیں رکھتی بہر حال مارکسسٹ "Marxist" نظریہ کے رواج اور اس الحادی نظریہ کے طرفداروں کی وجہ سے یہ سمبلیک تفسیر قابل قبول قرار پائی)

قارئین کرام! مذکورہ مقرر نے ہابیل و قابیل کے بارے میں تو یہ سمبلیک تفسیر بیان کر دی لیکن یہ نہیں بتایا کہ کوا کس چیز کا نمونہ تھا؛ یہاں تک کہ اس کے ایک شاگرد نے اس کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا کہ وہ کالا کوا مولویوں کا نمونہ تھا جو مجلس پڑھتے ہیں اور عزاداری کرتے ہیں جو منبر پر جا کر روزی کے سیاہ و سفید کے بارے میں بیان کرتے ہیں اور مالداروں اور سرمایہ داروں کی حمایت کرتے ہیں اور مزہ کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: "وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا" یعنی (اے رسول) اس واقعہ کی حقیقت لوگوں کے لئے بیان کریں، گویا خداوند عالم یہ خبر دے رہا ہے کہ ایک روز ایسا بھی آئے گا جب اس واقعہ کے سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیا جائے گا، لہٰذا آپ پہلے ہی اس واقعہ کی حقیقت کو بیان فرما دیں۔

جی ہاں، ان چند سالوں میں بعض مغربی ممالک کے کلچر سے متاثر افراد قرآن مجید سے اس طرح کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور آج کل دین اور قرآن کے بارے میں اس طرح کی باتیں اپنے زوروں پر ہے اور ان کی تبلیغ و ترویج ہو رہی ہے،

یہاں تک کہ بعض علماء بھی اس نظریہ سے متاثر ہو چکے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) قرآن کی زبان واقع نما نہیں ہے اور ایسا نہیں کہ قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ ہمیں کسی حقیقت کے بارے میں پتہ چلتا ہو، ہمارے پاس قرآنی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں قطعی، برہانی اور مسلم معیار نہیں ہیں تاکہ ان کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کریں کہ قرآن مجید کی فلاں آیت سے یہ نتیجہ ہے اور دوسری تفسیریں باطل اور نادرست ہیں بلکہ ہر شخص اپنے ذہن اور علم کی بنا پر قرآن کے بارے میں سمبلیک تفسیر بیان کرسکتا ہے، چاہے اس کی تفسیر دوسری تفاسیر سے بالکل مخالف اور متضاد ہو۔!!

۶۔ دین کی زبان واقع نما نہ ہونا یا دین کی ایک مبہم تصویر

دینی مسائل اور قرآن کریم کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کے سلسلہ میں وضاحت کے لئے عرض کرتے ہیں کہ ماڈرن ھنری میوزیم "Museum" میں بہت سی مختلف ھندسی اور مبہم چیزوں کی تصویر ہوتی ہیں جس کو دیکھ کر واضح طور پر معلوم نہیں ہو پاتا کہ یہ کس چیز کی تصویر ہے جس کی بنا پر مختلف احتمالات دیئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے ذوق کے لحاظ سے ان کی توضیح وتفسیر کرتا ہے اور ان کو کسی خاص چیز کا سمبل (اشارہ) بتایا جاتا ہے شاید ان کا مصور دوسروں کے مختلف نظریات کی طرف متوجہ بھی نہ ہو اسی طرح بعض نفسیاتی لیباریٹری "Laboratory" میں ایک کاغذ پر تھوڑی روشنائی ڈال دی جاتی ہے اور اس کو پھیلا کر بعض لوگوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ یہ کس چیز کی شکل ہے؟ تو وہ تھوڑی دیر غور وفکر کے بعد اپنے ذہن کے لحاظ سے کوئی شکل کہہ دیتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ یہ ایک عورت کے بال ہیں اور یہ اس کا ہاتھ ہے اور اپنے ذہنی خیالات کی بنا پر اس کو ایک عورت کی تصویر کہہ ڈالتے ہیں جبکہ اس کام کے کرنے والے نے کسی خاص تصویر کے لئے یہ کام نہیں کیا ہوتا اور نا ہی اس کام کو منظم طریقہ سے کیا جاتا ہے بلکہ یونہی روشنائی ڈال دی جاتی ہے کہ ہر شخص اپنے ذہن کے لحاظ سے اس کے بارے میں فیصلہ کرے۔

چنانچہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی زبان واقع نما نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید میں بیان شدہ مسائل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کو سمجھے، اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ قرآن مجید سے اپنے حاصل کردہ نظریہ کو مطلق قرار دے، اور یہ کہے کہ میری بیان کردہ ہی تفسیر قرآن ہی درست اور صحیح ہے اور دوسروں کی بیان کردہ تفسیریں غلط ہیں جس طرح ایک مبہم تصویر کو دیکھ کر کوئی یہ فیصلہ کرے کہ صرف میرا ہی نظریہ صحیح ہے اور دوسروں کا نظریہ غلط ہے: یہ کہنا اس کے لئے صحیح نہیں ہے، کیونکہ جس طرح وہ اپنے ذاتی خیالات اور تصورات کے ذریعہ کوئی خاص تفسیر کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح دوسرے بھی اپنے ذہن اور موقع محل کے لحاظ سے تفسیر کرسکتے ہیں، جن میں سے کسی ایک کو صحیح اور دوسری کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس طرح کی چیزوں میں صحیح اور غلط ہونا ثابت نہیں ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں صاحب کا حاصل کردہ نتیجہ صحیح ہے اور فلاں صاحب کا نتیجہ غلط ہے!

قارئین کرام! کیا قرآن مجید بھی (نعوذ باللہ) ایک ماڈرن میوزیم کی تصویروں کی طرح ہے کہ ہر شخص کو اس کی تفسیر

کرنے کا حق ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آسمانی کتابوں کے بارے میں اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں غالباً وہ لوگ خدا اور وحی پر عقیدہ نہیں رکھتے، اور اگر زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، تو ان کا یہ مسلمان ہونے کا دعویٰ صرف دکھاوے کے لئے ہوتا ہے اس وقت اختلاف قرائت کا نظریہ رکھنے والے کتاب مقدس کی تفسیر کے بارے میں کہتے ہیں: بالفرض اگر خدا بھی ہو، وحی بھی نازل ہوئی ہو اور انبیاء نے وحی کو صحیح سمجھا ہو (اگرچہ ان باتوں میں بھی شک ہے)، تو چونکہ انبیاء بھی انسان ہیں اور انسانی درک وفہم رکھتے ہیں اور انسانی درک وفہم؛ غلطی سے خالی نہیں ہے، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ نبی نے خدا کی باتوں کو صحیح نہ سمجھا ہو اور اگر یہ بھی مان لیں کہ پیغمبر نے وحی کو حاصل کرنے میں غلطی نہیں کی ہے، تو بھی قرآن مجید کی یقینی تفسیر بیان کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے، تا کہ اسی معیار کی بنا پر کسی ایک تفسیر کو یقینی قرار دیں اور دوسری تفاسیر کو غلط سمجھیں لہٰذا قرآن مجید سے کوئی بھی شخص اپنے لحاظ سے نتیجہ نکال سکتا ہے اور اپنے نظریہ اور نتیجہ کو صحیح و معتبر قرار دے سکتا ہے اور کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے حاصل کردہ نظریہ کو رد کرے ہم کتاب مقدس کی تفسیر کے بارے میں بالکل انہیں افراد کی طرح ہیں جن کے سامنے نفسیاتی لیباریٹری "Laboratory" میں ایک مبہم تصویر پیش کی جاتی ہے جس کے بارے میں ہر شخص کو اپنا اپنا نظریہ دینا پڑتا ہے مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ یہ شکل تو میری معشوقہ کے بالوں کی طرح ہے اور کوئی کہتا ہے کہ یہ رستم کی شکل ہے، اور اس سلسلہ میں ہر ایک شخص کی نظر محترم ہے اور کسی دوسرے کو اعتراض کا حق نہیں ہے، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مبہم تصویر کو سمجھنے میں سب نے غلطی کی ہو اور کسی نے بھی صحیح نہ بتایا ہو بلکہ اس طرح سے کاغذ پر روشنائی ڈالنے والے کا ہدف بھی صرف یہی ہو کہ ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کے بارے میں اپنا تصور بیان کرے!

۷۔ قرآن مجید کا شعراء کی زبان سے مقابلہ کرنا؛ بہت سے نتائج ہونے پر دلیل ہے!!

دین کی زبان کے سلسلہ میں معرفت کو نسبی قرار دینے والوں کے نظریہ کو بیان کرنے کے لئے ایک دوسری مثال یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے: جیسا کہ عرفانی اور عشقی اشعار سے مختلف نتائج نکالے جاسکتے ہیں خصوصاً حافظ کی غزلیات، جیسا کہ اکثر ایرانیوں کے گھر میں "دیوان حافظ" ہوتا ہے اور ایک قدیم زمانہ سے دیوان حافظ سے فال بھی نکالی جاتی ہے مثلاً جب کسی شخص کا رشتہ دار سفر میں ہوتا ہے اور وہ اس کے بارے میں باخبر ہونا چاہتا ہے تو وہ دیوان حافظ کے ذریعہ فال نکالتا ہے اور سامنے نکلنے والے صفحہ پر موجود غزل کو پڑھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا رشتہ دار خیریت سے ہے اور جلد ہی پلٹنے والا ہے اور اگر کوئی شخص مریض ہو اور دیوان حافظ سے فال نکالتا ہے تو وہ بھی اسی غزل سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جلد ہی اس کو بیماری سے شفا ملنے والی ہے؛ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسی غزل سے ایک شخص پریشان کن نتیجہ نکالے جبکہ حافظ کی عارفانہ اور عاشقانہ غزلیں اس طرح فال نکالنے کے لئے نہیں ہیں، اور حافظ کا ان غزلیات سے بالکل یہ مقصد نہیں ہے کہ فلاں مریض شفایاب ہوجائے گا یا فلاں مسافر سفر سے جلد لوٹ آئے گا، یا فلاں شخص کی یہ آرزو پوری ہوجائے گی یا فلاں صاحب کی یہ حاجت پوری نہیں ہوگی کیونکہ حافظ نے عرفانی اور شاعری ماحول میں شعر کہیں ہیں جبکہ فال نکالنے والا اپنے ذہن کے لحاظ سے مختلف نتیجے نکال رہا ہے جب کہ

شاعر اور دوسروں کے نتیجہ سے میلوں فاصلہ موجود ہے مولانا (شاعر) نے کیا خوب کہا:

ہر کس از ظن خود شد یار من

از درون من نجست اسرار من

اپنے خیال میں ہر شخص ہمارا دوست بن گیا ہے لیکن کسی نے ہمارے اندر کے اسرار کا پتہ نہ لگایا۔

کہتے ہیں کہ قرآن کریم بھی حافظ کی غزلوں کی طرح ہے جس سے ہر شخص مختلف نتیجہ نکال سکتا ہے بلکہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف بھی، اور ہر کوئی شخص اپنے ذہن اور سابقہ علم کی بنا پر قرآن کریم کی آیات سے نتیجہ نکال سکتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے حاصل کردہ نتیجہ اور قرائت کو مطلق قرار دے۔

یہاں پر پہنچنے کے بعد یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے یا کم سے کم یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ اس نعرہ (کہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دین سے حاصل کردہ اپنے نظریہ کو مطلق قرار دے)؛ کی اصلی بنیاد بھی دین کی زبان کا مسئلہ ہے کیونکہ اس نظریہ کی بنا پر دین کی زبان قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے، اور یہ زبان سمبلیک "Symbliec" (رمزی) اور غیر واقع نما ہے، لہٰذا ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذھنیت کے لحاظ سے دینی مسائل کے معنی و تفسیر کرے، نیز کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی قرائت اور تفسیر کو صحیح قرار دے اور دوسروں کے حاصل کردہ نتائج کو باطل و بے بنیاد!

تو کیا واقعاً اس بے بنیاد اور الحادی نظریہ کی نشر و اشاعت کے بعد جس میں قرآن کریم کو دیوان حافظ کی طرح قرار دیا جاتا ہے اور جس سے ہر کس و نا کس اپنے ذہن کے لحاظ سے معنی و تفسیر کرنے کا حق رکھتا ہے تو کیا اس صورت میں یہ قرآن کریم؛ کتاب ہدایت باقی رہے گی؟! اور کیا قرآن کریم سے اس طرح کے پیش کردہ نتائج کے بعد وہی کتاب باقی رہے گی جس کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنی جان خطرات میں ڈالی اور اس راہ میں کس قدر شہید فدا ہو گئے؟ اگر ہر کس و نا کس قرآن مجید کی تفسیر کر سکتا ہو اور اپنے حاصل کردہ نتیجہ کو حجت قرار دے سکتا ہو تو پھر آیات قرآن کی صحیح تفسیر پر قرآن مجید کیوں زور دیتا ہے اور تفسیر بالرائے کرنے سے کیوں ڈراتا ہے، نیز دین میں بدعت گذاری کی کس قدر مذمت کی گئی ہے؟

اگر قرآن مجید کی تفسیر من پسند ہونے لگے اور دو بول پڑھنے والا ہر شخص قرآن مجید سے نتیجہ حاصل کرنے لگے، تو پھر ہمارے انقلاب کا کیا فائدہ؟ کیوں ہم نے شاہ کی حکومت کو سرنگون کیا؟ کیونکہ شاہ بھی اپنے کاموں اور اپنی سمجھ کو قرآن اور دین کے مطابق سمجھتا تھا، یہاں تک کہ وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ملاؤں کی بیان کردہ باتوں سے زیادہ مناسب ہے!! اور یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں ملاؤں سے زیادہ قرآن کو سمجھتا ہوں، میرے خلاف بے وجہ تقریریں کی جاتی ہیں بلا وجہ عوام الناس کو میرے خلاف ورغلایا جاتا ہے!! دین کے سلسلہ میں شاہ کی بھی ایک قرائت تھی کیوں اس کی قرائت کو باطل قرار دیا گیا!

اگر کوئی شخص اسی نظریہ کی بنا پر یہ دعویٰ کرے کہ دین سے حاصل کردہ میرا نتیجہ یہ ہے کہ خداوند عالم وجود عینی اور

واقعی نہیں رکھتا اور مسلمان ہونا خدا کو ماننے میں منحصر نہیں ہے، تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے؛ چونکہ اس نے اپنے درک وفہم کو بیان کیا ہے اور دین سے اس طرح کا نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حافظ کے اشعار میں بھی مختلف معنی اور تفسیر کرنے کی گنجائش پائی جاتی ہے مثلاً حافظ کہتے ہیں:

اگر لشکر میں طلاطم پیدا ہو جائے تو عاشقوں کا خون بھی بہا دیا جاتا ہے، ہم اور
ساقی آپس میں پیار و محبت سے رہیں تو پھر اس کی بنیاد کو گرا سکتے ہیں۔

چنانچہ اس شعر کو پڑھ کر ہر شخص اپنی ذھنیت کے لحاظ سے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس کی بیماری کو شفا ہو جائے گی، یا اس کی حاجت پوری ہو جائے گی، اور اپنے حاصل شدہ نتیجہ کے لئے مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ "مے اور ساقی" سے مراد؛ مریض اور ڈاکٹر ہے، اور "بنیادش بر اندازیم" سے مراد یہ ہے کہ یعنی مرض کو جڑ سے ختم کر دیا جائے گا لیکن کوئی دوسرا شخص اسی دیوان حافظ سے فال نکالے اور یہی شعر نکلے تو وہ اس سے بالکل مخالف نتیجہ نکال سکتا ہے۔

اگر قرآن مجید میں ایسے نتائج کی گنجائش پائی جاتی ہو کہ مثلاً خدا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، اور خداوند عالم کے اثبات کرنے کے لئے کوئی دلیل بھی نہ ہو، تو پھر اسلام میں کیا باقی بچے گا؟ اگر ہر کس و ناکس قرآن مجید سے مستقل طور پر ایک نتیجہ نکالنے کا حقدار ہو اور تمام لوگوں کے حاصل کئے ہوئے نتائج کا احترام کیا جائے تو پھر دین اسلام سے دفاع، اور دین کے سلسلہ میں غیرت مندی کا مظاہرہ اور اسلامی اقدار کے مقابلہ میں حساسیت دکھانا؛ بے معنی اور بے ہودہ ہوگا سب کو ٹولرانس "Toleranec" کی رعایت کرتے ہوئے دوسروں کی باتوں کو برداشت کرنا چاہئے اور دوسروں کے نظریات پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے ہر شخص اپنے لحاظ سے دینی مسائل پر عمل کرے، اور اگر اس کا یہ نظریہ ہے کہ واقعاً خداوند عالم واحد اور یکتا ہے تو اس کو اپنے وظیفہ کے مطابق عمل کرنا چاہئے، لیکن اگر کسی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہزاروں خدا موجود ہیں تو اس کا وظیفہ اسی لحاظ سے ہوگا؛ اور جب ہر شخص کی اپنی سمجھ حجت ہے تو کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے اور سب پیار و محبت کے ساتھ بہترین زندگی بسر کریں، اور کوئی بھی ایک دوسرے کے نظریات کے مقابلہ منفی اعتراض نہ کرے۔

بہر حال، یہ نظریہ جس میں دین کی زبان کو سمبلیک "Symbilec" زبان قرار دیا گیا ہے، جس میں ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے ذہن کے لحاظ سے دینی راز اور مخفی باتوں کے من پسند معنی کرے، اسی بنیاد پر کہنے والے کہتے ہیں کہ دینی معرفت اور شناخت نسبی اور سیال (رواں دواں) ہے اور کسی کو اپنے نظریہ کو مطلق قرار دینے کا حق نہیں ہے بے شک اس طرح کا فاسد نظریہ دین اور قرآن کی نظر میں باطل اور بے بنیاد ہے اور اس طرح کا نظریہ دین سے کسی بھی ہم آہنگ نہیں ہے ہم عقلی دلائل سے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ خداوند عالم کی حکمت اور اس کا لطف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایک

مقصد اور ایک راہ حق و مطلق کی طرف ہدایت کرے، جس کے لئے خداوند عالم نے قرآن مجید نازل کیا جس میں ہر انسان کے لئے حجت اور موعظہ ہے اور جو نوع بشریت کی روحی و نفسیاتی بیماریوں کا علاج کرتا ہے جب کہ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کے مکتب سے تعلیم حاصل کرنے والوں کے نزدیک قرآن مجید کی ایک ہی قرائت اور تفسیر ہے اور وہ بھی پیغمبر اور اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر ہے اور صرف انہیں حضرات کی رائے اور نظریہ صحیح اور برحق ہے جو معرفت کے آب زلال کا سرچشمہ ہیں، دین کی یہ قرائت دوسری مختلف قرائتوں سے سازگار نہیں ہے، اور ان کو باطل قرار دیتی ہے اگر چہ عالم اسلام میں "مارٹن" اور "لوتھر" پیدا ہو جائیں اور ایک نیا دین ایجاد کرلیں جس کی بنا پر مختلف اور مخالف قرائتیں پیدا ہونے لگیں اور معرفت کے نسبی قرار دینے کی وجہ سے تمام قرائتوں کو صحیح قرار دیا جانے لگے، لیکن ائمہ علیہم السلام سے نقل شدہ بے شمار روایات کے ذریعہ قرآن مجید کی صحیح قرائت ہم تک پہنچی ہے اور لوگوں کو تفسیر بالرائے سے سخت منع کیا گیا ہے۔

اولیاء اللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عوام الناس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے طرف سے دین میں کچھ چیزوں کو شامل کردیں اور اگر کسی مقام پر غیر واضح متشابہ بیان ہو، تو اس موقع پر توقف کیا جائے اور اہل بیت علیہم السلام کی موجیں مارتے ہوئے دریائے معرفت سے اس کی تفسیر حاصل کریں، اور خدا اور اسلام کی طرف اسی چیز کی نسبت دیں جو خود خداوند عالم، قرآنی آیات اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وائمہ معصومین علیہم السلام کے فرمان میں موجود ہو۔

۸۔ ہرمنوٹک فلسفہ میں قرائت کی کثرت اور معرفت کا سیلاب

تعدد قرائت اور اپنی نظریہ کو مطلق قرار نہ دینے کے نعرہ کی ایک دلیل: علم ہرمنوٹیک "Hermeneutics" (تحریر کے معنی اور تفسیر کرنا) ہے؛ یہ علم آج کل معرفت اور شناخت کے بارے میں ایک عظیم شعبہ ہے جس کی تحقیق کے سلسلہ میں دنیا بھر میں بہت سے افراد مشغول ہیں اس علم کی پیدائش بھی مغربی ممالک میں ہوئی ہے، پہلے یہ ہرمنوٹیک "Hermeneutics" عیسائیت کے علم کلام اور حکمت (فلسفہ) کے کام میں آتا تھا جس کا موضوع کتاب مقدس (عہد عتیق اور عہد جدید) کی حقائق کی معنی و تفسیر کرنا تھا لیکن اس کے بعد اس میں وسعت دیدی گئی اور اس کو انسانی کردار، رفتار و گفتار و آثار کی اہمیت کے معنی و تفسیر کے سلسلہ میں ایک فن اور مہارت سمجھا جانے لگا اور اس آخری معنی کی وجہ سے علم ہرمنوٹیک کو خدا شناسی (الٰہیات) سے نکال کر فلسفہ سے مخصوص کر دیا گیا، اور یہ انسانی علوم کے مطالعات یا علوم انسانی کے لئے خاص روشوں میں استعمال ہونے لگا۔

اس علم میں بیان ہونے والی تھیوری اور نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے استعمال کردہ الفاظ دوسروں تک مافی الضمیر منتقل کرنے سے قاصر ہیں، ہمارے یہ الفاظ کسی بھی صورت میں اس معنی اور حقائق کی طرف منتقل نہیں کرتے جن کو مؤلف نے بیان کئے ہیں پس جس وقت کوئی شخص دوسروں سے گفتگو کرتے وقت الفاظ کا استعمال کرتا ہے تو سننے والا؛ کہنے والے کے اصلی مقصد تک نہیں پہنچ سکتا مثال کے طور پر ہر انسان کی باطنی احساسات ہوتے ہیں جیسے محبت، عشق، غصہ،

نفرت اور تعجب تو اگر کوئی شخص کوئی تعجب آور چیز دیکھتا ہے اگر وہ اپنے تعجب کے احساس کو دوسرے سے بیان کرنا چاہے، تو سننے والا صرف یہ بات سمجھتا ہے کہ اس کو تعجب ہوا ہے، لیکن کسی بھی صورت میں استعمال ہونے والے الفاظ کے اندر حقیقت تعجب کا پتہ نہیں چلتا، درحقیقت الفاظ کے ذریعہ صرف ایک احساس کی خبر دی جاتی ہے لیکن اس احساس کی ماہیت اور کیفیت منتقل نہیں ہوتی مثال کے طور پر اگر آپ کسی سے کہیں کہ میں فلاں چیز کا عاشق ہو، تو آپ کا مخاطب آپ کے اندر احساس کو نہیں سمجھ سکتا وہ آپ کے بعض حالات سے ایک طرح کا اندازہ لگا سکتا ہے لیکن تفصیلی طور پر اس کی شناخت اور اندرونی احساس کو نہیں سمجھ پاتا۔

۹۔ الفاظ کے ذریعہ مختلف حقائق کو سمجھا جاسکتا ہے

جیسا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کے دعووں میں ایک دعویٰ یہ ہے کہ کسی مؤلف یا مقرر کے الفاظ مقصد کو بیان کرنے اور مافی الضمیر کو منتقل کرنے سے قاصر ہیں، اور الفاظ کا مافی الضمیر کے منتقل کرنے میں ناکافی ہونا ھرمنوٹیک کی بحث کا ایک حصہ ہے نیز دینی تحریروں میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے گذشتہ اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم گذشتہ چند ہزار سال پہلے کی مختلف اقوام و مذاہب کا تاریخی مطالعہ کریں اور ہر دین و مذہب اور مسلک کے ماننے والوں کی ادبیات پر سرسری نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تمام ہی اقوام اور مذاہب کی رونق بخش تعلیمات "عشق" کی بنیاد پر ہے اور اس نکتہ سے پتہ یہ چلتا ہے کہ عشق ایک ایسی حالت ہے جس کا احساس تمام انسانوں کے یہاں پایا جاتا ہے، جو سب کے لئے قابل فہم ہے اب اگر کوئی جاپانی، چینی، ایرانی یا عرب باشندہ اپنے عشق کے بارے میں خبر دے تو پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ ہم اس کے احساس کو درک نہیں کر سکتے؟ کیونکر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ لیلا مجنون یا شیرین اور فرہاد کی داستان عشق ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہے اور ہم ان داستانوں میں عشق کو صحیح طریقہ سے سمجھ نہیں سکتے؛ اور یہ بہانہ کریں کہ الفاظ کے ذریعہ احساسات منتقل نہیں ہوتے ہیں، اگر عشق جیسی حالت اور احساس تمام کہنے والوں یا سننے والوں کے لئے قابل فہم نہ ہو تو پھر ہر قوم و ملت میں عشق کے سلسلے میں اس قدر نظم و نثر کیوں موجود ہے، اور عشق کے بارے میں اس زبان کی ادبیات کیوں بھری ہوئی ہے؟

ہم بھی اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ انسان اپنی اندرونی احساسات کو کما حقہ (ہو بہو) دوسروں کی طرف منتقل نہیں کرسکتا، لیکن قرائن و شواہد اور دوسری چیز کو دیکھ کر دوسروں کے احساسات کو سمجھا جاسکتا ہے (مثلاً) ہم اپنے اندر موجود احساس خوف کو دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے جس سے ہمارے احساس کو سمجھ سکے؛ لیکن چونکہ خوف اور ڈر کا احساس ایک ایسی چیز ہے جو تقریباً کم و بیش سبھی کے اندر پایا جاتا ہے، لہٰذا دوسرے افراد بھی ہمارے اندر موجود خوف کا احساس کر سکتے ہیں لیکن اگر کسی کے یہاں ہماری طرح کا احساس نہ پایا جاتا ہو تو وہ قرائن اور شواہد کے ذریعہ بھی ہمارے احساس کا پتہ نہیں چلا سکتا مثال کے طور پر اگر کسی کے اندر عشق و محبت کا احساس نہ پایا جاتا ہو، تو پھر وہ عشقی داستان سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، لیکن یہ

بات بھی ماننا پڑے گی کہ ایسے شخص کو انسان بھی مشکل سے کہا جائے گا کیونکہ ہر شخص میں تھوڑا بہت محبت کا احساس پایا جانا ضروری ہے، اب اگر کوئی شخص اپنے اس اندرونی احساس کے بارے میں خبر دے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس حالت میں شدت اور زیادتی کا امکان پایا جاتا ہے، تو اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب یہ حالت اپنی سرحد کمال اور بہت زیادہ شدت تک پہنچتی ہے تو اسی کو "عشق" کہا جاتا ہے پس ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے اندرونی احساسات کو دوسروں تک منتقل نہیں کر سکتے، جس کے نتیجہ میں ہمارے استعمال کردہ الفاظ اپنی دلی حالت کی ترجمانی کرنے کے ناکافی اور قاصر ہوں۔

۱۰۔ قرآن کریم سے مطلق اور واقعی معرفت کا حاصل کرنا ممکن ہے

جی ہاں، ہم بھی یہ بات مانتے ہیں کہ عام طریقوں اور معمولی شناخت کے ذریعہ کُنہ حقائق (جوہر حقائق) اور ماورای طبیعت مثلاً فرشتہ کے ماہیت اور حقیقت کے بارے میں آگاہی حاصل نہیں کی جاسکتی، اور ان کے بارے میں مکمل طور پر شناخت حاصل نہیں ہوسکتی، ان کے بارے میں ہونے والی گفتگو متشابہ اور ذو معنی ہیں، اسی وجہ سے بعض آیات قرآن میں اس طرح کی موجودات کے بارے میں بیان شدہ مطالب متشابہ ہیں ان حقائق کی پہچان کے لئے مخصوص راستے موجود ہیں جو عام انسان کو معلوم نہیں ہیں اور صرف وہی حضرات ان طریقوں کو جانتے ہیں جنھوں نے مدتوں تہذیب نفس اور اخلاقی و عرفانی سیر و سلوک کا راستہ طے کیا ہے، جس کی بنا پر ان بعض موجودات کو درک کیا ہے لیکن قرآن مجید کی بعض باتوں کو نہ سمجھنا دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ کہہ دیں کہ جو کچھ بھی قرآن مجید میں بیان ہوا ہے وہ سب اسی طرح ہے، ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے، اور ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہے، نیز الفاظ کے ذریعہ ہمیں حقائق کا پتہ نہیں چلتا، اور ہر انسان اپنے ذہن کے لحاظ سے ان الفاظ کے معنی و تفسیر کرسکتا ہے اگر چہ یہی ماوراء طبیعت حقائق (جیسے ملک و فرشتہ): کے بارے میں مکمل معرفت حاصل نہیں ہوسکتی، اور ایک عام انسان ان کی شناخت اور اور حقیقت سے باخبر نہیں ہوسکتا، لیکن ان کے بارے میں جن صفات اور خصوصیات کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے ہم ان کے ذریعہ کافی حد تک ان کی معرفت حاصل کرسکتے ہیں۔

دین اور قرآن کی زبان کو افسانوی زبان قرار دینے والوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتابوں میں استعارات، کنایات، تشبیہات اور تمثیلات ذکر ہوئی ہے، منجملہ یہ مثال قرآن مجید میں ذکر ہوئی ہے:

(وَلاَتَکُونُوا کَالَّتِی نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْکَاثًا.[1]

"اور خبردار! اس عورت کے مانند نہ ہو جاؤ جس نے اپنے دھاگہ کو مضبوط کاتنے کے بعد بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا"

اگر چہ قرآن مجید میں یہ مثال بیان ہوئی ہے اور شاید اس طرح کی کوئی بُڑھیا کا وجود ہی نہ ہو۔

اسی طرح گدھے کے بارے میں ایک مثال قرآن مجید میں یہ ذکر ہوئی ہے:

---

[1] سورہ نحل آیت ۹۲

بھی آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ ظاہر آیات اور کلمات والفاظ حجیت نہیں ہیں، اور ہم پر حقائق کو آشکار نہیں ہوتے۔

قارئین کرام! آیات کے ظاہری اعتبار کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی مزید دقیق اور گہرے مطالب موجود ہیں جن کو بطون اور تاویل آیات کہا جاتا ہے، اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اصلاً قرآنی ظواہر معتبر نہیں ہیں، اور صرف ان سے حاصل کردہ ہمارا نتیجہ معتبر ہے اور وہ بھی وہ تاویلات جو تاویل کرنے والے کے ذہن کے مطابق اور اس کے ذہن کی پیداوار ہوں اس طرح دینی سلسلہ میں مختلف اور متضاد قرائت پیش کی ہو رہی ہیں اور ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان سب کو قابل احترام مانیں!!

۱۲۔ تحریف دین کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اظہار افسوس

قارئین کرام! ہم اپنی گفتگو کے آخر میں لازم اور ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے ان نورانی کلمات کی طرف اشارہ کریں جس میں آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے دینی انحرافات اور شبہات کو بیان کیا ہے اور جن کی بنا پر افسوس ناک اور برے نتائج برآمد ہوئے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ۲۵/ سال کے بعد قائم ہوئی ہے، اس وقت تک وہ اصحاب رسول موجود تھے جنھوں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے آیات قرآن کی تفسیر اور شان نزول کو سنا تھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آیات کے موقع کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؛ کیونکہ اس وقت قرآن کے نزول کو زیادہ وقت نہیں گذرا تھا لیکن وہ منافقین اور دشمنان اسلام موجود تھے جو اہل بیت علیہم السلام کے بے انتہا دریائے معرفت سے بے بہرہ تھے، اور جاہ وحشم کے دلدادہ اور ہوا پرست دین میں شبہات اور تحریفات ایجاد کر رہے تھے جس کی وجہ سے اسلام میں انحرافات پیدا ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے درمیان برادر کشی ہونے لگی چنانچہ اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَلٰكِنَّا إِنَّمَا أَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ إِخْوَانَنَا فِي الْإِسْلَامِ عَلَىٰ مَا دَخَلَ فِيهِ مِنَ الزَّيْغِ وَالْإِعْوِجَاجِ وَالشُّبْهَةِ وَالتَّأْوِيلِ۔"[1]

مگر اب ہم کو ان لوگوں سے جو اسلام کی رُو سے ہمارے بھائی کہلاتے ہیں ان سے جنگ کرنا پڑ گئی ہے، چونکہ (ان کی وجہ سے) اس میں گمراہی، کجی، شبہات اور غلط سلط تاویلات داخل ہوگئے ہیں۔

یہی وہ شبہات اور اعتراضات ہیں جو عصر حاضر میں علمی طریقہ سے بیان کئے جاتے ہیں اور منظم طور پر بیان ہوتے ہیں، حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ میں انہیں اعتراضات کی وجہ سے مسلمانوں میں مقابلہ بازی شروع ہوگئی، اور اسی طرح کے شبہات اور اعتراضات کو قبول کرتے ہوئے جنگ جمل اور جنگ نہروان میں حقیقی مفسر قرآن حضرت علی علیہ السلام کے مقابلہ میں آگئے جس کی بنا پر بہت سے لوگ قتل کردیئے گئے۔

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۲

بات بھی ماننا پڑے گی کہ ایسے شخص کو انسان بھی مشکل سے کہا جائے گا کیونکہ ہر شخص میں تھوڑا بہت محبت کا احساس پایا جانا ضروری ہے، اب اگر کوئی شخص اپنے اس اندرونی احساس کے بارے میں خبر دے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس حالت میں شدت اور زیادتی کا امکان پایا جاتا ہے، تو اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب یہ حالت اپنی سرحد کمال اور بہت زیادہ شدت تک پہنچتی ہے تو اسی کو "عشق" کہا جاتا ہے پس ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے اندرونی احساسات کو دوسروں تک منتقل نہیں کر سکتے، جس کے نتیجہ میں ہمارے استعمال کردہ الفاظ اپنی دلی حالت کی ترجمانی کرنے کے ناکافی اور قاصر ہوں۔

۱۰۔ قرآن کریم سے مطلق اور واقعی معرفت کا حاصل کرنا ممکن ہے

جی ہاں، ہم بھی یہ بات مانتے ہیں کہ عام طریقوں اور معمولی شناخت کے ذریعہ کُنہ حقائق (جوہر حقائق) اور ماورائی طبیعت مثلاً فرشتہ کے ماہیت اور حقیقت کے بارے میں آگاہی حاصل نہیں کی جاسکتی، اور ان کے بارے میں مکمل طور پر شناخت حاصل نہیں ہوسکتی، ان کے بارے میں ہونے والی گفتگو متشابہ اور ذومعنی ہیں، اسی وجہ سے بعض آیات قرآن میں اس طرح کی موجودات کے بارے میں بیان شدہ مطالب متشابہ ہیں ان حقائق کی پہچان کے لئے مخصوص راستے موجود ہیں جو عام انسان کو معلوم نہیں ہیں اور صرف وہی حضرات ان طریقوں کو جانتے ہیں جنھوں نے مدتوں تہذیب نفس اور اخلاقی وعرفانی سیر وسلوک کا راستہ طے کیا ہے، جس کی بنا پر ان بعض موجودات کو درک کیا ہے لیکن قرآن مجید کی بعض باتوں کو نہ سمجھنا دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ کہہ دیں کہ جو کچھ بھی قرآن مجید میں بیان ہوا ہے وہ سب اسی طرح ہے، ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے، اور ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہے، نیز الفاظ کے ذریعہ ہمیں حقائق کا پتہ نہیں چلتا، اور ہر انسان اپنے ذہن کے لحاظ سے ان الفاظ کے معنی وتفسیر کرسکتا ہے اگر چہ ہم بھی ماوراء طبیعت حقائق (جیسے ملک وفرشتہ)؛ کے بارے میں مکمل معرفت حاصل نہیں ہوسکتی، اور ایک عام انسان ان کی شناخت اور اور حقیقت سے باخبر نہیں ہوسکتا، لیکن ان کے بارے میں جن صفات اور خصوصیات کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے ہم ان کے ذریعہ کافی حد تک ان کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

دین اور قرآن کی زبان کو افسانوی زبان قرار دینے والوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتابوں میں استعارات، کنایات، تشبیہات اور تمثیلات ذکر ہوئی ہے، منجملہ یہ مثال قرآن مجید میں ذکر ہوئی ہے:

(وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا.[1]

"اور خبردار! اس عورت کے مانند نہ ہو جاؤ جس نے اپنے دھاگہ کو مضبوط کاتنے کے بعد بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا"

اگر چہ قرآن مجید میں یہ مثال بیان ہوئی ہے اور شاید اس طرح کی کوئی بڑھیا کا وجود ہی نہ ہو۔

اسی طرح گدھے کے بارے میں ایک مثال قرآن مجید میں یہ ذکر ہوئی ہے:

[1] سورہ نحل آیت ۹۲

(مَثَلُ الَّذِینَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوهَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ أَسْفَارًا.)[1]

"ان لوگوں کی مثال جن پر توریت کا بار رکھا گیا اور وہ اسے اٹھا نہ سکے اس گدھے کی مثال ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو"

کہنے والے کہتے ہیں کہ جب اس طرح کی افسانوی مثالیں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں تو پھر قرآن مجید میں بیان شدہ دوسری باتیں منجملہ خدا، قیامت، وحی اور جنت ودوزخ کس طرح افسانوی نہ ہوں گی!

قارئین کرام! اس طرح بے بنیاد اور بے ہودہ نیز الحادی باتیں مقالات کی صورت میں پورے ملک کی یونیورسٹیوں کے اسٹوڈینٹس تک پہنچائی جارہی ہیں، تاکہ ان کو یہ بات تلقین کی جائے کہ پورے کا پورا قرآن افسانہ اور کہانی ہے یہاں تک یہ گستاخی اس قدر بڑھتی جارہی ہے کہ ایک اسٹوڈینٹ نے اپنے مقالہ میں قرآن مجید میں بیان شدہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے رومانٹیک "Romantique" نتیجہ حاصل کیا اور ایک خیالی داستان کے عنوان سے لکھا، اور اس کے بعد اس پر ادبی تنقید کی اور اس پر بہت سے اعتراض واشکال کئے، اور جب حضرت یوسف کی اس رومانٹیک داستان کو استاد کی موجودگی میں سب کے سامنے پڑھا، تو اس داستان کو سننے کے بعد استاد نے بھی بہت سے اعتراضات کئے، جس کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا کہ داستان یوسف کا لکھنے والا کوئی ماہر ادیب نہیں تھا جس کی بنا پر یہ داستان صحیح طریقہ پر نہیں لکھی گئی ہے!!

۱۱۔ قرآن کی زبان کو واقع نمانہ ہونے پر نسبی نظریہ رکھنے والوں کی بے بنیاد دلیل

افسوس کہ جرائد کی "آزادیٔ بیان" کے زیر سایہ اور یونیورسٹیوں و دیگر مراکز میں آزاد سیاسی ماحول، اسی طرح ہمارے ملک کے سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی نظام کی کمزوری، نیز انقلاب کے بعد سے تعلیم وتربیت کے عہدہ داروں کی بے توجہی خصوصاً یونیورسٹی کا موجودہ ماحول میں؛ اسلامی اقدار کے خلاف وسیع پیانہ پر زہریلی تبلیغات اور پروپیگنڈے ہورہے ہیں، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ عصر حاضر میں بعض یونیورسٹی طلباء کا سوال یہ ہے کہ جب قرآن مجید میں داستان، افسانہ اور استعارات وکنایات بیان ہوئے ہیں اور ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں اور ان کی جگہ مجازی معنی مراد لئے جاتے ہیں، تو پھر قرآن مجید کے دوسرے مطالب بھی اسی طرح کے ہونے چاہئیں؟ شاید خدا، وحی اور قیامت جیسے الفاظ سے بھی مجازی اور غیر حقیقی معنی مراد ہوں؟

جی ہاں، یہ سب معرفت کے نسبی ہونے، زبان دین کے سمبلک ہونے اور ہرمنوٹیک "Hermeneutics" کے ذریعہ دینی تحریر کے معنی وتفسیر کرنے کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ ہمارے عظیم الشان اعتقادت اور اصول کو نقصان پہنچایا جارہا ہے جو ہمیشہ ہماری ثقافت اور معاشرہ کے لئے باعث عزت ہے اور ہمارے گذشتہ اور حال کے افتخارات انہیں اسلامی اعتقادات کی وجہ سے ہیں اور تمام انبیاء اور اولیاء اللہ کی امانت کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

---

[1] سورۂ جمعہ آیت ۵

یہ نسبیت گرائی اور شکاکیت کا نتیجہ ہے کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے نظریہ کو مطلق قرار دے، اور دین سے حاصل شدہ مختلف نتائج کو قابل احترام سمجھا جائے کیونکہ قرآن کی زبان واقع نما اور حقیقی نہیں ہے بلکہ سمبلک ہے، ہر شخص قرآنی آیات سے مستقل طور پر نتیجہ نکال سکتا ہے ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید میں مثالوں، استعاروں اور داستانوں کو بہانہ بنا کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کریم اصولی طور پر حقائق اور واقعیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف داستانوں، افسانوں اور کنایات و استعارات کی گفتگو کو بیان کرنا چاہتا ہے ہم یہاں پر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر کسی کتاب یا مقالہ یا نظم میں کوئی مثال ذکر ہوئی ہو تو کیا اس کو شعر اور مثل کی کتاب کا نام دیا جائے گا؟ اگر کوئی مقرر اپنی تقریر کے دوران کوئی لطیفہ یا کوئی طنز بیان کرے تو کیا اس کی تمام باتوں کو مسخرہ اور طنز آمیز کہا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص کسی موقع پر اپنی گفتگو میں مثال، شعر، استعارہ، تشبیہ، کنایہ اور مجاز جیسی چیزوں کا استعمال کرتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ اس کی تمام گفتگو شعر اور افسانہ ہے جس میں کچھ استعارات، کنایات، تشبیہات اور مثالیں بیان ہوئی ہیں اس صورت میں پھر کسی بھی قلمکار کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں مثال، شعر یا طنز کا استعمال کرے، ورنہ تو اس کی کتاب شعر اور طنز کی کتاب کہلائے گی اگر خداوند عالم نے قرآن مجید میں مثل ذکر کی ہے تو کیا خداوند عالم کے اس قول "وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ" [1] کو ایک افسانہ اور مثل قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا خداوند عالم کے اس فرمان "وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ" [2] کو شعر اور افسانہ قرار دیں سکتے ہیں؟!۔

یہ لوگ ہرمنوٹیک "Hermeneutics" نظریہ اور عبارت و تحریر کی تفسیر کے اعتبار پر ایک دلیل یہ ذکر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں ہمیشہ تفسیر اور تاویلات ہوتی رہی ہیں اور علماء و عرفاء نے تاویل اور تفسیر کے بارے میں بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں؛ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی مختلف تفاسیر اور مختلف تاویلات ہو سکتی ہیں جس طرح عرفاء اور علماء نے قرآن مجید کی تاویلات اور تفاسیر ذکر کی ہیں اسی طرح ہمیں بھی قرآن مجید کی جدید تفسیر کرنے کا حق حاصل ہے، اگرچہ ہماری بیان کردہ تفسیر علماء کی تفسیر سے بالکل مخالف ہو جیسا کہ بعض روایات میں قرآن مجید کی تفسیر؛ قرآن کے ظاہری الفاظ سے بالکل مختلف ہے، لہٰذا قرآن مجید میں مختلف تفاسیر کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید کی مختلف تفاسیر اور تاویلات کی جا سکتی ہیں؛ لہٰذا ہم بھی یہ کام کر سکتے ہیں اور چونکہ ان کے درمیان فرق نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کون سے تفسیر صحیح ہے اور کون سی غلط؛ لہٰذا ان سب کو معتبر ماننا چاہئے!

قارئین کرام! یہ بات صحیح ہے کہ قرآن مجید میں متشابہ آیات پائی جاتی ہیں جس کی تفسیر آیات محکمات کے لحاظ سے ہونا چاہئے، اور روایات میں بھی بیان ہوا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سارے باطن اور مختلف پردہ ہیں، لیکن قرآن مجید کی کسی

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۲۷ ترجمہ: "اور اے پیغمبر! آپ ان کو آدم کے دونوں فرزندوں کا سچا قصہ پڑھ کر سنائیے"

[2] سورہ اسراء (بنی اسرائیل) آیت ۱۰۵۔ "ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے"

بھی آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ ظاہر آیات اور کلمات والفاظ حجیت نہیں ہیں، اور ہم پر حقائق کو آشکار نہیں ہوتے۔

قارئین کرام! آیات کے ظاہری اعتبار کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی مزید دقیق اور گہرے مطالب موجود ہیں جن کو بطون اور تاویل آیات کہا جاتا ہے، اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اصلاً قرآنی ظواہر معتبر نہیں ہیں، اور صرف ان سے حاصل کردہ ہمارا نتیجہ معتبر ہے اور وہ بھی وہ تاویلات جو تاویل کرنے والے کے ذہن کے مطابق اور اس کے ذہن کی پیداوار ہوں اس طرح دینی سلسلہ میں مختلف اور متضاد قرائت پیش کی ہو رہی ہیں اور ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان سب کو قابل احترام مانیں!!

۱۲۔ تحریف دین کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اظہار افسوس

قارئین کرام! ہم اپنی گفتگو کے آخر میں لازم اور ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے ان نورانی کلمات کی طرف اشارہ کریں جس میں آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے دینی انحرافات اور شبہات کو بیان کیا ہے اور جن کی بنا پر افسوس ناک اور برے نتائج برآمد ہوئے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ۲۵/سال کے بعد قائم ہوئی ہے، اس وقت تک وہ اصحاب رسول موجود تھے جنھوں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے آیات قرآن کی تفسیر اور شان نزول کو سنا تھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آیات کے موقع کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؛ کیونکہ اس وقت قرآن کے نزول کو زیادہ وقت نہیں گذرا تھا لیکن وہ منافقین اور دشمنان اسلام موجود تھے جو اہل بیت علیہم السلام کے بے انتہا دریائے معرفت سے بے بہرہ تھے، اور جاہ وحشم کے دلدادہ اور ہوا پرست دین میں شبہات اور تحریفات ایجاد کر رہے تھے جس کی وجہ سے اسلام میں انحرافات پیدا ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے درمیان برادر کشی ہونے لگی چنانچہ اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَلٰکِنَّا اِنَّمَا اَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ اِخْوَانَنَا فِی الْاِسْلَامِ عَلٰی مَا دَخَلَ فِیْهِ مِنَ الزَّیْغِ وَ الْاِعْوِجَاجِ وَالشُّبْهَةِ وَالتَّاوِیْلِ۔"[1]

مگر اب ہم کو ان لوگوں سے جو اسلام کی رُو سے ہمارے بھائی کہلاتے ہیں ان سے جنگ کرنا پڑ گئی ہے، چونکہ (ان کی وجہ سے) اس میں گمراہی، کجی، شبہات اور غلط سلط تاویلات داخل ہو گئے ہیں۔

یہی وہ شبہات اور اعتراضات ہیں جو عصر حاضر میں علمی طریقہ سے بیان کئے جاتے ہیں اور منظم طور پر بیان ہوتے ہیں، حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ میں انھیں اعتراضات کی وجہ سے مسلمانوں میں مقابلہ بازی شروع ہو گئی، اور اسی طرح کے شبہات اور اعتراضات کو قبول کرتے ہوئے جنگ جمل اور جنگ نہروان میں حقیقی مفسر قرآن حضرت علی علیہ السلام کے مقابلہ میں آگئے جس کی بنا پر بہت سے لوگ قتل کر دیے گئے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۲

حضرت علی علیہ السلام خداوند عالم کی بارگاہ میں عوام الناس کی جہالت کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"إِلَى اللهِ أَشْكُو مِنْ مَعْشَرٍ يَعِيشُونَ جُهَّالًا وَ يَمُوتُونَ ضُلَّالًا، لَيْسَ فِيهِمْ سِلْعَةٌ أَبْوَرُ مِنَ الْكِتَابِ إِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ، وَلَا سِلْعَةٌ أَنْفَقُ بَيْعاً وَلَا أَغْلَى ثَمَناً مِنَ الْكِتَابِ إِذَا حُرِّفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَلَا عِنْدَهُمْ أَنْكَرُ مِنَ الْمَعْرُوفِ وَلَا أَعْرَفُ مِنَ الْمُنْكَرِ"[1]

اللہ ہی سے شکوہ ہے ان لوگوں کا جو جہالت میں جیتے ہیں اور گمراہی میں مرجاتے ہیں، ان میں قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہیں ہے، جب کہ اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسا پیش کرنے کا حق ہے، اور اس قرآن سے زیادہ کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں، اس وقت جب کہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے، ان کے نزدیک نیکی سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہیں۔

قارئین کرام! توجہ فرمائیں حضرت امیر علیہ السلام کا یہ شکوہ و شکایت اس وقت کا ہے جب رحلت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ۲۵ سال کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا، لیکن انحرافات، شبہات اور بدعت دین کے لئے اس قدر نقصان دہ ثابت ہو رہے تھے کہ حضرت نے تنہائی کے عالم میں لوگوں کی ہدایت کے مسئلہ کو ان کے حال پر چھوڑتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیئے اور اپنے درد و غم کو بیان کرنا شروع کر دیا۔

مذکورہ بالا کلام کی طرح خطبہ نمبر ۱۴۵ میں بھی حضرت فرماتے ہیں:

"وَ إِنَّهُ سَيَأْتِي عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي زَمَانٌ لَيْسَ فِيهِ شَيْءٌ أَخْفَى مِنَ الْحَقِّ، وَ لَا أَظْهَرُ مِنَ الْبَاطِلِ، وَ لَا أَكْثَرُ مِنَ الْكَذِبِ عَلَى اللهِ وَ رَسُولِهِ. وَ لَيْسَ عِنْدَ أَهْلِ ذَلِكَ الزَّمَانِ سِلْعَةٌ أَبْوَرَ مِنَ الْكِتَابِ إِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ، وَلَا أَنْفَقَ إِذَا حُرِّفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَلَا فِي الْبِلَادِ شَيْءٌ أَنْكَرَ مِنَ الْمَعْرُوفِ وَلَا أَعْرَفَ مِنَ الْمُنْكَرِ"

میرے بعد تم پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں حق بہت پوشیدہ اور باطل بہت نمایاں ہوگا، اور اللہ اور اس کے رسول پر افتراء پردازی کا زور ہوگا، اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جبکہ اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے پیش کرنے کا حق ہے، اور اس قرآن سے زیادہ ان میں کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں ہوگی جب کہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے، اور (ان کے) شہروں میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہ ہوگی۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"چنانچہ حاملان قرآن کو چھوڑ دیا جائے گا اور حافظین قرآن کو بھلا دیا جائے گا، قرآن اور قرآن والے (اہل بیت) بے گھر اور بے در ہوں گے، اور ایک ہی راہ میں ایک دوسرے ساتھی ہوں گے، انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا وہ (بظاہر)

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۷

لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ، ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق، اس لئے کہ گمراہی ہدایت سے ساز گار نہیں ہو سکتی، اگر چہ وہ یک جا ہوں لوگوں نے تفرقہ پردازی پر تو اتفاق کر لیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا کہ وہ کتاب کے پیشوا ہیں کتاب ان کی پیشوا نہیں، ان کے پاس تو صرف قرآن کا نام رہ گیا ہے اور صرف اس کے خطوط اور نقوش کو پہچان سکتے ہیں، اس آنے والے دور سے پہلے وہ نیک بندوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا چکے ہوں گے، اور اللہ کے متعلق ان کی سچی باتوں کا نام بھی بہتان رکھ دیا ہوگا اور نیکیوں کے بدلہ میں انہیں بُری سزائیں دی ہوں گی۔"

نیز فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمُوا اَنَّكُمْ لَنْ تَعْرِفُوا الرُّشْدَ حَتّٰى تَعْرِفُوا الَّذِيْ تَرَكَهُ وَلَنْ تَاْخُذُوْا بِمِيْثَاقِ الْكِتَابِ حَتّٰى تَعْرِفُوا الَّذِيْ نَقَضَهُ وَلَنْ تَمَسَّكُوْا بِهِ حَتّٰى تَعْرِفُوا الَّذِيْ نَبَذَهُ۔

جان لو کہ تم ہدایت کو اس وقت تک نہ پہچان سکو گے جب تک اس کے چھوڑنے والوں کو نہ پہچان لو اور قرآن کے عہد و پیمان کے پابند نہ رہ سکو گے جب تک کہ اس کے توڑنے والے کو نہ جان لو اور اس سے وابستہ نہیں رہ سکتے جب تک کہ اسے دور پھینکنے والوں کی شناخت نہ کر لو۔

اور خطبہ کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:

"پس انہیں سے ہدایت حاصل کرو، وہی علم کی زندگی اور جہالت کی موت ہیں وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا (دیا ہوا) ہر حکم ان کے علم اور ان کی خاموشی ان کی گویائی کا پتہ دے گی، اور ان کا ظاہر ان کے باطن کا آئینہ دار ہے، وہ نہ دین کی مخالفت کرتے ہیں نہ اس کے بارے میں باہم اختلاف رکھتے ہیں، دین ان کے سامنے ایک سچا گواہ ہے اور ایک ایسا بے زبان ہے جو بول رہا ہے۔"[1]

قارئین کرام! آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام لوگوں کو متوجہ کرنے کے بعد ان سے چاہتے یہ ہیں کہ دین کو صرف اہل بیت علیہم السلام کے ذریعہ حاصل کریں کیونکہ دین اور قرآن سے انہیں کا حاصل کردہ نتیجہ صحیح اور بر حق ہے، اور دین سے دوسرے حاصل کردہ نتائج باطل اور بے بنیاد اور راہ خدا کو حاصل کرنے والوں اور حق و حقیقت کے تلاش کرنے والوں کے چور ہیں، جس کا نتیجہ گمراہی اور ذلت کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

توجہ فرمائیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے نظریہ کے مطابق یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس دین سے ایک الگ نتیجہ حاصل کر لے اور اس طرح کے تمام حاصل شدہ نتائج صحیح اور درست ہوں، کیونکہ یہ اپنے سلیقہ اور ذوق کے مطابق ہے کیا دین کے سلسلہ میں ذوق کا بھی کوئی دخل ہے؟ کیا دینی مسائل میں بھی ذوق دکھایا جا سکتا ہے؟ (ہرگز نہیں)

تو پھر دین کی صحیح تفسیر اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کرنا چاہئے، نہ یہ کہ اپنے سلیقہ اور ذوق کی بنا پر خود بھی گمراہ ہو رہے

---

[1] نہج البلاغہ ترجمہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ، خطبہ نمبر ۱۴۵

ہوں اور دوسروں کو دین سے گمراہ کردیں۔

۱۳۔ دینی سلسلہ میں ذاتی سلیقہ کو رد کیا جائے

بعض لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ اپنے سلیقہ اور ذوق کو دوسروں پر نہ تھوپیے، تو کیا دین ذوق اور سلیقہ کا نام ہے، اور اس کی حدود حدود اور اس کے معنی وتفسیر انسان کے سلیقہ سے معین ہوتے ہیں؟ سلیقہ اور ذوق انسان کی عام زندگی سے متعلق ہوتا ہے؛ مثال کے طور پر کوئی شخص کوئی کپڑا یا دوسری چیز خریدنا چاہتا ہے تو اس موقع پر کسی دوسرے شخص پر اپنا سلیقہ تحمیل کرنا صحیح نہیں ہے لیکن اعتقادات میں سلیقہ اور ذوق کا کوئی سروکار نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میرا سلیقہ یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے، اور (نعوذ باللہ) دوسرا شخص کہے کہ میرا سلیقہ یہ ہے کہ کئی خدا ہیں، کیونکہ شریعت اور احکام الٰہی عوام الناس کے ذوق کے تحت نہیں ہیں تاکہ کہنے والے کہیں کہ دوسروں کے سلیقوں کو بھی برداشت کریں، نیز دوسروں کے سلیقوں کو رد نہ کریں پس اعتقادی مسائل، ضروریات اسلام، احکام اسلام، عقائد اور الٰہی اقدار کسی کے سلیقہ کے تحت نہیں ہیں، اور ان کے سامنے ذوق وسلیقہ کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے اپنے نظریہ کو مطلق نہ قرار دینے کے شعار فقط دین کے فرعی اور ظنی مسائل میں صحیح ہے اور ان میں بھی ان حضرات کا نظریہ قابل قبول ہے جو دینی وفقہی مسائل میں اپنے عظیم الشان علم اور صحیح طریقہ سے مکمل طور پر اجتہاد کریں اور قرآن وسنت کے ذریعہ اپنے نظریہ کو استنباط کریں اور اسی کے مطابق فتویٰ دیں اور جو شخص اس طرح کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے اس کو اصطلاحاً "فقیہ" کہا جاتا ہے، چنانچہ اسی موقع پر کہا جاتا ہے کہ ایک فقیہ اپنی رائے کو دوسرے فقیہ پر تحمیل کرنے کا حق نہیں رکھتا یہ مسلم ہے کہ دو فقہاء کے درمیان فتووں میں اختلاف ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی فقیہ یہ نہیں چاہتا کہ اپنے نظریہ کو دوسرے فقیہ پر تحمیل کرے لیکن عقائد، اصول اور اسلام کے قطعیات میں انسان کا کوئی سلیقہ اور ذوق قابل قبول نہیں ہے کیونکہ دینی عقائد میں صرف وہی چیز صحیح ہے جس کو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام نے بیان فرمایا ہے، اور تمام علماء اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے، کیونکہ اسلامی مسلمات کے سلسلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی قرائت کے علاوہ دوسری تمام قرائت باطل اور بے بنیاد ہیں، اور کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی آگے بڑھ کر یہ کہے میں بھی دین سے ایک نئی قرائت پیش کرتا ہوں، درحقیقت اس طرح کا نظریہ دین میں بدعت گذاری کا واضح مصداق ہے جس سے مقابلہ کرنا حقیقی علماء اسلام کا فریضہ ہے، تاکہ وہ خداوند عالم، اس کے فرشتوں اور نیک بندوں کی لعنت ونفرین کے مستحق قرار نہ پائیں۔

چالیسویں نشست

دینی معارف افسانہ ہیں یا حقیقت نما آئینہ

ا۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر

"اسلامی سیاسی نظریات کی وضاحت" کے سلسلہ میں ہماری بحث یہاں تک پہنچی تھی کہ اگر اسلامی منابع کے لحاظ سے قوانین اور ضوابط بنانا چاہیں اوران کو اسلامی اقدار کے مطابق نافذ کرنا چاہیں، تو اس کے لئے ہمارے پاس قرآن وسنت (جو ہمارے اصلی منابع ہیں)؛ کی گہری شناخت اور قابل اعتماد پہچان ہونا ضروری ہے، تاکہ قانون گذاری کے وقت اسلامی نظریہ کو مدنظر رکھیں، اور وہ قوانین وضوابط اسلام کے کلی قوانین کے تحت قرار پائیں، اوراسی طرح قرآن وسنت سے الہام لیتے ہوئے ان کو نافذ کرنے کا طریقہ اپنائیں اس سلسلہ میں کبھی کبھی آیات وروایات سے ہونے والا نتیجہ مختلف ہوجاتا ہے اور بعض آیات وروایات کی مختلف تفسیر ومعنی کئے جاتے ہیں نیز بعض روایات سے مختلف استنباط ہوتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں بعض لوگ اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہیں اختلاف کے پیش نظر یہ کہتے ہیں کہ تمام دینی مسائل میں اختلاف جائز ہے، اور کہتے ہیں کہ ہر شخص اسلام سے مخصوص قرائت اور مخصوص نتیجہ حاصل کرسکتا ہے، اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نظریہ کو دوسروں پر تحمیل کرے جیسا کہ اخباروں اور جرائد میں مکرر یہ شعار دیا جاتا ہے کہ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ دین سے اپنے حاصل کردہ نتیجہ کو مطلق گردانے، بلکہ توجہ رہے کہ دوسرے افراد بھی آراء اور نظریات رکھتے ہیں، اور یہ کہ اسلام کی صرف ایک قرائت نہیں ہے، نیز اسلام کے بارے میں مختلف قرائت کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ دین کی ہر ایک قرائت معتبر اور محترم ہے۔

۲۔واقع نما اور غیر واقع نما زبانوں کی اہمیت

قارئین کرام! ہم نے گذشتہ جلسہ میں دینی سلسلہ میں مختلف نظریات کے مطلق نہ ہونے نیز دین کی مختلف قرائت نہ ہونے کے بارے میں بحث کی، اور نظریات کے نسبی ہونے نیز مختلف قرائت کا سرچشمہ تلاش کرتے ہوئے "نسبیت معرفت" کے مسئلہ کو بیان کیا اور عرض کیا کہ "نسبیت معرفت" کے سلسلہ میں تین نظریات پائے جاتے ہیں اس جلسہ میں دینی نظریات کے مطلق نہ ہونے کے شعار اور دین کی مختلف ہونے کے بارے میں دوسرے دو نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور وہ دو نظریہ یہ ہیں: "دین کی زبان" اور "ہرمنوٹیک" "Hermeneutics" کی بحث اور علم تفسیر متون (تحریر کی شرح وتفسیر کرنا) جو

کہ عصرِ حاضر میں معرفت کا ایک مہم باب کہلاتا ہے، اور دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں مخصوص ڈیپارٹمینٹ اور مخصوص علمی گروہ اس میں مشغول ہیں لہٰذا ہم اس نشست میں انہیں دو چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

دین کی زبان کے سلسلہ میں بحث، اور دینی معرفت مطلق نہ ہونے والے مسئلہ کا سرچشمہ یہ ہے کہ ان آخری چند صدیوں کے دوران یورپی ممالک میں "فلسفہ دین اور کلام جدید" کے سلسلہ میں ایک نئی بحث یہ کی گئی ہے کہ کیا دین کی زبان واقع نما ہے یا دین کی زبان سمبلیک "Symbilec" (رمزی) اور قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے اس سلسلہ وضاحت کے طور پر یوں عرض کیا جائے کہ انسان اپنی بات کو سمجھانے کے لئے زبانی اور عرفی محاورات یا علمی اور فلسفی اصطلاحات، نیز الفاظ اور ان کی ترکیبات کا استعمال کرتا ہے تاکہ دوسروں کو خارجی یا عینی چیزوں کی واقعیت کی طرف متوجہ کر سکے اور کبھی انسان ان الفاظ کے ذریعہ خارجی اور عینی واقعیات کے طرف متوجہ کرتا ہے اور کبھی ان الفاظ کے ذریعہ منطق اور فلسفہ جیسے علم میں ذہنی اور تصوری حقائق کی طرف متوجہ کرتا ہے، مثال کے طور پر کوئی شخص یہ کہے کہ "فضا روشن ھے" اس جملہ سے کہنے والے کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سننے والے کو اس بات کی خبر دے کہ فضا روشن ہے، اور چراغ کے ذریعہ روشنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے بے شک یہ زبان واقع نما ہے اور ایک بیرونی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے اور اسی طرح کی زبان ریاضیات، منطق اور فلسفہ میں بھی استعمال کی جاتی ہے، البتہ یہ زبان علوم دقیقہ (منطق وفلسفہ) اور تجربی علوم میں تھوڑے دخل وتصرف کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ زبان علم اور زبان فلسفہ واقع نما ہوتے ہیں اور بیرونی حقیقت یا ذہنی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔

لیکن کبھی کبھی کسی بھی زبان کے الفاظ بیرونی یا ذہنی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے استعمال نہیں کئے جاتے اگرچہ الفاظ کی ترتیب وہی ہوتی ہے جس کو علوم میں حقیقت نما طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے، لیکن کہنے والے یا لکھنے والے کا مقصد حقیقت سے باخبر کرنا نہیں ہوتا، مثال کے طور پر افسانہ اور قصہ کی زبان، جس میں کسی بھی طرح کی کوئی واقعیت کا پتہ نہیں دیا جاتا، لہٰذا اس طرح کی زبان واقع نما نہیں ہے جس وقت قصہ اور کہانیوں کی کتابوں میں "کلیلہ ودمنہ" کی داستان بیان کی جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان قصوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کسی طرح کی حقیقت کی حکایت نہیں کرتے اگر ان میں جنگلی حیوانات مثلاً شیر، بھیڑیا اور لومڑی وغیرہ کا کے بارے میں باتیں بتائی جاتی ہیں تو مولف کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جنگلی حیوانات میں اس طرح کی گفتگو ہوتی ہے؛ بلکہ مولف اس داستان کے ذریعہ حیوانات کی زبان میں غیر مستقیم طور پر بعض مہم باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے لہٰذا افسانہ اور قصہ کی زبان غیر واقع نما زبانوں کا ایک حصہ ہے۔

انھی غیر واقع نما زبانوں میں سے: زبان سمبلیک "Symbilec" (رمزی) ہے جو بہت سے علوم میں استعمال کی جاتی ہے، اسی طرح انسانی معارف کی بہت سی قسموں میں حکایت اور حقائق کے بیان کرنے کے لئے اس زبان سے استفادہ کیا جاتا ہے، جس کا واضح نمونہ؛ علم ہندسہ اور ریاضی کی مثالیں اور فارمولے نیز اختصار کی علامتیں ہوتی ہیں جیسے "y"، "x"

، کیونکہ یہ مثالیں اور فارمولے کسی حقیقت کی حکایت نہیں کرتے، بلکہ بعض علمی حقائق کے لئے صرف ایک علامت ہوتی ہیں، اسی طرح شاعروں کی زبان بھی غیر واقع نما ہوتی ہیں جب شاعر؛ مئے، ساغر اور ساقی جیسے الفاظ کو اپنے شعر میں استعمال کرتا ہے تو حقیقت میں اس کی مراد واقعی ساقی اور شراب نہیں ہوتی بلکہ ان الفاظ کو کنایۃً استعمال کرتا ہے جب کہ اس کے ذہن میں حقیقی مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔

۳۔ دین کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کا سبب

چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین بھی اپنی خاص زبان رکھتا ہے، اور دین کی زبان غیر واقع نما زبانوں میں سے ہے پہلے تو دین کی زبان کا مسئلہ یورپ میں یہودیت اور عیسائیت کے عقائد کے بارے میں بیان ہوا، اسی وجہ سے دانشوروں اور متفکروں نے اپنے نظریہ کی تائید میں یہودیوں اور عیسائیوں کی کتاب مقدس سے مثالیں پیش کیں، اور یہ کہا کہ جب ہم کتاب مقدس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے اندر بعض چیزوں کے بارے میں دیکھتے ہیں، تو ہمارا تصور یہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ مقدس کتاب ہم کو علمی (اور سائنسی) کتابوں کی طرح بیرونی حقائق سے آشنا کر رہی ہے، بلکہ دین نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ایک افسانہ کی زبان اور سمبلیک "Symbilec" زبان ہے، (واقع نما نہیں۔)

عام طور پر زبان کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

1. واقع نما زبان

2. غیر واقع نما زبان،

اور بعض لوگ دین کی زبان کو غیر واقع نما زبانوں میں قرار دیتے ہیں، یعنی دین کی زبان حقائق اور واقعیت پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ افسانہ، قصہ وکہانیوں کی طرح ہوتی ہے لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دین کی زبان کو زبان افسانہ قرار دینے کی علت اور وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب یورپ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے پیش نظر ہر روز نئی نئی چیزیں کشف ہوئی، اور زمین، سورج اور دیگر ستاروں کے بارے میں مغربی دانشوروں جیسے "کلپر"، "کپر نیک"، "گالیلہ"؛ نے نئے نئے فرضیہ قائم کئے جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتاب (توریت اور انجیل) سے ہم آہنگ نہ تھے، جس کی وجہ سے انہوں نے یہ اندازہ لگالیا کہ عصرِ حاضر میں سائنس کی نئی تھیوری اور نظریات؛ کتاب مقدس میں بیان شدہ بعض عقائد کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں، جس کی بنا پر یہودیت اور عیسائیت کا چراغ گل ہو جائے گا، کیونکہ جب توریت اور انجیل میں بیان شدہ چیزیں نادرست، بے بنیاد اور جھوٹی ثابت ہو جائیں گی تو پھر یہ دین کیسے باقی رہ سکتا ہے خصوصاً عیسائیت جس کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

خصوصاً "رنسانس" کے زمانہ کے بعد سے؛ کتاب مقدس کی اہمیت کو بچانے اور یہودیت وعیسائیت کی دیواریں

بچنے سے روکنے کے لئے راہ حل تلاش کرنے کی فکر ہوئی، (اور کافی مدت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ) توریت اور انجیل میں بیان شدہ عقائد اور دوسری چیزیں؛ سائنس کے جدید نظریات اور ٹیکنالوجی سے اس وقت ہم آہنگ نہ ہوں گی جب ہم دین کی زبان کو واقع نما اور حقائق کی عکاسی کرنے والی زبان کہیں لیکن اگر دین کی زبان کو غیر واقع نما زبان قرار دیدیں اور یہ کہیں کہ دین کی زبان؛ شعر اور افسانہ کی زبان ہے جو حقائق اور واقعیت کی عکاسی نہیں کرتی اور توریت وانجیل میں بیان شدہ چیزیں گویا افسانہ اور قصہ کہانیوں کی طرح ہیں اور خاص اغراض ومقاصد کے تحت تنظیم ہوئی ہیں، تو اس صورت میں سائنس اور دینی باتوں میں کسی طرح کا کوئی اختلاف پیش نہیں آئے گا؛ کیونکہ بنیادی طور پر دونوں زبانوں کا مقصد مختلف ہے اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ توریت اور انجیل میں خدا، وحی، قیامت اور جنت وجہنم کے بارے میں ذکر شدہ مطالب صرف عوام الناس کو اچھائیوں اور برائیوں کے سمجھنے کے لئے بیان ہوئے ہیں، تاکہ دیندار افراد نیک کام کرنے اور برے کاموں سے پرہیز کرنے کی کوشش کریں جھوٹ نہ بولیں، غیبت نہ کریں اور دوسرے پر ظلم وستم کو جائز نہ مانیں مثلاً اگر ان میں کہا جاتا ہے کہ جو شخص کسی پر ظلم کرے گا تو آخرت میں اس پر عذاب ہوگا، تو درحقیقت اس قول سے ظلم کی بُرائی کو مزید مجسم کیا گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ واقعاً آخرت میں کوئی جنت وجہنم موجود ہے، لہٰذا ہمیں دینی مسائل سے اس طرح کا کوئی تصور اور نتیجہ حاصل نہیں کرنا چاہئے۔

کتاب مقدس (توریت اور انجیل) سے عام فہم عوام الناس یہی نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں ذکر شدہ دینی مسائل حقائق پر مبنی ہیں اور بیرونی حقائق کی عکاسی کرتی ہیں، لیکن روشن خیال رکھنے والوں اور دانشوروں کے نزدیک توریت وانجیل میں بیان شدہ مطالب صرف عوام الناس کے لئے تربیتی پہلو رکھتے ہیں یعنی ان کے پیش نظر عوام الناس میں نیک کام کرنے اور بُرے کاموں سے پرہیز کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس کے علاوہ ان مقدس کتابوں میں بیان شدہ مطالب میں کوئی پیغام نہیں ہے یہاں تک کہ دین کی افسانوی زبان میں خدا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، چنانچہ اگر توریت اور انجیل میں خدا کا ذکر ہے یا انبیاء علیہم السلام اور وحی کے بارے میں بیان ہوا ہے، تو اس افسانوی زبان میں یہ صرف خدا کا ایک عکس ہے ورنہ (نعوذ باللہ) نہ تو خدا ہے اور نہ جنت وجہنم اور وحی اور اس عکس کو اس افسانوی زبان میں اس قدر بہترین سلیقہ سے بیان کیا گیا ہے تاکہ عوام الناس میں نیک کام کرنے اور بُرے کام سے پرہیز کرنے کا شوق پیدا ہو، اور انسانی اقدار کا پاس و لحاظ رکھا جائے ان کی یہ کوشش رہے کہ اسی دنیا میں بہترین زندگی گذاریں اور دوسرے کو آزار واذیت نہ دیں؛ ورنہ تو توریت وانجیل کی "کلیلہ ودمنہ" داستان سے زیادہ اہمیت نہیں ہے جس طرح سے یونانی قدیم تمدن اور دوسرے قدیمی معاشروں میں افسانوی خدا ہوتے تھے، یہاں تک کہ ان کی بعض داستانوں میں یہاں تک بیان ہوا ہے کہ وہ خدا ایک دوسرے سے شادی کیا کرتے ہیں، اور کبھی تال میل کرتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے ناراض ہوجاتے ہیں، اسی طرح دوسرے ادیان کی کتابوں منجملہ توریت اور انجیل میں بھی صرف خیالی اور افسانوی عکس ہوتا ہے جس میں کسی بھی طرح کی کوئی

حقیقت نہیں ہوتی۔

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہودیت اور عیسائیت کو نابودی سے بچانے کے لئے توریت اور انجیل میں بیان شدہ دینی مسائل کے بارے میں یہ تھیوری اور نظریہ پیش کیا گیا ہے اور یہ نظریہ آہستہ آہستہ مغربی ممالک کے دیندار لوگوں میں بھی رائج ہوتا چلا گیا، اور کتاب مقدس کی توجیہ (اور دلیل) کے عنوان سے اس نظریہ کو بہترین راہ حل مانا جانے لگا لیکن "رنسانس" کے زمانہ سے پہلے یہودی اور عیسائی متدین لوگ دینی عقائد اور مسائل کو صادق، حق اور واقع کے مطابق مانتے تھے، اور انہوں نے جب نئی نئی کشفیات اور سائنس کے نظریات کو اپنی کتاب مقدس کے برخلاف پایا تو کتاب مقدس کے دفاع کرتے ہوئے بعض دانشوروں کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بعض دینی مسائل کے مخالف دانشوروں کو پھانسی دے دی گئی اور بعض کو زندہ آگ میں جلا دیا گیا اسی طرح بعض بہت سے دانشوروں کو منجملہ "گلیلہ" کو توبہ پر مجبور کیا جس کی بنا پر اس نے اپنے نظریات واپس لے لئے۔

۴۔ مغربی نسبی گرائی نظریہ کی ترویج (وتبلیغ) کرنے والے مغرب پرست روشن خیال

قارئین کرام! مغربی ممالک میں پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ دین کی زبان؛ سائنس کی زبان سے مختلف ہے اور دین کی زبان کسی بھی طرح کے حقائق پر مبنی نہیں ہے، بلکہ دین کی زبان قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے، لیکن مشرقی ممالک سے مغربی ممالک کے تعلقات اور علمی تبادلہ خیالات اور مغربی ممالک میں اسٹوڈینٹ کا تعلیم حاصل کرنے وغیرہ جیسے امور کی وجہ سے یہ نظریہ مشرقی ممالک میں بھی آ گیا مغرب پرست اور مغربی کلچر کے عاشق اور دلدادہ نیز مغربی ممالک میں تعلیم یافتہ اسٹوڈینٹ وغیرہ مغربی تمدن کے شیدائی بن گئے، اور وہاں کی تعلیم اور وہاں کی زبان سے آشنائی کو اپنے اہم افتخارات میں شمار کرنے لگے، اور اس الحادی تھیوری اور نظریہ کے حصول کو اپنے لئے باعث سرفرازی سمجھنے لگے، نیز اس نظریہ کو کارگر اور بہترین تحفہ کے عنوان سے عالم اسلام میں داخل کر دیا، اور کہا کہ جس طرح مغربی ممالک میں توریت اور انجیل کے ماننے والے اپنے دین کی زبان کو غیر واقع نما زبان قرار دیتے ہیں اور اس کو صرف قصہ کہانی کی زبان مانتے ہیں جو کسی بھی طرح کے حقائق کو بیان نہیں کرتی، اسی طرح قرآن کریم کی زبان بھی قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے جس میں حقائق سے کوئی سروکار نہیں ہے۔!!

عالم اسلام میں بعض عربی ممالک جو اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم سے آشنائی نہیں رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے اس تھیوری اور نظریہ کو قبول کر لیا اور بعض عربی اہل قلم نے اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھ ڈالیں اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے شواہد یا "مستندات قرآن" کا بھی ذکر کیا اور جب انہوں نے قرآن مجید کی متشابہ آیات کو دیکھا جن کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کے حقیقی معنی کو درک نہ کر سکے، اور ان کے ظاہری معنی کو علم اور سائنس سے ہم آہنگ نہ پایا تو توریت وانجیل کے ماننے والوں کی طرح اپنے دینی عقائد کی افسانوی تفسیر وتوضیح کرنے لگے، اور قرآن مجید کی بھی افسانوی اور سمبلیک "Symbilec" (رمزی) تفسیر کرنا شروع کر دی تا کہ اپنے خیال ناقص میں سائنس کے نظریات کے، دینی عقائد اور دینی مسائل سے ٹکراؤ کا راہ حل

پیش کرسکیں تقریباً تیس سال سے خصوصاً ان آخری چند سالوں میں یورپ اور امریکہ میں تعلیم یافتہ لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ فعالیت اور کارکردگی کی تاکہ مغربی تمدن کے اس نظریہ کو ہمارے معاشرہ میں رواج دیں اور قرآن کی زبان کو قصہ کہانی اور افسانوی زبان کہہ ڈالا، اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے قرآن مجید کی بعض رمزی اور سمبلیک تفسیر کے چند نمونہ پیش کئے:

۵۔ ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے انحرافی نتیجہ

تیس سال پہلے انحرافی اور مارکسسٹ "Marxist" نظریہ رکھنے والے ایک صاحب نے اپنی ایک تقریر میں ہابیل وقابیل کے واقعہ سے سمبلیک "Symbilec" تفسیر کی۔

جب کہ قرآن مجید میں اصل واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ [1]

اور اے پیغمبر! آپ ان کو آدم کے دونوں فرزندوں کا سچا قصہ پڑھ کر سنائیے کہ جب دونوں نے قربانی دی اور ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی نہ ہوئی تو اس نے کہا کہ میں تجھے قتل کردوں گا تو دوسرے نے جواب دیا کہ میرا کیا قصور ہے خدا صرف صاحبان تقویٰ کے اعمال قبول کرتا ہے۔

اسلامی کتب میں وارده شدہ روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جناب آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہابیل وقابیل کو خدا کی بارگاہ میں قربانی کرنا تھی چنانچہ قابیل نے ایک گوسفند کی قربانی کی، اور جناب ہابیل علیہ السلام نے ایک مقدار گیہوں راہ خدا میں ہدیہ دیئے، جناب ہابیل علیہ السلام کی قربانی بارگاہ رب العزت میں قبول ہوگئی لیکن قابیل کی قربانی قبول نہ ہوئی، جس کے بنا پر قابیل کو جناب ہابیل سے حسد ہونے لگا یہاں تک کہ جناب ہابیل کو قتل کردیا؛ لیکن اپنے کئے پر پشیمان ہوا اس کے بعد اپنے بھائی کے جنازہ کے بارے میں فکر ہوئی کہ اس کو کیا کرے تو خداوند عالم نے ایک کوے کو بھیجا جس نے قابیل کو دفن کرنے کا طریقہ سکھادیا۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْاَةَ اَخِيْهِ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْاَةَ اَخِيْ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ. [2]

پھر خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کھود رہا تھا کہ اسے دکھلائے کہ بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے گا تو اس نے کہا کہ افسوس میں اس کوے کے جیسا بھی نہ ہوسکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو زمین میں چھپا دیتا اور اس طرح وہ نادمین اور پشیمان

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۲۷

[2] سورہ مائدہ آیت ۳۱

لوگوں میں شامل ہو گیا۔

کوے نے اپنی غذا کو چھپانے کے لئے زمین میں ایک گڑھا کھودا اور اپنی غذا وہاں چھپا دی؛ جب خداوند عالم کے حکم سے کوے نے زمین میں اپنی غذا کو دفن کیا تو کیونکہ قابیل کو نہیں معلوم تھا کہ زمین میں مردہ کس طرح دفن کیا جاتا ہے، لیکن کوے کے کام سے اپنے مردہ بھائی کے دفن کا طریقہ سیکھ لیا۔

وہ مقرر اور مولف اس واقعہ کے بارے میں اپنی سمبلک تفسیر میں کہتا ہے:

اس واقعہ میں جناب ہابیل زحمت کش اور کاشتکاری کا ایک نمونہ ہے جو بہت زیادہ زحمت کے بعد بہت کم نتیجہ حاصل کرتا ہے اور چونکہ خداوند عالم اس طبقہ کا طرفدار ہے لہٰذا خداوند عالم نے اس کا ناچیز ھدیہ قبول کرلیا اور قابیل مالداری کا نمونہ ہے اور جب ایک مالدار نے گوسفند کی قربانی کی تو خدا نے اس کو قبول نہیں کیا؛ کیونکہ خداوند عالم مالداری کا دشمن ہے چنانچہ اس مقرر نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہابیل وقابیل اور گندم اور گوسفند کی قربانی کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور صرف سمبلیک "Symbilec" (رمزی) پہلو رکھتا ہے، اور یہ واقعہ مزدور اور مالدار طبقوں کے درمیان اختلاف اور جنگ وکشمکش کی حکایت کرتا ہے (لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جناب آدم وحوا اور ان کے دونوں فرزند ہابیل وقابیل کے علاوہ کوئی تھا ہی نہیں کس طرح غریب، مزدور اور مالدار طبقہ کا تصور کیا جاسکتا ہے، اور اس طرح کی طبقاتی تقسیم اس زمانہ کے لئے معنی نہیں رکھتی بھر حال مارکسسٹ "Marxist" نظریہ کے رواج اور اس الحادی نظریہ کے طرفداروں کی وجہ سے یہ سمبلیک تفسیر قابل قبول قرار پائی)۔

قارئین کرام! مذکورہ مقرر نے ہابیل وقابیل کے بارے میں یہ سمبلیک تفسیر بیان کردی لیکن یہ نہیں بتایا کہ کوا کس چیز کا نمونہ تھا؛ یہاں تک کہ اس کے ایک شاگرد نے اس کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا کہ وہ کالا کوا مولویوں کا نمونہ تھا جو مجلس پڑھتے ہیں اور عزاداری کرتے ہیں جو منبر پر جا کر روزی کے سیاہ وسفید کے بارے میں بیان کرتے ہیں اور مالداروں اور سرمایہ داروں کی حمایت کرتے ہیں اور مزہ کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا.[1]

(اے رسول) اس واقعہ کی حقیت لوگوں کے لئے بیان کریں۔

گویا خداوند عالم یہ خبر دے رہا ہے کہ ایک روز ایسا بھی آئے گا جب اس واقعہ کے سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیا جائے گا، لہٰذا آپ پہلے ہی اس واقعہ کی حقیقت کو بیان فرمادیں۔

جی ہاں، ان چند سالوں میں بعض مغربی ممالک کے کلچر سے متاثر افراد قرآن مجید سے اس طرح کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور آج کل دین اور قرآن کے بارے میں اس طرح کی باتیں اپنے زوروں پر ہے اور ان کی تبلیغ وترویج ہو رہی ہے،

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۲۷

یہاں تک کہ بعض علماء بھی اس نظریہ سے متاثر ہو چکے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) قرآن کی زبان واقع نما نہیں ہے اور ایسا نہیں کہ قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ ہمیں کسی حقیقت کے بارے میں پتہ چلتا ہو، ہمارے پاس قرآنی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں قطعی، برہانی اور مسلم معیار نہیں ہیں تا کہ ان کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کریں کہ قرآن مجید کی فلاں آیت سے یہ نتیجہ ہے اور دوسری تفسیریں باطل اور نادرست ہیں بلکہ ہر شخص اپنے ذہن اور علم کی بنا پر قرآن کے بارے میں سمبلیک تفسیر بیان کر سکتا ہے، چاہے اس کی تفسیر دوسری تفاسیر سے بالکل مخالف اور متضاد ہو۔!!

٦۔ دین کی زبان واقع نما نہ ہونا یا دین کی ایک مبہم تصویر

دینی مسائل اور قرآن کریم کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کے سلسلہ میں وضاحت کے لئے عرض کرتے ہیں کہ ماڈرن ہنری میوزیم "**Museum**" میں بہت سی مختلف ھندسی اور مبہم چیزوں کی تصویر ہوتی ہیں جس کو دیکھ کر واضح طور پر معلوم نہیں ہو پاتا کہ یہ کس چیز کی تصویر ہے جس کی بنا پر مختلف احتمالات دیئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے ذوق کے لحاظ سے ان کی توضیح و تفسیر کرتا ہے اور ان کو کسی خاص چیز کا سمبل (اشارہ) بتایا جاتا ہے شاید ان کا مصور دوسروں کے مختلف نظریات کی طرف متوجہ بھی نہ ہو اسی طرح بعض نفسیاتی لیباریٹری "**Laboratory**" میں ایک کاغذ پر تھوڑی روشنائی ڈال دی جاتی ہے اور اس کو پھیلا کر بعض لوگوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ یہ کس چیز کی شکل ہے؟ تو وہ تھوڑی دیر غور وفکر کے بعد اپنے ذہن کے لحاظ سے کوئی شکل کہہ دیتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ یہ ایک عورت کے بال ہیں اور یہ اس کا ہاتھ ہے اور اپنے ذہنی خیالات کی بنا پر اس کو ایک عورت کی تصویر کہہ ڈالتے ہیں جبکہ اس کام کے کرنے والے نے کسی خاص تصویر کے لئے یہ کام نہیں کیا ہوتا اور نا ہی اس کام کو منظم طریقہ سے کیا جاتا ہے بلکہ یونہی روشنائی ڈال دی جاتی ہے کہ ہر شخص اپنے ذہن کے لحاظ سے اس کے بارے میں فیصلہ کرے۔

چنانچہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی زبان واقع نما نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید میں بیان شدہ مسائل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کو سمجھے، اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ قرآن مجید سے اپنے حاصل کردہ نظریہ کو مطلق قرار دے، اور یہ کہے کہ میری بیان کردہ ہی تفسیر قرآن ہی درست اور صحیح ہے اور دوسروں کی بیان کردہ تفسیریں غلط ہیں جس طرح ایک مبہم تصویر کو دیکھ کر کوئی یہ فیصلہ کرے کہ صرف میرا ہی نظریہ صحیح ہے اور دوسروں کا نظریہ غلط ہے: یہ کہنا اس کے لئے صحیح نہیں ہے، کیونکہ جس طرح وہ اپنے ذاتی خیالات اور تصورات کے ذریعہ کوئی خاص تفسیر کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح دوسرے بھی اپنے ذہن اور موقع محل کے لحاظ سے تفسیر کر سکتے ہیں، جن میں سے کسی ایک کو صحیح اور دوسری کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس طرح کی چیزوں میں صحیح اور غلط ہونا ثابت نہیں ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں صاحب کا حاصل کردہ نتیجہ صحیح ہے اور فلاں صاحب کا نتیجہ غلط ہے!

قارئین کرام! کیا قرآن مجید بھی (نعوذ باللہ) ایک ماڈرن میوزیم کی تصویروں کی طرح ہے کہ ہر شخص کو اس کی تفسیر

کرنے کا حق ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آسمانی کتابوں کے بارے میں اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں غالباً وہ لوگ خدا اور وحی پر عقیدہ نہیں رکھتے، اور اگر زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، تو ان کا یہ مسلمان ہونے کا دعویٰ صرف دکھاوے کے لئے ہوتا ہے اس وقت اختلاف قرائت کا نظریہ رکھنے والے کتاب مقدس کی تفسیر کے بارے میں کہتے ہیں:

بالفرض اگر خدا بھی ہو، وحی بھی نازل ہوئی ہو اور انبیاء نے وحی کو صحیح سمجھا ہو (اگرچہ ان باتوں میں بھی شک ہے)، تو چونکہ انبیاء بھی انسان ہیں اور انسانی درک وفہم رکھتے ہیں اور انسانی درک وفہم غلطی سے خالی نہیں ہے، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ نبی نے خدا کی باتوں کو صحیح نہ سمجھا ہو اور اگر یہ بھی مان لیں کہ پیغمبر نے وحی کو حاصل کرنے میں غلطی نہیں کی ہے، تو بھی قرآن مجید کی یقینی تفسیر بیان کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے، تا کہ اسی معیار کی بنا پر کسی ایک تفسیر کو یقینی قرار دیں اور دوسری تفاسیر کو غلط سمجھیں لہٰذا قرآن مجید سے کوئی بھی شخص اپنے لحاظ سے نتیجہ نکال سکتا ہے اور اپنے نظریہ اور نتیجہ کو صحیح و معتبر قرار دے سکتا ہے اور کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے حاصل کردہ نظریہ کو رد کرے ہم کتاب مقدس کی تفسیر کے بارے میں بالکل انہیں افراد کی طرح ہیں جن کے سامنے نفسیاتی لیباریٹری "Laboratory" میں ایک مبہم تصویر پیش کی جاتی ہے جس کے بارے میں ہر شخص کو اپنا اپنا نظریہ دینا پڑتا ہے مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ یہ شکل تو میری معشوقہ کے بالوں کی طرح ہے اور کوئی کہتا ہے کہ یہ رستم کی شکل ہے، اور اس سلسلہ میں ہر ایک شخص کی نظر محترم ہے اور کسی دوسرے کو اعتراض کا حق نہیں ہے، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مبہم تصویر کو سمجھنے میں سب نے غلطی کی ہو اور کسی نے بھی صحیح نہ بتایا ہو بلکہ اس طرح سے کاغذ پر روشنائی ڈالنے والے کا ہدف بھی صرف یہی ہو کہ ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کے بارے میں اپنا تصور بیان کرے!

۷۔ قرآن مجید کا شعراء کی زبان سے مقابلہ کرنا: بہت سے نتائج ہونے پر دلیل ہے!!

دین کی زبان کے سلسلہ میں معرفت کو نسبی قرار دینے والوں کے نظریہ کو بیان کرنے کے لئے ایک دوسری مثال یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے: جیسا کہ عرفانی اور عشقی اشعار سے مختلف نتائج نکالے جاسکتے ہیں خصوصاً حافظ کی غزلیات، جیسا کہ اکثر ایرانیوں کے گھر میں "دیوان حافظ" ہوتا ہے اور ایک قدیم زمانہ سے دیوان حافظ سے فال بھی نکالی جاتی ہے مثلاً جب کسی شخص کا رشتہ دار سفر میں ہوتا ہے اور وہ اس کے بارے میں باخبر ہونا چاہتا ہے تو وہ دیوان حافظ کے ذریعہ فال نکالتا ہے اور سامنے نکلنے والے صفحہ پر موجود غزل کو پڑھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا رشتہ دار خیریت سے ہے اور جلد ہی پلٹنے والا ہے اور اگر کوئی شخص مریض ہو اور دیوان حافظ سے فال نکالتا ہے تو وہ بھی اسی غزل سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جلد ہی اس کو بیماری سے شفا ملنے والی ہے؛ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسی غزل سے ایک شخص پریشان کن نتیجہ نکالے جبکہ حافظ کی عارفانہ اور عاشقانہ غزلیں اس طرح فال نکالنے کے لئے نہیں ہیں، اور حافظ کا ان غزلیات سے بالکل یہ مقصد نہیں ہے کہ فلاں مریض شفایاب ہوجائے گا یا فلاں مسافر سفر سے جلد لوٹ آئے گا، یا فلاں شخص کی یہ آرزو

پوری ہو جائے گی یا فلاں صاحب کی یہ حاجت پوری نہیں ہوگی کیونکہ حافظ نے عرفانی اور شاعری ماحول میں شعر کہیں ہیں جبکہ فال نکالنے والا اپنے ذہن کے لحاظ سے مختلف نتیجے نکال رہا ہے جب کہ شاعر اور دوسروں کے نتیجہ سے میلوں فاصلہ موجود ہے مولانا (شاعر) نے کیا خوب کہا:

ھر کس از ظن خود شد یار من

از درون من نجست اسرار من

اپنے خیال میں ہر شخص ہمارا دوست بن گیا ہے لیکن کسی نے ہمارے اندر کے اسرار کا پتہ نہ لگایا۔

کہتے ہیں کہ قرآن کریم بھی حافظ کی غزلوں کی طرح ہے جس سے ہر شخص مختلف نتیجہ نکال سکتا ہے بلکہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف بھی، اور ہر کوئی شخص اپنے ذہن اور سابقہ علم کی بنا پر قرآن کریم کی آیات سے نتیجہ نکال سکتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے حاصل کردہ نتیجہ اور قرائت کو مطلق قرار دے۔

یہاں پر پہنچنے کے بعد یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے یا کم سے کم یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ اس نعرہ (کہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دین سے حاصل کردہ اپنے نظریہ کو مطلق قرار دے)؛ کی اصلی بنیاد یہی دین کی زبان کا مسئلہ ہے کیونکہ اس نظریہ کی بنا پر دین کی زبان قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے، اور یہ زبان سمبلیک "Symbilec" (رمزی) اور غیر واقع نما ہے، لہٰذا ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذہنیت کے لحاظ سے دینی مسائل کے معنی و تفسیر کرے، نیز کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی قرائت اور تفسیر کو صحیح قرار دے اور دوسروں کے حاصل کردہ نتائج کو باطل و بے بنیاد!

تو کیا واقعاً اس بے بنیاد اور الحادی نظریہ کی نشر و اشاعت کے بعد جس میں قرآن کریم کو دیوان حافظ کی طرح قرار دیا جاتا ہے اور جس سے ہر کس و ناکس اپنے ذہن کے لحاظ سے معنی و تفسیر کرنے کا حق رکھتا ہے تو کیا اس صورت میں یہ قرآن کریم؛ کتاب ہدایت باقی رہے گی؟!

اور کیا قرآن کریم سے اس طرح کے پیش کردہ نتائج کے بعد وہی کتاب باقی رہے گی جس کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنی جان خطرات میں ڈالی اور اس راہ میں کس قدر شہید فدا ہو گئے؟

اگر ہر کس و ناکس قرآن مجید کی تفسیر کر سکتا ہو اور اپنے حاصل کردہ نتیجہ کو حجت قرار دے سکتا ہو تو پھر آیات قرآن کی صحیح تفسیر پر قرآن مجید کیوں زور دیتا ہے اور تفسیر بالرائے کرنے سے کیوں ڈراتا ہے، نیز دین میں بدعت گذاری کی کس قدر مذمت کی گئی ہے؟

اگر قرآن مجید کی تفسیر من پسند ہونے لگے اور دو بول پڑھنے والا ہر شخص قرآن مجید سے نتیجہ حاصل کرنے لگے، تو پھر ہمارے انقلاب کا کیا فائدہ؟

کیوں ہم نے شاہ کی حکومت کو سرنگون کیا؟

کیونکہ شاہ بھی اپنے کاموں اور اپنی سمجھ کو قرآن اور دین کے مطابق سمجھتا تھا، یہاں تک کہ وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ملاؤں کی بیان کردہ باتوں سے زیادہ مناسب ہے!! اور یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں ملاؤں سے زیادہ قرآن کو سمجھتا ہوں، میرے خلاف بے وجہ تقریریں کی جاتی ہیں بلا وجہ عوام الناس کو میرے خلاف ورغلایا جاتا ہے!! دین کے سلسلہ میں شاہ کی بھی ایک قرائت تھی کیوں اس کی قرائت کو باطل قرار دیا گیا!

اگر کوئی شخص اسی نظریہ کی بنا پر یہ دعویٰ کرے کہ دین سے حاصل کردہ میرا نتیجہ یہ ہے کہ خداوند عالم وجود عینی اور واقعی نہیں رکھتا اور مسلمان ہونا خدا کو ماننے میں منحصر نہیں ہے، تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے؛ چونکہ اس نے اپنے درک وفہم کو بیان کیا ہے اور دین سے اس طرح کا نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حافظ کے اشعار میں بھی مختلف معنی اور تفسیر کرنے کی گنجائش پائی جاتی ہے مثلاً حافظ کہتے ہیں:

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقان ریزد

من و ساقی بہ ہم سازیم وبنیادش بر اندازیم

اگر لشکر میں طلاطم پیدا ہو جائے تو عاشقوں کا خون بھی بہا دیا جاتا ہے، ہم اور ساقی آپس میں پیار و محبت سے رہیں تو پھر اس کی بنیاد کو گرا سکتے ہیں۔

چنانچہ اس شعر کو پڑھ کر ہر شخص اپنی ذہنیت کے لحاظ سے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس کی بیماری کو شفا ہو جائے گی، یا اس کی حاجت پوری ہو جائے گی، اور اپنے حاصل شدہ نتیجہ کے لئے مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ "مے اور ساقی" سے مراد؛ مریض اور ڈاکٹر ہے، اور "بنیادش بر اندازیم" سے مراد یہ ہے کہ یعنی مرض کو جڑ سے ختم کر دیا جائے گا لیکن کوئی دوسرا شخص اسی دیوان حافظ سے فال نکالے اور یہی شعر نکلے تو وہ اس سے بالکل مخالف نتیجہ نکال سکتا ہے۔

اگر قرآن مجید میں ایسے نتائج کی گنجائش پائی جاتی ہو کہ مثلاً خدا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، اور خداوند عالم کے اثبات کرنے کے لئے کوئی دلیل بھی نہ ہو، تو پھر اسلام میں کیا باقی بچے گا؟

اگر ہر کس و ناکس قرآن مجید سے مستقل طور پر ایک نتیجہ نکالنے کا حقدار ہو اور تمام لوگوں کے حاصل کئے ہوئے نتائج کا احترام کیا جائے تو پھر دین اسلام سے دفاع، اور دین کے سلسلہ میں غیرت مندی کا مظاہرہ اور اسلامی اقدار کے مقابلہ میں حساسیت دکھانا؛ بے معنی اور بے ہودہ ہوگا سب کو ٹولرانس "Toleranec" کی رعایت کرتے ہوئے دوسروں کی باتوں کو برداشت کرنا چاہئے اور دوسروں کے نظریات پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے ہر شخص اپنے لحاظ سے دینی مسائل پر عمل کرے، اور اگر اس کا یہ نظریہ ہے کہ واقعاً خداوند عالم واحد اور یکتا ہے تو اس کو اپنے وظیفہ کے مطابق عمل کرنا چاہئے، لیکن اگر کسی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہزاروں خدا موجود ہیں تو اس کا وظیفہ اسی لحاظ سے ہوگا؛ اور جب ہر شخص کی اپنی سمجھ حجت ہے تو کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے اور سب پیار و محبت کے ساتھ بہترین زندگی بسر کریں، اور کوئی بھی ایک دوسرے کے نظریات کے

مقابلہ منفی اعتراض نہ کرے۔

بہر حال، یہ نظریہ جس میں دین کی زبان کو سمبلیک "Symbilec" زبان قرار دیا گیا ہے، جس میں ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے ذہن کے لحاظ سے دینی راز اور مخفی باتوں کے من پسند معنی کرے، اسی بنیاد پر کہنے والے کہتے ہیں کہ دینی معرفت اور شناخت نسبی اور سیال (رواں دواں) ہے اور کسی کو اپنے نظریہ کو مطلق قرار دینے کا حق نہیں ہے بے شک اس طرح کا فاسد نظریہ دین اور قرآن کی نظر میں باطل اور بے بنیاد ہے اور اس طرح کا نظریہ دین سے کسی بھی ہم آہنگ نہیں ہے، ہم عقلی دلائل سے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ خداوند عالم کی حکمت اور اس کا لطف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایک مقصد اور ایک راہ حق و مطلق کی طرف ہدایت کرے، جس کے لئے خداوند عالم نے قرآن مجید نازل کیا جس میں ہر انسان کے لئے حجت اور موعظہ ہے اور جو نوع بشریت کی روحی و نفسیاتی بیماریوں کا علاج کرتا ہے جب کہ پیامبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم اور ائمہ علیہم السلام کے مکتب سے تعلیم حاصل کرنے والوں کے نزدیک قرآن مجید کی ایک ہی قرائت اور تفسیر ہے اور وہ بھی پیغمبر اور اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر ہے اور صرف انہیں حضرات کی رائے اور نظریہ صحیح اور برحق ہے جو معرفت کے آب زلال کا سرچشمہ ہیں، دین کی یہ قرائت دوسری مختلف قرائتوں سے سازگار نہیں ہے، اور ان کو باطل قرار دیتی ہے اگر چہ عالم اسلام میں "مارٹن" اور "لوٹری" پیدا ہو جائیں اور ایک نیا دین ایجاد کرلیں جس کی بنا پر مختلف اور مخالف قرائتیں پیدا ہونے لگیں اور معرفت کے نسبی قرار دینے کی وجہ سے تمام قرائتوں کو صحیح قرار دیا جانے لگے، لیکن ائمہ علیہم السلام سے نقل شدہ بے شمار روایات کے ذریعہ قرآن مجید کی صحیح قرائت ہم تک پہنچی ہے اور لوگوں کو تفسیر بالرائے سے سخت منع کیا گیا ہے۔

اولیاء اللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عوام الناس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے طرف سے دین میں کچھ چیزوں کو شامل کردیں اور اگر کسی مقام پر غیر واضح متشابہ بیان ہو، تو اس موقع پر توقف کیا جائے اور اہل بیت علیہم السلام کی موجیں مارتے ہوئے دریائے معرفت سے اس کی تفسیر حاصل کریں، اور خدا اور اسلام کی طرف اسی چیز کی نسبت دیں جو خود خداوند عالم، قرآنی آیات اور پیغمبر اکرم وائمہ معصومین علیہم السلام کے فرمان میں موجود ہو۔

۸۔ ہرمنوٹک فلسفہ میں قرائت کی کثرت اور معرفت کا سیلاب

تعدد قرائت اور اپنی نظریہ کو مطلق قرار نہ دینے کے نعرہ کی ایک دلیل: علم ہرمنوٹیک "Hermeneutics" (تحریر کے معنی اور تفسیر کرنا) ہے؛ یہ علم آج کل معرفت اور شناخت کے بارے میں ایک عظیم شعبہ ہے جس کی تحقیق کے سلسلہ میں دنیا بھر میں بہت سے افراد مشغول ہیں اس علم کی پیدائش بھی مغربی ممالک میں ہوئی ہے، پہلے یہ ہرمنوٹیک "Hermeneutics" عیسائیت کے علم کلام اور حکمت (فلسفہ) کے کام میں آتا تھا جس کا موضوع کتاب مقدس (عہد عتیق اور عہد جدید) کی حقائق کی معنی و تفسیر کرنا تھا لیکن اس کے بعد اس میں وسعت دیدی گئی اور اس کو انسانی کردار، رفتار و گفتار و آثار کی اہمیت کے معنی و تفسیر کے سلسلہ میں ایک فن اور مہارت سمجھا جانے لگا اور اس آخری معنی کی وجہ سے علم ہرمنوٹیک کو خدا شناسی (الٰہیات) سے

نکال کر فلسفہ سے مخصوص کر دیا گیا، اور یہ انسانی علوم کے مطالعات یا علوم انسانی کے لئے خاص روشوں میں استعمال ہونے لگا۔

اس علم میں بیان ہونے والی تھیوری اور نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے استعمال کردہ الفاظ دوسروں تک مافی الضمیر منتقل کرنے سے قاصر ہیں، ہمارے یہ الفاظ کسی بھی صورت میں ان معنی اور حقائق کی طرف منتقل نہیں کرتے جن کو مولف نے بیان کئے ہیں پس جس وقت کوئی شخص دوسروں سے گفتگو کرتے وقت الفاظ کا استعمال کرتا ہے تو سننے والا؛ کہنے والے کے اصلی مقصد تک نہیں پہنچ سکتا مثال کے طور پر ہر انسان کی باطنی احساسات ہوتے ہیں جیسے محبت، عشق، غصہ، نفرت اور تعجب تو اگر کوئی شخص کوئی تعجب آور چیز دیکھتا ہے اگر وہ اپنے تعجب کے احساس کو دوسرے سے بیان کرنا چاہے، تو سننے والا صرف یہ بات سمجھتا ہے کہ اس کو تعجب ہوا ہے، لیکن کسی بھی صورت میں استعمال ہونے والے الفاظ کے اندر حقیقت تعجب کا پتہ نہیں چلتا، درحقیقت الفاظ کے ذریعہ صرف ایک احساس کی خبر دی جاتی ہے لیکن اس احساس کی ماھیت اور کیفیت منتقل نہیں ہوتی مثال کے طور پر اگر آپ کسی سے کہیں کہ میں فلاں چیز کا عاشق ہو، تو آپ کا مخاطب آپ کے اندر احساس کو نہیں سمجھ سکتا وہ آپ کے بعض حالات سے ایک طرح کا اندازہ لگا سکتا ہے لیکن تفصیلی طور پر اس کی شناخت اور اندرونی احساس کو نہیں سمجھ پاتا۔

۹۔ الفاظ کے ذریعہ مختلف حقائق کو سمجھا جاسکتا ہے

جیسا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کے دعووں میں ایک دعویٰ یہ ہے کہ کسی مولف یا مقرر کے الفاظ مقصد کو بیان کرنے اور مافی الضمیر کو منتقل کرنے سے قاصر ہیں، اور الفاظ کا مافی الضمیر کے منتقل کرنے میں ناکافی ہونا ہر منوٹیک کی بحث کا ایک حصہ ہے نیز دینی تحریروں میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے گذشتہ اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم گذشتہ چند ہزار سال پہلے کی مختلف اقوام و مذاہب کا تاریخی مطالعہ کریں اور ہر دین ومذہب اور مسلک کے ماننے والوں کی ادبیات پر سرسری نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تمام ہی اقوام اور مذاہب کی رونق بخش تعلیمات "عشق" کی بنیاد پر ہے اور اس نکتہ سے پتہ یہ چلتا ہے کہ عشق ایک ایسی حالت ہے جس کا احساس تمام انسانوں کے یہاں پایا جاتا ہے، جو سب کے لئے قابل فہم ہے اب اگر کوئی جاپانی، چینی، ایرانی یا عرب باشندہ اپنے عشق کے بارے میں خبر دے تو پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ ہم اس کے احساس کو درک نہیں کر سکتے؟ کیونکر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ لیلا مجنون یا شیرین اور فرھاد کی داستان عشق ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہے اور ہم ان داستانوں میں عشق کو صحیح طریقہ سے سمجھ نہیں سکتے؛ اور یہ بہانہ کریں کہ الفاظ کے ذریعہ احساسات منتقل نہیں ہوتے ہیں، اگر عشق جیسی حالت اور احساس تمام کہنے والوں یا سننے والوں کے لئے قابل فہم نہ ہوتو پھر ہر قوم وملت میں عشق کے سلسلے میں اس قدر نظم ونثر کیوں موجود ہے، اور عشق کے بارے میں اس زبان کی ادبیات کیوں بھری ہوئی ہے؟

ہم بھی اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ انسان اپنی اندرونی احساسات کو کما حقہ (ہو بہو) دوسروں کی طرف منتقل نہیں کرسکتا، لیکن قرائن وشواہد اور دوسری چیز کو دیکھ کر دوسروں کے احساسات کو سمجھا جاسکتا ہے (مثلاً) ہم اپنے اندر موجود احساس خوف کو دوسرے کی طرف منتقل نہیں کرسکتے جس سے ہمارے احساس کو سمجھ سکے؛ لیکن چونکہ خوف اور ڈر کا احساس ایک ایسی چیز ہے جو تقریباً کم وبیش سبھی کے اندر پایا جاتا ہے، لہٰذا دوسرے افراد بھی ہمارے اندر موجود خوف کا احساس کرسکتے ہیں لیکن اگر کسی کے یہاں ہماری طرح کا احساس نہ پایا جاتا ہو تو وہ قرائن اور شواہد کے ذریعہ بھی ہمارے احساس کا پتہ نہیں چلا سکتا مثال کے طور پر اگر کسی کے اندر عشق ومحبت کا احساس نہ پایا جاتا ہو، تو پھر وہ عشقی داستان سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا، لیکن یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ ایسے شخص کو انسان بھی مشکل سے کہا جائے گا کیونکہ ہر شخص میں تھوڑا بہت محبت کا احساس پایا جانا ضروری ہے، اب اگر کوئی شخص اپنے اس اندرونی احساس کے بارے میں خبر دے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس حالت میں شدت اور زیادتی کا امکان پایا جاتا ہے، تو اس کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ جب یہ حالت اپنی سرحد کمال اور بہت زیادہ شدت تک پہنچتی ہے تو اسی کو "عشق" کہا جاتا ہے پس ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے اندرونی احساسات کو دوسروں تک منتقل نہیں کرسکتے، جس کے نتیجہ میں ہمارے استعمال کردہ الفاظ اپنی دلی حالت کی ترجمانی کرنے کے ناکافی اور قاصر ہوں۔

۱۰۔ قرآن کریم سے مطلق اور واقعی معرفت کا حاصل کرنا ممکن ہے

جی ہاں، ہم بھی یہ بات مانتے ہیں کہ عام طریقوں اور معمولی شناخت کے ذریعہ کنہ حقائق (جوہر حقائق) اور ماورائی طبیعت مثلاً فرشتہ کے ماہیت اور حقیقت کے بارے میں آگاہی حاصل نہیں کی جاسکتی، اور ان کے بارے میں مکمل طور پر شناخت حاصل نہیں ہوسکتی، ان کے بارے میں ہونے والی گفتگو متشابہ اور ذو معنی ہیں، اسی وجہ سے بعض آیات قرآن میں اس طرح کی موجودات کے بارے میں بیان شدہ مطالب متشابہ ہیں ان حقائق کی پہچان کے لئے مخصوص راستے موجود ہیں جو عام انسان کو معلوم نہیں ہیں اور صرف وہی حضرات ان طریقوں کو جانتے ہیں جنھوں نے مدتوں تھذیب نفس اور اخلاقی وعرفانی سیر وسلوک کا راستہ طے کیا ہے، جس کی بنا پر ان بعض موجودات کو درک کیا ہے لیکن قرآن مجید کی بعض باتوں کو نہ سمجھنا دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ کہہ دیں کہ جو کچھ بھی قرآن مجید میں بیان ہوا ہے وہ سب اسی طرح ہے، ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے، اور ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہے، نیز الفاظ کے ذریعہ ہمیں حقائق کا پتہ نہیں چلتا، اور ہر انسان اپنے ذہن کے لحاظ سے ان الفاظ کے معنی وتفسیر کرسکتا ہے اگر چہ بھی ماوراء طبیعت حقائق (جیسے ملک وفرشتہ)؛ کے بارے میں مکمل معرفت حاصل نہیں ہوسکتی، اور ایک عام انسان ان کی شناخت اور اور حقیقت سے باخبر نہیں ہوسکتا، لیکن ان کے بارے میں جن صفات اور خصوصیات کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے ہم ان کے ذریعہ کافی حد تک ان کی معرفت حاصل کرسکتے ہیں۔

دین اور قرآن کی زبان کو افسانوی زبان قرار دینے والوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتابوں میں استعارات، کنایات، تشبیہات اور تمثیلات ذکر ہوئی ہے، منجملہ یہ مثال قرآن مجید میں ذکر ہوئی ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا.[1]

"اور خبردار! اس عورت کے مانند نہ ہو جاؤ جس نے اپنے دھاگہ کو مضبوط کاتنے کے بعد بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا"

اگر چہ قرآن مجید میں یہ مثال بیان ہوئی ہے اور شاید اس طرح کی کوئی بڑھیا کا وجود ہی نہ ہو۔

اسی طرح گدھے کے بارے میں ایک مثال قرآن مجید میں یہ ذکر ہوئی ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا.[2]

"ان لوگوں کی مثال جن پر توریت کا بار رکھا گیا اور وہ اسے اٹھا نہ سکے اس گدھے کی مثال ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو"

کہنے والے کہتے ہیں کہ جب اس طرح کی افسانوی مثالیں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں تو پھر قرآن مجید میں بیان شدہ دوسری باتیں منجملہ خدا، قیامت، وحی اور جنت و دوزخ کس طرح افسانوی نہ ہوں گی!

قارئین کرام! اس طرح بے بنیاد اور بے ہودہ نیز الحادی باتیں مقالات کی صورت میں پورے ملک کی یونیورسٹیوں کے اسٹوڈینٹس تک پہنچائی جارہی ہیں، تاکہ ان کو یہ بات تلقین کی جائے کہ پورے کا پورا قرآن افسانہ اور کہانی ہے یہاں تک یہ گستاخی اس قدر بڑھتی جارہی ہے کہ ایک اسٹوڈینٹ نے اپنے مقالہ میں قرآن مجید میں بیان شدہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے رومانٹیک "Romantique" نتیجہ حاصل کیا اور ایک خیالی داستان کے عنوان سے لکھا، اور اس کے بعد اس پر ادبی تنقید کی اور اس پر بہت سے اعتراض و اشکال کئے، اور جب حضرت یوسف علیہ السلام کی اس رومانٹیک داستان کو استاد کی موجودگی میں سب کے سامنے پڑھا، تو اس داستان کو سننے کے بعد استاد نے بھی بہت سے اعتراضات کئے، جس کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا کہ داستان یوسف کا لکھنے والا کوئی ماھر ادیب نہیں تھا جس کی بنا پر یہ داستان صحیح طریقہ پر نہیں لکھی گئی ہے!!

۱۱۔ قرآن کی زبان کو واقع نما نہ ہونے پر نسبی نظریہ رکھنے والوں کی بے بنیاد دلیل

افسوس کہ جرائد کی "آزادیٔ بیان" کے زیر سایہ اور یونیورسٹیوں و دیگر مراکز میں آزاد سیاسی ماحول، اسی طرح ہمارے ملک کے سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی نظام کی کمزوری، نیز انقلاب کے بعد سے تعلیم و تربیت کے عہدہ داروں کی بے توجہی خصوصاً یونیورسٹی کا موجودہ ماحول میں؛ اسلامی اقدار کے خلاف وسیع پیمانہ پر زہریلی حملیغات اور پروپیگنڈے ہو رہے ہیں، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ عصر حاضر میں بعض یونیورسٹی طلباء کا سوال یہ ہے کہ جب قرآن مجید میں داستان، افسانہ اور استعارات و کنایات بیان ہوئے ہیں اور ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں اور ان کی جگہ مجازی معنی مراد لئے جاتے

---

[1] سورہ نحل آیت ۹۲

[2] سورہ جمعہ آیت ۵

ہیں، تو پھر قرآن مجید کے دوسرے مطالب بھی اسی طرح کے ہونے چاہئیں؟ شاید خدا، وحی اور قیامت جیسے الفاظ سے بھی مجازی اور غیر حقیقی معنی مراد ہوں؟

جی ہاں، یہ سب معرفت کے نسبی ہونے، زبان دین کے سمبلک ہونے اور ہرمنوٹیک "Hermeneutics" کے ذریعہ دینی تحریر کے معنی وتفسیر کرنے کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ ہمارے عظیم الشان اعتقادت اور اصول کو نقصان پہنچایا جارہا ہے جو ہمیشہ ہماری ثقافت اور معاشرہ کے لئے باعث عزت ہے اور ہمارے گذشتہ اور حال کے افتخارات انہیں اسلامی اعتقادات کی وجہ سے ہیں اور تمام انبیاء اور اولیاء اللہ کی امانت کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

یہ نسبیت گرائی اور شکاکیت کا نتیجہ ہے کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے نظریہ کو مطلق قرار دے، اور دین سے حاصل شدہ مختلف نتائج کو قابل احترام سمجھا جائے کیونکہ قرآن کی زبان واقع نما اور حقیقی نہیں ہے بلکہ سمبلک ہے، ہر شخص قرآنی آیات سے مستقل طور پر نتیجہ نکال سکتا ہے ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید میں مثالوں، استعاروں اور داستانوں کو بہانہ بنا کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کریم اصولی طور پر حقائق اور واقعیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف داستانوں، افسانوں اور کنایات واستعارات کی گفتگو کو بیان کرنا چاہتا ہے ہم یہاں پر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر کسی کتاب یا مقالہ یا نظم میں کوئی مثال ذکر ہوئی ہو تو کیا اس کو شعر اور تمثیل کی کتاب کا نام دیا جائے گا؟

اگر کوئی مقرر اپنی تقریر کے دوران کوئی لطیفہ یا کوئی طنز بیان کرے تو کیا اس کی تمام باتوں کو مسخرہ اور طنز آمیز کہا جاسکتا ہے؟

اگر کوئی شخص کسی موقع پر اپنی گفتگو میں مثال، شعر، استعارہ، تشبیہ، کنایہ اور مجاز جیسی چیزوں کا استعمال کرتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ اس کی تمام گفتگو شعر اور افسانہ ہے جس میں کچھ استعارات، کنایات، تشبیہات اور مثالیں بیان ہوئی ہیں اس صورت میں پھر کسی بھی قلمکار کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں مثال، شعر یا طنز کا استعمال کرے، ورنہ تو اس کی کتاب شعر اور طنز کی کتاب کہلائے گی اگر خداوند عالم نے قرآن مجید میں تمثیل ذکر کی ہے تو کیا خداوند عالم کے اس قول "وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ" [1] کو ایک افسانہ اور تمثیل قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور کیا خداوند عالم کے اس فرمان "وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ" [2] کو شعر اور افسانہ قرار دیں سکتے ہیں؟!۔

یہ لوگ ہرمنوٹیک "Hermeneutics" نظریہ اور عبارت وتحریر کی تفسیر کے اعتبار پر ایک دلیل یہ ذکر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں ہمیشہ تفسیر اور تاویلات ہوتی رہی ہیں اور علماء وعرفاء نے تاویل اور تفسیر کے بارے میں بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں؛ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی مختلف تفاسیر اور مختلف تاویلات ہوسکتی ہیں جس طرح عرفاء اور علماء نے

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۲۷۔ "اور اے پیغمبر! آپ ان کو آدم کے دونوں فرزندوں کا سچا قصہ پڑھ کر سنائیے"

[2] سورہ اسراء (بنی اسرائیل) آیت ۱۰۵۔ ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے"

قرآن مجید کی تاویلات اور تفاسیر ذکر کی ہیں اسی طرح ہمیں بھی قرآن مجید کی جدید تفسیر کرنے کا حق حاصل ہے، اگرچہ ہماری بیان کردہ تفسیر علماء کی تفسیر سے بالکل مخالف ہو جیسا کہ بعض روایات میں قرآن مجید کی تفسیر، قرآن کے ظاہری الفاظ سے بالکل مختلف ہے، لہٰذا قرآن مجید میں مختلف تفاسیر کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید کی مختلف تفاسیر اور تاویلات کی جاسکتی ہیں؛ لہٰذا ہم بھی یہ کام کرسکتے ہیں اور چونکہ ان کے درمیان فرق نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے کون سے تفسیر صحیح ہے اور کون سی غلط؛ لہٰذا ان سب کو معتبر ماننا چاہئے!

قارئین کرام! یہ بات صحیح ہے کہ قرآن مجید میں متشابہ آیات پائی جاتی ہیں جس کی تفسیر آیات محکمات کے لحاظ سے ہونا چاہئے، اور روایات میں بھی بیان ہوا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سارے باطن اور مختلف پردہ ہیں، لیکن قرآن مجید کی کسی بھی آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ ظاہر آیات اور کلمات والفاظ حجیت نہیں ہیں، اور ہم پر حقائق کو آشکار نہیں ہوتے۔

قارئین کرام! آیات کے ظاہری اعتبار کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی مزید دقیق اور گہرے مطالب موجود ہیں جن کو بطون اور تاویل آیات کہا جاتا ہے، اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اصلاً قرآنی ظواہر معتبر نہیں ہیں، اور صرف ان سے حاصل کردہ ہمارا نتیجہ معتبر ہے اور وہ بھی وہ تاویلات جو تاویل کرنے والے کے ذہن کے مطابق اور اس کے ذہن کی پیداوار ہوں اس طرح دینی سلسلہ میں مختلف اور متضاد قرائت پیش کی ہو رہی ہیں اور ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان سب کو قابل احترام مانیں!!

۱۲۔ تحریف دین کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اظہار افسوس

قارئین کرام! ہم اپنی گفتگو کے آخر میں لازم اور ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے ان نورانی کلمات کی طرف اشارہ کریں جس میں آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے دینی انحرافات اور شبہات کو بیان کیا ہے اور جن کی بنا پر افسوس ناک اور برے نتائج برآمد ہوئے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ۲۵ سال کے بعد قائم ہوئی ہے، اس وقت تک وہ اصحاب رسول موجود تھے جنھوں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے آیات قرآن کی تفسیر اور شان نزول کو سنا تھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آیات کے موقع کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؛ کیونکہ اس وقت قرآن کے نزول کو زیادہ وقت نہیں گذرا تھا لیکن وہ منافقین اور دشمنان اسلام موجود تھے جو اہل بیت علیہم السلام کے بے انتہا دریائے معرفت سے بے بہرہ تھے، اور جاہ وحشم کے دلدادہ اور ہوا پرست دین میں شبہات اور تحریفات ایجاد کررہے تھے جس کی وجہ سے اسلام میں انحرافات پیدا ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے درمیان برادر کشی ہونے لگی چنانچہ اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَلٰكِنَّا اِنَّمَا اَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ اِخْوَانَنَا فِي الْاِسْلَامِ عَلٰى مَا دَخَلَ فِيْهِ مِنَ الزَّيْغِ وَالْاِعْوِجَاجِ

وَالشُّبْهَةِ وَالتَّأوِیْلِ۔ [1]

مگراب ہم کو ان لوگوں سے جو اسلام کی رُو سے ہمارے بھائی کہلاتے ہیں ان سے جنگ کرنا پڑ گئی ہے، چونکہ (ان کی وجہ سے) اس میں گمراہی، کجی، شبہات اور غلط سلط تاویلات داخل ہو گئے ہیں۔

یہی وہ شبہات اور اعتراضات ہیں جو عصر حاضر میں علمی طریقہ سے بیان کئے جاتے ہیں اور منظم طور پر بیان ہوتے ہیں، حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ میں انہیں اعتراضات کی وجہ سے مسلمانوں میں مقابلہ بازی شروع ہوگئی، اور اسی طرح کے شبہات اور اعتراضات کو قبول کرتے ہوئے جنگ جمل اور جنگ نہروان میں حقیقی مفسر قرآن حضرت علی علیہ السلام کے مقابلہ میں آگئے جس کی بنا پر بہت سے لوگ قتل کردیے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام خداوند عالم کی بارگاہ میں عوام الناس کی جہالت کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"إِلَى اللهِ أَشْكُو مِنْ مَعْشَرٍ يَعِيشُونَ جُهَّالًا وَ يَمُوتُونَ ضُلَّالًا، لَيْسَ فِيهِمْ سِلْعَةٌ أَبْوَرُ مِنَ الْكِتَابِ إِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ، وَلَا سِلْعَةٌ أَنْفَقُ بَيْعاً وَلَا أَغْلَى ثَمَناً مِنَ الْكِتَابِ إِذَا حُرِّفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَلَا عِنْدَهُمْ أَنْكَرُ مِنَ الْمَعْرُوفِ وَلَا أَعْرَفُ مِنَ الْمُنْكَرِ۔" [2]

اللہ ہی سے شکوہ ہے ان لوگوں کا جو جہالت میں جیتے ہیں اور گمراہی میں مرجاتے ہیں، ان میں قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہیں ہے، جب کہ اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسا پیش کرنے کا حق ہے، اور اس قرآن سے زیادہ کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں، اس وقت جب کہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے، ان کے نزدیک نیکی سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہیں۔

قارئین کرام! توجہ فرمائیں حضرت امیر علیہ السلام کا یہ شکوہ و شکایت اس وقت کا ہے جب رحلت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ۲۵ سال کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا، لیکن انحرفات، شبہات اور بدعت دین کے لئے اس قدر نقصان دہ ثابت ہو رہے تھے کہ حضرت نے تنہائی کے عالم میں لوگوں کی ہدایت کے مسئلہ کو ان کے حال پر چھوڑتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیئے اور اپنے درد و غم کو بیان کرنا شروع کر دیا۔

مذکورہ بالا کلام کی طرح خطبہ نمبر ۱۴۵ میں بھی حضرت فرماتے ہیں:

"وَ إِنَّهُ سَيَأْتِي عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي زَمَانٌ لَيْسَ فِيهِ شَيْءٌ أَخْفَى مِنَ الْحَقِّ، وَ لَا أَظْهَرُ مِنَ الْبَاطِلِ، وَ لَا أَكْثَرُ مِنَ الْكَذِبِ عَلَى اللهِ وَ رَسُولِهِ، وَ لَيْسَ عِنْدَ أَهْلِ ذٰلِكَ الزَّمَانِ سِلْعَةٌ أَبْوَرَ مِنَ الْكِتَابِ إِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ، وَلَا أَنْفَقَ إِذَا حُرِّفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَلَا فِي الْبِلَادِ شَيْءٌ أَنْكَرَ مِنَ الْمَعْرُوفِ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۲

[2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۷

وَلَا أَعْرَفَ مِنَ الْمُنْكَرِ۔

میرے بعد تم پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں حق بہت پوشیدہ اور باطل بہت نمایاں ہوگا، اور اللہ اور اس کے رسول پر افتراء پردازی کا زور ہوگا، اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جبکہ اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے پیش کرنے کا حق ہے، اور اس قرآن سے زیادہ ان میں کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں ہوگی جب کہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے، اور (ان کے) شہروں میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہ ہوگی۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"چنانچہ حاملان قرآن کو چھوڑ دیا جائے گا اور حافظین قرآن کو بھلا دیا جائے گا، قرآن اور قرآن والے (اہل بیت) بے گھر اور بے در ہوں گے، اور ایک ہی راہ میں ایک دوسرے ساتھی ہوں گے، انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا وہ (بظاہر) لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ، ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق، اس لئے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہوسکتی، اگر چہ وہ یک جا ہوں لوگوں نے تفرقہ پردازی پر تو اتفاق کرلیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا کہ وہ کتاب کے پیشوا ہیں کتاب ان کی پیشوا نہیں، ان کے پاس تو صرف قرآن کا نام رہ گیا ہے اور صرف اس کے خطوط اور نقوش کو پہچان سکتے ہیں، اس آنے والے دور سے پہلے وہ نیک بندوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا چکے ہوں گے، اور اللہ کے متعلق ان کی سچی باتوں کا نام بھی بہتان رکھ دیا ہوگا اور نیکیوں کے بدلہ میں انہیں بری سزائیں دی ہوں گی۔"

نیز فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ لَنْ تَعْرِفُوا الرُّشْدَ حَتّٰى تَعْرِفُوا الَّذِيْ تَرَكَهُ وَلَنْ تَاْخُذُوْا بِمِيْثَاقِ الْكِتَابِ حَتّٰى تَعْرِفُوا الَّذِيْ نَقَضَهُ وَلَنْ تَمَسَّكُوْا بِهٖ حَتّٰى تَعْرِفُوا الَّذِيْ نَبَذَهُ۔"

جان لو کہ تم ہدایت کو اس وقت تک نہ پہچان سکو گے جب تک اس کے چھوڑنے والوں کو نہ پہچان لو اور قرآن کے عہد و پیمان کے پابند نہ رہ سکو گے جب تک کہ اس کے توڑنے والے کو نہ جان لو اور اس سے وابستہ نہیں رہ سکتے جب تک کہ اسے دور پھینکنے والوں کی شناخت نہ کرلو۔

اور خطبہ کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:

"پس انہیں سے ہدایت حاصل کرو، وہی علم کی زندگی اور جہالت کی موت ہیں وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا (دیا ہوا) ہر حکم ان کے علم اور ان کی خاموشی ان کی گویائی کا پتہ دے گی، اور ان کا ظاہر ان کے باطن کا آئینہ دار ہے، وہ نہ دین کی مخالفت کرتے ہیں نہ اس کے بارے میں باہم اختلاف رکھتے ہیں، دین ان کے سامنے ایک سچا گواہ ہے اور ایک ایسا بے زبان ہے

جو بول رہا ہے۔"[1]

قارئین کرام! آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام لوگوں کو متوجہ کرنے کے بعد ان سے چاہتے یہ ہیں کہ دین کو صرف اہل بیت علیہم السلام کے ذریعہ حاصل کریں کیونکہ دین اور قرآن سے انہیں کا حاصل کردہ نتیجہ صحیح اور بر حق ہے، اور دین سے دوسرے حاصل کردہ نتائج باطل اور بے بنیاد اور راہ خدا کو حاصل کرنے والوں اور حق وحقیقت کے تلاش کرنے والوں کے چور ہیں، جس کا نتیجہ گمراہی اور ذلت کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

توجہ فرمائیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے نظریہ کے مطابق یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ ہر کس وناکس دین سے ایک الگ نتیجہ حاصل کرے اور اس طرح کے تمام حاصل شدہ نتائج صحیح اور درست ہوں، کیونکہ یہ اپنے سلیقہ اور ذوق کے مطابق ہے کیا دین کے سلسلہ میں ذوق کا بھی کوئی دخل ہے؟ کیا دینی مسائل میں بھی ذوق دکھایا جاسکتا ہے؟ (ہرگز نہیں)

تو پھر دین کی صحیح تفسیر اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کرنا چاہئے، نہ یہ کہ اپنے سلیقہ اور ذوق کی بنا پر خود بھی گمراہ ہو رہے ہوں اور دوسروں کو دین سے گمراہ کردیں۔

۱۴۔ دینی سلسلہ میں ذاتی سلیقہ کو ردّ کیا جائے

بعض لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ اپنے سلیقہ اور ذوق کو دوسروں پر نہ تھوپئے، تو کیا دین ذوق اور سلیقہ کا نام ہے، اور اس کی حدود اور اس کے معنی وتفسیر انسان کے سلیقہ سے معین ہوتے ہیں؟ سلیقہ اور ذوق انسان کی عام زندگی سے متعلق ہوتا ہے: مثال کے طور پر کوئی شخص کوئی کپڑا یا دوسری چیز خریدنا چاہتا ہے تو اس موقع پر کسی دوسرے شخص پر اپنا سلیقہ تحمیل کرنا صحیح نہیں ہے لیکن اعتقادات میں سلیقہ اور ذوق کا کوئی سروکار نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میرا سلیقہ یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے، اور (نعوذ باللہ) دوسرا شخص کہے کہ میرا سلیقہ یہ ہے کہ کئی خدا ہیں، کیونکہ شریعت اور احکام الٰہی عوام الناس کے ذوق کے تحت نہیں ہیں تا کہ کہنے والے کہیں کہ دوسروں کے سلیقوں کو بھی برداشت کریں، نیز دوسروں کے سلیقوں کو ردّ نہ کریں۔

پس اعتقادی مسائل، ضروریات اسلام، احکام اسلام، عقائد اور الٰہی اقدار کسی کے سلیقہ کے تحت نہیں ہیں، اور ان کے سامنے ذوق وسلیقہ کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے اپنے نظریہ کو مطلق نہ قرار دینے کے شعار فقط دین کے فرعی اور ظنی مسائل میں صحیح ہے اور ان میں بھی ان حضرات کا نظریہ قابل قبول ہے جو دینی وفقہی مسائل میں اپنے عظیم الشان علم اور صحیح طریقہ سے مکمل طور پر اجتہاد کریں اور قرآن وسنت کے ذریعہ اپنے نظریہ کو استنباط کریں اور اسی کے مطابق فتویٰ دیں اور جو شخص اس طرح کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے اس کو اصطلاحاً "فقیہ" کہا جاتا ہے، چنانچہ اسی موقع پر کہا جاتا ہے کہ ایک فقیہ اپنی رائے کو دوسرے فقیہ پر تحمیل کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

---

[1] نہج البلاغہ ترجمہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ، خطبہ نمبر ۱۴۵

یہ مسلم ہے کہ دو فقہاء کے درمیان فتوؤں میں اختلاف ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی فقیہ یہ نہیں چاہتا کہ اپنے نظریہ کو دوسرے فقیہ پر تحمیل کرے لیکن عقائد، اصول اور اسلام کے قطعیات میں انسان کا کوئی سلیقہ اور ذوق قابل قبول نہیں ہے کیونکہ دینی عقائد میں صرف وہی چیز صحیح ہے جس کو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام نے بیان فرمایا ہے، اور تمام علماء اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے، کیونکہ اسلامی مسلمات کے سلسلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی قرائت کے علاوہ دوسری تمام قرائت باطل اور بے بنیاد ہیں، اور کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی آگے بڑھ کر یہ کہے میں بھی دین سے ایک نئی قرائت پیش کرتا ہوں۔

درحقیقت اس طرح کا نظریہ دین میں بدعت گذاری کا واضح مصداق ہے جس سے مقابلہ کرنا حقیقی علماء اسلام کا فریضہ ہے، تاکہ وہ خداوند عالم، اس کے فرشتوں اور نیک بندوں کی لعنت ونفرین کے مستحق قرار نہ پائیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

والحمد للہ رب العالمین

تمت بالخیر